عالمگیر
لاہور
قیمت فی پرچہ چھ آنہ قیمت سالانہ چار روپے چار آنے

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرہ آفاق تصنیف

تمدّنِ عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ اور
نواب جیون یار جنگ بہادر بی اے۔ بیرسٹر ایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے
عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے

جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۲۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ جس کی قیمت پچاس روپے
تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی اب

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن و برار مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

سید عبدالقادر
پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۲ — فہرست مضامین عالمگیر ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء — نمبر ۲

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

عالمگیر کی عالمگیر مقبولیت!

سنہ ۱۹۳۴ء نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور سنہ ۱۹۳۵ء منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ خدا کرے کہ یہ سال نو عالمگیر اور اس کے جملہ ناظرین کے لئے باعث سرور و انبساط ہو۔

یہ تو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عالمگیر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے فی الحقیقت عالمگیر ہے اور دنیا کے ان دور دراز حصوں میں پہونچکر اپنا عالمگیر مقبولیت کا ثبوت دے رہا ہے جہاں اس کے ناچیز ایڈیٹر و مرتب کو عمر بھر جانا نصیب نہ ہو، عالمگیر اس وقت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچنے کے علاوہ برما، افریقہ، افغانستان، فلسطین، یمن مملکت حجاز، مڈغاسکر (فرانس) چین، جاپان، مصر، وغیرہ میں بھی پہونچ رہا ہے۔ اشاعت کے لحاظ سے بھی عالمگیر ہندوستان بھر کے باتصویر ادبی رسائل میں بہت آگے ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس کثرت اشاعت کے باوجود کارپردازان عالمگیر مطمئن نہیں، اور ان کی دلی خواہش ہے کہ عالمگیر کی اشاعت موجودہ اشاعت سے بھی زیادہ ہو جائے اور یہ جذبہ بالکل قدرتی اور فطری ہے۔ آپ ہندوستان کے دوسری زبانوں کے رسائل کی اشاعت کو دیکھئے کہ ہندی اور بنگالی زبان کے مشہور رسائل دس دس اور پندرہ پندرہ ہزار کی مستقل اشاعت رکھتے ہیں۔ وہ مالی پریشانیوں سے آزاد ہیں۔ ہندی اور بنگالی کے علاوہ۔ گجراتی، مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے رسائل کی اشاعتیں بھی اردو رسائل سے کہیں زیادہ ہیں حالانکہ وہ محدود علاقہ اور خطہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اردو ایسی عالمگیر زبان کے مقابلہ میں ان کی کچھ بھی حیثیت اور حقیقت نہیں۔

لیکن جب ہم اردو رسائل کے مقابلہ میں دوسری زبانوں کے رسائل کی کثرت اشاعت کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے۔ ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

بدقسمتی یا خوش قسمتی سے جو لوگ اردو رسائل نکال رہے ہیں وہ اس وادی پرخار اور اس راہ دشوار گذار سے اچھی طرح واقف ہیں، لیکن اس وقت میرا روئے سخن ان حضرات کی جانب ہے جو ناظرین کرام اور قارئین عظام کی حیثیت سے اردو رسائل کے بجا طور پر ممد و معاون ہیں وہ اگر چاہیں تو اردو رسائل آج دوسری ہمسایہ زبانوں کے رسائل سے اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ ان کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکیں۔ اردو رسائل یا کم از کم عالمگیر اپنے ناظرین کرام سے سوائے عملی ہمدردی کے کچھ نہیں چاہتا وہ بصورت نقد ایک پیسہ بھی لینا نہیں چاہتا بلکہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ عالمگیر کے خریدار حضرات اپنا سلسلہ خریداری مستقل طور پر جاری رکھیں اور اپنے حلقہ اثر میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرماتے رہیں۔ اس حقیقت کی تردید ناممکن ہے کہ انفرادی اور شخصی کوششیں اسی وقت کامیاب اور بارآور ہو سکتی ہیں کہ مجموعی طور پر ان سے تعاون اور اشتراک عمل کیا جائے۔

مجھے عالمگیر کے ناظرین کرام سے کامل توقع ہے کہ وہ ضرور اپنے حلقۂ احباب میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرما کر جہاں مجھے ممنونیت کا موقع بخشینگے وہاں عالمگیر کو بھی اس سے بیش از بیش فائدہ پہونچیگا۔

خاص نمبر سنہ ۱۹۳۵ء کی عالمگیر مقبولیت عالمگیر کے خاص نمبر گذشتہ دس سال کے عرصہ سے جو قبولیت عامہ اور شہرت تامہ حاصل کر چکے ہیں وہ کسی توضیح اور تشریح کے محتاج نہیں لیکن زیر بحث خاص نمبر کو جو قبولیت حاصل

ہوئی وہ عالمگیر کے گذشتہ خاص نمبروں کے لئے بھی قابل رشک ہے۔ ناظرین کرام کے ایسے والا ناموں کے علاوہ جن میں خاص نمبر کی دل کھول کر تعریف کی ہے عالمگیر کے ایجنٹ حضرات نے بھی اپنے خطوط میں اس کی بہت زیادہ تعریف کی اور شاید ایک آدھ ایجنٹ کے علاوہ تمام حضرات نے اس کو دوبارہ طلب فرمایا بلکہ کلکتہ کے ایجنٹ جناب محمد شفیع صاحب اور بمبئی کے ایجنٹ جناب منشی احمد بخش صاحب اس کو چار چار مرتبہ طلب فرما چکے ہیں اور ابھی ان کی فرمائشات کا سلسلہ جاری ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ لمیٹڈ حیدرآباد دکن اور مولوی مظفر الدین صاحب تاجر کتب سیالکوٹ اور مولوی غلام یٰسین صاحب ایجنٹ دہلی تین تین مرتبہ طلب فرما چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ابھی فروری کے آخر تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ باقی تمام ایجنٹ صاحبان خاص نمبر دوبارہ طلب فرما چکے ہیں اور امروز فردا میں ان کی مزید فرمائشات کی توقع ہے۔

ناظرین کرام

اور اہل قلم حضرات کی آرا، کو اگر درج کیا جائے تو اس کے لئے کئی صفحات کی ضرورت ہے جن حضرات نے خاص نمبر کو پسند فرما کر خطوط کے ذریعہ میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ میں ان کی خدمت میں اپنے جذبات تشکر پیش کرتا ہوا اس حقیقت صحیحہ کے اعلان و اعتراف کی اجازت چاہتا ہوں کہ عالمگیر کے خاص نمبر کی کامیابی فی الواقع عالمگیر کے ناظرین کرام اور اہل قلم حضرات کی کرم فرمائیوں کی رہین منت ہے۔ میں تو ایک خادم کی حیثیت سے عالمگیر کی خدمت میں مصروف ہوں اگرچہ یہی مصروفیتیں اکثر و بیشتر میری ذہنی اور قلبی اذیتوں کا باعث بن جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد آپ کا تعاون ہی ایک ایسی متاع بے بہا ہے جو مجھے ان حوصلہ شکن روح فرسا اور جان لیوا پریشانیوں سے عہدہ برآ ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

اس مرتبہ

عالمگیر کے خاص نمبر کی ڈاک کی روانگی میں قدرے تاخیر واقع ہوئی اور اس تاخیر کے سبب سے عالمگیر کے ناظرین کو جو تکلیف ہوئی اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ تاخیر کی وجہ یہ ہوئی کہ خاص نمبر کی اشاعت سے دو تین روز قبل عالمگیر پریس کے ٹھیکیدار صاحب اور دو ملازم بیمار ہوگئے اور کام بھی اکے بہت زیادہ تھا۔ یقین ہے کہ مہربان کرام اس جبری تاخیر کا خیال نہ فرمائینگے۔

عالمگیر

کا عید قربان نمبر اس سال بھی خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ضرور شایع ہوگا۔ اور ادارہ عالمگیر اس کی تیاری میں مصروف ہے۔ کوشش کیجا رہی ہے کہ عید سے ایک دو روز قبل عید کا یہ قابل دید تحفہ ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوجائے۔

مفصل حالات فروری اور مارچ کے عالمگیر میں ملاحظہ فرمایئے۔

محبوبۂ قیرواں جن حضرات نے علامہ جرجی زیدان (مصری) کے مشہور تاریخی ناول شجرۃ الدر کا ترجمہ "موتیوں کا درخت" ملاحظہ فرمایا ہے ان میں سے اکثر نے علامہ ممدوح کے دوسرے تاریخی ناول محبوبۂ قیرواں کی خریداری کے لئے فرمائشیں بھیجی ہیں لیکن، خاص نمبر کے سبب ہم اس ناول کو چھپوا نہ سکے اب انشاءاللہ فروری ۳۵ء میں معرکہ آرا ناول شایع ہوجائیگا جن حضرات نے تاحال فرمائش خریداری نہیں بھیجی وہ آج ہی ایک کارڈ بھیجکر اسم گرامی درج رجسٹر کرالیں اس ناول کی قیمت عہ ہوگی لیکن ناظرین عالمگیر سے صرف بارہ آنے ۱۲ علاوہ محصول ڈاک لئے جائینگے فرمائش کرتے وقت عالمگیر کے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔ "موتیوں کا درخت" کی بھی چند کاپیاں دفتر میں موجود ہیں اس کی قیمت بھی بارہ آنے صرف ہے لئے ناظرین عالمگیر ہے۔ دونوں کتابیں منگانے میں محصول ڈاک میں کفایت ہوگی۔ حافظ محمد عالم عفی عنہ۔

پتیرا حیانی

تاثراتِ روحانی سے لبریز اپنی طرز کا نیا رومانی افسانہ

جناب مولانا صادق الخیری صاحب دہلوی

—(۱)—

کہیں دور — بہت دور ......

ایک خاموش و پرغوغا، تاریک اور چمکیلے جزیرے میں جہاں دن اور رات طلوع اور غروب آپس میں گلے ملتے ہیں وہ — یعنی حیانی — رہتی تھی

..... کیونکہ کرہ ارض پر اس کا کوئی مخصوص مسکن نہیں۔

— لیکن انسان جب سن شعور کو پہونچتا ہے تو اس کی پروا بھی نہیں کرتا کہ وہ کبھی ایسی جگہ رہا ہوگا — اور یہی خیال ننھے پتیرا کا تھا جس کی عمر چار سال ہوگی۔

پتیرا حیانی سے غالباً بہت ہی کمسنی میں ملا ہوگا جب کہ اس کو بولنا بھی نہیں آتا تھا اور سوائے بسور لے ہاتھ پھیلانے اور ہنسنے کے کچھ نہ جانتا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ان "ساؤں" کو پکڑنے کی لاحاصل اور انتھک کوشش کر لیا کرتا ہوگا جو حال سے ماضی میں تبدیل ہوجایا کرتے ہیں۔

بہرحال سب سے پہلے اس نے چار سال ہی کی عمر میں اس سے گفتگو کی۔ وہ اس کو چاہتا تھا — حیانی کے فردوسی لباس کو، اس کی آسمانی مسکراہٹ کو اور اس کے حسین مکھڑے کو — بس اس سے زیادہ وہ حیانی کو اور کچھ نہ جانتا تھا — رات کو سنسان کمرے کے ایک تنہا کونے میں وہ اس کو کھڑے ہوئے دیکھتا — حیانی مسکراتی اور پتیرا ہنسنے لگتا۔

باوجود بہتیرا منع کرنے کے پتیرا اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکتا تھا لیکن اس کی ماں اس کو مجبور کرتی کہ وہ سو جائے۔

آخرکار ماں نے پریشان ہوکر ایک روز کہا "تو کس سے باتیں کرتا ہے"

"مرمریں لباس میں ..... اماں ... ایک حسین مکھڑے والی کی آسمانی مسکراہٹ مجھے بہت ہی پسند ہے۔" پتیرا نے جواب دیا۔

اس سے زیادہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اور اس نئے دوست کے متعلق اس سے زیادہ وہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

—(۲)—

ایک صبح کو دفعۃً پتیرا چیخا — "کون ہے؟"

لیکن حیانی صرف ہنسدی اور درختوں کے ایک جھنڈ میں گم ہوگئی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کی نرم و نازک مسکرانے والی موسیقی آواز نے اسے اس کا نام بتا دیا اور وہ دیوانہ وار چیخنے لگا "پیاری حیانی! پیاری حیانی!"

"کیوں چیخ رہا ہے" ماں نے ترشروئی سے کہا۔

"پیاری حیانی" پھر آواز آئی۔

"کیا بکتا ہے؟" ماں بگڑ کر بولی۔

"پیاری حیانی" پھر پتیرا نے جواب دیا۔

"پاگل تو نہیں ہوگیا۔ خواہ مخواہ کیوں شور مچاتا ہے۔ کیا کمال کھا رہی ہے؟" ماں آپے سے باہر ہوکر بولی۔

پتیرا باہر نکل گیا۔ درختوں کی طرف۔

اس کے بعد ماں اکثر دیکھتی کہ وہ اپنے نادیدہ دوست سے باغ یا مکان کے کسی گوشے میں گفتگو کر رہا ہے۔ ہر وقت کی انھیں باتوں نے اس کو عادی کر دیا۔ اور وہ اس کی طرف سے اگرچہ ایک طرح سے بے پرواہ ہوگئی مگر ایک دفعہ جب اسے کسی بات کا اندیشہ ہوا تو پتیرا کے باپ سے کہنے لگی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتیرا کو ہو کیا گیا؟ آج صبح وہ مجھ سے کہنے لگا

کو ہی کوئی دوست ——— اسے رات کو اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئی اور اُسے
پھل وغیرہ کھلائے اور باوجود میرے جھٹلانے کے وہ یہی کہے جاتا ہے ———
"اماں میں اس کے ساتھ گیا تھا ——— آسمانی مسکراہٹ والی ——— اس
نے مجھے پھل بھی دیئے ———" اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ صرف
ایک خواب تھا۔ وہ مانتا ہی نہیں۔"

"ہاں ہے تو حیرت ناک بات، مگر یہ سب بچپنے کے خیالات ہیں جو بہت
جلد دھندلے پڑنے شروع ہو جائیں گے" باپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ایک رات کو ماں جاگ اٹھی تو دیکھا کہ بتیرا اپنی پلنگڑی پر پڑا کہہ رہا ہے
"وہاں سردی ہوگی، میرا بستر گرم ہے۔ آؤ میرے ساتھ میرے بچھونے
میں آکر سو جاؤ۔"

ماں نے غور سے دیکھا کہ بتیرا پٹی پر سرک گیا ہے اور باقی جگہ چھوڑ دی ہے
تاکہ کوئی اس کے پاس آکر لیٹ جائے۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس کی ماں نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"پیاری حیاتی کو بلا رہا ہوں ——— اس کے لئے یہ جگہ کافی ہو گی
——— اس کو سردی لگ رہی ہے۔ وہ سونا چاہتی ہے ———"
اس نے بھولے پن سے کہا۔

"مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" ماں چاروں طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ ہے تو سہی ——— وہاں ——— حیاتی!" بتیرا کی آواز
میں خفگی معلوم ہوتی تھی۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ سو جاؤ۔" ماں نے کہا۔

"بیوقوفی نہیں ہے ——— وہ ہے تو۔ پیاری حیاتی ...."

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بتیرا اور حیاتی خاموشی سے اور چھپ چھپ کر ملنے لگے
ان کی ملاقاتیں رنگین ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے
تھے وہ دور دور کھیتوں اور خاموش باغوں میں جایا کرتے اور طرح طرح
کی باتیں کیا کرتے تھے۔

جب اس کی عمر پانچ سال کی تھی تو اس کے باپ نے ایک چھوٹی سی
پہاڑی پر ایک ننھا سا باغ بنوایا اور اپنے اکلوتے بیٹے سے ذرا مذاق میں
پوچھا ——— "اس کا نام کیا رکھنا چاہیئے؟"

"فردوس حیاتی!" اس نے معصومیت اور سادگی سے کہہ دیا اور
اپنے باپ کی صورت کو تکنے لگا۔

عقلمند باپ پر اس کا اثر ہوا اور اس نے اس کا نام "فردوس حیاتی"
ہی رکھ دیا۔

اپنے عمر کے پانچویں سال میں جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوتا تو اکثر
فردوس حیاتی چلا جاتا اور کہیں دور ——— بہت دور ——— کسی چیز
پر اپنی نگاہیں گڑا دیتا اور آہیں بھرتا ——— نہ معلوم کیوں؟

پھدکنے والے خرگوشوں کی طرح اگر کوئی آہستہ سے وہاں چلا جائے
اور خاموش ہو کر سنے تو وہ کہتا ہوتا۔

"حیاتی جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو مجھے سفر کرنا ہوگا ——— دور ———
دیکھنا ——— بہت دور ——— اور پھر نہ مجھے پڑھنا ہوگا اور نہ کسی کی ضرورت
ہوگی، ماں، باپ، بہن اور نہ کوئی میرے ساتھ ہوگا۔"

جب کبھی وہ کچھ بے چینی سی محسوس کرتا تو بھی وہیں چلا جاتا اور کہتا۔

"پیاری حیاتی، دنیا کی ہر چیز کیوں اس قدر بے رحم واقع ہوئی ہے؟ مجھے
کیوں زبردستی پڑھنا پڑتا ہے! اور اماں تمہیں یہاں اپنے گھر میں کیوں
نہیں آنے دیتیں؟"

جب بتیرا فردوس حیاتی سے واپس آتا تو مسرور ہوتا اور اس کے
دل کو سکون، اگر اس کی ماں کبھی اسے مارنے دوڑتی تو یہیں پناہ لیتا،
وہ جانتا تھا کہ یہاں میں محفوظ ہوں کیونکہ بڑھیا اماں موٹی تو ویسے ہی ہے
پھر اس پہاڑی پر کہاں چڑھے گی۔

——— (۳) ———

وقت گذرتا گیا اور بتیرا کی عمر چھ سال ہو گئی۔ اس اثنا میں خلاف
توقع وہ دوسرے مشاغل میں منہمک ہو گیا۔ سنہری پنجرے میں سبز طوطا
اس کا اکثر دل بہلاتا اور اس سے اس کو اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ اس کو
ایک لمحہ بھی مشکل سے چھوڑتا۔ رفتہ رفتہ حیاتی کی یاد اس کے دل سے ڈھل
جانے والے سائے کی طرح کم ہوتی گئی اور صرف "فردوس حیاتی" کے
صنوبر کے درختوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔

پندرہ سال کی عمر میں ایک دفعہ وہ اپنے وطن واپس آیا اور اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اسی پہاڑی پر پہونچے۔ اس کے دوست نے کہا۔

"اسے فردوس حیانی کیوں کہتے ہیں؟"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "کیا معلوم! یہ ایک پرانا نام ہے۔ یہاں کے دہقان تو اسے "باغ پتیرا" کہتے ہیں"۔

——— لیکن یکبارگی اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ اپنے دل میں ندامت محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ایسی یاد کا انکار کر رہا ہے جو "فردوس حیانی" کے درختوں پر سے جھانک رہا ہے مگر وہ پھر بھی لڑکا تھا ——— سب ہی ناسمجھ اور شریر ہوتے ہیں ——— وہ اس کو اُڑا لیگیا اور اس کا ساتھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

بہت سے سال بیت گئے ——— عرصہ دراز۔

اور وہ ایک دوسرے ملک میں چلا گیا۔

سبز پہاڑیوں نے اپنی ردا رشام اوڑھ لی تھی ——— اور سورج جھیل کے پگھلے ہوئے سونے پر جلا کر رہا تھا۔ ہوا خاموش تھی مگر کبھی کبھی دور سے چرواہوں کی آوازیں مویشیوں کی گھنٹیوں سے ہم آہنگ ہو کر سنائی دے جاتی تھیں۔

پہاڑی کے ایک طرف ایک گھر میں جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھا، بڑی ہی خاموشی تھی۔ برابر ہی کے کمرے میں ایک نوجوان شخص بیٹھا ہوا کھڑکی میں سے ارغوانی مناظر دیکھنے میں محو تھا کہ اس نے تاریک کمرے میں سے کچھ آوازیں آتی سُنی۔ اس کا دوست بستر پر بیمار پڑا تھا اور اس پر بحرانی کیفیت طاری تھی اس نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں؟ میں تم کو نہیں پہچانتا۔ ہیں! وطن میں ...... دریا کے کنارے؟ ..... ہاں! ...... فردوس حیانی؟ حیانی؟ ...... ہاں اب یاد پڑتا ہے ..... ارے تم ہو! .... اچھی تو رہیں؟ ...... تم نے بہت اچھا کیا کہ آگئیں۔ .... تم کہاں تھیں .... مجھے تو تمہارا انتظار تھا۔ ......"

کچھ دیر تک خاموشی مسلط رہی۔ پھر ایک گہرا سانس اور چند آہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر کمزور اور دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ جسم جو وہاں پڑا ہوا ہے نا۔ اگر اس کا سانس رک جائے تو میں مرجاؤں گا ——— جیسا نا حیانی؟ وہ لمبا، زرد، مرجھایا ہوا، لاش سا جسم میرا ہی ہے حیانی ——— تو میں یقیناً بیمار ہوں ..... اگر اس کا سانس رک جائے تو میں مرجاؤنگا"۔

نوجوان شخص نے اپنے پڑوسی کی طرف گردن پھیر کر کہا ——— "پتیرا، پتیرا کیا بات ہے؟ کون ہے؟"

——— لیکن آواز آئی،

"وہ میری طرح تو نہیں ہے۔ ... وہ جسم! آہ مجھے تکلیف ہوتی ہے ... میرا طوطا مرگیا ..... عرصہ ہوا ... کیا تمہیں یاد نہیں؟ حیانی! آہ حیانی، میری مدد کرو، مت جاؤ، پیاری حیانی۔"

کچھ لمحات بعد وہ پھر کہنے لگا۔ جب تم مجھے چھوڑ چکی تھیں ... پیاری ... میرے ماں باپ کا انتقال ہوگیا .... تم کیوں جا رہی ہو؟ مجھے تمہاری ہر وقت ضرورت ہے ...... کیا تمہیں معلوم ہے حیانی .... کہ اگر وہ جسم جو وہاں پڑا ہوا ہے سانس نہ لیگا تو میں مرجاؤنگا۔ پھر میں کہاں جاؤں گا، میں نہیں جانتا؟ ..... تم تو بہت ہی دور رہتی ہو، ہے نا؟ ایک دفعہ تم نے مجھے بتایا تھا ——— بہت دور .... یہاں سے کہیں دور ....

.... ایک ایسے جزیرے میں جہاں دن اور رات میں اختلاط باہمی ہے اور جہاں شام اور شفق .... صبح اور صبح کاذب، ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتی ہیں .. یہیں رہتی ہو نا؟ مگر یہ ہے کہاں؟ مجھے نہیں معلوم ..... میرے خیال میں بھی نہیں ہے"

پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"میں اس زرد اور مرجھائے ہوئے جسم کے قریب ہونا نہیں چاہتا، تم ہمیشہ کی طرح آج بھی مسکرا رہی ہو حیانی؟ ... کیا میں بھی مسکراؤں، پیاری! اچھا ... جاؤ مت، حیانی ... خدارا! ...."

گہرا سانس اور آہیں .... اور خاموشی،

پتیرا اب سوگیا تھا۔

جب وہ اچھا ہوا تو اس کے دوست اس کے متعلق گفتگو کرنے لگے ایک کہنے لگا ——— "تم بچ گئے، بخار بہت تیز تھا۔"

دوسرا بولا۔ "تم کیا کیا بک رہے تھے پتیرا؟"

"ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تم کسی حیانی سے باتیں کر رہے تھے،" وہ کون ہے؟ ایک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟ دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو اپنی بحرانی کیفیت کی باتیں یاد رکھتا ہو۔" پتیرا نے لاپروائی سے جواب دیا۔

حیانی کی باتیں پھر معدوم ہو گئیں۔ البتہ ایک دھندلی سی یاد کا سایہ پتیرا کے کمرے میں کبھی کبھار پڑ جاتا تھا ——— جہاں وہ اس سے دوبارہ ملی تھی۔

——— (۴) ———

ایک شام کو ———

ایک میز کی گرد پانچ اشخاص جن کی عمریں پچپن سے پینسٹھ تک ہونگی بیٹھے مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔

ایک بولا "جب کبھی مجھے پتیرا کی بیماری یاد آتی ہے جب کہ ——— عرصہ دراز گذرا ——— وہ قریب المرگ تھا ——— مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نصف اس دنیا میں تھا اور نصف کہیں اور . . . "

"اس کے کیا معنی؟" دوسرے نے تعجب سے پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دو مختلف شخصیتیں ہیں ——— گویا ایک روح اپنے جسم سے باتیں کر رہی تھی جو الگ پڑا ہوا تھا ——— وہ گھڑی گھڑی کہے جا رہا تھا" اس جسم کا اگر سانس رک جائے تو میں مرجاؤنگا ——— تمہیں یاد ہے پتیرا؟ ——— "

"کچھ کچھ؟" پتیرا نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسی حالت میں روح واقعی جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر مسکراتا ہوا بولا "چونکہ اس قسم کی کتابیں ہمیں نہیں پڑھائی جاتیں اس لئے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو تمہارے خیال میں روح جسم کو نہیں چھوڑ سکتی تاوقتیکہ اپریشن نہ کیا جائے۔"

"نہیں . . . . . "

پانچوں آدمیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

ہماری عمریں ختم ہوئی جاتی ہیں، یہ بھی ہم کو معلوم ہو جائیگا۔"

"واقعی، بہت جلد معلوم ہو جائیگا۔"

"ہاں!" پتیرا بھی ایک لمبا اور سرد سانس لیکر بولا۔

پانچوں دوستوں کی محفل درہم برہم ہونے کے بعد پتیرا اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس کے دماغ اور جسم کو پھونکے جا رہا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ اٹھا۔ وہ پیاسا تھا، اس لئے پانی پی کر پھر لیٹ گیا، اس کا جسم گرم ہو گیا تھا اور وہ اندرونی تپش سے جل رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور قدرت کی رحمدل ملکہ نے اسے اپنی آغوش میں لیکر سلا دیا۔

اس نے ایک آہ بھری اور دفعتہً بولا۔ "تم کون ہو؟ آہا حیانی، تم آگئیں تمہیں دیکھے برسوں گذر گئے تھے ——— کبھی جوانی میں دیکھا تھا اور یا پھر بچپن میں ——— پیاری میں جا رہا ہوں۔ فردوس حیانی! ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ میں، بھولا نہیں، میں کہاں ہوں؟ کیا سردی لگ رہی ہے۔ آؤ یہاں آجاؤ . . . . میرے پاس . . . میں جا رہا ہوں . . . . "

——— خاموشی . . . . . "

"کیا تمہیں معلوم ہے حیانی؟ کہ وہ شخص ——— بڈھا اور ضعیف ——— اگر سانس لینا بند کردے تو میں مرجاؤں گا . . . میں! ہاں میں، وہ کس قدر بوڑھا ہے کیا وہ قریب قریب ختم ہو گیا۔؟ . . . . کیا تم سمجھتی ہو ہم دونوں ساتھ جائیں گے؟ میں جانا چاہتا ہوں، مگر کہاں؟ مجھے یاد ہے . . . . دور . . . بہت دور ایسی جگہ جہاں دن اور رات ملتے ہیں . . . . شام اور شفق گلے ملتی ہیں . . طلوع ہوتے ہی اس میں سما جاتی ہے . . . . میں وہاں ہی جا رہا ہوں . . . آہ حیانی میں بہت تھک گیا ہوں . . . . میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔ دور . . . بہت دور . . . کہیں دور . . . اور پھر آرام کرنا، میں اپنے تئیں سے کس قدر پرے ہو گیا ہوں پیاری . . . میں کون ہوں؟ . . . آہ پیاری! میں بیحد تھک گیا ہوں . . . . آج بھی مجھے پہلے کی طرح اپنی آغوش میں لیلو پیاری! . . . . "

آہ سرد! اور پھر سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

علی الصباح ملازم نے پتیرا کو بستر کے ایک طرف ——— پٹی پر پڑا ہوا ——— دیکھا۔ مردہ مگر بشرے سے اطمینان اور مسرت ظاہر ہوتی تھی کیونکہ . . . رات بھر حیانی اس کے ساتھ اس کے پلنگ پر سوئی تھی ———

صادق الخیری،

جذبات ازہر

جناب سید ارشاد حسین صاحب ازہر

ترا جلوہ میری نظر میں ہے مجھے دھوکا کیوں ہو شرار پر
نہیں میرے مزاج میں سادگی کہ دل آئے شعلۂ نار پر

دل و چشم حسن میں ہوں مکیں نہیں گر چمن میں نہیں سہی
ہوں سراپا زخموں سے لالہ گوں مجھے رشک کیوں ہو بہار پر

میں جہانِ رنگ کا شاہ ہوں مری ہستیاں ہیں ہزارہا
کبھی شاخِ گل پہ ہوں نغمہ زن کبھی گلفشاں ہوں میں دار پر

میں نوائے بلبلِ بوستاں میں نبائے نغمۂ وحشیاں
مجھے داد دیتی ہیں بیڑیاں میں ہوں طرۂ رنگ بہار پر

مجھے یاد اپنی دلا گئے مرے دل کے داغ کھلا گئے
وہ بجھے چراغ جلا گئے کبھی آ گئے جو مزار پر

یہ چمن کی ساری شگفتگی ہے جنونِ عشق کے فیض سے
جو فضا میں خوں کہیں اڑے تو بہار کیا ہو بہار پر

ہے عجیب منظرِ کیف زا ہے جوابِ آئینہ آئینہ
ترا حسن اپنے شباب پر۔ مرا عشق اپنی بہار پر

جو کھلے ہیں دہر میں گل تو کیا جو ہے عطر بیز صبا تو ہو
مرا دل اگر نہ کھلا سکی تو ہزار تف ہے بہار پر

کوئی آشیاں کو جلائے کیوں کوئی میرے دل کو دکھائے کیوں
مرا خانماں یہی چار خس مری مملکت یہی چار پر

گل و غنچہ کی نہیں اب وہ خو ہے چمن میں مہر و وفا کی بو
جو بہار میں یہ مرا لہو تو کچھ آیا رنگ بہار پر

مرا درد دل مری زندگی مرا عشق مجھکو ہے فصلِ گل
وہ ہے ازہر اور کوئی جنوں کہ جو منحصر ہے بہار پر

حجاج بن یوسف ثقفی

از جناب کوثر صاحب، چاندپوری؛

ہم اپنے ایک تاریخی مضمون "چنگیز خاں" کی تمہید میں بتا چکے ہیں کہ حجاج اور چنگیز خاں کے نام دنیا کے حافظے سے کبھی محو نہ ہونگے اس لئے نہیں کہ ان کو تدبیر و دانشمندی یا عدل و انصاف کے سلسلے میں کوئی امتیاز خاص حاصل ہے بلکہ محض اس بنا پر کہ قتل و غارتگری اور ظلم و قساوت کی بہت سی داستانیں ان کے نام سے منسوب ہیں۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم نے حجاج بن یوسف کے سوانح حیات قلمبند کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چونکہ "عالمگیر" کی اشاعت خاص کے اہم اعلانات ہو چکے ہیں اس لئے اپنے وعدہ کو ایفاء کرنا "مدیر عالمگیر" کی ناراضی مول لینا ہے۔

ولادت اور ابتدائی حالات:۔ حجاج بن یوسف ۵۴ ؍ چون سال کی عمر میں ۹۵ھ میں فوت ہوا ہے اس حساب سے اس کا سن ولادت ۴۱ھ سمجھنا چاہئے۔ صاحب ہفت اقلیم نے حجاج کا سال وفات ۱۰۹ھ لکھا ہے مگر میں نے تاریخ طبری کی روایت پر اعتبار کیا ہے۔

مصنف ہفت اقلیم لکھتا ہے کہ حجاج کو صغر سنی سے ہی قتل و خونریزی کا شوق تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ میرے نزدیک کوئی چیز قتل سے زیادہ لذیذ نہیں ہے۔

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ پیدائش کے وقت حجاج کا مبرز مسدود تھا مجبوراً منقب سے سوراخ کیا گیا۔ حجاج ماں کا دودھ نہ پیتا تھا آخر ایک طبیب کی رائے سے بکری ذبح کی گئی اور اس کے خون میں حجاج کو بٹھایا تو اس نے ماں کی پستان مُنہ میں دبائی۔

میں اس وقت ان بیانات پر جرح کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ نتیجہ ضرور نکالتا ہوں کہ حجاج فطری طور پر نہایت سنگدل اور بے رحم تھا۔ حجاج عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں عراق و خراسان کی حکومت پر فائز تھا اور مسلسل بیس سال تک اس نے عراق پر حکومت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی سیاسی و ملکی خدمات بہت پسندیدہ ہیں اگرچہ مذہبی نقطہ نظر سے ان خدمات کو سراہا نہیں جاسکتا مگر دنیوی کاموں کی تاریکی میں جہاں مذہب کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے اور اس کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے ان باتوں کی تلاش سے کوئی فائدہ نہیں اور حجاج کے واقعات زندگی کو لکھنے سے ہمارا یہ مدعا بھی نہیں ہے کہ ہم اس کی مذہبیت کے کارنامے بیان کریں۔ ہمیں صرف اس کی سیاسی زندگی کا وہ پہلو دکھانا مقصود ہے جو اس کی فتوحات اور ملک گیری سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کی حیات مختصر کا یہ رُخ بہت روشن ہے۔

حجاج نے عبدالملک کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں بڑے بڑے کارنمایاں کئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ عبدالملک کے ہاتھ حجاج ایسا سخت دل انسان نہ آتا تو اس کی حکومت کو اس قدر وسعت حاصل نہ ہوتی۔

عبدالملک کے سامنے سب سے بڑی شخصیت حضرت عبداللہ بن زبیر کی تھی اور چونکہ وہ مکہ میں مستقل خلیفہ تسلیم کر لئے گئے تھے اور حج کی امامت کا مرتبہ بلند ان کو حاصل تھا اس لئے ان کا مقابلہ براہ راست مذہب اور ارض مقدس کے وقار کا مقابلہ تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی کافی عزت تھی اور وہ اس کی معمولی سی توہین پر سر کٹانے کو آمادہ تھے۔

عبدالملک یا اس سے پہلے اموی خلیفہ یزید کے مقابلہ میں ابن زبیر کی عسکری قوت کچھ بھی نہ تھی تاہم مکہ پر قابض ہونے کے لحاظ سے وہ اسلام میں بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے اور اس خیال نے کہ وہ قتل حسین کے انتقام کا ارادہ بھی رکھتے ہیں ان کے اثر و رسوخ کو اور زیادہ کر دیا تھا،

چنانچہ عبدالملک نے یہ دیکھکر کہ حج کے موسم میں ہزاروں مسلمان مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں اور ان سب پر ابن زبیر کا اثر ہے ان کی مذہبی قیادت کے مقابلہ کو یہ ترکیب نکالی کہ بیت المقدس کی تعمیر اور مرمت کا انتظام کیا تاکہ مسلمان وہاں مثل مکہ مکرمہ کے سالانہ جمع ہوا کریں عبدالملک نے بیت المقدس میں حجر اسود کی جگہ بوسہ دینے کی غرض سے سنگ یعقوب نصب کیا۔

بہرحال عبدالملک تمام عالم اسلام پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنی چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ بہت بیتاب تھا لیکن اس کے ارادے میں سب سے بڑی روک حضرت عبداللہ بن زبیر تھے مگر حجاج نے عبدالملک کے راستہ سے اس سنگ راہ کو جلد ہی الگ کر دیا۔

ہم حجاج کی بڑی بڑی مہمات کو الگ الگ تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کا قتل :۔ عبدالملک عراق عرب کی طرف سے مطمئن ہو کر دمشق آیا تو اس نے دربار عام میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو حضرت عبداللہ بن زبیر کے قتل پر آمادہ کیا جو مکہ میں مستقل خلافت قائم کئے ہوئے تھے اور اسی اعتبار سے عبدالملک کے زبردست حریف تھے لیکن کعبہ اور مسجد حرام کی عظمت کے باعث کسی نے عبدالملک کی دعوت کے جواب میں زبان نہ ہلائی۔ جب ہر طرف سے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملا تو حجاج جو اس زمانہ میں معمولی حیثیت کا آدمی تھا کھڑا ہوا اور اس نے اس زبردست مہم پر جانے کا اقرار کیا مگر عبدالملک نے اس کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ حجاج نے کہا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ابن زبیر کی کھال میں نے کھینچ لی ہے۔ عبدالملک نے یہ سن کر تین ہزار سوار اس کو دیئے اور اس مہم پر نامزد کیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر خلیفہ اول جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے جناب رسالتمآب (روحی فداہ) سے بھی ابن زبیر کے دو رشتے تھے حضرت زبیر رسالت پناہ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور چونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی جناب اسماء جن کو "ذات النطاقین" کا لقب حاصل تھا حضرت زبیر سے منسوب تھیں اس لئے حضرت زبیر روحی فداہ جناب رسول کے ہم زلف بھی تھے ۔

ابن زبیر ہجرت کے پہلے سال مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے اس وقت یہود نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ مسلمانوں پر ہم نے جادو کر دیا ہے اب ان کے یہاں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوگا خدا کی شان کہ پہلے ہی سال حضرت عبداللہ پیدا ہوئے۔ آنحضرت اور صحابہ بے انتہا خوش ہوئے اور اس زور سے خوشی میں نعرہ تکبیر بلند کیا کہ مدینہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

ابن زبیر نے حجاج کے حملہ کی اطلاع پاکر تھوڑی سی فوج اس کے روکنے کی غرض سے روانہ کر دی مگر حجاج نے اس کو شکست دیدی اور آسانی سے مکہ کے سامنے آگیا۔

پہلے حجاج نے تیر کے ذریعہ سے ایک خط اہل مکہ کی طرف پھینک کر پیام دیا کہ ہم عبداللہ کے ظلم سے تم کو رہائی دینے آئے ہیں اگر تم ان کی رفاقت ترک کر کے ہمارے پاس آجاؤ گے تو ہم تمھاری حفاظت کرینگے اور تم دیکھو گے کہ ابن زبیر کا عنقریب یہ انجام ہوگا کہ وہ اپنے لقب "خلیفہ" کے ساتھ جلد مکہ میں دفن ہو جائینگے ۔

حجاج نے مکہ معظمہ کا محاصرہ کر کے کوہ ابوقبیس اور دوسرے بلند مقامات پر منجنیق نصب کر دیئے اور اچھی طرح خانہ خدا پر سنگ باری کی۔ حملہ کے دوران میں بجلی کی سخت کڑک ہوئی اور محاصرین خوفزدہ ہو کر سمجھنے لگے کہ اس مقدس مقام پر گستاخی کرنے کی وجہ سے قہر الٰہی نازل ہوا ہے۔ حجاج نے لوگوں کا شبہ رفع کیا اور خود پتھر پھینک کر ان کو دلیر بنایا۔ دوسرے دن بھی بجلی کی کڑک ہوئی اور بہت سخت ہوئی مگر حجاج نے اپنے لشکریوں کو سمجھایا کہ تم پر بجلی کا جو اثر ہے وہ دشمن پر بھی ہے۔

ابن زبیر ابتدائے محاصرہ میں اکثر خانہ کعبہ میں رہتے تھے مگر دشمنوں نے اس کا کچھ حصہ گرا دیا اور آگ بھی لگا دی اس وجہ سے آپ نے یہاں کا رہنا ترک کر کے اپنے گھر میں سکونت اختیار کر لی۔

حضرت عبداللہ کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی لیکن محاصرے کے طویل ہو جانے سے محصورین بھوک سے مرنے لگے تو سب نے ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج سے پناہ مانگی حتی کہ ان کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی باپ کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے جا ملے ابن زبیر ان حالات سے نہایت شکستہ خاطر ہوئے اور اپنی والدہ حضرت اسماء کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بیٹے بھی بیکسی میں بوڑھے باپ کی رفاقت نہ کر سکے

ابھی تک جو لوگ گرد و پیش نظر آ رہے ہیں ممکن ہے کہ مصائب سے تنگ آ کر یہ بھی دشمن کے پاس چلے جائیں اگر میں دشمن سے اطاعت کی درخواست کروں تو یقین ہے کہ وہ رد نہ کرینگے آپ اس معاملہ میں کیا فرماتی ہیں؟

حضرت اسماءؓ کا سن اس وقت نوے برس کا تھا آپ نے نہایت استقلال سے فرمایا کہ تم حق پر ہو تو تقدیر خداوندی پر شاکر رہو اور ہرگز بنی امیہ کی اطاعت کا خیال دل میں نہ لاؤ اور اگر تم حق پر نہیں ہو تو اللہ کے بہت بُرے بندے ہو کہ تم نے محض اپنے نفس کی خاطر ہزاروں بندگان خدا کو ضایع کیا۔ اور اگر تم باوجود برسر حق ہونے کے صرف کمزوری کے خیال سے اطاعت کا ارادہ رکھتے ہو تو یہ بھی طرح سن لو: بیٹا عبداللہ کہ یہ کام مردوں کا نہیں ہے۔ آخر کب تک زندہ رہو گے۔ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ تمہیں بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہے بہتر یہی ہے کہ عزت کی موت مرو اور عزت کے ساتھ آخرت کا سفر کرو۔" حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اماں! مجھے یہ خوف ہے کہ اہل شام میری لاش کو سولی پر چڑھائینگے اور طرح طرح میری توہین کرینگے۔"

حضرت اسماء نے جواب دیا "بکری کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال کھینچ لی جائے تو اس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی خدا سے اعانت طلب کرو اور اپنے نیک ارادے پر قائم رہو۔"

ابن زبیر نے اپنی والدہ کی پیشانی پر بوسہ دیکر کہا کہ "میرا بھی یہی خیال ہے میں خدا کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ میں نے صرف اس لئے بنی امیہ کی مخالفت کی ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کردیں۔ آپ نے میری تائید کرکے میرے ارادے کو مضبوط کردیا ہے۔ میری ہمتوں کو بڑھا دیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ احکام الٰہی کے اجرا اور انصاف کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی میں نے ہمیشہ اپنے عہد کو پورا کیا ہے اور کسی حلیف یا مسلمان پر ظلم نہیں کیا نہ اپنے ماتحت عمال کو اس کی اجازت دی میں نے کبھی کسی چیز کو خدا کی مرضی سے زیادہ پسند نہیں کیا۔ یا اللہ! میں اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں نفس کو بڑھانے اور غرور کی نیت سے نہیں بلکہ اپنی شفیق ماں کو تسکین دینے کی غرض سے کہہ رہا ہوں اور تو میری نیت کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

ابن زبیر نے چلتے وقت حضرت اسماء سے دعا کی خواہش فرمائی حضرت اسماء نے کہا۔ میں ہر وقت تمہارے لئے دعا کرتی ہوں پھر ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔

یا اللہ! عبداللہ کے دن کے روزوں اور رات کی عبادتوں کے عوض میں اور ان تمام عبادتوں کے معاوضہ میں جو مجھ سے یا اس کے باپ سے ظہور میں آئیں اپنی رحمت کو تو اس کی شامل حال کر۔ میں اپنے لخت جگر کو تیرے حوالے کرتی ہوں اور تو نے جو کچھ اس کی قسمت میں لکھا ہے اس پر شاکر ہوں یا اللہ تو مجھے اس حال میں شکر کرنے اور صبر کرنے والوں کا ثواب عطا فرما۔"

حضرت عبداللہ نے اپنی مادر مشفقہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور فرمایا کہ میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں کیونکہ آج مجھے سفر آخرت کے لئے تیار ہونا ہے حضرت اسماء نے اپنے بہادر اور جانباز بیٹے کو میدان کے متعلق ضروری نصیحتیں کیں۔ پھر گلے لگایا۔ اسی دوران میں جناب اسماء کا ہاتھ حضرت عبداللہ کی زرہ کو چھو گیا جس کو آپ میدان میں جانے کی غرض سے زیب بدن کر چکے تھے۔

ذات النطاقین نے فرمایا۔ عبداللہ! جو لوگ شہادت کے آرزومند ہوں ان کو زرہ بکتر سے کیا واسطہ؟ حضرت عبداللہ نے کہا کہ میں نے آپ کی تسلی کے لئے زرہ پہن لی تھی۔ یہ منشا نہ تھا کہ زندگی کی حفاظت کروں۔

آپ نے زرہ اتار دی اور آستینیں چڑھا کر دامن کمر سے باندھ لئے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے بہادرانہ طور پر میدان میں کود پڑے۔

"مجھے اپنی موت کا حال معلوم ہو جاتا ہے تو میں مردانہ وار
صبر کرتا ہوں"

حضرت اسماء نے رجز سن کر فرمایا۔ خدا نے چاہا تو عبداللہ تو صابر اور مستقل رہے گا اور کیوں نہ رہے گا جب کہ زبیر تیرے باپ، ابوبکر صدیق تیرے نانا اور صفیہ (جناب رسالت مآب کی پھوپھی) تیری دادی تھیں

حضرت عبداللہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح عرصہ کارزار میں پہنچے اور حجاج کی بھیڑوں میں زلزلہ ڈالدیا۔ تھوڑی دیر لڑ کر آپ بیت اللہ میں آئے اور مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد پھر مصروف پیکار ہو گئے اور بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

حضرت عبداللہ جام شہادت پی کر گھوڑے کی پیٹھ سے گرے تو اہل شام نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ عبداللہ ابن عمر نے سن کر کہا۔ خدا کی شان دیکھو ایک دن وہ تھا جب عبداللہ پیدا ہوئے تھے اور مہاجرین و انصار نے اللہ اکبر کہا تھا اور ایک دن یہ ہے کہ عبداللہ شہید ہو کر گرے ہیں تو حجاج کی فوج صدائے تکبیر بلند کر رہی ہے۔

یہ جانگداز واقعہ ۱۷ر جمادی الآخر یوم سہ شنبہ سنہ ۷۳ھ کو ہوا جبکہ حضرت عبداللہ کی عمر بھی تہتر سال کی تھی۔

حجاج نے حضرت عبداللہ کا سر مبارک شام بھیجا اور جسم اطہر کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں مصلوب کرکے لٹکا دیا۔ حضرت اسمار نے اپنے لخت جگر کی نعش مانگی تو جب تک دمشق سے منظوری نہ آگئی نعش ماں کے حوالے نہیں کی گئی۔

ابن زبیر کی شہادت کے بعد حجاج نے جناب اسمار کو دو مرتبہ بلایا لیکن آپ نے ہر مرتبہ انکار کردیا۔ آخر حجاج خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جناب اسمار سے دریافت کیا کہ عبداللہ کے ساتھ جو سلوک ہوا آپ نے اس میں مجھے کیسا پایا؟ جناب اسمار نے کہا میں نے تجھے ایسا پایا کہ تو نے میرے بیٹے کی دنیا اور اپنی عقبیٰ خراب کی۔ جناب رسول صلعم نے فرمایا ہے کہ بنی ثقیف میں ایک جھوٹا اور ہلاک کرنے والا پیدا ہوگا۔ یقیناً وہ جھوٹا اور ہلاک کرنے والا تو ہی ہے۔

حضرت عبداللہ کی شہادت کے چند روز بعد حضرت اسمار کا بھی وصال ہوگیا بعض مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ کی شہادت کی خبر آپ کو پہونچی تو آپ کو جوش آیا اور جریان خون ہوکر آپ کا انتقال ہوگیا۔

اگرچہ مضمون طویل ہورہا ہے لیکن میرے لئے یہ مشکل ہے کہ ان جذبات کو دبالوں جو اس مقدس ہستی کے حالات پڑھکر میرے دل و دماغ پر مستولی ہیں۔ ایک مورخ اس معرکہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"حضرت عبداللہ نہایت جرات و استقلال کے ساتھ برابر جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کے تمام رفقا قتل ہوگئے اور تیر بھی ترکش میں باقی نہ رہے آپ صرف نیزہ و تلوار سے کام لے رہے تھے اسی حالت میں آپ نے ایک ایک قدم پیچھے ہٹنا شروع کیا مگر آپ کا رخ دشمن ہی کی طرف رہا۔ آخر میں حضرت عبداللہ ایک نشیب میں آگئے جہاں صرف سامنے سے آپ پر حملہ ہو سکتا تھا۔ اس موقع پر بھی آپ بے جگری سے لڑتے رہے اور مخالفین کو آپ کے ہتھیار کی زد تک آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ دور سے تیر اور کنکر پتھر پھینک رہے تھے ایک پتھر آپ کے سر پر لگا جس سے سر مبارک کو صدمہ پہونچا اور خون بہ کر داڑھی تک آگیا۔ آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ مگر غنیم کے پر مسرت نعروں سے آپ ہوش میں آگئے اور ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے زخم کا خون آگے کی طرف بہتا ہے یعنی ہم مقابلہ کی حالت میں مجروح ہوتے ہیں بھاگتے ہوئے نہیں، آپ خون بہنے سے کمزور ہوگئے اور دشمنوں نے بہادر حریف کو ناتوان دیکھ کر سر کاٹ لیا۔

مورخ طبری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ نے دشمن کو باب صفا تک بھگا کر پہاڑ پر چڑھنے کے لئے مجبور کردیا تھا انھوں نے پہاڑ سے پتھر پھینک پھینک کر آپ کو مجروح کیا تھا۔

حضرت عبداللہ نے نو برس خلافت کی، آپ نہایت بہادر اور مدبر تھے امیر معاویہ نے آپ کی شجاعت اور عقلمندی کی تعریف ہی میں کہا تھا کہ ان میں شیر کی بہادری اور لومڑی کی ہوشیاری پائی جاتی ہے۔

طارق ابن عمار نے آپ کی شجاعت و بسالت سے متاثر ہوکر کہا کبھی عورت نے ان سے زیادہ بہادر آدمی پیدا نہیں کیا ہوگا۔ حجاج نے کہا، تم امیر المومنین کے دشمن کی تعریف کرتے ہو مگر جب عبدالملک کو اس گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے بھی طارق کے قول سے اتفاق کیا۔

حضرت عبداللہ نہایت عبادت گذار اور پرہیزگار تھے۔ نماز میں بالکل بے خبر ہو جاتے۔ ایک مرتبہ کبوتروں نے مورت سمجھ کر آپ کے سر پر گھونسلا بنا لیا تھا۔ آپ بہت انتظام کے ساتھ خرچ کرتے تھے آپ نے ایک پوشاک کئی سال تک استعمال کی۔

آپ کی شہادت کے بعد تمام ممالک اسلام عبدالملک کے زیر نگین آگئے۔

خراسان کی مہم۔ حضرت عبداللہ کی شہادت کے بعد عبدالملک کا شاہانہ اقتدار تمام اسلامی ممالک پر قائم ہوگیا مگر امیر خراسان عبداللہ ابن ہیزم نے ابھی اس کے سامنے سر اطاعت خم نہ کیا تھا۔ عبدالملک نے امیر خراسان کو پیام دیا کہ تم ہماری اطاعت کروگے تو ہم سات سال تک تم کو خراسان کا حاکم رکھینگے۔ ابن زبیر کا سر بھی اس پیام کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور امیر خراسان کو ڈرایا گیا تھا کہ اگر تم نے اطاعت میں ذرا بھی تامل کیا تو تمھارا بھی یہی حشر ہوگا۔

امیر خراسان نے حضرت عبداللہ کے سر مبارک کی بہت تعظیم کی اسا کو غسل دیا۔ کفن پہنایا خوشبو لگائی اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف دفن کرنے کی غرض سے روانہ کردیا۔ اور عبدالملک کا خط پھاڑ کر پھینک دیا قاصد کو محض قاصد ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا ورنہ اس کے مقتول ہونے میں بھی

کوئی شک نہ تھا۔

عبدالملک نے حجاج کو اس معرکہ کے لئے حجاز سے طلب کیا۔ وہ زبردست لشکر لے کر خراسان کی طرف بڑھا اور خراسان پہونچکر متعدد لڑائیوں کے بعد امیر خراسان کو قتل کر کے وہاں کے صوبوں پر عبدالملک کے تسلط کا پرچم لہرا دیا۔

عراق و بابلستان کی امارت:۔ حجاج نہایت کارگذار اور جنگ آزما جرنل تھا۔ عبدالملک نے اس کی خدمات کے صلے میں حاکم عراق بشیر کے مرنے پر اس کو بابلستان اور عراق کی حکومت پر سرافراز کیا۔

یہ صوبہ فارس اور عرب کے درمیان واقع تھا اس لئے بہت خطرناک اور نازک مقام تھا۔ یہاں کے باشندے ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتے تھے۔ شام اور عراق اگرچہ اموی بادشاہ کے ماتحت تھے مگر عقاید کے لحاظ سے ان میں سخت اختلاف تھا۔ شام بنی امیہ کا طرفدار تھا، عراق حضرت علی کے خاندان سے محبت و عقیدت رکھتا تھا اور ان کی جانبداری کو اپنا مذہبی فریضہ جانتا تھا۔ جب تک ان دونوں صوبوں پر مختلف بادشاہ حکمراں رہے اس وقت تک تو خیر یہ اختلاف رہنا ہی چاہیے تھا مگر ایک بادشاہ کے زیر اقتدار آجانے کے بعد بھی جذبات میں یکسانیت پیدا نہ ہوئی اور پرانی نزاع بدستور قائم رہی۔ ظاہر ہے کہ عقاید کی یہ جنگ معمولی نہ تھی اور عرب کی آزاد و حریت پسند فطرت آسانی سے اپنے معتقدات میں تبدیلی گوارہ نہ کر سکتی تھی۔ اس لحاظ سے اس صوبہ کی حالت بالکل پکے ہوئے پھوڑے کے مانند تھی۔ نہ معلوم کس وقت پھوٹ جائے اور مواد بہ نکلے۔ یہاں اندر ہی اندر بغاوت و سرکشی کے منصوبے باندھے جاتے تھے اور ہروقت بغاوت کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا تھا۔

یہ ایسے حالات تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی حاکم کا اطمینان اور کامیابی کے ساتھ حکومت کرنا سخت مشکل تھا مگر حجاج نے اپنی سخت مزاجی ظلم اور سیاسی قابلیت کے عناصر ثلاثہ کو ممزوج کر کے ایک ایسا دستور حکمرانی مرتب کیا جس کی بدولت وہ بیس سال کے طویل عرصہ تک امن و اطمینان کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اگر کسی طرف سے عصیان و طغیان کے آثار نمایاں بھی ہوئے تو اس نے جلد ہی ان دماغوں کو کچل دیا جن میں یہ جنون بغاوت پیدا ہوتا تھا۔

حجاج چار ہزار سواروں کی معیت میں کوفہ گیا اور اس نے مسجد میں داخل ہو کر ایک تقریر کی جس میں واضح کیا کہ وہ نہایت سختی اور سخت گیری کے ساتھ حکومت کریگا۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے موسیٰ ابن نصیر کو جو سابق حاکم کا وزیر تھا خیانت کے جرم میں گرفتار کرنے کا قصد کیا۔ لیکن وہ بروقت اطلاع پاکر فرار ہوگیا۔ اور پھر اپنی حکمت عملیوں سے عبدالملک کے پاس پہونچکر پچاس ہزار دینار بطور جرمانہ ادا کر کے بچ گیا۔

کوفہ سے فارغ ہو کر حجاج بصرہ گیا اور وہاں بھی سختی سے کام لینا چاہا مگر یہاں بغاوت پھیل گئی اور حجاج کو میدان کارزار میں اپنی جنگی طاقت صرف کرنے کی نوبت آئی۔ فتح حجاج کی ہوئی اور باغیوں نے شکست کھائی۔ حجاج نے اٹھارہ سرداروں کے سر کاٹ کر عبدالملک کے پاس بھیجے اور بصرہ میں اپنی قابلیت سے سکون پیدا کر کے حکومت کرنا شروع کی۔

شبیب کا مقابلہ:۔ شبیب نہایت بہادر اور دلیر آدمی تھا جس نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر کے موصل سے خروج کیا اور حجاج ایسے سخت گیر حاکم کے خوف سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ اس کو متواتر چند بار شکست دی حجاج کو مجبور ہو کر عبدالملک سے امداد کی درخواست کرنا پڑی۔

اصل میں شبیب ابن یزید اور صالح ابن مریم نام کے دو خارجی عبدالملک کو ہلاک کرنے کی فکر میں تھے۔ صالح نہایت شیریں البیان تھا اور پہلے شبیب نے اسی کو امیر المومنین بنایا لیکن حجاج کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے صالح میدان جنگ میں مارا گیا اور اس کے بعد شبیب نے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔

شبیب موصل سے نکل کر کوفہ کی طرف بڑھا۔ حجاج بھی اس کے ارادے سے واقف ہو کر کوفہ گیا تاکہ کوفہ کو شبیب کی دستبرد سے محفوظ رکھ سکے۔ شبیب کی بیوی نے منت مانی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا میں کوفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھونگی اور پہلی رکعت میں سورہ بقرہ اور دوسری میں آل عمران پڑھونگی۔

اس منت کو پورا کرنے کے خیال سے شبیب نہایت تیزی سے کوفہ کی طرف آرہا تھا اور حجاج سے پہلے کوفہ پہونچنے کا عزم رکھتا تھا مگر حجاج بھی غافل نہ تھا وہ بھی برق و باد کی تیزی سے چلا اور شبیب سے پہلے ہی کوفہ پہونچ گیا۔

شبیب کو حجاج کے پہونچنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنی ماں اور بیوی کے علاوہ (جو خود بھی دلیر اور جنگجو عورتیں تھیں) ستر بہادر اور نبرد آزما

آدمی ساتھ لئے کر رات کے آخری حصے میں مسجد کوفہ کا رخ کیا اور دلیری کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر مسجد میں پہونچ گیا۔ اس کی بیوی غزالہ نے اطمینان سے صبح کی نماز پڑھی اور جب تک وہ نماز میں مشغول رہی شبیب کی مختصر فوج تلواریں علم کئے اس کی حفاظت کرتی رہی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ اکائی کے ساتھ اپنی جماعت کو لے کر کوفہ سے نکل گیا۔

حجاج پر شبیب کے اس دلیرانہ اقدام کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ مارے ڈر کے کانپنے لگا۔ اور محل میں چھپ گیا۔ دروازے بند کرا لئے اور حفاظت کے لئے پہرہ قائم کر دیا۔ جب معلوم ہوا کہ شبیب واپس ہو گیا اس وقت اس کے حواس قائم ہوئے مگر پھر بھی اس نے کوفہ میں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ بصرہ واپس چلا گیا۔ حجاج پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے شبیب سے تنہا جنگ نہ کی اور تمام واقعات لکھ کر عبدالملک کے پاس دمشق بھیجدیئے، عبدالملک نے ایک زبردست لشکر سفیان ابن ابرد کی سرکردگی میں حجاج کی امداد کے لئے کوفہ بھیجا۔

سفیان کوفہ پہونچ گیا تو حجاج بھی کثیر التعداد جمعیت لے کر بصرہ سے نکلا اور دونوں طرف سے شبیب کو گھیر کر حملہ کیا۔ شبیب نے مخالف کی کثرت سے ذرا بھی خوف نہ کیا اور مرنے مارنے پر تیار ہو کر مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ سخت خونریز لڑائی ہوئی کہ شبیب کی بہادر بیوی بھی اس لڑائی میں ماری گئی اور شبیب شکست کھا کر بھاگ گیا۔

سفیان نے شبیب کا تعاقب کیا اور اہواز میں مکرر شبیب سے مقابلہ ہوا مگر دجیل الاہواز کے پل پر شبیب کا گھوڑا بگڑ گیا اور شبیب زین سے جدا ہو کر پانی میں گر گیا۔ چونکہ وہ سر سے پیر تک لوہے میں غرق تھا اور خود زرہ۔ چار آئینہ وغیرہ کا بوجھ ایسا تھا کہ اس کو ابھرنے دیتا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوب گیا۔ وہ دو مرتبہ پانی پر نمودار ہوا ایک مرتبہ اس نے کہا " اللہ کا حکم درست ہے" دوسری بار اس کے منہ سے نکلا "اللہ کی مشیت پوری ہونی چاہیئے"۔

دریا میں جال ڈال کر شبیب کی لاش نکالی گئی۔ حجاج کے پاس لاش پہونچی تو اس نے شبیب کا دل سینہ چاک کر کے نکالا اور اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھا تو بہت وزنی معلوم ہوا حجاج نے طیش میں آکر اس کو زمین پر پٹک دیا۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر دور جا پڑا۔ حجاج نے دل کو چاک کرایا تو اس کے اندر سے ایک اور لوتھڑا برآمد ہوا۔ جب اس کو چیرا گیا تو جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا نکلا۔

یہ واقعہ ۷۷ھ کا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ کی شہادت کے چار سال بعد کا۔

شبیب کی ماں کو خبر دی گئی کہ تیرا لڑکا مارا گیا تو اس نے یقین نہ کیا جب کہا گیا کہ ڈوب گیا تو اس نے رونا چلانا شروع کیا اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ شبیب کی ولادت کے وقت میں نے خواب دیکھا تھا کہ آگ کا ایک شعلہ میرے سینے سے نکلا اور برجوں کو روشن کرتا ہوا سمندر میں گر کر بجھ گیا اس کو خواب پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے شبیب کے مارے جانے کی خبر پر یقین کیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ شبیب کی ماں بھی اس کی بیوی کے ساتھ لڑائی میں ماری گئی تھی۔ لیکن میں نے متعدد تاریخوں میں یہ واقعہ دیکھا ہے اس لئے قلمبند کر دیا۔

عبدالرحمن بن محمد الاشعث کی مہم:۔ حجاج کو شبیب کے بعد اسی صوبہ میں ایک دوسرا معرکہ پیش آیا اور وہ عبدالرحمن کا مقابلہ ہے۔

عبدالرحمن حجاج کا ماتحت افسر تھا اس کے مقابلے کا حال تاریخوں میں مختلف طور پر لکھا ہے۔ میں ہفت اقلیم اور طبری سے اس جنگ کی کیفیت لکھتا ہوں مگر اختصار کے خیال سے ہفت اقلیم کا میں نے زیادہ اتباع کیا ہے۔

حجاج نے عبدالرحمن کو چالیس ہزار سوار دیکر رتبیل حاکم کابل سے لڑنے کی غرض سے روانہ کیا۔ عبدالرحمن کابل کے بہت سے صوبوں اور شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد سیستان کی طرف لوٹ آیا۔ حجاج کو عبدالرحمن کی واپسی پسند نہ آئی اس نے ایک خشونت آمیز خط لکھا جو عبدالرحمن کو ناگوار ہوا اور وہ مخالفت کا ارادہ مستقل کر کے زبردست فوج لے کر عراق کی جانب چلا حجاج نے بھی اپنے لشکر کی معیت میں اس کا استقبال کیا لیکن شکست کھا کر بصرہ آگیا دوبارہ پھر لشکر مرتب کر کے حجاج نے عبدالرحمن کے مقابل صف آرائی کی مگر اس مرتبہ بھی اس کو ہزیمت ہوئی اور وہ کوفہ چلا گیا۔

بہت سے صحابہ و تابعین نے حجاج کے ظلم سے تنگ آکر عبدالرحمن کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے خلاف آمادہ پیکار ہوگئے۔

اب ایک لاکھ سواروں کی جمیعت جرار کے ساتھ عبدالرحمٰن نے حجاج کے استیصال کا ارادہ کیا لیکن حجاج کے پاس بھی شام سے امدادی فوج آگئی اور وہ بھی سرگرمی کے ساتھ عبدالرحمٰن سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان میں آگیا۔

تقریباً ساڑھے تین ماہ تک سلسلۂ جنگ جاری رہا اور اسی عرصہ میں بارہا عبدالرحمن کی فتح کے آثار نمایاں ہوئے مگر آخر میں حجاج غالب آیا، اور عبدالرحمن سیستان کی طرف بھاگ گیا۔ راستہ میں اس کی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ پریشان ہوکر رتبیل حاکم کابل کے پاس پناہ گزیں ہوا رتبیل نے عبدالرحمن کو چند ہمراہیوں کے ساتھ قید کرکے عمارہ بن تمیم کے پاس بھیجدیا جو حجاج کی طرف سے عبدالرحمن کے تعاقب پر مامور ہوا تھا۔ عبدالرحمن نے حجاج کے دربار میں پہونچنے سے قبل ہی اثنائے راہ میں ایک بلند مقام سے گرکر خودکشی کرلی عمارہ نے اس کا سر کاٹ کر معہ دوسرے قیدیوں کے حجاج کی خدمت میں بھیجدیا۔ حجاج نے فوراً تمام قیدیوں کے قتل کا حکم دیدیا۔

ایک قیدی نے کہا کہ میرا آپ پر ایک حق ہے حجاج نے پوچھا کیا؟ قیدی نے جواب دیا کہ عبدالرحمن ایک مرتبہ آپ کو گالیاں دے رہا تھا میں نے اسے منع کیا تھا۔

حجاج۔ کوئی گواہ رکھتے ہو؟

قیدی۔ فلاں شخص گواہ ہے۔

یہ کہکر اس نے ایک دوسرے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔ حجاج نے اس کو بلاکر دریافت کیا اس نے کہا واقعی یہ ٹھیک کہتا ہے حجاج نے دوسرے قیدی سے کہا کہ تم نے عبدالرحمن کو اس فعل سے کیوں نہ روکا؟

دوسرا قیدی۔ میں آپکو دشمن سمجھتا تھا۔

حجاج نے حکم دیا کہ ایک کو اس احسان کی بدولت جو اس نے مجھ پر کیا تھا رہا کردیا جائے اور دوسرے کو سچ بولنے کے معاوضہ میں چھوڑ دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حجاج ایسے قہار اور ظالم آدمی کے سامنے اتنی جرات اور بیباکی سے سچ سچ کہدینا ایسے ہی صلہ کا مستحق تھا۔

فتح ماوراالنہر۔ ماوراالنہر کی فتح بھی حجاج کے ملکی کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ہے حجاج نے قتیبہ بن مسلم کو امیر خراسان بناکر حکم دیا کہ ماوراالنہر کو فتح کرو۔

قتیبہ نے پہلے تاشکند اور اس کے اطراف کو فتح کیا پھر خاقان کے بھانجے سے جنگ کرکے اس کو شکست دی جو دو لاکھ کی جمیعت سے فرغانہ کے حدود میں اس سے مقابل ہوا تھا اس کے بعد بخارا کو فتح کیا اور خوارزمیوں کو مطیع کرکے سمرقند پر فوج کشی کی۔ آخر میں سمرقند کے حاکم سے ایک ہزار درہم اور تین ہزار غلام سالانہ دینے کا معاہدہ کرکے صلح کی اس طرح سندھ پر بھی اس نے حملہ کیا اور وہاں سے بھی جزیہ لیکر واپس ہوا۔

الواسط کی بنا۔ حجاج سب سے پہلا شخص ہے جس نے خلفائے راشدین کے بعد اسلام میں ایک بہت بڑا شہر آباد کیا۔

حجاج نے دجلہ سے پچیس میل کے فاصلہ پر رود شطالحی کے کنارے "الواسط" نام کا ایک شہر بسایا۔ چونکہ جس جگہ اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی تھی وہ بصرہ اہواز اور بغداد سے پچاس پچاس کوس کے فاصلہ پر واقع تھی اس لئے شہر کا نام الواسط رکھا گیا۔

یہ شہر سنہ ۸۳ھ میں آباد ہوا تھا۔ اور اپنے بے چھت کے قیدخانے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ شہر اب بھی موجود ہے مگر اس کی آبادی اتنی وسیع اور مردم شماری وہ نہیں ہے جو حجاج کے زمانہ میں تھی۔

الواسط کے اس جگہ آباد ہونے کی تاریخ طبری میں یہ وجہ لکھی ہے کہ اب جہاں واسط آباد ہے وہاں سے حجاج گذر رہا تھا اور کچھ لوگ عمدہ قیام گاہ کی تلاش میں آگے روانہ ہوگئے تھے۔ ایک راہب گدھے پر سوار ادھر سے نکلا۔ اتفاقاً گدھے نے وہاں پیشاب کردیا۔ راہب نے اتر کر وہ مٹی کھودی اور دریا میں ڈالدی جو گدھے کے پیشاب سے تر ہوئی تھی۔ حجاج نے راہب سے پوچھا کہ تم نے یہ مٹی کھود کر دریا میں کیوں ڈالدی؟ راہب نے جواب دیا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ یہاں ایک زبردست عبادتکدہ بنے گا جس میں اس وقت تک خدا کی عبادت کی جائے گی جب تک دنیا میں ایک موحد بھی باقی رہے گا۔ حجاج نے وہیں الواسط کی بنیاد قائم کردی اور جس جگہ گدھے نے پیشاب کیا تھا عظیم الشان جامع مسجد تیار کرائی۔

جس جگہ شہر بسایا گیا ہے یہ ایک پارسی زمیندار کی ملکیت تھی۔ جب اس کو حجاج کا ارادہ معلوم ہوا اور اس سے زمین کی خریداری کے متعلق گفت و شنید ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ زمین خراب اور کھوکھلی ہے یہاں مضبوط عمارت نہ بن سکیگی۔ گرمی اتنی سخت ہوتی ہے کہ لو کی حدت سے اڑتے ہوئے پرند

گر کر مرجاتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کی عمریں بھی کم ہوتی ہیں۔

حجاج کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے کہا کہ اس شخص کو ہمارا قریب رہنا ناپسند ہے اس کو اطمینان دلاؤ کہ ہم وہاں نہریں جاری کرینگے۔ عمدہ عمدہ عمارتیں بنائینگے۔ زراعت کو ترقی دینگے اور تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کرینگے زمین خراب ہے تو ہم مکانوں کی بنیادیں مضبوط بنائینگے اور خوب بھرا دینگے گرمی سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ رہا عمر کا معاملہ تو عمر کا گھٹانا اور بڑھانا خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی جو عمر مقرر ہو چکی ہے اس میں کمی و بیشی ممکن نہیں ہے۔

بہرحال زمین خرید لی گئی اور ۸۳ھ میں کام شروع ہو کر ۸۶ھ میں مکمل ہو گیا۔ اس شہر کی تعمیر میں نوے لاکھ درہم صرف ہوئے تھے۔

حجاج نے الواسط میں اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں۔ باغات لگائے بڑے بڑے اور وسیع بازار لگائے۔ اسی شہر میں اس کا وہ مشہور قیدخانہ بھی تعمیر ہوا جس میں تینتیس ہزار سیاسی قیدی رہتے تھے۔ یہ قیدخانہ غیر مسقف تھا اور قیدیوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کا اس میں کوئی انتظام نہ تھا۔ مشرعۃ الفیل نام کا ایک گھاٹ بھی اسی شہر میں تھا جس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس گھاٹ پر حجاج بن یوسف کے داماد محمد بن قاسم فاتح سندھ کا بھیجا ہوا ہاتھی جہاز سے اتارا گیا تھا۔

واسط میں اجناس کے نرخ نہایت ارزاں تھے اس وجہ سے وہاں کے باشندے بہت آسودہ اور مرفہ حال تھے۔ اسی شہر میں مکھن کا ایک گھڑا ایک درہم کو مل جاتا تھا اسی طرح بارہ مرغیوں کی قیمت ایک درہم تھی دوسری ضروری چیزوں کے نرخ اس نقشہ سے واضح ہونگے

نام جنس	تعداد	قیمت
چوزے	۲۴ عدد	ایک درہم
گھی	چھ سیر	"
روٹی	۲۰ سیر	"
دودھ	۱۵ سیر	"
مچھلی	۱۰۰ سیر	"

سعید بن جبیر کا قتل

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ ابن عباس اور ابن عمر کے شاگرد رشید تھے اور اولیاء اللہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا حجاج نے عبدالرحمن کی سازش کے الزام میں ان کو قتل کرا دیا اس وقت سے حجاج کے حواس میں فتور آ گیا تھا۔ اگرچہ بعض مورخین نے حضرت سعید کے دامن کو اس سازش کے دھبہ سے پاک قرار دیا ہے۔ لیکن طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عبدالرحمن کے شریک تھے اور میری دانست میں جب کہ اور بھی صحابہ نے عبدالرحمن کو اپنی شرکت سے تقویت پہونچائی تھی تو حضرت سعید کا بھی اس شریک جنگ ہو جانا مستبعد نہیں ہے۔

طبری لکھتا ہے کہ عبدالرحمن شکست کھا کر رتبیل کے پاس چلا گیا تھا اور حضرت سعید نے اصفہان کو جائے پناہ بنا لیا تھا۔ حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے امیر اصفہان کو لکھا کہ سعید کو گرفتار کر کے بھیجا جائے مگر سعید کو بھی کسی طرح خبر ہو گئی اور وہ آذربائجان چلے گئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے مکہ آ گئے۔

جب ولید بن عبدالملک کے دربار سے خالد بن عبداللہ قریشی مکہ کی امارت پر مامور ہوا تو مکہ کے بعض لوگوں نے سعید سے کہا کہ خالد حاکم ہو کر آ رہا ہے اور وہ کچھ اچھا آدمی نہیں ہے ہمیں آپ کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ آپ پر دست درازی نہ کرے بہتر یہ ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیے۔

سعید نے کہا کہ میں اس قدر بھاگا پھرا ہوں کہ اب مجھے خداوند عالم سے شرم آتی ہے کہ مجھے کب تک زندہ رکھے گا۔

حجاج کو اطلاع ہوئی کہ باغیوں میں سے کچھ لوگ مکہ میں موجود ہیں حجاج نے ولید کو لکھا کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے ان کے بارے میں اختیار دیدیا جائے تاکہ میں جو چاہوں ان کے حق میں حکم دیدوں۔

ولید نے خالد امیر مکہ کو ان لوگوں کی گرفتاری کا حکم دیکر لکھا کہ حجاج کے پاس پکڑ کر بھیجدیئے جائیں۔ ان گرفتاران بلا میں سعید بن جبیر بھی تھے بعض لوگ تو راستہ ہی میں مر گئے لیکن مجاہد اور سعید زندہ حجاج کے سامنے پیش کئے گئے۔

حجاج نے سعید کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب آپ کا سر بدن سے جدا ہوا تو تین مرتبہ "الہ الا اللہ" زبان سے نکلا۔ حجاج نے یہ ماجرا دیکھ کر کہا کہ لعنت ہو اس ترسا زادے (امیر مکہ) پر کہ اس نے ایسے آدمی کو میرے پاس بھیجا واللہ اگر وہ مکہ میں رہتا تو میں معاف کر دیتا۔

حجاج سعید بن جبیر کے بعد چالیس روز زندہ رہا روزانہ رات کو خواب میں دیکھتا تھا کہ سعید دامن پکڑ کر کہتے ہیں "یا عدو اللہ قتلتنی"۔

یہ واقعہ بروایت طبری ۹۴ھ میں ہوا۔

مخترعات حجاج۔ حجاج پہلا شخص ہے جس نے دنیار و درہم پر کلمۂ توحید نقش کرایا اسی نے خلفائے راشدین کے بعد پہلا شہر اسلام میں بسایا محمل بھی حجاج ہی کی ایجاد ہے جیل بے چھت کا قید خانہ بھی سب سے پہلے اسی نے بنوایا بہت قدیم مصنف لکھتا ہے،

"محمل و زندان بے سقف از جملہ مخترعات خوم اوست۔"

چونکہ عام طور پر اسلامی مورخ حجاج کی نسبت اچھے خیال نہیں رکھتے اس لئے وہ فرط غضب میں اس کے ہر اچھے بُرے فعل کو بے سوچے سمجھے قابل نفرت و مذمت قرار دیتے حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک بُرا شخص کبھی کوئی اچھا کام ہی نہ کرے۔ درہم و دینار پر کلمہ توحید کا نقش کرانا ایسا نہیں ہے جس کو حجاج کے ظالمانہ افعال کے مقابلہ میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو اسی طرح محمل کی ایجاد ایسی نہیں جس کو حجاج کے اچھے کارناموں کی فہرست میں عنوان نہ بناکر نہ لکھا جائے۔

ہندوسندھ کی فتح بھی حجاج کا بہترین کارنامہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سندھ میں ایک مسلمان عورت کو پکڑ لیا گیا اس نے گرفتار ہوتے وقت کہا۔ "یا حجاج!" حجاج کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ستر لاکھ کی خطیر رقم خرچ کرکے سندھ پر لشکر کشی کی اور اس عورت کو قید بلا سے نجات دی نیز ہندوسندھ کو فتح کرکے خدائے واحد و قدوس کی آواز وہاں کے باشندوں کے کانوں میں پہونچائی حجاج نے واسط سے قزوین تک بلند ٹیلوں پر یہ انتظام کیا تھا کہ واسط میں دن کو آگ جلائی جائے تو قزوین تک تمام ٹیلوں پر روشنی ہو جائے اور رات کو یہاں روشنی ہو تو وہاں تک دھواں کا سلسلہ قائم ہو جائے اور اس طرح ایک دن میں وہاں کی خبر یہاں پہونچ جائے۔

حجاج کی موت:۔ ۱۰ رمضان ۹۵ھ کو حجاج بھی تیر قضا کا نشانہ بنا حجاج نے مرض الموت میں منجم کو بلاکر دریافت کیا کہ اس سال کوئی بڑا سردار مریگا۔ منجم نے حساب لگاکر کہا ایک حاکم جس کا لقب "کلیب" ہے عنقریب مرنیوالا ہے۔ حجاج بولا واللہ بچپن میں میری ماں اسی نام سے مجھکو پکارتی تھی۔ منجم کہنے لگا: "والله انت تموت"۔ خدا کی قسم تو ہی مرنے والا ہے؟ حجاج نے کہا خیر میں تو مر ہی رہا ہوں مگر تجھے بھی روانہ کئے دیتا ہوں۔ یہ کہکر منجم کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حجاج جس وقت مرا ہے اس کی عمر ۵۴ سال کی تھی اس نے بیس سال عراق و خراسان پر حکومت کی اور آخر تک وہ امیر عراق رہا۔

حضرت سعید کو قتل کرانے کے بعد حجاج کے دل میں خوف آگیا تھا اور ہر وقت کہا کرتا کہ مالی ولسعید وغیرہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار آدمی قتل کئے ہیں ان میں وہ شامل نہیں جو میدان جنگ میں مارے گئے۔

حجاج جس وقت مرا ہے پچاس ہزار قیدی اس کی قید میں تھے اس قدر لکھ چکنے کے بعد حجاج کے اخلاق و عادات کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے کیونکہ اس کا سب سے نمایاں وصف قتل و خونریزی تھا تاہم یہ ظاہر کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ تفریح اور کھیل تماشے کا بہت شائق تھا اور ان مشاغل میں کافی روپیہ صرف کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عرب نے جو حجاج کو پہچانتا نہ تھا کہا کہ حجاج بڑا ظالم ہے حجاج نے کہا تم مجھکو پہچانتے ہو عرب نے جواب دیا نہیں حجاج بولا میں ہی حجاج ہوں عرب نے کہا ممکن ہے آپ ہی ہوں مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اسی بیوقوف خاندان زبیر سے ہوں حجاج اس کی اس لطیفہ سنجی پر ہنسا اور اس کو انعام دیا۔ حجاج خواہ کتنا ہی ظالم تھا مگر اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت اچھا حاکم اور مدبر تھا اس نے عراق میں بڑی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ سے حکومت کی عبدالرحمن کی بغاوت کے بعد عراق میں کوئی شورش رونما نہ ہوئی اور کوفہ کے باشندے بھی باوجودیکہ نہایت متلون المزاج تھے اس کے سچے دل سے مطیع و فرمانبردار ہوگئے اور یہ اس کی سیاسی قابلیت، استقلال اور تدبیر ملکی کی بہترین مثال ہے۔

حجاج کو مذہب سے بالکل بیگانہ خیال نہ کرنا چاہیئے اس کو مذہب کا فی خوش اعتقادی تھی چنانچہ ایک واقعہ اس سلسلہ میں درج کیا جاتا ہے۔

واسط کی تکمیل کے بعد حجاج جب اپنے قصر میں آکر کچھ دن بہت آرام و مسرت سے بسر ہوئے مگر اس کی بیوی پر جن کا سایہ ہو گیا۔ حجاج کو اس بیوی سے بہت محبت تھی اس لئے وہ سخت پریشان ہوا۔ اسی پریشانی میں اس نے کوفہ سے عبداللہ ابن ہلال کو بلایا جو آسیب وغیرہ کے دفع کرنے میں مشہور تھا عبداللہ نے اپنے عمل سے حجاج کی محبوب بیوی کو تندرست کر دیا مگر حجاج کو یہ خوف تھا کہ مکان میں کہیں جن نہ آجائے عبداللہ نے اس کا انتظام کیا کہ تین دن کے بعد ایک گولہ منگایا جس میں ایک کڑا لگا ہوا تھا اور جس پر مہر لگی ہوئی تھی عبداللہ نے قصر کھولنے کو کہا تاکہ اس کے وسط میں جادو کا گولہ گاڑ دیا جائے حجاج نے دریافت کیا کہ آخر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس گولہ میں کوئی اثر بھی ہے۔ عبداللہ نے کہا آپ مضبوط سے مضبوط آدمی کو بلاکر گولا اٹھانے کا حکم دیجیے اگر گولہ اس کی قوت سے اٹھ جائے تو بیکار ہے ورنہ اس کا اثر تسلیم کر لیا جائے۔ آدمی آئے اور انھوں نے بہت زور کیا مگر گولہ اپنی جگہ سے نہ ہلا حجاج نے متعجب ہوکر اپنے ہاتھ کی لکڑی کو گولہ کے کڑے میں ڈالکر "بسم اللہ الرحمن الرحیم، ان ربکم الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش" پڑھا اور گولہ کو ایک جو وزن چیز کی طرح اٹھالیا پھر زمین پر ڈالکر کچھ سوچا اور عبداللہ سے کہا کہ اپنا گولہ لیجاؤ مجھے اس کی ضرورت نہیں اگر تمہارے کسی نے صحیح بچھوکر گولہ نکالا تو تجھ پر لعنت کرکے کہیگا کہ محض جادو ٹونے کے زور سے مہمات میں کامیابی حاصل کیا کرتا تھا۔

اس واقعہ سے حجاج کی مذہبیت اور اس کی راسخ الاعتقادی پر کافی روشنی

امیر و غریب کا مکالمہ

از علامہ امجد حیدر آبادی

(۱) پہلا سوال امیر کا غریب سے

دُنیا میں یہ بدنصیب، جیتے کیوں ہیں؟
مردودِ درِ حبیب، جیتے کیوں ہیں؟
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں، غریب جیتے کیوں ہیں؟

(۲) دوسرا سوال غریب کا امیر سے

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں؟
سر چڑھ کے زمین میں اُترتے کیوں ہیں؟
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں
معلوم نہیں، امیر، مرتے کیوں ہیں؟

نانی اماں

از مسٹر حسن عزیز صاحب، جاوید!

(۱)

بیس برس کے بعد نانی اماں شہر میں آئی ہیں۔ بہت ضعیف ہو گئی ہیں غدر کے وقت ان کی عمر تین برس کی تھی ان کے سر کے بالوں کی لٹیں ایسی سفید ہو گئی ہیں جیسے مینی حلوائی کی دکان پر سفید بڑھیا کے بال ملتے ہیں۔ جسم کا چمڑہ لٹک گیا ہے۔ چہرہ پر جا بجا جھریاں پڑ گئی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جب میں سو برس کی ہو جاؤں گی تو میرے دانت پھر سے نکلیں گے۔ پان کا بڑا شوق ہے لیکن پان کوٹنی میں کوٹ کر کھاتی ہیں۔ جس طرح کسی کے ساتھ حقہ چلتا ہے ان کے ہمراہ پان کوٹنی ضرور چلتی ہے۔ ہاتھوں میں قدرے رعشہ ہے۔ آواز بھی گرجدار ہے۔ بینائی اچھی ہے لیکن جب بخیہ اور سوزن کاری کرتی ہیں تو اپنا موٹے موٹے کانچ کا چشمہ لگا لیتی ہیں جس کا فریم لوہے کا ہے اور جسے نانی اماں کہتی ہیں کہ یہ پتھر کا چشمہ ہے۔ وہ اب تک بہت خوب سیتی ہیں۔ لیکن سوئی کے ناکے میں ڈورا نہیں ڈال سکتیں۔ نانی اماں کے کان چاندی کے موٹے موٹے چھ بالیوں سے بالکل گر سے پڑتے ہیں۔

کل جب وہ ماڑی جنکشن پر اتریں تو قلی کے سر پر پاندان بیداری کی گٹھڑی کا صندوق رکھا یا جس میں نانی اماں نے اپنی دلائی اور دری بھی اس لئے ٹھونس ٹھونس کر بھر دی تھی کہ باہر علیحدہ رکھنے سے مبادا گم ہو جائے جب قلی جلد ہی چلنے لگا تو نانی اماں نے اسے پکارا لیکن اس نے نہ سنا تو نانی اماں دوڑیں اور جھپٹ کر اپنا دوپٹہ قلی کی گردن میں ڈال کر گھوڑے کی باگ ڈور کی طرح دونوں پلو پکڑ لئے اور زور سے پکڑ کر کہنے لگیں۔ "موئے اب کہاں بھاگے گا؟ تیرا سامان ہضم کرنے کا ارادہ ہے؟" قلی نے ہر چند چھڑانا چاہا مگر نانی اماں نے کہا "دیکھ بھائی ایک آدھ آنہ زیادہ لے لینا سیدھی طرح سے چل کر گاڑی میں بٹھا دے۔ بڑھیا سمجھ کر لوٹ سامان ہضم کرنے کی نیت مت کر، میں تجھے بستر آبھاؤں گی" قلی نے اپنی رفتار دھیمی نہیں کی کیونکہ اسے اور کئی آدمیوں کا سامان پہنچانا تھا۔ نانی اماں بھی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی پل پر چڑھنے لگیں۔ ان کی زیر پائیاں بار بار سیڑھیوں سے پھسل جاتی تھیں۔ مگر نانی اماں انہیں جوں توں پہنکر قلی کی باگ ڈور تھامے ہی رہتی تھیں۔ جب پل پر ٹکٹ کلکٹروں نے تماشہ دیکھا تو خوب ہنسے، کئی آدمی نانی اماں کے پیچھے لگ گئے کسی نے کہا اماں اسے چھوڑ دو۔ انگریزی راج ہے وہ کہاں بھاگ جائیگا۔ مگر نانی اماں نے کسی کی نہ سنی اور کہنے لگیں۔ "لوگو! کیا میں سٹرن ہوں کیوں تماشہ کرتے ہو۔ مجھے قلی چل دیے گا میں تمہارا کیا کر لوں گی" لوگ تھے کہ ہنسے چلے جاتے تھے اور نانی اماں قلی کی باگ ڈور تھامے ہوئے دوڑ رہی تھیں۔ ہانپ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے قلی ڈبے کے پاس پہونچا جب کہیں نانی اماں نے دوپٹے سے اس کی گردن آزاد کی۔ لیکن قلی بھی ایسا مسخرہ تھا کہ وہ نانی اماں کے چھیڑنے کو بھاگتا جاتا تھا اور دوپٹے میں گردن کسنے کسنے پر اس کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا۔

(۲)

نانی اماں نے تسبیح پڑھتے پڑھتے کہا —— "زاہدہ! آج تاج محل دیکھ آئیں۔ بیس برس ہوئے جب ہم نے دیکھا تھا۔ یہ روضہ اس بی بی کی یادگار ہے جس کے میاں نے اس مرنے والی کی محبت میں تیس برس اس کی تعمیر میں گذار دئیے۔ آہا! کیسے لوگ تھے وہ اور کیسی تھی ان کی محبت۔ اب تو وہ عالم ہے کہ آج بیوی کو سات من مٹی تلے دبا آئے اور کل سے دوسری کا فکر ہونے لگا" زاہدہ نے کہا —— "نانی اماں آج ایک زنانہ جلسہ ہے۔ شہر بھر کی اور بیرونجات کی خواتین جمع ہونگی۔ کل دیر رکھئے۔ کل چلینگے۔ آج میں اس جلسے میں شریک ہونگی۔ کل آپ صبح سویرے چلئے گا۔"

نانی اماں بولیں —— خیر بھائی کل چلیں گے۔ جیسی تیری مرضی!

تو صبح سویرے کب اٹھتے ہے۔ تو تو آٹھ بجے بیدار ہوتے ہے۔ گھر کا یہی رنگ دیکھتی ہوں وہ امین ہے بیچارا۔ بوڑھا ہو گیا ہے۔ جو ادھر موذن نے صبح کی بانگ دی اور ادھر اس نے اٹھ کر وضو کیا۔ اور مسجد چلا گیا۔ یا تیری ماں اٹھ جاتی ہے۔ باقی تم لڑکا لڑکی آٹھ بجے کے قبل کیا بیدار ہوتے ہو شیطان تلوے سہلاتا ہے۔ نیند نہ آئے تو کیا ہو۔ تم لوگوں کو امین کچھ نہیں کہتا۔؟"

زاہدہ نے جھینپ کر کہا —— "نہیں نانی اماں وہ جب دیکھ لیتے ہیں ڈانٹتے ہیں بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے انہیں تاکید کی تھی کہ صبح اٹھنا چاہئے کیا ہوا تھا نانی اماں آپ نے کیسے تاکید کی تھی۔

نانی اماں مسکرانے لگیں پھر کہا —— "کچھ نہیں۔ امین تیری ماں کو لینے گیا تھا۔ وہ رات جب سویا تو صبح سورج نکلے بیدار ہوا۔ میں نے کہا امین کیا تو چاہتا ہے کہ ہم بھیک مانگنے لگیں اور ہمارا رزق ہماری روزی گھٹ جائے؟ تو امین نے گھبرا کر پوچھا کیا خالہ جان میں نے کیا کیا۔ تب میں نے کہا تو ہمارے گھر میں سورج نکلے تک نہ سویا کر بھائی۔ جہاں سورج نکلنے تک کوئی بندہ سوتا ہے تو جبرائیل فرشتہ وہاں سے ناراض ہو کر چلا جاتا ہے جو رازق العباد ہے امین اس دن بہت خفیف ہوا اور پھر میرے دیکھتے کبھی سورج نکلے تک نہ سویا۔ آہ ہاں زاہدہ تیرے ساتھ میں بھی جلسے میں چلوں؟ مگر میری پن کوٹنی اور باریک چھالیہ کے ڈبے پٹارہ تیرے پان ضرور ہمراہ رکھ لیجو تیری ماں بھی چلیگی؟"

زاہدہ نے ہنس کر کہا —— "چلئے پان پن کوٹنی سب رکھ لونگی۔ امی جان نہیں جائینگی۔"

نانی اماں نے کہا —— "تہیں تو میں اب نہیں جانے کی بھائی جب بیٹی نہیں جائیگی تو میں ماں بوڑھیا کیا جاؤں زمانہ مجھے ٹوکیگا۔"

زاہدہ کہنے لگی —— "نہیں نانی اماں اس میں کوئی حرج نہیں آپ ضرور چلئے۔"

—— (۱۳) ——

ایک نازنین نے ہارمونیم بجاتے ہوئے سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ سریلی آواز سے گانا شروع کیا۔

نانی اماں نے دھیرے سے کہا —— "زاہدہ یہ کون لکڑی ہوتی ہے۔ باجا بجا کر گا رہی ہے۔"

زاہدہ نے نانی اماں کے کان میں کہا —— "نانی اماں جلسوں کا افتتاح گانے سے ہوتا ہے۔ وہ نواب اکرم کی بیٹی ہے۔ بی۔ اے تک انگریزی پڑھی ہے اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

نانی اماں بولیں —— "نوج ایسی بہو بیٹیوں پر جو کسبیوں کی طرح باجا بجا کر سر جلسے گائیں۔ اور پھر ابھی شادی نہیں ہوئی ہے لگتے بیاہ کہیں گے میراثن کہیں گے۔ کوئی بر نہیں ملے گا۔"

زاہدہ ہنس کر کہنے لگی —— "نہیں نانی اماں اس کے تو بہت پیام آئے ہیں آج کل کے مرد گانا نہ جاننے والی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہتے۔"

نانی اماں نے ناک پر انگلی رکھ لی اور حیرت و استعجاب سے اس کا کانا سننے لگیں اور دھیرے دھیرے اللہ توبہ ہے، استغفر اللہ۔ اللہ شیطان سے پناہ میں رکھیو۔ پڑھنے لگیں۔ نانی اماں اس گانے والی لڑکی کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھور رہی تھیں اگر ان کا بس چلے تو بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو بانٹ دیں۔

پھر عفت آرا نے کھڑے ہو کر آزادی نسواں پر تقریر شروع کی۔ مردوں کے ظلم عورتوں کی حق تلفیاں گنانے لگیں۔

نانی اماں نے زاہدہ کو دھیرے سے کہا —— "اے ہے زاہدہ! یہ مرد عورتوں کے جلسے میں تقریر کر رہا ہے کیا یہی نیا فیشن ہے تم لوگوں کا؟"

زاہدہ نے مسکرا کر کہا —— "نانی اماں کیسی باتیں کرتی ہو۔ کہاں کا مرد وہ تو عفت آرا بیگم ہیں۔"

نانی اماں کہنے لگیں —— "اے بی! یہ کیسی عفت آرا بیگم ہیں؟ انکے سر پر بال تو ہیں ہی نہیں۔ مردوں کی طرح تو ان کے بال ہیں۔"

زاہدہ نے ہنس کر کہا —— "نانی اماں آج کل عورتیں اتنے ہی بال رکھنے لگی ہیں۔ وہ کہتی ہیں زبردستی کا جنجال ہے۔ سر پر ایک بوجھ سا لگا رہتا ہے۔ پھر جوں رہنے لگتی ہے۔"

نانی اماں نے تعجب سے کہا —— "ہائے لوگوں کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے وقتوں میں جس عورت کا غصہ کرنا ہوتا تھا اس کے بال تو شاد دیکھتے تھے بڑی بوڑھیاں کوسنے دیتی تھیں کہ خدا کرے تو گیسو بریدہ ہو جائے مرد عورتوں کو ڈراتے تو کہتے ٹھہر جا مردار، ناک چوٹی کاٹ کر منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر شہر بدر کر دونگا۔ عورت اپنے بالوں کے سبب کالے سر والی کہلاتی تھی۔ جتنے لمبے بال ہوتے تھے اتنی عورت حسین سمجھی جاتی تھی اور شاعر کے طرز پر زلف بنگالہ کہتے تھے۔ واہ بی عفت آرا ہوا منڈا سر، جس کا کان پر ایک بال تک نہیں۔

ناک میں ننھی بلاق نہیں تو ایک کیل ہی ہوتی! اجڑ کٹی کیسی ہے۔ ہاتھ کیسے ہائے جیسے ہوئی رنڈی نوچ رہی ہو۔ بڑے عیب کی بات ہے"۔

زاہدہ دل ہی دل میں کٹی جاتی تھی کہ ہماد! کوئی پاس والی نہ سن پائیں ورنہ اس کی بڑی سبکی ہوگی۔

عفت آرا کی تقریر ختم ہونے کے بعد جب حمیدہ خاتون کھڑی ہوئیں تو نانی اماں کے تن بدن میں آگ لگ گئی انھوں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں میچ لیں اور گویا ہوئیں —— "لے زاہدہ! بس کر بھئی ٹانگ منگا گھر چلیں گے میں بھی کہاں آن پھنسی، دیکھو تو ننگی مادر زاد کھڑی ہے اتنے بھرے مجمع میں اس کے دیدے کو شرم نہیں ہے"۔

زاہدہ نے کہا —— "نانی اماں ننگی مادر زاد تو نہیں ہے۔ اچھا خاصہ فراک پہنے ہے۔ تم ذری عینک لگا لو"۔

نانی اماں نے اب آنکھیں کھول دیں اور بغور دیکھ کر کہنے لگیں —— "ارے واہ اچھا تیرا فراک ہے بی —— بغل تک شانے عریاں ہیں رانوں تک بالکل جالی سایہ ہے لال لال رانیں بالکل ننگی ہیں۔ عورت کا ستر ٹخنوں تک ہے کہ نہیں؟"

زاہدہ مسکرا کر بولی —— نانی اماں رانیں برہنہ نہیں ہیں۔ وہ موزے ہیں ریشمیں لیکن بالکل جلد کی رنگت کے جو دور سے دیکھنے میں ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسے انسانی بدن"۔

نانی اماں نے جل کر کہا —— "خاک پڑ جائے ایسے پہننے پر یہ بھی کوئی گناہ ہے"

زاہدہ چپ رہ گئی۔

ایک گھنٹہ کے بعد جب جلسہ برخواست ہوا اور زاہدہ کی شناساؤں سے مل جل لیں تو زاہدہ اور نانی اماں اپنے ٹانگہ پر سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئیں راستہ میں نانی اماں نے پان کو تا۔ منہ میں دبایا اور پھر کہنے لگیں۔ "تیرے پاس بیٹھی کلائیوں میں گھڑی باندھے اونچی ایڑی کا جوتہ پہنے اور باریک ساری پہنے تھیں وہ ہندو ہیں نا؟"

زاہدہ نے ہنس کر کہا —— "نہیں نانی اماں وہ مسلمان ہیں"۔

نانی اماں نے کہا۔ "اے ہے مسلمان اور ساری؟ اچھا ان کے کپڑے کس عطر میں بسے تھے؟ وہ نہ موتیا سا اچھا تھا، نہ حنا، نہ خس۔ نہ گلاب، نہ کیوڑہ میں بہت دیر سے اس سوچ میں ہوں کہ آخر کون سا عطر تھا؟"

زاہدہ کہنے لگی —— نانی اماں وہ لونڈر انگریزی عطر تھا۔

نانی اماں نے کہا —— "اچھا ان کا مقصد کیا تھا؟ یہ سب بکنے والیاں کیا بک رہی تھیں؟"

زاہدہ بولی —— وہ کہتی تھیں کہ ہمیں آزادی دو تم نے ہمیں قیدی بنا لیا ہے ہم اب قید میں نہیں رہنے کے۔

نانی اماں نے کہا —— اوئی اللہ، تو کیا وہ باہر پھرنا چاہتی ہیں؟ کیا مردوں کو دبا کر رکھنا چاہتی ہیں؟ بی اگلے وقتوں سے تو چلا آتا ہے کہ مرد باہر پھرے۔ گھر کی رانی گھر کو رونق دے۔ بچے پالے۔ مرد کے لئے کھانے رینے جھے اس کے آرام و راحت کا خیال رکھے بس اتنا تو عورت کا کام ہے۔

زاہدہ نے کہا —— "مگر آج کل کلکتہ کے اسٹیشن پر عورتیں مردوں کو ٹکٹ فروخت کرتی ہیں۔ دفتروں میں ٹائپ رائٹر جو ایک لکھنے کی مشین ہے اس پر کام کرتی ہیں۔ گیند کھیلتی ہیں، تیرتی ہیں، دوڑتی ہیں۔ موٹر چلاتی ہیں سنا کھیتی ہیں، حجامت بناتی ہیں......"

نانی اماں نے کہا —— "یا اللہ توبہ ہے، حجامت بھی بنانے لگیں"۔

زاہدہ نے کہا —— "جی حجامت بنانے، بال سنوارنے کی دکانیں عورتیں چلا رہی ہیں۔ اچھی اچھی لکھی پڑھی"۔

——(۴)——

نانی اماں نماز سے فارغ ہوئیں تو زاہدہ کی ماں سے کہنے لگیں —— "نوشابہ! میں بہت دن سے غور کر رہی ہوں کہ تجھ سے پوچھوں مگر کمبخت یاد نہیں رہتا ہے وہ تیرے یہاں حمیدا نام کی پنہاری آتی تھی نظر نہیں آتی کیا مر گئی؟"

نوشابہ نے جواب دیا —— "امی جان خدا خبر وہ بیچاری کہاں چلی گئی۔ مدت سے اس کا پتہ نہیں لگتا"۔

نانی اماں نے پوچھا۔ "کیا اسے چھڑا دیا تھا؟ آج کل کون پنہاری آتی ہے؟"

نوشابہ نے کہا: "آج کل کوئی نہیں آتی۔ آٹا کل سے پس کر آتا ہے"۔

نانی اماں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا —— "اے صاحب آٹا بھی کل سے پسنے لگا۔ بیچاری غریب دکھیاری عورتیں چکی پیس کر اپنا پیٹ پالتی تھیں وہ بھی گیا۔ سقوں کا بیوپار تو ہمارے سامنے ہی مٹ گیا تھا۔ پانی کے نل لگ گئے تھے اب پنہاریوں کا بھی گیا۔ دیکھیں ہم جیتے ہیں کہ نہیں جب یہ فرنگی ایسی کوئی کل نکالیں گے جو کھانا بھی پکا دیا کرے۔ بس پھر عورتوں کو جلسے کرنے کی فرصت مل جائے......"

نوشابہ نے کہا ــــ "وہ بجلی نکل گئی ہے امی جان! صفیہ نے انجیا لیں تو کیسا ہے کہ کھانا پکانے۔ جوتوں پہ پالش کرنے۔ جھاڑو دینے۔ برتن مانجھنے مسالہ پیسنے۔ کپڑے دھونے اور خدا جانے کیا کیا کام کرنے کی بجلی کی کلیں نکل گئی ہیں۔

نانی اماں کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ اتنے میں آسمان کی سمت بڑا شور دھوں سنائی دیا۔ وہ اوپر دیکھنے لگیں۔ زاہدہ، منصور، ممتاز، انور سب باہر صحن میں نکل کر دیکھنے لگے۔

انور نے کہا ــــ "نانی اماں! یہ پرندہ کتنا بڑا ہے کیسا شور و غل کرتا ہے کیسا بھاگ رہا ہے۔ دیکھے ہو کبھی؟"

نانی اماں نے کہا ــــ "اے ہاں بھیا، بڑی بھیانک آواز ہے اتنی عمر آئی میں نے تو نہیں دیکھا"

زاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "نہیں نانی اماں یہ انور آپ سے ہنسی کرتا ہے۔ یہ پرندہ نہیں ہے، ہوائی جہاز ہے۔ اس میں آدمی بیٹھ کر اڑتے ہیں"

نانی اماں اسے دیکھتے دیکھتے بولیں ــــ "اررر، یہی ہے ہوائی جہاز۔ ہمارے گاؤں کے اکثر لوگ کہتے تھے کہ ہوائی جہاز نکل آیا ہے لو بھئی آج میں نے وہ بھی دیکھ لیا۔ اور ہاں کہتے ہیں کوئی باجہ ایسا نکلا ہے جس میں آواز بھری رہتی ہے۔ بعینہ جیسے آدمی کی آواز۔"

ممتاز اور منصور نانی اماں کی باتوں سے بہت محظوظ ہو رہے تھے انہوں نے انور کو اشارہ کیا جو بیرونی نشست گاہ سے گراموفون اٹھا لایا اور نانی اماں کو مختلف ریکارڈ سنائے۔

(۵)

نانی اماں نے اپنے داماد سے کہا ــــ "امین!"

محمد امین صاحب کہنے لگے ــــ "خالہ جان!"

نانی اماں نے کہا ــــ "تجھے کچہری عدالت سے کب فرصت ملے گی کسی دن تو دو گھڑی میرے پاس بیٹھ لے"

محمد امین صاحب نے کہا ــــ "بہت اچھا لیجئے آج اتوار ہے کلب نہیں جانے کا۔ آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوں"

نانی اماں نے کہا ــــ "بھئی زاہدہ کی رخصتی کے کے رہ نادر! آتی ہیں۔ مجھے اب گھر جانا ہے بابا۔ تیری بجلی کی روشنی میں اب بہت رہ لی۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا بھی خوب کھالی"

محمد امین بولے ــــ "خالہ جان اب کیا ہے۔ میں [illegible] ہے میری تو تمنا ہے کہ اب آپ یہیں رہئے"

نانی اماں کہنے لگیں ــــ "نہیں بیٹا میرا سب کا سب [illegible] گاؤں میں دے آئی ہوں بیچارے خود بوتے ہیں کاٹتے ہیں۔ اٹھاتے ہیں اور اناج [illegible] دیتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بھئی مجھے اپنے مٹی کے گھر کی روشنی میں آزادی کے سانس لینے اچھے لگتے ہیں"

محمد امین کہنے لگے ــــ "کس کے واسطے کر رہی ہو۔ اب آرام سے بیٹھ کر روٹیاں کھاؤ اور اللہ اللہ کرو۔"

نانی اماں نے کہا ــــ "ابھی بارہ سو روپیہ لا کر بیٹی کو دیئے ہیں۔ کیوں کیا نوشابہ نے تجھے نہیں بتایا۔ گھر ہے، باڑی ہے۔ کھیت ہیں مٹھی اور بڑی کا باغیچہ ہے وہ سب ہیں منصور کو دونگی"

ممتاز کہنے لگا ــــ "اور نانی اماں ہم؟"

انور بولا ــــ "اور ہمیں؟"

زاہدہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

نوشابہ مسکراتی رہی۔

نانی اماں نے منہ بنا کر اور ذرا کھسک کر کہا ــــ "تمہیں اور تمہیں، لو تمہاری ماں سے، تمہارے باپ سے۔ خوب تو کمایا ہے۔ مقدمے کرتے ہیں معاملے کرتے ہیں ان سے لو۔"

محمد امین کہنے لگے ــــ "خالہ جان بچا مہینہ کے آخر میں ایک پائی نہیں بچتی"

نانی اماں بولیں ــــ "اے ہے اساڑھے تین سو تنخواہ اور ایک پائی نہیں بچتی آخر اتنا روپیہ کہاں جاتا ہے؟"

نوشابہ نے کہا ــــ "امی جان خرچ بھی تو پیچھے لگے ہیں۔ ابھی ایک موٹر خریدی، وہ بگڑ گئی تو مرمت ہونے گئی۔ بنگلے کا کرایہ، دو چار نوکر نوکرانیاں دھوبی۔ نائی۔ بچوں کی کتابیں اور فیس کے دام۔ کپڑا لتا ہے۔ آیا گیا ہے غرض سب ہی تو لگا ہے انسان کے ساتھ۔"

نانی اماں ایک پس و پیش کے عالم میں چپ رہ گئیں۔

(۶)

آج زاہدہ کی رخصتی ہو رہی ہے۔

جب وہ سب گلے مل کر رو چکیں تو نانی اماں کی باری آئی۔ مغموم طبیعت نانی اماں کو بھی رلایا۔ نانی اماں نے زاہدہ سے کہا۔

"دیکھو بیٹی زاہدہ۔ تمہاری بوڑھی نانی کی باتیں پلّے میں باندھ کر رکھو گی تو ہمیشہ خوش و خرم رہو گی۔ تم اپنا منہ سی لینا ——— اور خاوند کا حکم دل و جان سے بجا لانا۔ اس کی نظر پہچاننا۔ اس کا دل اپنی مٹھی میں لینا۔ اگر ان چار باتوں پر عمل کرو گی تو گویا زندگی کا قلعہ تم نے جیت لیا۔ زاہدہ! ہم مسلمانوں کے سامنے سیّدہ فاطمہ زہرا کا نمونہ ہے۔ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ وہ تم سے کہے رات بھر کھڑی رہ تو بیٹا تم اگر شریف ہو گی تو رات بھر کھڑی رہو گی۔"

زاہدہ سسکتی رہی۔

نانی اماں نے نوشاہ کو بلوا بھیجا پھر اس کا سلام لیا اور کہا ——— "دیکھو بیٹا! یہ تمہارے گھر جا رہی ہے ——— بالکل اجنبی ہو گی۔ جہاں سوا تمہارے نہ اس کا کوئی ہمدرد ہو گا نہ رفیق۔ تم اس کی دیکھ بھال کرنا اور اپنا فرض کبھی نہ بھولنا:"

نوشاہ کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں اور اس نے کہا ——— "نانی جان! میں آپ کا غلام ہوں۔ انشاءاللہ آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہ ملے گا۔۔۔"

. . . .

. . . .

دوسرے دن نانی اماں نے اس غبار آلود متمدن۔ اس ہنگامہ خیز شہریت، اس مصنوعی تکلف گاہ کو خیرباد کہا اور وطن چلی گئیں۔ انھیں یہ ہنگامے منحوس گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت ماں بیٹیاں خوب گلے مل کر روئیں کیونکہ نوشابہ کا جی اپنی ماں کو رخصت کرنے سے دکھ رہا تھا۔

جاوید

غزل

نورِ وحدت سے بھرا یہ دل کا کاشانہ رہے ساقیِ کوثر کی الفت میں یہ دیوانہ رہے

یادِ حق کے ساتھ ہی عشقِ بتاں بھی دل میں ہے دل رہے کعبہ مرا کعبے میں بتخانہ رہے

اک نگاہِ لطف سے لبریز کر دے جامِ دل تو سلامت اور ساقی تیرا میخانہ رہے

کاٹ دیں یوں زندگی جب وہ نہیں ہے مہرباں دل میں غم تو لب پہ ہر دم آہِ مستانہ رہے

یہ تمنا کاش بر آئے دلِ ناکام کی شمعِ محفل تو ہو اور دل ترا پروانہ رہے

دل جگر دونوں کو تیرے ہی حوالہ کر دیا یہ رہے تجھ پر فدا وہ تیرا دیوانہ رہے

ساقیِ گلفام ہے موسم بھی ذوقیؔ پُر فضا

دور میں ساغر رہے لبریز پیمانہ رہے
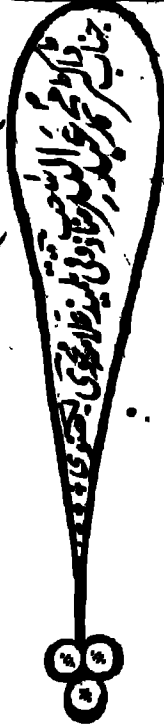
محسوساتِ ماہرؔ

از حضرت ماہر القادری

چاہتا ہوں رازِ جبرِ حسن کو افشا کروں — زندگی اک عقدۂ مشکل ہے اس کو وا کروں

فرض تھا دل پر مرے کفارۂ جرمِ نشاط — میں کسی کے جورِ پنہاں کی شکایت کیا کروں

تیرے دم سے میرے ایمانِ محبت کا وجود — سامنے آ، اے غمِ فرقت تجھے سجدا کروں

ساری دنیا کو دکھا دوں تیرے در کا راستہ — میں جہاں بھی جاؤں تیرے عشق کا چرچا کروں

پاس آتا ہے مجھے اک نسبتِ موہوم کا — عاشقی میں ورنہ میں اور غیر کی پروا کروں

پتلیوں کی آخری گردش کی ساعت آ چکی — آنے والے آ، میں کب تک راستہ دیکھا کروں؟

طولِ شامِ بیکسی کی کوئی ماہرؔ حد بھی ہے

دل کو میں کب تک تسلی دے کے بہلایا کروں؟

پریم چند اور اُن کا اثر!

از جناب سید وقار عظیم صاحب ایم۔اے

دنیا کی ہر چیز میں ارتقائی منزلوں کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسان کے لئے بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ممکن ہے کہ دوسری چیزوں میں یہ تمثیل موزوں نہ معلوم ہو۔ لیکن ادب اور اس کے ہر شعبہ پر اس کا اطلاق لفظ بہ لفظ ہوتا ہے ادب کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت میں اثرات قبول کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ روکھا۔ پھیکا رنگ، اس پر جو رنگ چڑھا دیا چڑھ گیا۔ اور اس طرح چڑھا کہ پھر اترنے کا نام تک نہ لیا۔ طفلی کے بعد اور شباب سے پہلے ایک ایسا عہد آیا جس میں ادب کی حالت یہ ہوئی کہ نت نئے رنگ بدلتا رہا۔ کبھی گہرا کبھی ہلکا کبھی روپہلا کبھی سُنہرا۔ کبھی سفید کبھی بچرنگی۔ دیکھنے والوں کی نظروں کے لئے تو ہونہ دنیا آفت کے نئے نئے سامان جمع ہوئے لیکن دل میں اسے کہیں جگہ نہ ملی رفتہ رفتہ اس نئی کونپل نے رنگ بدلنا شروع کیا اور تھوڑے دنوں میں ایک مستقل اور گہرا رنگ اختیار کر لیا۔ یہ رنگ سب کی آنکھوں میں کھُبا۔ سب کے دلوں میں بسنا شروع کر دیا۔ جس نے دیکھا وہی اس کا متوالا بنا۔ یہی زمانہ ادب کے شباب کا کہلاتا ہے۔

ہر ادب جب شباب کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ کس کی رہبری میں طفلی نے شباب کی کیف آور مستیوں میں قدم رکھا۔ کس کا اثر تھا کہ بچپن کی خامیوں نے ایک مستقل پختگی اختیار کی اور کس کے اثر سے متاثر ہو کر ادب کے دوسرے باغبانوں نے اسے پروان چڑھانے کی کوشش کی؟

اگر ہم انگریزی ادب کی سیر کرنے نکلیں تو جو نام ہمارے سامنے اس موقع پر پیش کئے جائینگے وہ ان پرستاران ادب کے ہونگے جنھیں نشاۃ ثانیہ کا رہبر کہنا چاہیئے۔ فرانس کے ادب کی کیفیت ملاحظہ کرنے کو جی چاہے تو روسو اور والٹیر کے کارناموں پر نظر ڈال لو۔ معلوم ہو جائیگا کہ بعد کے ادب پر ان دو ذاتوں نے کتنا اثر کیا۔ ایران میں فارسی کی حالت دیکھی جائے تو شاہان عباسیہ کے درباری شاعروں کے سر اس کی معراج کا سہرا رہا۔ اردو میں اس شباب کی منزلیں شبلی۔ حالی۔ آزاد اور نذیر احمد خاں کی ذاتوں کی مرہون منت ہیں، تاریخ۔ تنقید۔ سیرت نگاری ہر چیز کا شباب انھیں عناصر اربعہ کی ذات سے وابستہ ہے۔

اُردو میں مختصر افسانہ ایسی چیز ہے جس کی ابتدا اُردو کی معراج کے اس دور سے کسی قدر بعد ہوئی اور اس لئے اس کا شباب بھی ذرا بعد میں آیا۔ شروع شروع میں افسانہ اس قدر لطیف اثرات کا مالک نہیں تھا نہ اسے وجدان اور اس کی بلند کیفیتوں سے کوئی علاقہ تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ایک رہبر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر طفلی کی منزلوں سے باہر نکالا اور شباب کی شاہراہ پر لگا دیا اسی کے ہاتھوں اس کا شباب ہوا اور اس کے متبعین ہی نے اس کی ظاہری شکل وصورت میں بھی چار چاند لگائے۔

اس رہبر کو افسانوی دنیا میں پریم چند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پریم چند حقیقی معنوں میں اُردو افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں انھوں نے اسے ادبی لطافتوں اور نیرنگیوں سے مالا مال کیا۔ اس کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کے شباب میں سب سے شوخ رنگ پریم چند ہی کا ہے۔

اب ہم اس داستان کو حقیقت آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں جو کیف ہے اس کا لطف تجزیہ کرنے کے بعد باقی نہیں رہتا، لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انھوں نے افسانے میں کون کون سے محاسن بھرے۔ کہیں تو یہ محاسن محض اس فن کی تکمیل کے خیال سے پیدا کئے گئے ہیں اور کہیں پریم چند کی مخصوص فطرت نے اس میں ایسے آب و رنگ بھرے ہیں جو اُس کے حسن کا جزو لاینفک ہیں۔

پریم چند قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے دل میں ہر اس چیز کی عظمت ہے جو انھیں اور ان کی قوم کو دوسری قوموں سے ممتاز بناتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم عظمتیں اور ان کی یادگاریں اب زمانے کے ساتھ مردہ ہوگئیں ان کا ذکر افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ ان کی یاد محض ایک دلچسپ قصہ سمجھ کر کرتے ہیں جن میں کوئی مافوق الفطرت طاقت عمل کر رہی تھی لیکن پریم چند کا حساس دل انھیں زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ذکر کو افسانہ سمجھ کر بلکہ تاریخ کا ایک روشن ورق سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہیں وہ انھیں کسی مافوق الفطرت ذات سے وابستہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان کے نزدیک ان دلیرانہ کارناموں میں بھی اسی قسم کی ہستیاں جلوہ گر نظر آتی ہیں جن کا گوشت پوست ہم جیسا تھا۔ وہ ان کے افسانوں کو دلچسپی کے لئے نہیں بلکہ مردہ دل ہم وطنوں کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے دہرانا چاہتے ہیں۔ ان کا صحیح مقصد یہ نہیں کہ لوگ اپنی پامال شدہ عظمت اور بلندی کا ذکر سن کر محو حیرت بن جائیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی آنکھیں ان قدیم مرقعوں کے جلوے اپنی نظروں کے سامنے پھرتے ہوئے دیکھیں۔ انھیں دیکھ کر آنسوؤں کے عقیدت بھرے موتی ان پر نثار کریں اور دل کی اجڑی ہوئی بستی کو اس سے سرسبز بنا کر عمل کی طرف آئیں۔

پریم چند کے افسانے بکرامادت کا تیغہ ہیں۔ انھوں نے راجپوتوں کی روحانی اور جسمانی بلندیوں کے جو جلوے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ان میں پریم چند کی یہ ذہنیت بے حد روشن نظر آ رہی ہے۔ ایک فرضی قصہ کے ذریعہ سے انھوں نے وہ کام لیا ہے جو بڑے بڑے مصلح اور شاعر لے سکتے ہیں۔ پریم چند ایسے افسانوں میں حقیقت اور شعریت کو اس لطف سے شیر و شکر کرتے ہیں کہ انسان کا وجدانی ذوق اس سے خاص لطف لیتا ہے۔

پریم چند کے بہت سے افسانے اسی قسم کے ہیں۔ ان کی اس ذہنیت نے سدرشن کے اوپر خاص اثر کیا اور انھوں نے بھی اس کیفیت سے متاثر ہو کر بیحد دلکش افسانے لکھے۔ جن میں تخیل کی کارفرمائیوں میں شعریت کے جلوے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس خاص حیثیت سے سدرشن پریم چند سے بہت بڑھ گئے۔

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

کسی قوم یا ملک کی صحیح حالت معلوم کرنے کے جتنے ذریعہ ہیں ان میں ادب کو بھی ایک خاص اہمیت ہے۔ لیکن ادب میں افسانے کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے اور وہی کسی قوم کی زندگی کا زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہو سکتا ہے۔ اردو کے افسانوں میں خواہ وہ طویل ہوں خواہ مختصر اب تک یہ صفت بالکل مفقود تھی۔ پریم چند ہی اس طرز خاص کے بھی موجب ہوئے۔

ہندوستان کا مقامی رنگ ظاہر کرنے کا سب سے صاف اور خاص ذریعہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف دیہات کی زندگی۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بہت سی ظاہری مماثلتیں ہوتی ہیں اور ایک افسانہ نگار کے لئے بیحد دشوار ہے کہ وہ مختصر سی جگہ میں دو بڑے شہروں کے نمایاں خط و خال کی صحیح تصویر کھینچ سکے —— لیکن دیہات کی زندگی میں تہذیب اور سائنس کے اثرات نے اپنا رنگ نہیں جمایا۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک خصوصیات بھی الگ الگ جیسی ہونی چاہئیں ویسی ہی ہیں۔ پریم چند نے بھی مقامی رنگ پیدا کرنے کے لئے اپنے افسانوں کے پلاٹ عموماً دیہات کی سرزمینوں میں رکھے اس سادی زندگی کا غور سے مطالعہ کیا اور اس کے ہر چھوٹے اور بڑے۔ خاص اور عام۔ دلکش اور غم آگیں سارے واقعات کی تفصیلیں اپنے افسانوں میں بیان کیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہمارے دیہاتوں کے کسان کس مصیبت میں اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں ان کی زندگی دنیاوی [illegible]ت کی کشمکشوں میں کس طرح گذرتی ہے۔ کہیں پولیس۔ کہیں زمیندار کہیں مہاجن ان کی زندگی کو وبال بنائے رکھتے ہیں اور ان کی معصوم فطرت کس قدر خاموشی کے ساتھ ان مصائب کا سامنا کرتی ہے۔ فطرت کی نیرنگیاں کبھی ان کے لئے سامان مسرت اور کبھی پیغام غم بن کر آتی ہیں۔ کبھی بارش کے قطروں میں موتی برستے ہیں اور کبھی موسلا دھار بارشیں ان کی امید کے پودوں کو برباد کر کے جاتی ہیں۔ کبھی سورج کی روشن اور سنہری کرنیں اس کے خرمن کے دانوں کو اپنے رنگ سے سنہرا بناتی ہیں اور کبھی بجلی کے تبسم آگیں جلوے اس کے سامان حیات کو لوٹ کر نکل جاتے ہیں —— لیکن اس کا دل ان سب سے برابر لطف لیتا ہے اس کی دنیا میں غم اور مصیبت کے معنی بھی وہی ہیں جو خوشی اور مسرت کے۔

ان سب باتوں کا احساس پریم چند کے افسانے پڑھ کر اچھی طرح ہوتا ہے۔ کوئی دردمند دل ایسا نہیں جو ان واقعات کی تفصیلیں پڑھ کر رونے پر مجبور نہ ہو جائے۔

انسان اور انسان کی جنگ اتنی اہم نہیں جتنی انسان اور قدرت کی۔ اورغریب کسان کو اپنی زندگی میں ہمیشہ یہ دونوں جنگیں لڑنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ہتھیار تیر و تلوار نہیں۔ نیزہ و شمشیر نہیں۔ بلکہ صبر و شکر اطمینان اور مسرت اس دنیا کی سیر کرنی ہو تو پریم چند کے افسانے پڑھ لیجئے۔

مقامی رنگ پیدا کرنے کی اس محمود کوشش کا اثر بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں پر بہت پڑا۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے افسانوں کے پلاٹ بھی اکثر دیہاتی زندگی سے لئے گئے ہیں اور دونوں نے اس رنگ کو نہایت کامیابی سے نباہا ہے۔ حسینی کے افسانوں میں سے ایسے افسانے بھی ہیں جن کا تعلق شہری زندگی سے ہے۔ شہر کی زندگی میں جس خاص سوسائٹی یا جماعت کے متعلق انھیں اچھی طرح واقفیت ہے اُسے وہ اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں اور اس کے ہر روشن اور تاریک پہلو کو مکمل طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اسی طرح سدرشن نے بھی مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش میں اپنے افسانوں کے پلاٹ کے لئے عموماً ہندو گھرانوں کا انتخاب کیا۔ اور ان کی بول چال۔ ان کے اخلاق و عادات اور ان کی فطرتوں کے نمونے ہمارے سامنے افسانوں کی شکل میں پیش کئے۔

فضل حق قریشی نے اپنے افسانوں میں مسلمانوں کے اوسط درجہ کے گھروں کے واقعات نہایت حسن و خوبی سے بیان کئے ہیں۔ طالب الہ آبادی۔۔۔۔ راشد الخیری اور محشر عابدی نے بھی اپنے افسانوں میں ہر جگہ مختلف طریقوں سے مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانوں میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش سے پہلے یہ بیحد ضروری ہے کہ افسانہ نگار جس سوسائٹی یا جماعت کے حالات یا واقعات لکھے ان سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہو۔ اردو کے قدیم افسانوں میں یہ بہت بڑی کمزوری تھی۔ پریم چند نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا اور افسانے میں اس بات کا التزام رکھا ہے جسے انگریزی اصطلاح میں "Poetic Justice" کہتے ہیں۔ پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے افسانہ میں اس صفت کے قائم رکھنے کی کوشش کی ان میں حسینی۔ اعظم۔ مجنوں۔ افسر اور تاج کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پریم چند نے افسانوں کو بلند بنانے کا ایک سب سے اہم طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ۔ اپنے کرداروں کے اعمال۔ ان کی نقل و حرکت ان کی گفتگو اور افسانے کی ترتیب میں نفسیاتی پہلو کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیات کا دوسرا نام فطرت سے مطابقت ہے۔ وہ پلاٹ کے اتار چڑھاؤ۔ اس کی ابتداء اور انتہا میں کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق فطرت یا نفسیات کے ساتھ ساتھ عمل کرتا ہے۔

نفسیات پریم چند سے پہلے اُردو افسانہ نگاری میں مفقود تھی لیکن ان کے بعد کے افسانہ نگاروں میں سے قریب قریب سب اچھے افسانہ نگاروں نے اسے ایک خاص جگہ دی۔ بعض افسانہ نگار تو ایسے ہیں جو پورے افسانے کا ڈھانچہ صرف ایک نفسیاتی نکتہ پر رکھتے ہیں۔ سدرشن۔ قیسی۔ افسر۔ نیاز مجنوں۔ تاج سب اسی طرح کے افسانہ نگار ہیں۔ کسی کا فلسفہ گہرا ہے کسی کا سطحی لیکن ان میں سے کوئی سا بھی ایسا نہیں جسے نفسیات سے الگ کیا جا سکے۔

اصلاح عموماً جب ادب میں داخل ہوتی ہے تو اُسے روکھا پھیکا بنا دیتی ہے صرف ایسے مصنف یا شاعر ایسے عیب کے دور کرنے پر قادر ہیں جنھیں اپنے فن میں کمال حاصل ہے۔ پریم چند نے ہر افسانہ میں قوم کی ذہنی بے حسی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دلچسپی اور کیفیت میں کہیں کمی نہیں آئی۔ اسی طرح سدرشن۔ تاج اور حسینی نے بھی اس مقصد میں بے حد کامیابی حاصل کی ہے اور بہت کم موقعوں پر افسانے کو غیر دلچسپ ہونے دیا۔ اسے انگریزی میں art of story telling یا قصہ گوئی کا فن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ افسانہ نگار معمولی سے معمولی اور خشک سے خشک موضوع کو دلچسپ بنا کر لکھے اور پڑھنے والے کو دلچسپی کا احساس ہر وقت رہے۔ پریم چند کی اس کوشش کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض افسانہ نگار افسانے میں خواہ اور چیزیں دکھائیں یا نہ دکھائیں لیکن اسے دلچسپ ضرور بنا دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا افسانہ کے مفہوم کو کبھی دل سے دور ہوتا ہوا محسوس نہ کرے۔ پریم چند نے کبھی واقعات اور پلاٹ کے انتخاب سے کبھی ایک شاعر کی طرح دو متضاد کیفیتوں کو جمع کر کے اور کبھی کرداروں کو افسانے کی جان بنا کے فسانوں کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ ہر جگہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

پریم چند نے افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب یہ بھی پیدا کیا کہ انھوں نے کبھی اپنے افسانوں کے انجام حزنیہ رکھے اور کبھی طربیہ۔ اب تک افسانوں میں یہ التزام رکھا جاتا تھا کہ ان کا انجام طربیہ ہو خواہ افسانے کے

واقعات اور ان کا اتار چڑھاؤ اس کی اجازت دے یا نہ دے۔ فطری طور پر ایک افسانے کو حزنیہ ہونا چاہئے لیکن لکھنے والے پڑھنے والوں کے دل کو خوش کرنے کے لئے زبردستی اسے طربیہ بناتے تھے اور اس کا اثر جو کچھ بھی ہو اس میں یہ کمی ضرور رہ جاتی تھی کہ حقیقت کے متلاشی اسے جھوٹا سمجھنے لگتے تھے اور اکثر اوقات اس خامی کی وجہ سے اس کا اصلاحی مقصد بھی غایب ہو جاتا تھا۔ پریم چند صرف فطرت کے محکوم تھے اور دنیا کی ہر دوسری چیز کو بالائے طاق رکھ دیا۔

پریم چند کے افسانوں کا ایک بیحد دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انھوں نے قدیم افسانوں کے خلاف عورت کے ظاہری اور مادی نہیں بلکہ اس کے روحانی حسن کو سراہنے کی کوشش کی۔ انہیں سوسائٹی میں بے حد بلند درجہ دلوانے کی کوشش میں اسے ہر دلکش سے دلکش صفت اور حسن کا مالک بنایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے افسانوں میں عورت نے ایک خاص حیثیت حاصل کر لی۔

مختلف افسانہ نگاروں نے اسے مختلف نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے اور صرف عورت ہی کو اپنے افسانہ کا موضوع بنا لیا۔ ایسے افسانہ نگاروں میں نیاز اور مجنوں جیسے رومانی افسانہ نگاروں کے علاوہ عابد علی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے جنھوں نے عورت کو مرد کے ہر گناہ اور عیب کا ذمہ دار بنا دیا۔

افسانوں کے مواد کے بعد جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ پریم چند کی زبان ہے انھوں نے اردو کے افسانوں میں پہلی مرتبہ ایسی زبان لکھنی شروع کی جو ٹھیٹ ہندی تھی اور نہ ادق فارسی اور عربی آمیز اردو۔ دونوں کو شیر و شکر کر کے ایک نہایت شیریں اور دلکش زبان کی بنیاد ڈالی۔ لیکن کہیں کہیں اس محمود کوشش میں غلطیاں بھی سرزد ہو گئیں۔ اس دُھن میں الفاظ کے توازن کا خیال نہیں رہا اور ایک ہی جملہ میں جہاں ایک طرف کوئی ہلکا سا شیریں بھاشا کا لفظ لکھا وہاں دوسری طرف فارسی کے لفظوں کی ایک قسم بالشان ترکیب بھی لکھ دی اور دو انمل بے جوڑ چیزیں ایک جگہ جمع ہو کر کانوں کے علاوہ مذاق پر بار ہونے لگیں۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں جہاں اس امتزاج میں توازن ہے وہاں اس میں لطف اور کیفیت کے نغمے کانوں کو مسحور بناتے ہیں دل بھی ان سے لطف لیتا ہے۔

لیکن یہاں ہم پریم چند کی زبان کے علاوہ جس چیز کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی اس روش نے دوسرے افسانہ نگاروں پر بہت گہرا اثر کیا اور انھوں نے پریم چند کی تقلید میں ایک نئی زبان کی بنیاد ڈالی جو اردو کی آئندہ ترقی کے لئے ایک شمع ہدایت بنی۔

اعظم کریوی کی شیریں زبانی۔ سدرشن کے مسحور کن فقرے اور جملے ہمارے دلوں کو مسحور کرنے کے علاوہ زبان کی بھی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں اور ممکن ہے کہ اردو کے لئے ایک ایسا زمانہ بھی آ جائے جب پریم چند کی یہ لگائی ہوئی بیل شیریں اور لطیف اثمار سے اہل ذوق کے کام و دہن کو فیضیاب کرے۔ اور افسانہ نگاری کا بادشاہ زبان کی شاہراہ میں بھی ایک انقلابی رہبر سمجھا جائے۔

حسن زبان

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے، ایم، او، ال،

لطف و مذاقِ صحبتِ زندانیاں نہیں
اب وہ جنوں کی سلسلہ جنبانیاں نہیں

دل دیکھے آج غیر کو کیا کیا ہیں انفعال
مجھ کو تو جان دیجے پشیمانیاں نہیں

تم اور شورِ خندۂ بیجا رقیب کا
کیا زخمِ دل پہ یہ نمک افشانیاں نہیں

کیا داستانِ حشر سے واعظ ہو بڑھی
اس میں شبِ فراق کی طولانیاں نہیں

دشوار کیوں نہ ہو مجھے مرنا بھی ہجر میں
راحت پسند میری پریشانیاں نہیں

اڑ جائے بیخودی میں نہ رنگِ پریدہ کیوں؟
کچھ حلقۂ کمند تو حیرانیاں نہیں؟

شرم برہنگی سے ستمگر کو کیا غرض
کچھ وجہ ننگِ خار کی عریانیاں نہیں

کیا سکل ہو شگفتگیٔ دل کی بعدِ مرگ
شمع لحد میں بھی تو گل افشانیاں نہیں

رحمت سے اسکی ایسی خجالت ہوئی تپش
ناکردہ جرم تک کی پشیمانیاں نہیں

زرد نجارہ

مصور اسرار خان شاطر، غزنوی

سہیل میں دو خصوصیتیں تھیں ــــ دو خصوصیتیں جو ایک چور کو کامیاب چور بنا دیتی ہیں ــــ ہوشیاری اور عیاری۔

لیکن اب عیاری یا ہوشیاری۔ ایک بھی اسے پستول کا گھوڑا دبانے سے باز نہ رکھ سکی ــــ سوا اس کے چارہ نہ تھا ــــ اس موقع پر ــــ اس آخری حربہ سے کام لینا ضروری تھا۔ گولی ٹھیک نشانہ پر بیٹھی ــــ عورت کی ٹانگ بیکار ہو چکی تھی ــــ اس کے خیال میں ــــ بہرحال ــــ وہ چکرائی اور گری۔

اپنے ارادہ کو جامۂ عمل پہنانے سے قبل اس نے مکان کے حدود اربعہ اور اندرونی نقشہ سے پوری واقفیت حاصل کر رکھی تھی۔

وہ کھڑکی کے رستے اندر داخل ہوا ــــ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہونچا ــــ اب وہ ملاقات کے کمرہ میں تھا، اور اس سے اگلا کمرہ ــــ دار المطالعہ تھا، اس کے بعد ــــ خوابگاہ ــــ اس شخص کی خوابگاہ جسے لوٹنے وہ آیا تھا ــــ مکان میں صرف دو آدمی رہتے تھے۔

ہاں، تو اب وہ پستول ہاتھ میں تھامے ساکت و صامت انتہائی بے صبری سے کھڑا ــــ اپنے شکار ــــ زخمی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا ــــ ایک روح فرسا و بے ساختہ چیخ کا منتظر، لیکن شدید زخم اسے کافی دیر تک خاموش رکھنے کے لئے کافی تھا۔ وہ بے حس و حرکت ــــ بیہوش ــــ کوچ کے پیچھے اندھے منہ پڑی تھی مجروح ــــ بیہوش عورت مالک مکان کی بہن تھی، ڈاکٹر قاسم کے بعد اس مکان کا دوسرا مکین ــــ وہ حالات سے بے خبر غیر ارادی طور پر کمرہ میں داخل ہوئی۔ سہیل نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا ــــ وہ عورت ذات تھی اپنی فطرت سے مجبور، ــــ اس نے سہیل ــــ ایک چور کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر سہیل کے پستول سے نکلی ہوئی گولی بدنصیب عورت کی ٹانگ کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی۔ اور اب ــــ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ــــ کوچ کے پیچھے بے بس پڑی تھی۔

سہیل کے لئے فکر و اندیشہ کی کوئی بات نہ تھی ــــ گولی چلنے کی آواز نہ پیدا ہوئی تھی ــــ پستول بے آواز تھا۔

اب اسے جلد از جلد سرگرم عمل ہو جانا چاہئے تھا کسی خطرہ کی رونمائی سے پہلے پہلے ــــ اسے اپنے کام ــــ اپنے ارادہ ــــ کو پایۂ انجام تک پہونچا دینا چاہئے تھا۔ اس لئے عورت کے بے حس جسم کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا ــــ کوچ کے پیچھے چھپا دیا۔

لمحہ بھر کے لئے وہ خاموش کھڑا رہا ــــ اسے اپنی سماعت پر اشتباہ ہوا، شاید اس نے پاؤں کی چاپ سنی ــــ جبکہ وہ لاش کو گھسیٹ رہا تھا لیکن نہیں اس کا شبہ غلط تھا ــــ خاموشی ــــ سکوت۔

وہ کمرہ کے بعید کونے میں گیا اور بجلی کا بٹن دبا دیا ــــ گھٹا ٹوپ تاریکی نے کمرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ــــ خاموشی اور تاریکی۔

وہ جانتا تھا کہ عورت کے یہاں آنے اور زخمی ہو کر یہیں رہ جانے سے حالات کی صورت خطرناک ہو گئی ہے ــــ لیکن ــــ لیکن وہ ڈاکٹر قاسم کے بیش قیمت جواہرات اڑانے یہاں آیا تھا ــــ بعد مشکل ــــ بعد دقت ــــ اور کیا وہ یہاں سے خالی ہاتھ واپس جا سکتا تھا ــــ اب جبکہ گوہر مراد اس کے ہاتھ کی پہونچ کے اندر آ گیا تھا ــــ نہیں۔

وہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں دار المطالعہ کے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کا چہرہ سیاہ نقاب نے چھپا رکھا تھا اور صرف آنکھیں کسی شخص کو اس کی شناخت میں کوئی مدد نہ دے سکتی تھیں۔ اس کے ہاتھ ربڑ کے دستانوں میں ملفوف تھے۔ کسی شے پر اس کی انگلیوں کے نشانات کا رہ جانا ناممکن تھا۔ آخر وہ ایک کامیاب چور تھا ــــ ہوشیار اور عیار۔

اس کی جیب میں مختلف قسم کی درجنوں کنجیوں کا گچھا موجود تھا جس کی مدد سے وہ اپنے سامنے کا ہر ایک دروازہ ——— ہر ایک قفل با آسانی کھول سکتا تھا ——— شق اور لوزار دونوں چیزیں اس کے پاس موجود تھیں۔

اس نے اپنے جیبی لیمپ کی روشنی لائبریری کے دروازے پر پھینکی جیب سے گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے سوراخ میں ڈال دی ——— ایک ہی لمحہ بعد وہ لائبریری کے اندر تھا۔

کئی سیکنڈ تک اس کے برقی لیمپ کی روشنی دارالمطالعہ میں چاروں طرف گھومتی رہی اور پھر ایک ڈسک پر جا کر جم گئی ——— بیش قیمت و عدیم النظیر جواہر ریزے اسی ڈسک کی درازوں میں سے ایک میں محفوظ تھے۔

وہ بلی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اور گھٹنوں کے بل ڈسک کے سامنے بیٹھ گیا۔ پہلی، دوسری اور پھر ——— تیسری چابی ——— یکے بعد دیگرے مشین کی سی تیزی اور سرگرمی کے ساتھ اس نے درازیں دیکھنی شروع کیں ——— اس کی تلاش ختم ہو چکی تھی کہ دفعتہً اس کا سر ایک فوری تاثر سے پچھلی طرف مڑا کیا اس نے کچھ سنا ہے۔ سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز ——— پاؤں کی چاپ ——— آہٹ ——— نہیں، خاموشی ——— سکوت! اسے اپنے سانس کی آمد وشد کے سوا اور کوئی آواز محسوس نہ ہوتی تھی، مکمل سکوت ——— اور سکون ہاں، اب ——— اب غالباً مجروح عورت کروٹیں بدل رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اسے جلد از جلد اپنے کام سے فراغت حاصل کرنی چاہئے، اس کے ہوش میں آنے اور فطرتی کمزوری کی بنا پر شور مچانے سے پہلے پہلے سہیل کو خطرہ کی حدود سے باہر نکل جانا چاہئے۔

جواہر ریزے ایک خوبصورت چھوٹی ڈبیہ میں ——— مخمل کی تہ پہ پڑے برقی لیمپ کی روشنی میں جگمگا رہے تھے ——— ڈبیہ سہیل کے کف دست پر تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ہیرے ——— زمرد ——— یاقوت ——— سچے موتی ——— نیلم پکھراج ——— فیروزے ——— تاہم ہیروں اور زمردوں کی تعداد زیادہ تھی ——— سہیل نے ڈبیہ اپنے جیب کے حوالہ کر دی ——— مڑا ——— اور ٹخنوں کے بل آہستہ آہستہ دروازے کی طرف رینگنے لگا۔

اب اس کی سماعت نے اس مہیب سکوت میں پہلی بار ڈرپ ——— ڈرپ کی آواز محسوس کی، اس کی توجہ لمحہ بھر کے لئے ادھر متوجہ ہو گئی ——— کہیں قریب ہی پانی کے قطرات نیچے پانی ہی میں گر رہے تھے ——— تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ——— ڈرپ ——— ڈرپ ——— ڈرپ ——— اب اس کی سمجھ میں آ گیا ڈسک کے قریب ہی ایک کانچ کی نالی میں سے پانی کے قطرے نیچے ایک پیپے میں گر رہے تھے۔ اب سہیل اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ کمرہ نہ صرف ڈاکٹر قاسم کا دارالمطالعہ ہے بلکہ لیبارٹری بھی ———

اس نے ایک بار پھر جیبی لیمپ کی روشنی کمرہ میں ادھر اُدھر دوڑائی لیبارٹری کے متعلق ہر قسم کی ضروریات ادھر اُدھر پڑی موجود نظر آئیں۔

اس نے پھر آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا۔ لیکن تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ یکایک اس کا ٹخنہ کسی ٹھوس شے سے متصادم ہوا ——— شدید درد ——— بجلی کی لہر بن کر اس کے رگ و ریشہ میں دوڑ گئی، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا ——— گرنے لگا ——— لیکن ہمت کی اور کوئی سہارا پانے کے لئے ہاتھ مارا ——— اس کا ہاتھ میز پر جا پڑا اور اس نے تختے سے میز کا کنارہ پکڑ لیا ——— لیکن ٹھیک اسی ثانیہ درد و کرب کی ایک اور لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی، اسے اپنا ہاتھ کانچ کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا محسوس ہوا ——— اس نے اپنا ہاتھ زخمی کر لیا تھا ——— کانچ کے ٹکڑوں نے اس کی ہتھیلی کو پھاڑ ڈالا تھا ——— وہ اس غیر متوقع اور غیر معمولی حادثہ کے متعلق ابھی کچھ سوچنے نہ پایا تھا کہ اتنے میں مغاً دروازے پر انسانی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ خوابگاہ کا دروازہ زور سے کھلا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کا سوئچ دبنے کی آواز ——— کمرہ بقعۂ نور بن گیا ——— سہیل کی آنکھیں چندھیا گئیں ——— لیکن اس نے بکمال جرات و استقلال چلا کر کہا۔

"روشنی گل کر دو۔"

ایک دبلا پتلا ——— سنجیدہ شخص اس کے سامنے کھڑا تھا ——— نووارد حیرت آمیز نگاہوں سے سہیل کو گھور رہا تھا۔

"روشنی گل کر دو، میں کہہ رہا ہوں۔" سہیل نے سخت لہجے میں دہرایا۔ اور ریوالور نکال کر نالی سہیل کی طرف سیدھی کر دی۔

"چور! اب میں سمجھا۔" نووارد نے دلجمعی اور سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن دوست! تم نے تو اپنا ہاتھ زخمی کر لیا ہے۔"

نووارد کے چہرے پر کسی قسم کے خوف یا پریشانی کے آثار موجود نہ تھے صرف متعجب؟ لیکن جوں ہی پستول کا رخ اس نے اپنی طرف دیکھا آنے والے خطرے نے اسے محتاط کر دیا۔ نووارد کی نگاہیں نقاب کو چیر کر سہیل کے چہرہ

پہونچنے کی سعی کر رہی تھیں۔ نووارد ـــ بذات خود ـــ مالک مکان ـــ ڈاکٹر قاسم تھا ـــ وہ بآرام بستر استراحت پر عروس خوابیدگی سے ہمکنار تھا کہ اتنے میں اس کی سماعت نے کھڑکھڑاہٹ کی گواہی دی ـــ وہ اٹھا ـــ آیا اور کئی منٹ تک لائبریری کے دروازے کے باہر کھڑا چور کی حرکات کا مطالو کرتا رہا ـــ قدموں کی چاپ ـــ ایک مبہم سی آواز ـــ جس پر سہیل کو زخمی عورت کے چلنے پھرنے کا شبہ گذرا تھا۔ درحقیقت وہ ڈاکٹر قاسم کے چارپائی سے اترنے اور چلنے کی آواز تھی۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو" سہیل نے جلدی سے کہا۔ "نہیں ٹھہرو، ابھی روشنی گل کرنے کی ضرورت نہیں"

قاسم نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالئے۔

"اس کرسی پر بیٹھ جاؤ"

قاسم بیٹھ گیا ـــ کئی سیکنڈ تک سہیل اسے نقاب کے دو سوراخوں میں سے بغور دیکھتا رہا۔ وہ ڈاکٹر کے مدد کے لئے چلانے کا منتظر تھا۔ لیکن ڈاکٹر خلاف امید خاموش تھا۔ سہیل اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اب وہ پستول کا رخ ڈاکٹر کی طرف رکھے کمرے کے اس گوشہ کی طرف گیا جہاں ـــ جہاں بجلی کے مضبوط غیر مستعمل تاروں کے ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے چند ہی منٹ میں ڈاکٹر کو تاروں کی مدد سے کرسی کے ساتھ خوب مضبوط ـــ کس کر باندھ دیا۔

"اگر تم نے آواز نکالی تو اپنی جان گنوا دوگے!" سہیل نے اسے مطلع کیا۔ "یاد رکھو"

اور یہ حقیقت تھی کہ چلانے یا شور مچانے کی صورت میں سہیل اسے مار ڈالنے پر تیار تھا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا اور خون کے قطرے برابر فرش پر گر رہے تھے۔ لیکن اسے کیا فکر تھی۔ خون کے قطرے کوئی اہم ثبوت اور سراغ نہ تھے۔ سہیل نے ایک جھٹکے میں ڈاکٹر کی قمیص پھاڑ ڈالی اور کپڑے کے ٹکڑے کو ڈاکٹر کے منہ پر باندھنے کے لئے تہ کرنے لگا۔

"لیکن تم کیا لینے آئے تھے یہاں؟" قاسم نے دریافت کیا۔

"میں جو کچھ لینے آیا تھا لے چکا ہوں۔ جس شے کی مجھے ضرورت تھی وہ میری جیب میں پہونچ چکی ہے"

"غالباً میرے جواہرات؟"

"ہاں، بالیقین!"

سہیل ڈاکٹر کے منہ پر کپڑا باندھنے کے لئے آگے بڑھا لیکن۔ ڈاکٹر نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔

"پیشتر اس کے کہ تم میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے خاموش کردو میں ایک اہم ترین راز سے تمہیں آگاہ کردینا اپنا اخلاقی اور مذہبی فرض خیال کرتا ہوں، ایک ایسی بات جسے نہ جاننا تمہارے لئے یقینی موت کا سبب ثابت ہوگا تم میرے جواہرات اڑانے کے لئے آئے ـــ اور اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگئے ـــ لیکن کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم نے میری ٹسٹ ٹیوب توڑ کر ناقابل بیان و برداشت مصیبت ـــ ایک اٹل خطرہ خرید لیا ہے۔؟"

"کیا مطلب؟"

"تمہارا ہاتھ کانچ کی امتحانی نلی پر پڑا ـــ وہ ٹوٹ گئی ـــ تمہارا ربڑ کا دستانہ کٹ گیا اور ہتھیلی زخمی ہوگئی ٹسٹ ٹیوب کے کانچ کے ٹکڑے تمہاری جلد میں کھب چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے خوفناک ترین جراثیم بھی تمہارے خون میں داخل ہو چکے ہیں جو بالیقین تمہاری فوری موت کا سبب ثابت ہونگے۔ جانتے ہو زرد بخار کس قدر خوفناک مرض ہے؟ زرد بخار کا دوسرا نام ہے موت ـــ اٹل موت"

"زرد بخار؟" سہیل نے حیرت زدہ ہوکر دہرایا۔

"ہاں، دنیا کا شدید ترین بیحد خوفناک بخار ـــ اس ٹسٹ ٹیوب میں زرد بخار کے کروڑہا زندہ جراثیم بند تھے ـــ جو ٹوٹی اور جس کے ٹکڑے تمہارے جسم میں پیوست ہوکر رہ گئے ہیں، اُف! جراثیم؟ جنہیں انسانی نظریں نہیں دیکھ سکتیں۔ خون میں داخل ہوکر یہ جراثیم صرف چند گھنٹوں میں اپنے شکار کو قبر کی آغوش میں پہونچا دیتے ہیں کیا تم اس ناگہانی موت کی گرفت سے بچ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں! بحیثیت ایک ڈاکٹر میرا فرض تھا کہ تمہیں آگاہ کردوں"

"مجھے مطلع کر رہے ہو؟" سہیل کے چہرہ پر افسردگی اور پریشانی کے آخری آثار نظر آرہے تھے۔

"افسوس تمہیں معلوم نہ تھا کہ اس امتحانی نلی میں زرد بخار کے جراثیم موجود ہیں لاکھوں کی تعداد میں! زرد بخار جس کا شکار زندہ نہیں بچتا۔ ہرسال جس کی قربانگاہ پر ہزارہا انسان بھینٹ چڑھ جاتے ہیں، زرد بخار ایسا سانپ ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں مشرقی امراض میں یہ ہیبتناک ترین مرض اور..."

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری اور حسرتناک انداز میں سر ہلاکر گویا ہوا۔

"آہ بزدل بدکار تمہاری صورت حالات میں اپنے شکار کو صرف چوبیس گھنٹے زندگی کی ہوا میں سانس لینے کی مہلت دے سکتا ہے ــــ لرزہ ــــ ایک شدید ــــ یخ لرزہ ــــ ضعف اور آہ ــــ موت ہیبتناک موت جس کا نام سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ــــ دردناک ــــ حسرت ناک، موت ــــ سمجھے دوست۔"

سہیل بے حس و حرکت پتھر کا بت بنا ڈاکٹر کا منہ تک رہا تھا ــــ اُسے علم تھا کہ ڈاکٹر قاسم ایک غیر معمولی قابلیت کا مالک ہے۔ اور ہندوستان بھر میں مشرقی امراض کے ماہروں اور محققوں کا سرتاج مانا جاتا ہے ــــ اس نے اپنی عمر کا مستند بہ حصہ مشرقی امراض کی تحقیق اور تلاش علاج میں صرف کر رکھا ہے ــــ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر قاسم حال ہی میں چین میں چھ سال ریسرچ کی نذر کر کے واپس آیا ہے اور اس عرصہ میں اس نے مشرقی امراض کے متعلق بیش از بیش مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں ــــ سہیل دیگر جرائم پیشہ اشخاص کی طرح اخبار کے بالالتزام مطالعہ کا عادی تھا اور اخبارات ہی کے ذریعہ اسے قاسم کی قابلیت اور طبی مہارت کا علم ہوا تھا ــــ اخبارات ہی کے ذریعہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر قاسم چھ سال کی [illegible] طبی ریسرچ کے بعد بیش بہا طبی معلومات کے علاوہ عدیم النظیر جواہرات کا ایک گراں قیمت ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لئے چین سے واپس آرہا ہے ــــ اور پھر اسے اپنی پیشہ ورانہ تحقیقات کی بنا پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ جواہرات ڈاکٹر کے دارالمطالعہ میں ڈسک کی ایک دراز میں مقفل ہیں۔ ایک بات خاص طور پر اس کے حق میں تھی کہ یہ تمام جواہر ریزے ناتراشیدہ تھے اور وہ اپنے ہم مسلک جوہریوں کے ہاتھ نہایت آسانی سے فروخت کر سکتا تھا ــــ اور جوہری بھی ان کو حسب منشا تراش کر شناخت کے جملہ ثبوت زائل کر سکتے تھے۔ خریدنے کے چند ہی گھنٹوں بعد وہ ان پتھروں کی شکل و شباہت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر سکتے تھے اور خطرہ کا کوئی امکان نہ تھا۔

سہیل ان چوروں میں سے ایک تھا جو گھبراہٹ پریشانی اور جلد بازی کو اپنے قریب تک پھٹکنے نہیں دیتے۔ جرم اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ڈال سکتا تھا ــــ وہ ایک بیباک و بیخوف شخص تھا ــــ اور یہی وجہ تھی کہ بہت تھوڑے عرصہ میں وہ پنجاب کے کامیاب ترین چوروں کی صف اول میں شمار ہونے لگا۔ پانچ سال کے عرصہ میں اس نے پچپن چوریاں کیں ــــ کامیاب چوریاں ــــ اور ہر بار پولیس کی نظروں میں خاک جھونک کر صاف بچ جاتا تھا وہ ایک بہت بڑی جائداد کا مالک تھا ــــ جس سے ہر سال اسے بہت معقول آمدنی ہو جاتی تھی ــــ جو اس کی گذر اوقات کے لئے کافی سے زیادہ تھی ــــ وہ اپنی بقیہ زندگی اس آمدنی پر بعیش و عشرت بسر کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو مزید خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہ تھی ــــ لیکن آخر وہ چور تھا۔ ــــ آہ ــــ چور۔

جیل خانہ اس کی کتاب زندگی میں ایک مہمل لفظ تھا ــــ قید اس کے نزدیک ایک بے معنی اور بے وقعت لفظ تھا ــــ قید ــــ جیل ــــ مشقت ــــ تنہائی ــــ وہ ان الفاظ میں سے کسی ایک کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا ــــ لیکن آج ــــ آہ اب وہ خوفزدہ ہو رہا تھا ــــ خوف کی آخری حالت اور اضطراب کی آخری کیفیت اس پر مسلط تھی۔

موت ــــ اُف ــــ کس قدر ہیبتناک لفظ؟ جس کے تخیل ہی سے زندگی کی قوتیں شل ہو جاتی ہیں، ناگہانی موت ــــ یہ لفظ اس کے دماغ میں بجلی بن کر کوندرہا تھا وہ موت کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا ــــ خوف ــــ وہ خود مجسم خوف تھا ــــ وہ خود خوف تھا دوسروں کے لئے ــــ لیکن موت ایک مستقل خوف تھا لرزہ بر اندام کر دینے والا ــــ سہیل کے لئے۔

اس نے اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھا۔۔ ربڑ کا دستانہ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور ہتھیلی میں سے خون بہہ کر کلائی تک دھار کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ تمام ہاتھ خون میں ڈوب رہا تھا۔ اسے اپنی جلد میں کانچ کے ٹکڑے چبھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آخر اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو ڈاکٹر؟"

"چلو، یوں ہی سہی۔" جواب ملا۔ "اگر تمہارا یہی خیال ہے تو یونہی سہی لیکن میں آخری بار تمہیں مطلع کئے دیتا ہوں کہ جسے تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ ایک خطرناک ترین زہر تمہارے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ جس کا صرف ایک ہی تریاق ہے ــــ دنیا بھر میں صرف ایک تریاق اور جب تک زہر کے بعد یہ تریاق تمہارے خون میں داخل نہ ہو لے تم اپنے آپ کو زندہ نہیں بلکہ مردہ تصور کرو۔"

سہیل لمحہ بھر کے لئے کھڑا سوچتا رہا ــــ ڈاکٹر اس کے چہرے سے اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر اگر میں باور کرلوں کہ میرے جسم میں زہر داخل ہو چکا ہے۔" سہیل بولا "تو اس کے ساتھ ہی یہ یقین کر لینے کے لئے بھی میرے پاس کافی ثبوت ہے کہ تمہارے خون میں بھی جراثیم داخل ہو چکے ہیں۔ ٹسٹ ٹیوبز میں سے خارج شدہ مواد سے میرے ہاتھ لتھڑ رہے تھے اور میں نے انھیں آلودہ ہاتھوں سے تمہارے جسم کو چھوا تھیں باندھا۔ میرے ہاتھ پر لگے ہوئے مواد اور جلد سے خارج شدہ خون کے دھبے تمہارے جسم پر کئی جگہ لگ رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ . . . "

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" بندھے ہوئے شخص نے جواب دیا "تاہم مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے، میری زندگی کے امکانات موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے اس زہر کا تریاق معلوم ہے اور میں لاہور بھر میں اس واحد جگہ سے واقف ہوں جہاں سے یہ تریاق مجھے ——— صرف مجھے آسانی مل سکتا ہے۔"

نقاب کے پیچھے سہیل کا چہرہ ایک بار پھر فشاں ہوگیا ——— اس پر مردنی چھا رہی تھی ایک بار پھر اس نے اپنے زخمی ہاتھ کی طرف دیکھا اور ——— ایک ——— وتھو کے بعد چیلا کر بولا۔

"آخر کیا بکواس ہے یہ؟ یہ کیا مذاق کا موقع ہے ——— یہ سراسر جھوٹ ہے ——— غلط ——— میں یقین نہیں کر سکتا؟"

"اچھا!" ڈاکٹر نے دلجمعی سے کہا۔ "ذرا تکلیف گوارہ کر کے ان امتحانی نلیوں پر چسپاں شدہ لیبلوں کو تو پڑھو۔"

سہیل نے سٹینڈ اٹھایا۔ نالیوں پر چسپاں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھا تھا۔ "زرد بخار نمبر ۱ ——— سیاہ بخار نمبر 2 ——— موت کا آخری بخار نمبر ۳"

ڈاکٹر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں آتا؟ اگر اب بھی تم میری اطلاع کو ناقابل یقین سمجھتے ہو تو بہت بہتر ——— مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ——— تمہیں کوئی خطرہ نہیں ——— تمہارا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا ہے ——— اگر آئندہ کبھی میرے سامنے سے بھی گذر جاؤ ——— تو میں تمہیں نہیں پہچان سکونگا ——— تم میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے خاموش کر دو ——— میرے جواہرات تمہاری جیب میں ہیں ——— جاؤ چلے جاؤ، بے خوف و خطر چلے جاؤ میں تمہیں روک نہیں سکتا دیکھو دوست میں خود تمہیں موقع دے رہا ہوں۔"

"اے کاش کسی طرح مجھے یقین آجائے کہ تم مذاق نہیں کر رہے ہو" سہیل نے کہا۔

"آسان بات ہے یہ تو؟"

"وہ کیونکر؟"

"چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ اور اپنا آپ ملک الموت کے سپرد کر دو۔"

سہیل سر سے پاؤں تک لرز اٹھا اس پر موت سے زیادہ بھیانک کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ خوف و اضطراب کے بھیانک چہرے ——— اسے اپنے اردگرد ناچتے نظر آ رہے تھے۔

وہ ڈاکٹر کے پراسرار جراثیم کے گورکھ دھندے میں پھنسنے سے قبل ایک نڈر ——— بہادر اور حالات کا خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والا جری شخص تھا لیکن اب ——— آہ اب اس کی توتیں ایک ایک کر کے سلب ہوئی جا رہی تھیں ہمت بغلیں جھانک رہی تھی۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر کی زندگی اس کے رحم و کرم پر منحصر تھی ——— لیکن اب بازی کا رخ بدل چکا تھا۔ سہیل کی موت و زندگی کا سوال ڈاکٹر کے رحم و ظلم پر موقوف تھا۔ صورت حالات بہت نازک تھی ——— ایک بہادر و بے خوف شخص ایک تجربہ کار و ماہر فن ڈاکٹر کی زبانی اپنی موت کا فتویٰ سن رہا تھا۔ اور یہ فتویٰ موت کے آنے سے قبل ہی اس کی طاقت چھین رہا تھا۔ سچ ہے انسان اسی وقت تک موت سے نہیں ڈرتا جب تک کہ موت سامنے نہیں آجاتی ——— اسے یقین نہ آتا تھا، لیکن اب زبردست ذہنی ردوکد کے بعد اپنی ناگہانی موت پر یقین رکھنے ——— ایک شہرۂ آفاق ڈاکٹر کے فیصلہ پر ایمان لانے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

"لیکن ڈاکٹر! کس بات نے تمہیں مجبور کیا ——— تم کیوں مجھے مطلع کر رہے ہو؟" سہیل چلایا۔

"غالباً میری پیشہ ورانہ عادت مجھے مجبور کر رہی ہے، موت سے مقابلہ کرنا بحیثیت ڈاکٹر میرا فرض ہے اور میں ایک طویل عرصہ سے موت کے خلاف نبرد آزمائی کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میرا کام ہی موت کو نیچا دکھانا ہے، ہر مریض کو موت کے چنگل سے چھڑانا اور ہر شخص کو موت کی آمد سے مطلع کرنا قدرت نے میرا فرض قرار دے دیا ہے۔ فرض کرو کہ تمہارا ایک ہم مشرب ——— ہم پیشہ چور ——— چوری کا مال لئے بے خبری کے عالم میں چلا جا رہا ہے۔ ایک پولیس افسر اسے دیکھ لیتا ہے ——— تم پولیس افسر کا ارادہ بھانپ لیتے ہو۔ کیا تمہاری ہمدردی کے جذبات بیدار نہ ہونگے؟ کیا اس موقع پر تم اپنے چور بھائی کو بچانے کی کوشش نہ کرو گے؟ کیا تم کسی نہ کسی طریق سے اپنے چور بھائی کو مطلع نہ کرو گے کہ پولیس افسر تمہارا پیچھا کر رہا ہے اپنی جان بچاؤ۔"

"لیکن میں تم سے طبی ہدایات حاصل کرنے والوں میں نہ تھا۔ میں تمہارے مریضوں میں سے تو ایک نہیں" سہیل نے اعتراض کیا۔

"یہ درست ہے۔" قاسم نے کہا۔ "لیکن آخر اولاد آدم تو ہو نا؟ اور میں بھی بنی نوع انسان ہوں۔ اور کہ میں ڈاکٹر ہوں بنی نوع انسان کا ہمدرد۔ امراض و موت کا دشمن ——"

وہ ڈاکٹر کے اس موثر اور اہم ریمارک پر چند منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اب سہیل کے لئے ڈاکٹر کے قول پر یقین کر لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا —— اب اس کے ضمیر اور دماغ کے درمیان ایک زبردست کشمکش ہو رہی تھی —— چند منٹ گذر گئے —— اور پھر نقاب کے پیچھے —— سہیل کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی —— وہ بولا۔

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔ بہر حال ہم بآسانی معاملہ طے کر سکتے ہیں —— ہاں مگر کیا عام —— دوسرے ڈاکٹر زرد بخار کا علاج نہیں کر سکتے۔"

"اس وقت تک ہندوستان بھر میں میں ہی سب سے پہلا اور سب سے آخری ڈاکٹر ہوں جو اس خوفناک مرض کا تریاق جانتا ہے"—— ڈاکٹر نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تریاق کہاں مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں، میں جانتا ہوں کہ دوائی کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے نسخہ لکھنے کی۔"

"اور تمہیں ایک نسخہ لکھنا ہوگا!" سہیل نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"وہ کیوں؟ ایک نسخہ مجھے اپنے لئے بھی ....."

"ٹھہرو ڈاکٹر! میں تم سے ایک سودا کرتا ہوں اور اس سودے میں تمہیں سراسر فائدہ ہی رہے گا۔ سنو تم مجھے نسخہ لکھ دو اور میں تمہیں جواہرات واپس دیدیتا ہوں۔ کہو کیا صلاح ہے ——؟ بہر حال تمہارے لئے یہ ایک فائدہ بخش سودا ہے۔"

"فائدہ بخش؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ جواہرات کا یوں ہاتھ سے کھو بیٹھنا تمہارے لئے ایک ناقابل تلافی —— ناقابل برداشت نقصان ہے۔"

"بلاشبہ، ایک ناقابل برداشت نقصان۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جواہرات جو اس میری جیب میں ہیں تمہیں واپس دیدونگا —— اور آئندہ بھی انہیں چرانے کی کوشش نہیں کرونگا بشرطیکہ تم مجھے نسخہ لکھ دو —— کہو کیا ارادہ ہے؟"

ڈاکٹر نے ایک متجسس نگاہ سہیل پر سر سے پاؤں تک ڈالی۔

"تمہارا وعدہ ایمانداری پر مبنی ہے؟"

"تم پہلے جواہرات لے سکتے ہو؟"

"جو بہر صورت میری ملکیت ہیں۔"

"لیکن اس وقت میرے قبضہ میں ہیں، میں ان کا مالک ہوں۔"

ڈاکٹر خاموش تھا۔ خاموش رہا۔ سہیل پھر بولا۔

"اچھا اب میں معاملہ کو دوسرے رخ پر لاتا ہوں۔ تم میرے لئے نسخہ نہ لکھو اور میں تمہیں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے کی تکلیف سے بچا کر ابھی قبر کے کونے میں پہونچا دیتا ہوں۔ مجھے پرواہ نہیں خواہ اس زخم کا نتیجہ میرے لئے موت ہی ثابت ہو کم از کم میری روح کو اتنی تسکین تو حاصل ہوگی کہ میں نے اس شخص کو بھی اپنے ہاتھ سے صفحہ ہستی سے نابود کر دیا ہے جو میری موت کا سبب تھا اور کہ میری روح مسرور ہوگی اس خیال سے کہ اگر تم نے مجھے نسخہ لکھ کر نہ دیا تو اپنے آپ پر بھی اس نسخہ کو استعمال نہ کر سکے۔ دیکھو ڈاکٹر میں تمہیں ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصہ میں سوچ لو اور بتاؤ کہ تم کس طریق پر —— مرنا پسند کرتے ہو؟"

سہیل نے پستول کی نالی ڈاکٹر کی طرف سیدھی کر دی اور نگاہیں دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک پر جما دیں۔ ڈاکٹر مسکرایا اور معنی خیز نگاہوں سے سہیل کا منہ تکنے لگا —— اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا —— لیکن ڈاکٹر کی نظریں نقاب کو چیرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

سہیل کا مطلب بھی وہی تھا جو کچھ اس کے الفاظ تھے۔ قتل ایک معمولی بات تھی اس کے نزدیک اور اندریں صورت جب کہ وہ خود مرنے والا تھا ایک بالکل معمولی بات، اب پھر اس کا پلہ بھاری تھا۔ اب پھر اسے ڈاکٹر پر غلبہ حاصل تھا۔ ایک بار پھر ڈاکٹر اس کے رحم و کرم پر تھا۔

وہ ڈاکٹر کے جواب کا منتظر تھا —— اس کی نگاہیں بار بار کلاک کی طرف اٹھ رہی تھیں —— ڈرپ —— ڈرپ —— ڈرپ —— پانی کے قطرے اب بھی نالی سے ٹب میں گر رہے تھے —— اور ٹیلیفون کی سکوت میں یہ آواز زیادہ بلند معلوم ہو رہی تھی —— میز پر ٹوٹی ہوئی نالیوں کے ٹکڑے —— ادھر ادھر منتشر پڑے تھے۔

اور ان میں سے خارج شدہ سیال مواد میز پر بہہ کر جم چکا تھا ——

سہیل نے دیکھا کہ قاسم کی نگاہیں کمرہ میں ادھر اُدھر بیقرار —— گھوم رہی ہیں —— اس نے کلاک کی طرف آخری بار دیکھا۔

"میں تمہیں نسخہ لکھ دینا منظور کرتا ہوں۔" قاسم نے سرد آہ کے ساتھ کہا۔

"ہاں مجھے یقین تھا کہ تم ضرور لکھو گے ؟"

"اور تم جواہرات واپس دیدو گے نا ؟"

سہیل نے ڈبیہ جیب سے نکالی اور سامنے میز پر رکھدی۔"

"ڈسک کے پہلے خانہ میں کاغذ پڑے ہیں —— اور وہیں قلم دوات بھی رکھی ہے۔ ذرا اٹھا لاؤ یہاں۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے آزاد کر دیتے تاکہ میں اطمینان اور دلجمعی سے لکھ سکتا۔"

"میں تمام ضروریات یہیں حاضر کئے دیتا ہوں۔"

سہیل نے کاغذ اور قلم دوات ڈاکٹر کے سامنے رکھدی، اس کے ہاتھ کھولدیئے —— ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ لکھنا شروع کیا۔

ڈاکٹر کا قلم کاغذ پر دوڑتا ہوا عجیب و غریب —— بھاسراب۔ الفاظ بنا رہا تھا —— بالکل شکستہ خط —— طبابت پیشہ لوگوں کی شارٹ ہینڈ۔

سہیل کی نگاہیں ڈاکٹر کے قلم کی حرکات کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اس کے دماغ کی دنیا میں شک اور اطمینان کے درمیان میں ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی —— اس نے پہلی سطر کے آغاز میں ایک لفظ کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا۔

"یہ کیا لفظ ہے ؟ اس کا کیا مطلب ہے ؟"

"اس کا مطلب ہے کہ ایک منٹ ضایع کئے بغیر نسخہ جلد تیار کر دو۔ یہ ہدایت ہے دواساز کے لئے، تم جانتے ہو کہ موت ہر لحظہ تمہارے قریب آ رہی ہے اور وقت ضایع کرنا خود موت کی طرف دوڑ کر جانے کے مترادف ہے۔"

اس نے لفافہ کی پشت پر دواساز کا نام اور پتہ لکھا۔ کاغذ تہ کرکے لفافہ میں ڈالا —— اور سہیل کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"دواخانہ رات دن —— ہر وقت کھلا رہتا ہے —— اور یہ دواساز میرے احباب میں سے ایک ہے۔ مشرقی امراض کے متعلق وہ اکثر مجھ سے معلومات حاصل کیا کرتا ہے۔ تو کیا میں اسے ٹیلیفون پر بھی ہدایت کر دوں کہ نسخہ کی تیاری میں احتیاط اور تعجیل کو مدنظر رکھے ؟"

"تمہارا ٹیلیفون بیکار ہو چکا ہے۔ میں نے مکان میں داخل ہوتے وقت تاروں کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔"

"فی الحقیقت تم بہت ہوشیار اور محتاط چور ہو۔" قاسم نے کہا۔

سہیل نے لفافہ کھولا —— کاغذ نکالا اور تحریر پر شروع سے آخر تک ایک عمیق نگاہ ڈالی —— اور اپنی تسلی کرلی —— لیکن اس تحریر کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ تاہم کوئی ایسا لفظ بھی نظر نہ آیا جو مشکوک ہو، یا شبہ کو تقویت دے، شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طبابت پیشہ لوگ ایسا ہی رسم الخط اور انداز تحریر رکھتے ہیں —— اس نے لفافہ باحتیاط اپنی جیب کے سپرد کر دیا —— ڈاکٹر کے ہاتھ پھر باندھ دیئے —— اور اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"یہ نسخہ تو ہوا میرے لئے ؟" سہیل نے کہا۔ "تم اپنے معاملہ میں کیا کرنا چاہتے ہو ؟"

"یہ سوال تمہاری اخلاقی اور انسانی ہمدردی پر منحصر ہے —— انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنا نسخہ تیار کرالینے کے بعد تم دواساز کو میرے لئے بھی دوا جلد تر ارسال کرنے کی تاکید کرو۔"

سہیل نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ کی جانب —— اس کے بعد قاسم کے خشک و افسردہ چہرے کی طرف،

"لرزہ کس وقت شروع ہوگا ؟" اس نے دریافت کیا۔

"تمہاری صورت میں کوئی ایک گھنٹہ تک اور میری حالت میں دو گھنٹے یا اس سے بھی قدرے بعد اور اس کے بعد ضعف اور نقاہت کا حملہ۔"

"اور اگر تمہیں بروقت دوا نہ پہونچ سکی تو صبح تک تمہاری موت واقع ہو جائے گی —— ؟"

قاسم کے چہرے پر افسردگی کے آثار اور نمایاں ہو گئے —— معلوم ہوتا تھا کہ سہیل کے اس سوال نے اسے بیحد متاثر کیا ہے۔

"ہاں، یہ درست ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم دواساز کو میرے لئے دوا بھیجنے کی ضرور تلقین کرو گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں بیحد بے صبری سے انتظار کرونگا —— مناسب تو تھا کہ تم مجھے آزاد کر دو اور میں خود اس کے پاس جا پہونچوں اور وہیں جا کر دوا لاؤں۔"

ایک مکروہ مسکراہٹ نقاب کے پیچھے سہیل کے لبوں پر کھیل گئی جسے

ڈاکٹر نہ دیکھ سکتا تھا۔

"نہیں تم یہیں بیٹھے انتظار کرو ڈاکٹر۔"

سہیل نے برقی روشنی گل کر دی اور اس کی بجائے اپنا جیبی لیمپ روشن کر لیا۔ اور روشنی کا رخ ڈاکٹر کی طرف کرکے پیچھے ــــ پچھلے پاؤں ہٹنے لگا۔ قاسم کی آنکھیں چندھیا گئیں ــــ اب وہ سہیل کی حرکات کا اندازہ نہ کر سکتا تھا ــــ آہستہ آہستہ سہیل پیچھے ہٹتا ہوا میز کے قریب چند سکنڈ کے لئے رکا اور پھر ہٹنے لگا ــــ دروازے میں پہونچکر وہ بولا۔

"ڈاکٹر تمھیں انتظار کرنا ہوگا۔ دواساز خود تمھارے پاس دوا لے کر آئیگا۔"

"بہت اچھا۔"

"اور سنو۔ ممکن ہے کہ کسی وجہ سے دواساز نہ آسکے اور اندریں صورت میں ایک چیز تمھارے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب تمھارے انتظار کی حدیں ٹوٹ جائیں ــــ اور لرزہ ضعف کی صورت اختیار کر لے تو اس چیز سے مدد لینا اور اپنی روح کو اس ناقابل برداشت تکلیف سے نجات دلا دینا۔ سمجھے نا؟"

وہ دروازے سے باہر نکل گیا ــــ دروازہ بند ہوا ــــ ڈاکٹر نے دروازے کے سوراخ ــــ قفل میں چابی پھرنے کی آواز سنی ــــ قاسم اب قیدی تھا ــــ اپنے ہی دار المطالعہ میں۔

سہیل جلد جلد قدم اٹھائے شہر کے سب سے بڑے اور مشہور دوائی خانے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا ــــ نسخہ اس کی جیب میں تھا اور وہ اپنے بعد ڈاکٹر کے دوا بھیجنے پر ہرگز تیار نہ تھا۔ دواساز کے سوال کے جواب میں وہ کہہ سکتا تھا کہ نسخہ ڈاکٹر نے آج دوپہر مجھے لکھ کر دیا تھا ــــ کون اس کی تردید کر سکتا ہے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، کسی خطرہ کا امکان نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس وقت قاسم کے مکان سے آ رہا ہے ــــ ایک جرم کا ارتکاب کر کے نہ ڈاکٹر یہاں تک آسکتا ہے ــــ نہ اس کی بہن ــــ اول الذکر اپنے کمرہ میں مقید ہے اور صبح تک صفحہ ہستی سے اٹھ چکا ہوگا اور ثانی الذکر دوسرے کمرہ میں زخمی ــــ بند ــــ کیا تعجب کہ وہ بھی صبح تک ــــ یا اب بھی دنیا چھوڑ چکی ہوگی۔ زخم کی شدت اسے موت سے ہم کنار کر چکی ہو ــــ اور یہ عین قرین قیاس ہے۔

اگر عورت مر جائے ــــ یہ مر گئی ہو تو اچھا ہے ــــ سب یہی کہیں گے کہ ڈاکٹر نے بہن کو قتل کر کے خودکشی کر لی ہے۔

وہ جلد جلد قدم اٹھاتا منزل مقصود کی طرف چلا جا رہا تھا ــــ ادھر ڈاکٹر اپنے کمرہ میں مقید ــــ کرسی کے ساتھ بندھا ہوا۔ گھٹا ٹوپ تاریکی میں خاموش بیٹھا تھا ــــ اس نے نہ شور مچایا ــــ نہ امداد طلب کی ــــ البتہ جب کئی منٹ گذر گئے تو ــــ وہ اپنے آپ کو تاروں کے جال سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اپنی جد و جہد میں کامیاب ہو گیا ــــ وہ بجلی کے سوئچ کی جانب گیا ــــ ایک ہی سیکنڈ میں کمرہ روشن ہو گیا اور ڈاکٹر کی نگاہیں بے صبری سے ادھر ادھر پھرنے لگیں۔ اس نے سرسری نگاہ میں حالات کا جائزہ لیا ــــ باہر نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی ــــ کھڑکی ــــ سطح زمین سے بہت بلند، سخت خطرناک،

میز پر سہیل کا چھوٹا سا ریوالور پڑا تھا ــــ ڈاکٹر نے اٹھایا اور اس کا معائنہ کیا۔ چار غیر استعمال شدہ گولیاں موجود تھیں اور چھٹی خالی ــــ چھٹی گولی سہیل استعمال کر چکا تھا ــــ سہیل کے آخری الفاظ ڈاکٹر کے دماغ میں گونج رہے تھے،

"میں ایک شے تمھارے لئے چھوڑے جا رہا ہوں، جس کی مدد سے تم اپنے مصائب کا خاتمہ کر سکو۔"

ہاں، دوسرے الفاظ میں اپنی زندگی کا خاتمہ۔

اس نے ایک بار پھر پستول سے کھیلتے ہوئے کمرہ میں چاروں طرف نگاہ پھینکی۔ اب اس کی نظر جواہرات کی ڈبیہ پر پڑی ــــ ریوالور اس نے ہاتھ سے رکھ کر ڈبیہ اٹھالی۔ لیکن ــــ آہ ڈبیہ خالی تھی ــــ جواہرات غائب تھے ــــ

ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر تیر گئی۔

اس کے اندیشہ نے واقعہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خالی کیس ریوالور کی موجودگی کا سبب ظاہر کر رہا تھا۔

ڈاکٹر ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا ــــ بیٹھ گیا اور دلجمعی سے انتظار کرنے لگا ــــ انتظار ــــ انتظار ــــ ایک پراسرار انتظار۔

صبح کا آخری ستارہ دم توڑ رہا تھا جب کہ ڈاکٹر نے اونگھتے ہوئے ہال میں بھاری بھرکم قدموں کی آہٹ سنی۔ چند آوازیں اس کا نام پکار رہی تھیں اب وہ چلا چلا کر آوازوں کا جواب دینے لگا۔ وہ ان آوازوں کو دار المطالعہ کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی منٹ گذر گئے اور پھر دروازہ بہت

زور سے کھلا ـــ دو سپاہی اور انسپکٹر پولیس گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

انسپکٹر انتہائی جوش اور بے تکلفی سے آگے بڑھا اور گرمجوشی سے ڈاکٹر کے ساتھ معانقہ کرکے بولا۔ "مبارک ہو تمھیں ڈاکٹر، غالباً تمھیں سن کر بہت خوشی ہوگی کہ چور گرفتار کر لیا گیا ہے تمھارے دوست دواساز نے اسے نسخہ کی تیاری کے بہانے باتوں میں لگائے رکھا اور ہمیں مطلع کر دیا۔ دوست تمھیں سوجھی خوب، فرانسیسی زبان میں فرانسیسی دواساز کو معاملہ سے آگاہ کر دیا اور نسخہ میں دواؤں کے بجائے گرفتاری کی ہدایت لکھ دی ـــ واللہ بڑے ہوشیار آدمی ہو تم، لیکن ڈاکٹر حقیقت تو یہ ہے کہ تم سے زیادہ تمھارا دواساز دوست تعریف کا مستحق ہے اس نے قابل داد ہوشیاری سے مجرم کو باتوں میں لگائے رکھا اور اتنے میں ہم قضائے مبرم کی طرح اس پر نازل ہوگئے ـــ یہ پستول کا ریوالور ہے شاید! وہ اسے یہاں کیوں چھوڑ گیا؟"

"اس لئے کہ میں اسے اپنے آپ پر استعمال کروں۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"میں سمجھا۔" انسپکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "خوش قسمتی سے اس نے تمھیں کمرہ میں محبوس کر دیا اور باہر سے تالا لگا گیا۔ یہ اس کے خلاف ایک اور مستحکم ثبوت ہے۔ جواہرات بھی اس کی جیب سے برآمد کر لئے گئے ہیں لیکن دوست! اس زرد بخار کا کیا بنے گا؟ زرد بخار؟ جس کا وہ شکار ہو رہا ہے۔"

"اوہ 'زرد بخار'" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے دہرایا۔ "دوست زرد بخار کا کوئی وجود نہیں یہ درست ہے کہ ٹسٹ ٹیوب میں زرد بخار کے جراثیم موجود تھے لیکن ہلاک کردہ ـــ وہ تمام مردہ تھے۔ ان میں کوئی اثر باقی نہ تھا۔"

ایک پرجوش قہقہہ انسپکٹر نے لگایا اور ڈاکٹر بھی کھکھلا کر ہنس پڑا۔

"تو میں نے چوری کے الزام میں اسے حوالات کے سپرد کر دیا ہے اب ایک اور جرم اس کے خلاف ثابت ہو رہا ہے۔ اغتصاب بالجبر کے بعد ـــ حبس بیجا۔ لیکن کیا تم بے خبری کے عالم میں اس کے سامنے آگئے تھے؟"

ڈاکٹر انسپکٹر کو اپنے ساتھ دوسرے کمرہ میں لے گیا اور خادمہ کی لاش دکھا کر کہا۔ جو بے حس و حرکت کوچ کے اوٹ میں پڑی تھی۔

"میں بے خبری کے عالم میں نہیں آیا تھا۔" ایک حسرتناک لہجہ میں قاسم بولا "سب سے پہلا الزام ہے قتل عمد ـــ آہ ـــ میری وفادار خادمہ کا قتل ـــ میری

"شام"

جناب آزاد انصاری مالیگانوی

اُٹھے وہ نغمہ ہائے درد آگیں بربطِ جاں سے
کہ رخصت ہو رہا ہے شاہ خاور بزمِ امکاں سے

نقوشِ محفلِ ہستی نے پہنا ماتمی جوڑا
سرشکِ خوں ہوا جاری فلک کی چشمِ گریاں سے

مسافر شام کی آمد سے ٹھیرا اک جگہ آکر
وطن کی یاد میں آنسو بہا کر چشمِ گریاں سے

سفر کی بے سر و سامانیوں کا دردِ جانفرسا
کئے جاتا ہے پیہم چھیڑ اس واماندہ انساں سے

اور اس بیچارگی میں دوستوں کی یاد آآ کر
تقاضا کر رہی ہے چاک ہو جانے کا داماں سے

سیاہی اور بڑھ جاتی ہے اس کی بدنصیبی کی
وہ جس کو دور کرنا چاہتا ہے سوزِ پنہاں سے

اسی واماندگی کے درمیاں آتی ہے نیند اسکو
سفینہ کو سکوں حاصل ہوا آشوبِ طوفاں سے

وہ اپنے خواب سے اس وقت پھر بیدار ہوتا ہے
کہ روحِ تازگی ملتی ہے اسکو صبحِ خنداں سے

رواں ہوتا ہے پھر وہ منزلِ مقصود کی جانب
وطن میں جا کے پھر ملنا ہے اپنی جانِ ارماں سے

نمودِ شام سے افزوں ہوا سوزِ دروں میرا
کسک اُٹھتی ہے میری دل کے اندر دردِ ہجراں سے

مری قسمت میں تھا آزاد سلمیٰ سے جدا ہونا
نہیں معلوم اب تقدیر میں لکھا ہے کیا ہونا

رواں مرحوم

از جناب انوار الحق صاحب انوار

باغ اردو کا باغباں نہ رہا
مایہ نازش زباں نہ رہا
تجھ کو عمر رواں میں کیا کہوں
ہائے افسوس ہے رواں نہ رہا

رواں کا نام بابو جگت موہن لال تھا۔ آپ قصبہ موراواں ضلع اناؤ کے باشندے اور چودھری منشی گنگا پرشاد صاحب سری واستو کے صاحبزادے تھے۔ رواں ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے اور چھیالیسواں سال بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ فرمان موت آپہونچا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء کو بعارضہ بخار دو دن کے قلیل عرصہ میں آپ راہی ملک بقا ہو گئے۔

رواں نے ۱۹۰۷ء میں کے۔ ڈی۔ جے ہائی اسکول موراواں ضلع اناؤ سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اس کے بعد آپ کا داخلہ کیننگ کالج لکھنؤ میں ہوا جہاں سے آپ نے ۱۹۱۱ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ ذہین تو آپ تھے ہی بی۔ اے کے امتحان میں بھی اول آئے اور آپ کو وظیفہ علمی مقرر ہوا نیز آپ کا نام کالج کی دیوار پر سنہرے حرفوں میں لکھا گیا۔ دو سال کے بعد آپ نے ایم اے۔ بھی پاس کر لیا۔ اور ۱۹۱۶ء میں ایل ایل۔ بی۔ پاس کرنے کے بعد اناؤ میں وکالت کرنی شروع کی۔ ان کی ذہانت، مقدمہ فہمی اور حسن اخلاق نے ان کو بہت جلد شہر کا ایک سربرآوردہ وکیل بنا دیا۔

رواں کو شروع سے ہی شعر و سخن کا مذاق تھا اور خدا نے ان کے اندر شاعری کا مادہ روز ازل ہی سے ودیعت کیا تھا۔ دوران تعلیم میں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے چنانچہ جب کیننگ کالج لکھنؤ بورڈنگ ہاؤس میں مشاعرہ ہوا تو رواں اس کے میر مشاعرہ منتخب کئے گئے اور آپ نے شاعری پر پر ایک پر تحقیق نظم پڑھی۔

رواں کو لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ مولانا کے برگزیدہ شاگردوں میں سے تھے۔ "روح رواں" کے مقدمہ میں مولانا خود لکھتے ہیں۔

"..... چنانچہ ۱۹۰۶ء سے انھوں نے مجھے اپنے حلقہ احباب میں داخل کیا۔ ان کے صفات و اخلاق سے مجھے بھی ان کے ساتھ ایک خاص محبت ہو گئی۔ ..."

رواں صاحب غزل کہنے میں جادہ قدیم کے راہرو نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غزل کا معیار بہت بلند اور اس کا میدان بہت وسیع ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ زہے وسعت دامان غزل — بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شان غزل
ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایان غزل — پوچھئے حافظ شیراز سے امکان غزل
ضبط ہے آئینہ راز حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

جس کو آپ سے ایک بار بھی ملنے کا موقع ملا ہے وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا اور ہمیشہ مدح سرا رہا ہے گذشتہ سال میلہ تکیہ میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا اور رواں اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ آپ کی خاکساری دیکھئے کہ مسند تک نہیں رکھی اور کہا میں اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ وہ اتنے ہر دلعزیز تھے کہ صوبہ و ملک کے بڑے بڑے شعرا ان کے یہاں اناؤ آئے شہر کے حکام و روسا سے ان کے اچھے مراسم رہے۔ آپ اناؤ بار ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ یہ رواں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اناؤ میں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا اور دلدادگان سخن کو طبع آزمائی کا موقع ملتا تھا۔ خبر ہے کہ شرفائے اناؤ و محبان رواں ان کی یادگار میں کوئی رسالہ یا اخبار جاری کرنے والے ہیں۔ آمین۔

رواں اُردو کے ادیب اور بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ہندی میں بھی کافی استعداد رکھتے تھے۔ آپ کی ہندی نظمیں اکثر رسالہ "سکوی" کانپور میں شایع ہوا کرتی تھیں۔ آپ نے ہندی سہاگرات مصنفہ پنڈت کرشن کانت صاحب مالوی کا اردو ترجمہ سہاگرات نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے اور اس ترجمہ کی کامیابی پر آپ کو خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے مبارکباد بھی دی ہے۔

فریب عمل بھی آپ کی تصنیف ہے جو ہندستانی اکیڈمی سے شایع ہوئی ہے۔ روح رواں آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ ادھر آٹھ سال میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ مختلف رسائل میں تو ضرور شایع ہوتا رہا لیکن اس کا کوئی مجموعہ طبع نہیں ہوا۔ رواں مہاتما بدھ کے بڑے معتقد تھے اور ان کی شان میں ایک طویل مثنوی لکھ رہے تھے جو قریب قریب پایہ تکمیل کو پہونچ چکی ہے امید ہے کہ بابو کرتا کرشن صاحب جو آپ کے برادر حقیقی اور ہائی اسکول موراواں میں اسسٹنٹ ماسٹر ہیں آپ کے تازہ کلام کی تدوین اور مثنوی کی طباعت کی طرف خاص توجہ مبذول کرینگے۔

رواں بہت حاضر دماغ اور بیدار مغز تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ موراواں آئے تھے اور اوناؤ واپس جانے کے لئے اپنی موٹر کار پر بیٹھ چکے تھے کہ اڈیٹر صاحب ہائی اسکول موراواں میگزین پہونچے اور آپ سے میگزین کے لئے کچھ کلام دینے کی درخواست کی۔ آپ نے جیب سے کاغذ نکال کر چار رباعیاں فوراً لکھدیں ان میں سے ایک یہ تھی۔

اپنی تقدیر آزمانے کے لئے آداب وادب میں دل لگانے کے لئے
اسکول کی زندگی بھی کیا شے ہے رواں کہتے ہیں یہاں سے جلد جانے کے لئے

ایک صاحب کہیں ملازم تھے مالک نے دوران سال میں سر دربار جواب دیدیا۔ ان کی خوبی قسمت دیکھئے کہ دوسری جگہ بہتر ملازمت مل گئی اس پر انھوں نے کہا۔

لطف ستم نما کیا، کاٹ کے پر جدا کیا
اہل چمن کے سامنے اور بھری بہار میں

جب کسی نے رواں سے یہ واقعہ بتایا اور شعر کہا تو آپ نے فرمایا بہتر تھا کہ "کاٹ کے پر جدا کیا" کے بجائے "باندھ کے پر جدا کیا" ہوتا۔ [illegible]

خوبی اہل نظر سے چھپی نہیں ہے۔

جب علالت کا زیادہ غلبہ ہوا تو ایک شعر کہا اور اس کے بعد پھر کچھ سری نہیں گئے حتی کہ دست اجل نے دامن ہستی چاک کر دیا۔

وہ شعر یہ ہے ؎

موت کی آغوش میں شاید سکون دل بھی ہو
زندگی کا زندگی والوں کو یہ پیغام ہے

رواں نے دکھلا دیا کہ شاعر کو مستقبل کا کہاں تک علم ہوتا ہے آپ کا شعر ہے۔ ؎

مرے بعد اور پھر کوئی نظر مجھ سا نہیں آتا
بہت دن تک کرینگے سوگ اہل خاندان میرا

واہ رواں صاحب! مدتوں قبل ایک واقعہ کو نظم کر دیا۔

رواں کو غزلیات کے علاوہ رباعیات میں خاص ملکہ تھا کئی انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ سلاست و روانی، درد و تاثیر، احساس قومیت اور فلسفیانہ مسائل آپ کی شاعری کے خاص جوہر ہیں۔ اس وقت روح رواں میرے پیش نظر ہے۔ اسی سے کچھ اشعار و رباعیات بطور نمونہ کلام دیتا ہوں۔

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کی یاد کرتے ہیں فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں

سکوت بے محل تقریر بے موقع کی تہمت کیوں اٹھانا ہو تو یوں ہم کو اٹھادو اپنی محفل سے

گذاری اتنی مدت قید میں صیاد کی میں نے کہ اب ڈھونڈے نہیں ملتا چمن میں آشیاں مجھکو

محافظ جان کے دشمن ہیں ابنائے وطن غافل رلاتی ہے لہو یہ حالت ہندوستاں مجھکو

قفس کے ہمنواؤں میں بھی باہم پھوٹ پیدا ہو نہ جانے کیا لکھا ہے ہم اسیروں کے مقدر میں

[illegible] اک سرگیں نگاہ گلو گیر ہو گئی

[illegible] [illegible] آنسو نکلتے دیکھتا

اپنے دامن میں سمیٹے ہیں خاک کوئے دوست — دل کے ذروں کو ارادہ ہے کہ پھر کام کیا

یوں تو کس کو فکر کس کو ہوش کس کو آرزو — موت سے ہوتا ہے کچھ کچھ امتیاز زندگی

ناخن ہمت شکستہ اور گرہ صبر آزما — زندگی کیا چیز تھی اور موت کس کا نام تھا

بندگی باعثِ اصلاح عمل ہو جاتی — ساتھ ہی چھوڑ دیا ذوقِ جبیں سائی نے

تسبیح کی ہیں قرباں زنار کے ہیں صدقے — دونوں میں مگر مجھ کو پھندا نظر آتا ہے

داستانِ شوکت ماضی سے کچھ حاصل نہیں — خود اگر کچھ ہوں تو چھیڑوں قصہ اجداد بھی

رباعیات

— ۲ —

تبلیغ ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے — آزادی دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے — فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

— ۳ —

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے — چلنا بیکار ہے جو منزل نہ ملے
وسط دریا میں غرق ہونا اچھا — اس سے کہ نظر میں آکے ساحل نہ ملے

— ۴ —

پابندی ذوق اہل دل کیا معنی — دلچسپی جنسِ مضمحل کیا معنی
اے ناظم کائنات کچھ تو بتلا — آخر یہ طلسم آب و گل کیا معنی

— ۵ —

یہ ہستی جزو، کل نہیں ہونے کی — ہستی پابندِ کل نہیں ہونے کی
محفل بدلے لگن بدل جائے۔ مگر — یہ شمع حیات گل نہیں ہونے کی

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں — رازِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیال اہل دنیا ہیں مگر — اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

انوار الحق۔ انوار

افکارِ تازہ

جناب حکیم صاحب اورنگ آبادی

نگاہِ شوق ہو کیا رخنہ زن کہ تاب نہیں — تجلیات ہیں حائل، وہاں نقاب نہیں

نہ ٹوٹ جائے کہیں دل، ذرا خیال رہے — اگرچہ کاسۂ چینی نہیں، حباب نہیں

الگ جہاں سے ہے اس حسن و عشق کی دنیا — یہاں جو بات ہے اس کا کہیں جواب نہیں

وہ بھولے پن سے یہ باتیں بنائے جاتے ہیں — مرے سوال کا لیکن کوئی جواب نہیں

اک آرزو جو بر آئی تو دوسری موجود — جو کامیاب ہیں، وہ بھی تو کامیاب نہیں

تو پہلے حسنِ طلب، ذوقِ صدق پیدا کر — حریمِ دوست میں "ہاں" کے سوا جواب نہیں

بجا ہیں تیری دُر افشانیاں، مگر ناصح! — یہ ایسے موتی ہیں جن موتیوں میں آب نہیں

قصور اپنی نگاہوں کا ہے، وگر نہ کلیم! — جمالِ یار عیاں ہے تہِ نقاب نہیں

نگاہِ مست نے صبر و قرار لوٹ لیا — سکون دل میں نہیں چشمِ تر میں خواب نہیں

بہار آئی تو آنے دو ہم سے کیا مطلب؟ — وہ ہمنشیں نہیں، ساقی نہیں، شراب نہیں

جفائے دوست میں ہے ایک لذتِ جاں بخش — غضب تو یہ ہے کہ وہ مائلِ عتاب نہیں

جنابِ شیخ! ہم آلودۂ گناہ سہی، — یہ نکتہ چینی حضرت بھی کچھ ثواب نہیں

الٰہی! تیرا کرم دے رہا ہے درسِ عمل — نہیں تو ہوش میں جو آئے وہ شباب نہیں

نجومیوں کی پریشانیاں ہیں خود شاہد
حکیم قابلِ تعبیر میرا خواب نہیں

"روٹھنا"

ایک جرمن مضمون کا چربہ

جناب محمد عتیق اللہ خاں صاحب بی۔ اے

تعلیم یافتہ عاشقوں کے رسم و رواج کے مطابق میں بھی اپنی منسوبہ کو پیار سے "قمری" کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔ مگر اب میں اپنی بیگم صاحبہ کو جب وہ مجھ سے کبیدہ خاطر ہوتی ہیں "قمری خاموش" کا لقب دیتا ہوں اور جب ازدواجی فضا بادلوں سے پاک و صاف ہوتی ہے تو انھیں "قمری بے بال و پر" کہہ کر پکارتا ہوں۔ پہلے روز جب میں نے قمری بے بال و پر کی اصطلاح استعمال کی تو بیگم صاحبہ نے ذرا لال ہو کر اس کی وجہ دریافت کی۔ میں پریشان سا ہو گیا کیونکہ دروغ مصلحت آمیز کا ابھی مجھے محاورہ نہ ہوا تھا اور نہ ہی مجھے یہ علم تھا کہ ازدواجی زندگی میں دروغ گوئی کتنا اہم اور سکون خیز حربہ ہے۔ میں نے ان کے گلابی ہونٹوں کے درمیان کیک کا جو انھیں نہایت مرغوب ہے ایک ٹکڑا رکھتے ہوئے کہا۔

"میری لاڈلی بیگم صاحبہ! میں آپ کو بے بال و پر اس لئے تصور کرتا ہوں کہ مجھے اس خیال سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے ہر دم کھٹکا رہے گا کہ کہیں آپ پر پرزے تول کر پرواز ہی نہ کر جائیں۔"

میں شاعرانہ اور نہایت غمگین آواز میں کہنا چاہتا تھا کہ "اور اللہ میاں آپ جیسی حسین قمری کو جنت کے کسی سرو پر نشیمن بنانے کے لئے طلب فرمالیں" مگر انھوں نے سلسلہ کلام منقطع کر دیا اور فرمانے لگیں۔

"لعنت ہے آپ کے بیہودہ اور ذلیل خیالات پر، میں بھی کوئی بیسوا ہوں کہ اپنے عزیزوں کو اپنے گھر بار کو اور اپنے میاں کو لات مار کر بھاگ جاؤنگی۔"

میری معروضات سننے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ میری خوشامدوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ بھویں تن گئیں اور بس روٹھ گئیں۔

میری منتیں۔ میری گڑگڑیاں۔ میری صلح جوئیاں حتیٰ کہ میری خاموشیاں بالکل رائگاں گئیں۔ میں سراسیمگی کے عالم میں کمرے میں بھاری قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ میرا چہرہ ہر نوعیت کے جذبات —— محبت، نفرت، غصہ، غضب، پریشانی اور مایوسی —— کا آئینہ دار تھا، مگر بیگم صاحبہ چپ سادھے رہیں، اب مجھ پر روشن ہوا کہ حوا کی بیٹیاں کس انداز سے روٹھتی ہیں۔

صنف نازک کا یہ شہرہ آفاق وصف تمام عمر میرے ذہن سے مٹایا نہ جا سکے گا۔ ازدواج کی طلائی زنجیروں میں مقید ہوئے ابھی سالم مہینہ بھی نہ گذرا تھا کہ میری مسرتوں کا سورج برج سرطان میں داخل ہو گیا۔

روٹھنے کے وقت بیگم صاحبہ کرسی پر متمکن تھیں۔ اول تو کرسی پھرا کر پشت ہماری طرف کر دیگئی۔ پھر سرکتی سرکتی کرسی ایک کونے میں پہونچ گئی اور اس کے بعد بیگم صاحبہ اپنے کمرہ میں مقفل ہو گئیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں مجھے مختلف علوم سے علاقہ رہا ہے جیسا فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، تواریخ اور علم ادب وغیرہ سے میں واقف ہوں مگر روٹھنے کے مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر بیگم صاحبہ کی تشریف آوری سے پہلے غور کرنے کا موقع میسر نہیں ہوا تھا۔ اب ذاتی مشاہدہ تجربہ اور تحقیق سے جو چند مسلمہ اصول مجھے معلوم ہوئے ہیں عرض کئے دیتا ہوں۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا میں امید ہے بہت سود مند ثابت ہونگے۔ کیونکہ جب ہمارے لیڈر اس مسئلہ پر عبور حاصل کر لینگے تو ان کا وقت دل اور دماغ قوم کے لئے وقف ہو جائے گا۔

"روٹھنا" مردوں کی حکمرانی کے خلاف گوریلا نما جنگ کا اعلان ہے اور یہ جنگ ایسی ہے کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ عورتوں کی فتح ہوا کرتا ہے۔ بھلا آپ کے منطق کا توپ خانہ کس کام کا جب کہ فلیتے میں آگ لگانے والے ہاتھ ہی شل ہو جائیں۔ آنسوؤں کے پانی سے فلیتہ ہی گیلا ہو جائے اور فریق مخالف کے کان ہی خندق گیر ہو جائیں۔ آپ کے سب دلائل ایک طرف دھرے

کے دھبے بھی رہ جائیں گے خواہ ان میں دس ہزار نکات آپ کی حماقت پر کمربستہ ہی کیوں نہ ہوں۔ صنف نازک کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ آپ انہیں مشتعل کے اتھاہ سمندر میں کتنے ہی غوطے کیوں نہ دیجئے مرغابی کے پروں کی طرح ان کے دماغ ہمیشہ صاف ستھرے ہی رہینگے۔ آپ کی دلیلوں کے بے پناہ تیر ان کی خداداد زرہ بکتر پر ہرگز کارگر ثابت نہ ہونگے۔

عورتوں کے ترکش میں جنگ کا سب سے خطرناک حربہ ان کی زبان ہے اس کے استعمال کے دو طریقے ہیں اوّل "روانی" اور دوم "سکوت" پہلا طریقہ یورش کے لئے مخصوص ہے اور دوسرا ہر موقع و محل پر کام آتا ہے اور اثرات میں سب سے زیادہ ہمہ گیر اور خطرناک ہے۔ اگر آپ کے پاس قوت برداشت کی کمک موجود ہے تو آپ زبان کی یورش کو نہایت اطمینان سے روک سکتے ہیں۔ مگر سکوت کی صورت میں (جسے گھریلو جنگ کی اصطلاح میں "روٹھنا" کہتے ہیں) آپ کی تمام قوتیں اور سیاسی چالیں بازیچہ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ایسی حالت میں مجبوراً آپ کو پسپا ہونا پڑیگا اور ہر ممکن شرائط پر صلح کرلینی ہی سیاست دانی کا معراج سمجھا جائیگا۔

اگر مرد کبھی خشمناک بھی ہو تو عموماً اس کا دماغ غصہ کے سیاہ بادلوں سے بلند رہے گا لیکن خدانخواستہ حوا کی کوئی بیٹی روٹھ جائے تو اس کے خشم آلود چہرہ پر صلح کی ایک بھی کرن آپ کو درخشاں نظر نہ آئیگی۔ جب کبھی میں اپنی بیگم صاحبہ سے جنگ آزما ہوتا ہوں (ایسا موقع کبھی شاذونادر ہی آتا ہے) تو مجھے کامل یقین ہوتا ہے کہ نصف گھنٹے کے مختصر وقفے میں ضرور صلح ہو جائیگی مگر میری روٹھنے والی قمری ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اگر ایک دفعہ دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے تو عمر بھر نہیں مٹ سکتی۔

جنگ کے دوران میں ایک معمولی سی غلط فہمی جس کا ازالہ آج تک نہیں ہوسکا بیگم صاحبہ کو اور بھی مشتعل کر دیتی ہے جس سے منزل صلح بعید تر ہو جاتی ہے۔ میں نہایت سنجیدہ لہجے میں ان کا نام لے کر "قمر" کہہ کر مخاطب کرتا ہوں اور ان کو سمجھانے کی امکانی کوشش کرتا ہوں مگر وہ یہ سمجھتی ہیں کہ قمری کے بجائے "قمر" کہنے سے میرا مقصد ان کے حدت غصہ سے دمکتے ہوئے چہرے کو چاند سے تشبیہ دینا ہے۔ سبحان اللہ! اب آپ ہی اندازہ لگا لیجئے کہ گوریلا جنگ میں وہ کس قدر مشاق اور آزمودہ ہیں۔

بارہا میں نے بیگم صاحبہ سے عرض کیا ہے کہ خدارا آپ جنگ سے پہلے ہمیں پہلے مجھ سے لکھوا لیجئے کہ آئندہ نبرد آزمائی میں آپ راستی پر ہونگی اور میں غلطی پر۔ مگر وہ اس سودے سے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میری گھریلو زندگی کا کیلنڈر پریشان کن دنوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے یہ امر میری زندگی کے کیلنڈر کو اور بھی تاریک اور بھیانک بنا دیتا ہے کہ ان کے روٹھنے کا وقت اور دن تو یہ مرض شروع ہوتے ہی مجھے معلوم ہو جاتا ہے مگر یہ ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ کس وقت اور کس دن اس مرض کا حملہ ختم ہوا ہے ہماری بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ اتنے غیر محسوس پر صحتیاب ہوتی ہیں کہ ہمیں قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ کب راضی ہوگئیں یکایک ہم خود کو وہی پرانی بےفکر اور پرکیف زندگی بسر کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ کون سے خوش قسمت ستارے کے باعث ہمیں گمشدہ دولت پھر میسر ہوگئی ہے۔

ایک مرتبہ بیگم صاحبہ نے نہایت رازدارانہ انداز میں ہم سے کہا تھا کہ "کچھ مجھ ہی پر تو موقوف نہیں ہر عورت کی یہی حالت ہے۔ غصہ معراج پر پہونچ کر یکایک ہی فرو نہیں ہو جاتا بلکہ گھڑی کی سوئی ڈائل کے گرد کئی مرتبہ چکر کاٹ لیتی ہے جب کہیں ان کا دل سکون آشنا ہوتا ہے۔ عورتیں بچہ تو ہیں نہیں کہ کھلونا ہاتھ میں دیدیا تو روتے روتے چپ ہوگئیں" (میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بچوں کی طرح چمکدار چیزیں ان کے لئے بھی بیحد جاذب توجہ ہیں۔ بیگم صاحبہ مچل ہی رہی ہوں تو ذرا کوئی زیور یا زرق برق ساڑھی خرید لائیے اور خود تجربہ کر لیجئے) ہاں یہ بہت ممکن ہے کہ غصہ کے بیک وقت فرو ہو جانے سے صنف نازک کی روحانی گھڑی کو کچھ نقصان پہونچنے کا احتمال ہو۔

بیگم صاحبہ اگر ہمیں اس بہشت سے جہان کی ذات نے ہمارے لئے تعمیر کیا ہوا ہے گھنٹوں یا دنوں کے لئے خارج کر دینے کی عادی ہیں تو اس کا الزام بھی مجھ ہی پر عاید ہوتا ہے۔ کیونکہ میں نے غیر ارادی طور پر انہیں گھر کی حکومت میں برابر کا حصہ دار بنا لیا ہے حالانکہ ہندوستان میں رہتے ہوئے مجھے ہندوستانی طرز حکومت پر نگاہ رکھنی چاہئے تھی۔ عورت مجموعہ ہے تلون مزاجی۔ ناشکرگذاری۔ غصہ اور وہم کا۔ اس لئے آئین حکومت سے اسے دور کا بھی لگاؤ نہیں (ساتھ ہی عورت کی صفات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ورنہ بیگم صاحبہ تجدید جنگ کا اعلان کر دینگی۔ عورت خوشبودار پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ لذیذ پھلوں کا ایک خوشہ ہے اس میں رنگ و بو ہے۔ حسن ہے۔ مذاق ہے اور سب صفات سے افضل صفت احساس محبت ہے)

میرے نکتہ نظر سے چونکہ دونوں ایک سلطنت میں حکمرانی نہیں کر سکتے اس لئے ملک کے امن و امان کی خاطر ایک کو لازماً حکومت چھوڑنی پڑے گی ایک مشہور سیاست داں کا قول ہے کہ ـــــ "ملوکیت کی سنگلاخ چٹانوں پر امن کا محل قائم ہے۔ جمہوریت کی موجیں اس کی گرد تک کو نہیں پا سکتیں" دیکھ لینا کہ دنیا ایک دفعہ پھر ملوکیت کی طرف بھاگے گی۔ اور ہم بھی اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں۔

اب حل طلب مسئلہ فقط یہ باقی ہے کہ حکومت سے دستبردار کون ہو؟؟؟۔

ریویو:- سعیدی ڈکشنری

مولوی محمد منیر صاحب تنویر صدیقی لکھنوی نے یہ اُردو لغت مرتب کی ہے جسے حاجی محمد سعید صاحب مالک مطبع مجیدی کانپور نے درسی تقطیع کے ساڑھے تیرہ سو صفحات میں شائع کیا ہے۔ اس لغت میں اُن عربی، فارسی، ہندی، ترکی، عبرانی، انگریزی، سنسکرت الفاظ کے مختصر معنی بیان کئے گئے ہیں جو اُردو زبان میں رائج ہیں ساتھ ہی محاورات کا مطلب بھی دیا گیا ہے کل مجموعہ الفاظ ۲۳ ہزار چار سو ہے چند ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں الف سے انگریزی سیاسی اصطلاحات کے معانی بیان کئے گئے ہیں۔ ضمیمہ ب میں قانونی اصطلاحات کا مفہوم دیا گیا ہے ج میں اہل زبان کے فارسی اُردو محاورے ہیں۔ ضمیمہ د میں اُردو محاوروں کے مرادف انگریزی محاوروں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ڈکشنری طلبہ کے لئے بہت مفید ہے۔ اب تک طلبہ کے لئے جو ڈکشنریاں مرتب ہوئی ہیں ان میں یہ سب سے جامع۔ مکمل اور کارآمد ہے، قیمت مجلد چار روپے ہے اور مطبع مجیدی کانپور سے مل سکتی ہے۔

غزل

از جناب علی احمد صاحب علی فرزند نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

ہجر میں اُن کے پیار کی باتیں ہیں خزاں میں بہار کی باتیں

ہائے مجھ سے وہ یار کی باتیں لطف کی باتیں پیار کی باتیں

سحر و شام دل سے کرتا ہوں! عارض و زلف یار کی باتیں

وصل کا وعدہ پھر کیا تم نے پھر وہی انتظار کی باتیں

ساقیا بے پیے بہلا جاؤں! یہ نہیں اختیار کی باتیں

نرگسِ باغ سے میں کرتا ہوں چشمِ جادوئے یار کی باتیں

آج گلشن میں کوئی پھول نہیں کل تھیں محفل میں ہار کی باتیں

ہو گیا خوں دل ہر اک گل کا سنتے سنتے ہزار کی باتیں

اے علی کیا اثر کریں دل پر

واعظِ بادہ خوار کی باتیں

مسلمان اور تجارت

جناب خواجہ غلام دستگیر صاحب پٹنی (اورنگ آباد)

مسلمانوں کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کو مقیاس قرار دیکر بعض نادان اور حسد پیشہ یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ تجارت جیسے مبارک پیشے سے ہمیشہ گریز کرتے آئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی ان میں تجارت کی اہلیت نہیں ہے۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد و معلق ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق کو تحقیق کے ہاتھوں سے الٹ کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت ارباب دانش و بینش پر مخفی نہ رہے گی۔ محض نادانی کی وجہ سے ایسے لایعنی اعتراضات کا قائم کرنا گویا آفتاب عالمتاب پر خاک اڑانا ہے۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں اس مبارک پیشہ کو نہایت عزت اور واجبی توقیر حاصل تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ ان کے ہادی حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاوہ اور بیشمار خصائل اور عادات کے تجارتی اولوالعزمیوں اور دیانت داری سے جو تجارت کا اصل الاصول ہے عوام عرب اور خصوصاً خدیجۃ الکبریٰ کی نظروں میں اس درجہ تک اعتبار پیدا کیا تھا کہ جب اسلام کی اشاعت آنحضرت صلعم نے اپنے ذمہ لی تو چونکہ ان کے دشمنوں نے آپ کو پہلے ہی نہایت صادق القول دیانتدار اور پکا ایماندار تسلیم کر لیا تھا۔ اس لئے کوئی الزام بے ایمانی کا کبھی نہ دے سکے۔ اس سلسلہ میں آپ دو وقت شام تشریف لے گئے تھے اور یہی حال آپ کے اصحاب کبار کا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بچپن سے تجارت کا پیشہ کرتے تھے۔ آپ کی تجارت ایک طرف یمن اور دوسری طرف شام تک پھیلی ہوئی تھی (الصدیق مطبوعہ امرتسر صفحہ ۶) حضرت عمر فاروق رضؓ کا ذریعہ معاش بھی تجارت تھا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ آپ نے جاہلیت کے زمانہ میں عراق اور شام کے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے عرب و عجم کے بادشاہوں سے بھی ملے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ و عثمان بزازی کی دکانیں کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص تیر بنا کر بیچا کرتے تھے۔ زبیر بن عوام صحابی تحم فروش تھے (فلاح دارین مولفہ محمد اسمٰعیل) اسی تجارت کی بدولت وہی مسلمان جو دس سال پہلے نان شبینہ کو محتاج تھے خلیفہ ثانی کے عہد حکومت میں اس قدر مالدار ہو جاتے ہیں کہ ایک شخص دوسرے کو زکوٰۃ دیتا ہے تو وہ یہ کہہ کر واپس کرتا ہے کہ میں بھی صاحب نصاب ہوں اور اسلام نے مجھے بھی امیر بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے یہاں بہ نظر دینی و دنیوی تجارت ایک مستحسن اور ضروری چیز ہے اور جہاں تک اس کی کوشش اور اقوام شائستہ کی پیروی اور اپنے برگزیدہ ہادی کا تتبع کیا جائے مستحسن سمجھا جائے گا۔

تمام اہل یورپ کی شائستہ قومیں اب بھی معترف ہیں کہ عرب کے برابر کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی کہ جس نے اس خوبصورتی اور تیزی کے ساتھ دنیا میں عروج حاصل کیا اور تہذیب و تجارت پھیلائی ہو۔ انھوں نے اس قدر ذکاوت اور ذہانت دکھائی اور ترقی میں جلدی سے ایسے بلند درجہ کو پہونچ گئے کہ جس کی مثال بجز وہم و خیال کے اور کہیں عالم امکان میں نظر نہیں آتی۔ سلطنت روم کو جو کمال اپنے اچھے سے اچھے زمانہ عروج میں نصیب ہوا تھا وہ عربوں نے ایک ہی صدی میں مذہب اسلام اور زبان عرب کو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور سرسبز ملکوں میں پھیلا دیا۔ مشرق میں سرحد چین سے لے کر مغرب میں فرانس کے میدانوں تک تمام ملک خلفاء عباسیہ کے اطاعت گذار تھے اور فرمانبردار۔ افریقہ میں بھی انھیں کا سکہ چلتا تھا۔ ایشیا میں بھی مسلمانوں کا ملک اتنا وسیع تھا کہ جس کا رقبہ تمام ملک یورپ سے زیادہ تھا۔ جہاں اسلام کا جھنڈا گڑ گیا اس جگہ تہذیب نے نہایت جاہ و جلال کے ساتھ اپنا جلوہ دکھایا۔ عربوں نے دنیا

کے علوم قدیمہ کی ہزارہا کتابوں کا ترجمہ کیا اور نہایت کوشش سے اس کو سیکھا۔ رفتہ رفتہ علم فلاحت صنعت اور فلسفہ میں انھوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ اہل روم اور یونانیوں کے ہنرمندوں اور علماء کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔ درحقیقت یہ لوگ ان کے کمالات کے سامنے وحشی سے معلوم ہونے لگے تھے انھوں نے مدارس اور بیت العلوم قائم کئے علم ادب میں جان ڈالی۔ نظم اور موسیقی میں ترقی کی اور فن تعمیر میں تو ایسا کمال حاصل کیا کہ بے نظیر مکانات کی تعمیر سے دنیا کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا اور ایک نئی دنیا بن گئی جن کا قدیم زمانہ میں کبھی کسی کو خیال بھی نہ تھا سچ ہے کہ نقاشی اور معماری کا جاہ وجلال اور شان وشوکت انھوں نے اس درجہ کو پہونچایا تھا کہ اس وقت تک باوجود ہر گونہ ترقی کے فن تعمیر عربوں کی تعمیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جب عربوں کی بادشاہت اندلس پر تھی اس زمانہ میں تمام حال کی قومیں جہالت کی پستی میں پڑی ہوئی تھیں اور چاروں طرف شب دیجور کی سی تاریکی چھا رہی تھی۔ صرف عربوں ہی کے ممالک مفتوحہ میں مدرسہ اور بیت العلوم جاری تھے۔ فلسفہ اور تاریخ کے پودے اسی جگہ لگائے جارہے تھے نیز اس بات پر بھی مورخین متفق ہیں کہ جب رومیوں کی سلطنت کو عروج حاصل ہوا تو اس وقت رومیوں نے مفتوحہ ملکوں کو لوٹ کر اپنے دارالسلطنت اور اپنے ملک کو آراستہ کیا تھا۔ برخلاف اس کے خلفاء عرب نے نہ تو کسی ملک مفتوحہ کو کبھی لوٹا اور نہ کسی ملک سے مال و اسباب لاکر اپنی سلطنت کو رونق دی بلکہ خود ممالک مفتوحہ کے بہت سے مقاموں پر ہزاروں شہر بسائے اور ان کو رونق دی اور تجارت وصنعت کی منڈیاں اور کارخانہ جابجا قائم کئے۔

قرائن اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ تجارت کی ابتداء عرب شامی اور ہندیوں سے ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ اہل اسلام اپنے زمانہ میں تجارتاً کل اقوام سابقہ سے بڑھ چڑھ کر تھے اور انھوں نے اپنی فتوحات روزافزوں کے ساتھ نہایت عمدہ عمدہ موقعوں پر منڈیاں قائم کی تھیں چنانچہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے ہندوستان کی تجارت کے لئے شہر بصرہ کی بنیاد ڈالی۔ خلیفہ منصور نے بغداد بسایا۔ قسطنطنیہ کو سلطان محمد ثانی نے فتح کرکے اپنا مستقر سلطنت قرار دیا۔ اسکندریہ جبرالٹر۔ عدن۔ وغیرہ کی تجارت کو مسلمانوں نے بہت کچھ ترقی دی اور جس طرح بندرگاہ اسکندریہ کو ایک نہایت عمدہ موقع تجارت پر اسکندر اعظم نے آباد کیا تھا جو اس کی عقل و فراست کی شاہد حال ہے اسی طرح بہت سے نامی تجارتی شہر جو کلید بحر قرار دیئے جاتے ہیں مسلمانوں کی حد بینی اور تجارتی تبحر کی یادگار ہیں۔ مثلاً بصرہ۔ بغداد۔ جبرالٹر۔ عدن۔ وغیرہ

عباسیوں کے زمانہ کا تمدن اسلام کی تاریخ میں نہایت مشہور تھا اس زمانہ میں تجارت کو حد سے زیادہ ترقی ہوئی۔ بغداد۔ بصرہ اور ممالک اسلامیہ کے بڑے بڑے شہروں میں بہت سی تجارتی کوٹھیاں پائی جاتی تھیں۔ دارالخلافہ میں جو تجارتی چیزیں مختلف ملکوں اور شہروں سے لائی جاتی تھیں وہ یہ ہیں۔

یاقوت اور ہیرے ہندوستان سے موتی بحرین سے۔ عقیق اور ہاتھی دانت حبش سے۔ کتان کے کپڑے شستر سے۔ ہلکے اونی کپڑے اور منقش پردے فسا سے۔ فرش اور جانمازیں جہرم سے۔ نرم وگرم گدے رشت سے۔ نرم ونازک کپڑے اصفہان سے۔ چمکدار کپڑے خراسان سے عمدہ ریشم کے لچھے اور لکڑی کے برتن طبرستان اور نیشاپور سے۔ کاغذ نوشادر۔ سمور اور سنجاب ماوراءالنہر سے۔ مشک تبت سے۔ اونی جانمازیں اور پشمینہ کے کپڑے بخارا سے۔ ریشمی کپڑے یونس اور دمیا سے۔ کاغذ مصر سے۔ قیمتی منقش مندیل تونس سے۔ ریشمی نقاب اور برقع جرجال سے۔ چمکدار چادریں اور منقش کنگھیاں خراسان سے۔ عود چین سے آتا تھا۔

"الاشارة الی محاسن التجارة" جو ابوالفضل جعفر دمشقی کی تصنیف ہے اس میں اس زمانہ کے تجارت کے مسلمہ اصول ہیں۔

اہل عرب اور یورپ کے تجارتی تعلقات کا پتہ ان الفاظ سے بھی چلتا ہے جو ان کی زبان میں اب تک استعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً میگزین (مخزن) کاٹن (قطن یعنی روئی) ٹیرلیف (تعریف) ایڈمرل (امیرالبحر) وغیرہ اور عربی اعداد تو اس وقت تک تمام دنیا کے استعمال میں ہے (کمپاس) قطب نما کا علم اگر عربوں نے ایجاد نہیں کیا ہو تب بھی یورپ میں عربوں ہی کی بدولت پہونچا ہے۔

دمشق۔ بغداد۔ بلخ۔ مرویہ۔ مشرق میں بڑے بڑے شہر تھے

یہاں کی تجارت اب تک زبان زد خاص وعام ہے۔ اسی طرح افریقہ میں قاہرہ۔ اسکندریہ اور ملک اندلس میں غرناطہ۔ قرطبہ۔ سیول وغیرہ تھے۔ شمالی عرب میں جہاں بابل کے بڑے بڑے میدان ہیں وہاں سے عمدہ اور عجیب وغریب نہریں نکالیں کہ جس سے وہ ملک سیراب اور آباد ہوگیا۔ ملک اندلس کے نہروں سے اس جگہ ایسی سرسبزی پھیلی کہ ضلع کے ضلع سبز باغ نظر آنے لگے اور جہاں بحر فارس کے کناروں پر ویرانہ تھا وہاں شہر آباد ہوگئے۔ بحر خزر کے کنارے جابجا تجارتی منڈیاں قائم ہوئیں اور سوداگری کا لین دین ہونے لگا۔ مصر میں از سر نو جان آگئی۔ شمالی افریقہ میں وہ رونق ہوئی کہ جس کو دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ مراکو میں دستکاری وصنعت وحرفت کو ایسی ترقی ہوئی کہ باید وشاید۔ تمام یورپ سے عیسائی امرا اور تجار کے بچے انھیں شہروں میں آتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ معاش دنیوی کے علوم۔ مسلمان بادشاہ اور امیر جب عیش وعشرت میں زیادہ مبتلا ہوگئے تو اس وقت ان کو طرح طرح کی لذت دنیوی کی طرف رغبت پیدا ہوگئی۔ پھولدار باغ لگائے جانے لگے۔ قسم قسم کے عطر اور خوشبوؤں کا استعمال ہونے لگا بڑی شاندار اور شاہانہ عمارتیں بننے لگیں۔ مکانات کے گرد نہریں۔ حوض بنائے گئے۔ جن میں نہایت صاف اور شفاف پانی رہتا اور بہتا تھا۔ نہایت عمدہ لباس اور قیمتی پوشاکیں زیب بدن ہونے لگیں۔ سرود ونغمہ کا شوق اٹھا۔ بربط نواز اور مطرب پیدا ہوئے۔ شعر وسخن کو عروج ہوا۔ یہاں تک کہ ہر شے کے حسن وجمال اور نزاکت ولطافت کی خواہش نے جلوہ دکھایا اور ان سب ضرورتوں کے رفع کرنے کے لئے ضرور ہوا کہ ملک کے آدمی صاحب کمال اور تجار ہوں۔

دمشق کے چاقو۔ چھری راس کے قلمتراش سے زیادہ مشہور تھے تلوار وہاں بے نظیر بنتی تھی اور ایک قسم کا کپڑا بھی بنا جاتا تھا جس کے اوپر نقش ونگار ابھرے ہوئے رہا کرتے تھے۔ طرابزون کے ارغوانی منقش اور مشجر دیوار گیریاں مشہور تھیں۔ اصفہان کا سوت نہایت باریک اور بے نظیر ہوتا تھا۔ مرو ریشم کی تجارت کا مرکز تھا اور ہرات میں بے بہا قالین بنا کرتے تھے اندلس میں نقرئی کام اول درجہ پر تھا۔ ان سب میں تجارتی اہمیت کے لحاظ سے دمشق کا نمبر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ شہر اپنے مرکز وسطی کی وجہ سے یورپ اور ایشیا دونوں اقلیموں کا تجارت گاہ بنا ہوا تھا۔ جہاں ثروت ودولت کی نہریں بہہ رہی تھیں اور اس شہر کا حسن موقع اور تجارتی مناسبتیں اس کے لئے ذمہ دار ہوگئی تھیں اس لئے کہ یہ شہر ملک حجاز کا دروازہ کہلاتا تھا۔ ہر سال بلاد عجم اور اناطول اور عراق وغیرہ ممالک سے وہاں حجاج کی فوجیں چلی آتی تھیں جن کی وجہ سے وہاں تجارت کا بازار گرم رہا کرتا تھا اسی طرح بخارا بھی وسط ایشیا میں تجارت کی بڑی منڈی تھا۔ شہر کے چاروں طرف راستے جاری تھے جو قافلے کہ مغرب سے یہاں آتے تھے وہ بحر خزر کے مشرقی کنارے سے استرآباد کے ایرانی سرسبز صوبہ میں ہوکر گذرتے تھے۔ بال فروش۔ اشرف، استرآباد۔ مشہد۔ سرخس۔ مرو کے سے جو کسی زمانے میں شاہان سلجوقیہ کا دار الخلافہ تھا بخارا میں پہونچتے تھے۔ بخارا میں شمال مشرق میں چار سو میل پر شہر خوجیل اور خوکان واقع ہے۔ تمام قافلے ان شہروں کی راہ سے ممالک کاشغر اور یارقند کو جاتے تھے جو یہاں سے چھ سو میل دور ہے وہاں سے بخارا میں لوہا، فولاد، تانبا، پیتل، پارا، شنگرف، مرجان، سونا اور چاندی آتی تھی۔ اور شہر بخارا سے اس کو سیاہ بھیڑوں کی کھالیں اور ریشمی ایرانی کپڑے اور جواہرات بدخشانی بھیجے جاتے تھے۔ کاشغر بخارا۔ یارقند میں ظروف چینی اور چینی ساخت کی چیزیں آتی تھیں۔ فارس سے شالیں اور کرمان سے اونی کپڑے آتے تھے اور نیرو، اصفہان سے ریشمی کپڑے کا چوبی سامان ظروف مسی۔ ہمدان کا چمڑا اور لاجورد وہاں وہاں پہونچتا تھا۔ غرض تجارت سے بخارا کے لوگ مالامال تھے۔ نیرو ایک بڑا تجارت گاہ تھا ریشم کا یہاں بڑا کارخانہ تھا اور جو قافلے مشرق اور مغرب سے گذرا کرتے ان کا یہاں زیادہ قیام رہا کرتا تھا۔ بڑی کثرت سے یہاں کابل۔ کشمیر اور ہندوستان کے کارواں آکر ٹھہرتے اور اسی جگہ سے فارس۔ بخارا۔ عرب، ترک اور نیز یورپ کے تجار ایک دوسرے کے ساتھ معاملت کرتے تھے۔ اسی جگہ سے ہرات میں ہوکر خشکی کے راستے سے قندھار کو جاتے تھے۔

جدہ بھی بحری تجارت کی بڑی منڈی تھی اور اب بھی ہے زبان عربی میں اس کا نام جدہ یعنی دولتمند رکھا ہے جو اسم بامسمیٰ ہے یہاں کافی کی تجارت بکثرت ہوتی تھی۔ یمن سے کافی کے بھرے ہوئے جہاز سال میں ہر وقت آتے رہتے تھے اور سوتی اونی کپڑے، تسبیح کے دانوں کے عوض مبادلے میں فروخت کر ڈالے جاتے تھے۔ شہد۔ سرکہ۔ فواکہ۔ چاول۔ روئی۔ شیرینی خوشبو، لوبان، وغیرہ کی یہاں بڑی تجارت تھی۔

مسلمانوں کی تجارت کا عظیم الشان مرکز خشکی میں بغداد اور سواحل پر بصرہ تھا۔ جہاں ہر قسم کے اسباب کی نقل و حرکت ممکن تھی۔ مورخ مسعودی نے اپنی تاریخ میں نامور مسلمان تاجروں کا ذکر کیا ہے جو دنیا کے سب سے بڑے ارباب دولت کہلائے جاتے تھے۔ خزانہ مینی کی تاریخ میں جو واقعات پائے جاتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ سو برس پیشتر باشندگان جزائر میں اسلام رواج پا رہا تھا بعض سے مسلمان تاجر خاص کر عرب جزائر سماٹرہ کے مشہور بندرگاہوں میں اور اس کے قرب و جوار کے ملکوں میں آباد ہو گئے تھے۔

تاریخ کے صفحات اس بات کے ظاہر کر دینے سے قاصر ہیں کہ جزیرہ نما ملیبار میں اسلام کا آغاز کس تاریخ سے ہوا مگر اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ سن ہجری کی ابتدائی صدیوں میں عرب تجار ہی اسلام کو ان جزائر میں اپنے ساتھ لائے۔ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جب کہ عربوں کی تجارت براہ سیلون ملک چین سے شروع ہو گئی تھی اور اس کو کمال ترقی ہوئی تو آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب تاجر مقام کنٹن میں بکثرت آنے لگے۔ دسویں صدی یعنی پندرہویں صدی تک بحر الجزائر میں عرب مشرقی ملکوں کی تجارت پر تمام و کمال قابض رہے۔ ان جزائر کے مسلمان تاجر زیادہ تر شافعی مذہب رکھتے تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں جب ابن بطوطہ ان سواحل پر آیا تب بھی اسی مذہب کا زیادہ رواج تھا۔ اس ساحل کی بندرگاہوں پر جاوہ، چین، فارس اور یمن کے تاجروں کی کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی۔

عربوں کی تجارت زیادہ تر براہ خشکی ہوتی رہی ہے۔ اندلس سے لے کر چین کی سرحدوں تک سڑکوں کا بڑا جال پھیلا ہوا تھا۔ ان سڑکوں کے کنارے ہزاروں شہر اور قصبے آباد تھے جن میں سے ہزاروں سوداگروں کے قافلے گذرا کرتے تھے سوا اس کے ہر سال حج کے واسطے مسلمان دور دراز سے آتے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھتے تھے چنانچہ اس آپس کے میل جول سے ہر قسم کی تجارت کی بڑی ترقی ہو گئی تھی۔ جس راہ سے قافلے گذرتے تھے وہاں بڑے بڑے شہر بس گئے تھے اور ان کی ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے تجار مال لاتے تھے اور ان شہروں میں پہنچے تھے آپس میں مسلمان ایک دوسرے کی چیزوں کو دیکھتے تھے اور نئی نئی صنعت اور قسم قسم کے تکلفات کا علم حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگ مشرقی چین اور تاتار تک جاتے اور وہاں سے مال و اسباب لاتے اور لیجاتے تھے۔ شمال میں بحر خضر اور بحیرہ ارال سے بھی آگے بڑھ کر [illegible] کے ملک میں پہنچتے تھے اور جنوبی ملکوں سے روئی اور ریشمی کپڑا لیجاتے تھے اور وہاں سے ان کے عوض سمور اور شہد وغیرہ لاتے تھے۔

عربوں کی تجارت تری میں بھی کچھ کم نہ تھی شام کے ملک میں جو کنعانیوں کی بندرگاہیں تھیں وہ عربوں کی سلطنت میں از سر نو زندہ ہو گئی تھیں۔ سسلی اور سارڈینیا اور ممالک اطالیہ کے جنوبی حصوں پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ بحر قلزم اور خلیج فارس کے کناروں پر بہت بڑی تجارت پھیلی ہوئی تھی اور دریائے سندھ اور ساحل ملیبار اور سراندیپ سے گذر کر جزائر سماٹرہ، جاوا، بورنیو اور اس کے بھی آگے تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ سنہ ۸۹۶ء میں عربوں کی بہت سی سوداگری جہاز چین تک پہنچتے تھے مگر خشکی کو وہ زیادہ پسند کرتے تھے اسی سبب سے تجارتی جہاز چین کو بہت کم جاتے تھے۔

مسلمانوں کو تجارت سے یہی فائدہ نہ تھا کہ وہ مال سے نفع حاصل کرتے تھے بلکہ وہ تمام دنیا کی سیاحی سے نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے اکتشافات دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ دنیا کے کل سمندروں پر مسلمانوں کا پرچم اقبال لہراتا تھا اس لئے انہیں تجارت کے ضمن میں ملکوں کی حالت بھی معلوم ہوتی رہتی تھی۔ ایشیا کے سمندروں میں وہ چین و جاپان تک پہنچے تھے اور افریقہ کے دریاؤں میں مڈغاسکر تک۔ یورپ میں ناروے ڈنمارک تک یورپ کی ان سرزمینوں میں اب تک مسلمانوں کی عالیشان عمارتیں ان کی یادگاری کا ترانہ گا رہی ہیں۔ مسلمانوں نے تجارت کے ساتھ مذہب کی ترویج کا بھی بڑا خیال رکھا ہر مسلمان کی رگوں میں اسلام کا خون اس قدر جوش زن تھا کہ وہ اپنی روشنی میں دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے نفس پر مصیبتیں گوارہ کر کے سفر کرتا۔ فرمان رسول اور تبلیغ اسلام نے مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا تھا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اگلی سلطنتوں نے اپنا تسلط جمانے کا بڑا ذریعہ تجارت کو قرار دیا تھا چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے بعہد حضرت ابوبکر صدیق رض حضرت عمر فاروق رض ملک شام، مصر اور ایران کو فتح کیا تو ان ملکوں میں فاتحین تجار کو بھی اپنے ساتھ ہی ساتھ لیتے گئے۔ مسلمان تاجروں نے لوگوں کو دعوت اسلام دی دسویں صدی عیسوی سے جزائر ملایا میں مسلمانوں کا دخل ہوا۔ ساحل کارومنڈل اور ملیبار اور جزائر ملایا میں شافعیوں کا موجود رہنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں تاجروں کی بدولت ان لوگوں نے اسلام کی تعلیم پائی ہو گی دیگر جزائر فلپائن سماٹرا وغیرہ میں تاجروں نے اپنی جانفشانی سے اسلام کی خدمت ادا کی جزائر مدورا، جاوہ اور زرد لو کے اسلامی ہیرو جن کے نام ابد الآباد تک زندہ رہیں گے وہ حاجی پرواء مولانا ملک ابراہیم اور تاجر سید علی تھے غرض مسلمانوں کا زریں دور ہر حیثیت سے برتر اور معروف عالم رہا۔ منکروں کا ان محیر العقول کارناموں سے انکار کرنا کوئی نئی بات نہیں۔"

انوارِ سخن

زباں خاموش ہوگی دیدۂ تر نوحہ گر ہوگا
تمھارے ظلم کا شکوہ باندازِ دگر ہوگا،

مرے ذکرِ وفا پر شکر لانے کا سبب کیا تھا
مری جاں کچھ تو آخر آپ کے مدِ نظر ہوگا،

یہاں احوالِ دل کہنے کو آیا تھا خبر کیا تھی
مری جانب اشارہ بزم میں ہر بات پر ہوگا،

ریاضؔ[۱]ِ عشق میں بادِ خزاں کا دور آپہونچا
وہ گل پیدا کہاں اب بلبلِ شوریدہ سر ہوگا،

بظاہر اب انھیں آمادۂ الطاف پاتا ہوں
مگر واللہ اعلم آگے کیا کچھ جلوہ گر ہوگا،

مرے ضبطِ فغاں کا راز کھل جائیگا محشر میں
تمھارے ظلم کا شکوہ وہاں بیدادگر ہوگا،

میں ترکِ التجا سے ہوگیا مغرور سا گویا
بزعمِ خود مرے نالوں میں پیدا اب اثر ہوگا،

اگر ہم بے وفا ہیں ضبطِ غم کا دعویٰ باطل ہے
تمھارے ظلم جھیلے اور پھر کس کا جگر ہوگا،

شریکِ گفتگو تم کس لئے انور نہیں ہوتے
محبت میں تمھارا تجربہ کچھ تلخ تر ہوگا؟

لطیف انور، گورداسپوری،

[۱] استاذی لسان الملک سید ریاض مرحوم

ستی!

محترمہ خضر بانو صاحبہ خیسری

ستی ہونا ہندوستان کی ایک بہت قدیم رسم ہے۔ مفتی ہوں کہ یہاں کے دھرموں میں ستی ہونا ہندو عورتوں کی ایک نہایت پاکترین علامت مانی جاتی ستی چال کی تصنیفات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عہد اسلام تک یہ رسم جاری رہی۔ عرفی جیسا کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہیچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اسی مفہوم کو حضرت امیر خسرو نے کس دلگداز پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

خسرو در عشق بازی کم نہ ہندو زن مباش
کز برائے مردہ میسوزند جان خویش را

اور ایک دوہے میں فرماتے ہیں ؎

خسرو ایسی پیت کرو جیسے ہندو جوئے
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئے

ڈاکٹر برنیر صاحب شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کر رہے تھے ان کی سیاحت مس میو کی طرح وحشیانہ سیاحت نہ تھی اس نے جس واقعہ کو لکھا ہے متانت اور صداقت سے۔ ہاں کہیں کہیں جو لغزشیں ہو گئی ہیں وہ قصداً نہیں ہوا ہیں۔ سفرنامہ برنیر کے صفحہ ۱۶۹ سے ستی کا بیان شروع ہوا ہے اور متعدد صفحات تک پھیلا ہوا ہے ان کا خیال ہے کہ ستی ہونا محبت نہیں بلکہ ایک خاص طور کی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بدکاری کی وجہ سے ستی ہونا دیکھا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ستی ہوتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے۔ آفت تو یہ تھی کہ کبھی کبھی عورتوں کو جبراً جلایا گیا۔ اور ستم تو یہ تھا کہ جو عورتیں چتا سے بھاگ جاتی تھیں انھیں خاکروب کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ جو عورت ستی نہیں ہونا چاہتی تھی اسے مغل نہیں بلکہ ہر گونہ پناہ دیا کرتے تھے ڈاکٹر صاحب نے ایک کمسن لڑکی کو جلاتے ہوئے خود دیکھا تھا۔

یہ تو ہوا اسلامی دور کا افسانہ، اب موجودہ عہد پر نظر ڈالئے تو آپ کو ستی کے واقعات بہت کم ملینگے کیونکہ ۱۸۳۰ء میں لارڈ بنٹنگ نے اس قبیح رسم کو خودکشی مان کر سارے ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے بند کرا دیا۔ جب سے ستی ہونا قانوناً جرم مانا جاتا ہے تاہم کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں یہ واقعہ ہو ہی جاتا ہے۔ چند سال ہوئے باڑھ (ضلع پٹنہ) میں بھی وقوع پذیر ہوا۔ حال فی الحال کا واقعہ ہے کہ موضع اکنورہ (بلگرام ضلع ہردوئی) میں بھی ایک لڑکی ستی ہوئی ہے جس واقعہ کو ایک ہندی اخبار نے اس طرح شائع کیا ہے۔

موضع اکنورہ بلگرام ضلع ہردوئی کے پنڈت چھوٹے لال پانڈے کی بڑی لڑکی ریشم کنواری کا بیاہ ۱۹۳۲ء میں موضع سسرو تحصیل ہردوئی کے پنڈت دین دیال مشر کے لڑکے بنسی دھر کے ساتھ ہوا تھا۔ اس وقت بر کی عمر ۱۷ یا ۱۸ برس اور کنیا کی ۱۵ یا ۱۶ برس کی تھی۔

گذشتہ ۱۷ جون کو خبر ملی کہ لڑکا بہت بیمار ہے اور ریشم کنواری کو یاد کرتا ہے۔ جب ریشم کنواری چلی تو اس کو راستہ ہی میں خبر مل گئی کہ لڑکا مر گیا اس پر بیل گاڑی مڑی اور شام کو سامڑی پہونچی جہاں لوگ اس لڑکے کی لاش کو لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ریشم کنواری لاش سے لپٹ گئی اور اس کا منہ کھول کر دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بیہوش ہو گئی اور پھر اس نے ستی ہونے کا اعلان کیا اسے روکا گیا اور ۱۸ تاریخ کو قریباً جبراً اس کو بیل گاڑی میں لاکر اکنورا روانہ ہو گئے لاش گنگا جی کی طرف لیجائی گئی۔ اکنورا پہونچ کر ریشم کنواری کو بہت سمجھایا گیا۔ ریشم کنواری نے کنوئیں پر جاکر غسل کیا اور سمجھانے والوں سے کہا کہ میں ستی ہونگی۔ وہ ایک کوٹھری میں چلی گئی لوگ سمجھانے لگے

لیکن وہ چلانے لگی اس کے چچا کوٹھری کے دروازے پر گئے ریشم کنواری تھوڑی دیر میں کہنے لگی کہ میرے پتی کی چتا میں آگ دیدی گئی ہے میری دیہ جلنے لگی مجھے چھوڑ دو نہیں تو گھر بھسم ہو جائیگا۔ اس پر اس کے چچا ہٹ گئے کہا جاتا ہے کہ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے دیپک کی روشنی کے برابر لپٹیں نکل رہی تھیں ریشم کنواری نے پکارا اگر کوئی مجھے چھوئیگا تو وہ کوڑھی ہو جائیگا۔ لوگ ڈر کر ہٹ گئے اور پیپل کے نیچے جہاں اس کے شوہر کی لاش رکھی گئی تھی وہاں پر پتی پہنچا کر اس نے آسن بچھایا اور سورج کی طرف ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے تھالی سے کچھ اٹھا کر ادھر پھینکا اور پتی کا نام لے کر سر سے ساری ہٹائی اور سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ اتنے ہی میں آگ بھڑکی اور لپٹ اٹھی جس نے پیپل کی چوٹی تک کے پتوں کو جھلسا دیا۔ اور لپٹوں نے ریشم کنواری کو چھپا لیا۔ وہ رام نام جپتی ہوئی جھجکی پھر اٹھی اس کے بعد پھر لپٹ اٹھی اور اس لپٹ کے ساتھ اس کی جان نکل گئی۔

لوگوں نے چندن گھی اور کشتے ڈالے اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں راکھ کی ڈھیر لگ گئی۔

پولیس نے اکوڑا پہونچ کر جانچ کی۔ وہاں کے زمیندار خان بہادر جناب چودھری سید سالار شاہ کے بھانجے جناب سید مقبول حسن صاحب نے وہاں پر ایک مندر اور چبوترہ بنانے کا انتظام کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ستی وہ ہونے کی جو علالت بتائی گئی ہے وہ یہی ہے جسے میں اوپر بیان کر چکی۔ ورنہ کسی کی ترغیب، مصلحت، یا وقتی جوش محبت میں ستی ہو جانا واقعی جرم ہے۔ لیکن اسلام نے جو قانون بنا لیا ہے وہ نہایت ہی اعلیٰ ہے وہ سبب ہے ان محصنات کی پاک زندگی کا جو اپنے شوہروں کی محبت میں (چاہے وہ مردہ ہو یا مفقود الخبر) بہت ہی احتیاط اور پاک دامنی کے ساتھ بسر کرتی ہیں اس رسم جوہر سے کہیں اعلیٰ ہے جسے نہ کوئی قانون روک سکتا ہے نہ کوئی تمدنی بندش۔

خضر بانو خیری

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۲۲ فہرست مضامین عالمگیر ماہ فروری و مارچ ۱۹۳۵ء عیسوی نمبر ۲ و ۳

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر [illegible] لاہور سے شائع کیا

مُلاحظات

عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۵ء آپ ملاحظہ فرما چکے اب عیدالضحےٰ کے موقعہ پر عالمگیر کا معرکہ آرا عید قربان نمبر ملاحظہ فرمائیے ۔

عالمگیر کا عید قربان نمبر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہمہ وجوہ اس قدر کامیاب ہوگا کہ اتنے کم عرصہ میں ایسے قابلِ قدر عید نمبر کی اشاعت پر آپ کو حیرت ہوگی ۔ مجھے یقین ہے کہ عالمگیر کے ناظرین کرام کے لئے یہ عید نمبر فی الحقیقت عید کا ایک بہترین تحفہ ثابت ہوگا ۔

عید نمبر کے تمام مضامین اور افسانے اپنا جواب نہیں رکھتے متعدد رنگین اور یک رنگ تصاویر نے عید نمبر کی خصوصیت میں چار چاند لگا دئیے ہیں ۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں کماحقہٗ تصاویر اور مضامین کے متعلق کچھ عرض کرسکوں ۔

ادارۂ عالمگیر اور عالمگیر الیکٹرک پریس کا عملہ بیحد مصروفیتوں کے باوجود شب و روز اس کوشش میں مصروف ہے کہ عید نمبر عید سے پیشتر عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کی خدمت میں بھیج دیا جائے اگرچہ کام بہت زیادہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ عید نمبر ضرور بر وقت شائع ہوجائے گا !

زیرِ نظر شمارہ فروری و مارچ کی مشترکہ اشاعت ہے عید نمبر ایک زائد پرچہ ہے ۔ اس لئے عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کی خدمت میں حسبِ معمول بذریعہ وی پی حاضر ہوگا ۔ اس کے بعد یکم اپریل کو اپریل کا پرچہ بدستور شائع ہوگا ۔ ادارۂ عالمگیر کی طرف سے ہر سال عید نمبر شائع ہوتا ہے، اور عالمگیر کے تمام پرانے خریدار حضرات کو علم ہے کہ یہ عید نمبر ہمیشہ قیمتاً بھیجا جاتا ہے ۔ لیکن نئے خریدار حضرات کو اس کا علم نہیں، اس لئے اُن کی اطلاع کے لئے مینجر صاحب کی طرف سے متعدد اعلانات شائع ہو رہے ہیں ۔

عید نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول ڈاک ہے ۔ لیکن عالمگیر کے خریداروں سے ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک لیا جائے گا ۔ گویا انہیں محصول ڈاک سمیت ایک روپیہ چار آنے کا وی پی بھیجا جائے گا ۔ علیٰ ہذا القیاس جو لوگ عالمگیر کے خریدار نہیں، اُن سے ایک روپیہ آٹھ آنے لئے جائینگے !

مجھے یقین ہے کہ عالمگیر کے تمام خریدار حضرات عید نمبر کے وی پی وصول فرما کر عالمگیر نوازی کا ثبوت دیں گے ۔

سالانہ نمبر ۳۵ء ۔ عالمگیر کا سالانہ نمبر ۳۵ء حسبِ معمول جون ۱۹۳۵ء میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا ۔ اس سالانہ نمبر اور دسمبر میں شائع ہونے والے خاص نمبر کی ناظرین کرام سے کوئی علیحدہ قیمت نہیں لی جاتی اور دس سال سے یہ دونوں خاص نمبر سالانہ قیمت میں ہی پیش کئے جاتے ہیں ۔ عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے قابلِ دید و لاجواب ہوگا ۔

عالمگیر کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں جو حضرات کوشش فرما رہے ہیں میں بصمیم قلب اُن کی غائبانہ کرمفرمائیوں، مسلسل عنایتوں اور پیہم نوازشوں کا شکرگذار اور ممنون ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ عالمگیر کی اس اعانت کے سلسلہ کو جاری رکھینگے جن حضرات نے تاحال توجہ نہیں فرمائی وہ بھی اپنے حلقۂ احباب میں کوشش فرما کر شکرگذاری کا موقع بخشیں ۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ

(۷۸۶)

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

عالیجناب حضرت نواب فصاحت جنگ بہادر اُستاد حضور نظام خلد اللہ ملکہ کا مکتوب گرامی

جناب مکرم و محترم   حیدرآباد دکن

تسلیم و نیاز۔ عالمگیر کا خاص نمبر پہنچکر باعث منت پذیری ہوا۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

اس نمبر کی جسقدر توصیف کیجائے مبالغہ نہوگا، سراپا حُسن کی تصویر ہے مَیں کس کس چیز کا ذکر کروں

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

دو شعر ہدیتہً عالمگیر کے لئے بھیجتا ہوں:۔

دید کی قابل ہی جلوہ آج عالمگیر کا — کھینچتا ہے دل کو نقشہ آج عالمگیر کا
تھا فقط اک ہند زیب دولت اورنگزیب — ہفت کشور میں ہے سکہ آج عالمگیر کا

نیازمند فصاحت جنگ جلیل (کان اللہ لہ)

عالمگیر

عید قربان نمبر ۱۹۳۵ سنہ

حسبِ معمول اس سال بھی "عالمگیر" کا عیدِ قربان نمبر ۱۹۳۵ء عید الاضحیٰ سے پیشتر شائع ہو جائے گا۔

چونکہ یہ ایک زائد پرچہ ہے اس لئے

تمام خریدار حضرات کی خدمت میں بذریعہ وی پی حاضر ہو گا

عالمگیر کا عید نمبر تصاویر مضامین اور افسانوں کے اعتبار سے فی الحقیقت عید نمبر ہے

عالمگیر کا عید نمبر ملاحظہ فرما کر عید کی مسرتوں کو دوبالا کیجئے

قیمت خریداران عالمگیر سے ایکروپیہ چار آنے معہ محصولڈاک اور غیر خریداران سے ایکروپیہ آٹھ آنے معہ محصولڈاک۔

چونکہ عالمگیر کے تمام خریدار حضرات ہر سال عید نمبر بمسرت خرید فرماتے ہیں اسلئے انہیں اس کیلئے فرمائش خریداری بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ دفتر سے خود بخود عید نمبر بذریعہ وی پی بھیجدیا جائے گا۔

نیازمند منیجر "عالمگیر" لاہور

اُس کا عاشق

(از جناب حامد جمال صاحب)

میرے ایک ملاقاتی نے مجھ سے ایکبار حسب ذیل داستان کہی۔

جب میں ماسکو میں تعلیم پاتا تھا۔ میرے کمرے کے قریب ہی ایک لیڈی رہتی تھی۔ وہ پولینڈ کی رہنے والی تھی، اور لوگ اُس کو ثریا کہتے تھے۔ وہ ایک دراز قد، الجیم، شحیم جسم کی آتشیں رنگ کی عورت تھی۔ اُس کی بھویں سیاہ اور بہت ہی گھنی تھیں۔ اور اُس کا لانبا بھدا چہرہ معلوم ہوتا تھا کہ پھاوڑے سے تراشا گیا ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھوں کی خونخوار رشنائیں، اُس کی نہایت بھدی کرخت آواز، اُس کی کہاروں کی سی چال اور ملاحوں کے سے خدار مونڈھے مجھ میں بغیر نفرت پیدا کئے نہیں رہتے تھے۔ جب مجھے اس کا علم ہوتا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے تو میں اپنا دروازہ کبھی کھلا نہیں چھوڑتا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی اُس سے مُٹھ بھیڑ ہو ہی جاتی تھی۔ مجھے دیکھکر جب وہ مسکراتی تو معلوم ہوتا کہ کسی نے ڈھیلا کھینچ مارا۔ بعض اوقات میں اُس کو مخمور بھی دیکھتا۔ اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور اُلجھے ہوئے بالوں کے ساتھ نہایت ہی بدنما دانت نکالے رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اکثر وہ مجھ سے ہمکلام ہوتی۔

"آہا۔ مسٹر طالب علم! کیسے ہو؟" اُس کا احمقانہ قہقہہ مجھ میں اُس کی طرف سے اور نفرت پیدا کرتا۔ میں نے اُس کے اس الطاف و ملاقات سے بچنے کے لئے اکثر یہ چاہا کہ اپنا کمرہ تبدیل کر دوں، مگر میرا چھوٹا سا کمرہ اتنا نفیس اور ایسے اچھے موقع پر واقع تھا۔ کہ کبھی اس کے چھوڑنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

ایک روز میں اپنے کوچ پر پڑا ہوا اسکول نہ جانے کا بہانہ سوچ رہا تھا کہ کواڑ کھٹکے اور دروازے سے ثریا کی کرخت آواز سنائی دی۔

"مسٹر طالب علم! خدا تمہیں سلامت رکھے"

"تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے جواب دیا۔ اُس وقت اُس پر ایک بدحواسی چھائی تھی اور چہرے سے عاجزی ظاہر ہو رہی تھی۔

"جناب میں آپ سے ایک التجا کرتی ہوں۔ کیا آپ اُسے قبول کرینگے"

میں حیرت کا کوچ پر پڑا رہا۔ اور دل سے کہا گیا "ہمت چاہیئے"

"میں ایک خط وطن بھیجنا چاہتی ہوں۔ بس یہی میری درخواست ہے"

اُس کی آواز میں ایک خاص لجاجت تھی۔ میں فوراً کود کر میز پر بیٹھ گیا۔ ایک پرچہ کاغذ کا اٹھالیا اور اُس سے کہا "یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔ اور بولو" وہ آکر بہت آہستگی سے کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک مجرمانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"تم کسے لکھانا چاہتی ہو؟"

"بولس کو جو وارسا میں رہتا ہے"

"اچھا، بول چلو"

"میرے پیارے بولس، میری جان، میرے وفادار عاشق، خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے، تم نے کیوں اتنی مدت سے اپنی غمگین چھوٹی بط ثریا کو اپنی خیریت نہیں لکھی" ... ...

قریب تھا کہ میں مارے ہنسی کے لوٹ جاؤں "غمگین چھوٹی بط" پانچ فٹ سے زیادہ اونچی، کئی من وزنی اور ایسی چھلبسی ہوتی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسا بط ہمیشہ کا رخانہ میں رہی اور اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہیں نہائی! بہرحال کسی طریقہ سے میں نے ہنسی ضبط کی اور پوچھا "یہ بولس کون ہے"؟

"بولس، مسٹر طالب علم۔ یہ میرا منگیتر ہے"

"منگیتر!"

"کیوں؟ آپ کو تعجب کیوں ہے۔ کیا ایک عورت کے منگیتر نہیں ہوتا؟"

"ہاں کیوں نہیں" میں نے کہا "سب کچھ ممکن ہے۔ کیا وہ ایک زمانہ سے تمہارا منگیتر ہے؟"

"چھ برس"

"ہرگز نہیں" میں نے خیال کیا "اچھا آپکا خط ختم کرنا چاہیئے"

جب میں نے اس کا خط ختم کر کے اُس کے حوالے کیا تو اس نے تہِ دل سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا "شاید میں آپ کے اس احسان کا بدلہ کسی طور پر ادا کر سکوں"

"نہیں میں آپکے اس احسان کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

"شاید جناب میں آپ کی قمیصوں اور پتلونوں کو رفو کر سکوں"

"نہیں مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے" اور وہ چلی گئی۔

ایک ہفتہ یا عشرہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں دریچہ پر بیٹھا طبیعت کی کسل کو دور کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ موسم بہت گندہ تھا اور کسی کام کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔ کہ دروازہ کھلا۔ خدا رحم کرے، کوئی داخل ہوا۔

"مسٹر طالبعلم! میں امید کرتی ہوں کہ آپ کسی خاص کام میں اس وقت مشغول نہیں ہیں"

یہ ٹریسا تھی۔

"میں آپ سے ایک دوسرا خط لکھانا چاہتی ہوں۔

"بہت بہتر۔ بولس کو؟"

"نہیں۔ اس مرتبہ بولس کا جواب"

"کیا؟"

"ارے میں بھی کیا بیوقوف آدمی ہوں۔ مسٹر طالب علم۔ یہ میرے لئے نہیں ہے۔ یہ میرے ایک دوست کے لئے ہے۔ ایک مرد دوست کے لئے۔ جس کی ایک منظورِ نظر میری ہی ہمنام یہاں پر رہتی ہے۔ کیا آپ اس ٹریسا کے نام خط لکھ دینگے"

میں نے اُس کی طرف نگاہ کی، اُس کا چہرہ پریشان تھا۔ اور اُس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں، پہلے تو میں خود ہی گم سا رہا، بعد کو تاڑا۔

میں نے کہا "محترمہ! سنئے، نہ کوئی بولس ہے اور نہ کوئی ٹریسا۔ تم دنیا بھر کا مجھ سے جھوٹ بولتی رہی ہو۔ آپ مہربانی کر کے مجھ پر کرم افزائی نہ فرمایئے۔ اور مجھے اپنے نیاز کے شرف سے بخشے ہی رہئے تو اچھا ہے۔

یک بیک اُس کی ایک عجیب حالت ہوگئی۔ بغیر اپنے مقام سے اُٹھے اُس نے زانو بدلنے شروع کئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اور نہیں کہہ سکتی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ دیکھئے کیا کہتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کہ اس کا منشاء نہ تھا بلکہ معاملہ کچھ اَور ہی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ اس پر بدگمانی کی۔

"مسٹر طالب علم!" یہ کچھ اَور کہنا چاہتی تھی کہ فوراً ہاتھ ہلاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور چلدی۔ میں ایک بدمزگی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اور میں نے اُس کے دروازے کے اندر سے کھلنے کی آواز سُنی۔ تھوڑی دیر کے غور کے بعد میں نے یہ طے کیا کہ نہیں مجھے اسے منالانا چاہیئے، اور جو کچھ کہے اور جسے کہے لکھ دینا چاہیئے۔

میں اُس کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ میز پر کہنیوں کے بل ہاتھوں پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔

"میری سنو" میں نے کہا۔

جب میں اپنے قصّے کے اس مقام پر پہونچتا ہوں تو مجھ کو اپنی حماقت مآبی کا انتہا احساس ہوتا ہے۔

"میری سنو" میں نے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے کُود کر اُٹھی میری طرف نہایت تیز نگاہیں کئے بڑھی اور میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"جناب دیکھئے معاملہ یہ ہے، نہ کوئی بولس ہے نہ کوئی ٹریسا! لیکن آپ کو اس سے کیا۔ آپ کے لئے قلم اٹھانا بہت دشوار ہے۔ حسن ہی کا بار کیا آپ کے لئے کم ہے۔ نہ کوئی بولس ہے نہ کوئی ٹریسا۔ صرف میں ہوں۔ سُن لیا آپ نے، اب آپکی تشفی ہوئی؟"

"مجھے معاف کرو" میں نے کہا "مجھ سے سخت غلطی ہوئی لیکن آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ تم کہتی ہو کوئی بولس نہیں ہے"

"نہیں کوئی بولس نہیں ہے اور نہ کوئی ٹریسا، میں ٹریسا ہوں"

میں خاک بھی نہ سمجھا۔ اور اُس کی طرف یہ خیال کر کے تاکتا رہا کہ ہم دونوں میں سے کون پاگل ہے۔ لیکن وہ اپنی میز کی طرف بڑھی۔ کچھ تلاش کیا اور پھر میری طرف واپس آکر آزردہ لہجہ میں کہا۔

آپ کے لئے پولس کو خط لکھنا بہت مشکل کام تھا۔ یہ لیجئے آپ کا خط ہے۔ دوسرے میرے لئے لکھ دینگے۔ میں نے دیکھا تو واقعی وہی میرا لکھا ہوا خط تھا۔

میں نے کہا۔ ثریا سنو! آخر جب کے معنی کیا ہیں۔ اور کیوں کسی دوسرے سے لکھواؤ۔ جبکہ میں اسے لکھ چکا ہوں اور تم نے اسے بھیجا بھی نہیں"

"کہاں بھیجوں؟"

"کہاں۔ اس پولس کے پاس"

"اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے"

میں بالکل نہیں سمجھا اور منہ تاکتا رہا۔ تب اس کہا "اس قسم کا کوئی آدمی نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ ہو۔ کیا میں اور لوگوں کی طرح انسان نہیں ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔ میں جانتی ہوں جانتی ہوں کہ۔۔ لیکن مجھے اس کو خط لکھنے میں کوئی نقصان نہیں ہے"

"معاف کرنا۔ کس کو؟"

"پولس کو"

"لیکن اس کا وجود نہیں"

افسوس! افسوس! اگر وہ نہیں ہے تو کیا؟ کیا ہوا۔ لیکن ہو میں اس کو خط لکھتی ہوں۔ تو مجھے یقین ہوتا ہے۔ کہ وہ ہے اور وہ ثریا یعنی مجھکو جواب دیتا ہے۔ اور میں پھر اس کو لکھتی ہوں۔

میں آخرکار سمجھا اور مجھے اس قدر تکلیف ہوئی اور میں اتنا محجوب ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میرے ہی قریب تین گز کے بھی فاصلہ پر ایک انسان رہتا ہے۔ جس کا کوئی دنیا میں چاہنے والا نہیں ہے۔ اور نہ کوئی دلدہی کرنے والا۔ اور اس انسان نے خود اپنے لئے ایک فرضی دوست گڑھ لیا ہے۔

"سنئیے! اس نے کہا آپ نے پولس کو یہ خط لکھکر مجھے دیا۔ اور میں نے دوسروں کو دیا۔ کہ وہ پڑھکر مجھے سنائیں۔ اور جب یہ پڑھ کر مجھے سنایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پولس موجود ہے پھر میں نے آپ سے خواہش کی کہ پولس کی طرف سے ثریا یعنی مجھکو خط لکھ بھیجئے۔ جب لوگ مجھے اس قسم کا خط لکھ دیتے ہیں اور پڑھکر سناتے ہیں۔ تو مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ پولس ہے اور دنیا میرے لئے آسان ہوجاتی ہے۔

"میں بھی کتنا بڑا گدھ مغز تھا" میں اپنے آپ سے کہا۔

آج وقت سے برابر ہفتہ میں دو بار میں ایک خط پولس کو اور اس کا جواب ثریا کو لکھا کرتا تھا۔ میں جواب خوب بنا بنا کر لکھتا تھا اور وہ جواب سنکر زار و قطار رو یا کرتی تھی۔ اس کے صلہ میں وہ میری قمیصوں اور پتلونوں کو رفو کیا کرتی تھی۔ یا سینے پرونے کا جو کام ہوتا تھا کرتی تھی۔

میرے دوست نے سیگرٹ کی خاک جھاڑی۔ اور آسمان کی طرف معنی خیز نگاہ کر کے کہا۔

"سچ ہے جتنا ہی انسان کو تلخ کامی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اتنا ہی وہ شادکامی کا بھوکا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اپنی ذوی استطاعتی کی چادروں میں ملفوف اس کو نہیں دیکھتے۔

(حامد جمال)

جذباتِ عالیہ

(از اعتبار الملک حضرت دِل شاہجہانپوری)

اے جنوں راحت اثر دل کی پریشانی نہ تھی ! ہم نے جبتک خاک کوئے یار کی چھانی نہ تھی

یاد آیام جب اشکوں کی فراوانی نہ تھی عشق کے انجام پر یہ مرثیہ خوانی نہ تھی

دشتِ وحشت میں خلافِ وضعِ عریانی نہ تھی وجہِ رُسوائی کسی کی چاک دامانی نہ تھی

ضبطِ گریہ اِک مصیبت ہو گیا دِل کے لئے یہ تو اُس دریا میں ڈوبا جس میں طغیانی نہ تھی

مٹ گیا لیکن نمایاں ہوں بیاضِ دہر پر اب یہ میں سمجھا کہ ہستی عشق کی فانی نہ تھی

ہر قدم پہ نارسائی کا گِلہ بڑھتا گیا ! حدِ آخر تک مری منزل میں آسانی نہ تھی

جُزوِ دل کیا ہو گیا سودائے گیسوئے دراز ، اِس قدر تو داستانِ عشق طولانی نہ تھی !

چارہ گر اب غور کر کیا حاصلِ درماں ہوا ، کاہِش دل میں تو یہ تکلیفِ رُوحانی نہ تھی

ہمت افزا تھا کوئی گر مشکلیں بڑھتی گئیں عشق کو ناکامیٔ دل پر پریشانی نہ تھی

تھا تقاضائے محبت جو ہوا انجامِ دل ! کیا مرے پیشِ نظر یہ خانہ ویرانی نہ تھی

تجھکو لے ڈوبا ہے اے دل پھر اُبھرنے کا خیال ورنہ بحرِ عشق کی تہ میں یہ طغیانی نہ تھی

بس یہ ہے میری نظر میں رُوح و تن کا تفرقہ پھر وہیں پہونچی جہاں کی زندگی فانی نہ تھی

یہ نتیجہ عشق کا ہے اے دِل شوریدہ سر

اِس قدر جوش آفریں پہلے غزلخوانی نہ تھی !

طلیحہ ابن خویلد

زمانہ صداقت کا انقلابی متنبی

ازیں چمن کسے بیخار گل نچید آرد
چراغ مصطفوی با شرار بولہبیست
(حافظ)

از جناب مولانا اظہر صاحب امرتسری

پیغمبر اسلام کی رحلت سے چند برس پہلے دنیائے اسلام میں ارتداد و بغاوت کے جو چند فتنے ظہور پذیر ہوئے ان کے پس پردہ نبوت کے ان جھوٹے مدعیوں کی ہوس ملک گیری کام کر رہی تھی جو اسلام کو اپنے سیاسی و استعماری مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتے تھے۔

پیغمبر اسلام نے اپنی اخوت آموز تعلیم کے باعث قبائل عرب سے عصبی و خاندانی تفریق مٹا کر ان کو ایک جامع الشرائط قوم میں تبدیل کر لیا تھا جس پر انسانیت کبریٰ کا ایوان ترقی تعمیر ہو سکتا ہے لیکن اس طرح گھر گھر کی سرداریاں اور قبیلہ قبیلہ کی امارتیں مٹ کر ایک وسیع نظام میں مدغم ہو گئیں جس کو اسلامی اصطلاح میں خلافت کہا جاتا ہے۔ قبائلی تفریق اور خاندانی تفاخر پر عرب کے جاہلانہ تمدن اور وحشیانہ تہذیب کی بنا رکھی۔ اگرچہ پیغمبر اسلام کی مساعی اتحاد اپنے روحانی و عقلی اثر کے باعث کامیاب تو ہو گئی لیکن بعض دلوں میں نور ایمان کی شعاعوں بھی ظلمت تفریق اور قبائلی انانیت دبی رہی جو چند جھوٹے مدعیان نبوت کے خیالات سے پرورش پا کر غداری، بغاوت اور انقلاب انگیزی کے خونیں لباس میں ظاہر ہوئی۔ اور کفر وارتداد کی گھنگھور گھٹا بن کر جزیرہ نمائے عرب کے چند حصوں پر چھا گئی۔ چنانچہ یمن کے مرکزی حصہ میں ذو الخمار اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد کثیر التعداد لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اکثر بلاد و دیہات پر قبضہ کر لیا۔ بنو تمیم میں ایک حسین وجمیل عورت سجاح نے جس کا زمانہ قریب حسن ہی اس کی نبوت کا روشن ثبوت تھا چند جنگجو قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یمامہ میں مشہور کذاب مسیلمہ کا دور دورہ تھا۔ بنی اسد میں طلیحہ ابن خویلد کے دعویٰ پیمبری نے بہت سے لوگوں کو مرتد کر لیا تھا۔ غرضیکہ جس طرح غروب آفتاب کے وقت ہر سمت سے ظلمت کے ٹکڑے اٹھ کر باہمی تنظیم سے شام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح حضور سرور کائنات کی رحلت سے دو تین برس پہلے ہر طرف سے نبوت کے جھوٹے مدعی اٹھ کھڑے ہوئے جن کے کام کے طریقے اگرچہ مختلف تھے لیکن سب کا بنیادی مقصد اسلام کو کسی نہ کسی جزیرہ نمائے عرب سے رسوا کر کے نکالنا تھا لیکن خداوند عالم کو اپنے آخری پیغام کے جو پیغمبر اسلام کی زبان فطرت ترجمان نے دیا تھا حلقہ ساعت کو محفوظ رکھنا تھا اس لئے مرتدین کا گروہ جو شعلہ جوالہ کی طرح پیچ وتاب کھا کر اٹھا تھا پانی کی طرح خاک نامرادی میں جذب ہو گیا۔

اس صحبت میں ہم ان جھوٹے نبیوں میں سے طلیحہ کے حالات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں کیونکہ تمام کذابوں میں سے طلیحہ ہی ایک ایسا بدقسمت ہے جس کو روشناس کرانے کی اہل قلم نے بہت کم کوشش کی ہے۔

طلیحہ اور اس کی نبوت

طلیحہ خویلد کا بیٹا اور عرب کے مشہور قبیلہ بنی اسد کا ایک فرد تھا اس کی

تربیت و پرورش زمانہ جاہلیت کی مذہبی فضا میں ہوئی تھی۔ اس لئے دنیائے شباب میں قدم رکھتے ہی اس کو تمام اسد نے مذہبی رہنما تسلیم کرلیا۔ وہ ایک عرصے تک کاہن کی حیثیت سے زندگی کی منزلیں چراغ پارسائی کی روشنی میں طے کرتا رہا اسی اثنا میں آفتاب نبوت کا طلوع ہوگیا۔ طلیحہ نے بھی بنی اسد کے معزز افراد کے ساتھ اسلام قبول کرلیا لیکن محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چشمۂ نور کی موجیں اس کے دل سے فطری ظلمت کے دھبے پوری طرح دھو نہ سکیں وہ اپنے ایمان کو بیعادری کی طرف سے عاید کی ہوئی بیگار سمجھتا تھا کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد اس کی رفعت نفس اور امتیازی عزت مساوات کی صورت میں تبدیل ہوگئی جو اس کو کاہن ہونے کی حیثیت سے حاصل تھی۔ وہ رات دن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے منصوبے گانٹھتا رہتا۔ آخر اس کی کامیابی کا زمانہ فتنہ ارتداد کا بہروپ بھر کر آگیا۔ طلیحہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ نبوت کا دعویٰ کردیا۔ ابتدا میں تو لوگ طلیحہ کے دعویٰ نبوت کو اس کی دماغی پریشانیوں کا نتیجہ خیال کرتے رہے لیکن کچھ عرصہ ہدف تمسخر بننے کے بعد اس کی مقبولیت کا حلقہ پیدا ہوگیا۔ طلیحہ کی نبوت جس نظریہ پر تھی وہ سرمایہ داروں کے لئے دنیوی اعتبار سے مفید تھا اس لئے بہت سے امرا نے اس کا ساتھ دیکر اس کو نبی کہلانے کے قابل بنا دیا۔

امیروں کا مذہب ہر زمانہ میں دولت پرستی ہی رہا ہے دولتمند مذہب کو اس لئے قبول نہیں کرتا ہے کہ وہ اس کو نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ تو مذہب کو بھی توسیع مال اور حصول اقتدار کا ہتھیار سمجھ کر قبول کرتا ہے اور جب مذہب اس کی دولت یا جاہ و اقتدار کے لئے وجہ نقصان ثابت ہو تو وہ یا تو دینیت کو اپنے نفسانی اغراض کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے یا اس سے انکار کردیتا ہے۔

طلیحہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ اس نے اپنی نبوت پر عقل و بصیرت کی کوئی شہادت نہیں دی جو عقل سلیم کو مسخر کرسکتی۔ کوئی معجزہ نہیں دکھایا جس کی حیرت انگیز تاثیر کے سامنے لوگوں کو سر عجز خم کردینا پڑتا۔ کوئی کتاب پیش نہیں کی جو ناطقہ فصاحت بند کردیتی اس نے اپنے دلائل میں فلسفیانہ حقیقت پیش نہیں کی جس کی صداقت پر علم و دانش کو مہر تصدیق ثبت کرنا پڑتی۔ اس نے اگر اپنی نبوت کا کوئی ثبوت کوئی شہادت کوئی دلیل پیش کی تو صرف یہ تھی جس سے اس نے قوم کے سرمایہ دار افراد کو اپنا ہمنوا بنالیا۔

وہ یہ کہ:-

"زکوٰۃ کے نام پر جو رقم جہاد فی سبیل اللہ کی ضروریات بیواؤں، یتیموں کی پرورش اور ملکی نظم و نسق کی تکمیل کے لئے بیت المال میں داخل کی جاتی ہے وہ سراسر ناجائز ہے۔ بیت المال کے محافظین کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ ہماری دولت ہم سے وصول کرکے صرف کریں اس لئے زکوٰۃ کی ادائگی بند کردی جائے کیونکہ ہم نے اسلام خراج دینے کے لئے نہیں قبول کیا۔"

یہ نظریہ اگرچہ انسانیت کے بنیادی اصول جن پر انسانی برادری کے اشتراکی و اجتماعی تعلق کی بنا رہے سراسر خلاف تھا لیکن جب سرمایہ داران بنی اسد نے اس خیال کو میزان اغراض پر تولا تو اس کا وزن نفس پرستانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق اسلام سے زیادہ ثابت ہوا۔ انھوں نے محض اپنے درہم و دینار سے ڈہائی فی صدی کی بچت کے لئے اسلام کے خدائی قانون سے منہ موڑ کر طلیحہ کا انسانی آئین قبول کرلیا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ رائے عامہ میں جب تک تنظیم اور حقیقت اندیشی پیدا نہ ہو عوام کو امرا کے ناجائز سے ناجائز روّیہ کی بھی تقلید کرنا پڑتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا بنی اسد نے اپنے شیوخ و امرا کے حکم پر چلتے ہوئے طلیحہ کی جھوٹی نبوت کو محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حقیقی رسالت پر ترجیح دی اور اس کے اشارہ ابرو پر کٹ مرنے کو تیار ہوگئے طلیحہ نے نامہ و پیام کے ذریعے سے حضور صلعم کو بھی اپنی پیمبری کی اطلاع دی۔ حضور نے اس کی سرکشی اطاعت سے بدلنے کے لئے ضرار ابن الازور کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک گروہ بھیجا۔ اس زمانہ میں طلیحہ سمیرا میں مقیم ہوگیا اور بنی اسد کے کثیر التعداد افراد اس نے اپنے ساتھ ملالئے تھے۔ ضرار نے لڑائی شروع کردی۔ اسی اثنا میں حضور کے رحلت فرماجانے کی اطلاع پہونچی۔ جس کو سنتے ہی ضرار اپنے لشکریوں سمیت مدینہ واپس آگیا۔ ضرار کی واپسی طلیحہ کے لئے کامیابی کا موجب ہوئی اس نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ طے، ہوازن، عامر اور اسی قسم کے چند قبیلوں کو مرتد کرکے اپنے ساتھ ملالیا۔

حضرت صدیق اکبر سے مطالبہ

حضور کی وفات کے بعد صدیق اکبر نائب رسول کی حیثیت سے تخت خلافت پر جلوہ گر ہوئے تو اس وقت عرب کے گوشہ گوشہ میں ارتداد و بغاوت

کے شعلے اٹھ اٹھ کر خرمن اسلام پر منڈلا رہے تھے۔ قبائل عرب نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسلام جو اپنے داعی اعظم سے محروم ہو جانے کے باعث یتیم ہو چکا ہے اس کو کم عمری ہی میں رسوائی کے ساتھ عرب سے نکال دیا جائے لیکن صدیق کے صدق نے ایمانی قوتوں سے کام لیتے ہوئے مرتدین کے ارادوں کو نامرادی کی موت ہلاک کر دیا۔ اس دور پر آشوب کے پیش نظر طلیحہ کی رگ نبوت پھڑک اٹھی اور اس نے خیال کیا کہ صدیق اکبر اپنی سیاسی مشکلات میں اس درجہ جو الجھ چکے ہیں تو ان کی طبیعت بھی کمزور ہو گئی ہو گی اس لئے میرے مطالبات وہ تسلیم کر لینگے۔ یہ سوچ کر طلیحہ نے ایک وفد جو چند قبائل کے شیوخ پر مشتمل تھا حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں بھیجا۔ اس وفد نے بارگاہ خلافت میں پہونچکر اپنے یہ مطالبے پیش کئے کہ

"(۱) نمازوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔
(۲) زر زکوٰۃ کی وصولی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کی جائے۔"

صدیق یہ مطالبے سنتے ہی شان جلالی کے ساتھ کہنے لگے کہ ابوبکر ان امور و فرائض کو کس طرح منسوخ کر سکتا ہے جو خدا اور رسول کی طرف سے عاید کئے گئے ہیں۔ میں زکوٰۃ کی مقررہ شرح میں سے ایک عقال (یعنی وہ رسی جس سے اونٹ کے پاؤں باندھے جاتے ہیں) بھی کم لینے کو تیار نہیں۔ اسی طرح پانچوں نمازوں میں سے ایک رکعت کی بھی تخفیف گوارہ نہیں کر سکتا۔ مرتدین کا وفد یہ جواب سننے کے بعد واپس آ گیا۔ اور ارکان وفد نے اپنے اپنے قبائل میں بیان کیا کہ مسلمانوں کی تعداد اس درجہ کم ہے کہ وہ کسی جنگ کو کامیابی کے ساتھ قبول نہیں کر سکتے۔ بنی عبس اور بنی ذبیان جن کی رگ رگ میں مسلمانوں کے خلاف جوش نبرد آزمائی چٹکیاں لے رہا تھا مارے خوشی کے اچھلنے لگے۔ ان کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ صدیق اپنے ساتھیوں کی قلت تعداد کے باعث ہمارے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے۔

مرتدین اور مومنین کی مڈھ بھیڑ

قبائل عبس و ذبیان نے اپنی مزعومہ کامیابی کی توقع پر مدینہ پر دھاوا بول دیا لیکن حضرت صدیق نے پہلے ہی دفاعی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔ مدینہ کے باہر حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت زبیر اور چند جلیل القدر صحابی محافظ شہر کی حیثیت سے متعین تھے۔ جب مرتدین نے ان پر حملہ کر دیا تو صدیق نے فوراً ہی مدنی رضا کاروں کی ایک جماعت بھیجی۔ مومنین نے اس دلیری کے ساتھ مرتدین پر حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور جان بچا کر بھاگ نکلے اسلامی لشکر نے چند میل تک ان کا تعاقب کیا لیکن انھوں نے شجاعت و جوانمردی کے تمام اوصاف سے محروم ہو کر مکاری کو جنگ کا ہتھیار بنا لیا۔ چنانچہ وہ دوسرے راستے سے دف بجاتے اور ڈھول پیٹتے آ گئے جس سے مسلمان مجاہدین کے اونٹ بدک کر الٹے پاؤں بھاگ نکلے۔ مجاہدین نے اونٹوں کو ہر چند پھیرنے کی کوشش کی لیکن اونٹ دف و طبل کے ہنگامہ سے کچھ اس طرح ڈر گئے تھے کہ انھوں نے مدینہ ہی میں جا کر دم لیا۔

مسلمانوں کی اضطراری مراجعت مرتدین کے لئے پراپاگنڈہ کا بہترین ذریعہ بن گئی انھوں نے ذوالقصہ میں جا کر مشہور کر دیا کہ مسلمان ہم سے جان بچا کر بھاگ گئے ہیں اب ان کی عسکری قوت کا دیوالہ نکل چکا ہے اہل ذوالقصہ اس پراپاگنڈہ سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ مل گئے۔ دوسرے دن جب صبح کی پہلی کرن ریگستان پر بکھر کر ہر ذرہ کو زریں لباس پہنا رہی تھی تو صدیق اکبر نے اپنے سرفروش مجاہدین کی معیت میں مرتدین پر حملہ کر دیا۔ قبائل عبس و ذبیان اور ان کے ساتھیوں نے عربی شجاعت کا نام لے کر مجاہدین کا مقابلہ کیا لیکن جب دوپہر ہوئی تو مرتدین اپنے سینکڑوں ساتھیوں کی نعشیں تپتی ہوئی ریت پر چھوڑ کر بھاگ نکلے صدیقی فوج نے ان کا سامان حرب قبضہ میں کر لیا۔ جو نعمان کو دے کر مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اور خود حضرت صدیق مرتدین کے تعاقب میں آگے بڑھے۔ نعمان ابھی تھوڑی دور ہی چلنے پائے تھے کہ شکست خوردہ عبسیوں اور ذبیانیوں نے ان پر حملہ کر کے مال و متاع چھین لیا اور جو چند مسلمان وہاں موجود تھے ان کو بھی شہید کر دیا گیا واپسی پر جب حضرت صدیق اکبر کو اس دردناک واقعہ سے آگاہی ہوئی تو آپ بیحد رنجیدہ خاطر ہوئے آپ نے انتہائی غصے میں فرمایا کہ

"مجھے رب کعبہ کی قسم ہے کہ جتنے مسلمانوں کو مرتدین نے شہید کیا ہے اتنے ہی مرتدین جب تک ہلاک نہ کر لوں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔"

دوسرے دن ہی صدیق نے ابرق پر جہاں مرتدین جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے دھاوا بول دیا۔ فریقین میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا صحرا کا ہر ذرہ خون مسلم میں ڈوب کر لالہ صحرا کے لباس میں جلوہ گر ہو کر رہا لیکن مرتدین کو یہاں بھی ناکامی ہوئی اسلامی جیوش نے سارے علاقے پر قبضہ کر کے وہاں عامل مقرر کر دیئے۔

حضرت صدیق اکبر کا فرمان

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تمام شرارتوں اور بغاوتوں کا بانی طلیحہ تھا۔ یہ بغاوت و ارتداد کا چشمہ اسی کے افکار و اعمال سے ابلا تھا جس کی موجیں الحاد و کفر کی سوکھی ہوئی کھیتیوں کو شاداب کرنے کی غرض سے سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیلنا چاہتی تھیں اس لئے صدیق اکبر نے فتح ابرق کے بعد مدینہ میں آکر گیارہ لشکر مرتب کئے جو مختلف مقامات کے باغیوں اور مرتدوں کی سرکوبی کے لئے تھے ان میں سے ایک لشکر جو حضرت سیف اللہ خالد ابن ولید کی سرکردگی میں تھا اس کو دربار خلافت کی طرف سے طلیحہ، مسیلمہ، اور اس قسم کے طاقتور باغیان اسلام و خلافت پر حملہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ لیکن لشکر اسلام کی روانگی سے پہلے حضرت صدیق نے اتمام حجت کی غرض سے سارے مرتدین کو ایک ہی مضمون کا گرامی نامہ بھیجا۔ چنانچہ ایک خط طلیحہ کو بھی بھیجا گیا جو تاریخ ابن خلدون سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ابوبکر خلیفہ رسول کی ہدایت ہے اس شخص کو خواہ وہ خاص ہو یا عام جس کے پاس یہ فرمان پہونچے۔

سلام ہو اس شخص پر جو اسلام پر قائم ہے اور اتباع رسول کی ہدایت کی اور گمراہی و ہوائے نفسانی کی طرف رجعت کرنے سے باز رہا میں تمہارے روبرو حمد و ثنا کرتا ہوں اس خدا کی جس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں اور جو وحدہ لاشریک ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندہ اور رسول ہیں اور جو وہ لیکر آئے ہیں میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور میں قابل کفر سمجھتا ہوں اس شخص کو جس نے اس سے انکار کیا اور اس سے مجاہدہ کرتا ہوں . . . .

. . . .

. . . .

میں تمہاری طرف ایک شخص کو مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین کا لشکر دیکر بھیجتا ہوں میں نے اس کو حکم دیا ہے کہ وہ جب تک (مرتدین کو) اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت نہ دے لے جنگ نہ کرے جس شخص نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور نیک کام کئے اس کی مدد کی جائیگی۔ جو شخص منکر رہا اس سے لڑائی کرنے کا میں نے حکم دیدیا ہے تا آنکہ ان میں سے کسی کا اثر و اقتدار نہ رہے پس جو شخص اس کا متبع ہوگا اس کے لئے خیریت ہے جو شخص سرکشی کریگا وہ یاد رکھے کہ وہ اپنی قوت اور قوم سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنے قاصد کو ہدایت کردی ہے کہ اس فرمان کو مجمع عام میں پڑھ کر سنادے اور تم کو اذان کے ذریعے سے دعوت دے۔ تم جب مسلمانوں کی آواز سنو تو (اس کے جواب میں) اذان دو (تاکہ تمہارا مسلمان ہونا اور ارتداد سے تائب ہونا ثابت ہو جائے) اگر وہ اذان نہ دے تو اس سے اس کی وجہ دریافت کرو اگر وہ انکار کریں تو ان کی بابت (حملہ کرنے میں) جلدی کی جائے۔ اگر وہ اقرار کریں تو ان سے اس کی روش کے مطابق سلوک کیا جائے۔ (ترجمہ)

یہ خط صدیق اکبر کی ہدایات کے مطابق قاصد نے بنی اسد میں جاکر سنایا لیکن اس کا جواب وہی دیا گیا جس کا تابعین طلیحہ سے امید ہو سکتی تھی۔

خالد کا طلیحہ پر حملہ

طلیحہ اپنے حامیوں سمیت بزاخہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی فوجی قوت کے گھمنڈ پر نتائج اعمال سے بے نیاز ہو کر امیرانہ زندگی کی رنگ رلیوں میں مصروف تھا کہ قہر الٰہی خالد کا لباس پہن کر اس کے سر پر نازل ہو گیا۔

خالد نے حامیان طلیحہ پر حملہ کرنے سے پہلے ارشاد صدیق کی تعمیل ضروری سمجھی۔ اُس نے گفت و شنید کے ذریعہ سے مخالفین پر اپنا اثر ڈالنے کا تہیہ کر لیا لیکن ابھی وہ اپنے مساعی کا آغاز کرنے نہیں پایا تھا کہ ان کے دو ساتھی عکاشہ بن حصن اور ثابت بن اقرم جو پٹرول کر رہے تھے مخالفین نے دفعتہً حملہ کر کے شہید کر دیئے اس واقعہ کے بعد خالد نے خیال کیا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے ماننے کے نہیں اس نے لشکر اسلام کو تیاری کا حکم دیدیا۔ دوسری طرف طلیحہ کا سپہ سالار عیینہ اپنے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عیینہ کو میدان جنگ میں آنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ "تم خالد کے لشکر پر حملہ کردو میں جبرائیل کا انتظار کر رہا ہوں نزول وحی کے بعد میں بتا سکوں گا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے"۔

عینیہ نے طلیحہ سے رخصت ہو کر اپنے جنگجو رضاکاروں کو مسلح ہونے کا حکم دیا۔ لیکن ان کے دل پر لشکر اسلام کا خوف کچھ اس طرح طاری ہو چکا تھا کہ ان میں سے اکثر نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ طلیحہ کی حمایت میں درجنوں قبائل سردھڑ کی بازی لگانے کا اعلان کر چکے تھے لیکن وقت آنے پر سوائے بنی فرازہ کے کسی نے ساتھ نہ دیا۔ آخر عینیہ بنی فرازہ کو لے کر میدان میں نکلا۔ فریقین میں خونریز معرکہ ہوا۔ آخر لشکر اسلام کی فاتحانہ یلغار نے مرتدین کے حوصلے پست کر دیئے۔ اُس وقت عینیہ بھاگا بھاگا طلیحہ کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا کہ "تمہارے پاس میرے بعد کوئی (یعنی جبرئیل) آیا تھا؟"

طلیحہ نے جواب دیا ـــــ "نہیں"

عینیہ پھر میدان جنگ میں آیا۔ جب اُس کی فوج راہِ فرار تلاش کرنے لگی تو وہ پھر طلیحہ کے پاس آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"کوئی آیا تھا؟"

"ہاں جبرئیل آئے تھے۔" طلیحہ نے جواب دیا۔

"تو وہ کیا کہہ گئے؟" عینیہ نے پوچھا۔

"جبرئیل کہہ گئے ہیں کہ جو تمہاری قسمت میں ہے وہی ہو کر رہے گا۔"

یہ مضحکہ خیز اور مہمل جواب سن کر عینیہ کے آگ لگ گئی اس نے انتہائی جوش و غضب کے لہجہ میں للکار کر کہا کہ

"اے بنی فرازہ یہ شخص کذاب ہے مفت میں ہماری جانیں ضائع کرا رہا ہے۔ میں تو جاتا ہوں اور تمہیں بھی میدان جنگ سے واپس آ جانا چاہیئے۔"

مرتدین کے پاؤں پہلے ہی اکھڑ چکے تھے اس پر عینیہ کا اعلان "سرِ دست سل" ثابت ہوا۔ چنانچہ چشم زدن میں میدان خالی ہو گیا اور لشکر اسلام نعرۂ فتح لگاتا ہوا ہر طرف قابض ہو گیا۔ طلیحہ نے جب اپنے مریدوں کی ذلت آمیز ناکامی دیکھی تو وہ نہایت رازداری کے ساتھ اپنے خیمہ سے نکلا اور بیوی سمیت گھوڑے پر سوار ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا۔ جہاں وہ چند سال رہا۔ اس کے بعد وہ فاروق اعظم کے زمانہ خلافت میں تائب ہو کر مسلمان ہو گیا اور مرتے دم تک مجاہد اسلام کی حیثیت سے مختلف جہادوں میں شریک ہوتا رہا۔

طلیحہ کی جانشینوں کا حشر!

طلیحہ بھاگ تو گیا لیکن کفر و ارتداد کی جو آگ اس نے پھیلائی اس کی چنگاریاں مختلف قبائل میں بکھری پڑی تھیں جن کو بجھانے کے لئے مجاہدین اسلام کو ایک بار اور حرکت عمل سے کام لینا پڑا۔

طلیحہ کے فرار ہوتے ہی بنی اسد اور بنی غطفان جن کی حمایت پر اس کی جھوٹی نبوت کا محل کھڑا تھا مسلمان ہو گئے لیکن دوسرے قبائل جو طلیحہ کی مصیبتوں میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن اس کے دین کو ضرور تسلیم کر چکے تھے ابھی تک باغیانہ سرگرمیوں میں شریک تھے۔

طلیحہ کی سرکوبی کے بعد اسلامی لشکر نے بنی ہوازن۔ بنی سلیم اور بنی عامر اور دوسرے باغی قبائل کی طرف رخ کیا لیکن انھوں نے آمد خالد کی اطلاع پاتے ہی اپنی بغاوت اطاعت کے سانچے میں ڈھال لی اور سب کے سب خالد کے پاس آ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن عینیہ بدستور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ خالد نے اس کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں بھیج دیا جہاں اس کو اپنی بد کرداریوں کی سزا موت کی صورت میں بھگتنا پڑی۔

سلمےٰ کی بغاوت

خالد اگرچہ بت شکنی میں ہر چند سبکدوش ہو چکے تھے لیکن ابھی رستہ میں "سنگ گراں" اور بھی تھے چنانچہ قبائل بنی غطفان و سلیم کے متعدد افراد جن کی رگ رگ میں اسلام دشمنی سرایت کر چکی تھی مواعید کو توڑ کر تمام حوآب سلمیٰ بنت مالک کے پاس آ گئے یہ عورت اس زمانہ میں اپنے حسن عالم فریب کی برکت سے قائدانہ حیثیت رکھتی تھی اس کے پاس پہونچتے ہی مفسدین کے جوش فساد میں حسن پرستی کی تڑپ بھی پیدا ہو گئی۔ سلمیٰ اپنے پرستاروں کا گروہ لیکر خالد کے مقابلے میں نکلی وہ اونٹنی پر سوار تھی ہر مرتد اس کے اشارہ ابرو کا حکم پاتے ہی آگے بڑھ کر گردن کٹاتا تا۔ جب مسلمانوں نے سلمیٰ کے ناقہ کا محاصرہ کر لیا تو ایک سو مرتدین نے اس کے ناقہ کے پاؤں پر خون بہا کر عاشقی و حسن پرستی کی مہمل روایات میں روح حقیقت پھونک کر دکھلا دی آخر ناقہ کا ایک پاؤں کٹ گیا اور وہ ناقہ سے گر کر ہلاک ہو گئی اس کے گرتے ہی مرتدین بھاگ نکلے اور مسلمانوں نے میدان مار لیا۔ اس شکست کے بعد طلیحہ کا افسانہ نبوت صفحات تاریخ پر درس عبرت بن کر رہ گیا اور اس کی نبوت اپنی تمام طاقتوں سمیت خاک نامرادی میں دفن تو ہو گئی لیکن اس کی نعش اب بھی اکھیڑ کر مختلف صورتوں میں پیش کی جاتی ہے۔ . . . . . . (اظہر امرتسری)

کلام نفیسؔ

ازجناب نفیسؔ صاحب تلمیذ حضرت جلیلؔ مدظلہ

فائدہ کیا جو کوئی چاند سی صورت رکھے
وہی معشوق ہے جو شانِ محبت رکھے

یہی مے ہے یہی شیشہ ہے یہی ساقی ہے
نگہِ مست کو اللہ سلامت رکھے

وہی تصویر ہے آئینۂ دل کے قابل
جو ترا حُسن ترا ناز و نزاکت رکھے

وہی پروانہ ہے جو شمع پہ قرباں ہو جائے
وہی انسان ہے جو سوزِ محبت رکھے

بزمِ جاناں میں پہنچنے کی تمنا ہو جسے
بخت آئینہ کا شانے کی وہ قسمت رکھے

جلوہ، پھر ایک بُتِ ہوشربا کا جلوہ
کس طرح سے کوئی قابو میں طبیعت رکھے

نغمۂ بلبلِ شیدا کا یہی مطلب ہے
پھول وہ پھول ہے جو بوئے محبت رکھے

آنے دو جوش سے اب کے جو بہار آتی ہے
یہ گریباں مرا اللہ سلامت رکھے

جان دے دی مگر ابرو پہ نہ بل آنے دیا
عشق کرنا ہے تو پروانے کی ہمت رکھے

جامِ جم اس کا ہو دل بزمِ جم اس کا سینہ
پیرِ میخانہ سے جو حُسنِ عقیدت رکھے

آج جب وعدے ترے حشر بپا کرتے ہیں
کیا توقع کوئی فردائے قیامت رکھے

شیشے اُس کے ہیں سبو اس کے ہیں جام اُس کے نفیسؔ
برقرار آج جو میخانے کی عظمت رکھے،

گیانی کی ماں

مسٹر حسن عزیز صاحب جاوید

۱

جب رات کی تاریکی میں موسلادھار بارش ہو رہی تھی جھنکو اپنے جھونپڑے میں آگ کے قریب بیٹھا ہوا بین بجا رہا تھا۔ وہ ایسی نفیس بین بجاتا تھا کہ نالے سے پانی کے مٹکے بھر کر لیجانے والی عورتیں بھی اس کے جھونپڑے کے پاس پہونچکر ایک گھڑی وارفتگی کے عالم میں کھڑے ہو کر سننے لگتی تھیں۔

باہر بادل گرج رہے تھے۔ قہرمانی باد تند بڑے بڑے درختوں کو سرنگوں کر رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ بڑی بڑی شاخیں ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ پہاڑی نالے بلندیوں سے پستی کی طرف شور مچاتے، جھاگ اڑاتے، سیاہ سیاہ چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے رواں تھے۔

جھنکو اپنی بین کی لے سے خود اتنا بدمست ہو گیا تھا کہ اسے بالکل خبر نہ تھی کہ ہوا اور پانی باہر کیا غضب ڈھا رہے ہیں۔ آج جس طرح وہ بھیانک رات کی گھڑیاں بین سے اپنا دل سمجھا کر کاٹ رہا ہے بعینہٖ اسی طرح اس کی تمام راتیں بسر ہوتی ہیں۔ اس کا لڑکا گیانی جلدی سے سو جاتا ہے اور جھنکو کو نیند نہیں آتی۔ کبھی دو بج جاتے ہیں۔ کبھی تین بج جاتے ہیں کبھی چار بج جاتے ہیں اور وہ تنہا قلت نوم کی مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے کالے کمبل کو بچھا کر لیٹ جاتا ہے لیکن کروٹیں بدلتے بدلتے پاؤں اٹھاتے اینٹھاتے تنگ آجاتا ہے تو فی الفور اٹھ بیٹھتا ہے اور بین بجانے لگتا ہے یا اپنے تیتر کا پنجرہ اٹھا لاتا ہے اور اسے باہر نکال کر نرم و نازک پروں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے اسے "بول بیٹا" کہتا ہے تو تیتر بھی آواز دینے لگتا ہے جس سے جھنکو کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔

یہ اس کی زندگی کا آخری دور تھا جسے منزل آخر کہتے ہیں: بچپن دربدر مارے مارے پھرنے میں بسر ہوا۔ جوانی پانچ مرتبہ سزایاب ہونے کے سبب سے جیل کی چار دیواری میں بسر ہوئی اور اب بڑھاپا جنائی کے پہاڑی دامن میں قطع ہو رہا تھا۔ پچاس برس کے سن میں اس نے جس عورت کو اپنی زندگی کی شریک بنایا تھا وہ گیانی کو پانچ برس کی عمر کا چھوڑ کر جھنکو سے علیحدہ ہو گئی تھی اور گیانی اپنے باپ کی گود میں پرورش ہوا تھا۔ جھنکو کی عمر کا بیشتر حصہ تجرد میں کٹا اس لئے اس کے قویٰ اب تک اچھے تھے۔ وہ جوانوں کی طرح دوڑتا، جوانوں کی طرح کام کرتا پولیس کا سپاہی ہفتہ میں ایک دو مرتبہ آکر جھنکو سزایاب کی جانچ کرتا تھا اور رات کے کسی حصے میں بھی اسے بیدار کر لیتا تھا۔

برساتی کدو کی بیلیں اس کے جھونپڑے پر اس طرح محیط ہو گئی تھیں گویا قدرت کے باغبان نے ان سے چھپر کو آراستہ کیا ہو۔ اس کے چھوٹے سے صحن میں برساتی گل مہندی، گل عباس اور گل صد برگ کے پودے قطار در قطار لگے ہوئے تھے ایک گوشہ میں اروی کے سبز اور چوڑے پتے ہوا میں لہلہاتے تھے۔ وہ کہیں سے سورج مکھی کے بیج لے آیا تھا اور صحن کے کنارے کنارے انھیں بو دیا تھا چنانچہ سورج مکھی کے پھول کھل رہے تھے۔

جھونپڑے کے عقب میں مکا کے بھٹوں کی فصل کھڑی تھی اور با وجود خار دار سوکھی شاخوں سے اس نے احاطہ کر دیا تھا گیدڑ بھٹے اور مرچین کھانے ضرور آجاتے تھے۔ جھنکو نے مٹی کے تیل کا پرانا اور خالی پیپا باڑی کے وسط میں لکڑی کے سہارے لٹکا دیا تھا۔ پیپے میں ایک پتھر بندھا تھا پھر اس میں ایک لمبی رسی باندھی تھی جس کا سرا جھونپڑی میں اس کے سرہانے رہتا تھا۔ جب گیدڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تو جھنکو رسی کھینچتا تھا جس کے سبب پیپے میں آواز پیدا ہوتی تھی اور گیدڑ پیپے کی گھنٹی کو خطرہ کا سگنل سمجھ کر دم دبا کر بھاگ جاتے تھے۔

دفعتہً مہیب دھماکہ ہوا شاید کہیں بجلی گری ہوگی۔ جھنکو چونک اٹھا اور ڈر کر گیانی کے کلیجے پر ہاتھ رکھ دیا کہ مبادا وہ ڈر جائے۔ گیانی سویا نہیں تھا وہ دم سادھے پڑا تھا اس نے آنکھیں کھولدیں۔ جھنکو نے جب اس کے گالوں

ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ گیانی کے گال بالکل تر ہو رہے تھے اس نے جلدی سے گیانی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر شفقت کے ساتھ پوچھا — "بیٹا آج کیا ہو گیا ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟"

گیانی نے سسک کر کہا — "کچھ نہیں دادا" وہ اپنے باپ کو دادا کہتا تھا۔

جھنکو نے پھر بیتاب ہو کر کہا — "نہیں گیانی کچھ نہ کچھ ضرور ہے سچ بتا کیا ہوا۔ کیا ماں کی یاد آئی ہے؟"

گیانی ٹھنڈا سانس بھر کر بولا — "ہوں"

جھنکو کہنے لگا، — "ہاں میرے بدنصیب بیٹے! تجھے اپنی ماں کا سکھ بھوگنا نہیں بدا تھا"

جھنکو کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں اور وہ اپنے بیٹے کے گالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر گویا ہوا — "ارے پاگل تو پندرہ برس کا ہو چکا مگر تیرا ہردے اب تک کمزور ہے بات بات میں تجھے رونا اور سسکنا آتا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیری ماں نے مجھے کتنا فریب دیا، میرے ساتھ کیسی بیوفائی کی، میرے پریم کو کس طرح ٹھکرا دیا، مگر گیانی تم ہم کچھ نہیں کر سکتے بدھاتا نے ہمارے بھاگ میں یہ دکھ لکھ دیا تھا، کرم گت ٹالے نہیں ٹلتی ہے۔ دیکھو جب ہم تین برس کے تھے ماں اور باپ دونوں مر گئے ہمیں اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ ماں کی صورت کیسی تھی اور باپ کی کیسی۔ تم تو ہوشیار ہو ذرا صبر سے کام لو میرے نادان بیٹے۔ ...."

پھر وہ گیانی کو تکنے لگا۔

گیانی نے ترش روئی سے کہا — "بھیکم نائی کی ماں کہتی ہے کہ تم نے مار کر میری ماں کو بھگا دیا ہے دادا"

جھنکو نے زہرخند کے ساتھ کہا — "بھیکم نائی کی ماں کٹنی ہے۔ یہ اسی کی بدولت تھا کہ تمہاری ماں تمہیں چھوڑ کر فرار ہو گئی وہ اسے اپنے سبق دیتی رہتی تھی۔ گیانی کچھ باتیں ایسی افسوس کی ہیں کہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا"

گیانی نے تیزی کے ساتھ کہا "اس میں تمہارا ہی قصور تھا"۔ اور اپنے باپ کو گھورنے لگا۔ جھنکو ہنسنے لگا لیکن اس کی ہنسی بہت تلخ تھی۔

تھوڑی دیر تک دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے جھنکو نے پیار سے کہا، — "گیانی! بھٹے بھون دوں، کھاؤ گے؟"

گیانی نے غصے سے گردن ہلا کر کہا — "نہیں کھاتے"

—۲—

جھنکو نے اپنے پیلے پیلے دانت وا کر دیئے اور گیانی کا غصہ فرو کرنے کی سعی کرنے لگا اس نے گیانی سے کہا "میں تجھے ننھی سی بین بنا دوں گا تو بین بجانا سیکھ لینا۔ وہ پیلی تتلی جو تم نے پکڑی ہے اسے احتیاط سے ٹین کی ڈبیا میں بند کر کے رکھنا بھیکم کے ساتھ مت کھیلا کر، گنگا رام اور تالو کے ساتھ کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے کل ہم خرگوش کے شکار کو چلیں گے۔ تجھے پھندا لگانا بتاؤں گا۔ جنگل میں آج کل ایک ایسی بتی اگ آئی ہے جسے ہاتھ میں لے کر اگر تو پتھروں کے تلے سے بچھوؤں کو سنگھائے گا تو سب بچھو بیہوش ہو جائیں گے۔ پھر ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لینا۔ جب بستی والے دیکھیں گے تو اچنبھا کریں گے"

اس نے گیانی سے کہا کہ تو تیتر کو سیٹی بجا کر "لعل بیٹا" کہہ، گیانی نے ایسا ہی کیا مگر تیتر نہیں بولا مگر جب جھنکو نے ایسا کیا تو تیتر بانگ دینے لگا۔ پھر جھنکو ہنسنے لگا۔ لیکن گیانی اسی طرح سنجیدہ اور خاموش رہا۔

جھنکو نے گیانی کے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ تیرے واسطے میں جنگل سے ناگر قند کھود کر لا دوں گا۔ جو ایک من کا ایک ہوتا ہے۔ اپنی گائے کے دودھ میں اس کے آٹے کی کھیر پکا کر کھلاؤں گا۔ کیوں گیانی کھائے گا؟"

گیانی نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ گیانی کے گدگدی کرنے لگا یہ سب جتن اس واسطے کئے جا رہے تھے کہ گیانی ہنسنے لگے۔ مگر گیانی کو ہنسی نہیں آتی تھی۔

اتنے میں سزا یابوں کی جانچ کرنے والا سپاہی قربان علی آ گیا۔ جھنکو نے جلدی سے اٹھ کر اس کے بیٹھنے کے لئے پیڑھا رکھ دی سپاہی نے اپنا کوٹ اتار کر بازو سے رکھ لیا۔ جھنکو نے چلم بھری اور انگارہ رکھ کر قربان علی کو دم لگانے کے واسطے دی، قربان علی نے کہا — "جھنکو اس ہفتے تم اپنے گھر سے کہیں غیرحاضر تو نہیں رہے؟"

جھنکو نے اس کا جواب نفی میں دیا۔

قربان علی سپاہی نے گیانی کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر پوچھا —— "کہو بیٹا! کیسے اداس ہو؟"

گیانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر جھنکو نے بیان کرنا شروع کیا۔ "قربان بھائی اسے اپنی ماں کی یاد آئی ہے۔ گاؤں کے لوگ بڑے بدمعاش ہیں خاص کر بھیکم نائی کی ماں وہ اسے ماں کی یاد دلایا کرتے ہیں انھیں اتنا نہیں سوجھتا کہ گیانی کا نازک دل تلملا اٹھے گا"

قربان بھائی! سب سپاہیوں سے زیادہ مجھے تم سے پریم ہے۔ تم جب تنتے ہو مجھے دھمکاتے نہیں۔ گالی نہیں دیتے۔ ٹھوکر نہیں مارتے اسی لئے میں تم سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ گاؤں کے لوگوں کو ذرا ڈانٹ بتا دینا کہ وہ گیانی کے دل کو بے تاب نہ کریں۔ بھیکم نائی کی ماں کو سب سے زیادہ دھمکی دینا۔ وہ بڑی خراب عورت ہے اور سچ پوچھو تو اسی نے میرا گھر برباد کرایا۔"

قربان علی نے پوچھا ——— "میں ضرور ان سب کو ڈانٹ دونگا مگر بھیکم کی ماں نے کیا کیا تھا؟"

جھنکو نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا ——— "قربان بھائی! میں جب لڑکا تھا اور یہ بھی چھوٹی تھی ہم دونوں ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو ہماری دوستی بہت گہری ہو گئی۔ کرما گاؤں کے مالگذار نے مجھے اپنے یہاں نوکر رکھ لیا تو میں اس گاؤں سے چلا گیا۔ میں نے سینکڑوں نقب لگائے۔ چوریاں کیں اور سب مال اسی بدمعاش کو دیتا رہا۔ اس کے بالعوض وہ مجھے پوری حلوا اور مٹھائی کھلاتا تھا اور کپڑے بنوا دیتا۔ خرچ کو روپے دیتا اور کہتا کہ مجھے کیا کرنا ہے سب دھن تیرا ہے۔ جب جی چاہے لے لینا۔ میں اسی بھروسے پر رہا۔ وہ اکثر مجھے سراغ بتایا کرتا۔ نقب زنی کی ترکیبیں بھی بتاتا، چنانچہ بارہا میں گرفتار ہوا اور رہا کر دیا گیا۔ لیکن زندگی بھر میں صرف پانچ مرتبہ نقب کی جائے وقوع پر پکڑا گیا اور مجھے دو برس پھر چار برس پھر دس برس کی سزائیں دی گئیں۔ میں نے اپنے گلے میں ایسا گھر بنا لیا تھا کہ دس تولہ سونا نگل کر اس میں رکھ لوں اور پولیس حیران ہو جائے تو برآمد نہ ہو۔

یہ کہہ کر جھنکو نے کھونٹی میں لٹکی ہوئی چاندی کی زنجیر اتاری اور گیانی اور قربان علی کو دکھا کر نگل گیا وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے قربان علی نے ہر چند گلے میں ہاتھوں سے ٹٹولا لیکن زنجیر کہیں محسوس نہ ہوئی پھر قربان علی کے کہنے سے دوبارہ جھنکو نے زنجیر اگل دی اور ہنسنے لگا۔

قربان علی حیرت زدہ جھنکو کا منہ تک رہا تھا۔

پھر جھنکو نے کہنا شروع کیا ——— "قربان بھیا! جب آخری مرتبہ میں جیل سے رہا ہو کر آیا تھا تو ایک سادھو کا چیلا بن گیا۔ انھیں کے اپدیش کا نتیجہ ہے کہ میرا چال چلن درست ہو گیا۔ کرما گاؤں کے مالگذار نے جب دیکھا کہ اب میں کہیں سے مسروقہ مال لا کر نہیں دیتا تو اس نے آہستہ آہستہ مجھے تنگ کرنا شروع کیا اور میرے خورد و نوش سے لاپروائی برتنے لگا جب میں نے اپنا لایا ہوا زیور اور روپیہ مانگا، تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں ناامید ہو کر یہاں آ گیا۔ لوگوں نے مجھے شادی کرنے کی صلاح دی مگر بھیکم کی ماں شادی نہیں ہونے دیتی۔ جب میں نے گیانی کی ماں سے شادی کر لی تو بھیکم کی ماں کو بڑا برا لگا اور وہ بہت دنوں تک روتی رہی۔ پھر اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب مجھے دیکھتی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا کر کوسنے دیتی میری عورت کو اس نے دھیرے دھیرے بہکانا شروع کیا اور انجام کار اسے میرے گھر سے بھگا دیا۔"

قربان علی دانت پیس پیس کر بھیکم کی ماں کو گالی بکنے لگا۔ جھنکو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر قربان علی سے یہ بھی کہا کہ میرا گیانی اب سیانا ہو رہا ہے اس کے واسطے تم پولیس میں نوکری کا بندوبست کر دو۔ قربان علی نے وعدہ کیا کہ میں نے سیکڑوں لڑکوں کو پولیس میں بھرتی کرا دیا ہے گیانی کو بھرتی کرانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، جھنکو نے جلدی سے اٹھ کر باڑی میں سے نکال کے چار بھٹے توڑے ان کے بالائی پرت اتارے سفید سفید بالوں کے شال ریشے الگ کئے اور بھون کر قربان علی کے آگے رکھ دیئے قربان علی نے ایک چھوٹا بھٹا گیانی کو بھی دیا اور مسکرا کر کہا ——— "لو کھاؤ بیٹا! میں تمھیں بہت جلدی پولیس میں بھرتی کرا دونگا۔"

قربان علی کے جانے کے بعد جھنکو غور کرنے لگا کہ جب گیانی پولیس کا سپاہی ہو جائیگا تو میری سب فکریں دور ہو جائینگی۔ پہلے پہل گیانی کو دس روپے ملینگے۔ پھر ترقی ہو جائیگی۔ گیانی جب نیلی وردی پہن کر منائی میں آئیگا تو لوگ اسے دیکھ کر تھرّا اٹھینگے۔ بھیکم کی ماں! ٹھہر جا مردار میرا گیانی جب سپاہی بن کر آئیگا تو تیرے ہوش گم ہو جائینگے۔ میں تجھ سے بدلہ لئے بنا نہ رہونگا۔ میں گیانی کو ضرور ہدایت کرونگا کہ کرما گاؤں کے مالگذار کا خاص خیال رکھنا اور کوئی موقع ایسا نہ جانے دینا کہ اسے جیل میں نہ پہونچائے، کسی دن گیانی سپاہی سے تھانہ دار ہو جائے گا۔"

پھر جھنکو نے تیتر کا پنجرہ اٹھایا اور گیانی کو ساتھ لے کر میدانوں کی طرف نکل گیا۔

۳

آج گیانی نارائن گنج جا رہا ہے کیونکہ اس کی ماں وہاں رہتی ہے۔ پیر بخش پنجابی کے ہاں سے جو کالے پٹے کی صدری جھنکو نے خریدی تھی۔ آج وہی اس کے زیب جسم ہے دھاری دار لٹھے کا کرتہ پہنے ہے اور سفید صافہ باندھے ہے اس نے چلتے وقت اپنے چاندی کے دو نوں کڑے ہاتھوں میں ڈال لئے ہیں اور ایک لمبی لاٹھی ہاتھ میں لئے ہوئے جلدی جلدی جا رہا ہے وہ باپ سے لڑ کر گھر سے

نکلا ہے۔ باپ نے کہا تھا "ہمت جا" مگر گیانی کے خیال میں یہ حکم نہیں آیا۔ وہ تمباکو پیا کرتا ہے مگر دوسری جگہ جاتا تھا اس واسطے اس نے ایک کنٹر شیر چھاپ بیڑی اور ایک ڈبیہ ماچس اپنی صدری کے جیب میں ڈال لیا ہے۔ باپ نے جو روٹی پکائی تھی وہ اس نے ناے پر بیٹھ کر کھا لی اور راستے کے واسطے جہاں سے بیڑی ماچس خریدی تھی اسی جگہ سے پاؤ بھر بتاشے خریدے ہیں اور اپنے رومال میں باندھ لئے ہیں

وہ جب کسی گاؤں کے وسط سے گذرتا ہے تو ایک بیڑی ضرور سلگا لیتا ہے۔ پانچ روپے ایک چندی میں بندھے ہوئے اس کی دھوتی میں کمر کے پاس لپٹے ہیں کیونکہ وہ پردیس جا رہا ہے معلوم نہیں کس وقت کیا اتفاق پیش آئے۔

کنوار کی تیز دھوپ تھی، ہلواہے کھیتوں میں گندم کی تخم ریزی کر رہے تھے دوپہر ڈھل رہی تھی اس وقت گیانی نارائن گنج پہونچا اس نے اپنی ماں کا پتہ لگایا وہ گاؤں کے آخری سنسان گوشہ میں جو مکان ہے وہاں رہتی تھی۔

گیانی جب وہاں پہونچا اور اپنی ماں کو پکارا "ہو؟" تو اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور کسی کے سرگوشیاں کرنے کی آہٹ معلوم ہو رہی تھی۔ گیانی تھکا ہوا تھا اپنے صافے کے پلو سے پیشانی اور بھوؤں کا پسینہ خشک کر کے نیچے سائبان کے گھر کی بانس کی دیوار کے سہارے اکڑوں بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد پچھلے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی پھر تھوڑی دیر میں سامنے کا دروازہ کھلا۔ گیانی کی ماں شاید سو رہی تھی اس لئے اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھی کیونکہ دروازے بند کر کے سوئی تھی اور ہوا اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے شاید تنگی تنفس کا مرض ہو گیا تھا اس لئے وہ ہانپ رہی تھی، اس نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر خوشی اور گھبراہٹ سے کہا ———— "آہا! میرا گیانی آیا ہے، آؤ بیٹا آؤ۔"

گیانی نے کھڑے ہو کر اپنی ماں کے قدموں کو ہاتھ سے چھوا اور پھر وہی ہاتھ اپنی پیشانی سے لگا لئے اس نے تین مرتبہ یہ حرکت کی گویا وہ اپنی ماں کے قدم لے رہا تھا۔ گیانی اپنی ماں کی دعائیں حاصل کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا تھا اس لئے اس کی نظر اندر گئی ایک نوار کا پلنگ بچھا ہوا تھا اس پر ایک دری بچھی تھی دری پر سفید چادر بچھی تھی دو تین تکئے رکھے تھے۔ گہرے ہرے رنگ کی اونی لوئی، پائنتی رکھی تھی۔ گیانی نے خیال کیا کہ ماں کتنی اچھی حالت میں ہے ہم لوگ کالے کمبل اور دھان کے پیال پر رات بسر کرتے ہیں مگر میری ماں ایسے اچھے بستر پر سویا کرتی ہے۔

گیانی کی ماں نے ایک ایلومونیم کی طشتری میں چند گلاب جامن اور چند امرتیاں نکالیں اور اپنے بیٹے کو پیش کیں۔ اس نے کہا۔

"لو بچے کھاؤ، تم بہت تھکے ہوئے ہو بیس میل پیدل آئے ہو، میں لوٹا پانی لائی" اس نے کانسے کے گول لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیا اور گیانی کے قریب بیٹھ کر سنائی کے حالات پوچھنے لگی۔ اس نے بھیکم کی ماں کے حالات اور خیریت خاص طور پر پوچھی اور جب گیانی کھا چکا تو اس نے ایک گلوری اسے کھانے کو دی۔ گیانی نے ارادہ کیا کہ وہ بیڑی پیئے لیکن ماں کے پاس ادب سے وہ نہ پی سکا۔

بالآخر ماں نے پوچھا ———— "کیوں گیانی! کیا تمھارے باپ نے تمھیں کچھ روپے خرچ کے واسطے دیئے ہیں؟ بیٹا آج کل میں بہت تنگ ہوں۔ اگر ہو سکے تو میری مدد کرو۔"

گیانی نے فی الفور وہ پانچ روپے جو اس کے پاس بندھے تھے کھول کر اپنی ماں کو دیدیئے۔ ماں نے گیانی کی بڑی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ تمھارے آنے سے میرا غم غلط ہو گیا ہے۔ پھر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ جب کہ ماں اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہو، بیٹے کا دل کتنی راحت، کتنا سکون، کتنا آرام محسوس کرتا ہے اس کا اندازہ دنیا کے تمام انسانوں نے لگایا ہوگا۔

شام کو باہر دالان میں کمرے کے دروازے سے ہٹ کر گیانی کے واسطے ٹاٹ کا ایک بستر کر دیا گیا۔ اس کی ماں نے تاکید کی کہ تم جلدی سو جانا کیونکہ رات کو ہمیشہ میرے بھائی، میرے چچا، خالو اور اکثر رشتہ دار یہاں آتے ہیں اور بہت رات گئے تک بیٹھا کرتے ہیں۔ میں انھیں چلے جانے کے لئے کس طرح کہہ سکتی ہوں اس لئے تمھارا بستر میں نے باہر گوشہ میں بچھا دیا ہے تاکہ تمھیں تکلیف نہ ہو اور تمھاری نیند میں خلل نہ آئے۔ گیانی نے اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا اور جس گوشہ میں اس کا بستر تھا وہاں سر شام ہی سے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

تمام گاؤں سونا اور آبادی چپ ہو گئی۔ صرف کتوں کے بھونکنے کی صدائیں اور ندی کا شور اور جھینگروں کی آوازیں باقی رہ گئیں۔ اس وقت یکے بعد دیگرے چند آدمی گیانی کی ماں کے گھر میں بے تکلفانہ داخل ہوئے۔ گیانی کو نیند نہیں آئی تھی بلکہ وہ چپ چاپ لیٹا ہوا تھا اس نے خیال کیا کہ یہی میرے نانا میرے ماموں اور اعزہ ہیں۔ رفتہ رفتہ کمرے میں آوازیں، سرگوشیاں قہقہے گلنے سنائی دینے لگے۔ گیانی کو خیال گزرا کہ میرے ماموں، نانا اور دوسرے اقارب بڑے بڑے لوگ ہیں اور پڑھے لکھے ہیں کیونکہ ان کی صاف گشت

گفتگو اور انداز کلام سے یہی مترشح ہوتا تھا۔ وہ رات کے تین بجے تک نہ سو سکا اور یہی خیال جاگزیں رہا کہ ماں اب آ کر مجھے اٹھا کر لے جائیگی۔ اپنے بھائی، چچا۔ اور سب سے ملا کر کہیگی کہ دیکھو یہی میرا بیٹا ہے لیکن ماں نہیں آئی جب وہ صبح بیدار ہوا تو دیکھا کہ اس کی ماں باریک سفید ساڑی پہنے ہوئے پلنگ پر لیٹی ہے اس کی آنکھیں شب بیداری کے سبب سے خمار آلود ہیں اس کے ہونٹ پان اور مسی کے سبب سیاہی مائل ہو رہے ہیں۔ اس کی پیشانی پر طلائی جھومر جھول رہا ہے وہ ململ کی نیم آستین پہنے ہے اور اس کے گلے میں سونے کی زنجیر کا چندن ہار پڑا ہے۔ پلنگ کے پاس باسی پھولوں کے ہار اس فرش پر بکھرے ہیں جو تمام کمرے میں بچھا ہوا ہے جب اس نے سڑک پر نگاہ کی تو دیکھا کہ مٹھائی رکھنے کے خالی دونے پڑے ہیں۔

ماں نے گیانی کو دیکھ کر قریب بلا لیا اور نرمی سے پوچھا ــــ "رات تمھیں آرام سے نیند آئی یا نہیں؟"

گیانی نے وہی جواب دیا جس کی وہ متوقع تھی کہ "جی ہاں"

گیانی نے اپنی ماں کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا ــــ "میں نے اپنے نانا، اپنے ماموں اور دوسرے عزیزوں کی صورت آج تک نہیں دیکھی ہے مجھے ان سب سے ملا دو"

ماں نے کہا ــــ "اے ہاں، میں بالکل بھول گئی، اب ملا دونگی"

اس دن ماں نے گیانی سے یہ بھی کہا کہ تمھیں یہاں بیٹھے بیٹھے برا لگتا ہوگا۔ تمھارے ماموں نے داروغہ صاحب سے کہدیا ہے کہ ہمارا بھانجہ تھانے میں آیا کریگا۔ میں نے تمھارے ماموں سے رات کو تمھارا ذکر کردیا ہے۔ تم دوپہر بھر وہاں رہنا۔ آج سے دوپہر تھانے میں صرف کیا کرو"

گیانی نے ماں کا کہنا مان لیا۔

وہ روز تھانے چلا جاتا اور شام کو آ کر کھانا کھانے کے بعد ماں سے دو دو باتیں کر کے سو جاتا۔ روز اس کی ماں اپنے رشتہ داروں سے گیانی کا تعارف کرانے کا وعدہ کرتی تھی مگر اپنے حافظہ کی کمزوری کے باعث بھول جاتی تھی۔

۴

آج ماں کی ہدایت کے خلاف گیانی دوپہر کو گھر آ گیا کیونکہ تھانے میں روزانہ بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اکتا گئی تھی۔ وہ جب قریب پہونچا تو اسے قہقہے سنائی دینے لگے اس نے آج ارادہ کیا کہ میں اپنے رشتہ داروں کو پوشیدہ طور پر دیکھوں گا۔ دیوار کے قریب ہو کر وہ دروازے کے پاس جا پہونچا۔ اندر سے زنجیر بند تھی اس نے جو کچھ دیکھا اس کا گیانی کو یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن آنکھیں مل کر دیکھنے پر بھی اسے وہی نظر آ رہا تھا جو پہلے دیکھا تھا۔ گیانی کی ماں وسط میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ساری کا آنچل سر پر سے کھسک کر الگ ہو گیا تھا چند آدمی اس سے خوش فعلیاں کر رہے تھے اور وہ ایک سیاہ بوتل میں سے کانچ کے گلاس میں خبر نہیں کیا بھر بھر کر سب کو باری باری سے پلا رہی تھی گیانی دروازے کی درزوں میں سے جھانک رہا تھا۔

ایک آواز سنائی دی ــــ "وہ کب جائے گا"

گیانی کی ماں نے کہا ــــ "نہیں معلوم کمبخت کب ٹلتا ہے"

دوسرے شخص نے کہا ــــ "مجھے تو زہر سا لگتا ہے"

ایک اور شخص کہنے لگا ــــ "جلدی بھگاؤ وہ سنائی ہی میں ہے تو بہتر ہے"

ایک آدمی نے گیانی کی ماں کی سی آواز بنا کر کہا ــــ "میرے بچے! تمھارے آنے سے میرا غم غلط ہو گیا ہے" پھر وہ گیانی کی ماں کے سر پر چمکار کر ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ پھر کسی نے کہا "بالکل بیوقوف دیہاتی لڑکا ہے۔ تم نے خوب بنایا اور پانچ روپے اینٹھ لئے"

پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ گیانی کی صورت سرخ ہو گئی۔ وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گیا جس کھونٹی پر اس کی صدری ٹنگی تھی وہاں گیا جلدی جلدی صدری پہنی دھوتی بغل میں دبائی۔ لاٹھی لی اور دبے پاؤں وہاں سے نکل آیا۔

وہ شام کے وقت ایک گاؤں میں رہ گیا اور دوسرے دن ایک بجے اپنے گاؤں میں پہونچا۔ گاؤں والے اس سے پوچھنے لگے "تو کہاں گیا تھا رے گیانی؟" مگر اس نے کسی کو جواب دیا بلکہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ جھنکو چپ چاپ بیٹھا ہوا پہاڑ کی سمت دیکھ رہا تھا گیانی نے کل سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اس کی صورت اتری ہوئی تھی۔

گیانی جونہی جھنکو کے قریب پہونچا دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگا۔ جھنکو چونک اٹھا پلٹ کر دیکھا تو گیانی منہ کو ہاتھوں سے ڈھانپے کھڑا رو رہا ہے۔

"گیا رے! کیا ہوا بیٹا؟ کیوں روتے ہو کچھ بتاؤ تو سہی؟" یہ کہکر اسے اپنے کلیجہ سے چمٹا لیا۔ جب گیانی نے اپنے باپ کے سینے میں پناہ لی تو اس کی سسکیاں کم ہو گئیں لیکن وہ بہت دیر تک اپنے باپ کی چھاتی سے لگا کھڑا رہا۔ کوئی الفاظ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

جھنکو نے کہا ــــ "گیانی اچھے آ گئے، میں نے کھچڑی پکائی ہے ــــ چلو کھچڑی کھائیں گے"

جاوید

"اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں!"

جناب نثار الملک میر احمدی احمیری

حاصل ہوا یہ تجربہ اُس بت کی نوکری میں
پنشن سے پیشتر ہی ہم آ گئے کمی میں،

کیا چیز آدمی ہے، کیا شے ہے آدمی میں
ہیں دو جہاں کے جلوے اس بزمِ عارضی میں،

گھیرا ہے ہر طرف سے تاریکیوں نے ہم کو
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں،

جب سے کرا چکا ہوں میں "زندگی کا بیمہ"
مر جاؤں ہوشوں پر یہ ٹھان لی ہے جی میں

مدت کے بعد جا کر بخیہ گری کی سوجھی
مجنوں نے نوکری کی "سنگر کی کمپنی" میں

میرِ حزیں ہوا ہے اب آگرہ میں حاضر،
یہ "پوسٹر" لگا دو اس شوخ کی گلی میں!!!

مغل بادشاہوں کے معاشرتی کارنامے

از جناب سید شبیر حسن صاحب بی۔ اے

اگرچہ ؎

ہمیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

مگر ایک غیر مسلم مورخ (پروفیسر بینی پرشاد) رقمطراز ہے کہ

"مغلیہ حکومت کی بنیاد محض عام رعایا کی رضامندی اور خوشنودی پر قائم تھی اور اس کا سب سے بڑا راز مذہبی آزادی اور رواداری تھی۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور دارا ہی کا یہاں ذکر نہیں ہے بلکہ خود اورنگ زیب تک نے اسے یکسر پامال نہیں کیا۔"

اس کے علاوہ مغل بادشاہوں نے رفاہ عام کے لئے پختہ سڑکیں۔ کنویں اور سرائیں بنوائیں اور سڑکوں پر دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے مسافروں کی حفاظت و خبرگیری کے لئے سپاہی مقرر کئے اور مسافر کو تکلیف پہونچنے کی صورت میں سپاہیوں کو سزا دی اور انھیں موقوف کیا یا مثلاً نالہ برکنہ اور دمدمہ پر بند بندھوایا۔ اکبر نے سلطانپور کے دریا پر پل بنوایا ملا نورالدین نے نہر شیخورلی کھدوائی۔ جہانگیر نے دریائے ہی پر پل تعمیر کرایا شاہجہاں نے علاوہ فیروز تغلق کی نہریں صاف کرانے کے اور بہت سی نہریں دہلی تک کھدوائیں، عالمگیر نے تمام شہر اورنگ آباد میں نل لگوا کر پانی کا بہترین انتظام کیا اور مختلف شہروں میں بڑے بڑے تالاب اور حوض تعمیر کرائے۔ نواب کمال خاں نے ساگی ندی سے نہر نکلوائی

تعلیم کے لئے امیر رحیم داد نے بابر کے ایما سے گوالیار میں ایک مدرسہ اور شیخ زین الدین خاں وفائی نے آگرہ میں ایک خانقاہ اور ایک مدرسہ جاری کیا اکبر نے اپنی سلطنت کے تمام شہروں میں مدرسے قائم کرنے کا انتظام کیا۔ اس نے سنسکرت کی تعلیم کو فروغ دیا۔ اور ہندو عالموں کی بھی سرپرستی کی۔ چنانچہ ابوالفضل اکبر کے جن اکیس[۲۱] عالموں کا ذکر کرتا ہے ان میں سے نو[۹] ہندو ہیں۔ خود ابوالفضل نے فتح پور سیکری میں مدرسہ جاری کیا تھا۔ مولانا علاءالدین لاری نے "مدرسہ حسن" قائم کیا۔ عالمگیر نے ہر شہر اور قصبے میں مدرسے جاری کئے۔

جہانگیر نے آگرہ سے دریائے اٹک تک اور آگرہ ہی سے بنگال تک سڑکوں پر درخت لگوائے جو کہ میوہ دار تھے اس نے ایک نئی سڑک بھی آگرہ سے لاہور تک بنوائی جس پر ہر کوس پر مینارے اور تین تین کوس پر کنویں کھدوائے اور ــــ "در شہرہائے کلاں دارالشفاہا ساختہ، اطبا بجہت معالجۂ بیماران تعین نمائند و آنچہ صرف و خرچ می شدہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ می دادہ باشند۔" (تزک جہانگیری)

الہ آباد کی موجودہ سرائے اسی نے بنائی تھی، شاہجہاں نے احمدآباد میں شفاخانہ قائم کیا۔ عالمگیر کی مدد سے نواب خیر اندیش خاں کنبوہ نے اٹاوہ میں ایک شفاخانہ جاری کیا۔ (یہاں اکبر کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس کی رعایا پروری کا اعتراف دوست دشمن سب کو ہے۔)

مغل بادشاہوں کے ظلم وستم کی داستان میں متذکرہ بالا باتوں کے علاوہ حسب ذیل بیانات بھی شامل ہیں کہ

"بنگال میں جو کہ دریائے گنگا کے دونوں طرف راج محل سے سمندر تک قریب تین سو میل کے بے شمار نہریں ہیں جو مال تجارت لے جانے کے لئے گنگا سے کاٹ کر بڑی محنت سے تیار کی گئی ہیں۔ ان نہروں کے دونوں طرف قصبے اور گاؤں آباد ہیں اور چاول و شکر اور مختلف قسم کی ماکولات اور سرسوں، و تل کے بڑے بڑے کھیت ہیں۔"

(مشہور سیاح برنیر، سترھویں صدی)

اور ـــــــ

"یہاں کے راستے فرانس و اٹلی کے راستوں سے بہتر ہیں۔"

(سیاح تھیوونو - سولہویں صدی)

اور ـــــــ

"جہانگیر نے شراب و تمباکو کی فروخت روکی۔ مشرقی بنگال میں خواجہ سرا بنانے کے ظالم رواج کو قطعاً ممنوع کر دیا بہت سی سرائیں۔ مسجدیں، مدرسے اور شفاخانے قائم کئے ہر شہر میں سرکاری روپیہ سے حکیم مقرر کئے لاوارثوں کی جائداد کو بجائے سرکاری خزانہ میں داخل کرنے کے۔ کنویں۔ تالاب۔ سرائیں اور پل وغیرہ تعمیر کرانے میں صرف کرنے کا حکم نافذ کیا اور جاگیرداروں نے جو اپنے فائدے کے لئے مختلف قسم کے ٹیکس قائم کر رکھے تھے انہیں بالکل موقوف کیا۔" وغیرہ وغیرہ

(تاریخ پروفیسر بینی پرشاد بموجب بارہ احکامات جہانگیری)

اور ـــــــ

"شاہجہاں کے زمانہ میں پولیس کا انتظام ہر معاملہ میں اور خاص طور پر سڑکوں پر مسافروں کے آرام وچین کے معاملہ میں اس قدر زبردست تھا کہ کسی شخص کو چوری کے الزام میں سزا دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔"

(سفرنامہ ٹیورنیر صفحہ ۳۳۵)

اور منوچی Storia do Mogor (Manucci) کا میں صفحات ۶۸، ۶۹، ۷۰ پر شاہجہاں کے زبردست اور غیر جانبدارانہ انصاف کی بے انتہا تعریف کرتے ہوئے یہ لکھنا کہ

"شاہجہاں کے تمام ممالک محروسہ میں ہر جگہ اتنی بڑی بڑی سرائیں تھیں کہ ان میں آٹھ سو سے لیکر ایک ہزار تک مسافر مع اپنے گھوڑوں، اونٹوں گاڑیوں اور خدمتگاروں کے آرام سے رہ سکتے تھے۔"

اور لب التواریخ کے مصنف رائے بھارمل (جو کہ شاہجہاں کے زمانہ کو زریں زمانہ کہتے ہیں) کا یہ کہنا کہ

"شاہجہاں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل افسران رکھتا تھا رعایا کے ساتھ نہایت رحمدلی اور محبت سے پیش آتا تھا اور کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا اور ممالک محروسہ میں کاشتکاری کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی چنانچہ جس پرگنے کی آمدنی اکبر کے زمانہ میں تین لاکھ تھی اب اسی پرگنہ کی آمدنی دس لاکھ ہے۔"

حالانکہ وصولیابی کا نرخ بھی وہی پیداوار کا ایک تہائی رہا اور پھر شاہجہاں یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ علاوہ مقررہ لگان کے کسی اور مد کے ماتحت کاشتکاروں سے روپیہ وصول کیا جائے جیسا کہ پروفیسر جادو ناتھ سرکار اپنی کتاب "مغلوں کا انتظام سلطنت" Mughal Administration میں صفحہ ۹۲ پر رقمطراز ہیں۔

"ایک مرتبہ شاہجہاں کسی پرگنے کے کاغذات کا معاینہ کر رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک گاؤں کی آمدنی ایک دم سے کئی گنا بڑھ گئی ہے اس پر اس نے سعد اللہ کو طلب کیا اور اس سے اس امر کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا کہ ایک دریا کے راستہ بدل دینے کی وجہ سے کچھ اور زمین قابل کاشت پیدا ہو گئی اور اس کا لگان قریب کی زمین کے کاشتکار سے وصول کیا گیا جس نے اس کو جوتا تھا۔ لہذا اس گاؤں کی آمدنی بڑھ گئی۔ اس پر شاہجہاں نے کہا کہ یہ دراصل اس زمین کے غریب کاشتکار اور اس کے معصوم بچوں کی آہ وزاری کا جواب دیتے ہوئے دریا خشک ہو گیا ہے۔ قدرت نے ان کو اپنے خزانہ سے یہ عطیہ عنایت کیا تھا لیکن تم نے اس کو سلطنت میں شامل کرنے کی حد سے زیادہ ناشائستہ حرکت کی۔ اگر خدا کی مخلوق کو معاف کرنے کا جذبہ مجھ میں نہ ہوتا تو میں اسی وقت اس شیطان ثانی یعنی ظالم نوجبار (جس نے اس زمین کا لگان وصول کیا تھا) کو قتل کر دینے کا حکم دیدیتا۔ مگر خیر اس کو اس وقت برخواست کر دینا ہی کافی سزا ہے تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور کبھی اس قسم کی نازیبا حرکات اور ظلم نہ کریں۔ تم فوراً حکم جاری کر دو کہ جتنا زائد رقم اس کاشتکار سے وصول کیا گیا ہے اس کو فوراً واپس کر دیا جائے۔"

اسی ضمن میں لب التواریخ کے مصنف رائے بھاری لال شاہجہاں کے انصاف کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہجہاں ہر شخص کے ساتھ برابر اور ایک سا انصاف کرتا تھا۔ اس ہندو مورخ کے بیانات کی منوچی (Manucci) بھی تصدیق کرتا ہے اور اس کے انصاف کی بہت سی مثالیں بھی پیش کرتا ہے چنانچہ ایک جگہ اپنے سفرنامہ میں کہتا ہے صفحہ ۱۹۷

"ایک مرتبہ کچھ تماشہ کرنے والوں نے ایک تماشہ دکھلانے کی بادشاہ سے اجازت حاصل کی اور اس میں گجرات کے گورنر کے مظالم دکھلائے۔ اس پر شاہجہاں نے بڑے تعجب سے کہا کہ "کیا میری مملکت میں ایسے ظالم لوگ بھی ہیں؟ اور فوراً واقعات معلوم کر کے اس گورنر کو رہتاس گڈھ کے قلعے میں زندگی بھر کے لئے قید کر دیا۔"

برنیر بھی یہی لکھتا ہے۔ صفحہ ۳۴۴ - ۳۴۳ کہ

"شاہجہاں اپنی رعایا کے ساتھ اتنی رحمدلی اور شفقت کے ساتھ پیش آتا تھا جتنی اس زمانہ کے بادشاہوں میں کہیں نہیں پائی جاتی تھی، اور اگر امراء رعایا پر ظلم کرتے تھے تو وہ ان کو سخت سے سخت سزائیں دیتا تھا ایسی تمام باتیں کرتا تھا جن سے رعایا کو آرام پہونچے اور اسی وجہ سے رعایا اس سے دلی محبت کرتی تھی۔"

چنانچہ منوچی کہتا ہے کہ جب کبھی قحط پڑتا تھا تو بادشاہ رعایا کی تکلیفوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا اور اس کی (شاہجہاں کی) تخت نشینی کے انیسویں برس جب پنجاب میں قحط پڑا تو اس نے یہ فرمان جاری کیا کہ شاہی خزانہ کے روپیہ سے ان بچوں کو خرید لیا جائے جن کو ان کے والدین بھوک کی وجہ سے فروخت کریں؟ اور ان بچوں کو پھر ان کے والدین کو واپس کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ صرف لاہور میں دس خیرات خانے کھولے تھے جہاں پر کھانا مفت تقسیم ہوتا تھا۔

اب اس ہندو کش، ظالم، ستمگر عالمگیر کے متعلق بھی سن لیجئے حالانکہ بقول مولانا شبلی مرحوم کے عبدالقادر بدایونی نے نکتہ چینی کے ساتھ اکبر کے حالات قلمبند کئے تو جہانگیر نے اپنے زمانہ حکومت میں حکم دیدیا کہ اس کتاب کی اشاعت قطعاً بند کر دی جائے مگر نعمت خان عالی نے وقائع نعمت خاں میں سرتاپا عالمگیر کی ہجو لکھی لیکن عالمگیر کے جانشین بہادر شاہ نے نعمت خاں کو دانشمند خاں کا خطاب دیا اور وقائع نعمت خاں درس میں داخل ہوگئی۔

عالمگیر کو بہادر شاہ سا جانشین، اور نعمت خان عالی، خافی خاں، شاہنواز خاں جیسے وقائع نگار ہاتھ آئیں تو بیچارے کو نیکنامی کی کیا توقع ہو سکتی ہے لیکن ان متعصب لوگوں کی تحریروں کے باوجود ہم پر کسی نہ کسی طرح سچ ظاہر ہو ہی جاتا ہے چنانچہ عالمگیر کے متعلق لین پول (باوجود انتہائی مخالف ہونے کے) لکھتا ہے۔

"سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینیاں اورنگ زیب کے حالات پر اسی زمانہ تک ہیں جب تک وہ شاہزادہ تھا لیکن وہ سیاح جس وقت اس کے زمانہ شہنشاہی کا حال لکھتے ہیں تو سوائے کلمات تحسین کے کچھ نہیں کہتے اس کے پچاس برس کی دراز حکومت میں ایک ظالمانہ فعل بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے حالانکہ ہندوؤں کے ستانے میں بھی جو اس کی دینداری کا ایک جز و تھا سب کو تسلیم ہے کہ کوئی قتل یا جسمانی تکلیف رسانی نہیں پیش آئی۔"

اسی "ہندو کش" بادشاہ کے متعلق خافی خاں لکھتا ہے کہ ——

"قرار یافت کہ از جملہ پیشکاران دفتر دیوانی و بخشیان سرکار یک پیشکار مسلمان و یک ہندو مقرر می نمودہ باشند۔"

اور مولانا شبلی مرحوم نے ایک طویل فہرست صرف ان بڑے بڑے منصبداروں کی دی ہے جن کا منصب ایک ہزار سے لیکر چھ ہزار تک تھا۔ اس کے علاوہ اس کے مذہبی تعصب کے خونین افسانوں میں یہ واقعات بھی شامل ہیں کہ ایک مرتبہ محمد دین خاں نے جو کہ اورنگ زیب کا مقرب تجہزاری منصب دار تھا یہ عرضی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

"پیر و مرشد عالم و عالمیان سلامت! ہر دو خدمت بخشی بایرانیاں (شیعہ) دیوصفت مقرر است اگر یک بخشیگری باین فدوی قدیم الخدمت مرحمت شود باعث تقویت دین و انتزاع کار از کفرئین خواہد بود آیۃ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء (احکام عالمگیری صفحہ ۳۹)

اس عرضی پر عالمگیر نے یہ جواب تحریر کیا۔

"آنچہ از قدر حضرت خود نوشتہ بیان واقعہ است نقد ربقدر قصدوانی بعمل می آید و آنچہ از "بہ مذہب ایرانیاں" نوشتہ امور دنیارا بامذہب چہ نسبت؟ و کارہائے نسبت مذہب را بہ تعصب چہ دخل، لکم دینکم ولی دین اگر ہمیں قاعدہ مقرر می بودے بایست کہ جمیع راجاہا و تواہناستاصل میکردم اختیار تغیر قابلان نزد عقلا مذموم است۔"

اور اس کا یہ قول بھی قابل غور ہے کہ "مارا بہ مذہب کسے چہ کار است؟ عیسٰی بدین خود موسٰی بدین خود۔" حالانکہ وہ خود سُنّی تھا لیکن اس نے شیعوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مرتے وقت اپنے ذاتی روپے کے متعلق یہ وصیت کی (حالانکہ اگر وہ اس کے خلاف بھی کرتا تو بھی کسی کو اس پر تعصب یا غیر رواداری کے اعتراض کا موقع نہیں تھا۔)

"سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در صرف خاص است روز وفات بفقرا بدہند اذیں راکہ زر کتابت قرآن نزد فرقہ شیعہ حرمت دارد بہ کفن و مایحتاج آں صرف نکنند (احکام ۳)

یہی ظالم بادشاہ انصاف کے معاملہ میں اپنے بیٹوں تک کے ساتھ رعایت نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب کہ کچھ مرہٹوں نے سورت کی سڑک پر احمد آباد سے چالیس کوس کے فاصلے پر چند سوداگروں کو لوٹ لیا اور جب محمد اعظم (فرزند عالمگیر) کو جو اس وقت احمد آباد کا صوبہ دار تھا اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس نے جواب دیا کہ "یہ واقعہ سورت کے متصدی امانت خاں کی فوجداری میں ہوا ہے مجھکو اس سے تعلق نہیں ہے"۔ اس کے متعلق جب اورنگ زیب کو پتہ چلا تو اس نے یہ حکم جاری کیا کہ

"بجزار ازاہل منصب کم وبموجب اظہار تاجران زر نقد از وکیل ایشاں بگیرند۔ اگر غیر بادشاہزادہ می بود بعد تحقیق حکم شد برائے بادشاہزادہ سزا عدم تحقیق است۔ زہے بادشاہ زادگی کہ خود را کمتر از امانت خاں بدانند۔ ہرگاہ در حالت حیات ما دعوٰی وراثت ملک داشتہ باشند۔ پس چرا در حیات امانت خاں را شریک میراث نگیرند"۔ (احکام ۲۱)

سید لعل مند سور کا جاگیردار تھا اور بہت شراب پیتا تھا اس وجہ سے شہزادہ اعظم نے عنایت اللہ کے ذریعہ کوشش کی کہ اس کی جاگیر کو اپنی ملکیت میں منتقل کرلے اس پر اورنگ زیب نے اس کو یہ لکھا۔

"کارے کہ تعلق بہ محتسب دارد بخود گرفتن و التماس تغیر جاگیر نمودن تصرف تازہ و بامزا است، یک لشتی (جاگیر تغیر نمودن) محال است چہ جائے سرلشتی، جاگیر کسے گفتہ کسے تغیر نمی شود در نوکری آں بابا (شہزادہ اعظم) باسید لال مساوی و در عبادت طرف ثانی ہزار مرحلہ زیادہ بہ محتسب آنجا بنویسد کہ بعد تحقیق دارسیدہ مفصل معروض دارد۔" (احکام ۱۸)

اس کے علاوہ ۱۰۸۲ھ میں عالمگیر نے یہ فرمان جاری کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کئے جائیں اور عام منادی کردی جائے کہ اگر کسی شخص کو بادشاہ کے خلاف کوئی دعوٰی ہو تو وہ وہاں کے قاضی کے یہاں پیش کرے اور وہ سرکاری وکیل جو کہ وہاں پر مقرر کیا گیا ہے اس کی جواب دہی کرے اور اگر واقعی اس کا دعوٰی صحیح ہو تو سرکاری وکیل اس کا مطالبہ ادا کرے۔ (خافی خاں) صفحہ ۲۴۹،

اس کے ساتھ ہی ساتھ پرچہ نویسی اور واقعہ نگاری کا محکمہ بہت بڑھا دیا تاکہ ملک و رعایا کی حالت و کیفیت آسانی سے معلوم ہو سکے اور خرابیوں کو دور کیا جا سکے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رقعوں میں ایک ایک چیز کا حوالہ دیتا ہے اور ان کے متعلق گورنروں کو ہدایات کرتا ہے پھر دادخواہی اس قدر شوق اور تندہی سے کرتا تھا کہ اس کا اندازہ جیملی کریری کے اس بیان سے جس نے اس کو اسی برس کا بوڑھا دیکھا تھا حسب ذیل بیان سے ہو سکتا ہے۔

"وہ لکڑی کے سہارے عہدیداروں کے درمیان میں کھڑا ہوا تھا اور دادخواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بغیر عینک کے پڑھ کر ان پر اپنے آپ دستخط کر رہا تھا اور اس کے خوش و بشاش چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے اس کام سے نہایت خوش اور شاداں ہے۔" (تاریخ الفنسٹن)

فیروز شاہ سے قبل جو والیان ریاست نذرو تحائف بادشاہ کو پیش کرتے تھے وہ بغیر کسی معاوضہ کے ہوتے تھے لیکن فیروز تغلق نے یہ کیا کہ ان کی قیمت کا اندازہ کرکے والیان ریاست کے خراج میں سے منہا کر دیئے جاتے تھے مگر اس کے بعد پھر وہی پہلا طریقہ رائج ہو گیا اور اورنگ زیب کے زمانہ تک جاری رہا۔ لہٰذا اورنگ زیب نے تحفے تحائف اور نذروں کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ امراء کے مرنے پر ان کی جائداد اور مال ضبط کرکے خزانہ شاہی میں داخل کرنے کے قدیم قاعدے کو یک قلم موقوف کر دیا

"واگذاشت متروکات امرائے عظام کہ مطالبہ دار سرکار معلی

تہ ہاشہ زاں انتخب تا نمار کہ متصدیان ولایت شاہی حمایل آئیت
سایق بفرمان اشتیاد آنتود مد این معنی سبب آزار ماتم زدگان
باغرا جرحلان می شد عفو فرمود و بلاد ند۔ (ماثر عالمگیری صفحہ ۲۰۱)

عالمگیر کے زمانہ میں آسام، چاٹگام، حیدرآباد اور بیجاپور سلطنت میں شامل ہو گئے تھے لیکن ان کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان کے شامل ہو جانے سے شاہجہاں کے زمانہ سے اورنگ زیب کے زمانہ میں دوگنی سے زیادہ یعنی ساڑھے اکتیس کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی بڑھ جائے (شاہجہاں کے زمانہ میں اٹھائیس کروڑ بچاس لاکھ اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی) ایسی صورت میں جب کہ اورنگ زیب نے ایسے اسّی ٹیکس بالکل معاف کر دیئے تھے جو کہ شاہجہاں کے وقت تک جاری تھے اور جن کی آمدنی خاصی بھاری کروڑوں تک تھا ہمیں لامحالہ یہی ماننا پڑتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بندوبست بہت اچھا تھا اور کاشتکاری کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی کہ ان باتوں کے باوجود آمدنی دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔

اسی ظالم اورنگ زیب کے زمانہ میں جب بقول ڈاکٹر ہملٹن (مشہور سیاح) صرف شہر ٹھٹہ میں چار سو درسگاہیں پائی جاتی تھیں اور وہ بھی اس حیثیت کی کہ ہملٹن ان میں سے ہر ایک کو کالج سے تعبیر کرتا ہے تو غور کیجئے کہ پایۂ تخت اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں تعلیم و تعلم کی کیا حالت ہو گی۔

ان سلاطین نے نہ صرف اتنا ہی کیا بلکہ ان کے علاوہ ایجادیں و اختراعیں بھی کیں نورجہاں نے نئے نئے قسم کے زیورات عطریات اور پوشاکیں ایجاد کیں اکبر نے الگ الگ ہو جانے والی جوڑی دار توپ، خود آٹا پیسنے والی چکی اور خس کی ٹٹی ایجاد کی، تختہ بندی، چمن بندی، خیابان، جدول اور قلم لگانے کا رواج دیا پھولوں میں گل سُرخ، نرگس، بنفشہ، یاسمن، کبود، سوسن، ریحان، رعنا، زیبا شقائق، تاج خروس، قلمہ، نافرمان، خطمی، درختوں میں سرو، صنوبر، چنار، سفیدار، بید مولہ، صندل، پستہ، اور قسم قسم کے انگور و انناس وغیرہ دوسرے ملکوں سے لا کر ہندوستان میں جاری کئے اور ان کو ہندوستان کی آب و ہوا کا مختلف طریقہ سے عادی بنایا گیا۔

پھر ملک کی دولت سے صرف بادشاہ وقت ہی فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ بلکہ بقول ایشوری پرشاد کے (مسلم رول ان انڈیا صفحہ ۶۱۴) رعایا کو اس سے بہت کافی نفع پہنچتا تھا۔ شاہجہاں کی شان و شوکت کی وجہ سے رعایا کے لئے لاتعداد ذرائع آمدنی پیدا ہو گئے تھے۔ جب بابر نے جو کہ ہندوستان میں صرف چار سال رہا تھا اور ان چار سال میں بھی زیادہ تر وقت سلطنت کے قیام کے لئے لڑائیوں میں صرف کیا تھا معاش کا اتنا ذریعہ پیدا کر دیا تھا کہ آگرہ میں ۶۸۰ چھ سو اسی سنگ تراش ہی محض اور سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار اور کوئل میں ۱۴۹۱ صرف سنگ تراش رکھے تو غور کیجئے کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ نے ذریعہ معاش کتنا وسیع کر دیا ہو گا؟ جب کہ ان کی بنائی ہوئی سیکڑوں عمارتیں تباہ و برباد ہو جانے کے علاوہ آج بھی ہزارہا موجود ہیں۔ ان وسیع ذرائع آمدنی کے ساتھ ساتھ چیزوں کی قیمت اتنی کم تھی کہ بقول ایشوری پرشاد صاحب کے (موجودہ) ایک روپیہ سے اس زمانہ میں اتنی چیزیں خریدی جاسکتی تھیں جتنی اب دس روپے میں خریدی جاتی ہیں۔ اور اس زمانہ سے اب تک اگر قیمتیں ایک سو سے چھ سو تک بڑھی ہیں تو مزدوری ایک سو سے محض تین سو تک بڑھی ہے، اور اسی وجہ سے مورلینڈ (کمصب۔ ا-۱۸۹-۲۰) اور اسمتھ (V. A. Smith) جیسے متعصب، غلط بیان اور جانب دار مورخ تک یہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ واقعی بہ نسبت آج کل کے اس زمانہ میں لوگوں کو بہت زیادہ کھانا میسر آتا تھا۔ چونکہ اس زمانے سے آج تک مزدوری میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جتنا کہ قیمتوں میں ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ

"ان بادشاہوں نے صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی دی، اور لاہور، آگرہ، فتحپور، احمد آباد، برہان پور اور کشمیر وغیرہ میں کارخانے جاری کئے جہاں پر قیمتی کپڑے تیار ہوتے تھے"
(مسلم رول ان انڈیا مصنفہ ایشوری پرشاد صفحہ ۶۱۴)

اور برنیر کہتا ہے کہ

"قلعوں میں کارخانے تھے جہاں پر سنار، نقاش، رنگ ساز، درزی، چمار، زردوز اور قیمتی کپڑے بنانے والے اپنی اپنی ہوشیاری اور ایجادات کے جوہر دکھاتے تھے" (صفحہ ۲۵۹)

ابوالفضل لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت (اکبر) نے اس طرف خاص توجہ کی کہ نئے نئے قسم کے کپڑے بنے جائیں اور اس کے لئے اس نے ہوشیار کاریگر ملازم رکھے تاکہ وہ لوگوں کو بہتر سے بہتر قسم کی صنعت سکھائیں۔ لاہور، آگرہ، فتحپور اور احمد آباد کے کارخانوں سے بہترین مال بن کر نکلتا تھا۔ ان مقامات میں

سے سب سے زیادہ مشہور لاہور کے کپڑے ۔ فتحپور سیکری کے قالین اور گجرات دیپالپور کے لعل کپڑے اور ڈھاکہ کی ململ تھی ۔ ان کے علاوہ کپڑے پر تصویریں ریشمی کپڑے ۔ مخمل ۔ زربفت ۔ فرنگی ۔ کاشی ۔ گجراتی ۔ ہردی ۔ طاس گجراتی ۔ دارائی مقیش ۔ شروانی ۔ شجر فرنگی ۔ دیبائے فرنگی ۔ دیبائے یزدی ۔ خارا ۔ اطلس ختائی نوار ختائی ۔ خز ۔ مخمل فرنگی خانی ۔ سرنگ قطنی ۔ کتان فرنگی ۔ تافتہ ۔ ماشری مطبق چوتار میں شکو ۔ سری صاف ۔ گنگاجل ۔ بھیروں ۔ سالور ۔ بہادر شاہی ۔ گریہ سوتی ۔ شیلہ دکنی ۔ مہرمل ۔ سہن ۔ جیونہ ۔ اسادلی ۔ محمودی ۔ پنجتولہ ۔ جبولہ چھینٹ وغیرہ تیار ہوتی تھیں ۔ شامیانے ۔ ڈیرے ۔ مختلف وضع و قطع کے بنائے جاتے تھے شالین ، قالین ، آئینے ، تخت وغیرہ وغیرہ ، نئی نئی طرز کے تیار کئے جاتے تھے بادشاہ چونکہ ان چیزوں کی سرپرستی کرتا تھا لہذا امرا اور عہدیدار بھی اپنے اپنے شہروں میں صنعت و حرفت کی ترقی کے خواہاں تھے پہلے پہل امرا کو تجارت کی رغبت نہیں تھی ۔ اس لئے اکبر کے خاندان کے شہزادوں نے تجارت شروع کی حد یہ ہے کہ خود شہنشاہ کی ماں نے بیانہ سے نیل خرید کر فروخت کرنے موچا بھیجا ۔ شاہزادوں کی دیکھا دیکھی امرا میں بھی اس کے چرچے ہوئے اور تجارت میں ترقی ہونے لگی ۔

چنانچہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہونے سے قبل ہندوستان دنیا کا سب سے زبردست تجارتی ملک تھا اور یہی وجہ تھی کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپ کی ہر قوم ہندوستان میں آرہی تھی کہ اس درخت کے پھل کھائے جس کی آبیاری مسلمان بادشاہوں نے کی تھی ۔

وہ احمق جیسے مورخین جو انگریزوں کو ہندوستانیوں کے لئے خدا کی ایک خاص رحمت اور دیگر بادشاہوں کو وحشی و خونخوار درندے سمجھے ہوئے ہیں ترتیب کے اس بیان کا مقابلہ کہ

" ہندوستان کی صنعت و حرفت عرصہ گذر چکا ہوتا کہ تباہ ہو چکی ہوتی اگر بادشاہ اور امرا اس کی سرپرستی نہ کرتے اور ان کاریگروں کو نوکر نہ رکھتے جو کہ ان کے گھروں میں کام کرتے تھے اور ان کے بچوں کو سکھاتے تھے ۔"

مشہور مورخ ایچ ۔ ایچ ولسن (H. H. Wilson) کے حسب ذیل بیان سے کریں جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ اسی رحمت خداوندی نے کس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت کو برباد کر کے اپنی صنعت و حرفت کی ترقی کی بنیادیں قائم کیں اور اس کو اپنے ذاتی فلاح و بہبود نفع و غرض کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا ۔

" جن دغابازانہ اور خود غرضانہ اصول پر ہندوستان کے ساتھ سوتی کپڑے کی تجارت قائم کی گئی اس کی مثال صفحات تاریخ میں نہیں ملتی ..... اس زمانہ (سنہ ۱۸۱۳ء سے قبل) میں ہندوستان نے سوتی کپڑے کی صنعت میں اس قدر حیرت ناک ترقی حاصل کر لی تھی کہ وہاں کے تیار شدہ کپڑے برطانوی منڈیوں میں انگلستان کے بنے ہوئے کپڑوں کے مقابلہ میں پچاس سے لے کر ساٹھ فی صدی تک ارزاں اور کم داموں پر ملتے تھے اس لئے وطنی تجارت کو غیر ملکی تجارت کے مقابلہ میں قائم و سالم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ موخر الذکر پر یا تو بہت ہی زیادہ محصول (ستر سے اسی فیصدی تک) عاید کر دئیے جائیں یا ان کی درآمد ہی قطعاً ممنوع قرار دے دی جائے ..... اگر صورت حال یہ نہ ہوتی اور اگر اس قسم کے امتناعی فرمان نافذ نہ کئے جاتے تو یہ واقعہ ہے کہ پیزلی اور مانچسٹر کے کارخانے جبکہ وہ ہنوز گہوارہ ہی میں تھے ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جاتے اور بمشکل انہیں حرکت میں لایا جا سکتا حقیقتہً ہندوستانی مصنوعات کی قربانی چڑھا کر انہیں زندہ کیا گیا ہے ۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ ہم سے اچھی طرح بدلہ لے لیتا اور اپنی صنعت کو بچانے کے لئے وہ بھی ہمارے مال پر شدید محاصل عاید کرتا اور اس طرح ایک حد تک اپنے تئیں برباد ہونے سے محفوظ و مامون رہتا ۔ لیکن یہ بات بھی کس قدر افسوسناک ہے کہ اسے خود اپنی حفاظت کا بھی حق حاصل نہیں ہے ۔ وہ تمام تر اغیار کے رحم و کرم پر ہے ۔ برطانوی مال زبردستی اس کے سر منڈھا گیا ہے اور غیر ملکی صنائع نے سیاسی بے انصافی کا ہتھیار استعمال کر کے ایک ایسے حریف کا گلا گھونٹا ہے جس سے وہ برابر کی جنگ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا ۔"

غزل

جناب سید ارشاد حسین صاحب آزہر، بی۔ اے

گل کی رنگت نہ رہی زینتِ گیسو ہو کر
پھول سا رنگ اڑا چہرہ سے خوشبو ہو کر

خالِ رُخ سُرمۂ چشم و خمِ گیسو ہو کر
کارفرما ہے جوانی تری جادو ہو کر

دل کو جب اور کوئی شکلِ رسائی نہ رہی
شاملِ تارِ نظر ہو گیا آنسو ہو کر

شوخیاں عالمِ طفلی کی چھپائے نہ چھپیں
آخر آنکھوں سے نمایاں ہوئیں جادو ہو کر

میری قسمت کی سیاہی ہے ترے رخ پہ نقاب
لیتی ہے تیری بلائیں ترا گیسو ہو کر

مرکزِ حسن پہ جاتی ہی نہیں اپنی نگاہ
تو نے حیرت میں مجھے ڈالا ہے ہر سو ہو کر

ہنس پڑے پھول ہوئی بوئے گل آوارہ مزاج
تم نے دیوانہ بنایا انھیں ہمرو ہو کر

پھوٹ نکلا ہے ہر اک جا سے ترا رنگِ شباب
رُخ پہ غازہ ہے نگاہوں میں ہے جادو ہو کر

حسرتِ دید میں مدت ہوئی دل خون ہوا
اب ہی آجا کہ ٹپکنے کو ہے آنسو ہو کر

روبروان کے بھلا گریہ کا موقع کیا ہے؟
پئے دیدار مژہ پہ ہے دل آنسو ہو کر

آس کیا رکھے اب اس شوخ سے آزہر کوئی
جس نے دل لوٹ لیا زینتِ پہلو ہو کر

چور پے چور

مصور اسرار ڈاکٹر خان شاطر، غزنوی

ایک غیرمادی سائے سے زیادہ خاموشی کے ساتھ "الف" آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرکے اوپر پہونچا — کمرہ کا دروازہ بالکل کھلا تھا — اور دروازے کا کھلا ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا۔

اس نے احتیاطاً اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا — انگلیوں نے جیب میں پستول کی موجودگی کا یقین دلایا اور پھر — فوراً ہاتھ جیب سے باہر نکل آیا —

الف آہستہ سے کمرے کے اندر داخل ہوا — بالکل ایک سائے کی طرح بغیر آواز پیدا کئے — اس نے اپنے پیچھے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا — شاید دروازے کو خود بھی احساس نہ ہوا ہوگا کہ مجھے بند کیا گیا ہے — کمرے کے اندر قبر سے زیادہ سیاہ اور بھیانک تاریکی تھی — تاریک، مجرم کے دل کی طرح تاریک — خاموش — قبرستان سے زیادہ ہیبتناک خاموش — وہ کھڑا تھا — خاموش — قطب کے لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت۔

کئی سیکنڈ گذر گئے —

کوئی آہٹ — کسی قسم کی آواز مفقود تھی — ابھی تک!

چند سیکنڈ اور گذر گئے —

اور اب —

اس کے کانوں نے تیز تیز سانس کی آواز غیر متوقع طور پر محسوس کی — کوئی انسان — زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

وہ سمجھا کہ میرے کان مجھے دھوکہ دے رہے ہیں لیکن اسی وقت اس نے کھڑکھڑاہٹ سنی — جیسے دو بھاری ثقیل چیزیں آپس میں ٹکرائیں۔

آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھا — بغیر آہٹ پیدا کئے — حتی کہ وہ بڑھتا بڑھتا خوابگاہ تک جا پہونچا، اب —،

اب وہ خوابگاہ کے دروازے میں — پردہ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، اب پھر اس نے کسی چیز کے گرنے کی ہلکی سی آواز سنی۔

اس نے پردہ آہستہ آہستہ ایک طرف سرکایا اور درز میں آنکھ لگا کر خوابگاہ کے اندرونی منظر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ تجوری پر پڑی۔ زمین پر پڑے ہوئے چھوٹے سے لیمپ کے دائرہ نما روشنی میں تجوری صاف نظر آ رہی تھی — اور تجوری کے قریب ایک سیاہ پوش عورت گھٹنوں کے بل بیٹھی سرگرم عمل تھی — انتہائی لاپروائی کے ساتھ — بے خوفی اور دلجمعی کے ساتھ؟ اس کا منہ تجوری کی طرف تھا — اور پشت الف کی طرف — خوابگاہ کے دروازے کی طرف — اس کا ایک ہاتھ تجوری سے متعلق تھا اور دوسرا ہاتھ سوراخ میں چابی گھما رہا تھا۔

لمحہ بھر کے لئے وہ اپنی جگہ پر کھڑا عورت اور عورت کی بیباکانہ سرگرمی کو مشتاقانہ دیکھتا رہا۔ وہ اس فیصلہ پر پہونچا کہ عورت کوئی معمولی — اناڑی — سارق نہیں، اس کی حرکات و سکنات — اس کا قیمتی لباس ریشمی — بیش قیمت ساڑھی —۔

وہ کھڑا دیکھ رہا تھا اور دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ عورت نے یکے بعد دیگرے پانچ چھ چابیاں بدلیں۔ لیکن ان میں ایک بھی کارآمد ثابت ہوئی اور پھر — اس نے بھاری گچھے میں سے ایک اور تالی نکالی۔ سوراخ میں گھونسی، دو منٹ سرگرم عمل — اور اب تجوری کا دروازہ کھلا تھا — قدرے وہ (عورت) پیچھے

ہٹ گئی۔ الف ــــ اس کی حرکات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور ہے۔ پیشتر اس کے کہ عورت نوٹوں کے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھائے الف نے اپنا ہاتھ بجلی کے بٹن کی طرف بڑھایا ــــ کمرہ بقعۂ نور بن چکا تھا۔

عورت چونکی، گھبرائی اور دفعتہً اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر مڑی ــــ مڑی اور الف کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

الف مسکرا رہا تھا ــــ ہاں فتح کی آمیز مسکراہٹ۔

"مبارکباد عرض کرتا ہوں اس کامیابی پر" الف نے مسکراتے ہوئے کہا "غالباً میری کمرہ دان کو تجوری کھولنے میں کافی محنت اور دقت کا سامنا کرنا پڑا"

عورت نے بولنے کی کوشش کی، لب ہلے ــــ ہاں لب ہلے لیکن زبان سے کوئی لفظ ادا نہ ہو سکا۔ البتہ اس کی نگاہوں نے کام کیا، نگاہوں نے کھلی ہوئی تجوری کی طرف چلنے کی کوشش کی، اس کے ہاتھوں نے اپنا فرض ادا کرنا چاہا ــــ اٹھے ــــ سینے کے پاس ــــ ساڑھی کے اندر ــــ

لیکن فوراً الف بول اٹھا،

"ہاتھوں کو حرکت نہ کرنی چاہیئے محترمہ"

عورت نے الف کے ہاتھوں میں چمکتا ہوا پستول دیکھا۔ جس کی نالی کا رخ ٹھیک اس کے سینہ کی طرف تھا۔

"اب تھوڑی سی تکلیف گوارہ فرما کر کرسی آگے کھینچ لیجئے" الف نے کہا ــــ "اور بیٹھ جایئے"

لیکن عورت نے حرکت نہ کی۔

"ہاں ہاں بیٹھ جایئے، کس انتظار میں ہیں آپ؟"

"پولیس کے" عورت نے جواب دیا۔

الف نے اظہار تعجب کے طور پر اپنی بھنویں اوپر کھینچ لیں۔

"آپ پولیس بلا کر مجھے گرفتار کرانے میں تساہل کیوں کر رہے ہیں" عورت نے کہا

الف نے اپنے شانوں کو سکیڑ کر چھوڑ دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے معاملات میں پولیس کی مداخلت پسند نہیں کرتا اور خصوصاً موجودہ صورت حالات میں پولیس کی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں، اچھا تو مس "ف" اب میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ بیٹھ جایئے"

عورت الف کی زبانی اپنا نام سن کر چونک پڑی اور حیران ہو کر بولی۔

"کیا ــــ؟"

"الف" خاموش رہا، خاموش رہا اور مسکراتا رہا۔

"اوہ، اوہ، آپ کیونکر جانتے ہیں میرا نام؟" ف کی آواز میں رقت پیدا ہو رہی تھی ــــ

"مجھ جیسی پوزیشن کا انسان ایسی بہت سی باتوں سے آگاہی رکھ سکتا ہے مس ف بہرحال آپ تشریف رکھئے کرسی پر"

ف نے خود عاد کر کے اپنا آپ کرسی پر ڈال دیا اس کے چہرے سے قلبی پریشانی کا راز نمایاں ہو رہا تھا۔

"مس ف کیا آپ اس کی تشریح نہیں کریں گی؟"

"کس کی؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ چوری ایسے مذموم فعل کے ارتکاب پر آمادہ کیوں ہوئیں؟"

الف کی توقع کے سراسر خلاف ف کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور یہ آنسو ہی اس کے سوال کا جواب تھے۔

الف اس کی طرف بڑھا اور ف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تشفی آمیز لہجہ میں بولا۔ ضبط کیجئے، ضبط، اپنا آپ سنبھالئے، رونے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں، دیکھئے دیکھئے آپ اور زیادہ رونے لگیں ــــ یہ ٹھیک نہیں ــــ خوف کی کوئی وجہ نہیں؟"

لیکن ف کا دل اس کے سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ ضبط کی عنان اس کے ہاتھوں سے چھوٹ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"آہ، ایک مرد کے لئے صبر، ضبط، حوصلہ سب کچھ ممکن ہے اور مرد کیلئے خوف ایک معمولی شے ہے لیکن آپ نہیں جانتے عورت کے لئے خوف موت سے زیادہ ہیبتناک لفظ ہے خصوصاً ایک ایسی لڑکی کے لئے جو اس وسیع اور سفاک دنیا میں بیشمار بھیڑیوں کے درمیان ایک بکری کے بچے کی طرح چھوڑ دی گئی ہو ایک ایسی لڑکی کے لئے جو اس بھری دنیا میں کوئی والی ــــ وارث یا محافظ نہ رکھتی ہو"

"آہ میں صرف دس ہی سال کی نادان بچی تھی کہ اس بھیڑیوں کے جنگل ــــ دنیا میں تنہا چھوڑ دی گئی ــــ تاکہ ایک دروازے سے ٹھوکر کھا کر دوسرے پر پہونچوں اور دوسرے دروازے سے ٹھوکر کھا کر تیسرے پر پہونچوں ــــ اور کوئی ذی روح میری طرفداری نہ کرے، ہاں کوئی میری فکر نہ رکھے۔ آہ، پھر میں آہستہ آہستہ جوان ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ میری زندگی مصیبت ذلالت اور

گمراہی کے تاریک غار میں جلد ہی پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ اور اب اس کا نتیجہ ــــ ثبوت آپ کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور اس کی نظریں رہ رہ کر کسی چیز کی طرف اٹھ رہی تھیں کسی ــــ کسی شے کو وہ رہ رہ کر تاڑ رہی تھی ــــ ٹھیک الف کے پیچھے ــــ الف کے سر کے اوپر، وہ الف سے باتیں کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور کام کر رہا تھا وہ منتظر تھی ــــ بے صبری سے منتظر ــــ کسی کی۔

اور اگلے ہی لمحہ ایک غیر متوقع اور زوری ٹھوکر سے الف کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا پڑا ــــ وہ گھبرایا ــــ اور گھبرا کر پیچھے پلٹ کر دیکھا ــــ اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی ــــ ہوش اڑ گئے جب اس نے کسی کو ٹھیک اپنی چھاتی کی سیدھ میں پستول تانے دیکھا۔ آنند الاخوا نگاہ کے دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا مسکرا رہا تھا، ور الف کو ایسی نگاہوں سے گھور رہا تھا جو اسے اپنے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میں حیران تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے مس ق" آخر کیا ہوا جو اتنا وقت ضائع کیا گیا۔" لو اور بولا "تو اب معلوم ہوا کہ یہ حضرت ذیل وہ خرافات فرما رہے تھے اور یہی ہمارا قیمتی وقت ضائع کرنے کے ذمہ دار ہیں، معاف فرمائیے جناب میں آپ سے یہ نازیبا سلوک کرنے پر مجبور ہوں افسوس ہے کہ اس کے اور کوئی چارہ نہیں نظر آتا۔ بلا مقصد وہ ہمیں تم نے میں منٹ ضائع کروا چکے ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک مضبوط رسی ق کی طرف پھینکی۔

ق نے جلدی جلدی الف کو رسی کے ذریعہ کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اس دوران میں ایجنسی ل اپنے مشین کی طرح کام کرنے والے ہاتھوں سے تجوری صاف کر چکا تھا۔

اب ل اور ق دونوں رخصت ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

"اچھا الوداع دوست" ل بولا۔ "ہم پولیس کو پبلک کال بکس سے اطلاع کر دیں گے کہ آکر آپ کو رسیوں سے آزاد کرے۔ غالباً پندرہ منٹ تک آپ کو تکلیف گوارا کرنی ہوگی اور یہ بھی اس لئے کہ ان پندرہ منٹوں میں ہم خطرہ کی حد سے باہر نکل جائیں۔ اچھا اب ہم آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہاں کیا میں امید کروں کہ آپ مس ف کو میرے جھوٹے سلام کا تحفہ پہنچا دیں گے؟ خوب تو الوداع" ق نے طنزیہ لہجہ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

انھوں نے روشنی گل کر دی آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور باہر نکل گئے

اب الف تاریک کمرہ میں تنہا رہ گیا۔ رسیوں میں جکڑا ہوا۔

"خداوندا! ان کے چلے جانے کے بعد الف غرایا۔ "خداوندا وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اس مکان کا مالک ہوں اور وہ میری دولت اڑا لے گئے ہیں لیکن آہ صرف پندرہ منٹ ــــ اور پولیس ایک بار پھر چوروں کے بادشاہ الف سے متعارف ہوگی۔"

شاطر

غزل

از جناب محمد حمید اللہ صاحب خلیق راغبی برہانپوری

تیری جلوہ ریزیوں سے جلوۂ جانانہ ہم
ہر سیہ خانہ بنادیں گے تجلی خانہ ہم

پھول برسادیں جہاں کہدیں ترا افسانہ ہم
کردیں صد رشکِ گلستانِ جناں ویرانہ ہم

کیفِ صد مستی میں کیوں ہوں ہوش سے بیگانہ ہم
جانتے ہیں کیفیاتِ ساغر و پیمانہ ہم

تجھ پہ صدقے ہوکے اے شمعِ رُخِ جانانہ ہم
اک جہاں کو دینگے درسِ فطرتِ پروانہ ہم

بجلیوں کو کیوں بنائیں رونقِ کاشانہ ہم
خود بھڑک کر کیوں نہ بن جائیں چراغِ خانہ ہم

کیا غرض کیوں جائیں اس کی جلوہ گاہِ حُسن تک
خود ہیں جلوہ خود بنینگے جلوۂ جانانہ ہم

کیا پسند آئیگا ہم کو نغمۂ چنگ و رباب
سازِ دل سے سُن رہے ہیں نغمۂ مستانہ ہم

غرقِ مستی دیکھنا ہوجائیگی سب کائنات
جوش میں جس دن کرینگے نعرۂ مستانہ ہم

ذرہ ذرہ میکدے کا میکدہ بردوش ہو،
میکدے میں گر دکھادیں جوشِ بیتابانہ ہم

امتیازِ حُسنِ کعبہ کو نہ سمجھے آج تک
ہوگئے کچھ ایسے محوِ جلوۂ بتخانہ ہم

رہروِ راہِ محبت بن کے یہ حاصل ہوا
ہر قدم پر دیکھتے ہیں منزلِ جانانہ ہم

کیوں نہ ہوں ممنون تیرے مطربِ سازِ خیال
روز سنتے ہیں حدیثِ نغمۂ مستانہ ہم

فطرتِ فیاض نے ہم کو دیا ہے اختیار
کردیں نذرِ صبحِ عشرت شامِ ماتم خانہ ہم

جب سراپا گوش ہوتے ہیں جہانِ ہوش میں
ایک سنتے ہیں نوائے کعبہ و بتخانہ ہم

کس قدر وسعت لئے ہے تیری وحشت کا اثر
پارہے ہیں ایک عالم کو ترا دیوانہ ہم

کم سے کم اتنی تو فرصت دے ہمیں پیکِ اجل
کچھ مرتب زندگی کا کرسکیں افسانہ ہم

اے معاذ اللہ اثر سوزِ درونِ عشق کا،
چیخ اٹھے دیکھکر خاکسترِ پروانہ ہم

گردشِ آلام سے پھر کیوں ہراساں ہوں خلیق
دل میں جب رکھتے ہیں جوشِ ہمتِ مردانہ ہم

سرشار کی ظرافت

جناب مولانا سید وقار عظیم صاحب ایم اے

چکبست مرحوم کا یہ فقرہ کہ اودھ پنچ کی ظرافت بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں۔ جس طرح اودھ پنچ کے نامہ نگاروں پر ایک سچی تنقید ہے اسی طرح اس کا اطلاق لفظ بہ لفظ سرشار کی ظرافت پر بھی ہوتا ہے۔ جس طرح اودھ پنچ کے مخاطب صحیح اکثر اوقات عوام ہوتے تھے اسی طرح سرشار نے اپنی تصانیف میں اپنی ظرافت کا بہترین مصرف یہی سمجھا کہ وہ عوام کو خوش کریں اور یہی وجہ ہے کہ سرشار کی ظرافت میں لطیف مزاح کے بجائے تمسخر اور پھکڑپن زیادہ ہے۔ بہت کم موقعے ایسے ہیں جہاں ان کی ظرافت لطیف مزاح سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اس میں بیساختہ پن جدت اور ندرت سب کچھ ہے لیکن افسوس ہے کہ سرشار اپنی فطرت کے ان بیش بہا جواہر پاروں کو برے مصرف میں لائے۔ طبیعت کی شوخی کبھی کبھی اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ اس میں لطف کے بجائے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے لطف ظرافت کا صحیح معیار یہ ہے کہ اُسے ہر شخص کسی دوسرے کے سامنے بلا کسی قسم کی جھجک کے بیان کر سکے لیکن سرشار کی ظرافت کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس میں یہ کمی ہے۔

سرشار کی ظرافت نگاری کا سب سے بڑا مظاہرہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی شخص کے قبیح کردار کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں Chesterton نے بلند اور پست ظرافت کے جو معیار مقرر کئے ہیں ان میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کی تصویر اس طرح ہمارے سامنے پیش کی جائے جو اُس کی اصلی اور فطری شکل سے زیادہ بدنما اور بھدی ہو تو اس قسم کی ظرافت کو پست اور عامیانہ کہیں گے، لیکن میرے نزدیک اس قسم کی ظرافت کو پست یا عامیانہ کہنے کے بجائے پھبتیانہ ظرافت کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ پھبتیانہ ظرافت کا مقصد عوام کی کسی نہ کسی برائی کی اصلاح کرنا ہے اس لئے اس قسم کی ظرافت کو بھی ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ سرشار نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اس وقت سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اس کی اصلاح کے لئے سخت سے سخت حربے کی ضرورت تھی۔ ادب میں اس حیثیت سے Caricature سے زیادہ سخت اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے سرشار اسی کو کام میں لائے۔ انھوں نے جس شخص کے برے کردار کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی اس کی صورت ایسی بگاڑی کہ اس کا پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ طنز کے سخت سے سخت تیروں سے اُس کے جسم اور روح کو اس طرح زخمی کیا کہ دیکھنے والے بھی اُس کی تاب نہ لا سکے ایسی تصویر سے ظاہر ہے کہ خواص لطف اندوز نہیں ہو سکتے انھیں ہر قدم پر لطف ظرافت کی تلاش ہے اور وہ اس قسم کے Caricatures میں مفقود ہے۔ ایسے بدنما مرقعے ہیں فسانہ آزاد میں کثرت سے ملتے ہیں۔

اس موقع پر سرشار کی مدافعت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے جو قبیح مرقعے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ان میں فن کی کس حد تک پابندی کی گئی ہے۔ یہ بدنما مرقعے تو بجائے خود کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہوں لیکن سرشار نے انھیں فن کی حیثیت سے جس خوبی سے نباہا ہے وہ ان کے فن کار (artist) ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک Caricature کو مکمل بنا سکتی ہیں۔ اور اسی لئے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سرشار اردو نثر کے سب سے بڑے

caricature ہیں۔

سرشار کی ظرافت کے دوسرے عناصر کو نمایاں کرنے کے لئے ہم اس وقت صرف ان کے شاہکار "فسانہ آزاد" سے مدد لیں گے۔ اور اس لئے ان کی ظرافت کی لطیف جھلک دیکھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے ان کے کرداروں کے مکالموں کو کان لگا کر سننا چاہیئے۔۔۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی حیثیتوں سے یہ مکالمے "فسانہ آزاد" کا ایک بہت قابل قدر عنصر ہیں لیکن ظرافت کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے آدھے سے زیادہ مکالموں میں پھیکا پن ظرافت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

آزاد سے لیکر خوجی تک سارے کردار آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے ہیں جسے سن کر عوام تو ہنستے ہنستے لوٹ جائیں اور خوش مذاق لوگوں کے دلوں میں گدگدی تک نہ ہو۔ عوام انھیں سن کر خوشی سے دیوانے ہو جائیں اور خواص ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھریں۔ اس قسم کے مکالموں میں پھبتیوں، تمسخر، پھکڑپن، ضلع جگت، ابہام، قافیہ پیمائی اور لفظوں کی الٹ پھیر کو مکالمہ کی جان سمجھا جاتا ہے۔ "Addison" کے نزدیک ایسی ظرافت یا مزاح جس کی بنیاد لفظوں پر ہو کاذب ہے مزاح صادقہ کی بنیاد لفظوں پر نہیں خیالات پر ہے کہ اگر ہم اس کا ترجمہ دوسری زبان میں بھی کر دیں تو مزاح باقی رہے۔ سرشار کے اکثر مکالموں میں اس حسن کی کمی ہے۔ اس لئے ہم ان کی ظرافت کو بلند یا صادق نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے کہ ایک موقع پر ہمارے سیلانی آزاد اپنی ظرافت کا رنگ کس طرح جماتے ہیں۔

اپنی عادت کے مطابق آزادوں کی طرح گھومتے چلے جا رہے ہیں ایک رئیس کے مکان کی طرف سے گذر ہوا ان سے دو دو فقروں میں دوستی ہو گئی۔ اب یہ معاہدہ ہوا کہ جو بات کریں گے قافیہ کی پابندی کے ساتھ۔ اس شرط کی تکمیل ایک موقع پر کس حسن و خوبی سے ہوتی ہے ملاحظہ ہو۔ رئیس صاحب آواز دیتے ہیں۔

"آزاد!"

آزاد۔ "خانۂ احسان آباد"

"اخاہ آپ ہیں!"

آزاد۔ "اور نہیں تو کیا آپ کے باپ ہیں؟"

"مت بک فضول"

آزاد۔ "چونچ سنبھال نامعقول"۔

یہ ہے ایک آقا اور غلام کی مہذب اور شستہ گفتگو۔ ایسے فقروں سے ظاہر ہے پڑھنے والے کیا حاصل کریں گے یا کچھ اپنے پاس سے کھو بیٹھیں گے نہ خیال میں لطافت ہے نہ حسن۔ محض قافیہ پیمائی ہے۔ معنی کے ہونے نہ ہونے سے غرض نہیں۔

بہرحال فسانہ آزاد میں اس قسم کی ظرافت کی مثالیں ہر صفحہ میں ہیں۔ سرشار کے تخلیق کردار جہاں گفتگو کرتے سنائی دیں کان لگا کر سن لیجئے یہی فقرہ بازی سنائی دیگی۔

یہ تو ہوئے مکالمے۔ اب دیکھئے کہ جن کرداروں کی یہ گفتگو ہے۔ وہ خود کیسے ہیں؟ سبحان اللہ جن کی باتوں میں یہ ۔۔۔۔۔ شگوفہ کاریاں ہیں ان کی شکل و صورت، آن بان اور بناؤ کا کیا کہنا۔ سارے کرداروں کو چھوڑیئے صرف ان پر نظر ڈالئے جنہیں سرشار نے اصلاحی مقصد کے لئے وقف کر دیا ہے۔ نکلے ہیں اصلاح کرنے اور وضع بانکوں کی اختیار کی۔ باتیں کرنی چاہئیں میٹھی لیکن یہ ہیں کہ ہر بات میں تلخی۔ تیزی۔ شوخی۔ اور تیکھاپن۔ میاں آزاد کو دیکھ لیجئے۔ وہ جس جگہ جاتے ہیں خدائی فوجدار بن کر ان کا فرض یہ ہے کہ وہ جیسے کوئی بری بات کرتا ہوا دیکھیں اسے اس کی سزا دیں۔ ان کا رویہ یہ ہے کہ جس کی اصلاح کے لئے گئے اس پر فقروں کی بوچھار شروع کر دی ادھر سے بھی ترکی بہ ترکی جواب ملے ایسی صورت میں اصلاح کا ہونا معلوم البتہ ہنستے ہنسانے کا ایک مشغلہ ضرور ہے۔ خود انھیں بھی لطف آیا اور سننے والوں نے ان سے زیادہ لطف لیا لیکن یہ لطف لینے والے کون ہیں؟ ان باتوں کی داد کون دیتا ہے وہی عوام جن کی ظرافت کا معیار سرنامہ سو پہنچا ہے۔

سرشار کی ظرافت کسی موقع پر چھپی نہیں رہتی۔ کردار نگاری میں۔ مکالموں میں۔ مرقع نگاری۔ منظر کشی۔ میں ہر جگہ اپنی ظرافت کا ثبوت دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ جہاں عبارت آرائی میں اس کا موقع نہیں ہوتا وہاں درمیان میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔

۔ ایسے لفظوں میں جو قوسین میں ہیں چڑا گئیز رو۔ چپت گاہ وغیرہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

اب تک سرشار کی ظرافت کے متعلق مختصر طور پر جو کچھ لکھا گیا اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ ان کی ظرافت زیادہ تر پھکڑپن ہے اور ممکن ہے کہ اسی سے لوگ انھیں ایک پست درجہ کا ظرافت نگار سمجھنے لگیں۔ لیکن ایسا سمجھنا سرشار کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ ہمیں سرشار کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ اردو نثر نگاری میں جس ظرافت کی بنیاد منشی سجاد حسین نے ڈالی اس کی تکمیل سرشار کے ہاتھوں ہوئی اور انھوں نے اردو نثر کے خزانے کو اس قسم کی ظرافت کے نمونوں سے اتنا مالا مال کیا کہ خود اودھ پنچ کا پورا خزانہ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور لطف یہ کہ اس کثرت کے باوجود اس ظرافت کو سرشار نے فن کی حیثیت سے بڑے حسن کے ساتھ نباہا۔

لیکن اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد بھی ہمیں یہی نہ سمجھنا چاہیئے کہ سرشار کی ظرافت میں بلند، ادبی اور لطیف ظرافت نہیں۔ اپنی ذہانت کی رہنمائی اور فطری صلاحیت کی ہدایت میں انھوں نے ظرافت نگاری کے گلشن کی ہر کیاری کی سیر کی۔ اچھے اور برے سب طرح کے پھول چنے کچھ ایسے ہیں جن میں خوشبو نہیں صرف ظاہری حسن ہے۔ نظریں اُن سے سامان نشاط حاصل کرتی ہیں کچھ ایسے ہیں جو دیدہ زیب بھی ہیں اور خوشبودار بھی۔ آیئے اب ذرا اس گلدستہ کی بہار دیکھیں جو سرشار نے لطیف ظرافت کے پھولوں سے آراستہ کیا ہے۔

لطیف ظرافت کے پیدا کرنے کا سب سے پہلا طریقہ جو سرشار نے استعمال کیا وہ یہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے شعروں کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا اور اس طرح اس میں ایک لطیف تضاد پیدا کر دیا۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

دھول دھپا جھپیا کی اب تلک عادت نہ تھی
ہائے کر بیٹھے تھے ہم ہی پیش دستی ایک دن

Leigh Hunt کا خیال ہے کہ لطیف مزاح عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہمارا ذہن دو چیزوں میں کوئی خاص تعلق پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ تعلق تضاد کا ہے تو ظرافت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ اوپر کے شعر کو پڑھتے ہی ہمارا ذہن غالب کے شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور جب ہم غالب کے شعر کو سرشار کی دلچسپ تحریف کے بعد دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن اس تضاد کا لطف محسوس کرتا ہے۔

سرشار نے جہاں اپنی کتاب میں اور بہت سی بے ربط باتیں شامل کر دی ہیں ان میں کہیں کہیں شعر و سخن کی بزمیں بھی آراستہ کی ہیں اور جب ہم آزاد کے ساتھ ایسی بزموں میں شریک ہوتے ہیں تو ہمارے سامنے لطیف مزاح کا کوئی نہ کوئی دلچسپ مرقع آ جاتا ہے۔

ارباب ذوق سرشار کی ظرافت میں اس وقت اور زیادہ لطف لینے لگتے ہیں جب وہ ہندوستانی مکتبوں کی حالت کے مرقعے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ایسے مرقعوں میں ایک خاص خوبی یہ ہوتی ہے کہ خیالات میں تو لطیف ظرافت ہوتی ہے اور بیان میں پھکڑپنا ظرافت؛ ان دونوں چیزوں کا امتزاج اس داستان کو اور زیادہ لطیف اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔

سرشار نے اکثر اوقات عبارتوں میں نہایت مزیدار عربی فقرے اس طرح داخل کئے ہیں کہ ہم انھیں پڑھ کر بلا لطف لئے نہیں رہ سکتے خیالات ہندوستانی لفظ اردو کے اور ان کی ترکیب عربی۔ یہ دلچسپ تضاد بھی بے حد لطیف مزاح پیدا کر دیتا ہے۔

لطیف مزاح پیدا کرنے کا ایک دوسرا اور نہایت پر لطف ذریعہ خود سرشار کے اشعار ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

وے پہیہ جھکڑ دو بردی	اے انجن ریل رہ نورد دی
وے روکش ٹانگن پہاڑی	اے رشک خرام ریل گاڑی
وے قلقل بوتل برانڈی	اے جوش ابال گرم ہانڈی

جدید لطیف تشبیہیں، فارسی، ہندی اور انگریزی لفظوں کی اضافی اور توصیفی ترکیبیں بیان کی سلاست اور روانی سے سننے والے کا دل کس قدر مسرور ہوتا ہے۔

سرشار نے بعض بعض جگہ فارسی کے شعروں پر دلچسپ تضمین بھی کی ہے کہیں ایک مصرع فارسی اور دوسرا خالص ہندی کا لکھ کر صنعت تلمیع پیدا کی ہے اور اس میں ایک قسم کی ظرافت شامل ہو گئی ہے

مختصر یہ کہ سرشار ظرافت کا پتلا تھا اس کی تحریروں میں پھکڑپنا ظرافت بھی ہے اور لطیف بلند مزاح بھی پھکڑ اور فحش بھی طنز اور استہزا بھی اور لطف یہ کہ کسی موقع پر فن ہاتھ سے نہیں جانے پایا جس قسم کی ظرافت کا موقع ہے اسے اسی طرح نباہا گیا ہے ؎

؎ اردو نثر نگاری میں شاید کوئی مصنف بھی ایسا نہیں جس کی تصنیفوں میں ظرافت کے اتنے قسم کے نمونے اتنی مکمل شکل میں اور اتنی زیادہ تعداد میں مل سکیں۔ ؎

آفتابِ عارض

جناب سیّد دل محمد صاحب فضاؔ، منشی فاضل، جالندھری

عجیب دلکش ہے حُسنِ رعنا ہیں دونوں اپنا جواب عارض
ان ابرُوں کو ہلال کہئے جبیں قمر آفتاب عارض

جو آئے ہو بزمِ ناز میں تم تو جانِ من پھر حجاب کیسا؟
کہ حسنِ دلکش یہ کہہ رہا ہے دکھائیں رنگِ شباب عارض

غضب نگاہوں سے ہے نمایاں تو رنگِ رخ بھی بدل گیا ہے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آج ہیں پر عتاب عارض

تری ادائیں ترے کرشمے مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
ہے چشمِ مخمور رشکِ نرگس ہیں رشکِ گل لاجواب عارض

نظر کو دیکھو تو ہے نمایاں شراب جیسے چھلک رہی ہو
متاعِ حسن و جمال گویا لٹاتے ہیں بے حساب عارض

اٹھاؤ پردہ دکھاؤ جلوہ حجاب اے رشکِ ماہ کب تک
کہ شوخیوں کا یہ ہے تقاضا رہیں نہ زیرِ نقاب عارض

چھپانے کی پردہ داری ضیائے رخ ہے مگر نمایاں
نقاب ڈالے ہوئے ہے کوئی مگر ہیں کھرنے نقاب عارض

جبیں کو اوجِ کمال کہئے ان ابرُوں کو ہلال کہئے
شبیہِ برقِ ادا ہیں نظریں فروغِ جوشِ شباب عارض

نگاہ بھی جانستاں ہے اُن کی کرشمہ ہے دلفریب جس کا
مہک میں ہیں بے مثال گیسو چمک میں ہیں لاجواب عارض

ہزاروں خوش رنگ پھول پائے مگر کہاں حسن کی ادائیں
فضاؔ ریاضِ جہاں میں دیکھا ہر ایک سے انتخاب عارض

"صابحہ"

ایک مصری افسانہ

جناب محمد بدرالدجیٰ صاحب کامل رزاقی، عزیزی۔ بہار شریف

عبدالسمیع مزدور راستعمال شدہ منہدم مکانوں کے پاس پہنچ ہوئے ایک چوڑے چکلے چٹان پر بیٹھا کھیتوں کو جانیوالے راستے کی طرف دیکھ رہا تھا ــــ یہ راستہ جو تمام لوگوں اور چوپاؤں کی عام رہگذر تھا خطہ "حسن آغا" کو دو حصوں میں منقسم کرتا تھا اور اس کے بعد کی نرم زمینوں سے گذرتا ہوا ریلوے لائن تک چلا گیا تھا اس کے دونوں جانب "نبق" کی سیدھی سیدھی شاخوں والے درختوں کا منظم سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ وہ اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچے اپنے چوپائے ہنکائے لئے جاتے تھے۔ جوان کاندھوں پر پھاوڑے رکھے چلے جا رہے تھے۔ اور عورتیں اپنے گدھوں کے پیچھے محوِ خرام تھیں اس کی آنکھیں ان گذرنے والوں کے درمیان کسی کو نہایت انہماک سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ دفعتہ اُس کا چہرہ چمک اٹھا۔ فرطِ مسرت سے اُس کی باچھیں کھل گئیں اور اُس کے سفید و منظم دانت چمکنے لگے ــــ

وہ ایک کشیدہ قامت، چوڑے قوی رگ اور پٹھے والا جوان تھا اس کی آنکھیں ساحر اور چہرہ کشش انگیز تھا۔ اس کا گداز سینہ جو گھنے بالوں سے خالی تھا۔ گریبان کی کشادگی سے صاف چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے نیلے رنگ کے چھوٹے سے کرتے کے اوپر سے کتان کے پٹکے کے ذریعہ کمر کو مضبوط باندھ رکھا تھا۔ جس کے باعث اس کا کرتا حد اعتدال سے ذرا اونچا ہو گیا تھا اور اس کی بھری بھری پنڈلیوں کے اوپر اس کے سڈول گھٹنے نظر آ رہے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا چٹان سے اٹھا اور زور زور سے پکارنے لگا۔

"صابحہ! ــــ صابحہ!! ــــ اے صابحہ!!"

حسینہ آواز کی سمت ملتفت ہوئی تو اس نے عبدالسمیع کو اپنی طرف متوجہ ہو کر پکارتا ہوا پایا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے موتی سے دانت کھل گئے اور ایک طمانیت بخش تبسم اس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوا جسے اس نے اپنے سیاہ دوپٹے سے چھپا لیا۔ وہ ایک گدھے کو ہانکتی جا رہی تھی جس پر صرف دو خالی ٹوکرے دھرے تھے۔ اُس نے اپنے ہاتھ والے ڈنڈے سے اسے متواتر کئی ضربیں لگائیں جن کا مفہوم سمجھ کر غریب گدھا تنہا گھر کی طرف روانہ ہو گیا اس کے بعد اس نے اس راستہ کو چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کیا جو چھوٹی نہر کے پاس سے ہوتا ہوا بلندی کی جانب چلا گیا تھا۔ تاکہ درمیان راہ میں عبدالسمیع کا استقبال کر سکے۔ نسوانی ضعف طبع اور جذبات پر قابو نہ پانے کی وجہ سے شرم و حجاب اس پر مستولی ہو رہا تھا اس لئے وہ اپنے چہرہ کے نصف زیریں حصے کو بڑی احتیاط سے دوپٹہ کے اندر چھپانے لگی۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب اور مقابل ہو گئے پھر دونوں خاموشی کے ساتھ مستعمل کانوں کی طرف چلتے رہے۔ یہاں تک کہ کان کے دروازے پر پہونچکر دونوں اسی چوڑے پتھر کے پاس رک گئے۔ عبدالسمیع چاہتا تھا کہ کچھ بولے۔ اس کی آنکھیں زمین کی طرف تھیں اور چہرہ پر غم انگیز شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے کہ اسے کیا کہنا چاہئے ــــ آخر چند لمحوں کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"صابحہ! میں نے کئی دنوں سے تمہیں "حسن آغا" میں نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے؟ کیا تمہاری کسی سے جنگ ہو گئی ہے یا کسی دوسرے مخفی سبب کی بنا پر تم نے خود وہاں کی آمد و رفت بند کر دی؟"

حسینہ نے اپنے چہرے سے دوپٹہ سرکایا اور پھر قمیص کی گرد جھاڑنے لگی، وہ خاموش تھی اور نہیں سمجھ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔

عبدالسمیع نے اس پر نظر ڈالی اس کی شعاع بصر نے حسینہ کے چہرے کا احاطہ کر لیا اور اس کی تشنہ دید نگاہیں آب دیدار حسن سے سیراب ہونے لگیں ــــ

صابحہ ایک نوجوان حسینہ تھی جسے قدرت نے حُسن وجمال سے محروم نہیں کیا تھا اس کا چہرہ نہایت ہی حسین ونازک اور آنکھیں سرگیں کشش انگیز تھیں صفائے نفس اور پاکیزگی قلب کے ساتھ ساتھ خلوص نیت وذہانت اور قول وفعل کی بے تکلفی کی وجہ سے وہ ممتاز درجہ پر پہونچ گئی تھی۔ وہ اپنے معتقدات میں بالکل پختہ تھی اور اسے اپنی ذات پر کامل وثوق تھا۔ اس نے عبدالسمیع کو پہلے پہل "حسن آغا"* کے مکان میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرنے گئی تھی۔ عبدالسمیع وہاں حسن آغا کے خاص معتمد اور سکریٹری کی طرح کام کرتا تھا اور اسے بھی اس کی ذات پر کافی اعتماد واطمینان تھا۔ وہیں دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور ان کی باہمی محبت کی ابتدا ہوئی۔ یہ محبت استحکام کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ مشہور بھی ہوتی گئی یہاں تک کہ صابحہ کے بعض قرابت داروں کو اس کی خبر ہوگئی اور انھوں نے اس کے والد کو اس کی اطلاع دیدی اس کا باپ عبدالسمیع کو ذلیل اور اپنی بیٹی کے لئے غیر موزوں جوڑا سمجھتا تھا اور اس کے لئے رئیس شہر کے لڑکے کو منتخب کرچکا تھا۔ جو ایک نازک اندام جوان تھا۔ اہل شہر کے میان اس کی بڑی عزت تھی اور کثیر دولت کا مالک ہونے کے باعث صابحہ کے باپ کی نظروں میں نہایت معزز وموقر تھا۔ اس کو اس انتخاب کی طرف ہمت دلانے والی جو چیز تھی وہ یہ کہ اپنی لڑکی پر اس نوجوان کی فریفتگی اور اس کے ساتھ ازدواج کی انتہائی خواہش کا علم اسے ہوچکا تھا۔ جب عبدالسمیع کی محبت کا حال اسے معلوم ہوا تو اس کی نفرت وحقارت اور بڑھ گئی اور اس کا قلب بغض وکینہ سے مملو ہوگیا اس کے خیال میں یہ محبت اس کی عزت وحرمت کی سخت ترین اہانت وذلت تھی

عبدالسمیع جب اس کے پاس آیا اور صابحہ کے ساتھ اپنا رشتہ مناکحت جوڑنے کی آرزو ظاہر کی تو اسے غضب وغصہ کے سوا جواب میں کچھ نہ ملا ——— اور آخر وہ عبدالسمیع کو اپنی لڑکی کا شوہر بنانا کس طرح پسند کرتا۔ درآنحالیکہ وہ ایک ذلیل نوکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو دن بھر اپنے آقا کے گدھے ہانکتا پھرتا ہو اور سوائے نیلے رنگ کے چھوٹے کرتے پرانی چیخ ٹوپی اور گندمی رنگ کی شکستہ حال صدری کے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ کہاں یہ اور کہاں رئیس شہر کا صاحبزادہ خوشرو جوان جوادن۔ ریشم اور پھولے کے متمدن کپڑے اور رنگ برنگ کے مروج سوتی لباس پہنتا۔ عمدہ عمدہ کشمیری دوشالے اوڑھتا۔ سفید ریشم کے رومال سر میں باندھتا اور سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی استعمال کرتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی بے شمار دولت اور قیمتی مہر دینے کا وعدہ تھا۔

عبدالسمیع اپنے آقا کے گھر واپس چلا آیا۔ شرم وخجالت اس کے ساتھ تھی اور ہم وکرب اسے گھیرے ہوئے تھے لیکن اس کے دل میں غبار یاس نہیں آنے پایا۔ اس نے اپنی اس ناکامی کو صابحہ سے پوشیدہ رکھتے ہوئے ہر ممکن ذریعے سے اس کے والد کو رضامند کرنے کی سعی وتدبیر شروع کردی تاکہ وہ صابحہ کو حاصل کرسکے۔ وہ اپنی نرمی اخلاق۔ خوشدلی، امانت، فرائض کی کماحقہ ادائگی اور استقلال نفس کے باعث اپنے آقا کی نظروں میں نہایت ہی عزیز اور تمام لوگوں کی نگاہوں میں لائق تحسین وسزاوار ستائش تھا۔

صابحہ کی خاموشی اسی طرح طوالت پذیر تھی اور عبدالسمیع اس کے سامنے کھڑا اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو اس کے قلب کے اندر جوش مارنے والی گہری محبت کی ترجمانی کررہی تھیں۔ آخرکار اس نے پھر اپنا سوال دہرایا ——— مگر دوسرے عنوان سے۔

"کیا تمھاری غیر حاضری کسی بیماری کی بنا پر تھی۔۔۔۔ پھر تم کب یہاں آؤگی؟"

صابحہ کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ مظہر حزن وملال بنا ہوا تھا۔ اس نے غم آلود لہجے میں جواب دیا۔

"میں اب حسن آغا میں کام کرنے نہیں آؤنگی!"

عبدالسمیع کی آنکھوں میں عجب طرح کی چمک پیدا ہوگئی جو اس کے اندرونی ہیجان کا پتہ دے رہی تھی۔ اس نے کرخت اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اب کام پر نہ آؤگی؟ یہ نہیں ہوسکتا۔۔۔ کون کہتا ہے؟"

"والد ماجد"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ انھیں ہماری باہمی محبت کی خبر ہوگئی۔"

"تو وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان افتراق پیدا کرادیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔"

"محال ہے۔۔۔"

"کیوں محال ہے؟ حالانکہ میں۔۔۔۔۔۔۔"

صابحہ کہتے کہتے رک گئی۔ عبدالسمیع نے اپنے سینہ کے اندر موجزن جذبات کو اکٹھا کرتے ہوئے رکی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ جس سے غیظ و

---

* حسن آغا مصر میں ایک رئیس کا نام ہے لیکن اس کی جائداد، باغ، غرض سب کچھ اسی کے نام سے موسوم ہیں۔ مترجم

غضب اور غیظ و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں ہاں صابرہ! اپنا جملہ پورا کرلو...... شرماؤ نہیں...... کیوں نہیں کہتیں کہ میں رئیس شہر کے بیٹے کی منسوبہ ہو چکی ہوں...... لیکن خدا کی قسم......" یہاں پہنچکر اس کی آواز بالکل گلوگیر ہو کر رہ گئی۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں اور گردن کی رگیں پھڑکنے لگیں۔ پھر اس نے منہ میں اکٹھے ہوئے کف کو گھونٹ کر جملہ پورا کیا۔

"...... لیکن خدا کی قسم یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی...... ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جب تک میں زندہ ہوں تم کسی غیر کی رفیقۂ حیات نہیں بن سکتیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ صابرہ نے عبدالسمیع کو ایسے لہجہ میں گفتگو کرتے سنا اور اسے اس وحشتناک حالت میں دیکھا۔ اس نے ڈر کر جلدی سے اس کی طرف سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ سوچنے لگی کیا سلیم الطبع اور مستود خصال عبدالسمیع یہی ہے اطاعت و فرمانبرداری جس کی سرشت ہے اور جس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی جنگ و جدل شر و فساد سے آلودہ و ملوث نہیں کیا ہے۔

عبدالسمیع شدت بخار میں جلتے ہوئے مریض کی طرح مضطرب اور بے چین تھا اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ دم چڑھ رہا تھا۔ اور تنفس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی ـــــ جب اس کی یہ کیفیت زائل ہوئی اور طبیعت میں کچھ سکون ہوا تو اس نے نہایت ملائم آواز میں کہنا شروع کیا۔ خوشگواری و سلاست کے ساتھ فرمانبرداری و اطاعت اس کے کلام سے ٹپکتی تھی۔

"عبدالسمیع تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟...... کیا تمہاری خواہش ہے کہ میں اپنے والد ماجد کی رائے کی مخالفت کروں۔ کیا یہ مجھ سے ممکن ہے؟"

"تو کیا تم مجھے محبوب نہیں رکھتیں؟...... بولو صابرہ!"

صابرہ خاموش تھی اور الفاظ کے ذریعہ جواب دینے سے قاصر لیکن دفعۃً اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ عبدالسمیع اس کی گریہ و زاری کو دیکھ کر بیتاب ہو گیا اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ایک تیز خنجر اس کے قلب میں اترتا جا رہا ہے۔ وہ کمال محبت سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا اور اسے کان کے اندر سے جا کر خس و خاشاک کے ایک ڈھیر پر بٹھلا دیا۔ اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے غمخواری و ہمدردی کے لہجہ میں کہنے لگا۔

"اے صابرہ! نہ روؤ، دیکھو تمہاری گریہ و زاری میرے قلب کے ٹکڑے کر رہی ہے۔ مجھے تمہاری محبت پر کامل وثوق ہے۔ لیکن اس تنگی نے مجھے بہت زیادہ رنجیدہ کر دیا ہے۔ میں اسے دور کرنے کی پوری کوشش کرونگا...... میں عنقریب تمہارے والد سے اپنی شادی کے متعلق گفتگو کرونگا...... اور مجھے امید ہے، قوی امید کہ وہ اسے قبول کر لینگے...... ضرور قبول کر لینگے"

صابرہ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اس نے عبدالسمیع کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کیسے قبول کر لینگے؟ تم نے پہلے بھی تو ان سے تذکرہ کیا ہے لیکن تمہیں ناکامی نصیب ہوئی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس سے بے خبر ہوں"؟

عبدالسمیع کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کا منہ کف سے بھر گیا اور وہ کچھ نہ بول سکا۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔ ایسی چمک جس میں حرمان و یاس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں صابرہ کے چہرے کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ آخر بے خودی کے عالم میں یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا۔

"اب کی مرتبہ میرے پاس ذریعہ ہے"

"کون سا ذریعہ؟"

وہ اندرونی کشمکش سے خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھیں مضطربانہ ادھر ادھر گردش کرنے لگیں پھر اس نے دائیں بائیں دیکھ کر نہایت ہی نرم اور راز دارانہ لہجے میں صابرہ کے کان میں کہا۔

"میرے پاس مال ہے...... میرے پاس زر ہے...... یہی ذریعہ جس سے میں تمہیں حاصل کر سکتا ہوں"

صابرہ نے آستین سے اپنی ناک اور آنکھیں صاف کیں اس کے متبسم چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور دردمندانہ لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے پاس زر ہے؟...... تمہارے پاس اشرفیاں ہیں؟"

"میرے پاس؟...... میرے پاس...... ہاں میری جیب میں ہیں۔ کیا تم انہیں دیکھنا چاہتی ہو؟"

پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سکوں کو نکال کر شمار کرنے لگا۔ جوشش جذبات و انفعال طبع کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں کانپ رہے تھے اس نے گنتی پوری کر کے صابرہ کی جانب نگاہ کی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ ایسا تبسم جس میں اضطراب پنہاں نظر آ رہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"صابرہ! یہ تمہارا مال ہے...... تمہارا زر ہے۔ جسے میں عنقریب تمہارے

والد کی خدمت میں پیش کرو" تاکہ اسے اپنے ہاتھ میں لیکر پرکھ لو۔۔۔ لو۔۔۔ لو"

وہ اسے مجبور کرنے لگا کہ سکوں کو لیکر جانچ لے لیکن صابحہ بجائے اس کے کہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کیا یک اس کا درخشندہ تبسم تاریک ہو گیا اور اس کے چہرہ پر عضہ خفگی کے آثار پیدا ہو گئے پھر اس نے تھوڑے وقفہ کے بعد استفسار انہ لہجہ میں کہا۔

" یہ مال تمہارے پاس کہاں سے آیا۔ درآنحالیکہ سب جانتے ہیں کہ تم ایک غریب اور محتاج شخص ہو؟"

صابحہ کے اس اچانک اور اہم سوال نے اسے گھبرا دیا۔ اس کی غیرت کو ایک ٹھیس لگی اور پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آخر اس نے اپنی ذلت کو پوشیدہ رکھنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" یہ میرا کرشمہ ہے۔ تمہیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اشرفیاں کہاں سے آئیں؟ بس میں نے انھیں حاصل کیا ہے اور . . . . . یہ ہماری ہیں۔ جنھیں میں تمہیں مہر میں دوں گا۔"

صابحہ نے اسی حالت غور و فکر میں کہنا شروع کیا۔ اس کی گفتگو کے انداز سے معلوم ہوتا تھا گویا وہ اپنے دل میں کہہ رہی ہے۔

" تمہارے پاس جو پائے بھی نہیں کہ انھیں بیچ کر تمہیں یہ قیمت ملی ہو۔ تمہارے خویش واقارب بھی نہیں جنھوں نے یہ اشرفیاں تمہیں قرض دی ہوں۔ تمہارا آقا حسن آغا بھی اتنا سخی نہیں جس نے اپنی دولت میں سے یہ رقم تمہیں بخشدی ہو۔۔۔"

دفعتہً اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا وہ عبدالسمیع کی طرف ملتفت ہو کر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے لگی۔ پھر اس کے قریب جا کر نرم آواز میں بولی ——— " ہرگز نہیں . . . . یہ نہیں ہو سکتا . . . . . ممکن ہی نہیں ہے؟ . . . . ایں تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

حقیقت کے واضح ہوتے ہی اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

" یہ مال تمہارا نہیں ہے اور تم اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں کر سکتے۔ یہ تو یقیناً حسن آغا کا مال ہے۔ یہ تیسوں اشرفیاں وہی ہیں جنھیں تم نے گذشتہ دنوں اس کے گھر سے چرایا ہے۔"

یہ سن کر عبدالسمیع کے چہرے پر غم و اندوہ کے کثیف بادل چھاگئے اور وہ دکتی ہوئی آواز میں بار بار کہنے لگا۔

" یہ کیا دیوانہ پن ہے . . . . . . میں چور ہوں۔ . . . . میں . . . میں

تم . . . . . مجھ پر . . . . . یہ الزام لگاتی ہو؟"

" تو پھر یہ اشرفیاں تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟"

اس کے جواب میں عبدالسمیع نے چند غیر مربوط الفاظ کہے مگر ایک حرف بھی صابحہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے متبسم اور پرنور چہرے پر غیظ و غضب اور بے رونقی چھائی ہوئی تھی لیکن صابحہ اس غیظ و غضب اور بے رونقی کے درمیان اس کے سفوف رخ پر شرم و خجالت اور غم و الم کی تحریر پڑھنے میں کامیاب ہو گئی پھر اس نے اس کی آنکھوں کو دیکھا کہ ان میں آنسو چمک رہے تھے۔ ایسے آنسو جو نامرادی اور ذلت کی ترجمانی کر رہے تھے ——— اسی لفظ "مرد" کی عظمت و جلالت پوری قوت و استحکام کے ساتھ اسے اپنے سامنے نظر آئی ——— اپنے سامنے ایک کمزور و نحیف "عورت" کے سامنے، لیکن وہ اس سے ڈری نہیں بلکہ اپنے کو اس کی طرف کھنچتا ہوا پایا ——— اور اس کی بانہیں عبدالسمیع کی گردن میں حائل ہو گئیں، پھر اسے تسلی و تشفی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

" عبدالسمیع مجھ پر غصہ نہ کرو، میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہاری بھلائی کی خواہاں ہوں۔ اشرفیاں اس کے مالک کو واپس دیدو۔ یہ چوری کا مال ہے اس میں خیر و برکت نہیں۔ اسے واپس ہی دیدینا چاہئے۔ اللہ تعالےٰ تمہاری اس لغزش کو معاف فرما دیگا۔ واپس دیدینا ضروری ہے . . . . . بالکل ضروری دیکھو تم ایک بھلے آدمی ہو، لوگ تمہیں امین و شریف جانتے ہیں، اپنی شہرت کو داغ نہ لگاؤ . . . . . . اشرفیاں واپس کردو . . . مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اشرفیوں کو پھر وہیں دھر آؤ گے۔ اور اس کے مالک کو خبر بھی نہ ہو گی۔"

صابحہ بولتی جا رہی تھی اور آنسوؤں کے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے آخر عبدالسمیع نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

" میں یہ اشرفیاں واپس نہیں کرنے کا۔ یہ میرے قبضہ میں آچکی ہیں اور انھیں میں تمہیں مہر میں دوں گا۔"

یہ سن کر صابحہ کا جی بھر آیا۔ وہ پھر رونے لگی اور آخر اس نے گلوگیر آواز میں چیخ کر کہا۔

" میں اپنے مہر میں سرقہ کا نقد نہیں لے سکتی۔ خدا تعالےٰ ہمارے اس نکاح میں کبھی برکت نہ دیگا۔ نہیں لے سکتی . . . . . کبھی نہیں لے سکتی"

عبدالسمیع یہ دیکھ کر اس کی جانب بڑی توجہ سے مائل ہوا اور نہایت ہی محبت و انہماک کے ساتھ کہنے لگا۔

"صابحہ! میں تمہارے فراق کے تصور تک کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ میرے لئے اس کا تصور بھی ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا تمہیں اپنی رفیقۂ حیات بنالے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک گناہ کا ارتکاب کرکے یہ نقود حاصل کئے اور اپنے آقا نعمت ولی نعمت حسن آغا کے گھر سے انہیں چرالیا ــــ یہ ہے چاندی اور ان نقود کی حقیقت۔ لیکن یہ کوئی سیاہ کاری نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں عدل و انصاف ہے ــــ میں ایک محتاج و بے برگ و نوا شخص ہوں اور میرا دشمن اپنی دولت و ثروت کی بناء پر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو مجھے قطعی شکست ہوگی اور اسے فتح، میں ناکام رہونگا اور وہ کامیاب ــــ میرے پاس اس سے جنگ کرنے اور اس مقابلے میں کامیاب ہونے کے لئے اس دنی جنسیں کند و زنگ آلود حربہ کے سوا کچھ نہیں ــــ لیکن میری نظروں میں یہ خست و دناءت نہیں ــــ بلکہ جب تک مجھے تم حاصل رہوگی میں اپنی اس حرکت کو ہمیشہ لائق تحسین و واجب ستائش سمجھتا رہونگا۔ اور میری یہ لغزش عزت بخش و سرافراز شامت ہوگی ــــ صابحہ تم میرے اس وقت کے غم و الم کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو جب مجھے تمہاری منگنی کی خبر ملی تھی۔ میں اس وقت گویا دیوانہ ہورہا تھا ــــ اور وہ طول طویل رات میں نے بڑے کرب و بے چینی میں گذاری۔ میں اپنی جھونپڑی کے دروازے پر تنہا بیٹھا تھا۔ آنکھیں روتے روتے پتھرا گئیں تھیں اور ان پر زندگی کی لہر کے بدلے موت کا سکون طاری تھا۔ پھر خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ اسی طرح صبح ہوگئی۔ حصول مراد کی نت نئی تدبیریں میرے ذہن میں آئیں اور سب کسی نہ کسی نقص کی بناء پر رد ہوگئیں۔ کامرانی کے سینکڑوں نقشے بن بن کر بگڑ گئے۔ میری سمجھ میں مطلق نہ آتا تھا کہ میرے دماغ میں ان عجیب و غریب تدبیروں کی پیداوار کا کیا سبب ہے؟ شاید شیطان! ــــ نفس امارہ پس پردہ بیٹھا میرے کان پھونک رہا تھا۔ اس کمبخت نے رات بھر مجھے اسی طرح حیران و پریشان رکھا ــــ اور میں وادی محبت میں بھٹکتا، ٹھوکریں کھاتا پھرا ــــ لیکن اب ــــ اب میں اسے سب و شتم نہیں کرسکتا کیونکہ انجام کار کے اعتبار سے وہ میرے لئے ایک تجربہ کار سفر آزمودہ رہبر اور بہترین خضر راہ ثابت ہوا اس نے میری صحیح معنوں میں رہنمائی کرکے مجھے ایسی شاہراہ پر لگادیا جس کی انتہا تمہارے وصال کی سرحد پر ہی جاکر ہوتی ہے ...... مجھے معلوم تھا کہ میرے آقا حسن آغا کے پاس کرایہ کی آمدنی کی پچاس اشرفیاں کل ہی پرسوں آئی ہیں اور اب تک اس کی تجوری میں محفوظ ہیں ــــ میں فوراً اٹھا اور دل میں کہتا جاتا تھا کہ تیس اشرفیوں کے نکل جانے سے حسن آغا کی دولت میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ وہ ایک نہایت ہی کنجوس شخص ہے۔ بہت تھوڑے سے سود پر اپنی نقدی بینک میں رکھتا ہے اور کاشتکاروں کے ساتھ غیر معمولی نفع پر کاروبار کرکے کثیر رقم پیدا کرلیتا ہے ــــ لیکن میرے لئے یہی تیس اشرفیاں انتہائی اقبالمندی و خوش نصیبی کا باعث ہونگی۔ اسی طرح یہ چوری عمل میں آئی اور .... صابحہ! جانتی ہو؟ یہ سب تمہارے لئے ہوا ہے تم مجھے معاف کردو تو مجھے امید ہے کہ باری تعالیٰ بھی مجھ سے اس لغزش کی پرسش نہ کریگا۔ میں اپنی تمام امکانی کوشش ختم کردونگا کہ نئے نئے نیکیاں کرکرکے اس گناہ کا کفارہ ادا کروں ــــ مجھے یقین ہے کہ یہ میری مدت حیات میں پہلی اور آخری لغزش ہوگی۔"

صابحہ اسی طرح گلوگیر آواز میں رو رہی تھی کہ اس نے عبدالسمیع کے گرم تنفس کو اپنے چہرے سے قریب ہوتا ہوا محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اس کے لب صابحہ کے رخسار سے مماس ہوگئے اور وہ اشرفیوں کو اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کرخت لہجہ میں اژدہے کی طرح پھنکار کر کہتا جاتا تھا۔

"صابحہ! میں تمہیں نہایت محبوب رکھتا ہوں۔ تمہاری پوجا کرتا ہوں اور تمہارے بغیر مجھے زندگی بسر کرنی دشوار ہے، تم میرے جسم کی روح آنکھ کی روشنی اور قلب کا سکون ہو ــــ یہ نقود تمہارے ہیں، تم چاہو تو ابھی انہیں لے لو ــــ لو یہ تمہارے ہی ہیں اور جس طرح چاہو اس میں تصرف کرو۔"

اسی آن صابحہ نے ایک گرم بوسہ کی حرارت محسوس کی اسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی سانپ نے انتہائی غصے کے عالم میں اسے ڈس لیا ہو، پھر اس کے ہاتھوں نے نقود کو مس کیا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے بھڑکتی ہوئی آگ نے اسے جھلسا دیا ــــ صابحہ چلا اٹھی اور اپنے آپ کو عبدالسمیع سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"عبدالسمیع مجھ سے دور رہو ...... مجھے چھوڑ دو ...... میرے قریب نہ آؤ ــــ میں تمہیں اس طرح اپنی جانب مائل دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی، مجھے کبھی تمہاری یہ دیدہ دلیری گوارا نہیں کہ تم میرا بوسہ لے سکو ــــ اور یہ نقود تمہیں ان کے مالک کو لوٹا دینا ضروری ہیں۔ ورنہ اگر دوبارہ تم انہیں میرے قریب لائے تو میں انہیں توڑ کر پھینک دونگی ــــ میرے پاس سے دور ہوجاؤ

ہٹو ــــ ورنہ میں اپنی مدد کے لئے زور سے چلاتی ہوں!

اس وقت اس کے سامنے سلیم الطبع مطیع و فرمانبردار عبدالسمیع نہ تھا بلکہ ایک ایسی شخصیت تھی جسے اب سے پہلے اس کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا ایک انسان تھا لیکن درندہ خصلت۔ اس کی آنکھیں بھڑکتے ہوئے دو شعلوں کی طرح مشتعل تھیں ــــ اس کا چہرہ منجمد خون کے لتھڑے کی طرح سُرخ تھا ــــ میں پر غیظ و غضب کے کثیف غبار چھائے ہوئے تھے ــــ اس کے ڈھانے خط و خال اس کی باطنی سرعت انقلاب کی خبر دے رہے تھے اس نے صابحہ کی باتیں سنیں ــــ لیکن انہیں سمجھے بغیر وہ اس کی جانب بڑھنے لگا اور صابحہ اس سے دور ہٹنے لگی۔ اس نے اپنا مُنہ کھولا وہ شور کرنا چاہتی تھی ــــ کہ یکایک اس نے اپنے کو ایک غیر معتاد شخص کے سامنے پایا جس نے سبقت کر کے اسے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور چاہتا تھا کہ بالجبر اس کا مُنہ چوم لے ــــ وہ ایک سانڈ کی طرح پھنکار رہا تھا اور عاشقانہ الفاظ غیر مربوط طریقے پر بلا فہم و ادراک اس کے مُنہ سے نکل رہے تھے دونوں کے درمیان خاموش جنگ جاری تھی ــــ جب صابحہ نے سمجھا کہ میں مغلوب ہوئی جا رہی ہوں تو وہ اپنی مدد کے لئے زور سے چلائی۔ لیکن عبدالسمیع نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس کے باعث اس کی آواز منقطع ہو گئی ــــ پھر بھی مختلف وقفوں میں اسے اتنا موقع ملا کہ عبدالسمیع کا ہاتھ اپنے مُنہ سے ہٹا کر چند مرتبہ چلائی اور دو چار جملے رک رک کر اُسے سنا سکی ــــ "مجھے چھوڑ دو ــــ میں تمھیں قبول نہیں کرتی مجھ سے دور رہو ــــ میں تم سے نفرت کرتی ہوں ــــ نفرت کرتی ہوں ــــ"

اور عبدالسمیع اسے کرخت لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا کہ تم میرے سوا کسی غیر سے شادی کرو ــــ میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا کہ تم ابن شیخ البلد کے پاس جا سکو ــــ میں تم سے محبت کرتا ہوں ــــ تمھاری پوجا کرتا ہوں ــــ تمھیں بھی مجھ سے محبت کرنی پڑیگی، میری پوجا کرنی پڑیگی ــــ کرنی پڑیگی ــــ کرنی پڑیگی۔"

"لیکن میں تم سے نفرت کرتی ہوں.... سخت نفرت..... مجھے چھوڑ اے درندے...."

پھر ایک پر اضطراب چیخ صابحہ کے مُنہ سے نکل کر کان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی جس کی بازگشت دیر تک ہوتی رہی۔ یہ دیکھ کر عبدالسمیع بہت گھبرایا اور قوت متخیلہ نے اسے یہ سین دکھلایا کہ عنقریب لوگ اسے چاروں طرف سے گھیر لینگے اور پولیس اسے گرفتار کر کے قیدخانہ لیجائیگی ــــ پھر صابحہ کو اس سے چھڑا کر لوگ اس کے رقیب ابن شیخ البلد کے حوالے کر دینگے۔ معاً اسے ان تین باتوں کا بھی یقین ہو گیا کہ صابحہ اس سے جھوٹی محبت کر کے اب تک اسے دھوکہ دے رہی تھی ــــ وہ یقینی اس کے رقیب کا حصہ ہوگی ــــ اس کا حصہ دائمی رسوائی و قید کے سوا کچھ نہیں ــــ اس یقین کے آتے ہی اس کی وہ حیوانی قوت بھڑک اٹھی جو پردوں میں چھپی ہوئی نشو و نما پا رہی تھی اور اگر اسے چھیڑا نہ جاتا تو کبھی بیدار نہ ہوتی ــــ اس وقت عبدالسمیع دو شخصیتوں کا مالک تھا جو ایک ہی جسم میں حلول کئے ہوئے تھیں ــــ "برانگیختہ درندگی" اور "ساکن الطبع آدمیت" وہ اپنی آخرالذکر شخصیت کے ساتھ ہمیشہ پرسکون و مطمئن زندگی بسر کرتا رہا اور اپنی اول الذکر شخصیت کا اسے کبھی علم بھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ آج یہ واقعہ پیش آیا اور اس کی حیوانی شخصیت کا مکروہ ترین مظاہرہ ہوا ــــ یکایک اس کا دایاں ہاتھ صابحہ کا گلا گھونٹنے لگا اور بایاں ہاتھ اس کی سانسوں کو روکنے اور اسے چیخوں سے باز رکھنے میں مصروف تھا اور وہ بار بار کہتا جاتا تھا۔

"میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا کہ تم ابن شیخ البلد سے شادی کر سکو.... تم میرے سوا کسی غیر کی نہیں ہو سکتیں....... میں تم سے محبت کرتا ہوں... ...... تم میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر نہیں جا سکتیں .... میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا کہ تم میرا راز فاش کرو...... تم کو مجھ سے محبت کرنی پڑیگی۔"

اتنے میں یکایک صابحہ کی قوتیں سُست پڑ گئیں۔ عبدالسمیع نے سمجھا کہ اس نے اس کی باتیں مان لی ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کرنے کے لئے رضامند ہے یہ سمجھ کر اس نے صابحہ کو چھوڑ دیا۔ چھوڑتے ہی ایک بے حس و حرکت جسم خاک کے ڈھیر پر گر پڑا۔ وہ چند لمحوں تک اسے اسی طرح خس و خاشاک کے ڈھیر پر پڑی دیکھتا رہا اور اس حقیقت تک مطلق نہ پہونچ سکا کہ اسے ہو کیا گیا ہے؟ پھر جب وہ اپنی سابق حالت کی طرف عود کرنے لگا اور اس قابل ہو سکا کہ واقعہ کو کسی حد تک سمجھ سکے تو کانپتا ہوا اس پر جھک پڑا اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر گلوگیر آواز میں پکارنے اور کہنے لگا۔

"اٹھو، اے صابحہ! میں تمھارا گنہگار ہوں! اس وقت غصہ میں تھا

تمہارا یہ کیا حال ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تمہیں کوئی تکلیف پہونچی ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ ۔ ۔ کیا تم بیمار ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے تم بیہوش ہو — لیکن یہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری سانسوں کی آمد و شد بھی نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ تم مُردہ ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مُردہ! ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تمہیں کس نے مارا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ وہ کون ہے؟ ۔ ۔ کون؟ ۔ ۔ کیا میں ہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی نہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ اٹھو اور مجھے جھٹلا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کبھی نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تم مُردہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ! ۔ ۔ ۔ ۔ بلاشبہ تم مردہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

پھر اس نے بآواز بلند گریہ وزاری شروع کر دی وہ بیتاب ہوکر گرد میں لوٹ رہا تھا اور ناخنوں سے اپنا چہرہ گھسوٹتا جاتا تھا۔

حسن آغا نوبجے کے بعد اپنے درود وظائف میں محو منہدم کاٹوں کے راستے سے واپس ہو رہا تھا اور قریبی راہ سے جامع مسجد جانا چاہتا تھا تاکہ فریضۂ مغرب ادا کرسکے وہ حسب معمول اپنی بدرنگ پیچ ترکی ٹوپی سر میں بندھے ہوئے تھا جو اس کے کانوں کو بھی ڈھانپے ہوئی تھی اور نیا سیاہ لبادہ پہنے اور بوسیدہ سفید شال اوڑھے ہوئے تھا اور پرانے سُرخ جوتے اس کے دونوں پاؤں میں گھسٹ رہے تھے وہ اسی طرح جا رہا تھا کہ عبدالسمیع کی دلدوز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس کے قدم رک گئے اور درود وظائف بند کرکے وہ بالکل خاموش ہو گیا آواز زیادہ دردانگیز ہوکر پھر بلند ہوئی تو حسن آغا اس کی جانب تیزی سے چلا جب کالونی کے دروازے کے قریب پہونچا تو عبدالسمیع باہر نکلا وہ اس کتّے کی طرح زمین پر رینگ رہا تھا جو زخموں سے چُور ہو رہا ہو اور نہایت بیتابی سے نالہ و فریاد کر رہا تھا حسن آغا نے اس سے نہایت حیرت سے پوچھا۔

"عبدالسمیع تمہیں کیا ہو گیا ہے تمہارا چہرہ کس نے گھسوٹ لیا ہے؟"

عبدالسمیع نے چیخ کر جواب دیا خواہ غم سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا — اے آغا صابحہ مرگئی اور میں ہی نے اسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا جائیے جائیے وہ دیکھئے اُس کی لاش ہے اور وہ دیکھئے اس کے گرد آپ کی اشرفیاں بکھری پڑی ہیں جنہیں میں آپکے گھر سے چرا لایا تھا اور پھر اپنے چہرہ کو گھسوٹتے ہوئے گرد میں لوٹ کر نہایت دردانگیزی سے رونے لگا۔

حسن آغا مبہوت و حیران کھڑا تھا کہ یکایک اس کی توجہ حجرہ کی طرف مبذول ہوئی تو اس نے صابحہ کو خس و خاشاک کے ڈھیر پر پڑی ہوئی پایا اور اشرفیاں اس کے گرد بکھری ہوئی تھیں اس نے اندر جانے کا قصد کیا لیکن اسے مُردہ سے ڈر لگتا تھا آخرکار اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اندر جاکر اشرفیوں کو ایک ایک کرکے جمع کرنے لگا ایک بار اس کا ہاتھ بھٹک کر صابحہ کے سر و گردن پر جا پڑا۔ خوف کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ چلانے لگا

" یہاں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں ہے ۔ ۔ ۔ چور یہاں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ قاتل یہاں ہے؟ قاتل یہاں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(کامل، مذاقی)

غزل

حضرت ابوالاقبال علامہ عیش، فیروزپوری

اک مست کی آنکھوں کا مدت سے ہوں مستانہ
میخانہ ہے دل میرا، دل میں مرے میخانہ

کیا طرزِ تجلّی ہے، اے جلوۂ جانانہ
محفل میں بنا ڈالا، ہر شمع کو پروانہ

یہ سُن لو، جو سنتے ہو، افسوں بھرا افسانہ
دیوانہ بنا دیگا، ذکرِ دلِ دیوانہ

آتا نہیں کیوں مجھ تک اب دور میں پیمانہ
کیا ہو گئی اے ساقی وہ شانِ کریمانہ؟

مست آنکھ کا ساقی کی ہے مختصر افسانہ
ہر وقت ہے گردش میں یہ عیش کا پیمانہ

کیا ماجرائے دشمن، کیا دوست کا افسانہ
ہر بات کا حاصل ہے میرا ہی یارانہ

ناصح تری باتوں کا کیا دل پہ اثر ہوگا
تو عقل سے بیگانہ، یہ ہوش سے بیگانہ

ساقی تو اگر چاہے کُھل جائیں ابھی دونوں
زنجیرِ درِ توبہ قفلِ درِ میخانہ

یعنی مری ہستی کا انجام ہے پامالی،
میں گلشنِ عالم میں ہوں سبزۂ بیگانہ

ساقی تری آنکھوں کی گردش کا اثر دیکھا
میکش ہیں ز خود رفتہ ہے وجد میں پیمانہ

محروم ہوں اے ساقی میں تیری عنایت سے
یہ گردشِ قسمت ہے یا گردشِ پیمانہ

اُس آنکھ کی گردش سے مدہوش ہوا عالم
اندازے سے باہر ہے چھوٹا سا یہ پیمانہ

آنکھوں پہ جگہ دیگا ہر شوخ پری پیکر
چھپ جائے اگر تیرا اے عیش پریخانہ

قاآنی کا زورِ تخیل اور حُسنِ بیان

جناب پروفیسر عبدالقوی صاحب فانی، ایم اے

قاآنی کا ایک قصیدہ حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ التحیتہ والثنا کی شان میں ہے اس کے چند شعر ذرا تفصیل سے ملاحظہ ہوں۔ مطلع ہے۔

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا
جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر زا

کہتا ہے صبح کو ایک سیاہ ابر سمندر سے اٹھا اور آسمان پر چھا گیا۔ وہ موتی برساتا تھا۔ موتی بکھراتا تھا، موتی لٹاتا تھا اور موتی اگلتا تھا۔

اس شعر میں اس قدر برجستہ اور بیساختہ ترکیب و ترتیب کے ساتھ ترنم ریز و نغمہ خیز الفاظ لائے گئے ہیں کہ پڑھنے سے ایک لذت اور ایک کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ذرا اس حُسن بیان کو دیکھئے کہ نقادان سخن میں کسی کو حسن تکرار پر اصرار ہے اور کسی کو حسن ترصیع پر لیکن سچ تو یہ ہے کہ فضائے تخیل پر مضامین کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور اس میں سے الفاظ کے قطرات نہ صرف موتی بن کر ٹپک رہے ہیں بلکہ دوسرے مصرعہ کی لڑی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دوسرا شعر ہے ؎

چو چشم اہرمن خیرہ چو روئے زنگیاں تیرہ
شدہ گفتی ہماں چہرہ بمغزش علت سودا

کہتا ہے وہ ابر ایسا تاریک تھا جیسے دیو کی آنکھ اور ایسا کالا تھا جیسے زنگیوں کا چہرہ اس پر اس درجہ سودا غالب تھا کہ مطلق سیاہ تھا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیرہ تیرہ اور چہرہ محض صنعت سجع یا مبادلۃ الراسین کے لئے استعمال کئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چشم اہرمن کیلئے "خیرہ" روئے زنگیاں کے لئے "تیرہ" اور علت سودا کیلئے "چہرہ" سے زیادہ موزوں مناسب اور مفہوم خاص کو ظاہر کرنے والے الفاظ نہیں مل سکتے۔

اسی سلسلہ میں کہتا ہے ؎

تنش با قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ
بدل پر شرمۂ سودہ دروں پر لولوئے لالا
بدل گلشن تبن زنداں گہے گریاں گہے خنداں
چو در بزم طرب رنداں ز شورِ نشاۂ صہبا

ان اشعار میں شاعر یہ دکھلاتا ہے کہ کالے کالے بادلوں سے موتی ایسی صاف اور شفاف بوندوں کا مینہ برس رہا ہے اور بجلی تڑپ رہی ہے۔ کہتا ہے ابر اتنا کالا تھا گویا اس کے جسم پر تارکول پھرا ہوا تھا لیکن اس کے دل میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ اسی پر بس نہیں کرتا اور کہتا ہے بادل اس درجہ سیاہ تھا۔ گویا باہر کی جانب پسا ہوا سُرمہ بھرا تھا مگر اندر چمکدار موتی بھرے ہوئے تھے اس کے دل میں پھولوں کا باغ کھلا ہوا تھا۔ گو اس کا جسم قید خانہ معلوم ہوتا تھا وہ کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا جس طرح عیش وطرب کے محل میں شرابی مستی کے عالم میں کبھی روتے ہیں اور کبھی ہنستے ہیں۔

سیاہ ابر کو زندان سے تشبیہ دینا اور اس کی بوندوں کو جو اس میں مقید ہیں گلشن سے تعبیر کرنا نہایت لطیف تشبیہیں ہیں۔

"دلش از شیر آمودہ" اور "بدل گلشن" کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں فلسفہ فطرت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

بچے از شیر خوار دودھ ہی کی بدولت پروان چڑھتے ہیں اور اسی سے ان کی زندگی ہے۔ یہی حال زمین اور نباتات کا ہے پانی ان کے لئے بمنزلہ دودھ کے ہے۔ پانی ہی سے مردہ زمین میں جان آتی ہے اور نباتات کی پیدائش اور نشو ونما ہوتی ہے پانی کی ہر بوند جو ابر میں چھپی ہوئی موجود ہے ایک ایک پھول کا حکم رکھتی ہے

جو برستے ہی زمین کو گل و لالہ اور رنگ برنگ کے خوشنما پھولوں سے آراستہ کر دیتی ہے۔ انھیں بوندوں کا مجموعہ جو پھولوں کا سرمایۂ حیات ہے درحقیقت "گلشن" ہے جو ابر کی سیاہ دیواروں میں مقید ہے اور جس میں طرح طرح کے دل رُبا پھول قطرتاً موجود ہیں اور جس کے فیض مسیحائی سے ساری زمین گلشن ہی گلشن نظر آتی ہے سبزہ زاروں کی کثرت اور چارہ کی افراط سے مویشیوں کی بن آتی ہے خوب آسودہ ہو کر چرتے ہیں اور بقول مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی اسی گھانس کا دودھ بن جاتا ہے

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی
کل جو گھاس چری تھی بن میں   دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں

باران رحمت کے نازل ہوتے ہی باغ تو باغ کوہسار اور مزبلے بھی سبزہ و گل سے ڈھک جاتے ہیں اور ساری زمین کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔

پھر "گریاں" پانی برسنے کی اور "خنداں" بجلی چمکنے کی تفسیر ہی نہیں بلکہ ہلکی تصویر ہے جو شاعر نے پیش کر دی ہے۔ ذرا اس صنعت تضاد کی خوبی کا لطف دیکھئے

جب بارش کی یہ کیفیت ہو تو پھر رندوں کو بادہ خواری اور اس کے سرور وکیف سے لطف اندوزی کی کیوں نہ سوجھے۔ چنانچہ شاعر دوسرے مصرعہ میں "گریاں و خنداں" کی حالت کو مثال سے سمجھاتے ہوئے نشہ کا دور دکھلاتا ہے کہ اس وقت تو خود فطرت بھی مستی سے بیخود ہے۔ وہ عالم ہے جیسے رندان بادہ خوار جو شراب کے نشہ میں سرمست ہو کر کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں۔ اس کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنھوں نے آتے جاتے کبھی کلوار خانہ پر نظر ڈالی ہو یا جن پر خدا نخواستہ خود کبھی ایسا عالم طاری ہوا ہو ورنہ زاہد خشک بقول شاعر ع

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں،

بھلا اس کیفیت کی خوبی اور حسن بیان سے کیا لطف اٹھا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سارا قصیدہ اسی طرح کی لطیف تشبیہوں اور صنائع و بدائع سے مرصع ہے اس پر لطف تخیل، زبان کی روانی اور حسن بیان مستزاد ـــــ کلام کیا ہے بالکل جادوگری ہے۔

اب ایک مسمط کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ندانم از کودکے شگوفہ از چہ پیر شد   نہ خوردہ شیر عارضش چرا برنگ شیر شد
گماں برم کہ ہمچو من بدام غم اسیر شد   ز پا فگندہ دلبرش چہ خوب دستگیر شد
بلے چنیں برند دل ز عاشقاں نگارہا

روح پرور موسم ہے، قدرت کی ہر چیز پر جوبن ہے۔ دلوں کی امنگیں اور طبیعتوں کی جولانیاں اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔ خون جوش کھا رہا ہے۔ عشق کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کلیاں تک اس عشق اور ہجر کی سوزش سے متاثر نظر آتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں معلوم غنچہ کو بچپن ہی میں کیوں بڑھاپا آ گیا۔ اس نے تو ابھی دودھ بھی نہیں پیا تھا۔ یعنی پوری طرح نشو و نما تک نہوئی تھی۔ پھر آخر اس کے رخسارے دودھ کے مانند کیوں سفید ہو گئے۔ یعنی وہ مرجھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی عشق کے پھندے میں پھنس گیا۔ محبت کا کیا اچھا صلہ ملا کہ اس کے محبوب نے اُسے یوں ٹھکرا دیا، ہاں! محبوب تو عاشقوں کا دل یونہی لے جاتے ہیں۔ یہاں شاعر یہ دکھاتا ہے کہ محبت و عشق کے جذبات جو موسم بہار میں حسن و عشق کی ازلی کشش کے باعث ہیجان میں ہوتے ہیں وہ صرف جاندارں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ کلیاں تک ان کے اثر سے متاثر ہیں اور ہجر کی مصیبتوں کے ہاتھوں تباہ حال ہیں۔ شاعر کا یہ بلند تخیل اپنی جدت ادا پر آپ گواہ ہے۔

اسی مسمط کا ایک دوسرا بند ہے نور تخیل اور صنعتوں کی خوبی کے علاوہ ذرا حسن بیان کو دیکھئے۔

بہار کا زمانہ ہے حسن پرست عاشق اپنے معشوقوں کے ساتھ گلگشت چمن میں مصروف ہیں۔ مرغان چمن کے ساتھ بوٹوں کے کاگ بھی اڑ رہے ہیں لیکن ایک قسمت کا مارا ہجر ان نصیب عاشق میر تقی میر کے حسب ذیل شعر کی تصویر بنا ہوا ہے۔

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی[1]   شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

اپنی حسرت کا یوں اظہار کرتا ہے ؎

دریں بہار ہر کسے ہوائے باغ دارد ا   بیاد باغ طلعتے خیال باغ دارد ا
بہ تیرہ شب ز جام مے بکف چراغ دارا   ہمیں دل من است و بس کہ درد و داغ دارا
جگر چو لالہ پُر ز خوں ز عشق گلعذار ہا

یعنی فراق کی شب تاریک ہے۔ میں ہوں اور میرا دل ہے جس میں درد بھی ہے اور داغ بھی ـــــ اللہ بس باقی ہوس۔ جب جی گھبرا اٹھتا ہے تو آب آتش خیز کا جام بھر کر ہاتھ میں لے لیتا ہوں جس کی روشنی سے اس اجڑے ہوئے گھر میں کچھ کچھ اجالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی اس موسم بہار میں سیر کے لئے خاصا لالہ زار ہے۔ کیونکہ لالہ کی طرح یہ بھی "پُر ز خوں" یعنی سرخ اور غم سے داغدار ہے۔

[1] ایک نامراد عاشق بہار کی آمد کو دیوانگی اور زنجیر سے تعبیر کرتا ہے۔

ایک قصیدہ کا مطلع ہے ؎

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئے بار ہا　　کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزار ہا

اس شعر میں شاعر بہار کی آمد کا سماں اس انداز سے کھینچتا ہے کہ بجھے سے بجھے ہوئے دل میں بھی ایک دفعہ تو امنگوں کی لہریں دوڑ ہی جاتی ہیں کہتا ہے شاید جنت کی ہوائیں چشموں اور ندیوں کے کنارے سے چل رہی ہیں کیونکہ سبزہ زاروں کی ہوا میں مشک کی لپٹیں آ رہی ہیں کیسے شیریں سادہ اور برجستہ الفاظ میں کیسا پاکیزہ اور مستانہ خیال ادا کیا گیا ہے۔

اسی قصیدہ میں ایک جگہ کہتا ہے ؎

بکف بطے ز سرخ مے کہ گر از او چکد نمے　　ہمی ز بند بند نے بروں جہد شرار ہا

یہاں شاعر شراب کی سرخی اور اثر کی تیزی کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے، ہاتھ میں شراب کی صراحی ہے جس میں سرخ شراب جھلک رہی ہے اور اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اگر اس میں سے ایک قطرہ بھی نے میں ٹپک جائے تو اس کی جوڑ جوڑ سے (شراب کی) چنگاریاں اڑنے لگیں۔ یہاں شراب کی صرف سرخی ہی کا شعلہ کی سرخی سے مقابلہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اثر کی تیزی کا بھی جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

ایک دوسرے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگ ہزار آید

بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید

شاعر بہار کے آنے کی خوشخبری دیتا ہے اور ثبوت میں کہتا ہے کہ بہار آ گئی کیونکہ گلاب کے درختوں سے بلبلوں کے نغموں کی آوازیں آ رہی ہیں اور سبزہ زاروں سے ہر دم چڑیوں کے چہچہے سنائی دے رہے ہیں۔ بہار کی آمد کی کیسی دلکش اور ولولہ انگیز تصویر ہے۔ مردہ قلوب کے ساتھ شاعر کی یہ سحر بیانی مسیحائی کا کام کرتی ہے مرغزار اور مرغ زار میں صنعت تجنیس نہایت پرلطف ہے۔

صنعت لف و نشر

بلحاظ لغت "لف" کے معنی لپیٹنے کے ہیں اور "نشر" کے پھیلانے کے اصطلاحاً یہ ہے کہ چند چیزوں کا پہلے مفصل یا مجمل ذکر کیا جائے یہ "لف" ہے پھر اسی قدر چیزوں کا اور ذکر کیا جائے جو پہلی ذکر شدہ اشیا سے مناسبت اور تعلق رکھتی ہوں، یہ نشر ہے۔ اگر "لف" کی ترتیب کے مطابق "نشر" ہے تو اسے "لف و نشر مرتب" کہتے ہیں اساتذہ متقدمین نے اس صنعت کا استعمال کیا ہے مگر کم اور سادگی کے ساتھ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عنصری کہتا ہے ؎

یا بہ بندد یا کشاید یا ستاند یا دہد　　تا جہاں باشد ہمی مر شاہ را این چار کار

انچہ بستاند ولایت انچہ بدہد خواستہ　　انچہ بندد دست دشمن انچہ بکشاید حصار

فرخی ؎

در رگ اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم　　خواب و صبر و روح و خون بادا ہمی اے ماہ قلزم [illegible]

رنج دارد جائے خون و درد دارد جائے روح　　عشق دارد جائے صبر و آب دارد جائے خواب

فردوسی ؎

بروز نبرد آں یل ارجمند　　بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند

درید و برید و شکست و ببست　　یلاں را سر و سینہ و پا و دست

عبد الواسع جبلی ؎

ندارم در غم و رنج و جفا و جود تو حالی

لب از باد و سر از خاک و رخ از آب و دل از آذر

بحسن و رنگ و بوئے و طعم در عالم ترا دیدم

قد از سرو و بر از عاج و خط از مشک و لب از شکر

رشید الدین وطواط ؎

بہ بزم و عزم و حزم و رزم گوئی عاریت داری

کف از حاتم ہش از رستم تن از بیژن دل از حیدر

بخشم و حلم و عفو و طبع بر داری اگر خواہی

رگ از خاک و تگ از باد و کم از آب و تف از آذر

امیر خسرو ؎

ز شوق عشق و سوز داغ تو باشد بدین گونہ

دم دود و غم سود و دلم عود و تنم مجمر

ندیدم چوں توئی در شکل و ناز و خوبی و خندہ

بروں رنگ و دروں جنگ و بدل سنگ و بلب شکر

قاآنی نے اس صنعت کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ نمونۃً ایک قصیدہ[1] کے چند شعروں پر اکتفا کی جاتی ہے، یہ پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قاآنی نے اس صنعت میں جو حسن و خوبی پیدا کر دی ہے اس کی نظیر

[1] یہ قصیدہ ناصر الدین شاہ کی مدح میں ہے۔ صفحہ ۵۱ دیوان قاآنی مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۲۷۷ھ

دوسری جگہ ذرا مشکل سے ملیگی۔

فرو بگرفتہ گیتی را بباغ و راغ و کوہ و در
نم ابرو دم باد و تف برق و غو تندر
شخ از نسرین ہوا از سمن چمن از گل تل از سبزہ
حواصل بال و شاہین چشم و ہدہد تاج و طوطی پر
چو سیمین سرو مشکین بت رومی موی و چہر و لب
مہ روشن شب تارے گل سوسن مئے احمر
دو یاقوت و دو یاقوتش دو گلبرگ و دو مرجانش
پر از خاک و پر از تاب و پر از آب و پر از شکر
مرا ہست از غم و اندیشہ و فکر و خیال او
بتا مشکل دو پا در گل ہوا در دل ہوس در سر

صنعت ترجیع

دونوں مصرعوں میں ہموزن یا ہم قافیہ الفاظ کے استعمال کا رواج متقدمین کے آخری دور یعنی ساتویں صدی تک اس درجہ تھا کہ شاید ہی کوئی قصیدہ اس صنعت سے خالی ہوتا تھا۔

مثلاً ہم چند شعر عنصری کے نقل کرتے ہیں۔

رخے چون نو شگفتہ گل ہمہ گلبن برنگ مل
ہمہ شمشاد پر سنبل ہمہ بیجادہ پر شکر
برو از نیکوئی معنی بغمزہ از جادوئے دعوی
بچہرہ حجت مانی بخوبی حاجت آزر
شگفتہ لالہ رخسارہ حجاب لالہ جمرہ
بر از عاج و دل از خارہ تن از شیر و لب از شکر
زمین طاعت و زد فرماں ہمو رزق و ہم او حرماں
ہم او درد و ہمو درماں ہم او دزد و ہمو داور
سرشتہ رویش از رحمت ہمیدوں کنج پر نعمت
رخ او نور و خط از ظلمت لب از مرجاں دل اندر مر
سمن بوئے شبہ موئے بلا جوئے جفا خوئے
پریزادے پری روئے پری چہرے پری پیکر
دل آرامے دلا رامے غم انجامے غم افزائے

نکو روئے نکو رائے بحسن اندر جہاں سرور

عنصری کا ایک قصیدہ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین کی مدح میں ہے۔ یہ پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے اس کو اس درجہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے کہ قریب قریب کل شعراء نے اس کی تقلید میں قصاید لکھے۔ مگر سلمان ساوجی امیر خسرو اور قاآنی نے اس میں بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا اور اس کا حسن دوبالا کر دیا۔ قاآنی نے بھی متقدمین کے تتبع میں صنعت بہت کی ہے چنانچہ ایک قصیدہ کہ جس میں اول سے آخر تک اس صنعت کا التزام رکھا گیا ہے چند شعر ستذکرہ بالا ردیف و قافیہ کے ملاحظہ ہوں،

چو سیمین سرو مشکین بت رومی موی و چہر و لب
مہ روشن شب تارے گل سوری مئے احمر
برش دیبا فرش زیبا قدش طوبی خدش جنت،
تنش روشن خطش جوشن رخش گلشن لبش شکر
قوی حال و قوی بال و قوی یال و قوی بازو
جہاں جوی و جہاں گیر و جہاں دار و جہاں داور
کفش رنگیں دلش سنگیں خطش مشکیں لبش شیریں
بخو توسن برو سوسن برخ گلشن بتن مرمر
سمن خوی و سمن بوی و سمن روی و سمن سیما
پری طبع و پریزاد و پری چہرہ پری پیکر
حقائق خان و قائق دان معارک جو بہارک زن
فلک پایہ گرانمایہ ہما سایہ ہمایوں فر

ـلہ ایک ایرانی پیغمبر مصور جس کا نام ہے ـلہ صورت، ایسی کہ ہم کچھ بہت بڑے بت تراش تھے ـلہ زلف ـلہ سیاہ چہرہ

رشحات محوی

از جناب مولوی محمد جمال احمد صاحب محوی، جلال پوری

بہت ہیں جادہ ہائے عشقِ مشکل دیکھنے والے
یہ ہیں صد ہفتخواں منزل بہ منزل دیکھنے والے

ہمارا سا کہاں سے لائیں گے دل دیکھنے والے
ترے جلوے نہ خنجر ہیں قاتل دیکھنے والے

نیازِ عشق کی سرمستیاں ہیں دید کے قابل
ہوئے جاتے ہیں بیخود رقصِ بسمل دیکھنے والے

تمھیں کہدو نہ کیونکر جان دیدیں رشک کے مارے
تمھیں بزمِ عدو میں زیبِ محفل دیکھنے والے

جفا سہ سہ کے کوئی سیکھ لے ہم سے وفاداری
کہ ہم ہیں سعیِ لاحاصل کا حاصل دیکھنے والے

نہ پایا کچھ سراغِ عمرِ رفتہ، کی بہت کوشش
رہے تھک تھک کے خود منزل بمنزل دیکھنے والے

نہ یوں کھل کھیل دشمن سے کہ رسوائی ہو دنیا میں
اڑائیں گے نہ کیا کچھ رنگِ محفل دیکھنے والے

نہیں منجدھار کی موجیں ہوئی ہیں باعثِ راحت
نہیں اے ناخدا ہم سوئے ساحل دیکھنے والے

مآل اندیش، محوی ہیں خیالِ سعی سے فارغ
کریں کیا فکرِ خرمن برق حاصل دیکھنے والے

افسانہ

جناب شیخ منور حسین صاحب بشیر

(۱)

اسمنڈ اپنی میز پر رکھے ہوئے خطوں کے ڈھیر پر ایک نفرت آمیز نظر ڈال رہا تھا۔ اس کی طبیعت کام میں مشغول ہونے سے اس طرح گھبرا رہی تھی جس طرح ایک طالب علم کی طبیعت تعطیلات کی بیکاریوں کے بعد کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے پریشان ہوا کرتی ہے۔ سوئٹزر لینڈ کی پہاڑیوں کا پر کیف منظر ابھی تک اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ وہاں کے دلکش مناظر، دلچسپ طرز معاشرت اور یہاں کی نہ بدلنے والی یکرنگ حالت کا تقابل اس کے دل پر تکلیف دہ اثر پیدا کر رہا تھا۔

اسمنڈ کا ذریعہ معاش اس کی وکالت تھی جس کے ذریعہ سے وہ اپنی تنہا زندگی کی کفالت کر رہا تھا اس کی طبیعت میں ادبی مذاق تھا اگرچہ ادب خصوصیت سے کچھ اس کی شہرت کا باعث نہ تھا اور نہ اس میں کچھ کامیابی ہی حاصل کی تھی تاہم اکثر رسائل کے ایڈیٹر اس کے مضامین کو خوشی سے قبول کرتے تھے اس کی پرواز تخیل بلند انشاپردازی کا اسلوب پسندیدہ اور طرز تحریر نکتہ چینی کی جانب مائل تھا۔ لیکن اس میں طعن آمیز ناگواری کا رنگ نہ تھا۔ اس کا سلسلہ نسب اسمنڈ خاندان سے تھا مگر بدقسمتی سے وہ اس کی ایک غریب شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس غربت کے باوجود ان قانع لوگوں میں سے تھا جو اپنے مقدر پر شاکر ہوتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا اور خطوں کو کھول کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ مختلف لوگوں کے خطوط تھے، کچھ ایڈیٹروں کے خطوط تھے اور کچھ اس کے مضامین کے پروف۔ ان میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جس پر امریکہ کی مہر ثبت تھی اس نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر اس لفافہ کو کھینچا اور سب سے پہلے لکھنے والے کے نام کو پڑھنے کی کوشش کی۔ "ہادتھ! ہادتھ؟" اس نے اس نام کو دو بار دہرایا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہادتھ صاحب کون ہیں۔ حافظے پر زور ڈالنے سے یاد آیا کہ یہ ہادتھ ایک معمولی وضع قطع کا انسان ہے جو کالج کے زمانے میں ایک خاص امتحان کی تیاری کے لئے دوسری یونیورسٹی سے بھیجا گیا تھا۔ اجنبی ہونے کی وجہ سے کالج کے لڑکوں کے مذاق کا تختہ مشق بنا رہتا تھا۔ اور اسمنڈ ہمیشہ از راہ ہمدردی اس کی طرفداری کیا کرتا تھا اور بعض اوقات زمانہ تعطیلات میں اسمنڈ ان کے یہاں مہمان بھی رہا تھا، لیکن دونوں کی عمر میں دس بارہ سال کا تفاوت تھا جس کی وجہ سے تعلقات میں بہت زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔

اس کے بعد کے حالات مختصر ایہ کہ ہادتھ اپنے حالات سے پریشان ہو کر جنوبی امریکہ کی طرف نکل گیا۔ وہاں واقعات نے مساعدت کی اور اس نے بہت سا روپیہ جمع کر لیا۔ عہد جوانی میں اس نے ایک کم حیثیت عورت کے ساتھ شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکی تھی اور ہادتھ کے بعد یہی اس کی واحد وارث تھی۔ خط ہادتھ کے انتقال سے پہلے لکھا گیا تھا جو اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"اسمنڈ اس میں شک نہیں کہ تمہیں یہ خط پڑھ کر تعجب ضرور ہوگا لیکن تمہیں شاید اس کا علم نہیں ہے میں ہمیشہ تمہاری نقل و حرکت کو بغور دیکھتا رہا ہوں اور شکر کرتا ہوں کہ تم میرے خیال میں اسی قدر ذی فہم، ذی عزت اور قابل اعتبار ثابت ہوئے جیسا کہ میں توقع کرتا تھا اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم میری لڑکی اور اس کے مقبوضات کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لو مجھے قدرتی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ تم اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار نہیں کروگے میں اس کا کوئی صلہ پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ جانتا ہوں کہ تم اس حالت میں اس ذمہ داری کی قبولیت سے انکار کر دوگے۔ تم دیکھوگے کہ ولیریا (لڑکی کا نام ہے) نہایت سمجھدار لڑکی ہے اور اس کی ماں ایک نیک خصلت عورت تھی اور یہ حسن اسی کی وجہ سے تھا کہ میں اتنا روپیہ جمع کر سکا ولیریا کسی قدر متلون اور تیز مزاج ضرور ہے لیکن پہلو میں دل رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے تمہیں زیادہ پریشان نہیں کریگی۔ اس کی نگرانی

سختی سے کرنا لیکن نہ اتنی کہ وہ ہاتھ سے نکل جائے۔"

ایسمنڈ اس خط کو پڑھ کر متعجب ہوا اور اس کے مضمون سے اس لڑکی کے مزاج کی جو خیالی تصویر اس کے ذہن میں آئی وہ کچھ زیادہ دلکش نہ تھی۔ قسمت کے اس جدید انقلاب سے پریشان ہو کر ایسمنڈ نے خط ہاتھ سے ڈال دیا اور باقی خطوط کی طرف متوجہ ہوا انھیں میں ایک خط ہادتھ کے وکیل کا تھا جس میں ہادتھ کے مندرجہ بالا خط کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور لکھا تھا کہ وہ لوگ ایسمنڈ کی ہدایات کے منتظر ہیں، خطوط میں سے ایک تار نکلا۔ اس کے خشک الفاظ نے بھی غریب ایسمنڈ پر اثر اچھا اثر نہ کیا۔ تار کا مضمون یہ تھا۔

" میں خیریت سے گرینج میں پہونچ گئی ہوں۔ آپ کا مزاج
جس وقت مائل التفات ہو، یہاں تشریف لائیے۔" ویلریا

اس وقت ہادتھ کے انتقال کو تین مہینے گزر چکے تھے اور چاہئے تھا کہ ایسمنڈ اس وقت تک ویلریا کے پاس ہوتا لیکن چونکہ وہ اپنے مسکن پر موجود نہ تھا اس لئے مجبوری تھی۔ ایسمنڈ نے خیال کیا کہ اگر میں وہاں جانے کے لئے وقت اور موقعہ کی فکر میں رہا تو شاید قیامت تک بھی نہیں جا سکوں گا اور نہ جانے کے معنی ہونگے کہ میں ایک مرے ہوئے دوست کی استدعا کو رد کرتا ہوں جس کی جوابدہی شرمندگی سے خالی نہ ہوگی۔ کم از کم مجھ کو وہاں جا کر ایک مرتبہ اس لڑکی سے مل لینا ضرور چاہئے۔ وہ رات بھر اس خیال سے کہ نہ معلوم اس لڑکی کے ہاتھوں مجھے کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑینگی جاگتا رہا۔ صبح کے وقت گرینج کی طرف روانہ ہوا اور شام تک وہاں جا پہونچا۔ گرینج ایک نہایت عالی شان عمارت تھی۔ ہادتھ کے بیشمار مکانات میں سے یہ مکان نہایت قیمتی اور بہترین موقع پر واقعہ تھا۔ ایسمنڈ مکان کے ہال میں داخل ہوا۔ چاہتا تھا کسی ملازم سے کہہ کر اپنی آمد کی اطلاع کرائے کہ ایکدم دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی جس کے پیچھے پیچھے دو بہترین نسل کے کتے بھاگتے ہوئے آئے اور اس کے ساتھ کھیلنے لگے۔ ویلریا نہایت حسین لڑکی تھی۔ سر کے بال بھورے اور دلآویز تھے آنکھیں دلفریب لب دلربا اور منہ کی ساخت دلکش تھی۔ اس کے جسم میں وہ رعنائی اور بانکپن تھا جس سے ہر دل اثر پذیر ہوتا ہے۔ ویلریا اس وقت سفید لباس پہنے ہوئی تھی۔ سادہ لیکن چست فراک اس کے سڈول جسم پر نہایت موزوں معلوم ہو رہی تھی اس کا قد "قامت دلنواز" کی بہترین تفسیر تھا۔ اعضا نہایت متناسب تھے غرض کہ ویلریا حسن و جمال کا ایک مکمل مجسمہ تھی اس کی نظر ایسمنڈ پر پڑی ایک لمحے تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ویلریا آگے بڑھی اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر نہایت متانت کے ساتھ کہنے لگی۔

ویلریا میں قیاس کرتی ہوں کہ آپ ایسمنڈ ہیں آپکے آنے کی توقع تو دیر سے تھی۔

ایسمنڈ میں باہر گیا ہوا تھا۔ رات ہی واپس آیا ہوں۔ واپسی پر آپ کے والد کا خط ملا اور ــــــ"

ویلریا اور آپ فوراً چلے آئے۔ اچھا کیا۔ آیئے اندر آیئے۔

ویلریا کی آواز نہایت شیریں اور خوشگوار تھی۔ دونوں لائبریری میں چلے گئے۔ ویلریا میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور ایسمنڈ کو دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ویلریا نے نہایت غور کے ساتھ اس کے چہرے کا مطالعہ شروع کیا۔ ایسمنڈ اگرچہ نیچی نظر کئے بیٹھا تھا لیکن ویلریا کی برقی نظر کی تابش کو محسوس کر رہا تھا اور گھبرا رہا تھا۔ آخر ویلریا نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

ویلریا مجھے آپ کی شکل تو بھلی معلوم ہوتی ہے جس نے میری طبیعت پر سے ایک بار ہلکا کر دیا۔ میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ بڑی عمر کے آدمی ہیں اور میں ایک بڈھے آدمی سے ملنے کی توقع کر رہی تھی۔ بہرحال آپ کی عمر کیا ہوگی؟

ایسمنڈ میری عمر تیئیس ۲۳ سال کے قریب ہے۔

ویلریا نہیں آپ کی عمر اتنی تو نہیں معلوم ہوتی خیر اب آپ میری عمر دریافت کرینگے میری عمر بائیس سال ہے اور خود اپنی نگرانی کے قابل ہوں جس کو آپ اور میں دونوں بخوبی سمجھ سکتے ہیں لیکن میرے والد اس خیال سے متفق نہ تھے چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق میں تاوقتیکہ میری عمر ۲۳ سال کی نہ ہو جائے خود مختار نہیں ہو سکتی۔ اب محض آپ کو ایک سال تک میری نگرانی کے فرائض ادا کرنے ہونگے کیا آپ اس زحمت کو گوارہ کر لینگے۔" ایسمنڈ قریب تھا کہ نفی میں جواب دے لیکن ویلریا نے اس کی آنکھوں سے اس کے جواب کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ ہنسکر کہنے لگی۔

" نہیں آپ گوارہ نہیں کر سکتے افسوس ہے تاہم آپ اس میں کسی قدر کوشش تو کر کے دیکھیں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے مزاج پر قابو پا لینا زیادہ مشکل نہیں ہے آپ نرمی اور ملائمت سے مجھ سے ہر کام لے سکتے ہیں لیکن اگر آپ چاہیں کہ سختی اور حکم سے کوئی کام لیں تو ذرا مشکل ہے بہرحال آپ تین مہینے کیلئے آزمائش کے طور پر یہی فیصلہ کر لیں۔"

ایسمنڈ خاموش تھا وہ سوچ رہا تھا کہ آخر دنیا کی ہر شے کی طرح یہ تین مہینے بھی ختم ہو جائیں گے کیا مضائقہ ہے یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ چنانچہ اس نے اس بات کو قبول کر لیا اور دونوں کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

(۲)

کھانا خاموشی کے ساتھ ختم ہوا میز صاف ہو جانے کے بعد ولیریا نے پھر سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

ولیریا کیا آپ میرے تمام حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یقیناً اس علم کے لئے بیتاب ہونگے۔ اچھا اس سے قبل کہ میں اپنے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں، آپ بتلائیے آپکا میرے متعلق کیا خیال ہے؟" ایسمنڈ نے گردن جھکالی اور لاچاری کی حالت میں مسکرانے لگا۔ "کیا آپ مجھے خوبصورت خیال کرتے ہیں، ٹھہرئیے ابھی کچھ نہ کہئے تاوقتیکہ جو کچھ آپ کہیں وہ قطعی سچ نہ ہو، میں آپ سے حقیقت دریافت کرتی ہوں خوشامد نہیں چاہتی"

ایسمنڈ چونکہ آپ سچ کہلوانے پر مُصر ہیں۔ لہذا میں حقیقت بیان کرتا ہوں کہ آپ محض خوبصورت ہی نہیں بلکہ حسین بھی ہیں۔

ولیریا میں آپ کی صاف بیانی سے نہایت خوش ہوئی۔ سنئے میرا زندگی میں محض ایک مقصد ہے اور ہر نوجوان لڑکی ایک نہ ایک مقصد رکھتی ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ میں کسی رئیس سے شادی کروں اور چونکہ میں بذات خود ایک کثیر روپیہ کی وارث ہوں اس لئے اور نوجوان لڑکیوں کے مقابلے میں ایسا ہو جانے کے امکانات میرے حق میں زیادہ ہیں، آپ اس خیال کی تائید کرتے ہیں نا؟ -

ایسمنڈ میں قطعی متفق ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس معاملہ پر غور کرنے میں کافی وقت صرف کیا ہے کیا پہلے سے کسی رئیس زادے پر نظر پڑ چکی ہے -؟

ولیریا ہاں، لارڈ فیرٹوش جو یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں۔" یہ سن کر ایسمنڈ کسی قدر متعجب ہوا لیکن ولیریا نے اپنا سلسلہ کلام یوں جاری رکھا۔ "میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے یہاں گرینج میں آئے ہوئے تین مہینے گذر چکے ہیں اور چونکہ آپ کے آنے میں تاخیر زیادہ ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے معاملات کو خود اپنے ہاتھ میں لینا پڑا آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے اپنے ملاقات کے حلقہ کو بہت وسیع کر لیا ہے۔"

ایسمنڈ میرا خیال ہے مجھے اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

ولیریا اچھا آپ متعجب نہیں ہونگے خیر، ہاں گارڈین یا نگراں کس کو کہتے ہیں۔؟

ایسمنڈ میں خود آپ سے یہی سوال کرنے کو تھا۔

ولیریا گارڈین یا نگراں کیا ایک حیثیت سے باپ نہیں ہوتا؟ کیا آپ کوشش کر کے تین مہینے کے لئے میرے باپ نہیں بن سکتے؟"

یہ سوال اس قدر صاف الفاظ میں سنجیدگی اور بھولے پن سے کیا گیا تھا کہ ایسمنڈ کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ "آپ مالی معاملات کو تو یقیناً اپنے ہاتھ میں رکھینگے اور مجھے فراک اور ٹوپیاں وغیرہ خریدنے میں بھی مشورہ ضرور دینگے تاہم اگر آپ کو اس سے دلچسپی نہ ہو تو اس تکلیف کی ضرورت بھی نہیں، آپ کو میری دولت کا بھی کچھ اندازہ ہے کہ میں کس قدر دولتمند ہوں -؟"

ایسمنڈ نہیں مجھے قطعاً کچھ معلوم نہیں۔ میں ابھی آپ کے وکیل سے نہیں ملا، سیدھا ادھر کو چلا آیا۔

ولیریا اچھا کیا آپ سیدھے چلے آئے۔ میں وکیل صاحب سے اکثر ملی ہوں بہت نیک اور بوڑھے آدمی ہیں وہ کہتے تھے کہ جہاں تک ان کا اندازہ ہے میری دولت دو لاکھ پونڈ سے زیادہ ہے زمین اور مکانات اس کے علاوہ ہیں۔

ایسمنڈ اللہ اکبر!

ولیریا غالباً آپ کے خیال میں بھی یہ بہت زیادہ ہے اتنے روپے کا حساب کتاب رکھنا آپ کے لئے سخت زحمت کا باعث ہوگا لیکن آپ اس فرض کو تو وکیل صاحب ہی پر چھوڑ دیئے ان کو اس سے دلچسپی ہوگی اور آپ کو اس سے کوئی حظ حاصل نہ ہوگا۔

ایسمنڈ ہاں بیشک، میں اس کام کا آدمی ثابت نہ ہو سکونگا۔

ولیریا بہر حال جو کچھ بھی ہے صرف تین مہینہ کے لئے ہے مجھے فی الواقع یہ خیال کر کے کتنی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ کم از کم تین مہینہ ہی کیلئے میں کل ذمہ داری آپ کی گردن پر ڈالدونگی اور لفضلہ آپ کی گردن اس بار کے تحمل کے لئے مضبوط بنائی گئی ہے؟

ایسمنڈ (کسی قدر تشکک کے انداز سے) میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کر لینگے

ولیریا بیشک "اور میرے ساتھ نباہنا مشکل ہی کیا ہے۔ مجھے مرضی پر چھوڑ دیجئے میری بات میں دخل نہ دیجئے اس کی مخالفت نہ کیجئے پھر دیکھئے کہ میں کیسی سیدھی رہتی ہوں۔

ایسمنڈ اچھا دیکھئے!

ولیریا لیجئے سگریٹ پیجئے۔ اس نے ایک سگرٹ خود سلگایا اور ایک ایسمنڈ کو دیا۔ اس گفتگو کے بعد وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو گئے۔ شام کے کھانے کے وقت ولیریا اپنے سادہ لباس میں نمودار ہوئی۔ اس کا حسن اپنی ضیا باریوں سے ایسمنڈ کی نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا اور اس کے جمال جہاں آرا کی ہر شعاع آنکھوں سے دل تک اترتی جا رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں ایسمنڈ نے لنڈن جانے کا قصد ظاہر کیا ولیریا کسی قدر پریشان سی ہوئی اور اس سے دوسرے دن واپس آجانے کے لئے تاکید کرنے لگی اور اس سے یہ بھی کہا کہ میں نے آپ کے لئے بہترین کمرے آراستہ کرا دیئے ہیں جس کا ایسمنڈ نے شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے رخصت ہوا۔ دوسرے روز واپسی پر شام کے وقت گرینج میں نہایت خوش مذاق لوگوں کا مجمع تھا ولیریا مہمان نوازی کر رہی تھی

اس موقع پر لارڈ فیر ٹوش اور ایسمنڈ کا تعارف ہوا اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے ایسمنڈ ان لوگوں کے لئے بار خاطر نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی خوش گفتاری ان کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ثابت ہوئی اس کے بعد سے ایسمنڈ کی زندگی کا وہ نیا دور شروع ہوا جس میں وہ ولیریا کا نگراں بن کر اس کے ساتھ مقیم رہا۔ یہ دور کچھ گراں معلوم نہیں ہوا کیونکہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرتے تھے۔ ایسمنڈ زیادہ تر اپنے مشاغل میں مصروف رہتا تھا اس کے ساتھ ولیریا کا سلوک ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک بڑے بھائی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ بعض اوقات وہ اُس کی رائے کو اپنی مرضی پر ترجیح بھی دیدیتی تھی اسی وجہ سے ان کے تعلقات نہایت خوشگواری کے ساتھ قائم رہے ایسمنڈ متحیر تھا کہ اکثر اوقات ولیریا کا حسین چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور اُس کی صورت اس کی نظر اور کاغذ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ صبح کا وقت ولیریا نے ایسمنڈ کو اپنے مشاغل میں مصروف رہنے کیلئے چھوڑ دیا تھا اور دن کے باقی حصے کو وہ اپنے لئے وقت سمجھتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ تمام وقت اس کے کاروبار میں صرف کیا جائے ولیریا نے آہستہ آہستہ اُس کے تمام حالات معلوم کر لئے اور جان گئی کہ ایسمنڈ غریب ہے اس کی دوستی کا حلقہ بھی زیادہ وسیع نہیں خودداری انتہا سے زیادہ ہے اور ادبی ذوق ہے ولیریا کتب بینی کی شائق نہ تھی اور ایسمنڈ نے اپنے دوران قیام میں کبھی اس کو کتاب پڑھتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا مگر وہ نہ جانتا تھا کہ ولیریا اکثر ان رسائل اور پرچوں کو دلچسپی سے دیکھتی ہے جس میں اس کے مضامین شایع ہوتے تھے ولیریا کے اخلاق اور متواضع طبیعت نے گرینج کو اچھا خاصا مہمان خانہ بنا رکھا تھا شام کی چاء کے وقت عام پر لوگ جمع ہوتے تھے اور مہینے میں دو ایک دعوتیں رات کے کھانے کی بھی ہو جاتی تھیں۔ ان تمام موقعوں پر ایسمنڈ کا صرف یہ کام تھا کہ ولیریا کی حرکات کو خاموشی کے ساتھ بغور دیکھتا رہے وہ بذات خود لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے کافی جگہ حاصل کر چکا تھا اور لارڈ فیر ٹوش کے ساتھ اس کے مخلصانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ لارڈ فیر ٹوش اور ولیریا کے ظاہری تعلقات سے ایسمنڈ خیال کرنے لگا تھا کہ ان کی شادی ضرور ہو جائیگی اور اس بارہ میں ولیریا پہلے ہی اپنے خیال کا اظہار کر چکی تھی۔

ایک روز سردی زوروں پر تھی اور ایسمنڈ و ولیریا نشست کے کمرہ میں انگیٹھی کے سامنے تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت ولیریا نے سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

ولیریا آپ کا لارڈ فیر ٹوش کے متعلق کیا خیال ہے؟

ایسمنڈ میرا خیال ہے کہ وہ بہت شریف اور نیک ہے۔

ولیریا کیا آپ نے ان کے متعلق کچھ اور بھی معلوم کیا ہے؟

ایسمنڈ وہ یقیناً بہت شریف آدمی ہے ہر فن سے بخوبی واقف ہے ایسا شہسوار اور نشانہ باز کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔ خاندان بہت قدیمی ہے مالی حالت اس قدر اچھی نہیں۔ جائداد ضرور ہے لیکن کسی قدر شکستہ ہے۔ مگر اب تک نہیں کسی قدر سقیم ہے لیکن خوش انتظامی اور روپے کی مدد سے سنبھالی جا سکتی ہے

ولیریا میرا روپیہ؟

ایسمنڈ (کچھ پریشان ہوکر) ہاں آپ کا روپیہ، ولیریا میرا خیال ہے کہ اگر آپ کا مقصد حقیقت میں وہی ہے جو آپ نے ملاقات کے پہلے ہی روز بیان کیا تھا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ فیئرنوش سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے وہ بہت وجیہ ــــــ'

ولیریا بس بس اس سے زیادہ مدح سرائی کی ضرورت نہیں' ولیریا کا چہرہ تمتما اٹھا اور کہنے لگی اف کس قدر تیز آنچ ہے اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ میں لارڈ فیئرنوش سے شادی کرلوں دراصل آپ مجھ سے جلدی سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں - ایسمنڈ چاہتا تھا کہ کہہ دے کہ بیشک یہ الزام بالکل صحیح ہے لیکن کچھ سوچکر خاموش رہا اور کہنے لگا -

ایسمنڈ غالباً میں نے اپنے فرائض کی ادائگی میں تو کوئی کوتاہی نہیں کی - ابھی وہ سلسلہ گفتگو کو ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ولیریا اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی -

ولیریا نہیں صاحب بالکل نہیں آپ بہترین نگراں ثابت ہوئے ہیں آپ کا طرز عمل نہایت خوشگوار مزاج حلیم اور اخلاق وسیع رہے ہیں تاہم مجھے اس بات کا ایک مخفی احساس ہے کہ آپ کو مجھ سے نجات حاصل ہوجانے پر نہایت مسرت ہوگی - میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ میری جانب سے کوئی ایسی وجہ پیدا نہ ہو جو آپ کی دل برداشتگی کا سبب ہو اور آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ مجھے اس کوشش میں کس قدر دقت اٹھانی پڑی ہے - میں اپنے طرز عمل کو اس کے بالکل برعکس کرسکتی تھی اور کوئی طاقت اس کے لئے مانع نہ ہوسکتی اور میں اب بھی آپ کو دکھا سکتی ہوں کہ ــــــ " یہ کہہ کر وہ میز کی طرف بڑھی ایک کتاب اٹھاکر جھنجھلاہٹ سے زمین پر دے ماری اور دروازے کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی پھر پلٹ کر ایسمنڈ کی جانب دیکھا جو ایک مایوسی اور حیرت کی تصویر بنا ہوا کھڑا تھا، وہ اسی پریشانی میں تھا جو ایک مرد کو ایک عورت کی ناخوشی کے وقت ہوتی ہے - خصوصاً ایسی حالت میں کہ بدقسمتی سے وجہ ناخوشی کا کوئی علم نہ ہو اس وقت ولیریا نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا " آپ نہایت ہوشیار آدمی ہیں اور آپ کو ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ہر اہل قلم ذکی و ہوشیار ہوتا ہے مگر آپ خصوصیت سے ذکی الطباع ہیں " اس سے قبل کہ ایسمنڈ اس کی مزید تیز زبانی کو روک سکتا یا عاید شدہ الزامات کی تردید کرسکتا وہ کمرے سے باہر جاچکی تھی اس واقعہ کے بعد سے ولیریا کا سلوک ایسمنڈ کے ساتھ قطعاً بدل گیا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دل میں عہد کرلیا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے ایسمنڈ کو پریشان کریگی دوسرے دن کھانے کے خراب ہونے کی شکایت تھی باورچی کو نکالدیئے جانے کی دھمکی دی گئی - ایک سائیس کو محض اس تقصیر پر کہ گھوڑے کے نعل درست نہ تھے برخواست کردیا گیا - بارش تیز ہورہی تھی اور وہ بغیر برساتی اور چھتری کے باہر جانے پر آمادہ تھی - ایسمنڈ نے منع کیا تو بگڑ کر جواب دیا کہ تم میرے گارڈین ہو یا نرس بھی ہو بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھیگوں آپ روکنے والے کون ہیں، یہ کہہ کر بارش میں باہر چلی گئی - ایسمنڈ اپنے کمرہ میں گیا لیکن بارش کی تیزی بڑھتی جارہی تھی آخر ولیریا کی صحت کے خیال سے بے چین ہوکر اس کی تلاش میں نکلا دیکھا تو ولیریا ایک فرسودہ پل پر بیٹھی تھی بارش سے شرابور ہورہی تھی اور پاؤں نہر کے پانی میں لٹکا رکھے تھے ایسمنڈ اس کے قریب پہونچا اور کہنے لگا -

ایسمنڈ تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو ٹھنڈ لگ جائیگی اور ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگی'

ولیریا میں اگر کوشش بھی کروں تو مجھے ٹھنڈ نہیں لگتی اس کے علاوہ میں اس سے بھی سخت موسموں کی شدت برداشت کرنے کی عادی ہوں -

ایسمنڈ (ترش لہجے میں) بس اب تم کو فوراً اندر چلنا ہوگا -

ولیریا بہت اچھا میرے آقا چلئے - اور اس کے پیچھے پیچھے مکان میں آگئی -

ایسمنڈ بہتر ہو کہ تم جاکر گرم پانی سے غسل کرلو - ایسی ضد اچھی نہیں ہوتی " ولیریا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ سوچ کر خاموش رہی اور اپنے کمرے میں چلی گئی - ولیریا تین دن تک اسی قسم کے سلوک سے غریب ایسمنڈ کی صبر آزمائی کرتی رہی چوتھے روز وہ مجبور ہوگیا کہ وہاں سے بھاگ نکلے چنانچہ اس نے چند روز کیلئے لندن جانے کا ارادہ ظاہر کیا اسی وقت ولیریا کہنے لگی

ولیریا بیشک آپ یہاں رہتے رہتے تنگ آگئے ہونگے میں بھی پریشان ہوچکی ہوں چاہتی ہوں کہ کہیں باہر چلی جاؤں -

ایسمنڈ لیکن تم نے تو کرسمس کے لئے مہمانوں کو مدعو کیا ہے تم کیسے جاسکتی ہو -

ولیریا میں ان کو ٹال بھی سکتی ہوں آپ مجھ سے دور کس قدر چین سے رہینگے اور کس اطمینان سے اپنے کلب میں ہنسیں کھیلینگے اچھا آپ کی غیبت میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

ایسمنڈ ولیریا کیا واہیات ہے - تم نے آخر مجھے پریشان کرنے کی کیوں ٹھان لی ہے

ولیریا میرے خیال میں تو آپ بالکل پریشان نہیں ہوئے آپ کے دماغ میں سوائے مضامین سوچنے کے اور کسی خیال کی گنجائش ہی نہیں میں اپنے ذہن میں انشا پرداز کو بہت اچھا سمجھتی تھی لیکن اب ــــــ'

ایسمنڈ اچھا بس، خدا حافظ -

ــــ (۳) ــــ

ایسمنڈ لندن پہونچا - سمجھتا تھا کہ شاید یہاں کچھ چین نصیب ہو لیکن یہاں بیقراری اور بڑھی کوئی چیز دلچسپ نہ معلوم ہوتی تھی بمشکل ایک ہفتہ پورا کیا اور ہفتہ بھر تک یہی سوال کہ " آخر ولیریا کو ہو کیا گیا ہے " - اس کے دماغ میں چکر لگاتا رہا - وہاں سے

روانہ ہوا جس وقت گرینج میں پہونچا کرسمس کے لئے مہمان آچکے تھے ایسمنڈ نے یہاں پہونچکر ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کی اور وہ اس احساس کی وجہ نہ سمجھ سکتا تھا، ولیریا سے ملاقات ہوئی۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ عرصہ خاموشی رہی ولیریا کے حسن نے ایسمنڈ کے قلب پر از سر نو اثر کیا محبت کے احساس کی تجدید ہوئی لب اظہار نے ضبط سے کام لیا آنکھوں کی غمازی کا خوف تھا کہ ولیریا یوں گویا ہوئی "آپ آگئے؟ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کرسمس کا زمانہ لندن میں گذار دیں اب چونکہ اب آ ہی گئے لہذا کرسمس کی دلچسپیوں کا پروگرام میرے ساتھ شامل ہو کر مرتب کر لیجئے۔ اس دفعہ خیال ہے بہت باری کثرت سے ہوگی اس کے متعلق بھی انتظام ہونا چاہئے غرض ہر قسم کی دلچسپی ہونی چاہئے۔ پروگرام مرتب ہوا جس کا ہر عنوان مہمانوں کے لئے نئی دلچسپی رکھتا تھا مگر بد قسمتی سے بارش اور ہوا کے طوفان اس قدر زبردست شروع ہوئے کہ اکثر وقت گھر کے اندر ہی صرف ہوتا تھا ایسمنڈ بسا اوقات اپنے کمرہ میں رہتا تھا لیکن خیالات ولیریا کے ساتھ تھے وہ اپنی اس کمزوری کو محسوس کر کے بہت پریشان ہوتا تھا اور یہ خیال کہ وہ ایک محافظ ہونے کی حیثیت سے در پردہ ولیریا سے محبت کرتا ہے اس کو بیچین رکھتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور ولیریا لاکھوں روپئے کی مالک ہے میری اور اس کی عمر میں بہت تفاوت ہے جو شادی کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ایسی حالت میں اس کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دینا باعث شرم اور شرافت سے بعید ہے لیکن اس شرم کے احساس کو وہ اپنے اس اطمینان کی بنا پر ڈال دیتا تھا کہ اس کے خیال میں ولیریا اس کے جرم محبت سے ناواقف تھی اور ان کی یکجائی کا زمانہ بھی قریب الختم تھا دوسرے یہ کہ اگر زمانہ یکجائی قریب الختم نہ بھی ہو تو ولیریا ایک دو روز میں لارڈ فیر ٹوش سے منسوب ہونے والی تھی جس کے بعد اس کے یہ احمقانہ خیالات رفتہ رفتہ جاتے رہینگے وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت جو بات ضروری ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ولیریا کو اس کے کسی قول یا فعل سے اس کے دل کا راز معلوم نہ ہو اگرچہ وہ پہلی سی بے تکلف ملاقاتیں تو عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھیں لیکن یہ کمبخت محبت آنکھوں سے یا کسی نہ کسی غیر ارادی فعل سے ظاہر ہو کر رہتی ہے اس کے متعلق انتہا درجہ کی احتیاط کی ضرورت ہے چنانچہ اس ارادے کے ساتھ ہی ایسمنڈ نہایت محتاط ہو گیا اور سوائے خاص خاص موقعوں کے ان لوگوں کی صحبت میں شریک ہونے سے بھی بچنے لگا۔ اور ولیریا سے ملنے کے موقعوں کو حتی المقدور ٹالتا رہا ولیریا نے اس تبدیل شدہ طرز عمل کو حیرت سے دیکھا اور انتہا درجہ کی نرم مزاج و خلیق بن گئی اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے گذشتہ چند دن کی حرکات سے پشیمان ہے۔ اس کی اس پشیمانی کا علم ایسمنڈ کو تھا اور تکلیف دہ تھا وہ تو اس کی بے اعتنائیوں سے ایک خاص لطف اٹھا رہا تھا اس کو اس درجہ متوجہ اور مائل بالتفات دیکھ کر اس کے درد دل میں افزونی ہوتی رہی۔ حیران تھا کہ اپنے درد کو کس وقت تک چھپائے رکھیگا۔ اور کب تک یہ صورت قائم رہیگی اس تشویش میں وہ زیادہ تر اپنے کمرہ ہی میں مقید رہتا تھا۔ ایک روز شب کے وقت ایسمنڈ نے اپنے دروازے پر دستک سنی اور چلے آیئے کہکر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا تو ولیریا داخل ہوئی ایسمنڈ کا دل ایک خاص مسرت سے دھڑکنے لگا اور وہ حیرت کا پتلا بن کر کھڑا رہ گیا۔ ولیریا کا حسن نظر سوز اس وقت اپنی پوری تابشوں سے کمرہ کو نورانی بنا رہا تھا۔ ایسمنڈ ڈر رہا تھا کہ دیکھئے تاب ضبط کب تک قائم رہے جانتا تھا کہ نظر اٹھانے کی طاقت نہیں مگر یہ خوف بھی تھا کہ یہ خاموشی ہی کہیں افشائے راز کا باعث نہ بن جائے نظر اٹھی مگر لرزیدہ پھر ولیریا کے چہرے کو پریشان دیکھ کر اور اس پریشانی کی وجہ کو معلوم کرنے کے لئے اس پر قربان ہوتی ہوئی ذرا قائم ہوئی اور ذوق تصدق نے زبان کو طاقت گویائی بخشی اور اس نے ہمت کر کے ولیریا سے پوچھا۔

ایسمنڈ "کیا آپ کو کسی معاملہ میں میری ضرورت ہے"۔ ولیریا نگاہیں نیچی کئے میز پر ہاتھ ٹکائے بالکل خاموش کھڑی تھی چونک کر کہنے لگی۔

ولیریا "میں آپ سے ایک بات کہنے آئی ہوں لارڈ فیر ٹوش نے ابھی مجھے شادی کا پیغام دیا ہے"۔ ایسمنڈ کرسی پر بیٹھ گیا اور لیمپ کا سایہ اپنے چہرے کی طرف کر لیا تاکہ اس کے چہرے کی کیفیات ولیریا کی نظر سے پوشیدہ رہیں اور کہنے لگا۔

ایسمنڈ "اس میں میرے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں، آپ بیٹھ جایئے لیکن ولیریا کھڑی رہی اور میز پر نظر جمائے رکھی۔ ایسمنڈ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے درحقیقت یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی میں جانتا ہوں فیر ٹوش نہایت شریف آدمی ہے، اور میرے خیال میں آپ نے نہایت عقلمندی کی کہ — میرا مطلب ہے، — ہاں مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت راحت سے گذریگی" اپنی زبان سے ولیریا کا دوسرے شخص کے قبضہ میں چلے جانا اور اس پر اظہار مسرت کرنا اور اپنی دل کی مالکہ کو گویا دفعتہً آج ہی اپنے سے علحدہ کر دینا کچھ ہنسی کھیل نہ تھا لیکن وہ اس کو اپنا فرض سمجھتا تھا اور اس وقت اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دے رہا تھا۔

ولیریا "میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ اس تجویز کی تائید کرتے ہیں لیکن ابھی اس خبر کو شہرت دینے کی ضرورت نہیں" یہ کہکر ولیریا جانے کیلئے دروازے کی طرف پھری لیکن رکی اور کہنے لگی۔ "پچھلے دنوں میرا سلوک آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں رہا لیکن میں کسی ایسی شریر لڑکی کی طرح جو اپنی شرارتوں پر پشیمان ہو کر ان کا اعتراف کرے اپنے قصور کا اعتراف کر کے معافی چاہتی ہوں"

ایسمنڈ ولیریا چلا کر کیا کہتی ہو تم میرے ساتھ ہمیشہ بہترین سلوک کرتی رہی ہو" وہ ایک دم خاموش ہو گیا کوئی چیز گلے میں پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی قریب تھا کہ ضبط کی تمام کوششیں بیکار ہو جائیں۔ اس کے ہونٹ اظہار حقیقت کے لئے بیتاب تھے اور قریب تھا کہ دل خون ہو کر آنکھوں سے بہ نکلے ہاتھ بار بار اٹھتے تھے کہ جرم محبت کا اقبال کر کے اس کو آغوش شوق میں لے لیں لیکن خودداری کا خیال غالب آیا اپنی طبیعت کو سنبھالا اور کہا تم سے زیادہ میرا کون خیال رکھ سکتا تھا۔ ولیریا نے کہا لیکن کچھ عرصہ سے ایسا نہیں ہے۔ میں اکثر آپ کے کاموں میں حارج اور مخل ہوتی رہی لیکن چونکہ اب میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤنگی آپ ان سب تکالیف کو بھول جائینگے ایسمنڈ حیران تھا کہ ولیریا اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہے کیا ابھی صبر و تحمل کی مزید آزمائش باقی ہے اب مجھ میں اس سے زیادہ طاقت شکیبائی نہیں اس کی بے اعتنائیاں قابل برداشت تھیں یہ التفات و کرم میرے عقل و ہوش کو کھوئے دیتا ہے۔ ولیریا جانے کے لئے جھپٹی ایسمنڈ نے لپک کر دروازہ کھولا ولیریا کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوا ایک بجلی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی پھر ضبط کیا اور آ کر اوندھے منہ اپنے بستر پر گر پڑا۔

دوسرے روز طوفان سخت تر ہو گیا ہوا کی شائیں شائیں اور بارش کے شور نے ایک دوسرے کی بات سننی مشکل کر دی۔ آخر سب چپ ہو کر بیٹھ گئے اور طوفان کی تیزی کو دیکھنے لگے ایسمنڈ اپنے کمرہ ہی میں تھا کہ لارڈ فیر نٹوش پہونچے اور نہایت پریشانی سے کہنے لگے۔

لارڈ ایسمنڈ ولیریا نے شادی سے انکار کر دیا۔ آہ مجھے پہلے ہی نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہے اہال ایک صدمہ ضرور ہے میری تمام امیدیں مٹ گئیں۔

ایسمنڈ (خشم آگیں لہجہ میں) بالکل غلط، غالباً اس نے مذاق کیا ہوگا اور دل سے نہ کہا ہوگا تمھیں اس کی بات کا یقین کر کے ہمت نہ ہارنا چاہئے۔

لارڈ میں مذاق کیسے سمجھوں اس نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا ہے آئندہ کسی قسم کی امید رکھنے کی بھی کوئی صورت نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ محبت ہی نہیں تھی۔

ایسمنڈ اگر محبت نہیں تھی تو اس نے کیوں کہا تھا کہ میں آپکے ساتھ شادی کرلونگی۔

لارڈ خیر جو کچھ ہوا ہو چکا آپ اس کی فکر نہ کریں میں اس صدمہ کو برداشت کرلونگا لیکن مہربانی سے آپ اس سے اس بارہ میں کچھ نہ کہیں۔ اس کے بعد لارڈ رخصت ہو گیا ایسمنڈ کسی گہری فکر میں سر جھکا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔ میں اس مداخلت کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن مس ولیریا کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

ایسمنڈ ولیریا یہاں بھی نہیں ہے یہیں کہیں گھر ہی میں ہوگی اس موسم میں کہاں جا سکتی ہے لیکن دل میں خائف تھا کہ ولیریا بعض اوقات معاملات کو انتہا تک پہونچا دیتی ہے اور اس کے مزاج کے سامنے یہ تیز بارش اور تند ہوا کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

خادمہ وہ مکان میں ہرگز کہیں نہیں ہیں میں نے ایک ایک کونہ ڈھونڈ لیا سب لوگ ان کے منتظر ہیں ان کی ٹوپی بھی تو کمرہ میں نہیں ہے۔

ایسمنڈ گھبرانے کی بات نہیں تم نے کسی اور سے تو اس کا ذکر نہیں کیا۔ ان سے کہدو مس ابھی آئی ہیں کمرہ میں ہیں۔

——— (۴) ———

ایسمنڈ چور دروازے سے نکلکر سیدھا پل کی طرف چلا ہوا کی تندی اس کی رفتار کو کم کر رہی تھی خوف اور صدمے سے اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا لیکن وہ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتا ہوا ولیریا کو ڈھونڈ لینے کی امید میں چلا جا رہا تھا اس کو وہ دن یاد تھا جس روز وہ ناراض ہو کر برستی ہوئی بارش میں دریا کے پل پر جا بیٹھی تھی اور اب بھی اس کو وہیں ڈھونڈ لینے کی توقع میں اپنی صحت کی پروا نہ کر کے بھیگتا ہوا جا رہا تھا بادلوں کی تیز رفتاری کی وجہ سے چاند کبھی کبھی نمودار ہوتا تھا تو وہ دور تک اپنے راستے کو دیکھ لیتا تھا اسی عارضی روشنی میں اس کو ولیریا کی ایک جھلک سی دکھائی دی کہ وہ پل کے کمزور ترین حصہ پر بیٹھی ہوئی ہے دریا میں سخت طوفان ہے پل کے بہ جانے کا ہر وقت خطرہ ہے اور ولیریا کا ساتھ بہنا بالکل یقینی ہے وہ گھبرا کر لپکا پل پر پہونچا پل کا ہر تختہ اس کے پیر کے نیچے اپنی جلد ختم ہو جانیوالی طاقت کا افسانہ کہہ رہا تھا ایسمنڈ نے چلا کر ولیریا کو پکارا لیکن اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور پانی کے شور نے اس کی آواز کو ولیریا تک پہونچنے نہ دیا آخر وہ اس کے قریب پہونچ گیا اور اس کو بازو سے پکڑ لیا ایسمنڈ کی گرفت سے چونک کر ولیریا نے اپنا چہرہ اس کی طرف پھیرا اس کی آنکھوں سے دریائے اشک جاری تھا چہرے کی رنگت بالکل سفید تھی کپڑے بارش میں ڈوبے ہوئے تھے بال بھیگ کر چہرے پر کہیں کہیں چپک گئے تھے اس وقت وہ حسین تر معلوم ہو رہی تھی ایسمنڈ کیلئے قابل پرستش لیکن ایسمنڈ کا خوف اس کے تمام احساسات پر غالب تھا وہ چلا کر بولا "تم پاگل ہو یہاں کیا کر رہی ہو فوراً میرے ساتھ چلو"

ولیریا کیوں میری کسی کو کیا ضرورت ہے؟ میں ہرگز نہیں چلونگی۔

ایسمنڈ تمھاری ضرورت؟ تمھارے ہوش درست ہیں؟

ولیریا میرے ہوش بالکل بجا ہیں لیکن میں اس منظر سے لطف اٹھا رہی ہوں دیکھو کیسا عجیب منظر ہے

ایسمنڈ خدا کیلئے اس پل پر سے ہٹ چلو تمھیں نہیں معلوم پل کس قدر کمزور ہے اور اس کے بہنے کا خطرہ ہے

ولیریا میرے خیال میں تو کوئی اندیشہ نہیں آپکو خطرہ ہے تو آپ کیوں نہیں چلے جاتے ایسمنڈ نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر سے ہٹا لیا اور جیبوں میں ڈالکر کھڑا ہو گیا اس وقت ایسمنڈ بھی حسین معلوم ہو رہا تھا اور کہنے لگا "ہاں بیشک میں زندگی سے اس قدر بیزار نہیں ہوں کہ ناحق دریا میں بہکر جان دیدوں لیکن اگر تم نے اس کا ارادہ کر لیا ہے تو چلو میں بھی تمھارے ساتھ ہوں"۔

ولیریا "یہ بیوقوفی مت کرو"۔ قریب ہی سے آواز آئی جیسے کوئی بھاری چیز دریا میں

کر دیں۔ تمام پل ہلنے لگا، ہر کوئی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ پانی پل پر آ کر تختے پکڑ پکڑ کر بہنے لگے۔ ایسمنڈ نے ولیریا کو ہاتھ سے پکڑا اور کنارے کی طرف دوڑا۔ وہ کنارے تک پہنچے ہی تھے کہ پل ٹوٹ گیا۔ ولیریا نے ایک آہ بھری اور آنسو ولیریا کی آنکھوں سے جاری ہو گیا۔

ایسمنڈ "خدا کے واسطے ہمت نہ ہارو، اس وقت آنسوؤں کی زیادہ ضرورت نہیں ہے" جس وہ محبت کرتا ہے ولیریا ایک دم چپ ہو گئی۔ ایسمنڈ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "ولیریا، ولیریا! اب تم خطرہ میں نہیں ہو میری جان، تم محفوظ ہو اور کنارے پر ہو۔"

ولیریا (غصہ میں) "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے لئے سوچتی ہوں، نہیں مجھے یہ خیال تھا کہ میں تمہاری قاتل تھی۔ آہ ایسمنڈ۔" ولیریا اس کے بازو سے چمٹ گئی اور اس کی طرف ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ نظر اٹھائی۔ "آہ ایسمنڈ اس طرح سے پکارنا کس قدر سلطف انگیز ہے، کیا تم مجھ سے جھٹ سنبھالنا اور ہم دونوں ہم خوشی کی حالت میں اس دل المحن کو خیر باد کہتے ایسمنڈ مجھے پھر ایک بار اسی طرح پکارو۔"

ایسمنڈ "میں تمہیں کیا کہہ کر پکاروں؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، تمام خون سمٹ کر چہرے کی طرف آ گیا تھا۔ ہونٹ کچھ کہنے کے لئے بے قرار تھے۔ ولیریا نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور اپنے رخسار اس کے رخسار پر رکھ دیئے اور آہستہ سے کہنے لگی۔

ولیریا "مجھے میری جان کہہ کر پکارو، آہ تم کس قدر بیوقوف ہو۔ تم سمجھ نہیں سکتے تمہیں بچانے کیلئے مجھے اپنی اور ساتھ تمہاری جان کو خطرے میں ڈالنا پڑا۔" ایسمنڈ نے اضطراری کیفیت میں اس کو اپنے سے لپٹا لیا۔ اللہ اضطراری حالت میں اس کی خیریں لبوں کو ہوشیار زبان کچھ نہ کہہ سکتی تھی انتہائی حیرت اور پشیمانی نے اس کی قوت گویائی کو سلب کر لیا تھا۔ ولیریا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور تم اب بھی میرے ساتھ کوئی بات نہیں کرو گے کیا تم اب بھی نہیں کہہ سکتے محض آشنا کر دلیریا مجھے تمہارے ساتھ شروع سے محبت ہے لیکن اظہار کی ہمت نہ تھی۔ جرات کرتا تھا لیکن موقع نہ ملا۔"

ایسمنڈ (انتہائی محبت کے ساتھ) "ہاں ولیریا مجھے تم سے محبت ہے تم میرے اقلیم دل کی بادشاہ ہو اور میں ایک فقیر دریوزہ گر، تم حسن کی دیوی ہو اور میں ایک پرستار۔"

ولیریا "کیا ایسمنڈ تم اپنی غربت کی وجہ سے چپ تھے میرا روپیہ تمہارے اظہار مدعا کے لئے مانع تھا یا واقعی تم میری محبت سے اثر پذیر نہ ہوئے تھے" اس کے بعد محبت کا اعتراف الفاظ میں نہیں ہوا —— بلکہ چند منٹ کے ولیریا نے محبت آمیز ہنسی سے کہا۔

ولیریا "اب ہم واپس کیسے چلیں پل تو ٹوٹ گیا۔"

ایسمنڈ "اور چکر کھا کر جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو گا۔"

ولیریا "اب اگر چار گھنٹے بھی صرف ہوں تو بار نہیں، ایسے موسم میں اور تمہارے ساتھ۔"

غزل

از جناب مولانا حسرت لکھنوی۔ مدیر مبصر لکھنؤ

۱

کچھ نمایاں شانِ وحدت ہوگئی
جس قدر جلوؤں کی کثرت ہوگئی

۲

ہر اذیت آج راحت ہوگئی
مر گیا بیمار صحت ہوگئی

۳

واہ کیا کہنا نگاہِ اولیں
روح بیتابِ محبت ہوگئی

۴

کیوں نہیں ہوتی ہے نذرِ دل قبول
آخر اس میں کیا قباحت ہوگئی؟

۵

کھول آنکھیں کھول آنکھیں ہوشیار
شامِ غم صبحِ قیامت ہوگئی،

۶

جب نگاہِ لطف سے دیکھا ادھر
دور سب دل کی کدورت ہوگئی،

۷

پوچھنا بھی ہے تغافل کی ادا،
دیکھئے کیا دل کی حالت ہوگئی،

۸

دوں گا کیا دستِ جنوں کو میں جواب
کیوں گریباں گیر وحشت ہوگئی؟

۹

دیکھتا کیا ہے مری دنیائے دل
اب محبت ہی محبت ہوگئی،

۱۰

اختیاری کب ہی ہنسنا بولنا
ہاں مگر جیسی ضرورت ہوگئی،

۱۱

حسن ہی کیا عشق کا باقی رہا
تم پہ ظاہر سب حقیقت ہوگئی،

مولٰنا حالیؒ کے خود نوشت سوانح حیات

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء عیسوی میں مقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد سے جانب شمال ۳۰ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے معاصرین میں امتیاز رکھتے تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جنکا سلسلہ نسب ۲۶ واسطہ سے حضرت ابو ایوب انصاری رض تک اور ۱۳ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطہ سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا پہونچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا۔ و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لئے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور پیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی۔ اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں۔ اور خطابت عیدین ان سے متعلق کردی۔ پانی پت میں جو ابتک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں بیٹی ہیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کی سرکار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔ میرے آباد اجداد نے جہاںتک کہ اُن کا حال معلوم ہے بظاہرا کوئی خدمت دلی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا اور میرے والد نے چالیس برس کی عمر میں جبکہ میں نو برس کا تھا انتقال کیا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھالکر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے اول مجھکو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق قدرتی طور پر میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور انکی صحبت میں فارسی لٹریچر کے ساتھ ایک طرح کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوگیا۔ انہیں دنوں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے اجتہاد کی سند لیکر آئے تھے۔ ان سے صرف و نحو پڑھی مگر چند روز بعد بھائی و بہن نے جنکو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا، تاہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔ اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا۔ کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی

کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا۔ اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہکر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاصکر قصبہ پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا۔ اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے کہتے تھے۔ دلی پہنچکر جس مدرسہ میں مجھکو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جاکر آنکھ سے دیکھا نہیں۔ اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی ضیاء الدین وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھکو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں نہیں گیا۔ اور بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں ملگئی لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا۔ اور حصار میں بھی بعض سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبد الرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا۔ اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود کی

بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا! اور خاصکر علم ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح اور مشورہ کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر طبیعت کو اطمینان نہ ہوتا تھا، میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ اُردو یا فارسی کی غزل لکھکر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانہ میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کیا کرتے تھے۔ اور شاعری کا اعلےٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے ان سے شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اسکی بہ نسبت انکا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر انکے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے انکا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا۔ تازہ ہو گیا اور انکی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو ابتک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ

میں بھی جیسا کہ جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مجھکو میرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا۔ وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور حقایق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز میر انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا "آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔ اور ایک خاص قسم کا مذاق رفتہ رفتہ پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد مجھکو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک اسامی ملگئی جس میں مجھکو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے۔ ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہکر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نا معلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاصکر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اپنے پرانے ارادہ کو پورا کیا یعنی مئی ۱۸۷۴ء میں ایک ایسے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر میں نے اول ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جسکی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کا حال اگر نظم میں بیان کیا جائے تو مفید ہوگا۔ چنانچہ میں نے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اسکے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی میں نے چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۸ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نو مسلم کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہموطن تھا۔ اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا لکھی تھی۔ جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیالوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دیدیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اسکو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصلی کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی۔ جبکہ جیالوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھکو اس فن سے محض اجنبیت تھی۔ اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جسپر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھکر شائع کیا۔ جسکا نام حیات سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط آرٹیکل لکھکر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور انکی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ یادگار غالب کے نام سے لکھکر شائع کی۔ اور اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی ہے جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں۔ جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ

ان میں بعض مضمون بھی مختلف عنوانوں [illegible] نے اوقات مختلف میں لکھے ہیں جو تہذیب الاخلاق علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور دیگر اخبارات یا میگزینوں میں شائع ہو رہے ہیں [illegible] کے [illegible] زیادہ اردو یا عربی [illegible] نظم و نثر موجود ہیں جو ابتک شائع نہیں ہوئی۔ جب ان دونوں زبانوں کا رواج ملک میں کم ہونے لگا ہے اسوقت سے انکی طرف توجہ نہیں رہی میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے لکھا تھا اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال ہی میں حضور ملکہ معظمہ ایمپرس وکٹوریا کی وفات پر لکھی اور جو علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔

۱۳۰۰ھ ہجری میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدارالمہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علیگڈھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کیلئے سر سید احمد خاں مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اسوقت علیگڈھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی ۴۵ ماہوار میرے لئے مقرر فرمایا۔ اور ۱۸۹۱ء میں جبکہ میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علیگڈھ حیدرآباد گیا تھا اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کرکے ستر روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کیا جو ابتک مجھکو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسیوقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع

رباعیات

(از جناب مولانا محمود صاحب [illegible]ائیلی۔)

فلسفۂ حیات

ہر بزم میں اک حسن ادب پیدا کر! ہر رنگ میں اک رنگ طرب پیدا کر!
ماضی سے بہر حال یہ حال اچھا ہے جینا ہے تو جینے کا سبب پیدا کر

قومی سیرت

جس طرح ہر اک پھول کی بو ہے مخصوص ایسے ہی ہر اک قوم کی خو ہے مخصوص
تہذیب پہ مغرب کی عبث نازاں ہے نادان کب اس کیلئے تو ہے مخصوص

موانع ترقی

جبتک کہ رہیگی ہم میں اندھی تقلید جبتک کہ اصول کی نہ ہوگی تجدید!
جبتک کہ رہیں گے یہ رسوم اور قیود ہم کو تو ترقی کی نہیں ہے امید

میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

از حضرت درویش میرٹھی

(۱)
میں نغمہ طرازِ الفت ہوں
سر تا پا سازِ محبت ہوں!
اک پیکرِ شوق و حسرت ہوں
گنجینۂ رازِ فطرت ہوں ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۲)
سودائے خیالِ خام نہیں
دل موردِ صد آلام نہیں
پابندِ غمِ ایام نہیں
کچھ مجھکو ہوس سے کام نہیں ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۳)
بالائے زمیں یا زیرِ زمیں!
ہر شے ہے مری نظروں میں حسیں
ہر ذرّے پہ ہی میری جبیں
محدودِ نگاہِ شوق نہیں ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۴)
تم مجھ سے جو پردا کرتے ہو!
محدود تماشا کرتے ہو
خود حسن کو رسوا کرتے ہو
نقصان مرا کیا کرتے ہو ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۵)
مجھکو سگِ دنیا سمجھے ہو
دلدادہ ہوس کا سمجھے ہو
یا نفس کا بندا سمجھے ہو
آخر مجھے تم کیا سمجھے ہو ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۶)
جا کر لبِ دریا بیٹھوں گا!
موجوں کا تماشا دیکھوں گا
غنچوں کو چمن میں چھیڑونگا
گلشن کی بہاریں لوٹوں گا ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

(۷)
گھبراؤنگا جب ویرانے میں
آجاؤنگا پھر میخانے میں
ہو جاؤنگا گم پیمانے میں
رہ جاؤنگا بس افسانے میں ٭ میں شاعرِ پاک طبیعت ہوں

سوختۂ محبت

از جناب منشی علی احمد صاحب کاکوروی

آج کل عشق و محبت گویا گڈے کا بیاہ ہو گیا ہے۔ گلی کوچوں میں محبت ٹکے سیر جس طرح بک رہی ہے ویسے اس کے خریدار بھی کثرت سے نظر آتے ہیں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد ان کے آگے گرد ہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہ لوگ محبت کے مفہوم سے اور اس کی [illegible] سے اسی طرح ناآشنا ہیں جس طرح مچھلی خشکی کی سیر سے یہ سب مخرب اخلاق ناولوں اور ہماری موجودہ توہم پرستی و آزادہ روی کا نتیجہ ہے جس قدر بے حجابی اور بے شرمی بڑھتی جائیگی اسی قدر زمانہ بد سے بدتر ہوتا جائیگا۔

حقیقتہً محبت ایسی چیز نہیں ہے جو ہر ایک کا حصہ ہو جائے۔ یہ فرد رہے کہ وجود انسانی بنائے محبت ہے مگر یہ کیونکر؟ اس سے وہ محبت مراد ہے جس سے ہم اپنے پندار کو فنا کرکے جوہر معانی بن جائیں مگر افسوس ہماری فہم و فراست پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ ہم نے اپنی نفسانی خواہشات کا نام محبت رکھ لیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

محبت عین حقیقت ہے۔ اس کی نکتہ دانی حق شناسی ہے اسی کی بدولت آج انسان اشرف المخلوقات ہونے کا دعویدار ہے یہی وہ بار گراں ہے جس سے سوائے انسان کے تمام موجودات و مخلوقات نے پناہ مانگی۔ یہ عین غیرت خداوندی ہے اس کو خواہشات سے بیر ہے کیونکہ مرضی محبوب میں اپنے آپ کو مٹا دینا پڑتا ہے

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

برخلاف اس کے ہم ہیں کہ ہر بات کو اپنی مرضی کے مطابق چاہتے ہیں۔ تو اب محبت کیا ہوئی ہمہ تن خود غرضی؛ اور یہی وجہ ہے کہ محبت بیشتر نفرت سے بدل جاتی ہے۔ ہاں، پاک محبت کبھی رائگاں نہیں ہوتی اور انجام کار دلی کاوشیں حد سے گذر کر نخل محبت میں ثمر لاتی ہیں۔ ڈالیاں جھوم جھوم کے آغوش وا کرتی ہیں۔ کوئی نامراد بصد شوق آگے بڑھتا ہے پتیاں خوشی خوشی شبنمی گوہر نثار کرکے شرم و حیا کا پردہ ڈالدیتی ہیں اور "وحدانیت" چپکے سے دونوں کے کان میں کہدیتی ہے کہ اصل میں ہم ایک تھے۔ یہ علیحدگی محض وہمی تفرقہ تھا۔ اسی عینیت کا نام وصال و انتہائی کمال ہے چنانچہ ذیل کا افسانہ اسی کا آئینہ ہے۔

———(۱)———

کو ملو بے باک کجا زاہد یابس
بگذیں [illegible] عشاق نہ آں باش نہ ایں باش

ایک عالم [illegible] مولوی صاحب متشرع عابد و زاہد مجموعہ اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ ایک مکتب میں بچوں کو درس دیا کرتے تھے اوصاف مندرجہ بالا کے ساتھ باوضع و وجیہ بھی تھے۔ عقاید کی پختگی میں عشق کو فسق اور محبت کو لغویت سے تعبیر کرتے تھے اپنے مجموعی طرز عمل سے ایک زاہد خشک تھے۔ تخمیناً تیس سال کی عمر ہوگی مگر علمی مشاغل نے عقد و مناکحت کے خیال کو ان سے کوسوں دور کر دیا، زندگی کی بہاروں سے ہنوز ناواقف جوش شباب کے ولولے۔ زہد و اتقا شرم وحیا کے دامن میں چھپے ہوئے اپنی بے بسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آخر مولوی صاحب انسان تھے۔ فطری حسیات و قدرتی جذبات کا اشتعال و ہیجان ناگزیر تھا۔

مکتب کے سامنے ایک معزز کھتری کا مکان تھا اس کی نوعمر دختر کی الڑ اور توبہ شکن نظر مولوی صاحب کے زہد و تقویٰ پر پڑی۔ ع

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود

سادگی اور بھولے پن کی ایک چنگاری نے مولوی صاحب کی خرمن ہستی میں آگ لگا دی۔ دبے ہوئے جوش نے مبارکباد دی امنگوں نے خیر مقدم کیا زخم ایسا کاری تھا کہ صبر و قرار رخصت ہو گیا۔

عشق رالازم کہ یوسف را ببازار آورد

ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد

ایک طرف نواہیٔ شرعیہ دل کی بے بسی اور حسن کا دلفریب نظارہ ایک طرف۔ محبت کے خمیر سے بنا ہوا دل۔ دوسری طرف عشق کی رسوائیوں کا خیال آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں مگر مجبور ہیں، دل محبت کے لئے ہے مگر [illegible] جبر اس مجموعہ اضداد کا کیا ٹھکانا ہے

دیا ہے آنکھ کو خواب اور خواب کو راحت

پھر اس پہ ضد ہے کہ تو مبتلائے خواب نہ ہو (نشتر کاکوروی)

ادھر مذہبی سختیاں ایسی پھر طرہ آغاز محبت اور پھر وہ بھی ایک پرکالۂ آتش مہ جبین دوشیزہ سے اضطراب دم بدم بڑھنے لگا۔ خلش نے مضطرب کر دیا۔ غرض کہ نا آشنائے لذت محبت مولوی صاحب کو محبت کی مضبوط زنجیر دل نے بری طرح جکڑ لیا۔

محبت ہے وہ دشمن دوست بن کر دل میں رہتی ہے

لگا کی ہے اسی میں آگ جس منزل میں رہتی ہے (نیرنگ کاکوروی)

وہ شعلہ جوالہ اس بلا کی حسین و جمیل تھی کہ مولوی صاحب ایسے جابر نفس و منکر محبت تابش جمال کی تاب نہ لا سکے اور پتھر سا دل موم ہو گیا۔

بترک چشم سازش کردہ کافر کیش زلف او

بے قتلم لبم گردیدہ دیدے بے دینے

غریب درد دل کی لذت سے ناآشنا پھر اتقا اور پارسائی میں فرد نہ راہ رفتن نہ جائے ماندن۔ عجب کشمکش کا عالم نہ کوئی مونس و غمخوار۔ نہ پاس رازداری سے اظہار کی جرات ؎

کون پرساں ہے بجز حسرت و اندوہ و فراق

کون مونس ہے بجز شکوۂ بے مہری یار

نہ دل پر قابو نہ جدائی کا یارا۔ حیا مانع مگر جویائے نظارہ۔ زبان کو ہمکلامی کی تمنا اور رسوائی کا خوف۔ کنارہ کشی حد امکان سے باہر ؏

قابو میں جس کے دل نہ ہو پھر وہ غریب کیا کرے

اس زبردست چوٹ نے مولوی صاحب کو نہ صرف درس و تدریس بلکہ دنیا کے تمام مشاغل سے بیزار کر کے فقط ایک مشاہدہ و تصور جمال یار کی طرف مائل کر دیا۔

دلم بردی قرارم را شکستی   تمامی کار و بارم را شکستی

غبار خاطرم برباد کردی   ہمہ نام و نشانم را شکستی

دن رات کا یہی مشغلہ رہ گیا کہ گل نوخاستہ و نوبہار حسن کے آستانہ رحمت کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کریں اور دوش صبا پر بزبان رضی لکھنوی یہ پیغام بھیجتے رہیں۔

یہ مانا اے ستمیں تجھ سے ہے لحاظ ہی چشم سرگیں کا

مگر ہے کچھ تو پاس خاطر بھی کبھی اک دل حزیں کا

آخر جذب محبت کام آیا۔ بیتابی دل رنگ لائی آہوں نے رسائی اور نالوں نے اثر کیا۔ شب بیداری و اختر شماری نے دوسرے کی آنکھوں سے نیند اڑا دی۔ مگر کچھ بیدار ہوئی اور دل ہی دل میں کشمکش خیال ہونے لگی۔ آہ یہ کھٹک کیسی؟ میرے دل کو کون سے لے ڈالتا ہے؟ اس الجھن کا آخر سبب؟ پھر اضطرابی کیفیت بڑھی تو کہنے لگی یہ کیا تھا۔ کیا محبت کا مقناطیسی اثر تھا۔

معلوم ہوا نشتر دل چیر کے جب دیکھا

ارماں جسے کہتا ہوں ٹوٹا ہوا پیکاں ہے

ہاں میں سمجھی یہ مولوی کی معنی خیز نظریں ادھر بار بار کیوں اٹھ جاتی ہیں؟ آئیں یہ ان کا خیال رہ رہ کے مجھے کیوں ستاتا ہے میں نے تو کبھی ان سے بات بھی نہیں کی۔ نہ وہ مجھ سے ملتفت ہوئے اصابت کرنے کا کون سا محل تھا۔ نہ کوئی غرض نہ مطلب۔ غیر کفو، غیر مذہب، ہائے یہ دل کو کیا ہوا اس کی دھڑکن بڑھ رہی ہے، یہ کیوں مجھے دیکھنے کو مجبور کر رہا ہے۔ اے ایشور میری لاج رکھنا۔ میری آبرو تیرے ہاتھ ہے یہ کہتے کہتے غزال چشم محبوب کی نگاہیں مکتب کے در و دیوار سے ٹکرا جاتی تھیں یہ کیا تھا؟ قوت جاذبہ کا کہربائی اثر۔ یہ وہ کشش تھی جس سے فطرت نے انسانی قلوب کو معمور کر دیا ہے واقعی سچ ہے کہ درد دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ؎

دل را بدل رہیست درین گنبد سپہر

از سوئے کینہ کینہ وز سوئے مہر مہر

غرض زمانہ کے نشیب و فراز سے ناواقف بھولی دوشیزہ مولوی صاحب کی محبت میں سرشار ہو گئی۔

میکشد دل بسوئے یار مرا   جذب او کرد بیقرار مرا

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ اس کو بغیر ان کے دیکھے قرار آتا نہ ان کو سکون خاطر میسر تھا۔ ادھر وہ غارتگر صبر و شکیب عصمت و حیا کی دیوی۔ ادھر یہ مستقل جدو دار ذی تمکنت نہ یہ بلانے کی جسارت کرتے نہ وہ خود آنے کی جرات کرتی۔ بہت بیقرار ہوئی تو بالا خانہ سے چھپ کے جھانک لیا۔ کبھی دروازے سے برق جہندہ کی طرح چمک کے نکل گئی۔ مولوی صاحب اپنے پارسائی کو آلودگی سے پاک رکھنے کی سعی میں غرق

فراق ہوتے جاتے ہیں۔

تصویر سادہ چہرہ دکھا کر چھل گیا ۔۔۔ آغوش تصور میں دلِ ناداں مچل گیا

دونوں طرف کے جذبہ ضبط نے ستم ڈھادیا ؎

مجبور اضطراب بھی پابند ضبط بھی
مشکل ہے دل کو کیا دکرے اور کیا کرے (حسرت موہانی)

خسرو کاکوروی ؎

آنکھ ملاتی نگاہ گرتی ہیں ۔۔۔ دل ہوں خسرو درد پیدا ہو گیا

یہ تپش، یہ خلش، فراق کی کلفتیں۔ درد دل کی افزونی مولوی صاحب کو مزہ دے گئیں ؎

از لب و رخسار و زلف عنبر افشاں کسے
آب دیگر رنگ دیگر بوئے دیگر یافتم

واقعی پاک محبت کا کیا کہنا بعفت آبی و محاسن اخلاقی کا عدیم النظیر مظاہرہ تھا۔ متقدمین نے فراق کو وصال پر اسی لئے ترجیح دی ہے مگر یہ دل والوں کا کام ہے بوالہوسوں کا نہیں۔ یہی وہ جذبہ لطیف ہے جس نے مجنوں سے انجام کار "لیلیٰ" کہلا دیا۔ محبت کا معاملہ ایسا ہے کہ سات پردوں میں چھپا کر رکھئے۔ طرح طرح سے پوشیدہ کرنے کی سعی کیجئے ایک پیش نہیں جاتی۔ اگرچہ مولوی صاحب محبوب خوش خصال سے کبھی ہمکلام نہیں ہوئے مگر آنکھوں نے غمازی کی چہرہ پر عشق نے وہ غازہ ملدیا کہ راز محبت افشا ہو کے رہا۔

ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند

اگر کوئی شاہد حال و پرسش حال کرتا تو فرماتے ؎

وہ ہجراں گذارد کہ نشینم خاموش ۔۔۔ ضعف قوت نہ دہد تہمت آہ بے گاہے
اجزائے عشق ہو ہر یک نگاہ کن ۔۔۔ اگر بیاد حال این سبب لو ابیں،

مولوی صاحب کے جذب محبت نے نہ صرف کھتران کے دل پر محبت کی مہر ثبت کی بلکہ ان کی صداقت و بے لوث محبت نے اس کے اعزہ و اقربا کو بھی مسخر کر لیا۔ اگرچہ ہر شخص ان کا ممد و معاون تھا مگر یہ اپنے دائرہ شرم و پرہیزگاری سے سر مو متجاوز نہ ہوئے۔

وہ وقت آیا کہ کھتران سعد الدین اپنے فرض منصبی کو ادا کریں۔ (؟) شادی ہو گئی۔ ادھر مولوی صاحب کے ذوق و شوق کے ولولوں میں ذرہ برابر فرق نہ آیا ادھر محبت وہی شیفتگی قائم رہی بے نفسی اور پاک دامنی کی انتہا ہے کہ جوش رقابت تک پاس نہ آنے دیا، یہ ضرور تھا کہ کھتران اب مولوی صاحب سے جُدا ہو گئی تھی اور ہر وقت کا شرف اجمال نصیب نہ تھا مگر یہ مہاجرت و فراق اس لئے زیادہ الم انگیز نہ تھا کہ اس کے شوہر کی طرف سے بھی مولوی صاحب کو دیدار محبوب کی ممانعت نہ تھی۔ فطری غیرت نے ہنوز باہم گفت و شنید و اظہار جذبات کا کوئی موقع نکلنے نہ دیا۔ اسی آن بان سے جادۂ عشق پر گامزن رہے۔ انقلاب پسند دنیا اور ناساز گار زمانہ سے مولوی صاحب کا یہ ربط و ضبط دیکھا نہ گیا۔ محبت والوں سے دشمنی ان کا جزو ہے۔ ناکامی محبت سے زیادہ لطیف و مہلک کوئی بیماری نہیں۔ ملٹن کہتا ہے کہ "یہ وہ گھن ہے جو نخل حیات کو اندر ہی اندر کھا کر بتدریج اس کی بیخکنی کر دیتا ہے۔"

کشاکش جذبات و آلام محبت کی بے بسی نے سراپا عشق و مجسم وفا کھتران کے نازک دل کو اس طرح مجروح کیا کہ چند ہی روز کے بعد اسے دق ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بجز مولوی صاحب کے کسی متنفس کے ساتھ شاد نہیں رہ سکتی اور مذہبی قیود کی بنا پر یہ ناممکن محض تھا اُدھر مولوی صاحب کی سچی اور پاک محبت اغراض و مقاصد سے قطعاً مستثنیٰ تھی ان کا تو اس پر عمل تھا کہ "حُسن دیکھنے کے لئے ہے نہ کہ مس کرنے کے لئے" ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا

مولوی صاحب مریض محبت کو بڑے انتشار و کرب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ضرور دیکھ آتے تھے۔ ان کے دلی اضطراب سے کسی کو کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ نہ زبان سے کچھ کہتے تھے نہ ان کے چشم و ابرو سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک معنی خیز سکوت سے کام لے رہے تھے۔ آخر وہ جدائی کی قیامت ڈھانے والی گھڑی آ ہی گئی۔ تمام کوششوں کے باوجود ناشاد و نامراد کھتران کی صحت کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے بلکہ ؎

مریض عشق پر رحمت خدا کی ۔۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا (میر)

وہ نوبہار ناز گلستاں سے جب پھرا
ہر پھول غم سے سوکھ کے کانٹوں میں مل گیا (لا علم)

آہ یہ غم مولوی صاحب کا نازک دل برداشت نہ کرسکا اور وہ یا
لمحہ جب وقت کھتر ائن کے ارتھی کے ہمراہ ہوئے صبر و ضبط کا یہی عالم تھا۔
ایک لفظ زبان سے نہ کہا۔ جزع و فزع کیا معنی؟ کھترائن کے ماں باپ بھائی گریہ و
زاری کرتے تھے۔ مگر واہ رے مولوی صاحب کا استقلال کہ ایک آنسو بھی نہ گرا۔
گویا سوز محبت نے تمام جسم کا خون خشک کردیا تھا۔ وہ غضب کی مہر سکوت منہ پر
لگی تھی کہ کھترائن کی طرح مولوی صاحب کے لب بھی قیامت تک کھلتے نہ معلوم
ہوتے تھے۔ نشتر ؎

لگی ضبط فغاں سے لب پہ نشتر مہر خاموشی
ہوا افسوس رسوائے جہاں میں بے زباں ہوکر

حیرت کے عالم میں نعش کے پیچھے پیچھے ایک جذبۂ بے اختیار کے تحت
سے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ مرگھٹ پر پہونچے۔ کھترائن کے اعزہ نے چتا تیار کی
اور نا کام تمنا جوانا مرگ کھترائن چتا کے انبار میں رکھی گئی۔ جس وقت چتا میں آگ
دی گئی ادھر شعلہ ہائے محبت مولوی صاحب کے خرمن صبر و قرار کو جلانے لگے۔ کون
عاشق کن آنکھوں سے اس منظر شعلہ فشاں کو دیکھ سکتا ہے کہ اس کا محبوب مطلوب
نذر آتش ہو رہا ہو۔ بار بار مولوی صاحب میں یہ ولولہ پیدا ہو رہا تھا کہ محبوب کے بعد
زندگی بیکار ہے۔ اب شرم و حیا کا موقع نہیں رہا۔ اسی چتا میں پھاند پڑنا چاہئے
اگر لوگ بے حیا کہینگے تو بیوفائی کا الزام بھی نہ آئیگا۔ مولوی صاحب کا عزم
ان کے چشم و ابرو سے ظاہر تھا۔ لوگوں نے انھیں اس مقام سے ہٹا کے کسی قدر
فاصلے پر زیر درخت پہونچا دیا۔ مولوی صاحب کے جذبات میں وہ ہیجان تھا کہ
کھڑے ہونے کی بھی تاب نہ تھی۔ زمین آسمان گردش میں اور دنیا اندھیر ہو رہی تھی
شاخ درخت کے سہارے سے کھڑے ہوئے شعلہ ہائے آتش کو بلند ہوتے دیکھ رہے
تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب نے صبر و استقامت کی حد دکھا دی
اندر ہی اندر سلگ رہے تھے مگر نہ آہ کی نہ منہ سے دھواں نکلا۔ جو کچھ ان پر
گذر رہی تھی۔ اس کا اندازہ شاید کوئی سوختہ بخت درد رسیدہ ہی کر سکتا ہے
بقول فانی بدایونی ؎

ہوتا ہے آج فیصلہ امید و یاس کا
لٹتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اجڑ گیا

الغرض کھترائن اپنے دل میں بے شمار تمناؤں کا ذخیرہ لئے ہوئے
دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئی اور ارتھی کے ساتھ آنے والے رنجیدہ و کبیدہ اپنے
گھروں کی طرف واپس ہوئے۔

اس کے بھائی نے گو یو کنان مولوی صاحب سے جن کی خستگی بہت
سب پر آشکار اتھی ا کہا ــــــ "اب چلئے ہم لوگ بھی جی بھر کے آنسو
رو چکے ..... قضا و قدر سے کیا چارہ ہے ..... ظالم آسمان کو یہی
منظور تھا ــــ"

کوئی جواب مولوی صاحب نے نہ دیا۔ وہ سمجھا کہ شدت غم اور قلق
سے مولوی صاحب مبہوت ہو رہے ہیں۔ ان کو ہوشیار کرنا چاہئے بلکہ تمام
ہاتھ شاخ شجر سے اپنی طرف کھینچا۔

مگر آہ جس طرح آگ نے بظاہر کھترائن کو پھونک دیا تھا باطنی سوز نے مولوی
صاحب کو بھی جلا ڈالا تھا۔ یہ کہ کھینچنا تھا کہ تمام ہڈیاں منتشر ہو گئیں۔ ادھر کھترائن کا
پیکر خاکی نذر آتش ہو رہا تھا ادھر سوز عشق اپنی کارفرمائی میں مصروف تھا ؎

عشق از یں بسیار کردہ است و کند

خوں رگ مجنوں سے نکلا فصد لیلیٰ نے جو لی   عشق میں تاثیر ہے پر جذب کامل چاہئے

اس حیرت انگیز و جانکاہ حادثے نے کھترائن کے اعزہ و اقربا کے زخموں پر نمک
پاشی کا کام کیا۔ سب نے مولوی صاحب کی خاکستر و سوختہ استخوان کو آنسوؤں سے تر کر دیا
اس دیوانگی اور صداقت کی موت نے بالآخر ان سب کو مجبور کردیا کہ وہ دونوں سوختگان
محبت کی ہڈیوں کو یکجا کرکے ایک ہی قبر میں دفن کردیں تاکہ عاشق و معشوق جدائی
کے غم سے ہمیشہ کے لئے سبکدوش ہو جائیں۔ اس طرح مولوی صاحب کی آرزوئے
دل پوری اور شادکام وصال ہوئے۔

آپ ہم اپنی آگ میں اے غم عشق جل چکے
آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا۔ جلا دیا،

حضرت نیاز بریلوی ؎

سروسامان وجودم شرر عشق بسوخت   زینہا کشتہ دل سوز نہانم باقیست

یہ عبرت گاہ، یہ یادگار عشق حقیقی عاشق و معشوق کی قبر جس کا نام ہے اب
بھی قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی میں موجود ہے اور ہر خاص و عام اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے
ان کے عشق کے ساتھ ان کا نام اور ذکر ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور حیات حقیقی اسی کا نام ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

غزل

از

جناب ماسٹر نراین پرشاد صاحب کھنہ نسیمؔ

جسے جاں نثاری کا ارماں ہو گا — تصور میں بھی تجھ پہ قربان ہو گا،

نگاہوں میں اب اضطرابی ہے پیدا — دکھا دے جو جلوہ تو احسان ہو گا،

پریشان ہو گا وہ حیران ہو گا، — ترے وصل کا جس کو ارمان ہو گا،

تمھیں دل نوازی سے نفرت ہے لیکن — مرا حال اب کیا مری جان ہو گا،

سُنینگے وہ کب دردمندوں کی حسرت — خدا جانے کس دن یہ احسان ہو گا،

یہی ہے اگر فطرتِ چشمِ ساقی — نہ تقویٰ رہے گا نہ ایمان ہو گا،

نسیمِ وفادار کو جانکنی ہے
اگر دیکھ لو تم تو احسان ہو گا

ایک غلطی

(جناب بخشی غضنفر علی صاحب بی اے)

"آپ کا بیگ میرا خیال ہے اُس کونے میں زیادہ محفوظ رہیگا"
مَیں نے مسکراتے ہوئے اپنے ہمراہی مسافر سے کہا۔

"شکریہ! مگر — معاف فرمائیے، ناواقفیت کی وجہ سے استحقاق نہیں رکھتا۔ ورنہ ضرور دریافت کرتا کہ اس ناخواندہ التفات سے کیا فائدہ ملحوظِ خاطر ہے" فیضی نے بغیر میری طرف دیکھے کہا۔ (انکا نام اُن کی عنایت سے مجھے بعد میں معلوم ہُوا تھا)

آپ جو کچھ چاہتے ہیں کرتے اُس کے خلاف ہیں۔ یعنی جو کچھ آپ کرنا نہیں چاہتے کر گذرتے ہیں۔ صاحب! اگر آپ کو دریافتِ حال کا حق حاصل نہیں تو یہ بغیر ضمانہ عنایات کی توقع کیوں ہے؟ فائدہ! جی ضرور "جائے تنگ است مرداں بسیار" اگر آپ کی توجہ نے دستگیری کی تو آرام سے بیٹھ سکونگا!

"لیجئے!" اُس نے بیگ اُٹھاتے ہوئے کہا "آپ شوق سے تشریف رکھیں، مگر یہ شرط نہیں کہ دو گھڑی بعد آپ کہدیں کہ میرے لئے گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے پلیٹ فارم پیمائی زیادہ آرام دہ ہوگی۔ اس صورت میں پہلے سے کہے دیتا ہُوں۔ تعمیل ارشاد کی توقع نہ رکھیئے"

"آپ چشم بد دُور بہت سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ اطمینان رکھیئے مَیں اپنی التجاؤں کو بہت کم رنج ناکامی سے آلودہ ہونے دیتا ہُوں! اجازت ہو تو دروازہ بند کردُوں مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں خوشگوار فضا کی سحر آفرینیاں آپ کو چلتی گاڑی سے کُود پڑنے پر مجبور نہ کردیں"

فیضی نے گھُور کر میری طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنے خیالات میں مستغرق ہوگیا۔

— ۲ —

میرے اور فیضی صاحب کے درمیان یہ گفتگو فرنٹیر میل کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہوئی۔ اُس دن کچھ ایسی معمولی بھیڑ تھی۔ کہ ناچار مجھے فیضی صاحب کی عنایات کا طالب ہونا پڑا!

فیضی جوان تھا اور خوبصورت، مناسب قد و قامت، متناسب اعضا، لباس گو سادہ تھا مگر پھر بھی فارغ البالی کا بین ثبوت، باایں ہمہ چہرے سے اندرُونی اضطراب نمایاں تھا۔ اور افسردہ نگاہیں قلبی بےچینیوں کی مظہر تھیں مَیں اُن کی عُریاں پریشانیوں کی وجہ سے اُنہیں مظلوم تو پہلے ہی سمجھنے لگ گیا تھا۔ اور گفتگو کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچا مشکل نہ تھا کہ فیضی صاحب دلچسپ ضرور تھے اور اُن کے حالات منفعت بخش!

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں، مگر میرا تھکا ہُوا دل اُن کے حالات میں ہمدردی کی ایک خوش آئند اُمید محسوس کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے اُن سے کچھ اُنس ہو جانا لازمی تھا!

جب گاڑی گوجرانوالہ سے روانہ ہوئی تو مجھے یہ معلوم کرکے ایک گونہ مسرت ہوئی کہ میرے اور فیضی کے سوا سب مسافر جاچکے تھے مَیں نے اِس موقعہ کو غنیمت جانکر گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

"صاحب! کس جگہ تشریف لیجائیگا؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"جہاں آپ نہ پہنچ سکیں! مجھے پریشان نہ کیجئے آپ کا کیا خیال ہے؟ مَیں تو جواب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا"

"کاش آپ اتنی سی بات سے مسرور ہو سکتے، مَیں تو اپنے جذبات کی قربانی کے لئے تیار ہُوں"

...کی پیشانی خطرناک پہلو اختیار کر رہی ہے۔ کیا آپ خاموش ہو جائیے یا میں اور کوئی جگہ تلاش کروں!"

"معافی! میرا مقصد یہ ہرگز نہ تھا۔ آپ رنجیدہ کیوں ہوتے ہیں آپکی پریشانی ہمدردانہ التفات کی متمنی نظر آتی ہے۔ اور میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں"!

"ہا ہا ہا" اُس نے زور سے قہقہہ لگایا، اور پھر یکایک خاموش ہو گیا۔ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس قدر جلد پہلو نہ بدلئے۔ آپکو جگہ چاہیئے تھی سو مل گئی۔ آپکو اور کیا چاہیئے! میری پریشانی سے دلچسپ انکشافات کی توقع ہے تو بیجا۔ اگر کوشش نہ کیجئے، رائیگاں جائے گی"!

"مگر ـــــ افسوس آپنے میرے سوال کو بالکل فراموش کر دیا۔ حضرت آپ سلسلۂ گفتگو کے جاری رکھنے کے کہاں تک حامی ہیں؟"

"آپ ضدی بہت ہیں۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"شکریہ! میرا خیال ہے۔ آپکی پریشانی بے معنی نہیں ہو سکتی آپ کسی تلخ تجربہ کے نتائج سے زیر بار ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک مخلص رازدار کا ملجانا بہترین صورت اندمالِ زخم کی ہو سکتی ہے آپ میرے خلوص میں تقاتص کی گنجائش کیوں سمجھتے ہیں"؟

"آپ پر کیا منحصر ہے سبھی کا ایک سا حال ہے۔ آپ کے لطف و کرم کا ممنون ہوں مگر پس و پیش صرف اس وجہ سے ہے کہ آپ جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں یا جن حالات و واقعات کے معلوم کرنے کیلئے بیتاب ہیں۔ اُن سے واقف ہو جانے کے بعد آپ شاید مجھے اس التفات کا مستحق نہ سمجھیں"

"آپ محتاط ہیں اور یہ اچھی بات ہے! ہر کس و ناکس سے اظہارِ دردِ دل بجا ہے کہ بجا نہیں۔ مگر بجائے خدا واقعات کی خصوصیت کو نظر انداز نہ کیجئے۔ امید کہ آپ محروم نہ رکھیں گے"!

۲

فیضی نے میری طرف دیکھا، مسکرایا اور کچھ لمحہ کے گہرے سکوت کے بعد بولا "حضرت میرا نام فیضی ہے اور ایک فارغ البال شریف گھرانے کا نورِ نظر ہوں۔ ابتدائی ایام زندگی آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کس راحت و آرام سے گذرے ہونگے۔ میری زندگی کے اس دَور کا آغاز جس سے ہمیں اس وقت تعلق ہے میرے زمانۂ کالج سے ہوتا ہے۔ اگر فلسفہ خیالات، جذبات، احساسات وغیرہ کے تاثرات اور نتائج کی کیفیات میں چھان بین کا نام ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں بچپن سے ہی اس میں کافی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ مگر کالج کے زمانہ تعلیم میں یہ دلچسپی ایک بڑھے ہوئے شوق کی صورت اختیار کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں ۱۹۲۲ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر گھر واپس گیا تو یہ نظریہ کہ "ہر حقیقت وہم ہے" میرے دل پر نقش برسنگ ہو چکا تھا"

"معافی!" اُس نے یکایک رُک کر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میری گفتگو کی دلچسپیوں میں نوعیت کا اضافہ ہو رہا ہے مگر میں نے اس کا ذکر صرف اسی وجہ سے جائز سمجھا کہ میری زندگی میں ہیجان اور میری ذہنیت میں اضطراب اور بے چینی کے باعث اصلی سے آپ ناآشنا نہ رہ جائیں"!

"میرا تجربہ ہے کہ انسان اپنے خیالات میں منہمک رہنے سے کبھی اکتاتا نہیں اور نہ افسردہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اچانک بیداری کے بعد تھوڑے عرصہ کے لئے متحیر ہو جائے۔ یہی حال میرا ہوا یعنی میری شادی ہو گئی، اور دُلہن صاحبہ پیغام بیداری ثابت ہوئیں مطلب یہ کہ فلسفہ کی خشک دنیا میں حُسن و عشق کی رنگینیاں نظر آنے لگیں۔ جو کچھ عرصہ کے بعد کامیاب محبت کی خوش فہمیاں ہو گئیں مگر ـــــ آہ! اُن کی حسین نگاہیں دل میں محبت تو پیدا کر سکتی تھیں مگر اسے قائم رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں۔ . . . . ."

اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا، کھڑا ہوا، اور پھر بیٹھ گیا۔ دو چار منٹ تک کھڑکی سے باہر جھک کر خوشگوار موسم کی دلفریبیوں سے تسکینِ قلب کی تدابیر کرتا رہا۔ اور بغیر مجھے مخاطب کئے ہوئے بولا:

"اور ـــــ وہ اس طرح سے میرے نظریہ کے مطابق حسن ایک حقیقت وہمی ہے اور چونکہ حسن و عشق! حسن و محبت لازم و ملزوم ہیں، اور اپنی حیات کے قیام کے لئے ایک دوسرے کے محتاج!! ہاں ـــــ عشق نام ہے اُس مسلسل بیتابی کا، جو

کبھی ایسی شے کے حصول کے لئے ہو جسے طالب کی نگاہ حسین خیال کرتی ہو۔ مگر جب حُسن اس حالت کو قائم یا برقرار رکھنے سے عاجز ہو تو حقیقی معنوں میں وہ حسن نہیں رہتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ یاد رکھئے سر الفاظ میں حُسن کی حقیقت اُس وقت ایک وہم رہ جاتی ہے۔ حُسن صورت ہو یا سیرت، ظاہری ہو یا باطنی، یہ نظریہ دونوں پر یکساں حاوی ہے!

"میری بیوی میرے معیارِ حسن کے مطابق حسین تھی، خوش اخلاق تھی، اعلیٰ سیرت کی مالک تھی مگر وہ میری محبت کو کافی سمجھتی تھی اور میری ممنون تھی ـــــ جسے میں محبت کے لفظ کی توہین خیال کرتا ہوں۔ وہ ایک خاموش پجاری کی طرح میری پرستش میں مصروف رہتی اور سمجھتی کہ میں اُس سے محبت کرنے میں اُس پر احسان کر رہا ہوں ـــــ اور ـــــ آہ ـــــ میرے جذبات شوق سجدہ نوازی کے لئے بیتاب تڑپ کر رہ جاتے۔ میری تمنا ہوتی کہ وہ محبت محبت پکارے، حتیٰ کہ میں سراپا محبت ہو جاؤں!

مگر وہاں تو حسن محبت کا منت گزار تھا۔ اُس عفیفہ کی جو نگاہ اُٹھتی سجدۂ شکر بجا لاتی۔ مرد عموماً ناشکر گزار ہوتے ہیں، مگر مجھے اُن میں خاص طور پر امتیاز حاصل ہے، میں نے ایک غلطی کی!"

۴

فیضی، سنگدل فلاسفر فیضی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ اور بڑی دیر تک کسی خاص خیال میں مستغرق رہا۔ یکایک چونکا اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا "معاف فرمائیے میں آپکو پریشان کر رہا ہوں۔ مگر خود کردہ را علاجے نیست، گھر کا آنا جانا آہستہ آہستہ کم کرتے کرتے بالکل موقوف کر دیا، اور اپنی مظلومیت کی دادرسی کے لئے کسی حسین کا متلاشی ہوا ـــــ آپ مسکراتے جائیے، میں مانتا ہوں کہ کسی صحیح العقل آدمی کا یہ کام نہ تھا۔ اور کیا عجب جو ان دنوں میں ـــــ واقعی کچھ دیوانہ سا ہو گیا ہوں!

۵

"مس نرگس ایک اعلیٰ پایہ کی تھیٹریکل کمپنی کی مایہ ناز ایکٹرس تھی، وہ حسین تھی اور اپنے حسن سحر سوز کی طاقتوں سے آگاہ، میرا اُنکا تعارف ایک رنگین مزاج دوست کی وساطت سے ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تعارف ہی میری زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوگا!

"نرگس صاحبہ سے راہ و رسم بڑھانے میں کوئی امر مانع نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے تعلقات بڑھتے بڑھتے حسن و عشق کی نہایت دلچسپ داستان کی صورت اختیار کر گئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ امر میری مسرت کا باعث تھا۔ کہ نرگس سے جس قدر زیادہ فریفتگی اور محبت کا اظہار کیا جاتا وہ اُس سے زیادہ کی طالب ہوتی۔ وہ چاہتی تھی کہ میری حیات کی تمام تر کیفیتیں اُس کے لئے ہوں اور صرف اس کے لئے۔ میں نے ہمیشہ اُس کے جذبات کی قدر کی اور اُس کی تمناؤں کو لبیک کہا!"

"اس مختصر زندگی کا دور جس طرح اچانک شروع ہوا تھا اُسی طرح یکلخت ختم ہو گیا۔ سعید میرا نہایت عزیز دوست ہے وہ ان ایام میں میرے پاس تھا۔ سعید میرے تمام حالات سے واقف تھا۔ اس نے مجھے بارہا کہا اور سمجھایا کہ یہ طرز زندگی گو اچھوتی تمہیں معلوم نہیں ہو سکتا، ہولناک انجام رکھتا ہے۔ مگر میں نے ہمیشہ سُنی اَن سُنی ایک کر دی! مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس نے ایک دفعہ نرگس کو لکھا بھی تھا۔ مجھے خط کا سارا مضمون یاد نہیں، مگر ایک فقرہ جو میرے لئے اب تک بھی ویسا ہی تعجب انگیز ہے، جیسا اُس وقت تھا، دماغ میں موجود ہے۔

"میں فیضی کی زندگی کو اپنے لئے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں اُسے برباد اور مجھے ناشاد نہ کیجئے!" ایک روز صبح میں اُن سے حسب معمول ملنے کے لئے گیا، گھر پر نہ تھے۔ مگر میری اُن کی چونکہ بہت بے تکلفی تھی۔ میں اُن کے کمرے میں بیٹھ گیا اور اُن کا انتظار کرنے لگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے وقت گذارنے کے لئے کسی شغل کا متلاشی ہونا پڑا۔ بیکار بیٹھنے سے انتظار کوفت بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ انسان ایک شے کی جستجو میں سینکڑوں غیر متعلقہ اشیاء سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ میری متجسس نگاہیں میز پر دھرے ہوئے کاغذ کے انبار میں ایک خط پر پڑیں اور جم کر رہ گئیں۔ میں نے نرگس کے دستخط پہچان کر رکتے ہوئے،

جھکتے ہوئے خط اٹھالیا۔ کہ اتنے میں سعید یہ کہتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے "شوق سے پڑھیئے، یہ آپ ہی سے متعلق ہے"! لکھا تھا:-

"سعید صاحب!

آپ کو یاد ہوگا آپ نے ایک دفعہ لکھا تھا فیضی کو برباد کرو مجھے تماشا دکھاؤ۔ جواب میں میرا شکر ادا اپنے فیضی کو واپس لیجئے۔ مجھے نہ کبھی اُن سے محبت تھی اور نہ ہے، وہ فریب کھا رہے تھے اور مجھے فریب دینے میں لطف آتا تھا۔ اگر وہ خود معلوم نہ کر سکے تو یہ ان کی غلطی ہے۔ اُن سے کہہ دیجئیگا "عورت کی اصطلاح میں محبت کا نام پرستش ہے"!

نرگس

باور فرمائیے خط پڑھکر میری عجیب حالت ہوئی۔ میری غلط سمجھی ہوئی مسرتوں کی حقیقت باطلہ کا انکشاف میرے لئے روح فرسا ضرور تھا، مگر ——— اس سے بچ نکلنے کے بعد مجھے سوائے اپنی بیوی کی محبت کے اور سب قسم کی محبت وہم نظر آئی۔

ان ایام میں میری بیوی راولپنڈی اپنے والدین کے پاس ہے۔ میں اب وہاں ہی جا رہا ہوں، مجھے اُن سے معافی مانگنی ہے"

بخشی غضنفر علی بی اے

گلزار خلیل

از جناب خلیل صاحب بیگوسرائی

ہے ابھی تو ابتدائے دردِ دل ۔ دیکھئے کیا کیا دکھلائے دردِ دل

وہ جو سنتے ماجرائے دردِ دل! ۔ دل مرا ہوتا فدائے دردِ دل!

ہے بلائے جاں، بلائے دردِ دل ۔ ہو نہ کوئی مبتلائے دردِ دل!

کچھ نہیں دل میں سوائے دردِ دل ۔ ہے یہ دل شاید سرائے دردِ دل

ہاتھ بھی دل پر کوئی رکھتا نہیں ۔ کس طرح پھر دل سے جائے دردِ دل

دردمندوں کا مداوا فرض ہے ۔ کر مسیحا کچھ دوائے دردِ دل!

اُٹھ گئے آخر مرے بالیں سے وہ ۔ سنتے سنتے ماجرائے دردِ دل

چارہ گر مجھکو خدا پر چھوڑ دیجئے! ۔ ہو نہیں سکتی دوائے دردِ دل

نالے سن سنکر مرے کہتے ہیں وہ ۔ کوئی ہوگا مبتلائے دردِ دل،

یہ اگر جائے بھی تو جائے کہاں ۔ خانۂ دل ہے برائے دردِ دل

ایک عیسیٰ اور لاکھوں دردمند! ۔ دیں وہ کہیں کس کو دوائے دردِ دل!

رُخ کیا پھر دل نے کوئے زلف کا ۔ سر نہ ہو جائے بلائے دردِ دل،

دردِ دل کب دیکھنے کی چیز ہے ۔ کیا انہیں کوئی دکھائے دردِ دل

دل سے سودا زلف کا جاتا نہیں ۔ دور ہو پھر کیا بلائے دردِ دل

کیا فضا تھی کوچۂ دلدار کی، ۔ لگ گئی دلکو ہوائے دردِ دل!

بڑھتے بڑھتے دردِ دل خود گھٹ گیا ۔ دردِ دل ٹھہرا دوائے دردِ دل

کچھ نہیں کھلتے کسی سے بھی خلیل ۔ دل ہی دل میں ہیں چھپائے دردِ دل

جب مشیرِ قانونی کو علم ہو کہ اس کا مؤکل گنہگار ہے

ازجناب محمد منظور الٰہی صاحب،

کیا ایک وکیل کو اس حالت میں بھی مقدمے کی پیروی جاری رکھنی چاہیئے؟ جب کہ اس کا موکل اس کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کرچکا ہو۔ یہ سوال اسّی سال سے زیادہ عرصے تک زیر بحث رہا ہے۔ آج سے ستّرہ ہی سال پہلے کا ذکر ہے کہ یہی سوال شنگھائی کی بار کونسل نے انگلستان کے وکلاء کی جماعت کے سامنے قطعی فیصلہ دیئے جانے کے لئے پیش کیا۔ اس وقت جو رائے متفقہ طور پر قائم کی گئی یہ تھی کہ اگر اقبال سماعت مقدمہ سے پہلے کیا گیا ہے تو وکیل کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ملزم کی صفائی کا ذمہ اٹھائے۔

بلاشبہ اس مسئلہ کو تاریخی حیثیت دینے والا کرویزیر کا مقدمہ تھا جو لارڈ ولیم رسّل کے قتل کے لئے مجرم قرار دیا جاکر تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ اس وقوعہ سے کچھ دیر کے لئے کرویزیر جیسے معمولی طبقہ کے آدمی کو بھی ویسی ہی شہرت حاصل ہوگئی جو لارڈ رسل جیسے امیر کو حاصل تھی۔ ممکن ہے ایسا نہ بھی ہوتا کیونکہ لارڈ رسّل امراء کی جماعت کا رکن ہونے اور ملکہ وکٹوریہ کی دوستی کی وجہ سے مشہور ضرور تھا لیکن ہر دلعزیز نہ تھا۔ تاہم ایک ضعیف العمر کا نہتہ مارا جانا اور پھر اوّل اوّل، جاسوسوں کا قاتل کا سراغ نہ پانا ایسی باتیں تھیں جن سے پبلک کے نفرت اور غصہ کی انتہا نہ رہی۔ چار طرف سے انتقام کا شور اٹھا اور ہر شخص قاتل کے لہو کا پیاسا نظر آنے لگا۔

لارڈ ولیم رسّل ہمانار فورک سٹریس پارک لین لنڈن میں مقیم تھا۔ اس کی اپنی ذات کے علاوہ وہاں صرف خدمتگاروں کی وہ جماعت رہتی تھی جن کا ہر وقت کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے خود پسند اور غصہ ور آقا کے ہر ممکن وہم کو پورا کرتے رہیں اس لئے یہ ضروری تھا کہ بجبن کرویزیر ایک فرانسیسی نژاد سوس خدمتگار باقی تمام خدمتگاروں سے زیادہ مورد عتاب ہو۔ کیونکہ وہی ایک شخص تھا جس کا اپنے آقا سے پیہم واسطہ پڑتا۔ اس کرویزیر کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ جس قدر ہو سکے انگلستان سے روپیہ جمع کرکے سوئٹزرلینڈ اپنے وطن کو واپس چلا جائے۔ یہ اپنے حلقہ احباب میں ایک نہایت مسکین، نرم دل اور بےضرر آدمی سمجھا جاتا تھا اور بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ اس پر قتل انسانی جیسے سنگین جرم کا شک بھی کیا جائے کرویزیر کا اپنا بیان ہے کہ جب تک اس نے ہیریسن انز ورتھ کی کتاب جیک شپرڈ کا مطالعہ نہ کیا۔ اس کو اپنے آقا کی ہر وقت کی ملامت کا کبھی احساس نہ ہوا، اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اس پر یہ عیاں ہوگیا کہ ایک آدمی اس کتاب کے ہیرو کی طرح مجرم ہوتے ہوئے بھی نام پیدا کرسکتا ہے اور یہی کتاب اس کے لئے محرک قتل ہوئی۔ بعد میں ہیریسن اینز ورتھ کتاب کے مصنف نے کرویزیر کے بیان کی تردید میں کئی آرٹیکل ٹائمز میں شایع کروائے اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کی کتاب سے ایسے بُرے نتائج نہیں اخذ کئے جاسکتے لیکن جو شہادت سردست موجود ہے وہ اس کے خلاف ہے۔

کرویزیر نے جس وقت اپنے مالک کو قتل کیا رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی اس نے اس قتل کے ارتکاب میں نہایت عیاری سے کام لیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس پر شک کئے جانے کا قوی احتمال ہوسکتا ہے اور اگر اس کے کپڑے پر خون کے دھبے پائے گئے تو اس کو فی الفور گرفتار کرلیا جائیگا وہ لارڈ رسل کے کمرے میں بالکل ننگا ہوکر داخل ہوا اور اپنے مالک کی گردن علیحدہ کردی۔ قتل کرنے کے بعد باہر آکر چاقو دھویا اور اسے اپنی اصل جگہ پر رکھ کر اپنے ہاتھ وغیرہ صاف کئے ان سب کاموں سے فراغت پاکر اپنے کمرہ میں گیا جہاں وہ گہری نیند سوگیا، لیکن اس چالاکی اور احتیاط کے باوجود اس کی اس عجیب وغریب نقل وحرکت کو ایک آدمی دیکھ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک نامی جرنیل اس رات لارڈ رسّل کے بالمقابل مکان میں موجود تھا اور اتفاق پر اتفاق یہ کہ ٹھیک اس وقت جب کہ کرویزیر قتل کرنے کی غرض سے لارڈ رسّل کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا وہ

جز نیا کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ چونکہ لارڈ رسل کے کمرے میں تمام رات روشنی رہتی تھی اس لئے جب کروییزیر کا سایہ سامنے والی کھڑکی کے پردے پر پڑا تو ایک لازمی امر تھا کہ رات کے ایسے وقت میں ایک ننگے آدمی کو کمرے میں چلتے پھرتے دیکھ کر اُس کی توجہ اس طرف مبذول ہوتی۔ کچھ دیر تو وہ اس منظر سے ششدر رہا لیکن چند ہی ساعت میں کروییزیر کو پولیس کی حراست میں دیکھ کر وہ سارے معاملہ کو بھانپ گیا۔ اب یہ اس کے اختیار میں تھا کہ کروییزیر کا جرم ثابت کردے لیکن اس کے لئے رکاوٹ یہ تھی کہ اگر وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تو اسے یہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ اُس مکان میں اس کی موجودگی کا کیا سبب تھا اور اگر وہ یہ بتاتا ہے تو ایک معزز خاتون کی عزت معرض خطر میں پڑتی ہے اُسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ مجرم پولیس کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید وہ فرار ہو جائے یا عدم ثبوت میں اپنے کیفر دار کو نہ پہونچے۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ آیا وہ ایک عورت کے راز کو جس نے اس پر اعتماد کیا تھا افشا کر کے اس کو تمام عمر کے لئے تباہ کردے یا ایک بزدل قاتل کے سزا سے بچنے میں مدد ہو۔ آخر اُس نے یہی طے کیا کہ آپ کو چھپائے رکھے یقیناً اہل نظر اس کے اس فیصلہ پر اظہار مذمت نہ کرینگے۔

عوام کی رائے میں کروییزیر بالکل بے گناہ تھا اور ان کے خیال میں اُسے محض اس لئے گرفتار کیا گیا تھا کہ پولیس کسی ایک کے سر پر الزام تھوپ کر اپنی جاسوسی قابلیت دکھانا چاہتی تھی اس میں کلام نہیں کہ کروییزیر کے خلاف شہادت نہایت نامکمل تھی۔ جب اولڈ بیلی کورٹ میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی بڑے بڑے لارڈ لیڈیاں۔ مشہور و معروف مصنف، نامی ایکٹر موجود تھے۔ عوام کا اشتیاق اس حد تک تھا کہ انھوں نے فی نشست ایک پاونڈ ادا کیا تھا۔ ملزم کی طرف سے انگلستان کا فصیح ترین بیرسٹر چارلس فلپ تھا۔ اس نے استغاثہ کے دو اہم گواہوں پر اس قابلیت سے جرح کی کہ معلوم ہونے لگا قیدی صاف بری ہو جائیگا۔ قرائن کی شہادت ضرور ثابت کرتی تھی کہ مجرم بجز کروییزیر اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ یہ تمام کی تمام اس بات پر مبنی تھی کہ شب وقوعہ کروییزیر اور لارڈ رسل کے سوا مکان میں تیسرا آدمی موجود نہ تھا اس لئے صرف اس بنا پر کروییزیر کو سزائے موت دی جانی کسی کے خیال میں مناسب نہ تھی۔ دو باتیں کروییزیر کے حق میں تھیں۔ ایک آلہ قتل کا برآمد نہ ہونا دوسرے اس کے کپڑوں پر خون کے نشانات کی عدم موجودگی۔ چونکہ عدالت کے سامنے موخر الذکر امر کی کوئی وجہ پیش نہ کی گئی اس لئے یہ بات ملزم کی صفائی کو اور زیادہ تقویت پہونچاتی تھی۔

اس رات ملزم کے وکیل نے اپنی تقریر مکمل کی اس میں جابجا اُس نے اپنے موکل کی بیگناہی کے متعلق اظہار یقین کیا تھا کئی بار خدا سے کروییزیر کو پھانسی سے بچانے کے لئے طالب ہوا تھا۔

اس دوران میں کروییزیر اپنی قید کی تنہائی میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب میڈم پولین عدالت میں چاندی کے برتنوں کا پارسل پیش کر کے یہ گواہی دیگی کہ یہ وہی برتن ہیں جو کروییزیر نے اپنے آقا کے گھر سے چرائے تھے تو اگر وہ قاتل نہیں بن ہو سکا چوری کا مجرم تو ضرور قرار دیا جائیگا۔ اس رات وہ بالکل نہ سویا۔ اور کسی نامعلوم وجہ سے اس نے اپنی برئیت کی راہ میں خود رکاوٹ پیش کی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ فلپ یعنی وکیل ملزم کے اپنے ہی الفاظ سے خوب ظاہر ہوگا۔ جس نے نو سال تک عوام کے دلسوز اعتراضات کا نشانہ بنا رہنے کے بعد مہر سکوت توڑی اور اپنے اس طرز عمل کی جوابدہی کی جس پر وہ اپنے موکل کے اقبال کے بعد کاربند رہا۔

فلپ بیان کرتا ہے کہ مقدمہ کی سماعت کا دوسرا دن تھا۔ جج کے آنے سے ذرا پہلے کروییزیر نے ڈاک (قیدیوں کا جنگلہ) کے اندر سے اپنے وکیل کو ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اور میرا دوست کلارکسن اسی وقت اس کے پاس گئے۔ ابھی تک مجھے کامل یقین تھا کہ وہ بیگناہ ہے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگا: "صاحبو میں ہی قاتل ہوں" اس کے اتنا کہنے پر کچھ دیر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھ سے طاقت گویائی چھین لی گئی ہے آخر جب میری زبان نے مجھے بولنے کی اجازت دی میں نے اس سے پوچھا کہ

"کیا تم عدالت میں اقبال کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "اس کے برعکس میں آپ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ میرے بچاؤ کے لئے انتہائی کوشش کرینگے" ہم دونوں اپنی جگہوں پر واپس آگئے میری اس وقت کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے شاید میرے کسی ہم پیشہ پر اپنی قانونی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہ آیا ہو۔

اپنی آخری تقریر کرنے سے پیشتر فلپ نے بیرن پارک سے ملاقات کی جو لارڈ چیف جسٹس کے ساتھ مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا اور اس نامور جج کے سامنے یہی پریشان کن مسئلہ پیش کیا جو ڈاک میں کھڑے ہوئے قیدی نے اقبال جرم کر کے پیش کر دیا تھا۔

"کیا اب بھی مجرم اس بات کا متمنی ہے کہ آپ اس کی طرف سے پیروی کریں"

جج نے دریافت کیا اور فلپ کے اثبات میں جواب دینے پر جج نے یہی رائے ظاہر کی کہ فلپ کیلئے لازم نہیں کہ وہ مقدمہ کی پیروی سے پہلو تہی کرے۔"

سرہیری پولینڈ نے جو کروزیر کے تمام وکلاء سے واقف تھا بعد میں بتلایا کہ بیرن پارک کو اس اقبال کے متعلق سن کر دوران سماعت میں بہت دماغی کوفت ہوئی اور لارڈ چیف جسٹس کو اتنی تکلیف سے بچانے کے لئے انہیں اس نے مجرم کے اقبال سے اس وقت آگاہ کیا جب حکم سنایا جا چکا تھا۔

بیرن پارک کا مشورہ حاصل کرنے کے بعد فلپ نے اپنی تقریر شروع کی شاید ہی کوئی ایسی تقریر ہو جس کے متعلق اتنی غلط فہمی پیدا ہوئی اور جو اس بُرے طریق سے اخبار والوں کے ذریعہ عوام تک پہونچائی گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخباری نمائندے جو اس تقریر کے وقت حاضر تھے اس پر مُصر تھے کہ فلپ نے اپنے موکل کی بیگناہی کا اظہار ایسے یقینی طور پر کیا تھا گویا اس کا ایمان ہے کہ ملزم بیگناہ ہے اور آپ حیران ہونگے کہ باوجود فلپ کے انکار کے یہ خیال اب تک موجود ہے کہ لارڈ ولیم کے قاتل کی وکالت کرنے سے فلپ اپنے پیشے کی رسوائی کا باعث ہوا۔

فلپ نے جو جواب اپنے معترضین کو دیا وہ نہایت دلچسپ ہے وہ لکھتا ہے کہ سماعت ہفتہ کی شام کو ختم ہوئی اور اتوار کو مجھے وہ تقریر دکھائی گئی جو اخبار والوں نے میری طرف منسوب کی تھی۔ میں اس اخبار کو پیر والے دن عدالت میں لے گیا اور وہاں ججان کو یہی رپورٹ بہ آواز بلند سنائی پھر ان سے مخاطب ہو کر میں نے دریافت کیا۔ "کیا آپ تبلا سکتے ہیں کہ آیا میں نے یہ جملے اپنی تقریر میں کہے تھے ؟"

"نہیں فلپ" لارڈ چیف جسٹس نے جواب دیا "تم نے ہرگز یہ نہیں کہا، اور جب کبھی تمہیں اس امر پر شہادت کی ضرورت ہو تم مجھے بُلا سکتے ہو۔"

"اور میں !" بیرن پارک نے کہا "ایک خاص وجہ سے جس سے لارڈ چیف جسٹس آگاہ نہ تھے تمہیں بڑے غور سے دیکھتا رہا اور تمہاری تقریر کے دوران میں انہیں یعنی لارڈ چیف جسٹس کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ دیکھئے فلپ کس خوبی سے اپنی رائے سے گریز کر رہا ہے اور آنجناب نے میرے ساتھ اتفاق کیا تھا۔"

گروزیر اپنی قید کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا اس قدر مرکز توجہ بنا رہا کہ اس صدی میں کسی قاتل کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کے متعلق تقریریں ہوئیں۔ مسٹر برج (اس وقت کا ایک مشہور ریفارمر) نے اپنی تقریر میں کروزیر کے آخری چند ساعتیں گذارنے کا نقشہ پیش کیا۔ مسٹر برج نے کہا اتوار کو ۱۰ بجے صبح سے پہلے قیدخانے کے معبد کی تمام گذرگاہیں آدمیوں سے کھچا کھچ پُر تھیں جو خاص طور پر پادری صاحب کا آخری وعظ سننے اور مجرم کو دیکھنے کے لئے آئے تھے ان میں کئی لارڈ تھے۔ کتنے ہی پارلیمنٹ کے ممبر اور چند ایک لیڈیاں بھی تھیں۔ جس دن کروزیر کو پھانسی دی جانی تھی کئی عالی مرتبہ اشخاص کو قیدخانہ میں سات بجے صبح سے پہلے داخل کر لیا گیا تھا۔ ان میں بہت سے غیر ملکی شہزادے اور کاؤنٹ بھی شامل تھے جنہیں یہ دیکھنا مقصود تھا کہ انگلستان میں نامی مجرموں کو پھانسی کس طرح دی جاتی ہے۔

اس موقعہ پر چارلس کین مشہور ایکٹر بھی جو اپنے پیشہ کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ جب کروزیر کو تختۂ دار کی طرف لیجایا جا رہا تھا مسٹر شیرف ایوانز نے اپنی جیب سے خط نکال کر اس کے سامنے دستخطوں کے لئے پیش کیا اور مسٹر شیرف ولٹن پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کروزیر لارڈ ولیم رسل کا قاتل نہ ہوتا تو شاید اس کے وکیل کے طرز عمل پر اتنا شور مخالفانہ نہ اٹھتا اور کسی حد تک یہ درست بھی ہے کیونکہ اس کے چند ہی سال بعد ایک اور ایسا ہی مقدمہ پیش ہوا جس کی تمام باتیں کروزیر کے مقدمہ سے ملتی تھیں۔ لیکن اس دفعہ کسی قسم کا چرچا نہ ہوا حالانکہ مرفیلڈ کے قتل کے واقعہ نے تمام دنیا میں آگ سی لگا دی تھی اور اس کے باعث وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کی نذیر جرائم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

۱۲ مئی ۱۸۴۲ء کو جیمز ریتھ ایک ۷۷ سال بڈھا۔ اپنی اس کی ۶۷ سالہ بیوی اور ایلس ان کی ۲۰ سالہ نوجوان خادمہ اپنے مکان واقعہ مرفیلڈ نزد ہیڈر فیلڈ میں مُردہ پائے گئے۔ مقتول خوش مزاج اور نیک طبیعت تھے اور قتل کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ جب مائیکل میکنب ایک بدچلن اور پیٹرک ریڈ ایک آوارہ گرد اس شبہ میں گرفتار ہوئے اور یہ پتہ چلا کہ یہ دونوں آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں تو مقامی برانگیختگی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے باشندے آئرلینڈ پر دھاوا بول دینے پر تیار ہو گئے۔ یہ آگ افسران وقت کی کوشش سے جلد فرو ہو گئی اور اب تمام کی نظریں اس طرف لگ گئیں کہ پولیس قاتلوں کو سزا دلانے کی کیا تدبیر کرتی ہے۔

استغاثہ کی فراہم کردہ شہادت بہت کمزور تھی اور اس کے خلاف ملزموں کا عذر یہ تھا کہ وہ بروقت واردات موقعہ پر موجود نہ تھے اس لئے استغاثہ نے اس خیال سے کہ مبادا قاتل سزا پانے سے بچ نکلے یہ مناسب جانا کہ مائیکل میکنب کو سلطانی گواہ بنالیں اور صرف پیٹرک ریڈ کو عدالت میں پیش کریں جب یارک کی عدالت میں مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزم کی طرف سے دو شہرہ آفاق بیرسٹر تھے جن میں سے ایک کا نام سار جنٹ ولکنز تھا اور دوسرے کا نام ڈیگبی سیمور۔ ان دنوں ولکنز پورے عروج پر تھا اس کی جرح کرنے کی قابلیت نے

سیمور کی فصاحت نے ساتھ مل کر کسی ملزم کی صفائی میں ایسے دو قابل وکیلوں کا ملنا محال کر دیا تھا۔

پیٹرک ریڈ کے خلاف جیمز ریتھ کے قتل کے الزام میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ وہی میکنب تھا جو خود کئی دفعہ اسی جرم میں مجسٹریٹوں کے سامنے پیش ہو چکا تھا۔ میکنب نے حلفیہ بیان کیا کہ وہ ایک پھیری والے کی حیثیت میں مسٹر ریتھ مقتول کے مکان پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اسے اندر سے جواب ملا کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ جب دروازہ کھلا ایک آدمی کا چہرہ باہر نکلا اور مجھے سامنے والی دیوار پر خون کے چھینٹے دکھائی دیئے۔ سفید دیوار، خون کے چھینٹے آدمی کے چہرے ان سب نے مجھے ترغیب دلائی کہ میں اردگرد بھی نظر ڈالوں۔ ایسا کرنے پر مجھے فرش بھی خون سے لت پت نظر آیا۔ اس آدمی نے میری نیچی نظر دیکھ کر دروازہ فوراً بند کر لیا —— وہ آدمی پیٹرک ریڈ تھا۔"

سارجنٹ ولکنز نے اس گواہ پر ایسی موثر جرح کی کہ جیوری کی رائے ملزم کے حق میں ہو گئی لیکن رائے دینے سے قبل جیوری نے جج سے دریافت کیا کہ اگر ریڈ اس مقدمہ میں بے گناہ ثابت ہو تو کیا مزید شہادت بہم پہنچنے پر اس کے خلاف دوسری دو عورتوں کے (یعنی ایلس خادمہ اور اینی مسز ریتھ کی بیوی) قتل کا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اس پر جج نے جواب دیا کہ وہ مقدمہ حاضرہ کے دوران میں اس مسئلہ کو زیر غور نہیں لا سکتے۔ فی الحال ان کا فرض صرف اتنا ہے کہ شہادت پیش کردہ پر اپنی رائے دیں۔

جب جج یہ بات جیوری کے ذہن نشین کرا چکا کہ انھیں صرف اس امر پر رائے دینی ہے کہ جیمز ریتھ کا قاتل کون ہے تو فورمین نے اٹھ کر اعلان کیا کہ وہ سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ملزم بیگناہ ہے لیکن ریڈ کو حراست ہی میں رکھا گیا، اور کچھ دنوں بعد میکنب دوبارہ گرفتار ہوا اور اس خبر نے کہ یہ دونوں آدمی مسز ریتھ اور ایلس کے قتل کے الزام میں سپرد عدالت کئے جائیں گے ہر طرف سنسنی پھیلا دی جرائم کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سلطانی گواہ (یعنی اس مقدمہ میں میکنب) کو اسی جرم کے لئے جوابدہی کرنی تھی جس کی تحقیقات میں خود اس نے مدد دی تھی پس کوئی تعجب نہیں کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے آئے اور میلوں تک اس کا چرچا تھا۔ ہجوم اس قدر تھا کہ وکلا کمرہ عدالت میں آسانی سے مل پھر بھی نہ سکتے تھے اس مرتبہ ریڈ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کرنے والا اکیلا ڈگبی سیمور تھا سارجنٹ ولکنز کی خدمات حاصل نہ کی گئی تھیں میکنب کا کوئی وکیل نہ تھا اس نے اپنے آپ کو جیوری کے رحم پر چھوڑ دیا تھا۔

ہر آدمی یہاں تک کہ جیوری اور جج بھی اسی خیال میں تھے کہ انکشاف حقیقت مشکل ہی نہیں تقریباً محال ہے۔ لیکن اسی کمرے میں ایک شخص تھا جسے یہ علم تھا کہ پیٹرک ریڈ فی الواقع گنہگار ہے۔ وہ آدمی مسٹر ڈیل تھا جو یارک میں سالسٹر کا کام کرتا تھا اس کے سامنے ریڈ مقدمہ کی سماعت سے قبل جرم سے اقبالی ہو چکا تھا۔ ڈیل نے اس اقبال سے ڈگبی سیمور کو مطلع کیا لیکن سیمور نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی اور اس میں کسی طرح فرق نہ آنے دیا۔ آخر میں دونوں ملزم مجرم قرار دیئے گئے اور ان کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی۔ حکم سنائے جانے کے بعد ریڈ نے بھی کروزیر کی طرح اپنے جرم کا عام اقبال کیا اور ان آدمیوں کی ضمیر کو تسکین دلائی جو اس کے جرم سے آگاہ تھے۔ لیکن ریڈ اور اس کے ستم رسیدہ گمنام شخصیتیں تھیں اس لئے جب یارک کے سالسٹر نے ریڈ کا وہ اقبال شائع کیا جو اس کے روبرو کیا گیا تھا تو کسی نے اس بحث کا اعادہ نہ کیا جو کروزیر کے وقت میں شروع ہوئی تھی نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ ڈگبی سیمور اور ڈیل اقبال سے اطلاع پاتے ہی مقدمہ کی پیروی سے کیوں نہ دست بردار ہو گئے۔ نہ ہی ریڈ کے وکیل ڈگبی سیمور پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے مجرم کے اقبال کے بعد مقدمہ کی پیروی کرنے سے عدالت کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ڈگبی سیمور کو وہ جواب دہی بھی نہ کرنی پڑی جس پر فلپ (کروزیر کا وکیل) مجبور کیا گیا تھا۔ پبلک صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ جس صورت میں سارا الزام ریڈ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا اس کے ساتھی میکنب کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائیگا؟ امید یہ تھی کہ میکنب کی جرم بخشی ہو جائیگی لیکن سیکرٹری آف اسٹیٹ نے اس کے ساتھ اتنی ہی رعایت کی کہ سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا ڈگبی سیمور کو بعد جب یاد دلایا گیا کہ جج نے جیوری کو مخاطب کرتے وقت کئی باتیں ملزمان کے حق میں کہی تھیں اور اگر وہ نہ دیتا تو ملزمان بڑی آسانی سے بری ہو سکتے تھے تو اس کے جواب میں اس نامی بیرسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے کے لئے تیار نہ تھا جو انصاف کی سدراہ ہوتی، تاہم جب قاتل کو تختہ دار پر چڑھایا گیا وہ چند آدمی جو اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے تھے جرات نہ کر سکے کہ دوبارہ کروزیر والی بحث کو چھیڑیں حالانکہ اس مقدمے میں پیٹرک ریڈ کے جرم کی اہمیت کروزیر کے جرم سے کہیں زیادہ تھی اور قاتل کا سزا پانا از بس ضروری تھا۔

بہت کم چوٹی کے فوجداری وکیل ایسے ہونگے جنھیں اپنی قانونی زندگی میں ایک نہ ایک وقت اس مندرجہ بالا مسئلہ سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو یعنی کیا ان کے

مدعا علیہ ملزم کا اقبال ان کے پیروی کرنے میں مانع ہے۔ لارڈ رسل آف کلوون نے جب کہ ابھی وہ سر چارلس رسل ہی تھا ایک دفعہ بڑے سنسنی خیز ازالہ حیثیت کے مقدمے کی پیروی اسی وقت ترک کر دی جس دم اس کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی موکلہ حقیقت میں اس چوری کی مرتکب ہوئی تھی جو بنائے دعویٰ تھی۔

اس مقدمے میں مدعی ایک نوجوان اور نہایت خوبصورت لڑکی تھی جس کی امیرانہ طرز معاشرت کے لئے اس کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ قصہ یہ تھا کہ یہی لڑکی ایک مرتبہ کسی دعوت پر مدعو کی گئی اور جس گھر میں دعوت تھی اس گھر سے بہت قیمتی زیورات ایک ہفتے کے اندر اندر غائب ہو گئے۔ اس وقوعہ کی خبر جلد پھیل گئی۔ ہوتے ہوتے اس لڑکی کو بھی اطلاع ہو گئی کہ اس کے میزبانوں نے صریح طور پر اس پر چوری کا الزام لگایا ہے چونکہ یہ لڑکی ایک فوجی افسر کے ساتھ منسوب تھی جس کا اپنا چال چلن بے داغ تھا اس لئے ضروری تھا کہ لڑکی سوسائٹی میں اپنی شہرت پر دھبہ نہ آنے دے چنانچہ اس نے رسل اور دوسرے دو بیرسٹروں کی خدمات حاصل کیں اور ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا۔ رسل کی افتتاحی تقریر بہت پر جوش تھی اور اپنے معمول کے مطابق اس نے گواہوں پر بھی نہایت دقیق جرح کی لیکن بعد ازیں جب اس نے سنا کہ اس کی موکلہ نے دراصل زیورات چرا کر پیکیڈلی میں ایک صراف کے ہاتھ بیچے ہیں اور وہ بنک نوٹ جو اس نے قیمت میں وصول کئے تھے دستیاب ہو چکے ہیں تو انہوں نے لڑکی کو بلا کر اس سے ان امور کا جواب مانگا جب وہ جواب دینے سے قاصر رہی تو رسل اور دوسرے دونوں بیرسٹروں نے مقدمہ کی آئندہ پیروی سے انکار کر دیا۔

لارڈ رسل کے رویہ پر بھی نکتہ چینی ہوئی۔ اس کے معترضین کہتے تھے کہ اس کا فرض تھا کہ اس بدقسمت لڑکی کا ساتھ نہ چھوڑتا لیکن اس نے بحث میں پڑنا قبول نہ کیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اس کی موکلہ نے اسے دھوکے میں رکھا۔ گو رسل کی پیروی ترک کر دینے سے لڑکی کو خاص طور پر کوئی نقصان نہ پہونچا کیونکہ لڑکی کا مقدمہ کو ہار جانا یقینی تھا لیکن رسل کے اس فیصلہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا پر یہ ظاہر کر دے کہ فلپ کا اپنے موکل کے جرم سے آگاہ ہونے کے بعد بھی پیروی کرتے رہنا محض غلط تھا اور لارڈ رسل کی رائے ہر صورت میں قابل احترام ہے۔

مندرجہ بالا تمام نظریئے مد نظر رکھتے ہوئے بھی بہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مشیر قانونی کا فرض ہے کہ اپنے موکل کے بچاؤ کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ قتل کے مقدموں میں اقبال جھوٹے ثابت ہوئے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ملزم کا اپنا بیان ہر صورت درست ہو، وکیل کو لازم ہے کہ شل پر کی شہادت کو پیش نظر رکھے اور جہاں تک ہو سکے اس شہادت کو اپنے موکل کے حق میں تعبیر کرے اس کے برعکس وکیل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نہایت متانت سے بحث کرے تھیٹر والوں کی طرح سے ایکٹ کرنا شروع نہ کر دے اور نہ ہی بار بار اپنے موکل کی بیگناہی ثابت کرنے کے لئے خدا کو شاہد بناتا پھرے۔ جج ایسے طرز عمل کو بہت نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک نامی جج نے وکیل کی ایسی حرکات دیکھ کر جیوری سے کہا تھا کہ صاحبو! وکیل کہتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے اور میرے یقین میں ایسا ہوا ہوگا۔ وکیل کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے خیال یا اپنے یقین کو ظاہر کرے لیکن چونکہ اس نے آپ کے سامنے اپنا یقین پیش کیا ہے میں بھی اپنا یقین پیش کرتا ہوں کہ اگر آپ نے اس کے یقین کو باور کر لیا اور اس کے موکل کو بری کر دیا گیا تو اس عدالت کے کمرے میں وہ پہلا آدمی ہوگا جو ہم سب کا مذاق اڑائیگا۔

آخر میں یہاں چند ایک ان عالی دماغوں کی آرا درج کی جاتی ہیں جن کو خطوط کے ذریعہ استدعا کی گئی تھی کہ اس مسئلہ پر اپنی رائے دیں جس نے کرودیزیر کی وجہ سے اہمیت پکڑی تھی یقیناً یہ دلچسپی کا موجب ہونگی کیونکہ رائے دینے والے بڑی عالی مرتبہ اور نامور ہیں۔

ایک سابق جج ہائیکورٹ لکھتا ہے کہ جب تک کوئی شخص قانون کی رو سے مجرم ثابت نہ ہو ہر طرح بری ہونے کا حقدار ہے۔ کسی وکیل کو حق نہیں کہ وہ اپنا عقیدہ یا اپنی رائے ظاہر کرے اس کا کام صرف شہادت پیش کردہ پر بحث کرنا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ شہادت اس کے موکل کو مجرم ثابت نہیں کرتی۔ ملزم کا جرم بروئے قانون ثابت ہونا لازمی ہے اس لئے وکیل یہ حجت کر سکتا ہے کہ قانوناً کوئی جرم ثابت نہیں۔ جرم محض ایک فعل کا مرتکب ہونا نہیں بلکہ اسے ایک خاص نیت سے کرنا جو خلاف قانون ہو۔ استغاثہ کا فرض ہے کہ تمام امور قانوناً پایہ ثبوت تک پہونچائے۔

جب چارلس فلپس نے کرودیزیر کے اقبال کا جج بیرن پارک سے ذکر کیا تھا تو جج نے اسے یہی رائے دی تھی کہ چونکہ ملزم عدالت میں انکاری ہے اس لئے فلپ کا فرض ہے کہ مقدمے کی پیروی جاری رکھے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ فلپ اقبال کے بعد بھی اپنے تعین کردہ طرز عمل پر کاربند رہا اور اس بات پر زور دیتا رہا کہ اس کا موکل بے گناہ ہے جرم کرنے والا کوئی اور ہے اور اشارۃً یہ بھی بتایا کہ مجرم فلاں ہے اگر فلپ نے ایسا کیا تو غلط کیا اور ایسا کرنے سے اس نے قانون کی مجوزہ حد سے تجاوز کیا۔

سر ہیری پولینڈ کنگ کونسلر

میں اس سوال کے جواب میں جو مجھ سے پوچھا گیا ہے بلا توقف کہہ سکتا ہوں کہ جب کوئی ملزم کسی بیرسٹر کی خدمات حاصل کر چکا ہو تو خواہ اس ملزم نے اپنے بیرسٹر کے سامنے اقبال کر بھی لیا ہو اس حالت میں بھی بیرسٹر کا نہ صرف حق ہے بلکہ فرض ہے کہ اپنے موکل کے بچاؤ کی کوشش کرے اس بات سے کوئی فرق نہیں آتا کہ اقبال سماعت سے پہلے کیا گیا ہے یا سماعت کے دوران میں، پیشتر ازیں کہ ملزم کو مجرم قرار دیا جائے استغاثہ کا فرض ہے کہ اس کے جرم کو قانون کی رو سے ثابت کرے اور ملزم یہ حق رکھتا ہے کہ وہ استغاثہ کے مقابلے میں اپنی بیگناہی کا اظہار کرے۔ میں نے خود سنا ہے کہ ایک دفعہ قیدی نے قتل عمد کے الزام کا اقبال کر لیا تھا اور جب جج نے اس سے دریافت کیا کہ وہ قتل عمد اور قتل مستلزم السزا میں فرق جانتا ہے تو قیدی نے لاعلمی ظاہر کی اور حقیقت بھی یہ تھی اس پر جج نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا اقبال واپس لے اور جرم سے انکار کرے چنانچہ قیدی نے ایسا ہی کیا۔

اگرچہ الزام قتل عمد کا بھی ہو پھر بھی وکیل کا فرض ہے کہ باوجود مجرم کے اقبال کے یہی سعی کرے کہ جیوری کی رائے میں وہ قتل مستلزم السزا ٹھہرے اور اگر کوئی اور چارہ نہ ہو تو رحم کی درخواست کرے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے موکل کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے۔

فرض کیجئے ایک عورت کے خلاف طفل کشی کا الزام ہے اور وہ وکیل کے روبرو مانتی ہے کہ اس نے بچہ کو قتل کیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ماں سے علاوہ بچے کا کوئی وجود نہ ہو اس لئے وہ قتل عمد کی مجرم نہیں ہو سکتی کیا اس حالت میں بھی کوئی یہ کہہ سکیگا کہ اس عورت کا کوئی حق نہیں کہ وکیل کو اپنی صفائی کیلئے پیش کرے۔

ایک مخبوط الحواس کا معاملہ ہی لیجئے جو اپنے وکیل کے سامنے جرم سے اقبالی ہوتا ہے اگر اس کا وکیل پیروی ترک کر دے تو کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی۔

اس سے لامحالہ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب بیرسٹر کو اپنے موکل کے مجرم ہونے کا علم ہو گیا ہو اس کا یہ فرض نہیں کہ وہ موکل کو اس کے حال پر چھوڑ کر خود الگ ہو جائے۔ اس کے برخلاف اس کا فرض ہے کہ وہ موکل کے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کرے۔ ہاں اتنا ضروری ہے کہ اس کے بعد وہ جو کچھ کرے جانچ تول کر کرے اور اس کا خیال رکھے کہ کسی گواہ پر جھوٹی شہادت دینے کا الزام نہ لگائے۔ ہر مقدمے میں ایسے نقاط ضرور ہوتے ہیں جن پر وکیل باوجود ملزم کے اقبال کے بحث کر سکتا ہے مثلاً بغاوت کے مقدمے میں بہت سے ضوابط ایسے ہوتے ہیں جن کی فروگذاشت سے مقدمہ کی تمام کارروائی باطل ہو جاتی ہے اور اگر کسی مقدمہ کے دوران میں بعض ضوابط کو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو قیدی بری کئے جانے کا قانوناً حقدار ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ معمولی چوری کے مقدمات میں فرد جرم غلط مرتب کی گئی ہے اور محض اتنی بات پر قیدی بری ہو گیا ہے۔ ایک بیرسٹر کو چاہئے کہ وہ دیکھے کہ اس کے موکل کو اسی وقت سزا دی جاتی ہے جب کہ مقدمہ کی تمام کارروائی باضابطہ ہوئی۔

اس سوال کا مختصراً جواب دینا مشکل ہے۔ اگر میری ذاتی رائے لینی، مقصود ہو تو شادل روجرایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ڈی کے فاضلانہ مضمون کا ملاحظہ کریں۔ جو جولائی ۱۸۹۹ء کے لاکوارٹری ریویو (Law Quarterly Review) میں شایع ہوا تھا یا جو بعد میں علحدہ طور پر میسرز سیٹیونز اینڈ سنز (Messrs Stevens & Sons) نے چھپوایا تھا۔ یہ مضمون ہر اس آدمی کے لئے پڑھنا لازمی ہے جو اس مندرجہ بالا مسئلے سے دلچسپی رکھتا ہو اگر آپ مضمون کا لب لباب دیکھنا مقصود ہو تو سپرٹ آف لاز مسٹر Spirit of Law صفحہ ۲۸۹ پڑھیں۔ اس مضمون میں کروزیر کے مقدمے میں چارلس فلپ کے طرز عمل پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ میں ضمناً یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر فلپ کی عذر داری کا دارومدار اس جج بیرن پارک کے بیان پر ہے کیونکہ بیرن پارک نے خود مقدمہ کی سماعت کی تھی اور اسے یہ معلوم تھا کہ کروزیر اپنے وکیل کے روبرو اقبال جرم کر چکا ہے بیرن پارک کا بیان ہے کہ فلپ نے اپنی تقریر میں کوئی بات قابل گرفت نہ کہی تھی لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ اگر وہ رپورٹ ٹھیک ہے جو فلپ کی تقریر کے متعلق اخباروں میں شایع ہوئی تھی تو اس تقریر میں کچھ ایسی باتیں ضرور تھیں جن کا ترک کرنا واجب تھا۔ جب بیرن پارک نے کروزیر کے اقبال کا ذکر کیا گیا تھا تو اس نے یہی مشورہ دیا تھا کہ چونکہ ملزم چاہتا ہے اس لئے فلپ کو لازم ہے کہ مقدمہ کی پیروی جاری رکھے لیکن بحث شہادت پیش کردہ تک ہی محدود رکھے۔

رائٹ آنریبل سر ایڈورڈ ریڈلے

میری رائے میں جس وقت وکیل فیس لے چکتا ہے اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے موکل کی جوابدہی تندہی سے کرے اگر موکل نے اس کے سامنے

اقبال جرم کر بھی لیا ہو تب بھی وہ پابند ہے کہ اپنے فرض کو فرض جان کر ادا کرے وجہ یہ ہے کہ آدمی خواہ وہ حقیقت میں ہی مجسم کیوں نہ ہو۔ حق رکھتا ہے کہ اپنی طرف سے جوابدہی کرے۔

کوئی شخص صرف اس حالت میں سزایاب ہو سکتا ہے کہ یا تو اس نے عدالت میں اقبال کر لیا ہو۔ یا جیوری کی رائے میں مجرم ٹھہرے۔

جو مراسلہ مجھے بھیجا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بار کونسل نے سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر وکیل کے روبرو اس کے موکل نے اقبال پیش از سماعت کیا ہے تو وکیل کو اس کی طرف سے پیش نہ ہونا چاہئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے پاس اس فیصلہ کے لئے کیا وجوہات تھیں کیونکہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اقبال خواہ پیش از سماعت ہو یا دوران سماعت موکل ہر صورت میں حقدار ہے کہ وکیل کو اپنے بچاؤ کے لئے پیش کرے۔

لیکن جیسا کہ بیرن پارک نے کروویزیر کے مقدمہ میں چارلس فلپ کو ہدایت کی تھی ایسے حالات میں وکیل کو چاہئے کہ وہ اپنی بحث کو شہادت مقدمہ تک محدود رکھے یہ حد قائم کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی دوسرے آدمی کا نام بطور ملزم لے دے یا خدا کو بار بار اپیل کرتا رہے کہ وہ اُس کے موکل کی بیگناہی کی آکر تصدیق کرے

یہ کہہ دینا آسان ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ میرا یقین ہے کہ کروویزیر کے مقدمہ میں فلپ کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ فلپ نے کروویزیر کے اقبال کے بعد بھی پیروی کرتے رہنے میں غلطی کی تھی اور یقیناً جو رپورٹ اخبارات میں شایع ہوئی تھی اس میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن کی بنا پر ایسا کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ بیرن پارک نے سنہ ۱۸۶۷ء میں مجھے دوران گفتگو میں کہا تھا کہ فلپ نے اپنی تقریر میں کوئی ناواجب بات نہ کہی تھی۔

لارڈ بروگم،

لارڈ چانسلر سنہ ۱۸۳۰ء تا سنہ ۱۸۳۴ء

وکیل اس مقدس فرض کی ادائگی میں جو اس پر موکل کی طرف سے عاید ہوتا ہے دنیا میں صرف ایک شخص کو جانتا ہے اور وہ شخص اس کا موکل ہے وکیل کا فرض ہے کہ اپنے موکل کی حفاظت میں کسی قسم کی فروگذاشت نہ کرے اور اُس کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھے۔

لارڈ ہالزبری

لارڈ چانسلر سنہ ۱۸۸۵ء و سنہ ۱۸۸۶ء تا سنہ ۱۸۹۲ء، سنہ ۱۸۹۵ء تا سنہ ۱۹۰۵ء

دوسرے فریق نے ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو عجیب ہوتے ہوئے ناقابل عمل بھی ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ مقدمہ سے پہلے وکیل کو کسی نہ کسی طرح یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ اس کا موکل بیگناہ ہے اور اگر وکیل کو بیرونی طور پر یہ پتہ نہ لگ سکے تو اس کو چاہئے کہ وہ پیروی کرنے سے پہلے بذات خود اس معاملہ کی تفتیش کرے۔

کتنی مضحکہ خیز بات ہے اور اس سے بے انصافی کا کتنا احتمال ہے اگر ایک وکیل ایک کہانی محض اس لئے مسترد کر دیتا ہے کہ اس کے خیال میں یہ کہانی ناممکن معلوم ہوتی ہے تو وہ وکیل کا فرض سرانجام نہیں دیتا بلکہ جج کا فرض، ادا کر رہا ہے۔ اگر عدالتوں کی کارروائی کا تھوڑا سا تجربہ بھی ہو تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جو کہانی شروع میں ناممکن دکھائی دیتی تھی بعد میں صحیح نکلی۔

چارلس فلپ

"مجھے حق نہ تھا کہ میں مقدمے سے دست بردار ہو کر اس بدنصیب کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتا جس نے مجھے اپنا رازدار بنایا تھا۔ جب ایک وکیل کسی مقدمہ کو ہاتھ میں لے لیتا ہے تو اس کی اپنی رائے کوئی نہیں ہوتی۔ اس کی تمام تر قوتیں اس کے موکل کی ملکیت ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا معاہدہ ہے جو وکیل اور اس کے موکل کے درمیان ہو جاتا ہے"

محمد منظور الٰہی،

محبت کا پوجاری

از جناب سید شوکت حسین صاحب شوکت چھپرہ

انور اس سے محبت کرتا تھا۔۔۔ اور وہ بھی انور سے۔۔۔ مگر دل ہی دل میں۔ نہ انور نے اپنی محبت کو ظاہر کیا تھا اور نہ اس نے۔ نہ انور جانتا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے اور ۔۔۔ نہ وہ واقف تھی کہ انور اس پر فدا ہے۔

زمانہ اپنی حسب معمول رفتار سے گذر رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آتش محبت کی شعلہ زنی بھی ترقی پر تھی۔

وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی مگر شریف! اس کا مکان انور کے مکان کے داہنی جانب گلی میں کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس کا باپ گاؤں کے ایک زمیندار کے ہاں منشی تھا۔ اور جو کچھ وہاں سے ملتا تھا، اسی پر ان سبھوں کی اوقات بسر ہوتی تھی۔

باوجود غریب ہونے کے لیلا کے باپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی کمسن لڑکی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلا سکے۔ اس لئے اس نے سرسوتی لیلا کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے گرلز اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ جہاں وہ امتیاز کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی!

گرلز اسکول کی موٹر گلی کے تنگ ہونے کے سبب اس کے مکان تک نہ جا سکتی تھی۔ وہ انور کے کمرے کے ٹھیک سامنے آکر رک جاتی تھی۔ اور لیلا کو گھر سے یہاں تک آکر سوار ہونا پڑتا تھا۔

انور اسے روزانہ اپنے کمرے سے دیکھا کرتا تھا۔ نہ معلوم کیوں اس کی نظر خود بخود اس کی طرف کھنچ جاتی تھی۔ ضروری کاموں یا پڑھنے ہی لکھنے میں مشغول ہوتا، مگر جب کبھی بھی وہ سامنے سے گذرتی تو اس کی نظر کسی نامعلوم طاقت کی بنا پر اٹھ جاتی اور وہ چند سکنڈ کیلئے مضطرب ہو جاتا!

رفتہ رفتہ اس میں تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا اور ۔۔۔ اب انور کی آنکھیں بار بار سڑک پر اس کو تلاش کرتیں۔ وہ اپنے دل میں ہمیشہ ایک خلش سی محسوس کرتا۔ کسی کام میں طبیعت نہیں لگتی۔ وہ اس کو بالکل نہ سمجھ سکا۔

خدا معلوم کونسی طاقت تھی جو اسکی نظر کو کھینچ کر بار بار سڑک کی جانب پھیر دیتی تھی۔ جو موٹر سامنے سے گذرتی انور بے چین ہو کر پرشوق نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اگرچہ وہ اس مخصوص گاڑی کے آنے کے وقت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آسکتی، مگر وہ مجبور تھا کسی زبردست طاقت کے ہاتھوں مجبور۔

وقت اپنی پوری تیزی کے ساتھ منزلیں طے کر رہا تھا۔ اور دن میں دو ایک بار نظروں کے مل جانے سے اس کے پریشان دل کو قدرے تسکین ہوتی تھی۔ مگر ایک دفعہ پندرہ بیس روز تک انور کی نگاہیں اسکے جمال خوش آگیں کی زیارت سے محروم رہیں۔ طبیعت کی بے چینی اور دل کی تڑپ بیان سے باہر ہے۔ اس کے چند بے تکلف دوست اس کے مغموم رہنے کی وجہ دریافت کرتے، مگر وہ ان سے کچھ بہانے کر دیا کرتا تھا۔ وہ بتا ہی کیا خاک سکتا تھا جبکہ خود اس کی حقیقت سے واقف نہ تھا۔

آج لیلا کو دیکھے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گذر چکا ہے جس کرب و بے چینی میں یہ دن بسر ہوئے وہ ناقابل بیان ہیں۔ شب کی اختر شماری اور دن کی آہ و زاری نے انور کو ایسا نڈھال کیا کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں مہینوں کا مریض معلوم ہونے لگا۔

شام کے وقت انور سکون کی تلاش میں ٹہلنے کے لئے نکلا۔ مگر اس کے قدم کسی نامعلوم کشش کی بنا پر اس برہمن کے مکان کی طرف

جھک گئے۔ وہ عالم بیہوشی میں جلد جلد قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ اور اُس کے چھوٹے سے مکان کے پاس سے گذرا۔

سامنے ہی ایک کمرہ تھا جس کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور بائیں جانب پلنگ پر لیلیٰ پڑی ہوئی کراہ رہی تھی چہرہ زرد تھا اور اُس باپ ماں زمین پر پلنگ سے لگے ہوئے بیٹھے تھے۔

انور نے ایک نظر ڈالی اور خوش قسمتی سے اُسکی نظر سے مل گئی انور جھجک کر ایک سکنڈ کے لئے وہاں پر کھڑا ہوگیا۔ ایک مدہوشی سی اس پر طاری ہوگئی۔ مگر اُس نے اپنے کو سنبھالا اور ایک دوسرے راستہ سے ٹہلتا ہوا مکان واپس چلا آیا۔

اس دن سے روزانہ کم از کم ایک بار وہ اس طرف جاتا اور اس طرح نظر ہی نظر میں اس کی حالت سے واقف ہو کر چلا آتا تھا۔

خدا خدا کر کے اُس کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ بالکل تندرست ہوگئی۔ انور نے بھی اسطرف کا جانا آہستہ آہستہ ترک کر دیا۔

اور اب وہ حسب معمول اسکول جانے لگی ـــ وہ اُسکو روزانہ جاتے ہوئے دیکھا کرتا۔ وہ بھی جب گذرتی تو انور کے کمرے میں ایک نظر ڈال لیتی۔

اگرچہ دونوں میں کسی کو ابھی تک زبانی گفتگو کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا مگر ؎

آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

اور حقیقت میں نگاہیں راز دل کو جس حُسن و خوبی کے ساتھ ایک دوسرے پر ظاہر کر دیتی ہیں اس حُسن و خوبی کے ساتھ اگر زبان کو موقع نصیب بھی ہو تو بیان کرنے سے قاصر ہے ـــ خیر تو آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں طرف سے ہدیۂ دل پیش ہوا' اور قبول کر لیا گیا۔

جس روز وہ پہلے پہل اچھی ہو کر اسکول جا رہی تھی تو انور اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا جیسی ہی وہ سامنے سے گذری اور نظریں اُٹھیں۔ ایک مسرت کی لہر اس کے رگ رگ میں دوڑ گئی اور انور خود بخود مسکرا دیا۔ اُس نے بھی ایک عجیب ہوشربا انداز سے مُسکرا کر نظریں نیچی کر لیں اور چلی گئی۔

اب انور بھی سمجھ گیا کہ اُس کی محبت یکطرفہ نہیں ہے بلکہ دوسری طرف سے بھی اس کی محبت کا جواب محبت ہی میں دیا جا رہا ہے۔ اس وقت انور بہت خوش تھا اور اپنے کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان تصور کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے فارسی کا شعر ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا مے شود

اپنی پوری صداقت کے ساتھ چکر لگا رہا تھا۔

اسی طرح کافی عرصہ گذر گیا اور اب انور کی خواہش تھی کہ کیا شاید وہ اس سے گفتگو کر سکتا مگر اُس کے لئے موقع اور تنہائی کی ضرورت تھی جو میسر نہ تھی!

ایک روز شام کے وقت اتفاق سے انور اپنی طبیعت کی بے چینی اور دل کی جلن میں سکون حاصل کرنے کے لئے دریا کے کنارے ٹہلنے کے لئے چلا گیا۔

آفتاب ابھی ابھی غروب ہوا تھا مغرب کی جانب آسمان پر سُرخ سُرخ بادل لہرا رہے تھے۔ جن پر جگہ بجگہ آہستہ آہستہ تاریکی مسلط ہوتی جا رہی تھی۔

انور سر جھکائے اپنے خیالات کے دریا میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا مولسری کے ایک بڑے درخت کے نیچے پہونچا تھا کہ یکایک کسی کے قدموں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ اور اُسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' جبکہ اُس نے دیکھا کہ اُس کے تخیل کی ملکہ' اُس کے ارمانوں کی دیوی' اُسکی اپنی لیلا' اپنے بے پناہ حُسن اور شباب کی خیرہ کر دینے والی رنگینیوں کے ساتھ اُس کے آگے کھڑی ہے۔

انور نے سمجھا کہ یہ بھی ایک خوشگوار خواب ہے' جو اُسکا تخیل اُسے دکھلا رہا ہے۔ یہ سمجھ کر اُس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور بڑھنے لگا۔ مگر پھر یکایک کسی کے نرم اور نازک ہاتھ نے اُس کے شانے کو چھوا' اور ایک شیریں نغمہ کی سی آواز اُس کے کان میں گونجی "کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں!"

انور نے نظریں برابر کیں' ایک ہلکی سی چیخ اُس کے مُنہ سے نکل گئی۔ اور ایک بیہوشی کی سی کیفیت اُس پر طاری ہوگئی۔ اور اگر اُس وقت لیلا اس کو سنبھال نہ لیتی تو وہ یقینی گر پڑتا!

"نہیں — نہیں اور تم سے ناراض — آہ لیلا! اگر واقعی تم لیلا ہی ہو تو کبھی اپنے دل میں اس کو جگہ نہ دو — دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو — حتیٰ کہ تم خود بھی مجھ سے ناراض ہو جاؤ مگر — میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا"

انور نے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ خاموش تھی۔ انور نے پھر بولنا شروع کیا۔

"پیاری لیلا! — میں نہ جانتا تھا — کیا۔ لیلا بھی مجھ سے محبت کرتی ہے — محبت — سچی محبت — سچ کہو؟"

انور مدہوشی کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

لیلا رو رہی تھی۔ اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس قدر روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

انور یک بیک چونکا "لیلا — کیا تم رو رہی ہو؟ — کیوں؟ — بولو — کچھ تو بولو! —"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آہ! انور . . کیوں نہ روؤں جبکہ میری محبت کے دیوتا — جس کے اوپر میں اپنی خوشی — اپنا دل — اپنا ارمان . . . سب کچھ بھینٹ چڑھا چکی ہوں اسی کو میری محبت کی صداقت میں شک ہے . . . آہ! انور میں بدنصیب ہوں — بدنصیب — مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بھی بدنصیب نہیں" یہ کہہ کر پھر لیلا رونے لگی۔

انور گھبرا گیا۔ اس کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ وہ بھی بے اختیار رونے لگا۔

". . . . لیلا! . . . مجھے معاف کر دو . . . میں نے غلطی کی . . سخت غلطی" یہ کہتے ہوئے انور نے اس کے آنسو پونچھے اور فرطِ محبت سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

اب لیلا مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کہا "اب مجھے جانا چاہیئے۔ پتا جی میرا انتظار کر رہے ہوں گے — میں اپنی سہیلی منّی سے یہ کتاب واپس لینے گئی تھی" یہ کہکر لیلا دو چار قدم آگے بڑھ گئی۔ انور پہلے تو کھڑا دیکھتا رہا مگر — پھر یکایک آگے بڑھا اور لیلا کا ہاتھ پکڑ کر بولا:۔

"اچھا پیاری! یہ تو بتا دو کہ پھر یہ موقع نصیب ہوگا یا نہیں؟"

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے انور کو دیکھتے ہوئے لیلا بولی۔

"میں کل پھر اسی وقت کوشش کرونگی" انور کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ کہ یکایک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور لیلا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے روانہ ہو گئی۔

انور جب وہاں سے لوٹا ہے تو ایک نیم مُردہ انسان ہو رہا تھا۔ تمام بدن میں سنسنی پیدا تھی۔ احساسِ حُسن سے مدہوش تھا اور نشۂ عشق میں چُور۔ قدم قدم پر لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ گھر پہنچ کر جلدی اپنے کمرے میں چلا گیا کہ مبادا کوئی اُسے اس حالت میں دیکھ نہ لے اندر جاتے ہی مسہری پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اُسکو کل شام کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔

اس درمیان میں انور اپنی محبت کے مستقبل پر بڑی محویت سے نظر دوڑاتا رہا۔ اس کو نہ معلوم کیوں اپنی محبت کی راہ میں قدم قدم پر ناامیدیاں اور رکاوٹیں محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ہر لمحہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اُس میں اور لیلا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور ان دونوں کا رشتۂ اتحاد میں منسلک ہونا تو محال بلکہ دونوں کا یکجا ہونا بھی دنیا کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ یہی ایک خیال تھا جو اُسے بےچین کر رہا تھا۔ اسی پریشانی میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اور اُس نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ لیلا کی شادی ہو رہی ہے اور وہ اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے" انور کی آنکھیں کھل گئیں اُس کے دل میں خیالات کا ایک دریا زور و شور سے موجیں مارنے لگا۔

"کیا — لیلا اس کو دھوکا دے رہی ہے۔ یہ سب محبت کی باتیں محض فریب ہیں — فریب — کیا لیلا ایک فریبی عورت ہے — دھوکاباز —" انور اُٹھ بیٹھا "نہیں نہیں! یہ سب اس کا اپنا خیال فاسد ہے۔ لیلا کبھی ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ عام عورتوں کی طرح نہیں۔ وہ یقیناً وفاپرست اور وفا کی دیوی ہے"

انور بہت بےچین تھا۔ خدا خدا کر کے رات بسر ہوئی۔ اور

دن ہوگیا۔ دن بھی اسی حالت میں کٹ گیا۔ اور آخر کار وہ وقت آگیا جس کا اُسے انتظار تھا!

وہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہنچا۔ اور لیلا کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا ـــ کہ وہ بھی یکایک آئی اور پیچھے سے انور کے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ وہ آج خوش تھی ـــ کچھ دیر تک تو سکوت طاری رہا اور دونوں محبت کے متوالے مدہوشی کے عالم میں ایک دوسرے کو تکتے رہے ـــ مگر پھر آخر کار لیلا نے سکوت کو اسطرح توڑا۔

"کہو پیارے، وہ کونسے دن ہونگے جبکہ ہم لوگ اس خود غرض اور اندھی دنیا سے علیحدہ کسی گوشہ میں چین اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہونگے؟" انور نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور کہا:-

"آہ! میری بھولی لیلا! کیا تم نہیں جانتی۔ ۔ ۔ ؟"

"کیا۔ ۔ ۔ ؟"

"یہ کہ تم میری نہیں ہو سکتیں"!

"کیوں؟"

"چونکہ ہمارے تمہارے درمیان دنیا کے اندھے قوانین اور بے رحم رسوم کا ایک بحر ذخار حائل ہے۔ جس سے پار ہونا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ ۔ ۔ آہ لیلا! ۔ ۔ ۔ تم میری نہیں ہو سکتی" انور رو رہا تھا "آہ دنیا۔ ۔ ۔ تباہ ہونے والی دنیا۔ ۔ ۔ کیا۔ ۔ تو اتنا بھی نہیں جانتی کہ محبت۔ ۔ ۔ مذہب و ملت۔ ۔ ۔ ذات پات دیکھکر نہیں ہوا کرتی۔ ۔ ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" انور کے سینے پر ہاتھ رکھکر لیلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "انور! ۔ ۔ ۔ میں تمہاری ہوں۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔ ہوکر رہونگی۔ ۔ ۔ جب ہماری رُوحیں ایک دوسرے میں مدغم ہو چکیں تو۔ ۔ ۔ کیا۔ ۔ ۔ یہ فانی دنیا۔ ۔ ۔ ہم دونوں کو متحد نہیں دیکھ سکتی۔ ۔ ۔ ؟"

"نہیں دیکھ سکتی۔ ۔ ۔ پیاری لیلا! ۔ ۔ ۔ نہیں دیکھ سکتی"!

خبر نہیں کبتک یہ دونوں اسیرانِ محبت اس طور پر گفتگو میں غرق رہے۔ پھر یکایک کسی کے قدموں کی چاپ نے دونوں کو علیحدہ کردیا۔ اور لیلا آنسو بھری آنکھوں سے انور کو دیکھتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

یہ آنے والا شخص لیلا کا باپ پرتھوی چند تھا۔ اُس نے انور کو درخت کے نیچے بیٹھا ہوا دیکھا۔ اور لیلا کی ایک ننھی سی جھلک بھی سڑک پر دکھائی دی۔ اس کو کچھ شبہ سا ہوا مگر خاموش چلا گیا۔

آج دو ہفتے گذر گئے کہ نہ لیلا سے ملاقات ہوئی ہے اور نہ وہ اسکول جاتی ہے۔ انور سخت پریشان تھا۔ اس نے بار بار پتہ لگانے کی کوششیں بھی کیں مگر بے سود۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں اُس کے باپ کو خبر تو نہ ہوگئی ہو۔

انور کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے تھے ـــ اور آخر کار اسی بے چینی میں کافی عرصہ گذر گیا کہ یکایک ایک دن شام کے وقت اُس کو خبر ملی کہ لیلا کی شادی ہونے والی ہے۔ اور کل اسی طرف سے بارات جائے گی۔

انور کے دل پر ہجوم رنج و غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اُس کے سکون اس کے خرمنِ امید پر سینکڑوں بجلیاں یکبارگر پڑیں۔ اور اُسے جلاکر خاکستر کردیا۔ اس کی ساری تمنائیں چشم زدن میں پامال ہوکر رہگئیں۔ اس کو دنیا سنسان اور زندگی بیکار معلوم ہونے لگی ہر لمحہ انور کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا ـــ پھر فرطِ غم سے اُس نے آنکھیں بندکرلیں اور خاموش پڑ رہا ـــ پھر یکایک بولنا شروع کیا

"آہ لیلا! ۔ ۔ ۔ میرا خواب۔ ۔ ۔ درست نکلا۔ ۔ ۔ میں نہیں ایسا نہ سمجھتا تھا۔ ۔ ۔ آہ! ۔ ۔ ۔ تم نے مجھے ناحق دھوکا دیا"۔ ۔ ۔ پھر یکایک "نہیں ٹھیرو، دیکھو صبر کرو۔ ۔ ذرا۔ ۔ ۔ دم لو، وہ کچھ بول رہی ہے"۔ ۔ ۔ "ہاں۔ ۔ ۔ میں تمہاری ہوں اور۔ ۔ ۔ ہوکر رہونگی"! انور نے بیہوشی کی حالت میں دیکھا کہ وہ عالم برزخ میں ہے اور فردوس بریں میں لیلا کے ساتھ باغ اور نہروں کی سیر کر رہا ہے۔

پھر یکایک اس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ وہ بمشکل اٹھا اور ٹیبل کے سامنے بیٹھکر کچھ لکھنے لگا۔

دوسرے دن شب کو بہت دھوم دھام سے ایک بارات انور کے مکان کے سامنے سے گذر رہی تھی۔ باجوں کے شور و غلغلہ نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ انور اپنے کمرے میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اُس کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔

کئی گھنٹوں کے بعد پھر ایک جلوس واپس ہوا۔ لڑکی کے والدین نے کچھ مناسب جانکر آج ہی رخصتی بھی کردی۔ اور نوشہ دلہن لیکر واپس ہو رہا تھا۔ انور حسرت و یاس کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں سامنے زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور دو موٹے موٹے آنسو اُس کے زرد رخسار پر ٹپک رہے تھے۔ وہ جلوس کو دیکھکر اٹھا اور اُس کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جلوس دھیرے دھیرے چلکر مکان پہونچا اور دلہن اُتاری گئی۔

ہر طرف چہل پہل تھی اور لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ آخرکار رات آدھی سے زیادہ گذر گئی۔ اور لوگ اِدھر اُدھر سو پڑ رہے۔

جب سناٹا ہوگیا تو انور ایک گوشہ سے نکلا اور زنانہ کمرے کی دیوار کے پاس کھڑا تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر یکایک تیزی سے دیوار پر چڑھ کر کاٹھ کی کھڑکی سے کوئی چیز نیچے گرادی اور پھر اُتر کر تیز قدم سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

لیلا کمرے میں بیٹھی ہوئی انور کی یاد میں آنسوؤں کے دریا بہا رہی تھی۔ کہ یکایک اُس کی گود میں ایک خط گرا۔ اُس نے جلدی سے اُسے لے لیا اور پڑھنا شروع کیا۔

"پیاری لیلا! خوش رہو آباد رہو۔ تم سمجھتی ہوگی کہ اس خط میں ایک طول طویل داستان محبت کو دہرایا گیا ہوگا۔ اور قدم قدم پر تمہاری شکایتیں کی گئی ہونگی مگر نہیں، مجھے اپنی لیلا سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ سب اپنی قسمت کا کھیل ہے۔ لیلا! پہلے میں غلطی پر تھا، میں سمجھتا تھا کہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان میں ہی ہوں اور کائنات کی ساری حقیقی کامیابیاں اور خوشیاں صرف میرے ہی لئے ہیں۔ مگر نہیں اب مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے بھی زیادہ خوش نصیب و کامیاب انسان دنیا میں موجود ہیں جن پر تمہاری نظر التفات ہو سکتی ہے۔ اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی سے کچھ بغض رکھتا ہوں۔ ہرگز نہیں، خدا تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ حقیقی خوشی اور آرام میسر کرے۔ آہ لیلا مجھے معاف کرنا میں نے تمہارے عیش و مسرت میں خلل ڈالا۔ مگر میں سچ کہتا ہوں لیلا! میں مجبور تھا، دل سے مجبور۔ میں تم سے آخری دفعہ ملنے آیا ہوں۔ کچھ روز کے بعد سُن لینا کہ تمہارا جاں نثار انور ہاں وہی انور جس سے تم کبھی محبت سے پیش آئی تھیں، دریائے گنگا میں تم پر سے قربان ہوگیا۔ امید ہے کہ تم اپنے زمانۂ عیش و مسرت کی گھڑیوں میں کبھی کبھی اس بدنصیب کو بھی یاد کر لیا کروگی، اچھا خدا حافظ جاتا ہوں اور تمہارے دیدار کی حسرت لئے جاتا ہوں، فقط تمہارا جاں نثار، انور"

لیلا خط پڑھ رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی آخرکار خط ختم کرچکی۔ اسکا سر چکرانے لگا۔ اسکو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آسمان پر اُڑی جا رہی ہے اور پھر یکایک معلوم ہوا کہ کسی نے اسکو اوپر سے چھوڑ دیا اور اب وہ نیچے آگئی۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ یک بیک اُس نے اپنی آنکھیں جھٹ سے کھول دیں، اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک دریا موجزن ہے جس کے بالکل کنارے انور کھڑا اُسے تک رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ پھر مولسری کے درخت کے نیچے ملاقات کا سماں پھر ایک ایک کرکے سب واقعات اُسکی غمناک آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ وہ اٹھی آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور موقع پاکر نکل گئی۔

اب وہ سڑک پر تھی اور بے تحاشہ دوڑ رہی تھی اُسنے رات کی تاریکی میں دیکھا کہ انور بہت دور آگے آگے چلا جا رہا ہے۔ اُس نے پکارنا چاہا مگر پکار نہ سکی آواز گلوگیر ہوکر رہ گئی۔ انور دریا کے کنارے پہونچ چکا تھا اور لیلا بھی بیس پچیس گز کے فاصلہ پر تھی۔ اب رات زیادہ تاریک ہوگئی تھی اور ہوا بھی زور زور سے چلنا شروع ہوگئی۔ چند جھلملاتے ہوئے ستارے ندیدہ نگاہوں سے اِس منظر کو تک رہے تھے کہ یکایک "آہ لیلا" کی آواز فضا میں گونجی اور ساتھ ہی پانی میں ایک زور کا دھماکا ہوا۔ ابھی پانی کا تلاطم بھی کم نہ ہوا تھا کہ ایک دوسرا دھماکا "آہ انور" کی آواز کے ساتھ ہوا اور پھر سکوت طاری ہوگیا۔

کچھ فاصلہ پر دریا کے کنارے چند ملاح بیٹھے ہوئے گا رہے اور گانجے کا دم لگا رہے تھے کہ انہیں سے ایک نے کہا "ارے یہ کیسی آواز تھی" سب ایک لمحہ کیلئے خاموش ہوگئے اور آواز کیطرف کان لگا کر سننے لگے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک دوسرے نے کہا "اونہہ کوئی جانور یا مچھلی ہوگی" اور پھر سب گانے بجانے میں مشغول ہوگئے۔ فقط آسمان ان درد بھرے فسانے کا گواہ تھا۔ — دوسرے دن صبح کو جبکہ بادل انکی بیکسی پر آخری آنسو بہا کر ایکطرف چلے گئے اور آفتاب نے اپنا مغموم و افسردہ چہرہ مشرق سے نکالا تو بہت دور کنارے پر کچھ آدمیوں کا ہجوم ہوگیا جو جھک جھک کر پانی میں دو مرد و عورت کی ہم آغوش لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں لاشیں نوجوان لیلا و انور کی تھیں جنہیں دنیا کی بیرحم [illegible]

حسرتِ ناکام

(از جناب ہادی قریشی صاحب)

یہ مانا حسنِ صورت میں وہ بیحد خوبصورت ہے
یہ مانا مجھکو اُس سے عشق ہے، بیحد محبت ہے

یہ مانا اُس سے وابستہ مرے دل کی مسرت ہے
یہ مانا نصف میری زندگی ہی میری دولت ہے

مری دنیائے تخیلات میں وہ جلوہ آرا ہے
مرے جذبات و محسوسات میں وہ کارفرما ہے

ہزاروں شب گذاری ہیں جاگ کر اُسکے تصور میں
اُسی کے دم سے گویا زندگی تھی قلبِ مضطر میں

مری اب زندگی کیسی کہ جب دل ہی نہیں بر میں
لکھی تھیں عمر بھر ناکامیاں میرے مقدر میں

یہی جی چاہتا ہے اب وہ میری بنکے آجائے
یہی جی چاہتا ہے کاش وہ مجھ میں سما جائے!

ہمیشہ میری پہلو میں رہے اور مجھکو بہلائے
قیامت تک نہ مجھ میں اور اُسمیں تفرقہ آئے

مگر مجبور ہوں، اللہ! ایسا ہو نہیں سکتا!
وہ میری ہو نہیں سکتی میں اُسکا ہو نہیں سکتا

وہ میرے پاس آجائے، یہ ناممکن ہی مشکل ہے
کہ میرے اور اُسکے درمیاں تقدیر حائل ہے

خالدہ ادیب خانم

از جناب شبیر احمد خاں صاحب

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہندوستان کی ایک نہایت بلند پایہ قومی اور تعلیمی درسگاہ ہے جس کی ترقی و عظمت بزرگ قائدین ملت اسلامیہ ہند کی مساعی کی رہین منت ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم علیگڈھ میں اس کے موسس ہوئے اور حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے اسے دہلی میں منتقل کرکے اس کی بنیادوں کو استوار کیا اور اب قائد اعظم ڈاکٹر انصاری کی زیر نگرانی یہ جامعہ بین الاقوامی شہرت دوام حاصل کر رہی ہے۔ اس درسگاہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اعلیٰ دنیاوی اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی سیرت کی تربیت خاص بلند، پاکیزہ اسلامی تمدن و معاشرت کی فضا میں ہوتی ہے۔ شاید ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی کو یہ فخر اور عزت حاصل نہیں کہ وہاں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے بہترین ماہرین فن تعلیم بہترین مفکر اور ادیب کی علمی تقاریر کا کوئی انتظام ہو۔ یہ زینت اسی درسگاہ کو نصیب ہے کہ یہاں گذشتہ سال سے ہر سال ماہ جنوری میں بیرون ہند سے اسلامی ممالک کے بہترین اور مشہور مفکرین اپنی پر از معلومات تقاریر سے اہم علمی، تاریخی اور دیگر موضوعات پر فاضلانہ اظہار خیالات کرتے ہیں۔ گذشتہ سال ہز ایکسلنسی رؤف پاشا سابق وزیر اعظم ترکی یہاں تشریف لائے اور انہوں نے مسلسل تقاریر کیں۔ امسال ترکی کی مشہور افسانہ نگار ادیب مفکرہ ماہر تعلیم خالدہ ادیب خانم تشریف لائی ہوئی ہیں۔ اور مختلف اہم اسلامی موضوعات اور ترکی تاریخ پر آٹھ مسلسل تقاریر کر رہی ہیں یہ سلسلہ تقاریر ۱۵ جنوری سے شروع ہے۔ اسی مشہور درسگاہ کے شیخ الجامعہ ہماری ملت افاغنہ کے قابلقدر فرد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے، ایچ پی، ڈی ہیں۔

آج مشہور عالم ادیب اور ترکی مفکرہ خالدہ ادیب خانم کے سوانح حیات ہمارے قارئین کی معلومات میں مفید اضافہ کا باعث ہونگے۔ لہذا انکا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے:۔

خالدہ ادیب خانم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اور اس کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکن کالج میں داخل ہوئیں۔ جہاں سے انہوں نے ۱۹۰۱ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال کے اخیر میں تعلیم سے فراغت کے بعد انکی شادی شیخ ذکی بیگ کے ساتھ ہوئی۔ جن حالات کے زیر اثر خالدہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت میں جلوہ گر ہوئیں۔ ان کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ۱۹۰۶ء میں بمقام سلونیکی پہلی مرتبہ آزاد پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جماعت نے بعد ازاں فوجی افسران کی شرکت کی وجہ سے انجمن اتحاد و ترقی کا قالب اختیار کیا۔ اس جماعت کی قابل ذکر بزرگ شخصیتیں انور۔ اسمٰعیل حقی۔ کاظم۔ قرۃ بکر۔ فتحی بیگ۔ نیازی بیگ۔ مصطفےٰ کمال اور جمال پاشا تھے۔ اس جماعت کی تاریخ میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء کی درمیانی مدت اس تحریک کے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت میں صرف ہوئی۔ سلطان عبدالحمید خان سلطان ٹرکی اس نوزائیدہ جماعت کے استیصال میں ناکام رہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۰۸ء بعض شہروں نے انور اور نیازی کی زیر قیادت جدید دستور اساسی قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے ہی دن شاہی فرمان کے ذریعہ حکومت نے بھی اس جدید دستور اساسی پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یہ واقعہ تاریخ ملت ترکیہ میں بے پناہ مسرت و انبساط کا نقیب تھا۔ تمام ملک پر اجلئے ملت کی روح افزا انجمنیں مسلط تھیں۔ یہ وہ حریت پرور فضا تھی جس نے بقول خالدہ ادیب خانم مجھ کو

نئی زندگی نئی طرح پھونکی اور میں پہلی مرتبہ بحیثیت ایک ادیبہ کے روشناس خلق ہوئی۔ اس زمانہ کے مشہور اخبار طنین کے صفحات اس کے مشہور ادبی شہکار اور جواہر ریزوں سے مزین ہوتے رہتے مگر اُن کا دائرہ عمل فی الحال اس قدر وسیع نہ ہوا تھا کہ وہ کسی آغوش میں تمکن کی جگہ صحافتی دنیا سمٹ آتے۔ اس کے مضامین کو جو قبولیت عام نصیب ہوئی اُس نے بہت جلد اُسے ایک نہایت معروف افسانہ نویس اور صحافت نگار بنادیا۔ اس کے گرد وپیش خواتین نامہ نگاروں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ جو مختلف سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر اُس کے لئے مواد جمع کرتی تھیں۔ اکثر ان کے پاس مختلف طبقے اور ملک کے مختلف گوشوں سے خواتین کے وفود مشورے کے لئے آتے تھے۔ اُن کے اپنے قول کے مطابق مجھے ان خواتین کے ذریعہ نہایت مفید معلومات بہم پہنچتی تھیں۔ اور میں ان کے بیانات سے آنے والے انقلابات کا اندازہ لگا رہی تھی۔

انجمن اتحاد و ترقی کی مخالف جماعت بھی اُن دنوں سرگرم عمل تھی جنوری ۱۹۱۹ء میں انہیں ایک تہدیدی خط موصول ہوا جس میں اُسے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے اپنے مضامین کا سلسلہ اخبار طنین میں جاری رکھا تو موت بہت جلد بطور سزا اس پر مسلط کردی جائیگی۔ مگر یہ بلند ہمت ادیبہ اپنے مقصود شدہ لائحہ عمل پر اُسی مستعدی کے ساتھ گامزن رہی مخالف طاقتوں نے زور پکڑ لیا اور اس کی زندگی مصائب اور خطرات کے گرداب کے نزدیک جا پہنچی۔ جب ایک صبح ۱۰۔ مارچ ۱۹۰۹ء کو اس کے ایک دوست نے اُسے ملک کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ لہذا وہ مصر کے لئے روانہ ہوگئی۔

دوران قیام مصر میں اس کی زندگی تفکرات اور مصائب کی زندگی تھی۔ اس کا چھوٹا بچہ حسن اس کے ساتھ تھا۔ اس کی مسلسل بیماری اُس کی طبیعت پر ایک بوجھ تھی۔ اُسی سال اکتوبر کو وہ اپنے وطن کو لوٹ آئیں یہ اُس کی زندگی کا وہ زمانہ تھا جب اس نے ناول نویسی شروع کی۔ اس کا سب سے پہلا ناول (CEIRA RALIB) ہے۔ جس میں اس نے اپنے ملک کی معاشرت و تمدن کی حیاسوز رسم اور رسومات کی پیدا کردہ مشکلات کو بے نقاب کیا۔ اس کتاب پر ملک کے ہر گوشہ میں سخت سے سخت تنقید اور تبصرے ہوئے۔ ملک کے تعلیمی مسائل پر مسلسل مضامین لکھے جنہوں نے سیدبے وزیر تعلیم کو مجبور کردیا۔ کہ وہ اس کے مشورے پر عمل کرے۔ وزیر تعلیم اُسے اپنے ہمراہ لڑکیوں کا نارمل سکول دکھلانے کیلئے لے گیا اور درسگاہ کی ترقی کے لئے اس کی تجاویز طلب کیں۔

اس واقعہ کے متعلق خالدہ ادیب خانم خود لکھتی ہیں "مجھے یہ کبھی خیال نہ تھا۔ کہ مجھے ایک معلمہ کی حیثیت میں بھی اپنی قوم کی خدمت کرنی ہے۔ میں نے قوم کی اس دعوت کو اس دور ترقی میں اتنا ہی اہم سمجھا ہے جتنا ایک سپاہی کے لئے جنگ کے وقت فوج میں شرکت اہم ہوتی ہے۔ خالدہ ادیب خانم نے اُس سکول کا معائنہ کیا اور مجوزہ ہدایات کے مطابق عملدرآمد شروع کیا۔ وہ سکول میں اصول تعلیم کی تعلیم کے لئے بحیثیت ایک معلمہ داخل ہوئیں۔ دو سال کی قلیل مدت میں لڑکیوں کا یہ نارمل اسکول ایک کالج کے درجہ تک پہنچ گیا۔ اس کالج میں وہ پانچسال تک تاریخ، اصول تعلیم، اخلاقیات پر لیکچر دیتی رہیں

۱۹۱۰ء میں حقی پاشا کی زیر قیادت مصالحتی بورڈ ملک کے معاملات کو بہتر نہ کر سکے۔ ۱۹۰۸ء میں آسٹریا نے بوسینیا، ہرزوگوینا پر اپنا قبضہ کرلیا۔ کریٹ کا جزیرہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ۱۹۱۱ء میں اطالوی فوجیں ٹریپولی کی سرزمین میں اُتر آئیں۔ انور پاشا اور فتح بیگ اس وقت ٹریپولی کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہی وہ سال ۱۹۱۱ء تھا۔ جب اُسے بیک وقت طلاق اور خطرناک بیماری کے مصائب میں سے گذرنا پڑا۔ قدرت نے بہت جلد اس کی مساعدت کی اور وہ اپنے میدان عمل میں از سر نو مستعد ہوگئی۔ تقریر اور تحریر کے ذریعے جمہور کے جذبات کو اُبھارتی رہی۔ ۱۹۱۱ء میں تباہ شدہ معابد اور ۱۹۱۲ء میں "نیمدان" اور اس کے بعد "توران جدید" اپنی اہم تصنیفات پبلک کے سامنے پیش کیں۔ سندان نے بہت قبولیت عام حاصل کی۔ اور وہ ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ ترک اُجاغ کی رکن منتخب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُس کے قلب میں قومیت کے جذبات کی تربیت شروع ہوئی۔ وہ خود تحریر کرتی ہیں۔ "قومیت کے متعلق ہمارا اپنا یہ خیال ہے کہ ہمیں آنیوالی نسلوں کے دلوں میں ایک قوم کے لئے ایک بے پناہ جذبۂ اخوت و محبت پیدا کر دینا چاہیئے۔ اور ہمیں اپنی قوم کو اقوام عالم کی صف میں ایک بلند مقام پر پہنچانے کیلئے

پر بھی جد وجہد کرنی چاہیئے۔ یہی وہ غیر متزلزل عزائم اور بلند جذبات ہیں جو ہماری قوم کو اس کرہ ارضی پر زندہ رکھنے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

جون ۱۹۱۱ء میں دوسری مرتبہ وہ انگلستان گئیں۔ جدید توران اس نے لندن میں تصنیف کی۔ یہ کتاب نہایت بلند سیاسی اور ملی معیار زندگی پیش کرتی ہے مگر یہ معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ ناممکن الحصول ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی جدید ہیئت ترکیبی پیش کرتی ہے جس اتحاد اور ترقی دونوں پہلو بہ پہلو ہیں جس میں حکومت ملک کی تمام قوتیں ان طاقتوں کے سپرد ہیں جس میں عورتوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہوں۔ جہاں عورتوں کو بھی اپنے بہترین دل و دماغ سے اپنی قوم اور ملک کی خدمات سرانجام دینے کے مواقع ہوں۔ جدید ترکی محض اپنے تمدن کے اعتبار سے ہی صحیح قومیت کا نمونہ نہ ہو بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی خالص قومیت کی ایک زندہ تصویر نظر آئے۔ فاضلہ مصنفہ کے خیال کے مطابق اس کتاب کی پیش کردہ نظریات سہل الحصول ہیں۔

جنگ بلقان ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی۔ اس جنگ کی ابتدا میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ اس پہلی عظیم الشان شکست میں کم و بیش تین ہزار ترک شہید ہوئے۔ قسطنطنیہ پر بھی حملہ کا اندیشہ تھا اس لئے اکثر خاندانوں نے شہر کو چھوڑ دیا تھا مگر خالدہ ادیب خانم اپنے شہر میں ٹھہر گئی اور "طبی نسواں کلب" کے دیگر ارکان کے ساتھ مجروحین کی امداد اور خبرگیری کرتی رہی ترکی میں عورتوں کی یہ پہلی کلب تھی۔ گو اس کلب کا دائرۂ عمل بالکل محدود تھا مگر تاہم اس نے نہایت مفید کام اس کلب کی زیر نگرانی استنبول میں ایک ہسپتال قائم کیا۔ جس میں ۳۰ مریضوں کے بستر موجود تھے۔

"جدید توران" تصنیف کو مقبولیت عام نصیب ہوئی۔ اس تصنیف کی مقبولیت کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ چند فوجی افسران نے جو طرابلس سے جنگ بلقان میں شرکت کے لئے آئے تھے انہوں نے اپنے افسران اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق ایک خط مصنفہ کو لکھا جس سے ان افسران کی اپنے ملک کے لئے بے پناہ جذبۂ خدمت و ایثار کا پتہ چلتا تھا۔

یہ میں ہمیشہ اس کتاب کو دل و جان سے محبوب رکھونگی چونکہ اس کتاب کے مطالعہ سے موجودہ مصائب کے باوجود نوجوان افسروں کے دلوں میں ملک و قوم کی خدمت کے بے پناہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔"

بالآخر بلغاروی فوجیں پسپا ہوئیں اور شتلجہ اور قسطنطنیہ محفوظ رہے۔ مجروحین اور پناہ گزینوں کی امداد کے لئے ایک نیم سرکاری جماعت قائم کی گئی۔ طبی نسواں کلب کے منتظمین نے اپنا ایک اجلاس یونیورسٹی ہال میں کیا۔ اس اجلاس میں خواتین بھی مقررین تھیں۔ ان کی تقریروں میں اس قدر جوش و اثر تھا کہ حاضرین مستورات اپنے زیورات تک پھینک رہی تھیں۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں خالدہ ادیب خانم دل کے مرض میں مبتلا ہوگئیں اور ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ انہی ایام میں انور اور طلعت ۲۰۰ فداکار سپاہیوں کے ساتھ باب عالی کی طرف بڑھے۔ تاکہ وزیر اعظم کامل پاشا کو مستعفی ہونے پر مجبور کریں۔ چونکہ اس کی وزارت نے ایڈریانوپل بلغاریوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس موقعہ پر اتفاقیہ گولی چل جانے سے ناظم پاشا اور اس کے دو ساتھی وہیں ڈھیر ہوگئے۔ اسکے بعد ایڈریانوپل ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس پر ۱۹۱۳ء میں دوبارہ قبضہ ہوا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک اتحادی جماعت نے ملک کی آئینی خدمات سرانجام دیں۔ انور پاشا نے فوجی اصلاحات کیں اور جاوید بے نے محکمۂ مالیات میں ترقیات کیں۔ شعبۂ تعلیم کی طرف حکومت کی پوری توجہ تھی۔ تمام ملک میں سکول اور کالج کھولے گئے شکری بے کا اصول یہ تھا کہ سب کو خواندہ کر دیا جائے۔ خواہ وہ تعلیم ابتدائی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر خالدہ ادیب خانم اس نظریہ کی معترف تھی کہ تعلیم نوعیت کے اعتبار سے بھی بلند ہونی چاہیئے۔ دونوں کے نظریوں میں اختلاف خالدہ ادیب خانم کے استعفیٰ کا باعث ہوا۔

$\frac{1913}{1914}$ء کی درمیانی مدت میں اوقاف مدرسے خالدہ ادیب خانم اور ملک کی ایک اور مشہور معلمہ کی مدد سے قائم ہوتے مگر ان دونوں کو بہت جلد اس سے دستبردار ہونا۔ اس کی وجہ بھی شکری بے تھا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ترکی اتحادیوں کے برخلاف یورپ کی وسطی طاقتوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ سال ۱۹۱۶ء میں جمال پاشا نے خالدہ ادیب خانم کو شام میں طلب کیا۔ تاکہ وہاں وہ ایک تعلیمی نظام ملک کے لئے تجویز کرے۔ چنانچہ وہ موسم گرما میں شام کے

کے علاقہ میں پہونچیں۔ اور اس نے تمام ملک کا دورہ کیا اور وہاں کے سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات کی اور ایک نہایت مفید تعلیمی نظام پیش کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ نظام تشنۂ تکمیل رہا۔ کیونکہ بہت جلدی ہی ترکوں کو اس علاقہ سے دستبردار ہونا پڑا۔

جنگِ عظیم کے دوران میں جب متخاصمین نے عارضی صلحنامہ پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اور اتحادیوں کی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہوگئیں تو میں نے اپنے میں ناقابلِ برداشت تھکان اور دکھ محسوس کیا۔

قسطنطنیہ کے مرد وزن کی عزت ان ایام میں معرضِ خطر میں تھی۔ مگر اتحادی فوجوں کی بربریت اتنی پریشان کن نہ تھی جتنی یونانیوں کی بربریت سمرنا میں دیکھی گئی۔ مئی ۱۹۱۹ء میں جب یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کیا۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا سمرنا کو دوزخ میں جھونک دیا گیا ہے۔ اتحادیوں کے مقاصد اب ظاہر ہوگئے تھے۔ کہ وہ نہ صرف ترکی کو ذلیل کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے عزائم رکھتے تھے!

ان دنوں مجھے تمام مشاغل یکسر بھول گئے۔ مجھے کوئی شئے محبوب نہ تھی۔ دیوانہ وار میں اپنی قوم کی طرف دیکھتی تھی۔ میں نے اپنی انفرادی حیثیت کو مفادِ ملت میں جذب کر دیا۔ ہر مقام پر ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ سلطان کی بارگاہ میں جمہوریت ترکیہ کی امداد کے لئے پہونچی۔ مگر سلطان نے ملنے سے انکار کر دیا۔ مایوس ہوکر محلات کے قریب سلطان احمد کی مسجد میں ایک ہنگامہ خیز تقریر کی۔ ہر وقت سر پر اتحادیوں کے ہوائی جہاز منڈلا رہے تھے۔ جلسہ میں آہوں اور آنسوؤں کا ایک ہیبتناک منظر تھا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے اراکین مالٹا میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں خالدہ ادیب خانم قسطنطنیہ سے انگورہ روانہ ہوگئیں۔ وہاں کاظم قرہ بکر۔ مصطفےٰ کمال۔ رفعت بے اور رؤف بے ایک متوازی حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ یہاں خالدہ نے انگلستان فرانس اور امریکہ کے اخبارات کو صحیح حالات سے آگاہ کرنے کا فرض انجام دیا۔ انگورہ میں مصطفےٰ کمال کی ملاقات کے بعد اپنی سوانح حیات مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔

خالدہ ملک میں ہمہ گیر اثر رکھتی تھی۔ اور ہر طبقہ میں ہر دلعزیز تھی۔ مصطفےٰ کمال بھی اس کے قرب کو اپنے تاریکی ہنگاموں میں ایک نیک فال سمجھتا تھا۔ جنگ سکاریہ میں خالدہ خانم مصطفےٰ کمال کے ہمراہ تھی۔ اور خود غازی کمال نے اسے وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ خالدہ ادیب علاوہ نامہ نگار کے ایک نہایت مستعد اور قابل نرس کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں کام کر چکی ہیں۔ جب یونانی علاقہ انگورہ سے واپس ہو رہے تھے اور راستہ میں دیہات کو تباہ و برباد کرتے جا رہے تھے۔ وہ ایک تیماردار کی حیثیت سے زخمیوں اور مجروحین کی مرہم پٹی کرتی جا رہی تھی۔

یہ ہیں ملتِ ترکیہ کی مایۂ ناز خاتون کے مختصر سوانح حیات جن کی علمی اور تاریخی تقاریر آجکل اخبارات کے ذریعہ قارئین کے مطالعہ سے گذری ہونگی۔

رُوحِ جذبات

از جناب پروفیسر اکبر حیدری

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء)

جامعہ:

حضرت اکبر حیدری نے اس کوچۂ شعر و شاعری کو بالکل چھوڑ دیا کہ جو جذبات اور ہوس پرستی کا ہے۔ اُن کا دماغی تخیل۔ حقائق فطرت کے جمالیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہے۔ اور ان کا قلم چمنستان شاعری کی روشوں پر محوِ خرام ہے۔ جہاں لطائف فطرت پھول بنکر کھلتے ہیں۔ اور بو بنکر مہکتے ہیں انہوں نے اپنی شاہراہ آپ پیدا کی ہے۔ جو شعریت کے ساتھ حقیقت تک پہنچتی ہے۔ کاش ان کا اثر متعدی ہو۔ اور پرانے بھٹکتے ہوئے اس راہ پر آجائیں۔ تو اُردو شاعری کی زمین آسمان ہو جائے "

معارف:

جناب اکبر حیدری اُردو کے روشناس ادیب اور شاعر ہیں۔ اُن کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "روح جذبات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اکبر حیدری کی شاعری میں تخیل آفرینیاں ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اُسے اپنے عزم و یقین اور ترتیب و توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ طریقۂ ادا سلیس اور سادہ ہے مغلق اور بے معنی فارسی ترکیبیں نظر نہیں آتیں۔

ہمارے نو مشق شعرا اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں "

زمانہ:

"۔۔۔ اکبر صاحب اُن لوگوں میں ہیں جو اُردو شاعری کو قدیم اور مسلمہ پابندیوں سے اس حد تک آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ کہ یہ آزادی باعث خطرہ ہو چنانچہ اس مجموعہ میں جتنی نظمیں ہیں سب میں یہ آزادی نمایاں ہے مخمس میں عموماً پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ یا ردیف و قافیہ کی پابندی کی گئی ہے یہاں میں ہر ایک بند کا پہلا اور تیسرا مصرعہ الگ ہم قافیہ ہے۔ اور دوسرا اور چوتھا علیحدہ قوافی رکھتا ہے۔ البتہ ٹیپ کے دونوں مصرعے قدیم دستور کے مطابق ہم قافیہ ہیں۔ اگرچہ یہ جدت مروجہ اصول کے خلاف ہے مگر ان مغرب پرست شعرا کی جدت کے مقابلہ میں بدرجۂ غایت بہتر اور خوشگوار ہے۔ جو اُردو شاعری کو ردیف و قافیہ حتیٰ کہ بعض حالات میں بحر کی پابندی سے بھی آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جس قدر کلام پیش کیا گیا ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کرینگے "

مجھے افسوس ہے کہ مضمون کا اختصار مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں ان تمام آرا کو نظر انداز کردوں جو یا تو میرے کرمفرما ایڈیٹروں نے لکھی ہیں۔ یا جنکی اہمیت کم سے زیادہ نہیں کہ آفتاب کو آفتاب کہدیا جائے!

آب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ کیجئے۔ میرا ایمان ہے کہ "روح جذبات" کی اشاعت ان کم نظر حضرات کیلئے (جنہوں نے اس تصنیف کے خلاف عموماً اور میرے خلاف خصوصاً ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے) کبھی بھی اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی۔ اگر مندرجۂ بالا الفاظ میں اس کا خیر مقدم نہ کیا جاتا۔

ذرا ان الزامات پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

(۱) اکبر حیدری چونکہ اہل زبان نہیں۔ اس لئے اس کی شاعری کسی توجہ کی محتاج نہیں (۲) اکبر حیدری کی شاعری کو ہندوستان کی شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ (۳) اکبر حیدری کا دیوان شاعرانہ خامیوں سے لبریز ہے۔ (۴) اساتذہ کے وضع کردہ اصولوں سے انحراف اکبر حیدری کا طغرائے امتیاز ہے۔ وغیرہ وغیرہ

(۱) اہلِ زبان

یہ اعتراض صحیح ہے کہ اکبر حیدری اہلِ زبان نہیں۔ اور خدا وہ دن نہ لائے کہ اکبر حیدری اہلِ زبان ہونے کا دعوے کرے۔ یہ دعویٰ تو کچھ اُنہیں حضرات کے مُنہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے جو پدرم سلطان بود سے زیادہ اور کچھ پڑھے ہی نہیں اکبر حیدری کا اہلِ زبان نہ ہونا اکبر حیدری کے لئے ندامت کا باعث نہیں۔ اس اعتراض پر تو اُن حضرات کو نادم ہونا چاہئیے۔ جو گذشتہ ایک صدی سے اہلِ زبان ہونے کا دعوے کر رہے ہیں۔ اور جنہوں نے اُردو کی اشاعت اور نشوونما کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اِن بلند بانگ دعووں کے باوجود اہلِ زبان ہونا اگر دہلی اور لکھنؤ تک محدود ہے تو انصاف کیجئے کہ ان علمبردارانِ اُردو کی قدر و قیمت کیا ہے جو بدنصیب قوم لکھنؤ اور دہلی کے گرد و نواح میں بھی اُردو کی اشاعت نہ کر سکے۔ وہ کس عزت اور سلوک کی مستحق ہے۔

اکبر حیدری دہلی سے صرف ایک سو میل کے فاصلے پر انبالہ چھاؤنی میں پیدا ہوا بیس سال تک وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اور اب گذشتہ بائیس سال سے مسلسل دہلی میں مقیم ہے۔ مگر اس قرب کے باوجود وہ آج تک اگر اہلِ زبان نہ بن سکا۔ تو یہ کس کا قصور ہے۔

اس سخن گسترانہ تمہید کے بعد میں اعتراف کئے لیتا ہوں کہ میں اہلِ زبان نہیں

تعریف دوست ہوں نہ تعارف پسند ہوں ؛ عزت کی آرزو ہے نہ شہرت کی جستجو
گوشہ نشیں فقیر ہوں سب سے بلند ہوں ؛ میری نظر میں ہے ابھی کچھ میری آبرو
خدمت گذار اُردوئے آشفتہ حال ہوں
اہلِ زباں نہیں ہوں میں اہلِ کمال ہوں

---

(۱) تغزّل

دِلی کے ایک فرشتہ صورت شاعر کی رائے ہے کہ اکبر حیدری کے کلام میں تغزّل کا فقدان ہے اور یہی وہ رائے ہے جو دِلی کے ہر نو مشق شاعر کا تکیۂ کلام بنی ہوئی ہے۔

مجھے معلوم نہیں قابل نقاد کا مفہوم تغزّل سے کیا ہے۔ اور اس لفظ کو کن معانی اور مطالب کی صورت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اُن کا مطلب غزل یا غزل سے ہے۔

غزل اُس کلام کو کہتے ہیں جس میں عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف ہو اور غزل اس شخص کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے۔ جو عورتوں کی اور اُن کے عشق کی باتیں کرے۔

ظاہر ہے کہ کسی خوددار انسان سے اِن دونوں باتوں میں سے کسی ایک کی امید رکھنا کھلی ہوئی اوباشی نہیں تو اور کیا ہے؟

بندہ نواز! غزل کے اصطلاحی معنی کو نظر انداز کر دیجئے اور اُردو کے دورِ گزشتہ کے شاعروں کے دیوان مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد آپکو ماننا پڑیگا کہ جس چیز کو آپ کے شاعروں نے غزل کہکر پیش کیا ہے وہ درحقیقت رندی، سرمستی، اوباشی اور گنہگاری کی تعلیم ہے جس نے تمام ہندوستانیوں کو عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصاً اس منزل میں پہنچا دیا ہے جہاں اُنہیں انسان یا مسلمان کہنا انسانیت کی اور اسلام کی توہین ہے۔

مجھے اس پر ناز ہے کہ جس چیز کو آپ تغزّل کہتے ہیں میرے دیوان میں موجود نہیں۔ شاعر کے متعلق میری رائے کیا ہے اور میں شاعر کو کتنا بلند سمجھتا ہوں میرے اس قطعہ میں ملاحظہ کیجئے! ؎

جلوہ ہائے حسن کا ناظر ہوں میں ؛ اپنے احساسات پر قادر ہوں میں
احترامِ حسن میرا فرض ہے ؛ کیا کروں مجبور ہوں شاعر ہوں میں
کیا اس سے زیادہ حُسن کی تعریف ہو سکتی ہے؟

(۳) ہندوستان کی شاعری

"اکبر حیدری کی شاعری کو ہندوستان کی شاعری نہیں کہا جا سکتا"

اس اعتراض کا جواب بہت آسان تھا۔ اگر قابل معترض "نہیں کہا جا سکتا" کی بجائے ایک فیصلہ کُن "نہیں" پر اپنے اعتراض کو ختم کر دیتے۔

مجھے حیرت ہے کہ قابل معترض کو یہ حق کس طرح حاصل ہو گیا کہ وہ اس دلیری سے مخرّبِ اخلاق اور عصمت سوز غزلیات کو "ہندوستان کی شاعری" کہہ رہے ہیں۔

"ادب" کی صحیح تعریف میرے نزدیک یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے قوم کا ہر فرد وہ مرد ہو یا عورت۔ لڑکا ہو یا لڑکی بے تکلف لطف اندوز ہو سکے۔

ادب کا یہ معیار قائم کرنے کے بعد اگر میں نے تشریح جذبات کو ایک معیار پر مرتب کیا۔ تو آخر کونسا جرم کیا۔ مجھے اپنی کاوش کی پوری داد مل گئی جب میں نے ہندوستانی خواتین کے مایۂ ناز صحیفے "سہیلی" میں یہ فقرہ دیکھا۔

"دنیا نے شاعری میں "رُوحِ جذبات" ہی ایک ایسی تصنیف ہے جس کو ہم آزادی سے اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے مطالعہ کیلئے وقف کر سکتے ہیں"

مَیں قابل نقاد اور اُن کے ہمنوا معترضین کو بتانا چاہتا ہوں کہ اکبر حیدری کی شاعری اگر ہندوستان کے دَورِ گزشتہ کی شاعری نہیں ہے تو انہیں ماتم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان کی آئندہ شاعری کی بنیاد "رُوحِ جذبات" کے پیش کردہ نقوش پر رکھی جائیگی۔ اور اس بنیاد رکھنے والوں میں مرد اور عورت کی تخصیص نہ ہوگی۔ اگر قابل معترض کا شاہد انہیں دھوکا نہیں دے رہا ہے تو وہ غور سے شاعری کی اس رفتار کو دیکھیں جو رُوحِ جذبات کے مطالعہ کے بعد شروع ہوئی۔ اور تیزی سے اُسی منزل کی طرف چلی آرہی ہے۔ جہاں "رُوحِ جذبات" جلوہ گر ہے۔

(۴) شاعرانہ خامیاں

اور

(۵) اساتذہ کے وضع کردہ اصُول

نہ "رُوحِ جذبات" کوئی الہامی کتاب تھی۔ کہ اُس میں کوئی غلطی نہ ہوتی نہ اس کے مصنف یا ناشر نے کبھی کوئی ایسا اعلان کیا بلکہ سچ پوچھئے۔ تو مَیں خوش ہوں کہ "رُوحِ جذبات" میں خامیاں موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے مَیں اپنے آپکو انسان سمجھنے کی بجائے فرشتہ سمجھنے لگتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان خامیوں کی اہمیت اور نوعیت کیا ہے۔ کیا یہ اتنی اہم ہیں کہ ان کی موجودگی میں "رُوحِ جذبات" کی تمام خوبیاں نظر انداز کر کے رات دن ان کا چرچا کیا جائے۔

اُن تمام خطوط میں جو مجھے موصول ہوئے ہیں، تین اور صرف تین تنقیدیں ہیں اور یہ تنقیدیں اُن بالغ نظر حضرات کے قلم سے نکلی ہیں جن کی رائے مستند ہے اور جن کا مقصد تخریب نہیں تعمیر ہے۔ مَیں ممنون ہوں کہ ان حضرات نے مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کیا۔ آئندہ ان سے بچنے کی کوشش کرونگا۔

یہ تنقیدیں کسی صحیفے میں شائع نہیں ہوئیں بلکہ نجی طور پر میرے پاس بھیجی گئی تھیں، پہلی تنقید علامہ احسن مارہروی کی ہے۔ آپنے بڑی محنت سے اور بہت تفصیل سے ہر چیز پر بحث کی ہے اور مجھے دوبارہ بعض ایسی قیود میں جکڑنے کی کوشش کی ہے۔ جن سے آزاد ہونا مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس تنقید کی اشاعت اور اس کے جواب کی تفصیل ایک مکمل مضمون کی محتاج ہے جو آئندہ کسی وقت مرتب ہو سکے گا۔

دوسری تنقید حضرت اثر صہبائی کی ہے مگر یہ اس قدر مختصر ہے کہ اس سے اس مضمون کی تکمیل نہ ہوسکیگی

تیسری تنقید جو سب سے زیادہ مکمل ہے۔ علامہ مولانا عبدالستار صاحب صدیقی ایم اے پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے عطا فرمائی ہے۔ اس مضمون کی تکمیل کے لئے مَیں یہ تنقید پیش کرتا ہوں۔ مَیں نے اس تنقید کو چار حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ پہلے حصے میں آپکی رائے ہے۔ دوسرے میں وہ باتیں ہیں جن میں آپ مجھ سے متفق ہیں۔ تیسرا حصہ بحث طلب ہے۔ اور چوتھے میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) حضرت اکبر حیدری کی شاعری کا کیا کہنا۔ ملک کو ایسی ہی حقیقی شاعری کی ضرورت ہے۔ شاعری کی بڑی خوبی میرے ذہن میں یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے دل میں ہو وہ شعر میں ظاہر ہو۔ لفظ سیدھے سادے ہوں اور ضرورت سے نہ کم نہ زیادہ۔ حضرت اکبر کے کلام میں یہ سب خوبیاں ہیں اللھم زد فزد۔

(۲) (الف) یہ دیکھکر بیحد خوشی ہوئی۔ کہ جناب اکبر اپنی شاعری پر زبردستی کی قیدیں نہیں عائد کرتے۔ چنانچہ "نفس" کو "بزم" کا قافیہ لاتے ہیں۔ شیخ سعدی اور فردوسی نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ؎

یکے طاس ہریسہ صابحی ⁂ بہتر ز ہزار مرغ و ماہی (سعدی)
کہ اے شاہِ آفاق کسریٰ لعدل ⁂ اگر من نہ مانم توانی بفضل

دوسرے شعر میں "ض" کا تلفظ عربی طریق پر کر کے "د" کے مقابلے میں لاتے ہیں: فردوسی کہتا ہے ؎

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی ⁂ خداوند امر و خداوند نہی

حرفِ قید کو اس ڈھنگ سے لانا روا ہے، نامناسب ہرگز نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہماری زبان میں ث، س اور ص کا تلفظ ایک ہے۔ ح اور ہ کا ایک۔ ز اور ذ اور ظ و ض چاروں کا ایک۔ پھر قافیے میں کیا عیب!

(ب) اعلانِ نون کے امر میں بھی مجھے حضرت اکبر کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔

(۳) الف ۔ اسی سلسلہ میں اگر میں چند ا صحاب کی طرف دوستانہ طور پر توجہ دلاؤں تو خدا کے لئے اسے تعرض یا نکتہ چینی نہ تصور فرمائیگا۔

(۱) صفحہ ۱۰۔ ۵ "روح رواں" ٹھیک نہیں۔ اس کے معنی ہونگے "چلتی ہوئی روح" مگر یہ جب صحیح ہوتا کہ ایک ساکن روح بھی ممکن ہوتی۔ لوگ اس "روح رواں" کو انگریزی (moving spirit) کا ترجمہ جانتے ہیں۔ مگر یہ ترجمہ بھی درست نہیں۔ اس مفہوم کے ادا کرنے کو "روح متحرک" ہوتا۔ تو بھی ایک بات تھی۔ مگر یہ تکلف ہے صحیح لفظ ہے "روح و رواں" جس چیز کو عربی میں "روح" کہتے ہیں۔ اُسی کو فارسی میں "رواں" کہتے ہیں دونوں کو واؤ عاطفہ کے ذریعے سے جوڑ کر تاکید و تفسیر کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ "روح و رواں" ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کاتب نے اپنی رائے سے "و" اُڑا دیا ہو۔

(۲) صفحہ ۷، ۵ سطر ۲ "سَنبد" میں "ب" کا زبر چاہیئے "سَنبد" صحیح نہیں۔

(۳) ب۔ (۱) صفحہ ۲۵ : "ماہِ تاباں کی شعاعیں مجھ میں جذب ہونے لگیں" اس مصرعے میں یا تو "ب" گرتی ہے یا "ہ"۔ اور یہ کسی طرح روا نہیں ہوسکتا۔ (۲) "رند بادہ نوش رہنے دیں مجھے" صفحہ ۸، ۔ اس مصرعہ میں "بادہ" کی "ہ" حد سے زائد کھینچ گئی ہے۔ "بادہ" کی بجائے "صہبا" کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

(۴) کچھ غلطیاں کتابت کی نظر پڑیں۔ ان کو لکھے دیتا ہوں کہ آئندہ اشاعت کے وقت خیال رکھا جائے۔

صفحہ ۴۔ اخیر سطر "ہوشیار" کی جگہ "ہُشیار" چاہیئے۔

صفحہ ۷ سطر ۱۔ صفحہ ۹ سطر ۷ "تماشہ" صحیح نہیں "تماشا" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۱۳ سطر ۷، ۸ "انسانیت" اور "نفسانیت" کی "ی" پر اس شعر میں تشدید ہونی چاہیئے۔

صفحہ ۲۰ سطر ۲ "کلیھا" ہندی لفظ ہے "الف" سے لکھنا چاہیئے۔

صفحہ ۳۹ سطر ۱ "برقع" میں "ع" نہیں ہے۔ حذف کرنا بہتر ہوگا۔

صفحہ ۹۱ سطر ۲ "حیات ذا" کی جگہ "حیات زا" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۹۵ سطر ۵ "میرے حسرت" کی جگہ "میری حسرت" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۱۰ سطر ۷ "پیوں" کی جگہ "پیڑوں" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۴۹ سطر ۳ "بیان" کے نون کے نیچے بھی زیر لگا دینا چاہیئے۔

صفحہ ۴۹ سطر ۵ "وقار" صحیح نہیں "وُقار" چاہیئے۔

اس تنقید کے پہلے حصے کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے حصے کی تائید میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

سرمد فرماتے ہیں۔ ؎

سرمد بقمارِ عشق بازی نہ برند ! ٭ تا سر ندہی بہ سرفرازی نہ برند
مے خور ز مے خور اگر حضوری خواہی ٭ ناکردہ گناہ پیشِ قاضی نہ برند

"نظم" اور "بزم" پر اعتراض کرنیوالے علامہ صدیقی صاحب کی رائے کے بعد "سرفرازی" اور "قاضی" کا قافیہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد علامہ کیفی دہلوی کی عطا کردہ مثالیں لیجئے۔ ؎

(حافظ) صلاحِ کار کجا و من خراب کجا ٭ ببیں تفاوتِ رہ از کجا تا بکجا
این منم این من کہ دیں کالبد است ٭ ہیچ گو جنبشِ این قالب است

(حالی) اے شعر دلپذیر نہ ہو تو تو غم نہیں ٭ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بتیدلوں کی بعد اسکے خلاف ہو تو تجھ کو شاذ تو

"خراب کجا" اور "تا بکجا" "کالب" اور "قالب" "دلگداز" اور "شاذ"۔ یہ قافیے ملاحظہ کیجئے اور اس کے بعد "نظم" اور "بزم" کو جائز کیجئے۔ اس کے بعد آپکو اختیار ہے۔ کہ "حفیظ" کا قافیہ "غلیظ" استعمال کرنے کی بجائے "عزیز" "تمیز" اور "عریض" استعمال کریں۔

اعلانِ نون کے جواز میں مندرجہ ذیل مثالیں حاضر ہیں۔ ؎

(غالب) بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں ٭ فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کیا ہے کعبہ علی کے قدم سے جان ٭ نافِ زمین نہ کہہ نافِ غزال ہے

(ذہین لکھنوی) پُر شوق میرے لال ٭ پُر ارمان میرے لال

(مصحفی) آویزۂ لعل اسکا جو میں کان میں دیکھا ٭ صد لخت جگر دیدۂ گریان میں دیکھا
پہنے ہوئے دیکھا ہے اسے سرخ جو جامہ ٭ ہے چلہ خوں تا بگریبان ہمارے

(میر حسن) درد فراق۔ زخم جگر۔ داغ دل حسن ٭ کیا کیا نہ وہ ہمیں گُلِ خندان دے چکا
محشر کا بھی دن کم نہیں آفت ہے ولیکن ٭ کرتی ہے قیامت شبِ ہجران بہت کچھ

غالب، مصحفی اور میر حسن کے دو دو شعر اس بات کی دلیل ہیں کہ ان اساتذہ نے عمداً اعلانِ نون کو جائز رکھا۔ اب میرا وہ قطعہ جس میں اعلان نون

کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کچھ ہو کر صبر کی تلقین کر، کچھ تو پاس خاطر غمگین کر
خوبیعا تیری عادت ہی سہی، لیکن ذرا کم دوست کی تسکین کر

تیسرے حصے میں دو جزو ہیں (الف اور ب) الف کی دونوں غلطیاں یقیناً غلطیاں ہیں۔ پہلی کم علمی کا نتیجہ ہے اور دوسری سہو کا۔ "موج رواں" کو میں نے تحقیق کے بغیر صحیح سمجھکر استعمال کیا۔ یہ کاتب کی نہیں بلکہ میری غلطی ہے۔ "شبد" مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ساکن نہیں متحرک سہواً ساکن ہوگیا۔ یہ دونوں غلطیاں آئندہ درست کردی جائینگی

دوسرا جزو (ب) میرے نقطۂ نظر سے بحث طلب ہے۔ "سقوطِ حروف" اور "ہائے مختفی کی بجائے الف کا استعمال" یہ دونوں چیزیں میں جائز کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی ہزارہا مثالیں اساتذہ کے ہاں ملتی ہیں اور جب "غزل گو" شاعر اس سے نہ بچ سکے تو "نظم نگار" جس کے نزدیک اپنے مفہوم کو ادا کرنا شاعر کا سب سے پہلا فرض ہے۔ کس طرح بچ سکتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سقوطِ حروف

(حالی) بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

(میر) عالمِ حسن ہے عجب عالم ❊ چاہیئے عشق بھی اس عالم کا

(شاہ نصیر) چہرے کا رنگ کس طرح بدلے موجِ اشک
زنجیر ہو رہی ہے ہمارے شکستِ رنگ

(حفیظ جونپوری) اُٹھ گئے دنیا سے لوگ علم و عمل
وے گئے وہ جس قدر پیدا کیا۔

(عاشق دہلوی) بعد مدت کے آج بادہ کشو
تھوڑی سی تلچھٹ ہاتھ آئی ہے

اِن اشعار میں (۱) پھونک کی ک (۲) عالم کی م (۳) کسطرح کی ح (۴) لوگ کا گ (۵) ہاتھ کی ھ سب ساقط ہیں۔

"ہ کی بجائے الف"

(غالب) ہوئی مستعد بانداز شعلہ ❊ کہ مستی ہیں تیرے کوچہ میں ہر دم دیوار

(ناسخ) ایک شب جو تیری محفل میں نہ پائے بار شمع
صبح ہوتے ہوتے ہو جاتی ہے گشتہ دار شمع

(آتش) حسن بے پردہ کا عالم جلوہ گر پایا جنگل میں
دم پھڑک جاتا ہے عریاں دیکھکر تلوار کو

(اسیر) شبنم و گل سے جنوں کے جوش میں ہم نے اسیر
حالِ گریہ کہدیا احوالِ خندہ کہدیا۔

(نسیم) سچ تو یہ ہے مرگِ عاشق کے تصدق جائیے
چشم مصروفِ نظارہ سر تہِ زانوئے دوست

مضمون کو طوالت سے بچانے کے لئے میں نے بہت اختصار سے کام لیا۔ ورنہ اساتذۂ قدیم و جدید کے ہاں بے انتہا مثالیں موجود ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ "اوراق پارینہ" میں ان باتوں کو عیوب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر جس طرح قدیم بزرگوں کو ان باتوں کو عیب کہہ دینے کا حق حاصل تھا اسی طرح آج ہم کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان عیوب کو عیوب نہ سمجھیں۔

آخری حصے کے متعلق میں کوشش کرونگا کہ کتابت کی یہ غلطیاں درست کردی جائیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں یا ناشر نئی غلطیوں کے ذمہ دار نہ ہونگے؛

اب آپ نے "لُوحِ جذبات" کے دونوں رُخ دیکھ لئے۔ اس کے بعد آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ اسے بیکار یا کارآمد جو چاہیں سمجھیں میں آئندہ اس موضوع پر اور کچھ نہ لکھونگا۔ تنقید نگار حضرات کو آزادی ہے وہ جو چاہیں لکھیں میری معذرت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

؎

فرصت کسے کہ ہر کس و ناکس سے ہو خطاب ❊ تم دوست تھے ہیں اسباب کامیاب
اتنا کیا کہ اپنی نظر سے گرادیا ❊ دشمن کی دشمنی کا نہ تھا اور کچھ جواب

(اکبر حیدری)

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے (مینیجر)

جلد ۲۲ فہرست مضامین عالمگیر ماہ اپریل ۱۹۳۵ء نمبر ۴

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

مُلاحظات

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مدظلہ نے عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۵ء کے متعلق جن گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے میں ... ساتھ ذیل میں ان کو درج کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ عالمگیر کی ... اور قدر افزائی قابل رشک ہے کہ مسلم الثبوت اہل قلم ... ناچیز کوششوں کی کامیابی کا کمال فراخدلی سے ... فرماتے ہیں۔

مدت کئی برس سے ... اپنے رسالہ کا خاص نمبر نکالتا ہے اور اس نمبر کی آرائش و زیبائش میں ... کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ مشاہیر سے نظم و نثر میں مضامین ... وغیرہ لکھائی جاتی ہیں۔ مشہور و مقبول تصویروں کا انتظام ہوتا ہے ... سب کچھ صحیح لیکن مدیر اپنی قابلیت سے کام نہ لے ان سب چیزوں کو دیکھنے سے نہ سجائے تو بجائے خوبیوں کے نقائص ہی نقائص نظر آتے ہیں۔ اس معاملے میں جناب حافظ محمد عالم صاحب کو جس قدر بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔ یہ اپنے رسالہ میں ہر بات کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر کا ہر نمبر اپنی جگہ خاص نمبر ہوتا ہے۔ میں برابر دیکھ رہا ہوں کہ جس محنت و جانفشانی سے یہ کام لیتے ہیں کسی رسالے کا کوئی مدیر نہیں لیتا۔ یہ اپنے رسالہ کو اپنے نقطۂ نظر سے ترتیب دیتے ہیں اور سنوارنے میں کوئی فروگذاشت نہیں کرتے۔

اس وقت ۱۹۳۵ء کا خاص نمبر میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

واللہ باللہ میں اس کی کماحقہ تعریف نہیں کرسکتا کہ یہ کیا چیز ہے ہر مضمون بہتر ہر نظم لاجواب، ہر غزل بے نظیر، ہر تصویر دلکش، لکھائی چھپائی دیدہ زیب کس کس بات کے متعلق لکھوں۔ ... خوبیوں کو سراہوں اگرچہ یہ چار آنے ہیں کسی صورت سے یہ جواہر پارے گراں نہیں اس پر طرہ یہ کہ اگر چار روپیہ سالانہ بھیج دیا جائے تو اور نمبروں کے ساتھ یہ نمبر بھی مل جاتا ہے اس طرح اس کو مفت ہی سمجھنا چاہئے۔

یہ نمبر شروع ہو کر ۲۰۰ صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ ۷ تصویریں اور ۹۷ نظم و نثر کی سرخیاں ہیں میں نے دوبار پڑھا اور کم سے کم ایک بار اور پڑھوں گا۔

جس بات کو لکھنے والوں نے اٹھایا ہے اس کے نباہنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی مضمون کو پڑھنا شروع کیا جائے اور وہ بغیر ختم کئے ہوئے چھوٹ سکے۔ جس تحریر میں اتنی دلکشی نہ ہو وہ میرے خیال میں تحریر ہی نہیں۔ میں کرر حافظ محمد عالم صاحب کو بغیر داد دیئے نہیں رہ سکتا فی الحقیقت وہ اردو زبان کی خدمت بڑی حد تک کر رہے ہیں اور یہ نمبر تو انھوں نے ایسا نکالا ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انگریزی رسالوں کے مقابلے میں چھپائی وغیرہ کے لحاظ سے اردو رسالے کوئی نسبت نہیں رکھتے وہ میرے کہنے سے اس سالنامہ کو دیکھیں اور پھر اپنی رائے قائم کریں۔

نوح ناروی،

خاص نمبر ۱۹۳۵ء

کے متعلق تو آپ نے حضرت نوح ناروی کی رائے پڑھ لی۔ پیشتر ازیں جلیل القدر عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ استاد حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے قطعات متعلقہ خاص نمبر ۱۹۳۵ء بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں اب عالمگیر کے سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء کا بھی ایک کیف زا بیقراری کے ساتھ انتظار فرمایئے جو حسب معمول جون ۱۹۳۵ء میں اپنی معرکہ آرا امتیازی خصوصیات کے ساتھ شائع ہوگا ہر لحاظ سے یہ سالانہ نمبر اتنا وقیع ہوگا، کہ ہر دیکھنے والا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگا اس کی قیمت ایک روپیہ چار آنے ہوگی لیکن عالمگیر کے مستقل خریدار حضرات کو خاص نمبر کی طرح یہ سالانہ نمبر بھی مفت ملیگا۔ جو حضرات خریدار نہیں وہ آج ہی ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجدیں۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ مدیر رسالہ عالمگیر

عالمگیر

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

اکبر بادشاہ کا بیٹا جہانگیر اور جہانگیر کا بیٹا شاہجہاں اور شاہجہاں کے فرزند عالمگیر بادشاہ تھے۔ ۴ نومبر ۱۶۱۸ء میں رات کو بمقام دھوند سرحد مالوہ پر پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ عربی کے صرف و نحو کے بعد فقہ کی کتابیں پڑھیں پھر درسیات سے فراغت حاصل کی، نہایت صغرسنی میں زندگی کے مشکل مرحلے طے کرنے کے عادی تھے۔ ۱۶۴۳ء میں جب کہ ان کی عمر ۲۵ برس کی تھی تارک الدنیا ہو کر مغربی پہاڑ کی گھاٹیوں کے ویران مقامات میں گمنامی کی زندگی اختیار کی اور نفس کشی کی محنت شاقہ اور ریاضت میں صوفیائے کرام کی طرح فقر و فاقہ پر قناعت کر کے عبادت میں مصروف رہے۔ چونکہ مغل شہزادوں کے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ وہ صوفیوں کی روش اختیار کریں۔ لہذا اس کی شہرت تمام ہند میں پھیل گئی اور بہت لوگ ان کے معتقد ہو گئے۔ ہاں اہل دنیا کور چشم اس کی مرتبہ شناسی میں معذور تھے۔ وہ اس کو بھی طرح طرح کی شبہات کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر اس کے خاندان کے لوگ اس تقدس اور عبادت سے بہت اثر پذیر ہوئے۔

ان کے بڑے بھائی دارا شکوہ جو خود صوفی کامل تھے ان کو پیرجی کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اسی طرح ایک سال تک مجاہدات و ریاضیات میں بسر کی بعد تکمیل کے گوشہ خانقاہ سے باہر گئے۔ ماہ مئی ۱۶۵۵ء میں انہیں کامل طور پر بادشاہ بننے کا موقع حاصل ہوا تو اس نے اپنا لقب عالمگیر اختیار کیا۔ ہندوستان کے اسلامی مورخ اسے اتقا کا اعلیٰ نمونہ بتاتے ہیں اورنگ زیب حقیقت میں زندہ دل تھے۔

عالمگیر اصول اسلامی کے سخت پابند تھے سلطنت، محبت، آرام، غرض کہ دنیا کی کسی چیز کی اسلام کے مقابلے میں پروا نہیں کی۔

اس نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ قانون بنایا کہ اس سے پیشرو بادشاہوں نے قدیم الایام سے جو محصول چنگی ہندوں کے تیوہاروں اور میلوں پر لی جاتی تھی اس کو ناجائز قرار دیکر معاف کر دی۔ اگرچہ اس عمل سے خزانہ شاہی کا بہت نقصان ہوا مگر کچھ پروا نہ کی۔

وہ صحیح حنفی سنی مذہب رکھتا تھا شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا اس نے فقراء کی طرح حظ نفس کو ترک کر دیا تھا۔ ترک حیوانات کر چکا تھا۔ گوشت نہیں کھاتا تھا شراب کو نجس جانتا تھا۔ بہت دبلا اور کمزور ہو گیا تھا اور اکثر روزے رکھتا تھا۔ ۱۶۶۹ء میں اس کی سلطنت کا زمانہ تھا کہ دنبالہ دار ستارہ نکلا جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بہت منحوس ستارہ ہے عالمگیر اس زمانہ میں غذا ترک کر کے روزے رکھتا تھا اور رات کو بھی سوا پانی پینے کے اور کچھ نہیں کھاتا تھا۔ یہ عمل چار ہفتہ تک کیا خدا نے ستارہ کو دفع کر دیا۔

بعض لکھتے ہیں شب کو افطار صوم کے بعد ذرا سی جوار کی روٹی کھاتا تھا۔ وہ آرام طلب نہ تھا۔ مسہری اور چارپائی پر نہیں سوتا تھا۔ عبادت شب کے بعد زمین پر شیر کی کھال بچھا کر سوتا تھا وہ مملکت کا پیسہ نہیں کھاتا تھا اور بموجب حکم رسول اللہ آپ بھی پیشہ کرتا تھا اور فرصت کے وقت ٹوپیاں بناتا تھا۔ دہلی میں وہ ٹوپیاں تمام مسلمان شوق سے پہنتے تھے۔

حافظ قرآن تھا اور خط نسخ کا نامور خوشنویس تھا۔ بیت اللہ اور مدینہ منورہ میں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف بھیجا تھا۔ بنارس میں گھاٹ کے کنارے جو عالی شان مسجد عالمگیر نے بنوائی تھی جس کو دہرہرے کی مسجد کہتے

ہیں اس میں بھی عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف رکھا ہوا ہے اور فتاویٰ عالمگیری بھی انہیں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ فتوے بھی انہیں کے جمع کئے ہوئے ہیں جو مستند ہیں۔ عالمگیر فیاض تھا۔ فضول خرچ نہ تھا وہ اپنا پیسہ نام و نمود کی جگہ صرف کرنا فضول سمجھتا تھا کیونکہ سلطنت کے پیسے کو وہ رعایا کا پیسہ سمجھتا تھا وہ اس پیسے کو لہو و لعب کی جگہ صرف کرنا گوارہ نہ کرتا تھا مگر خیرات دینے میں وہ قائم وقت تھا۔ تخت نشینی کے کچھ دنوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی جستجو فوجوں کی غارتگری اور خشک سالی کے سبب سے ملک میں قحط پڑ گیا ہے رعیت برباد ہو گئے ہیں۔ کسانوں کو جوتنے بونے کا موقع نہیں ملا ہے اس نے غریب رعایا کے واسطے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور بے خانماں لوگوں کے لئے مکان بنوائے تقریباً اسی روپیہ فیصدی مالگزاری کے معاف کر دیئے۔ سڑک۔ گھاٹ مکانات۔ دکانات کے محصول۔ میلوں کے محصول۔ شراب خانہ اور قمار خانہ کے ٹیکس معاف کرکے رعایا کو خوشحال کر دیا۔

البتہ بعض عاملوں اور حاکموں نے اس کے فرمان کی عدول حکمی کرکے اکثر محصول کی معافی کو نظرانداز کرکے برابر تحصیل وصول کرتے رہے مگر یہ سرکش حاکموں کا اپنا فعل تھا بادشاہ کا اس میں قصور نہ تھا۔ اس کو جب حاکموں کی خلاف ورزی کی خبر ملتی ان پر جرمانے کئے جاتے موقوف کئے جاتے اور ان کو دوسرے مقام پر تبدیل کر دیا جاتا۔ مگر اس رحمدل بادشاہ کے غصہ کو قیام کم تھا خطا بخشی بھی جلد ہو جاتی۔ بادشاہ کی سلطنت کچھ ایسی رحمدل تھی کہ صوبہ جات کے تحصیلداروں کے دل سے سزا پانے کا خوف اٹھ گیا تھا کیونکہ جرم سے سزا کم دی جاتی تھی حاکموں کو ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں جلد بدل دیا جاتا تھا کہ ان کو نمک حرامی کا موقع نہ ملے۔ بہرحال بادشاہ چونکہ سیدھا سادا مسلمان اور نیک دل تھا اس واسطے قرآن شریف کے صحیح حکم کے مطابق مساکین اور مسافروں کی مدد کرتا تھا اور غریب رعایا کی پرورش کا خیال کرتا تھا اس نے کبھی استحصال بالجبر سے رعیت کو نہیں ستایا اور ظلم کو کسی حالت میں پسند نہیں کیا۔

یہ ضروری بات تھی کہ اس نے تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی سازشوں، تدبیروں اور چالوں سے کام لیا تو یہ ایک بادشاہ کی عقلمندی اور دانائی ہے کیونکہ اگر دوسرے بھائی سلطنت لینے میں کامیاب ہو جاتے تو عالمگیر کو ہرگز زندہ نہ چھوڑتے پس اس کے واسطے دو ہی راستے تھے سلطنت یا موت۔ چنانچہ اس نے اپنی جان کے خوف سے سلطنت کے لئے کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی ابتدائی سلطنت کے دربار کا نقشہ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس دیباچہ بادشاہ کی آمد آمد ہوتی تھی تو صدر دروازے پر نوبت خانہ بجنے لگتا تھا۔ جہاں پناہ زرق برق پوشاک زیب تن کئے رونق افروز ہوتے تھے اور ایوان عالی شان کے آخری حصے شہ نشین میں تخت جواہر نگار پر تشریف رکھتے تھے۔ سفید نازک۔ پھولدار اطلس کا جامہ اس پر زری اور ریشم کا بنا ہوا زر لبفت کا سرپیچ بیش قیمت ہیرے اور جواہر کا طرہ اور وسط میں ایک بے مثل زبرجد مثل آفتاب درخشاں گلے میں گردن سے لے کر پیٹ تک بڑے بڑے موتیوں کا ہار پڑا ہوتا تھا۔ تخت ٹھوس سونے کا تھا جس میں چھ پائے تھے اور جگہ جگہ یاقوت۔ زمرد۔ الماس کے نگینے جڑے ہوئے۔ تخت کے نیچے ایک چبوترہ تھا جس پر کمخواب کا شامیانہ کھچا ہوا تھا اور اس میں مقیش کی جھالر ٹنکی ہوئی تھی اس چبوترہ پر سب امرا لباس فاخرہ پہنے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر فرشی کش ہوتے تھے۔

ایوانوں کے ستونوں پر زر لبفت منڈھا ہوا پھولدار اطلس کے شامیانے سارے ایوان میں کھنچے ہوئے ان میں ریشمی ڈوریاں بندھی ہوئی جا بجا ریشم اور مقیش کے پھندنے ٹنکے ہوئے۔ تخت ایک بڑی چوکی کی وضع کا تھا۔ ہر پایہ دو فٹ اونچا تھا۔ تخت کے اوپر چاندی کے بارہ کھمبوں کا ایک سائبان لگا ہوا تھا اس میں موتیوں کی لڑیوں کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ ان حلقوں میں شاہی تلوار۔ سپر۔ گرز۔ تیر و کمان لٹک رہے تھے۔ چتر کے اوپر سونے کا مور پر پھیلائے دم کھولے کھڑا تھا اس کی دم فیروزے اور جواہرات کی تھی۔ مور کے دونوں طرف گلدستے مرصع کار تھے ان میں قیمتی جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے چتر شاہی لگا ہوا تھا جس کی جھالر موتیوں کی تھی۔

یہ تخت اب شاہ ایران کے محل طہران میں ہے اس کی قیمت کا اندازہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے۔ تخت کے نیچے ایوان میں ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں ایک خیمہ نصب تھا اس خیمہ کا نام آسپک تھا یہ شاہی ایوان سے ملا ہوا تھا۔ خیمہ کے چاروں طرف ایک بڑی قنات گھری ہوئی تھی۔ اس پر چاندی کے پترے لگے ہوئے تھے شامیانے کے چوبے چاندی کے تھے۔ یہ خیمہ باہر سے سرخ تھا اور اندر موم جامہ کی چھینٹ کا استر تھا جس کی بیل اور پھول نہایت خوشنما اور آبدار تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک باغ

کھلا ہوا ہے۔

میدان کے آس پاس جو مکانات قطار در قطار تھے وہ سب ایک ایک امیر کے نام سے تھے جو اسے اپنے اپنے خرچ سے آراستہ رکھتے تھے اور ہر ایک کو خیال رہتا تھا کہ وہ اپنا مکان دوسرے سے بہتر رکھے اور ایسے ہو کہ ان کی آرائش کو بادشاہ پسند کریں وہ سارے مکان اوپر سے نیچے تک کمخواب سے منڈھے تھے اور ان کے اندر قیمتی قالین بچھے تھے۔

اس آرائش اور فضول خرچی کا سبب بتایا جاتا کہ جنگ دکن پائے سبب سے جو بدعیت کے سوداگروں کو نقصان پہونچا ہے اس کی کافی تلافی ہو جسے اور کمخواب اور زربفت کے تھان کثرت سے اراکین سلطنت اور خود شاہی کارخانوں میں جمع ہو جائیں اور رعایا جو تباہ ہو رہی ہے آرام و راحت کی سانس لے سکے مگر اس قسم کے جشن گاہے ماہے ہوا کرتے تھے ان میں سب سے بڑا جشن عالمگیر کی سالگرہ کا تھا جس میں بادشاہ کو سونے کے ترازو میں بٹھا کر اس کو سونے چاندی جواہرات اور اناج سے تول کر صدقہ کر دیتے تھے اور یہ سب مال غریبوں کو تقسیم ہو جاتا تھا۔

شاہجہاں خود اس کی عقلمندی کا قائل تھا اور اس کی نسبت کہا کرتا تھا کہ عالمگیر فن جنگ، صلاح و تدبیر اور انتظام و انصرام کا تو بادشاہ ہے مگر مزاج میں اس قدر شکی ہے کہ کوئی آدمی اس کا ایسا نہیں ملا جس پر وہ پورا پورا بھروسہ اور اطمینان کر سکے۔ عالمگیر خود اپنے بیٹوں پر بھی اعتماد نہیں کرتا تھا اور ان کی نگہداشت میں ہر وقت مصروف رہتا تھا ان کی نقل و حرکت کا معاینہ کیا کرتا تھا اور ان کو ہمیشہ نصیحت کرتا تھا۔

ایک مرتبہ شاہجہاں بطور تفاؤل اپنے بڑے بیٹے دارا کو ایک درویش کامل کی خدمت میں لے گیا اور اُسے عرض کیا میرا سب سے بڑا بیٹا یہی ہے میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد یہی سلطنت کرے درویش اپنی گدی سے ہٹ گیا اور دارا سے کہا آؤ یہاں بیٹھو دارا نے عذر کیا کہ یہ بے ادبی ہے کہ میں آپ کی جگہ پر بیٹھوں ہر چند درویش نے کہا اس نے یہی عرض کیا کہ مجھ سے ایسی گستاخی نہ ہوگی میں ایک ادنیٰ خادم ہو کر حضور کی گدی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر واپس آ گئے۔

دوسرے دن شاہجہاں عالمگیر کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہ بہت کمسن تھے درویش اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور ان سے کہا یہاں بیٹھو انھوں نے جواب دیا "الامر فوق الادب" یہ کہہ کر فوراً درویش کی گدی پر جا بیٹھے تب درویش نے کہا فقیر مجبور ہے خدا کے حکم میں کسی کو دخل نہیں تمہارا یہی بیٹا بادشاہ ہوگا آخر یہی ہوا۔

مگر شاہجہاں کا یہ خیال بھی سچ نکلا کہ وہ کسی آدمی پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کی فطرت میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے کسی عہدہ دار پر اعتماد کلی رکھے چاہے وہ ایماندار ہوں یا بے ایمان۔ وہ کسی کارکن کو پورے پورے اختیارات نہیں دیتا تھا۔ وہ ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس شک کا یہ نتیجہ تھا کہ اپنے بڑے بیٹے کو اس نے دائم الحبس کر دیا تھا دوسرے بیٹے کو سمجھ لیا کہ اس کے دل میں دغا ہے چھ برس تک قید رکھا۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ اس کے بیٹے کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ تھا اور اندیشہ کرنے کی معقول وجہ تھی۔ اس کا چوتھا بیٹا شہزادہ اکبر باپ کے خلاف راجپوتوں سے مل گیا تھا۔

شہزادہ اعظم ہمیشہ ولیعہد کے خلاف کچھ ایسی سازشیں کیا کرتا تھا کہ عالمگیر کو مراد بخش کا معاملہ یاد آ جاتا تھا۔

عالمگیر اگرچہ دنیا کے ساز و سامان سے متنفر تھا اور وہ جاہ و احتشام کو عارضی چیز سمجھتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اپنی رعایا سے سادہ لباس میں بے تکلف ملوں جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو مگر اس کی رعایا جو شاہجہاں کا جاہ و جلال اور اکبر کی شان و شوکت دیکھنے والی تھی وہ یہی چاہتی تھی کہ ہمارا بادشاہ بھی پرشکوہ ہو چنانچہ اسی لحاظ سے لاٹ صاحب اور وائسرائے جواب تک ہندوستان آتے ہیں اپنا جلوس شاہانہ اسی واسطے دکھلاتے ہیں کہ رعایا پر رعب بیٹھے حالانکہ انگریزوں کی سلطنت میں ان باتوں کا ذکر بھی نہیں ہے۔

عالمگیر نے بھی اپنی سلطنت کی رعایا کے لحاظ سے گذشتہ بادشاہوں کی طرح تزک و احتشام سے سلطنت کی لیکن رفتہ رفتہ اسے موقوف کرنا شروع کیا کبھی کبھی ایسے موقع پر بڑے بڑے سوداگروں کی بیبیاں محلات شاہی میں مینا بازار لگاتی تھیں اور طرح طرح کا بیش قیمت اسباب شہزادیوں کے ہاتھ زیادہ قیمت پر بیچ کر اس کا نفع بادشاہ کے سالگرہ کے موقع پر غریبوں میں خیرات کر دیا جاتا تھا۔

کیا ان سب بخششوں کے بعد بھی عالمگیر متعصب اور ظالم تھا اعتراض کرنے والے اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں جو ایک ایسے صوفی منش سنگدل بادشاہ پر الزام لگاتے ہیں۔

عشرت لکھنوی

محسوساتِ ماہر

جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدرآباد

دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں
محبت کی فضا ہے اور میں ہوں

تری تیغِ جفا ہے اور میں ہوں
وفاؤں کا صلہ ہے اور میں ہوں

مرے سجدوں کا عالم دیدنی ہے
جبیں ہے بتکدہ ہے اور میں ہوں

ستم پرور ہے آغازِ محبت
غموں کی انتہا ہے اور میں ہوں

ارے توبہ! مصائب کا تسلسل
غمِ صبر آزما ہے اور میں ہوں

مریضِ ہجر کروٹ لیکے بولا
کسی کا آسرا ہے اور میں ہوں

غمِ عقبیٰ نہ ہوشِ زندگانی
تصور آپ کا ہے اور میں ہوں

کوئی دیکھے مری الفت پرستی
طوافِ نقشِ پا ہے اور میں ہوں

کہوں کس سے میں اپنا حال ماہر
مقدر کا گلہ ہے۔ اور میں ہوں

ناظرینِ عالمگیر کیلئے اشد ضروری

اعلان

علامہ جرجی زیدان مصری کے جس شہرۂ آفاق تاریخی ناول محبوبہ قیصروان کی اشاعت کیلئے ناظرینِ عالمگیر ایک کیفیت زابیقراری کے ساتھ منتظر تھے شایع ہوگیا ہے۔ جن حضرات کی خریداری کے آرڈر اب تک درج رجسٹر ہوچکے ہیں ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ معرکہ آرا ناول ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی حاضر ہوگا۔ جن احباب نے اس وقت تک اس کی خریداری کا آرڈر نہیں بھیجا کج وہ اس آخری اعلان کو اشد ضروری خیال فرماتے ہوئے سب سے پہلی فرصت میں فرمائش خریداری بھیجیں ورنہ ممکن ہے کہ یہ بہت جلد ختم ہوجائے اور ناظرین کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے واقعی یہ عجیب و غریب تاریخی ناول بیحد دلچسپ اور لایق مطالعہ ہے،

قیمت:۔ صرف خریداران عالمگیر سے علاوہ محصول ڈاک **بارہ آنے** ۱۲؎

جو حضرات عالمگیر کے خریدار نہیں ان سے عہ علاوہ محصولڈاک لیا جائے گا۔

مینجر عالمگیر لاہور

شاعرِ کل[illegible] سے خطاب

از

شاعرِ اسلام ترجمانِ فطرت جناب مولانا ابوبکر صاحب مصوّر رئیس اعظم، بمبئی

[آپ ایک اولوالعزم باکمال شاعر ہیں نیز اپنے سینہ میں ایک دردمند اور پرجوش دل رکھتے ہیں اور اپنے حقیقی جذبات و اپنے تاثرات کو شاعرانہ کمال سے کام لے کر اپنی زبان و قلم کے ذریعہ سے دوسروں کے دلوں تک پہونچاتے ہیں اور یہی طریقہ صحیح پیغام عمل کا ہے اس لئے آپکی گرانمایہ ہستی قابل قدر و لائق ستائش ہے]

اے شاعرِ سخن کے دلدار اے مصوّر — مانا کہ خود سخن کو تیری ہی آرزو ہے

نقدِ سخن کا سکہ رائج ترا جہاں میں — اقلیمِ شاعری کا گو تاجدار تو ہے

جادو بیاں بھی ہے تو معجز بیاں بھی ہے تو — مُردوں کو زندہ کردے وہ تیری گفتگو ہے

لیکن بتا جہاں میں یوں سرخرو ہے کوئی — مضمر تری غزل میں اک قوم کا لہو ہے

اچھا ہے یا بُرا ہے اپنے ضمیر سے پوچھ — نقشہ جو زندگی کا آنکھوں کے روبرو ہے

کل تک تلاشِ حق میں تو محوِ جستجو تھا — باطل فروز اب تو ہر دل کی آرزو ہے

تو چاہتا نہیں گر ایمان کی تباہی — کافر نظر بتوں کی کیوں تجھکو جستجو ہے

ظاہر میں دے رہا ہے تجھکو فریبِ زینت — غازے کی شکل میں یہ پنہاں ترا لہو ہے

یہ بھی فریبِ رنگیں غافل ہے گلستاں کا — پھولوں سے تجھکو ہر دم امیدِ رنگ و بو ہے

مرنے سے ڈر رہا ہے مرتا ہے زندگی پر — کیا خاک زندگی ہے کیا خاک آبرو ہے

کیا غیرِ حق روا ہے سجدہ کسی کے آگے — اے بندۂ محبت تجھ میں وفا کی بو ہے

دنیا بدل رہی ہے عالم بدل رہا ہے
افسوس تو ہی اب تک محوِ غزل رہا ہے

ہیر وارث شاہ

پنجابی ادبیات کا زندۂ جاوید معجزہ

از جناب مولانا اظہر صاحب امرتسری

پنجابی ادبیات میں سید وارث شاہ کو وہی امتیازی تفوق حاصل ہے جو عربی میں امرؤالقیس، فارسی میں حافظ اور اردو میں میر تقی کو ہے اس امتیازی خصوصیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وارث کی شاعری عام مشرقی شاعری سے بہت زیادہ سادہ ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات اور لوازم لفظی و معنوی کی پیچیدگیوں سے حقیقت کو تصنع کا لباس پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بالکل عام فہم اور سادہ الفاظ میں ان نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ جن کے اظہار کیلئے شاعر کو تشبیہات میں لپٹی ہوئی کہاوتوں کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آپ اگر وارث کی منظوم تصنیف "ہیر رانجھا" کا مطالعہ کریں۔ تو سب سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ یہ اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ روحانی، جذباتی، نفسانی اور قلبی کیفیات کی تصویریں کا مرقع ہے جن کے صحیح نقش و خطوط کو کسی قسم کی غیر ضروری رنگ آمیزی سے بدلنے کی کوشش نہیں کیگئی۔

پنجابی ادبیات کے ماہرین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "ہیر" اس زبان میں سب سے پہلی اور سب سے آخری تصنیف ہے۔ جس کے اثرات بادشاہ سے لیکر فقیر تک اور روح سے لیکر نفس تک کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ "ہیر" میں جو زبان استعمال کیگئی ہے وہ بھی بہت پرانی ہونے کے باعث پنجابی کی تدریجی تبدیلی پر روشنی ڈالنے کی دعوت دیتی ہے بعض جگہ تو وارث نے اپنے شاعرانہ اختیارات کا بے پناہ استعمال کرتے ہوئے مستعمل الفاظ کو بھی ضرورت شعری کے مطابق بدل دیا ہے لیکن یہ تبدیلی صرفی اعتبار سے غلط ہونے کے باوجود ذوق سلیم پر گراں نہیں گذرتی

اس حقیقت سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان ہمیشہ شاعر کی تابع رہتی ہے پیشتر اس کے کہ میں "ہیر" میں سے مختلف مقامات کا ترجمہ پیش کروں، یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ "ہیر رانجھا" کا قصہ انتہائی اختصار کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر دوں۔ تاکہ مختلف مقامات جنکا ترجمہ میں پیش خدمت کرونگا، سمجھنے میں آسانی ہو جائے

آج سے قریباً ایک صدی پہلے پنجاب کے ایک گاؤں میں جو ہری موجو کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دیہاتی زبان کی نفاست کے مطابق "دھیدو" رکھا گیا، جو بعد میں "رانجھا" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ لڑکا ناز و نعم کے آغوش میں پل کر جوانی تک پہونچا تو موجو کا انتقال ہو گیا۔ اب رانجھے کو بھی اپنے بھائیوں کی طرح کاشتکاری کو ذریعہ معاش بنانا پڑا جس کو اس کی آرام پسند طبیعت برداشت نہ کر سکی اور اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کی سات بھاوجوں نے اس کو طنز آمیز لہجہ میں سرزنش کرنا چاہی جس پر فریقین میں دلچسپ مناظرہ ہوا اور رانجھا کبیدہ خاطر ہو کر تخت ہزارہ سے جھنگ سیال کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں دریا آیا تھا جس کو عبور کرنے کے لئے اس نے لڈن ملاح کی منت سماجت کی لیکن اس نے کشتی پر بلا اجرت سوار کرنے سے انکار کر دیا جس پر دونوں میں تکرار ہو گئی۔ بات یہانتک بڑھ گئی کہ رانجھانے لڈن کے مقابلہ کی ٹھان لی۔ اور دریا کے کنارے پر دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ جہاں اس نے ونجلی (بانسری کی قسم کا ایک ساز) چھیڑ کر دریا کے کنارے بسنے والی آبادی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہانتک کہ ملاح کی دونوں بیویاں بھی اس کے دلکش نغموں پر فریفتہ ہو گئیں اور انہوں نے رانجھے کی حمایت میں اپنے شوہر

کو بھی کوسنا شروع کر دیا۔ آخر لڈن کو رانجھے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا اور وہ رانجھے کو کشتی پر سوار کر کے دریا کے اُس پار چھوڑ آیا۔ اس کے بعد رانجھے نے ہیر کے گاؤں جھنگ سیال میں پہنچ کر اس کے باپ کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں رانجھا کو بھینسیں چرانے کا کام سونپا گیا۔ وہ ابھی ملازمت میں چند ہفتے ہی گذارنے پایا تھا کہ ہیر بھی اس پر فریفتہ ہو گئی۔ جب موسم گرما کی دوزخ آفرین دوپہر چرواہے پر شعلے برسانے لگتی تو ہیر وہاں آکر اُس کو شربت دیا۔ پلا دیتی تھی۔ اِن ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی زیادہ وسیع نہیں ہونے پایا تھا کہ ہیر کے چچا کیدو نے دونوں کو مصروفِ اختلاط دیکھ لیا۔ اِس کے بعد حُسن وعشق کا وہ ہنگامہ جس کا پھیلاؤ چراگاہ تک ہی محدود تھا لفظِ رسوائی بنکر سینکڑوں زبانوں پر تملانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیر کے باپ نے اُس کا گھر سے باہر نکلنا بند ہی نہیں کیا۔ بلکہ مقام رنگپور کھیڑیاں کے ایک شخص مسمی سیدا سے اُس کی نسبت کر دی۔ جب برات آئی تو ہیر نے سیدے کو بطور شوہر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ قاضی نے جب خطبۂ نکاح شروع کیا تو ہیر نے اس میں مداخلت کرتے ہوئے انکار واقرار کے مسئلہ کو ایک پُرلطف بحث سے تبدیل کر دیا۔ بالآخر نکاح کے مراسم بالجبر ادا کر دیتے گئے۔ لیکن سسرال کے گھر پہنچتے ہی بیماری کا بہانہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

دوسری طرف رانجھے نے ایک سادھو کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کے عقیدتمندوں میں شامل ہونا چاہا۔ لیکن سادھو (بالناتھ) نے اُس کی رس بھری آنکھوں کو دیکھکر کہا "میاں صاحبزادے! تم بیراگ کے خاردار رستہ پر پاؤں رکھنے کے قابل نہیں، جاؤ اور گلیوں میں نظربازی کرو۔" رانجھے نے سادھو کے اِس قیاس کی تردید کی۔ بالآخر ایک معنی خیز بحث کے بعد سادھو نے اُس کو چیلا بنا لیا۔ رانجھا جوگ کے ابتدائی مراسم ادا کرنے کے بعد رنگپور کھیڑیاں کی طرف روانہ ہُوا۔ قصبہ کے باہر اس کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی۔ جس نے رانجھے کو دیکھتے ہی کہا "فقیری کے دامن میں ہوسناکی لپٹی ہوئی جا رہی ہے"۔ چوپان کی یہ بات رانجھے کے لئے بہت بڑے مناظرہ کی تمہید ثابت ہوئی۔ اُس نے اپنے آپکو صاف ستھرا اور پارسا جوگی ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن آخر اُسکو چوپان کے دلائل سے مغلوب ہونا پڑا۔ وہ چوپان سے چند مفید ہدایات لیکر رنگپور میں داخل ہُوا۔ جہاں اُس نے ہیر کے دروازہ پر صدا دی جسکا عملی جواب دینے کے لئے ہیر کے شوہر سیدا کی نوعمر بہن جوگی کے سامنے آگئی۔ دونوں میں مختلف موضوعات پر دلچسپ بحث ہوتی رہی۔ سچ پُوچھئے تو کتاب کا یہ حصہ ہی حقائق ومعارف کے اعتبار سے سب سے زیادہ دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ اِسی اثنا میں ہیر کو بھی بحث میں مداخلت کرنا پڑی اور بات اِس درجہ بڑھ گئی۔ کہ باتوں کے اشارے لاتوں سے ہونے لگے لیکن آخری فیصلہ صلح وآشتی پر ہُوا۔ اور سہتی (سیدے کی بہن) اپنے عاشقانہ مقاصد پورے کرنے کے لئے جوگی کی مرید ہو کر رہ گئی۔ جوگی نے اس کی زندگی کا اکثر پہلو معلوم کرنے کے بعد اپنے اور ہیر کے درمیان ایک واسطہ بنا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سہتی ہیر کا علاج کرانے کی غرض سے اس کو جوگی کے پاس لے گئی۔ اس طرح دونوں کی مراد بر آئی۔ جوگی سے رازدارانہ ملاقات کے بعد جب ہیر واپس آ رہی تھی تو اُس کی سہیلیوں سے ملاقات ہو گئی۔ جنھوں نے جوگی اور ہیر کے خلوت افروز معاملات پر نسائیانہ طنز وطعن میں ڈوبی ہوئی نکتہ چینی کی۔ اور دُوہ کوک شاسترانہ حقائق بیان کئے جنکی تفصیل یہاں مناسب نہیں آخر کچھ عرصہ کے بعد رانجھے اور ہیر کا معاملہ حاکمِ شہر کی عدالت تک پہنچا جہاں ہیر رانجھے کے حوالے کر دی گئی۔

یہ ہے اِس افسانے کا خلاصہ! جو وارث شاہ نے نظم کے رنگین قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ "ہیر وارث شاہ" اپنے معجزنما اثر وجذب کے باعث اِس درجہ مقبول ہو چکی ہے کہ پنجاب کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اس کے قدردان موجود نہ ہوں۔ بلکہ بعض حلقوں میں تو اس کو تصوّف والٰہیات کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ضلع امرتسر میں صُوفیوں کا ایک گروہ موجود ہے جن کو "جانی شاہی" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ "ہیر" کو ہر وقت خوبصورت غلافوں میں ملفوف کر کے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور کسی الہامی کتاب سے کم اس کا احترام نہیں کرتے۔ مجھے ۱۹۲۹ء میں ایک تعلیم یافتہ جانی شاہی سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ اس نے سب سے پہلے مجھ سے جو سوال کیا وہ یہ تھا کہ "آپ کا ہیر کے متعلق کیا خیال ہے؟" میں نے کہا کہ یہ کتاب پنجابی ادبیات کا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ اس کی زبان اگرچہ موجودہ زمانہ میں آثارِ قدیمہ کہلانے کی مستحق ہے لیکن اسکی شعریت ہر زمانہ میں جدید مقبولیت کے سامان فراہم

کرلیتی ہے۔ میری یہ باتیں سنتے ہی اُس کی چمکیلی آنکھیں تھرا گئیں۔ اُسکے چہرہ پر کچھ اِس طرح قلبی کیفیت بکھر گئی کہ میں نے معلوم کرلیا کہ میرا مخاطب میری قابلیت کا دل ہی دل میں مضحکہ اُڑا رہا ہے۔ آخر اُس نے میرے حد سے بڑھے ہوئے اصرار کو کم کرنے کی غرض سے کہا کہ تم دنیادار لوگ "ہیر" کی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ قصہ ہے جس میں معمولی اور عام فہم الفاظ کے پردہ میں عرفانیات، الٰہیات اور تصوف و حقیقت کے تمام حقائق و معارف بالتشریح بیان کئے گئے ہیں۔ اس قدر کہنے کے بعد اُس نے "ہیر" کے چند اشعار پڑھے جن میں بلحاظ الفاظ ان باتوں کے بغیر کچھ نہیں تھا جو صرف خلوت ہی میں کی جا سکتی ہیں لیکن جانی شاہی نے پیچ در پیچ تاویلات کی امداد سے ان کو روح و نفس کی معرفت ثابت کرنے کی کوشش کی اور بیہودہ ترین الفاظ کو بعض صوفیانہ اصطلاحات کا قائم مقام قرار دیکر مجھے بتایا کہ "ہیر" کا ہر شعر مولانا روم کی پوری مثنوی کا آئینہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہیر کے متعلق جانی شاہی عقیدہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ ہیر کے اشعار اَوباش نوجوانوں سے لیکر خدا رسیدہ صوفیوں تک مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں گویا

سمجھ لیتے ہیں اسکو اپنے اپنے طور پر سامع
اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

"جانی شاہیوں" کے مبالغہ آمیز عقیدہ سے قطع نظر کرتے ہوئے "ہیر" کے اشعار کو صرف شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار نہ ہو سکیگا کہ یہ چیز جہاں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کا آئینہ ہونے کے باعث "گلستان سعدی" کی پنجابی بہن ہے وہاں اس میں حافظ کے وجد انگیز اور جذبات پرور نغمے بھی تڑپ رہے ہیں۔ اگر اس کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی اثر آفرینی کلام میر کی قائم مقام ہو سکتی ہے تو محبت کے سطحی معاملات کی ترجمانی میں داغ کی غزلوں کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے۔ اب میں اپنے دعوے کی تائید میں بمصداق "آفتاب آمد دلیل آفتاب" ہیر ہی سے چند مقامات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جب رانجھا بھابیوں سے ناراض ہو کر رخت سفر باندھ لیتا ہے۔ تو اُس کی بھابیاں اُس کا ارادۂ سفر توڑنے کی غرض سے کہتی ہیں:-

(۱)
بھرجائیاں آکھیا رانجھیا وے اسیں باندیاں چیلیاں تیریاں ہاں
ناؤں لیناایں جدوں تُوں جاونیدا اسیں ہنجواں تدی رُنیاں ہاں

(۲)
جان وِچ اُلنبیاں گئی ساڈی تیرے درد فراق وِچ بھُنیاں ہاں
جان مال قربان ہے تُدھ اُتوں اتے آپ بھی چکھنے ہنیاں ہاں

(۳)
سانوں صبر نہ آوندا اک ساعت جس دی گھڑی دے تیتھوں وچھنیاں ہاں
وارث شاہ دا آکھیا منّ دیورا اسیں سب مُرادتے پتیاں ہاں

ترجمہ (۱) بھابیوں نے کہا اے رانجھا ہم تیری چیلیاں اور کنیزیں بنتی ہیں جب تم یہاں سے جانے کا نام لیتے ہو تو ہم خون کے آنسو رُلتی ہیں۔

(۲) تمہارے غم کی آگ میں ہماری جان جل رہی ہے اور تمہارا فراق ہمیں بھون رہا ہے۔ ہم تم پر جان و مال قربان کرنے کے علاوہ اپنے آپکو بھی نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

(۳) جس وقت ہم تم سے جُدا ہو چکی ہیں ایک ساعت بھی صبر نہیں آتا۔ اے دیور اگر تو وارث شاہ کا کہنا مان لے تو ہم سب بامراد ہو جائیں۔"

جن حضرات کو علم النفسیات کے مطابق نسوانی فطرت کے چھپے ہوئے بھیدوں پر نظر ڈالنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وارث نے دہقانی اسلوب میں بھی عورت کے جذبۂ عجز و خوشامد کی ترجمانی کچھ اس عمومیت کے ساتھ کر دی ہے جو بڑے بڑے ماہرین نفسیات کے حسن بیان سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی سادگی کے باعث وارث کو انسانی سیرت کا صحیح نقاش کہا جا سکتا ہے۔

(۲)

رانجھا گھر سے روانہ ہو کر رات مسجد میں بسر کرتا ہے اور صبح دریا کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ رانجھے کی روانگی کے وقت کی تصویر وارث شاہ اِن شعروں میں کھینچتا ہے:-

(۱)
چڑی چوہکدے نال جاں ٹرے پاندھی پیاں دُدھ دے وِچ مدھانیاں نے
صبح صادق ہوئی جاں آن روشن تے وا آن چڑیاں چہلانیاں نے

(۲) اِکناں اُٹھ کے رِڑکا پا دِتا اِک ہوندیاں پھرن سُوہانیاں نے

اِک اُٹھ کے پلین تیار ہوئے اِک ڈھونڈ دے پھرن پرانیاں نے
وضو ساز کے زاہداں پھڑی تسبیح بانگاں مسجدیں کہیاں ملوانیاں نے

(۳)
ہوئے قافلے کوچ سراں وچوں کھڑکے ٹل بھر بات چلانیاں نے
کاروبار وچ ہویا جہاں سارا چرخے ڈھاوندیاں اُٹھ سوانیاں نے

(۴)
اُٹھ غسل دیواسطے جان دوڑے سیجاں جنہاں لے رات نوں ماننیاں نے
رانجھے کوچ کیتا آیاندی اُتے ساتھ لدیا پار مہانیاں نے

(۵)
وارث شاہ میاں لڈن خوب ہو ناں کیتا شہد دا لدیا بانیاں نے

ترجمہ (۱) چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور دودھ میں مدھنیاں گھوم رہی تھیں کہ مسافروں نے بھی کوچ کر دیا جب صبح صادق کی روشنی نمودار ہوئی تو چڑیوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔

(۲) کئی عورتیں دہی میں مدھنیاں ڈال چکی ہیں اور کئی ابھی تک چھاچھ کا برتن دھو رہی ہیں۔ کئی مرد ہل لیکر تیار بھی ہو گئے لیکن کئی ابھی جوتنے کا سامان ہی ڈھونڈھ رہے ہیں۔

(۳) زاہدوں نے وضو کر کے ہاتھوں میں تسبیح لے لی اور ملاؤں نے مسجدوں میں اذانیں دیدیں۔ قافلوں نے قیامگاہ سے کوچ کر دیا اور صبح کا گجر ہر طرف بجنے لگا۔

(۴) سارا جہان اپنے اپنے کام میں مشغول ہے یہانتک کہ عورتوں نے بھی اٹھ کر چرخے گھمانے شروع کر دیئے۔ جو لوگ رات بستر وصل پر بسر کر چکے ہیں اب غسل کی غرض سے دوڑے جا رہے ہیں۔

(۵) رانجھا رخصت ہو کر ندی پر آیا۔ یہاں مسافروں نے کشتی مسافروں سے بھرپور کر لی ہے۔ لڈن (ملاح) ایک بھاری بھر کم انسان ہے گویا بنیوں نے شہد کا کُپا لاد رکھا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ایشیائی شاعری میں منظر نگاری کا عنصر بہت کم ہے اور جو تھوڑا بہت ہے بھی تو اُس کی فطری سادگی پر تشبیہوں اور استعاروں کا پیچ در پیچ پردہ ڈال دیا گیا ہے لیکن وارث کے مرقومہ بالا اشعار اس دعوے کی قابل تسلیم تردید ہیں۔ وارث نے مناظر صبح کے صرف انہی حصوں کو حقیقی صورت میں دکھانے کی کوشش کی ہے جو محل منظر کے پیش نظر خالص مقامی تمدن سے تعلق رکھتے ہیں اور جنکی سادگی پر کسی قسم کی شاعرانہ رنگینی کو حملہ کی اجازت نہیں دی گئی۔

—— (۳) ——

سادگی اور اثرانگیزی کلام وارث کا امتیازِ خصوصی ہے۔ لیکن اسکا دامن ذوق رنگینی و شوکت بیان سے بالکل بھی محروم نہیں۔ اس کے ہاں تشبیہات و استعارات کا بھی فقدان نہیں۔ چنانچہ ہیر کے حُسن کی تعریف میں لکھتا ہے۔

(۱)
دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حُسن انار وچوں
لکھی چین تصویر کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں

(۲)
سُرخی ہوٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا کھوجے کھتری قتل بازار وچوں
باہاں ویلنے ویلیاں گھت مکھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں

(۳)
گردن کونج دی انگلیاں رواں پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری پٹ کھینوں سیو بلخ دے چنے انبار وچوں

(۴)
لنکا باغ دی پری یا اندرانی حور نکلی چند وچکار وچوں
پتلی پیکنے دے نقش روم والے لبھا پری نے چن اُجاڑ وچوں

(۵)
ایویں سرکدی آوندی لوہڑ لٹی جویں کونج اِک نکلے ڈار وچوں
جو کوئی ویکھدا اوسدے حُسن تائیں کھائے زخم خنجر تلوار وچوں

(۶)
متھے آ لگن جیہڑے بھور عاشق نکل جان تلوار دی دھار وچوں
عشق بولدا نڈھی دے تھاں تھائیں راگ نکلے زیر دی تار وچوں

(۷)
قزلباش جلاد اسوار خونی نکل دوڑیا اُردو بازار وچوں
وارث شاہ جاں نیناں دا داؤ لگے کوئی نہ بچے نہ جونیدی ہار وچوں

ترجمہ (۱) اُس کے دانتوں کی تقسیم چنبے کے پھولوں کی طرح ہے۔ گویا یہ ہنستے ہوئے موتی نہیں بلکہ انارِ حُسن کے چمکیلے دانے ہیں۔ یہ جٹی گویا حُسن کشمیر کی چینی تصویر ہے اور اُس کا قد باغ بہشت کے سرو سے ملتا جلتا ہے۔

(۲) ہونٹوں کی سُرخی پر دنداسے کی قیامت آفرینی سربازار خوجے اور کھتریوں کو قتل کر رہی ہے۔ اس کی باہیں مکھن ڈالکر قدرت نے خراد پر ہموار کی ہیں اور اس کی چھاتی گویا موج گنگا کی طرح مرمریں ہے۔

(۳) گردن کونج کی گردن کے مشابہ، انگلیاں روہا کی پھلیوں کیطرح اور ہاتھ برگ چنار کی صورت نرم و ملائم ہیں۔ سینہ اس شان سے ابھرا ہوا ہے

کو ریشم کے دو گیند رکھے ہوتے ہیں۔ یا بلخ کے سیبوں کے انبار سے دو اچھے سیب چن کر لائے گئے ہیں۔

(۴) یہ لنکا باغ کی پری ہے کہ اِندرانی ہے یا کوئی پری چاند سے نکل آئی ہے۔ ٹھوڑی کی پتلی پر رُوم کے نقش ہیں کہ کسی پری کو ویرانے میں اتفاقی طور پر چاند پڑا ہوا مل گیا۔

(۵) کچھ اس شان سے مٹک مٹک کر آ رہی ہے کہ گویا کونج اپنے ساتھیوں سے بدھک کر نکل آئی ہے۔ جو شخص اُس کے حسن کو دیکھتا ہے اُس کو خنجر اور تلوار کے زخم کھانے پڑتے ہیں۔

(۶) جو عاشق اُس کے سامنے آئیں اُن کو تلوار کی دھار سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ اس چھوکری کے بال بال سے عشق اس طرح بولتا ہے جس طرح ساز کے تار سے نغمے نکلتے ہیں۔

(۷) یہ خونخوار حسن والی ایک جلاد سپاہی کی طرح ہے جو چھاؤنی سے خونریزی کے لئے دوڑ نکلا ہو۔ وارث شاہ جب آنکھوں کی بازی لگ جائے تو اس قمار کی ہار سے کوئی نہیں بچ سکتا"

خوش معنی تشبیہات اور دلکش استعارات کا جو سلسلہ ان شعروں میں پھیلا ہوا ہے وہ اس امر کی شہادت ہے کہ وارث صرف دل کی صداؤں کو جامۂ الفاظ پہنانا نہیں جانتا اُس کے ہاں طبیعانہ حسن خیال کی بھی کمی نہیں۔ اُسکا دامنِ طبیعت گلستانِ معنی کے تمام نوشگفتہ پھولوں سے مزین ہے۔

(۴)

رانجھا ہیر کے باپ کا ملازم ہے وہ جنگل میں بھینسیں چراتا ہے۔ اسی اثنا میں وہ ہیر کو اپنے جذبۂ اشتیاق سے مسخر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہیر کبھی کبھی اُس کے ہاں جنگل میں آ کر راز و نیاز کی باتیں کرتی ہے۔ رانجھا ہیر کو قوانینِ محبت کا پابند بنانے کی غرض سے کہتا ہے۔

شرع وچہ منظور نہ قول رناں رانجھا ہیر نوں آکھ سناوندا ئے

(۱) مکر رن دے جیڈ نہ مکر کوئی رب وچہ قرآن فرماوندا ئے
مرشد جن تے رن دا اِجھ شیطان جیہڑا افترا مکر پڑھاوندا ئے

(۲) رناں سچیاں نوں کرن چا جھوٹھا مرداں وچہ نہ کوڑ سماوندا ئے

(۳) رناں منڈیاں پوستیاں بھنگیاں دا اعتبار زبان نہ آوندا ئے
وارث شاہ جے قول تے دیں پہرہ پت مہر دا چاک سدا وندا ئے

ترجمہ (۱) رانجھے نے ہیر کو کہا کہ شریعت عورتوں کے قول کو تسلیم نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے کہ عورتوں کے برابر کوئی مکاری نہیں کر سکتا۔

(۲) عورت اور جن کا مرشد شیطان ہے جو ان کو مکر و فریب کی تعلیم دیتا رہتا ہے۔ مردوں میں تو جھوٹ سما نہیں سکتا لیکن عورتیں سچوں کو بھی جھوٹا ثابت کر سکتی ہیں۔

(۳) عورتوں، لڑکوں، پوست پینے والوں اور بھنگیوں کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ وارث شاہ اگر تو عہدِ وفا پر قائم رہے تو یہ بہت بڑے زمیندار کا بیٹا نوکر کہلانے کو تیار ہے"

ان تین شعروں میں وارث نے نسوانی سیرت کی قابلِ اعتراض کمزوریاں اس جامعیت کے ساتھ بیان کر دیں کہ جن کی وضاحت کیلئے اتنا سلیس انداز اختیار کر لینا شاعر کے لئے ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے اب ہیر کا جواب بھی سن لیجئے:۔

ہیر آکھدی رناں نوں نیندنائیں رن وچہ چڑھی جند گالدی اے

(۱) رن جیڈ نہ سدھ ہے کسے کرناں سن مال تے ملک بھالدی اے
ماہی مجنوں پچھے لیلیٰ خوار ہوئی سوہنی اپنے آپ نوں گالدی اے

(۲) زلیخا چھڈ سرداریاں ہوئی عاجز جھگی پائیکے بیٹھ سمہالدی اے
پیکے ساہوریاں سکیاں دین پچھا پکی کرن نہ دولتاں مالدی اے

(۳) ستی ہو شہید وچہ تھلاں موئی شیریں سچ لے او سدنالدی اے
ولی غوث سب رناں تھیں ہوئے پیدا حوا سچ لے آدمیاں نالدی اے

(۴) ہٹھ رن دی جیڈ نہ مرد کوئی وارث شاہ نوں خبر اِس حالدی اے

ترجمہ (۱) ہیر نے کہا تو عورتوں کی برائی نہ کر عورت اگر اپنی بات پر ڈٹ جائے تو جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ عورت کے برابر اپنی بات کا کوئی پکا نہیں وہ مال اور ملک کی خواہشمند نہیں۔

(۲) لیلیٰ اپنے عاشق مجنوں کے لئے خوار ہو کر رہی اور سوہنی نے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔ زلیخا نے بادشاہی کو ٹھکرا کر جھونپڑی میں اپنی عزت

کو زندہ رکھا۔

(۳) اگر عورت کو میکے اور سسرال میں رشتہ دار جواب دیدیں لیکن وہ محبت کے لئے مال و دولت کی خواہش نہیں رکھتی۔ (اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ) سسی تھل میں شہید ہوگئی اور شیریں بھی (عاشقانہ قربانی کے لحاظ سے) اس کے برابر ہوکر رہی۔

(۴) ولی اور غوث بھی عورتوں ہی سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ مائی حوا عالمِ انسانیت میں ہے۔ تاریخ العزمی میں مرد عورت کا مقابلہ نہیں کرسکتا"

اِن شعروں میں وارث نے اُن اسرار و رموز کو دلائل و اسناد کے ساتھ بتا دیا ہے جو عورت کے جذبۂ محبت کی مخلصانہ تربیت و ترقی کی پیداوار ہیں۔ پہلے شعر میں عورت کی اُس راسخ العزمی اور عزیمت کا حوالہ دیا گیا ہے جو عورت کی فطرتِ سلیمہ کا امتیاز خصوصی ہیں۔ اس کے بعد اِسی دعوے کی تصدیق کے لئے تاریخی شہادتیں دی گئی ہیں۔ یہ وارث کی قادر الکلامی اور فطرت نگاری کا کرشمہ ہے کہ اُس نے ان امور کو بھی الفاظ کا جامہ پہنا دکھایا ہے جو صرف آنکھوں کی معنی خیز جنبش، نگاہوں کی توجہ طلب بیتابی اور آہ و نالہ کی دردآفرین تاثیر ہی سے ظاہر کئے جاسکتے ہیں۔ یہ شعر نہیں بلکہ محبت و عشق کے وُہ وجدانی تاثرات ہیں جن پر عہدِ وفا کی بنا رکھی جاسکتی ہے۔

(۵)

ہیر کی برات آجاتی ہے اور اس کے والدین سیدا کھیڑا کے ساتھ اُس کا نکاح باندھنا چاہتے ہیں۔ ہیر سیدے کو قبول نہیں کرتی اور اپنے آپکو رانجھے کی منکوحہ قرار دیتی ہے۔ اختلافات بڑھ جاتی ہے۔ قاضی اور ہیر کے درمیان مناظرہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہیر قاضی کو کہتی ہے

(۱) ہیر آکھیا عشق دے راہ پوتاں نہیں کم ملوانیاں قاضیاں دا
اِس عشق میدان دے کُٹھیاں نوں رتبہ کربلا دے ہے غازیاں دا

(۲) ترت وچہ درگاہ قبول ہووے سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی اے کم نہیں جھوٹیاں پاجیاں دا

(۳) کرکے قول زبان تھیں ہر جانا فعل بے ایماناں دھوکے بازیاں دا
عشق سِر اِک ذاتِ خدا دا ئے عاشق شان ویکھن کارسازیاں دا

(۴) جدوں کدوں کردا ترس عاشقاں تے مالک رب غریب نوازیاں دا
وارث شاہ حقیقی دی لین لذت پہلے چکھ کے توں مجازیاں دا

ترجمہ (۱) ہیر نے کہا کہ عشق کی راہ پر چلنا مُلّاں اور قاضیوں کا کام نہیں۔ میدانِ عشق میں جو مارا جائے اُس کو کربلا کے غازیوں کا رتبہ ملتا ہے۔

(۲) عاشق وُہ پاک طینت لوگ ہیں اُن کا سجدہ درگاہِ الٰہی میں بہت جلد قبول ہوتا ہے۔ اور خدا کی راہ میں جان قربان کردینا جھوٹے اور پاجی لوگوں کا کام نہیں۔

(۳) وعدہ کی پابندی نہ کرنا بے ایمان اور دغاباز لوگوں کا کام ہے۔ عشق ذاتِ خداوندی کا بھید ہے۔ جسکو جاننے کے بعد عاشق اُسکی کارسازیوں کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

(۴) غریب نواز خدا جب بھی عاشقوں پر رحم کرتا ہے تو اے وارث شاہ عاشق مجازی سے لذت آشنا ہونے کے بعد حقیقی کے مزے لیتے ہیں"

یہ ہے اِس خزینۂ ادب کے چند آبدار موتیوں کا تعارف جو پنجاب کے اِس ذوقِ سلیم میں جگمگا رہے ہیں۔ مَیں نے اِس شہرۂ آفاق ادبی شاہکار پر انتہائی اجمال کیساتھ طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے ورنہ کتاب کے مختلف حصوں پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت خود بخود منکشف ہوجاتی ہے کہ وارث نے فطرتِ انسانی کے تمام ظاہری و معنوی پہلوؤں کی تصویریں مصرعہ مصرعہ میں آویزاں کر رکھی ہیں۔ سچ پوچھئے تو وارث نے ان نفسیاتی حقائق کو بھی دہقانی انداز میں ظاہر کردیا ہے جو شاعرانہ فلسفہ اور تجسس کی نظر سے ہمیشہ پوشیدہ رہے۔

ہیر کا اگر ایک مصرعہ حقیقتِ انسانی کا متین ترین ترجمان ہے تو دوسرا جوشِ جوانی کی ہنگامہ آرائیوں کا مظہرِ کامل ہے کہیں درد و اثر میں ڈوبے ہوئے نالے لباسِ شعر میں تملا رہے ہیں کہیں عیش و مسرت کی ہنسی الفاظ کے دامن میں جگمگا رہی ہے کسی جگہ عرفانیات و الٰہیات کی تجلیاں پائے نور بہاتی ہیں اور کسی شعر میں خلوت افروز سیاہ مستیاں اپنی ناقابلِ اظہار کیفیت کا واشگاف اعلان کررہی ہیں۔ غرضیکہ فلسفہ و ادب نے حقیقی شاعری پر جو فرائض ادا کر رکھے ہیں وارث نے وہ سب کے سب جوں کے توں تمام پورے کر دکھائے ہیں۔ مجھے افسوس کیساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرا یہ مضمون اپنے مقاصد و فرائض کے اعتبار سے نامکمل رہا لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لئے طویل فرصت درکار ہے جو آجکل مجھے کسی قیمت پر بھی میسر نہیں آسکتی۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت اس اجمال کی تفصیل کا فرض ادا کرونگا۔ فقط۔

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری

حاصلِ جوششِ آرزو ایک طلسمِ راز ہے
عشق فدائے حسن ہے حسن کرشمہ ساز ہے

بے خبر خلش کرے وہ مرا چارہ ساز ہے
اے نگہِ ستم ابھی درد کا امتیاز ہے

حائلِ ہمتِ نظر پردۂ کبر و ناز ہے
شاہدِ بے حجاب کی جلوہ گری بھی راز ہے

سنگِ درِ حبیب پر سجدۂ عجز تا کجا
پاسِ نیازِ عشق سے حسن تو بے نیاز ہے

ضبط سے کام لیجئے راز عیاں نہ کیجئے
نشترِ عشق کی خلش دل میں رہے تو راز ہے

وقفِ سجود ہوتے ہی بن گئی جزوِ آستاں
تیرے نیازمند کو اپنی جبیں پہ ناز ہے

بیخودِ عشق دل ہوا طرزِ نگاہ دیکھ کر
حسن کا ایک شعبدہ چشمِ فسوں طراز ہے

وجہِ خلش اسی طرح کاش تری نظر رہے
درد سہی ہو جو بے خبر وہ مرا چارہ ساز ہے

عشق نے ہر سرور کو یاس سے اب بدل دیا
نغمۂ پر نشاط بھی نالۂ جاں گداز ہے

سامنے کوئی آ گیا پھر بھی ہوں محوِ آرزو
جلوۂ حسنِ پردہ در میری نظر میں راز ہے

جانبِ خانقاہ بھی ایک نظر جنابِ دلؔ
غرقِ مئے طہور میں زاہدِ پاکباز ہے

نقضِ عہد

ایک جاپانی افسانہ

جناب سید محمد احسن صاحب بی اے عثمانیہ حیدرآبادی ؔ

"میں موت سے نہیں ڈرتی" مرنے والی بیوی نے کہا "صرف ایک بات کا مجھے خیال ہے۔ کاش! یہ معلوم ہو جاتا کہ میرے بعد اس مکان کی مالک کون ہوگی؟"

"میری پیاری!" غمزدہ شوہر نے افسردگی سے جواب دیا "تمہارے بعد میں کسی سے شادی نہ کرونگا"

جس وقت اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہیں تو درحقیقت وہ بالکل سچے تھے۔ کیونکہ اُس کو صرف اسی عورت سے محبت تھی۔ جو اب عنقریب اُس کا ساتھ چھوڑنے والی تھی۔

"تم اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتے ہو؟" بیوی نے خفیف سا مُسکرا کر دریافت کیا۔

"اپنی عزت کی قسم!" اُس نے جوش سے اُس کے کُمھلائے ہوئے چہرہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پیارے!" اُس کی بیوی نے کہا "تم مجھے باغ میں دفن کروانا۔ — دیکھو ضرور — باغ کے آخری گوشے میں جہاں ہم نے بیر کے درخت لگائے تھے۔ عرصے سے میں اس کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر تمہارا دوسرا بیاہ کرنے کا خیال ہے تو پھر تم مجھے اپنے سے اس قدر قریب دفن نہ کراؤ گے، میں چُپکی ہو جاتی تھی۔ اب تم نے وعدہ کر لیا کہ کوئی عورت میرے قائم مقام نہ ہوگی، اس لئے میں نے صاف صاف اپنی خواہش کا اظہار کیا — باغ میں دفن کئے جانے کی میری دلی خواہش ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں میرے کانوں میں تمہاری آواز آیا کریگی۔ اور موسم بہار میں مجھے پھول کھلتے ہوئے نظر آئیں گے"

"سب تمہاری خواہش کے مطابق ہوگا" اُس نے جواب دیا "لیکن مرنے کا ذکر مت کرو۔ تم کچھ زیادہ علیل تھوڑی ہو۔ تم جلد اچھی ہو جاؤگی"

"میں جانتی ہوں" اُس نے جواب دیا —— "آج صبح میرا خاتمہ ہو جائے گا — لیکن دیکھو — باغ میں دفن کراؤ گے نا!"

"ہاں ہاں" اُس نے جواب دیا "ہم نے جو درخت لگائے تھے اُن کے سائے میں تمہارا مزار نہایت خوبصورت بنوایا جائیگا"

"اب مجھے کوئی خواہش نہیں" اُس نے جواب دیا "پیارے تم ہمیشہ میرے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے رہے ہو۔ اب میں خوشی سے مر سکتی ہوں۔ اس کے بعد اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور دم اسی آسانی سے نکل گیا، جیسے کوئی چھوٹا بچہ تھک کر غافل سو جائے۔ مرنے کے بعد وہ حسین نظر آ رہی تھی۔ اور لبوں پر ایک خفیف سا تبسم تھا۔

محبوب بیری کے درختوں کے سائے میں اُس کو دفن کیا گیا۔ قبر پر ایک خوبصورت لوح نصب کی گئی جس پر حسب ذیل الفاظ کندہ تھے "بیری کے پھولوں کے درخشاں سائے میں ہمدردی کی دیوی سو رہی ہے"

لیکن بیوی کو مرے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کو رشتہ داروں اور احباب نے شادی کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا "تم تو

ابھی جوان ہو۔ تم تو اپنے والدین کے ایک فرزند ہو اور پھر تمہارے بھی کوئی اولاد نہیں۔ دوبارہ شادی کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر تم بے اولاد مر جاؤ گے تو کون تمہارے آبا و اجداد کا نام روشن کرے گا۔ کون پھول چڑھائے گا؟"

اسی قسم کی بہت سی باتوں سے وہ شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دولہن سترہ برس کی تھی۔ اور اُس کا شوہر باغ والے مزار کی خاموش التجا کا کچھ خیال کئے بغیر اپنی نئی بیوی سے گہری محبت کرنے لگا۔

شادی ہونے کے ساتویں دن تک کوئی ایسی بات جس سے نئی دُلہن کی مسرتیں درہم برہم ہو جاتیں وقوع پذیر نہ ہوئی ——— اس کے بعد اُس کے شوہر کو حکم ملا کہ رات کو بادشاہ کے محل میں اُس کی حضوری نہایت ضروری ہے۔ پہلی دفعہ رات کو جب اُس نے اپنی بیوی کو تنہا چھوڑا ہے تو وہ بلا کسی سبب کے بے چین نظر آ رہی تھی۔ ایک غائبانہ پژمردگی اور ایک عجیب ہراس اُس پر غالب تھا ——— کسی نامعلوم خطرے سے وہ گھبرا رہی تھی سونے کے لئے جب وہ اپنی خوابگاہ میں گئی تو اُسے نیند نہ آئی تھی۔ ہوا میں ایک عجیب و غریب حبس ——— ایک ناقابل بیان گھٹن محسوس ہو رہی تھی، جیسے طوفان کی آمد سے قبل ہوا کرتی ہے۔

ٹھیک آدھی رات کو جب سارا قلعہ نیند میں مدہوش تھا یکبارگی وہ چونک اُٹھی ——— اُس کو باہر کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی پکارتا جا رہا ہو ——— اور وہ حیرت کرنے لگی کہ اس وقت کونسا پجاری اس کے مکان کے قریب سے گذر رہا ہوگا؟ تھوڑی دیر بعد آوازیں اور قریب سے آنے لگیں۔ بظاہر پجاری مکان کی طرف آ رہا تھا ——— لیکن وہ مکان کے عقبی حصے کی طرف سے جہاں کوئی سڑک نہ تھی کیوں آ رہا ہے؟ ——— دفعتاً کتے خاص قسم سے غرّا کر بھونکنے لگے ——— اور وہ ایسی خوفزدہ ہو گئی جیسے کوئی خواب میں ڈر جائے ——— آواز یقیناً باغ میں سے آ رہی تھی ——— اُس نے اُٹھ کر خادمہ کو بیدار کرنا چاہا۔ لیکن وہ اُٹھ نہ سکتی تھی ——— حرکت نہ کر سکتی تھی ——— پکار نہ سکتی تھی ——— اور آوازیں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں ——— اُف وہ کتے کس زور سے بھونک رہے تھے۔ اس کے بعد گو کمرے کے سارے دروازے بند تھے اور کوئی پردہ تک نہ ہلا تھا ——— ایک عورت آہستہ سے جیسے پرچھائیں چلتی ہے کمرے کے اندر داخل ہو گئی ——— ایک کفن پہنی ہوئی عورت ——— جس کی آنکھیں نہ تھیں۔ کیونکہ مرے ہوئے اُس کو بہت دن ہو گئے تھے۔ اور جس کے کھلے ہوئے بال چہرے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ——— اور وہ اپنی بالوں کے درمیان سے دیکھ رہی تھی ——— اور وہ بغیر کسی زبان کے کہنے لگی:-

"اس مکان میں تم نہیں رہ سکتیں۔ میں اس کی مالکہ ہوں۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے جانے کی وجہ کسی سے نہ کہنا۔ اگر تم نے اُن سے اس کا ذکر کیا تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگی"

یہ کہکر وہ غائب ہو گئی۔ دُلہن خوف سے صبح تک بیہوش پڑی رہی دن کی مسرت خیز روشنی میں اُس کو اپنے دیکھے اور سُنے ہوئے واقعہ کی حقیقت پر شبہ ہونے لگا۔ گو دھمکی کا خیال اُس کے دماغ پر اس طرح مسلط تھا کہ اُس نے اپنے خواب کا نہ تو اپنے شوہر سے تذکرہ کیا اور نہ کسی اور سے اس کے متعلق کوئی لفظ مُنہ سے نکالا تاہم اس نے اپنے دل کو یہ سمجھکر تسلی دینی شروع کی کہ رات کو بدخوابی ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے طبیعت ناساز ہو گئی تھی ———

بہرحال دوسری رات کو کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی دوبارہ ٹھیک آدھی رات کو کتے اُسی طرح غرّا کر خوف سے بھونکنے لگے ——— پھر اُسی طرح باغ میں سے آوازیں آنے لگیں ——— جو اُس سے قریب ہوتی جا رہی تھیں ——— پھر دوبارہ اُس نے اُٹھ کر پکارنا چاہا ——— مُردہ عورت پھر کمرے میں آ گئی اور ناگن کی طرح پھنکار کر کہنے لگی:-

"تم چلی جاؤ۔ اپنے جانے کی وجہ کسی سے نہ کہنا۔ اگر تم نے اُن سے ایک لفظ بھی کہا تو میں ٹکڑے ٹکڑے کر دونگی!"

اس دفعہ وہ مسہری کے قریب تک چلی آئی تھی ——— اور جھک کر نہایت قریب سے اُس نے یہ جملے کہے تھے۔

دوسرے دن جب اُس کا شوہر محل سے واپس آیا تو اُس کی نوجوان بیوی نے روتے ہوئے کہا "میں منت کرتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے کہ میں اس بُری طرح سے آپ کے سامنے گفتگو کر رہی ہوں ——— مجھے میکے بھیج دیجئے۔ خدا کے واسطے مجھے میرے والدین کے پاس بھیج دیجئے!"

"کیا تم مجھ سے خوش نہیں ہو؟" اُس نے تعجب سے دریافت کیا: "میری عدم موجودگی میں کیا کسی نے تم کو دُکھ پہونچایا؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے" اُس نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ "ہر شخص یہاں میرے ساتھ محبت سے پیش آتا ہے ـــ لیکن میں آپکی بیوی نہیں رہ سکتی ـــ مجھے چلا جانا پڑے گا"

"میری پیاری" اُس نے فرطِ حیرت سے کہا۔ "تم کو ضرور اس مکان میں کوئی تکلیف پہونچی ہے لیکن میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ تم جانے کے لئے کیوں آمادہ ہو ـــ کسی نے تم کو دُکھ پہونچایا ہے ـــ یقیناً تمہارا طلاق لینے کا تو خیال نہیں ہے"

اُس نے کپکپاتے ہوئے سسک سسک کر کہا کہ:۔ "اگر آپ طلاق نہ دیں گے تو پھر میری زندگی محال ہے!"

وہ تھوڑی دیر تک ان عجیب و غریب باتوں کی اصل وجہ معلوم کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہُوا ساکت رہا۔ اس کے بعد بغیر کسی جذبے کو دبائے ہوئے اس نے کہا۔

"تم کو بغیر کسی غلطی کے میکے بھیجدینا میرے لئے باعثِ شرم و بدنامی ہے۔ اگر تم اصل وجہ مجھ سے بیان کرو ـــ ایسی وجہ جس سے حالات کی ٹھیک ٹھیک توضیح ہو سکے تو میں تم کو طلاق دیدونگا لیکن بغیر کسی وجہ کے میں تم کو طلاق نہیں دے سکتا ـــ ہمارے خاندان کی عزت و وقعت پر کسی قسم کا دھبہ نہ لگنا چاہیئے"

اور اس کے بعد اُس کو ساری باتیں بمجبوری کہنی پڑیں۔ اور اُس نے خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا:۔ "اب جبکہ میں نے آپ سے سب کچھ کہدیا وہ مجھے مار ڈالے گی ـــ وہ مجھے ضرور مار ڈالیگی"

گو وہ ایک دلیر اور شجیع مرد تھا اور بھوتوں کے وجود کا قائل نہ تھا۔ تاہم ان الفاظ کو سُنکر اچھل پڑا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُس کے دماغ میں اس واقعہ کی نہایت سادہ اور فطری تشریح و توضیح ہو گئی۔

"میری پیاری" اُس نے کہا۔ "تم نہایت پریشان ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بدخوابی کا کرشمہ ہے۔ محض اس بنا پر میں تم کو طلاق نہیں دے سکتا۔ کہ میرے مکان میں تم رات کو سہم گئی تھیں۔ لیکن مجھے اس کا ملال ہے کہ تم کو ایسی تکلیف پہونچی آج رات کو بھی مجھے شاہی محل میں رہنا پڑیگا لیکن تم تنہا نہ رہوگی۔ دو آدمیوں کو میں تمہارے کمرے کی نگرانی کے لئے چھوڑ جاؤنگا۔ تم آرام سے سو جانا۔ یہ دونوں اچھے آدمی ہیں اور ہر طرح سے تمہاری حفاظت کریں گے"

اس کے بعد اُس نے کچھ ایسی محبت سے دیکھا کہ وہ اپنی خوفزدہ حالت پر شرمانے لگی اور مکان ہی میں رہنے کا اُس نے مصمم ارادہ کر لیا۔

دونوں نگہبان جن کو عروس کی حفاظت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ بہادر اور پاک باطن آدمی تھے۔ اور اُن کو عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنے کا کافی تجربہ تھا۔ انہوں نے عروس کو خوش کرنے کے لئے دلچسپ کہانیاں سُنائیں۔ اور دُلہن اُن سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی اور اُن کی بذلہ سنجیوں پہ قہقہے لگاتی رہی۔ خوف و ہراس اُس کے دل سے بالکل دُور ہو گیا تھا۔ بالآخر جب وہ آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہو گئی تو دونوں سپاہی کمرے کے ایک گوشے میں پردے کے پیچھے چوسر کھیلنے لگے ـــ وہ صرف سرگوشیاں کر رہے تھے، مبادا کہ اُس کے آرام میں خلل واقع ہو جائے۔ اور وہ ایک معصوم بچے کی طرح غافل سو رہی تھی۔

ٹھیک آدھی رات کو وہ خوفزدہ ہو کر بیدار ہو گئی ـــ اُس کو پھر وہی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں ـــ اب یہ آوازیں قریب سے آ رہی تھیں۔ اور قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ خوف و دہشت سے اُچھل پڑی اور چیخنے لگی لیکن کمرے میں کسی نے کوئی حرکت نہ کی ـــ صرف ایک موت کا سا سکوت جو لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ طاری تھا۔ وہ تیزی سے سپاہیوں کی طرف دَوڑی۔ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن خاموش ـــ اور ایک دوسرے کو سکتے کے عالم میں پھٹی ہوئی آنکھوں سے گھُور رہے تھے۔ وہ چلانے لگی اور اُن کو جھنجھوڑنے لگی لیکن وہ اُسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے گویا کہ منجمد ہو گئے ہیں ـــ

بعد میں اُنہوں نے کہا کہ اُن کو آوازیں سنائی دی تھیں ـــ دولہن کی چیخوں کو بھی اُنہوں نے سُنا تھا ـــ حتیٰ کہ اُن کو اُس کے جھنجھوڑنے کا بھی احساس ہُوا تھا۔ لیکن نہ تو وہ ہل سکتے تھے اور نہ مُنہ سے کچھ کہہ سکتے تھے ـــ ایک خاص قسم کی گہری نیند نے اُن پر غلبہ پا لیا تھا۔

صبح کو شوہر جب حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اُس کو ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے قریب اپنی نوجوان بیوی کی خون میں ڈوبی ہوئی بے سر نعش کو فرشِ زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ دونوں سپاہی ابتک غافل پڑے سو رہے تھے۔ اپنے مالک کی آواز پر وہ اُچھل پڑے اور بیوقوفوں کی طرح فرش کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ——— سر کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اور نعش کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو کاٹ کر جُدا نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ مروڑ کر علیٰحدہ کر دیا گیا تھا۔ خون کے نشانات گیلری کے باہر چلے گئے تھے۔ اور دروازے چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ تینوں آدمیوں نے باغ تک اُس کا سُراغ لگایا ——— خون کے قطرے اور بڑے بڑے چھینٹے گھاس پر، ریت پر، بیضوی چشمے کے کنارے پر اور صنوبر و بانس کے درختوں کے تاریک سائے میں پڑے ہوئے تھے۔ مُڑنے کے بعد اُن کی نظر دفعتاً ایک ایسی چیز پر پڑی، جو طلوعِ آثار کے وقت بدخوابی میں ایک چمگادڑ کی طرح نظر آیا کرتی ہے۔ ایک عورت کا ڈھیر جس کو دفنائے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا، اپنی قبر پر استادہ تھا ——— اور اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود سر تھا ——— ایک لمحے تک تینوں آدمی ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس کے بعد اُن میں سے ایک سپاہی نے اپنی تلوار کھینچکر اُس پر حملہ کیا۔ یکایک دم چُور چُور ہو کر زمین پر گر پڑا ——— اور کفن، ہڈیوں اور بالوں کے ریزے خاک پر پھیل گئے۔ لیکن استخوانی پنجے کی گرفت جو اگرچہ کلائی سے جُدا ہو گیا تھا پھر بھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ اُس کی انگلیاں خون آلود سر کو مضبوط پکڑے ہوئے تھیں ——— اور ایک کیکڑے کے پنجوں کی طرح، جس نے کسی گرے ہوئے میوے کو خوب مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو۔ اور اس کو نوچنے کی کوشش کر رہا ہو ——— سر کو مروڑ رہی تھیں ——— نوچ رہی تھیں ———

———✕———

"یہ تو ایک شیطانی قصہ ہے" میں نے اپنے دوست سے جو قصہ بیان کر رہا تھا کہا "مرنے والی نے اگر بدلہ لیا تھا تو اُس کو مرد سے لینا چاہیئے تھا"

"مرد یہی خیال کرتے ہیں" اُس نے جواب دیا "لیکن ایک عورت کبھی ایسا نہیں کر سکتی ———"

وہ سچ کہتا تھا۔ (ماخوذ)

نجومی! ٹیگور کا ایک ادبی پارہ

جناب مولانا حبیب احمد صاحب فاروقی

میں نے کہا ——— "جب شام کو پورا چاند درخت کی شاخوں میں پھنس جاتا ہے تو کوئی اسے پکڑ کیوں نہیں لیتا؟" ———

لیکن بھائی جان میرے اوپر ہنسے اور کہا ——— "تم جیسا احمق بچہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ چاند ہمیشہ دور ہی رہتا ہے ——— پھر کوئی اسے کیسے پکڑ سکتا ہے؟"

میں نے کہا ——— "بھائی آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں جب اماں کھڑکی میں دیکھتی ہیں اور ہمیں کھیلتا ہوا دیکھ کر مسکراتی ہیں ——— تو آپ انھیں دور کہیں گے؟

لیکن بھائی جان نے کہا ——— "تم بڑے بیوقوف ہو چاند کو پکڑنے کے لئے تم اتنا بڑا جال کہاں سے لاؤ گے؟"

میں نے کہا ——— "آپ ہاتھوں سے پکڑ سکتے ہیں" ——— لیکن بھائی جان ہنسے اور کہا تم نرے احمق ہو۔ اگر چاند نزدیک آ جائے تب تمھیں معلوم ہو کہ یہ کس قدر بڑا ہے؟

میں نے کہا ——— "بھائی! آپ کو ماسٹر صاحب اسکول میں کیا پڑھاتے ہیں؟ ——— دیکھئے! اماں جب ہمیں پیار کرنے کو جھکتی ہیں تو کیا اُن کا چہرہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے ———؟"

لیکن بھائی جان کہتے ہیں ——— "تم بڑے بیوقوف ہو"

(ترجمہ) ٹیگور

وقارِ وطن

نثار الملک حضرت میر احمدی اجمیری

خاطر میں کب وہ لائے بلبل ترے چمن کو — جو خلد جانتا ہو ہر خطۂ وطن کو

پھر کہہ رہا ہوں تم سے گذری ہوئی کہانی — پھر کر رہا ہوں تازہ افسانۂ کہن کو

آنکھوں میں پھر رہے ہیں دیوار و در کے نقشے — غربت میں ڈھونڈھتا ہے اک بیوطن وطن کو

باقی رہینگی اُس کی محنت کی یادگاریں — خوش بخت کیوں نہ سمجھوں خسرو کو کوہکن کو

میری وطن پرستی مشہور ہے جہاں میں — عزّت سے دیکھتا ہوں ہر ذرّہ وطن کو

تعریف کس زباں سے اس کی بیاں ہو جس نے — گویائی دی زباں کو بخشی زباں دہن کو

جنت نشان جس کو کہتا ہے سب زمانہ — خالق نے وہ دیا ہے رتبہ مرے وطن کو

ان کے ہی ہاتھ میں ہے دنیا کی حکمرانی — جو فرض جانتے ہیں تحصیلِ علم و فن کو

دیکھو جوان ہو کر باعزّ و شان ہو کر — بچو نہ بھول جانا تم مادرِ وطن کو

چمکے گا مہر بن کر عالم میں نام اپنا — لکھّے گی آبِ زر سے دنیا مرے سخن کو

اے میرؔ زندگی بھر اپنی رہی یہ حالت

پہونچے کبھی وطن میں چھوڑا کبھی وطن کو

عشق

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس!

نہ ہر کو ورقے خواند و معنے دانست

(جناب اخلاق صاحب دہلوی کے بی اے یو صدر شعبۂ تصنیف و تالیف بی ہیائی دہلی)

"عشق کیا ہے؟ کسی کامل سے پوچھا چاہیئے"

دُنیائے شعر و شاعری پر اگر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ کوئی شاعری اور کسی قوم کی شاعری عشقیہ جذبات کی تنظیم سے خالی نہیں۔ مولانا مہدی آفادات مہدی میں رقمطراز ہیں:۔

"جذباتِ عشق نے ہمیشہ دنیا میں مشقِ سخن کی ہے"

لیکن اس قدر وحد کے باوجود مستقل معلومات کی فراہمی سے یہ عنوان بالکل بے نیاز نظر آتا ہے ؎

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وُہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

چنانچہ اس کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو شاید اس سے بہتر جواب نہ ملے کہ "عشق میگویم و جاں میدہم از لذتِ وے" یعنی عشق وُہ شے ہے کہ نام لیتے ہی اُس کی لذت مست و بیخود کر دیتی ہے۔ تو جب کیفیت یہ ہے تو پھر حسن تنظیم کیسے پیدا ہو! لیکن دشوار طلب امر یہ ہے کہ ادبی حیثیت سے قلم اُٹھانے والے کے لئے یہ معذرت کسی حد تک قابلِ پذیرائی ہو سکتی ہے کیونکہ مضمون کو تخیلاتِ تنظیمیہ کا مرقع اور کیفیاتِ صحیحہ کا جلوہ گاہ بنا دینا اُسکا فرضِ منصبی ہوتا ہے۔ لہٰذا مقصد برآری کے لئے یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کیفیاتِ عشق کو ترتیب دیکر ایک نتیجہ نکالا جائے۔ اور اسی کو تعریفِ عشق قرار دیکر تخیل آمالی کا مرکز بنایا جائے۔

یہاں اس امر کا انکشاف کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ مُسلّم ہے کہ جو اشیا فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ تو عشق جو ایک جذبۂ لطیف اور ذوقی شے ہے۔ اس کی پوری پوری تعریف کیسے ہو سکتی ہے! لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جبتک کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ اُس کے متعلق کوئی معقول اظہار کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ اور شاید یہی امر اب تک تنظیمی معلومات کی فراہمی سے مانع رہا۔

لہٰذا ضرورت تھی کہ پہلے اس نعمے کو حل کیا جائے تاکہ دورانِ تحریر میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور آسانی سے تبصرہ کیا جا سکے۔

چنانچہ کیفیاتِ عشق پر تنظیمی اور تنقیدی نظر ڈالنے سے یہ امر بالکل مبرہن اور واضح ہو جاتا ہے کہ:

"عشق پاک اور بے غرض محبت کو کہتے ہیں"

یعنی محبت جب خود غرضی اور نفس پرستی کی سرحد سے گذر جاتی ہے تو عشق کا درجہ پاتی ہے۔ فلاسفۂ مشرق کے سرتاج امام غزالی (کیمیائے سعادت صفحہ ۴۰۰ میں) فرماتے ہیں:۔

"کشش، لگاؤ اور وابستگی کا نام محبت ہے۔ اور اگر یہ میلان اور رغبت قوی ہے تو اس کو عشق کہتے ہیں"

ہندی کے لائق ادیب پروفیسر دھرم اندر ایم اے وشارد منی شی پریم تت کے زیرِ عنوان مادھری (دسمبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۶۶) میں رقمطراز ہیں:۔

"प्रेम आकर्षण शक्ति है" "محبت کشش ہے"!

علامہ شبلی شعر العجم (جلد ۵ صفحہ ۸۹) میں رقمطراز ہیں:۔

"عشق ایک فطری کشش ہے جو انسان میں پائی جاتی ہے
وہ آکر دل میں ایک خاص ذوق اور شورش پیدا کرتا ہے"

دنیائے شاعری کے مجدد حضرتِ غالب دہلوی فرماتے ہیں:۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے!

ہندی مرحوم آفادات صفحہ ۲۰۹ میں "فلسفۂ حسن و عشق" کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں:۔

"محبت کیا ہے؟ ایک مقناطیسی کشش ہے"

پھر صفحہ ۲۱۵ میں لکھتے ہیں:۔

"اہلِ سائنس کا خیال ہے کہ عشق چاہنے والوں میں
کسی کا اختیاری نہیں ہے بلکہ ایک جذبۂ اضطراری
ہے جو گذشتہ زمانے کے ہزارہا میلانِ طبائع نے وراثتہً
ہمارے لئے چھوڑا ہے"

"وراثتہً ہمارے لئے چھوڑا ہے" اور فطری کشش کی توضیح علم النفس کے ماہر علامہ جلالی مصنف "اخلاق جلالی" سے بھی سن لیجئے، فرماتے ہیں:۔

"حکماء گفتہ اند کہ قوامِ موجودات بہ محبت است"

یعنی حکماء نے کہا ہے کہ موجودات کا خمیر محبت سے کیا گیا ہے"

محبت کی تصریح آپ سن چکے ہیں کہ وہ عشق کا ابتدائی درجہ ہے۔ اب ذرا ان اقوال کی مطابقت بھی ملاحظہ ہو۔ ماہرِ نفسیات ملا جلالی کے یہاں "قوامِ موجودات بہ محبت" اہلِ سائنس "میلانِ طبائع" "وراثتہً" اور "جذبۂ اضطراری" شعرا کے یہاں "زور نہیں" "لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے" (یعنی جذبۂ اضطراری ہے) اور شبلی کے یہاں "فطری کشش" اور وہ اکبر ہندی ادیب کے یہاں خالی "کشش" ہندی مرحوم کے یہاں "مقناطیسی کشش" اور امام غزالی کی "رغبتِ قوی" اور "کشش و وابستگی کا عروج" اور ہمارا نظریہ:۔

"عشق پاک اور بے غرض محبت کو کہتے ہیں"

پھر اس کی توضیح کہ محبت جب خود غرضی اور نفس پرستی کی سرحد سے گذر جاتی ہے یعنی نظریۂ غزالی کے مطابق جب ابتدائی مدارج طے کر لیتی ہے اور رغبتِ قوی کے مرتبے کو پہونچتی ہے تو عشق کا درجہ پاتی ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ توضیحات کس قدر ایک دوسرے سے وابستہ اور متعلق ہیں کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی آتی ہے۔ لفظ کچھ ہوں مگر مفہوم ایک ہے۔

ماہرِ نفسیات کا "قوام" دیکھئے، صاف پتہ دے رہا ہے کہ اختیاری نہیں اضطراری ہے۔ اور سائنس کے "وراثتہً" اور "میلانِ طبع" سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اور وہ خود وضاحت کر دیتے ہیں کہ اضطراری ہے، اختیاری نہیں۔ حضرتِ غالب بھی یہی فرماتے ہیں کہ اس پر کسی کو اختیار نہیں ہے، یہ لگائے لگتا ہے نہ چھڑائے چھٹتا ہے۔ علامہ شبلی کے یہاں بالکل صاف ہے کہ یہ فطری کشش ہے اختیاری نہیں ہے۔ "اکبر" کے لفظ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھئے کہ بے اختیاری کا جامع ترجمان ہے۔ ہندی کے لائق نثر نگار کے یہاں بھی آئینہ کی طرح مصفا ہے کہ محبت ایک کشش ہے۔ اور انہوں نے اپنے مضمون میں کامل تصریح کر دی ہے کہ خدا پریم ساگر ہے اور انسان کا پریم اس کی ایک بوند اور قطرہ ہے! اسی علیہ کی نسبت سے انسان خدا سے واصل ہو سکتا ہے۔ محقق غزالی نے مدارج تک کی توضیح کر دی ہے کہ جذبۂ عشق ایک کشش ہے جو ابتداً لفظ محبت سے اور بتدریج عشق کے مبارک نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ مولانا حالی نے لفظ عشق کو صحیح محل پر کس خوبی سے نظم فرمایا ہے ملاحظہ کیجئے:

اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم ۔۔ اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم ۔۔ اسی کی طلب میں مرو گر مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی!

الغرض یہ ثابت ہو گیا کہ عشق ایک فطری کشش ہے اور جذبۂ لطیف اور اس کو خرافات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ البتہ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ تشریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ عشق دو حالتوں سے خالی نہیں: ایک وہ جس میں کوئی غرض بھی شامل ہو مثلاً شوہر کی محبت، بیوی کی محبت، اولاد کی محبت، گرو اور پیر کی محبت، چنانچہ اس عشق کو عشقِ مجازی اور محبت کہتے ہیں۔ نواب حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی "مقدمۂ دیوانِ درد" میں خواجہ میر درد کے ناقل ہیں:۔

"بوالہوسی عشق مجازی نہیں اور اس مجاز کو حقیقت کی

لاہ نہیں کہہ سکتے۔ پیر کی محبت وہ عشق مجازی ہے جو مطلوب حقیقی تک پہونچا دیتی ہے" (ہماری شاعری ص۹۱)

ہندی کے لائق ادیب پروفیسر دھرم اندر شاستری ایم اے و شاردمنی شی ادھری ص۲۷ تحریر فرماتے ہیں:۔

عشق مجازی خدا تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے — वह तो तृषा है, वासना है और है प्रेम के रूप में पाखंड

عربی کی ضرب المثل ہے "المجاز قنطرۃ الحقیقہ" یعنی مجاز حقیقت کا ذریعہ ہے۔ اور یاد رکھئے کہ ضرب المثل ہونے کی اہلیت وہی فقرے رکھتے ہیں کہ جن میں صداقت اور کثرتِ استعمال کے باعث دلوں پر سکہ بٹھانے کی قابلیت ہوتی ہے۔ نیز یہ حقیقت کہ مجاز حقیقت کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ دن رات کے واقعات اور مشاہدات سے ظاہر ہے۔ مسٹر محمود الحسن صاحب علیگ کا افسانہ "نوشابہ" جو اپنے گوناگوں محاسن کی بنا پر ناظرین کی خواہش سے کئی بار طبع ہوا ہے۔ اور جو تنظیم جذبات اسلوبِ بیان اور اعلیٰ کیریکٹر کے لحاظ سے بہترین افسانہ اور اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس میں کیفیاتِ محبت کو لکھتے ہوئے صفحہ ۱۱۰ پر فرماتے ہیں:۔

"وہ محبت کی آٹھ سالہ اثر انگیزیوں سے بالکل مغلوب ہو گئی تھی۔ یہانتک کہ وہ اس قربانی کے لئے بھی تیار تھی جو محبت کبھی نہیں چاہتی لیکن جو دنیا کی اصطلاح میں دو مخالف جنس کی باہمی محبت کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ خدا جلد نوشابہ کو اس درجے سے گذار دے اور اس کو ان اثرات سے بلند کر دے اور اس کو حقیقی محبت کی غایت سمجھا دے"

آگے چل کر دوسری جگہ ص۱۱۱ پر اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"ایک سال کے عرصہ میں نوشابہ ان اثرات کی سرحد سے گذر گئی۔ اب اس کو میری محبت کی نوعیت کا پورے طور سے احساس ہو گیا تھا۔ اس کے خیالات میں وہی معصومانہ پاکیزگی پیدا ہو گئی تھی"

یہ تھی عشق کی ابتدائی منزل اب دوسری کا حال بھی سنئے۔ کہ عشق حقیقی وہ عشق ہے جو تمام اغراض و مقاصد اور احتمالات و شبہات سے مبرا و منزہ ہوتا ہے۔ اس درجے پر پہونچتے ہی انسان اس عالم میں پہونچ جاتا ہے۔ کہ پرتوِ وحدت کے سوا وہاں کچھ نہیں ہوتا۔ ملا جلالی صفحہ ۲۴۴ پر فرماتے ہیں:۔

"محبتیکہ منشائے آں ایں نوع لذت باشد اتم مراتب بود آں را عشق تام و محبت الٰہی خوانند"	"وہ محبت جسکے پیدا ہونیکا سبب اس قسم کی لذت ہوتی ہے وہ محبت کا آخری اور اعلیٰ درجہ ہے اور اس کو عشق کامل اور محبت الٰہی کہتے ہیں"

چنانچہ یہاں پہونچتے ہی دوئی کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ کوئی دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ ہر سو محبت ہی محبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچکر سالک بے اختیار "انا الحق" اور "انا اللہ" کے نعرے بلند کرنے لگتا ہے۔ خواجہ عطار فرماتے ہیں ؎

من خدایم من خدایم من خدا
فارغم از کبر و کینہ وز ہوا۔

"فلسفۂ محبت" کے مصنف پروفیسر دھرم اندر شاستری ایم اے و شاردمنی شی اسی پریم تت کے زیر عنوان تیتری دیدا اور برہیدار تنیک وید (جو ویدک کی مستند کتب ہیں) کے دو سنسکرت شلوکوں کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اسلئے پریم کو خدا اور خدا کو پریم کہہ سکتے ہیں" — इसलिये प्रेम को परमेश्वर और परमेश्वर को प्रेम कहा !

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"جیسے تیتریا اپنیشد انند میں جسے آج برہم کہکر پکارتے ہیں اسے ہم پریم پرمیشور کہیں تو کیا ہرج ہے۔" — ते तिरीय उपनिषद् जिसे आज स्वमय ब्रह्म कहकर पुकारता है और यदि हम प्रेम परमेश्वर कहें तो

اردو کے مستند شاعر حضرت غالب فرماتے ہیں ؎

جلا دے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے

ایک اور صاحب فرماتے ہیں

اپنی ہستی کو سوا غیر کو سجدہ ہے حرام ۔ مذہب پیر مغاں مشربِ رنداں ہے یہی

لیکن بندگانِ خدا ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جہاں منزل سے اسطرح گذر جاتے ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ لا موثر الا اللہ ولا موجود الا اللہ کے بحر ناپیدا کنار کے شناور حضرتِ غالبؔ فرماتے ہیں ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

مختصر یہ ہے کہ شاہراہِ عشق پر گامزن ہوتے ہی انسان اس دنیا میں پہنچ جاتا ہے کہ جہاں برائی کا تو ذکر ہی کیا۔ حسنات کا بھی دخل نہیں ہوتا۔ وہ شمعِ توحید کی ضیا سے معمور ہوتا ہے۔ اور بس۔

علامہ شبلی شعر العجم صفحہ ۷۰ میں فرماتے ہیں:-

"صوفیہ جب طالب کو تزکیۂ نفس کی تعلیم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے عشق و محبت کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صیقل تمام زنگوں کو پاک کر دیتی ہے ؎

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نرسد
کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں کردم

تو چونکہ عشق رذائل سوز و حکمت آموز ہے۔ اس لئے اس کو آگ سے بھی تشبیہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ دریائے محبت کے شناور حضرت غالبؔ فرماتے ہیں ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

مولانا رومؔ فرماتے ہیں ؎

آتش است ایں عشق نائی نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

ارشاد الطالبین صفحہ ۵ میں ہے:-

العشق نار تحرق ماسوی المحبوب (عشق ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا سب کچھ جلا دیتی ہے)

اور اسرار الاولیاء صفحہ ۵ میں حضرت خواجہ فرید الدین گنجشکر سے منقول ہے:-

"عشق ایک آگ ہے جو درویشوں کے دل کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی"

پھر فرماتے ہیں:-

"یہ ان کا خمیر تجلیٔ الٰہی کے انوار سے بنا ہوا ہے"

گویا کہ عشق رذائل سوز ہونے کی حیثیت سے آگ ہونے کے علاوہ چونکہ بعض بھی ایسے مقام مقدس میں ہوتا ہے کہ جو تجلیاتِ الٰہی کے انوار سے خمیر یعنی لمعاتِ وحدت اور قدسی اوصاف کے حمل کے لئے اچھلے ہی سے مستعد ہو۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

طاف الھوی فی بلاد اللہ کلھم
حتی اذا مر بی من بینھم وقفا

(عشق تمام دنیا میں چکر کھاتا پھرتا تھا۔ جب میرے پاس آیا تو ہیں ڈیرے ڈال دیئے)

مولانا مہدی آفادات ص۱۱۱ میں صراحت فرماتے ہیں کہ "عشق صرف مذہبِ عشق ہے"۔ پس انہی مذکورہ علل و اسباب کی بنا پر کہا گیا ہے کہ اوصافِ حمیدہ کو پیدا کرنا اور رذائل کو مٹانا عشق کا خاصہ ہے۔

علامہ شبلی (شعر العجم جلد ۵ میں) فرماتے ہیں:-

"عشق کا بڑا وصف یہ ہے کہ تمام رذیل اخلاق شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں۔ بغض، کینہ، حسد، خود پرستی، فخر، غرور فنا ہو جاتے ہیں۔ طبیعت میں رقت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسان ایک عام محبت اور کشش سے لبریز ہو جاتا ہے" (ص۳۳)

"عشق انسان میں شریفانہ جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ رنج، کینہ، بغض، عناد کی دل میں جگہ نہیں رہتی محبت کا ایک عام اثر ہو جاتا ہے۔ دل میں سوز و گداز آجاتا ہے۔ دشمن سے بھی دشمنی کا خیال نہیں آتا" (ص۹)

؎ زمینِ عشق بکونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

"یعنی عشق کی برکت سے ہم نے تمام عالم سے دوستی کر لی ہے۔ اے مخاطب تو ہمارا دشمن بن اور پھر ہماری دوستی کا تماشا دیکھ"

دوستی با دشمنم نہ زہر مہر انگیزی است
دوستی را دوست دارم ورنہ دشمن دشمن است

یعنی دشمن سے جو میں دوستی کرتا ہوں تو یہ کچھ اس سے ذاتی محبت نہیں ہے مجھکو دوستی خود محبوب ہے ورنہ دشمن تو دشمن ہی ہے"

"عشق ایثار نفس پیدا کرتا ہے جو انسان کے بہترین اوصاف میں سے ہے" (صـ۹۱)

عشق دلیرانہ جذبات یعنی جانبازی، جاں نثاری، عزم ثبات، پامردی واستقلال پیدا کرتا ہے" (صـ۹۱)

سچے عاشق کو کسی سے رشک ورقابت نہیں ہوتی وہ سب سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کو خیال ہوتا ہے کہ سب لوگ اس کے محبوب کے دوست ہیں اور دوست کا دوست' دوست ہوتا ہے۔ ؎

نیازارم ز خود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درو جائے تو باشد

یعنی اے محبوب میں کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس میں تیری محبت نہ ہو"

"عشق مال و دولت اور جاہ وحشمت کی طمع سے آزاد کر دیتا ہے" (صـ۹۱)

عشق کامل نیست تا در بند مال و مسکنی
آں زماں آتش علم گردد کہ سوزد خانہ را

یعنی جبتک آدمی دنیا کے بندھن میں پھنسا ہوا ہے اس وقت تک اسکا عشق کامل نہیں ہے۔ آگ کو اُس وقت بھڑکی ہوئی سمجھنا چاہیئے کہ جب گھر کو پھونک دے"

"عشق سے تمام اخلاق ذمیمہ اخلاق شریفہ سے بدلجاتے ہیں۔ عداوت محبت ہوجاتی ہے۔ بخل فیاضی بن جاتا ہے۔ غرور نیاز سے بدل جاتا ہے۔ پست ہمتی کی بجائے بلند حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض وہ ایک اکسیر ہے جس سے خاک زر بن جاتی ہے" (صـ۹۲)

چنانچہ یہ مسلم ہے کہ جو شخص عشق میں جتنا زیادہ کامل ہوتا ہے اُتنا ہی وہ محاسن وکمالات صوری ومعنوی کا مظہر ہوتا ہے۔ مولانائے روم فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد ÷ او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باد اے عشق خوش سودائے ما ÷ اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما ÷ اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد ÷ کوہ در رقص آمد و چالاک شد

بلوطینوس فلاسفر "فلسفہ جمال" کے زیر عنوان لکھتا ہے:۔

"صرف تین آدمی مثل اعلیٰ (ظاہری وباطنی محاسن کا مجموعہ) تک پہونچ سکتے ہیں (۱) موسیقی جاننے والا (۲) عاشق (۳) فلاسفر" (ادبی دنیا ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

ملا جلال اخلاق جلالی کے صـ۱۳۱ پر "علاج افراط شہوت" کی بحث میں لکھتے ہیں:۔

وحکما گفتہ اند کہ سہ چیز موجب جودت ذہن ولطافت نفس است یکے عشق عفیف، دوم فکر لطیف، سوم سماع وعظ از قائل ذکی"

یعنی "حکماء نے کہا ہے کہ تین چیزیں ذہن کو روشنی اور روح کو تازگی بخشنے والی ہیں (۱) پاک عشق (۲) اچھے خیالات (۳) ذہین آدمی کی تقریر سننا"

میر تقی میر اپنی خود نوشت سوانح حیات "ذکر میر" میں لکھتے ہیں۔ کہ اُن کے والد بزرگوار جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اور شب وروز یاد الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ وہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:۔

"اے پسر عشق بورز عشق کہ دریں کارخانہ متصرف است، اگر عشق نمی بود، نظم کل صورت نمی بست، در عالم ہر چہ است ظہور عشق است۔ . . . ؎

بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق پسرے دارد

یعنی اے لڑکے عشق اختیار کر عشق ہی ہے جو تمام عالم میں قبضہ کئے ہوئے ہے، اگر عشق نہیں ہوتا تو یہ انتظامات عالم ظہور میں نہ آتے، دنیا میں جو کچھ ہے عشق ہی کا ظہور ہے

"عشق سے خالی نہیں رہنا چاہیے اور بے عشق نہ ہونا
چاہیے (کیونکہ پیغمبر کنعانی (تمک کو بھی) اپنے لڑکے
کا عشق تھا"
غالباً میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" اور دریائے عشق بھی اسی تعلیم کے
نتیجے ہیں۔ شعلۂ عشق میں فرماتے ہیں ؎

محبت مسبب محبت سبب ۔ محبت سے ہوتے ہیں کار عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے ۔ محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے ہے انتظام جہاں ۔ محبت سے گردش میں ہیں آسماں
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل ۔ محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل
محبت سے ہوتا ہے جو کچھ کہو ۔ محبت وہ ہو جو ہرگز نہ ہو

مثنوی دریائے عشق میں فرماتے ہیں :۔ ؎

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق ۔ حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق سے عشق ہے نہیں ہے کچھ ۔ عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں ۔ ہے محمدؐ کہیں علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے ۔ جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
شان ارفع ہے جن کی خوار ہیں یاں ۔ عقل والے جنوں شعار ہیں یاں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے ۔ بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

دنیائے تنقید کے آفتاب درخشاں مسٹر روز حیدر آبادی (تنقیدی مقالات
صفحہ ۸۲) میں تحریر فرماتے ہیں۔
"محبت تمام انسانی جذبوں سے زیادہ قیمتی اور قابل ستائش
جذبہ ہے اور ہر آدمی از ابتدا تا انتہا اسی کا آرزومند اسی کا
شیدا اور اسی کا متمنی رہتا ہے"
خیام نے خوب کہا ہے ؎

ہر کس کہ درو مہر و محبت بہ سرشت ۔ گر ساکن مسجد و در اہل کنشت
در دفتر عشق نام ہر کس کہ نوشت ۔ آزاد ز دوزخ است فارغ ز بہشت

پروفیسر دھرم انند صاحب شاستری ایم۔ اے وشارد منی شی پریم تت
میں بائرن (ایک انگریزی شاعر) کے اقوال سے اپنے مدعا پر استدلال کرتے ہوئے
فرماتے ہیں۔

"جب عبادت آدمی کا دیرینہ جاتی ہے تو بھگوان پریم کی وجہ سے
خود ہی اس سے مل جاتا ہے۔

भक्ति उड़ाती है मानसको जब ऊंचेकी ओर !
तब भगवान स्वंय आ मिलते खिंचे प्रेमकी डोर !!

مختصر یہ ہے کہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے کہ جس کے فقدان سے انسان
انسان نہیں رہتا۔ لہذا حصول کمالات انسانی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس
عطیہ خداوندی سے فائدہ اٹھائے اور دنیوی کمالات و محاسن کے اکتساب کے ساتھ
ہی ساتھ آخرت کے محسنات سے بھی لطف اندوز ہو۔
لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عشق کے بالکل ہم شکل ایک اور
جذبہ ہے اور اس کو ہوس کہتے ہیں۔ اس میں اور عشق میں اس قدر مشابہت ہے
کہ امتیاز نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ عشق کے مقابلے میں ہوس بہت عام ہے اسی
وجہ سے عشق کی ابتدائی منزلوں میں عشق و ہوس میں بالکل تمیز نہیں ہوتی
اور اکثر دھوکے میں عشق کو ہوس اور ہوس کو عشق سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسٹر
محمود الحسن (علیگ) نوشابہ صفحہ ۱۰۷ پر لکھتے ہیں۔
"دنیا ہمیشہ سچی محبت کے متعلق غلط فہمیوں میں رہی ہے"
صاحب اخلاق جلالی صفحہ ۱۰۴ پر فرماتے ہیں :۔
"تفرقہ میان عشق نفسانی و بہیمی مشکل است" یعنی عشق اور
بوالہوسی میں فرق کرنا مشکل ہے۔
پھر فرماتے ہیں۔
"اکثر مردم بقید ہوائے نفس اسیر ماندہ از ربقہ اطاعت طبیعت
بیروں نیامدہ فسق را عشق نامند و ہوس را محبت دانند"
(اکثر آدمی دل کی خواہشات میں پھنسے ہوئے ہیں اور طبیعت
کی اطاعت کو نہ چھوڑ کر عشق کو فسق کہتے ہیں اور ہوس کو
محبت سمجھتے ہیں۔)
جناب غالب فرماتے ہیں۔ ؎

ہے ہے تمیز عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

اور اسی خوف سے کہ کہیں عشق کو ہوس اور ہوس کو عشق نہ سمجھ لیا جائے
میر صاحب فرماتے ہیں۔ ؎

دل کی لاگ کہیں ہو تو میر چھپائے رکھو اس کو

یعنی عشق ہوا ظاہر تو لوگوں میں رسوا ہوگا

چنانچہ قاعدہ مقرر ہوگیا۔ ع

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں

کسی نے خوب کہا ہے ؎

جنھیں ہے عشق صادق وہ کہاں فریاد کرتے ہیں
لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

یہاں یہ بھی بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "بوالہوسی" کہتے کس کو ہیں،
"بوالہوسی وہ محبت نما جذبہ ہے جو صرف خود غرضی اور
نفس پرستی پر مشتمل ہوتا ہے"

اور یہ ظاہر ہے کہ جس کی بنیاد ایسے نامعقول جذبے پر ہو وہ خود کیسا (قابل اجتناب جذبہ) ہوگا۔

لہذا جس طرح سے جذبہ عشق مثل اعلیٰ تک پہونچانے کے نردبان کا کام دیتا ہے۔ اسی طرح جذبہ بوالہوسی بھی اسفل السافلین میں لے جانے کے لئے یہ معاون و مددگار رہے۔ تو جس طرح اس سے توصل اتمتع ضروری ہے اس سے اجتناب و پرہیز لازمی ہے۔

(باقی باقی)

غزل

از جناب مظفر حسین صاحب، شمیم

کیا عجب دل کی لگی سوزِ بیاں تک پہونچے
کون کہہ سکتا ہے یہ آگ کہاں تک پہونچے

توڑ کر سرحدِ ادراک کی ہر بندش کو
تیرے دیوانے خدا جانے کہاں تک پہونچے

گردِ راہِ سرِ منزل یہ بتا دے للہ
ہم سے یارانِ عدم چھٹ کے کہاں تک پہونچے

پھر وہی ترچھی نظر پھر وہی تیکھی چتون
آپ پہونچے بھی تو پھر تیر و کماں تک پہونچے

ضبط و تسلیم ہے اربابِ وفا کا شیوہ
راز اس شوخ کا او میری زباں تک پہونچے

کشش بادۂ سرجوش کا دامن تھامے
جھومتے جھومتے ہم پیر مغاں تک پہونچے

کتنے انجان تھے انجامِ محبت سے شمیم
جان دیکر بھی نہ ہم جانِ جہاں تک پہونچے

"اِظہارِ حق"

جناب مولانا اظہر امرتسری

اگر دیتے رہے یوں ہی توکل کا سبق مجھ کو!
کسی دن شیخ فاقوں سے نہ کر دیں جاں بحق مجھکو

شکایت حسن کی میں کر تو سکتا تھا خدا سے بھی
مگر یاد آ گئی اس کی جبینِ پُر عرق مجھ کو

مری جنسِ نیاز و عشق کو نفرت سے ٹھکرا کر
زمانہ دے رہا ہے خود پرستی کا سبق مجھکو

بس اتنا ہی کہوں چپ ہی بھلی ہے اس زمانے میں
اگر دیدے زمانہ گفتگو کرنے کا حق مجھ کو!

جنابِ شیخ تو تھوڑی سی پیتے ہی یہ کہہ اٹھے
نظر آتے ہیں اب الٹے ہوئے چودہ طبق مجھکو

حوادث سے جو زندہ بچ گیا تو میری ہمت ہے
وگرنہ زندگی تو کر چکی تھی جاں بحق مجھ کو

اڑاتا ہے زمانہ مضحکہ میری بصیرت کا
تمناؤں کی دیکر اک کتابِ بے ورق مجھ کو

طبیبو ہے تو ساقی بھی دوائیں جاننے والا،
پلاؤ تو سہی انگور کا رنگیں عرق مجھ کو

چلا ہوں صومعہ سے جانبِ دار و رسن اظہر کہ پھر ہونے لگی ہے جرأتِ اظہارِ حق مجھکو

"بیزاری"

لارڈ ڈنسنی کے ایک شاہکار ڈرامے کا اردو ترجمہ

از

جناب مولانا خواجہ احمد صاحب فاروقی پھرالونی

افراد ڈرامہ

بادشاہ

بالنارب } دو ساربان
ایوب } دیوان

زابرا ایک مشہور و معروف شخص،

عزنارزا ایک خانہ بدوش عورت،

منظر شہر تالنہ کے باہر

وقت غیر یقینی

بالنارب شام تک ہم لوگ پھر ریگزار میں پہونچ جاویں گے

ایوب ہاں،

بالنارب پھر بہت دنوں تک ہمیں شہر کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگی

ایوب آہ،

بالنارب شام کی ہلکی ہلکی روشنی وہ شہر کی آخری چیز ہوگی جو ہماری آنکھیں دیکھیں گی۔

ایوب پھر ریگستان آجاویگا۔

بالنارب ہاں، وہی ظالم و بیرحم ریگستان۔

ایوب کس چالاکی سے یہ ریگستان اپنے کنوؤں کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اسے انسان کے ساتھ دشمنی ہے۔ یہ شہر کی طرح ہماری پذیرائی نہیں کرتا۔

بالنارب واقعی اسے دشمنی ہے دشمنی۔ مجھے ریگستان سے سخت نفرت ہے۔

ایوب شاید شہر سے زیادہ خوبصورت دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

بالنارب بیشک شہر سے زیادہ حسین شے کوئی نہیں۔

ایوب میرا خیال ہے کہ شہر فجر کے بعد جبکہ لیلی شب اپنا نقاب اتار دیتی ہے سب سے زیادہ دلکش یا درجاذب نظر معلوم ہوتا ہے۔ رات کی تمام تاریکیاں نبلادہ کی طرح دور کر دی جاتی ہیں اور شہر اپنے تمام حسن و رعنائی کے ساتھ دریاؤں کے شفاف پانی میں عکس ریز ہوتے ہیں آفتاب کی اولیں شعاعیں آتی ہیں اور شہر کی پیشانی کو بوسہ دیتی ہیں۔ آہ، یہ منظر کس قدر دلفریب ہوتا ہے لوگوں کی آوازیں رفتہ رفتہ بلند ہوتی ہیں۔ اول غیر مسموع پھر زرا سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور اس کے بعد تمام آوازیں ایک میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ آہ! یہ رونق ہنگامہ کس درجہ جاذبیت کی حامل ہوتی ہیں۔ صبح کے اس پر فضا منظر میں میں اکثر یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہر مجھ سے کہہ رہے ہیں: "ایوب! ایوب!! دنیا فانی ہے لیکن مجھے موت نہیں۔ میری بہار بے خزاں ہے۔

بالنارب لیکن ایوب مجھے شہر اس وقت زیادہ دلفریب معلوم ہوتے ہیں جب سورج غروب ہوتا ہے۔ صبح کا منظر تو ہم ریگستان میں بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شہر غروب آفتاب کے وقت جب کہ فضا پہ ہلکا اندھیرا مسلط ہوتا ہے جو نہ روشنی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ تاریکی سے بیحد دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ اس "رازِ پنہاں" میں یا اس تاریکی میں جو نہ رات ہی کا جزو معلوم ہوتی ہے اور نہ دن کا لبادہ میں ملفوف شکلیں دکھائی دیتی ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کون ہیں۔ جب خوب اندھیرا ہو جاتا ہے اور ریگستان میں بجز ایک "سیاہ افق" اور سیاہ آسمان کے کوئی مرکز نگاہ نہیں ہوتا اس وقت لالٹینیں جلتی ہیں اور گھر کوں میں سے ایک ایک کر کے روشنی پیدا ہوتی جاتی ہے اور لباس کے رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت رات میں غالباً ایک عورت اپنے دروازے سے نکل کر سڑک کی طرف چلی جائیگی۔ ایک مرد آہستہ آہستہ ایک خنجر لے کر کوئی پرانا جھگڑا طے کرنے نکل جائیگا اور سرائے والا اپنا قہوہ خانہ روشن کریگا اور رات بھر شراب فروخت کرے گا اور لوگ اس کے دروازے کے باہر بنچوں پر ایک ہری لالٹین کے سامنے بیٹھ کر کوئی کھیل کھیلینگے۔ اور حقہ پئیں گے۔ آہ یہ سب کچھ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ میں جب حقہ پیتا ہوں اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوں تو ریگستان کے بارے میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ اس پر ایک سرخ بادل چھا گیا ہے جو ایک دہشت انگیز آندھی کا پیش خیمہ ہے اور جو دم ابلیس کی کار فرمائی ہے۔

ایوب ہاں آندھی کا خیال ایسی صورت میں ضرور خوشگوار ہوتا ہے جب آدمی شہر میں محفوظ ہو۔ لیکن میں اس وقت اس کا خیال کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ صبح سے پیشتر ہم کو روانہ ہو جانا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ ریگزار اپنے دامن میں کیسے کیسے طوفان چھپائے ہوئے ہے ریگستان میں جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ کتے کو ہڈیاں ڈالنا۔ کچھ وہ چھوڑ دے گا اور کچھ کھالے گا۔ اسی طرح ممکن ہے وہ ہماری ہڈیاں کھالے یا ہم کتے کے درخشاں شہر کو واپس آجائیں۔ آہا۔ میں تو تاجر ہوتا۔ ایک مصروف سڑک کے اوپر میری چھوٹی سی دکان ہوتی اور دن بھر تجارت کرتا۔

بالنارب، آہ! شہر میں ایک رئیس اور مالدار شخص کو جو ریشم خریدنے آئے دھوکا دینا کس قدر آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ریگستان میں موت کو دھوکہ دیا جائے۔

ایوب (اشارہ کرتے ہوئے) وہ کون ہے؟

بالنارب کہاں؟ وہاں جہاں اونٹ کھڑے ہیں ریگستان کے کنارے پر؟

ایوب ہاں، وہی —— کون ہے؟

بالنارب وہ ریگستان کی طرف —— اونٹوں کے راستے پر گھور رہا ہے —— لوگ کہتے ہیں کہ بادشاہ ریگستان کے کنارے جاتا ہے اور اسے دیکھتا رہتا ہے۔ وہ شام کو وہاں دیر تک کھڑا مکہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

ایوب بادشاہ کے لئے یہ کس کام؟ وہ مکہ نہیں جا سکتا اور نہ ایک دن کے لئے ریگستان جا سکتا ہے۔ مخبر اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اسے پھر عدالت یا دیوان عام میں لے آوینگے۔ اگر وہ لوگ تلاش نہ کر سکیں گے تو ان کے سر قلم کر دیئے جائیں گے اور ان کے سر کسی اونچی جگہ آویزاں کر دیئے جاوینگے قاضی ان کی طرف دیکھینگے اور کہیں گے "یہ یہاں سے اچھا تلاش کر سکینگے"۔

بالنارب نہیں بادشاہ ریگستان کو نہیں جا سکتا۔ اگر خدا مجھے بادشاہ کر دیتا تو میں صرف ایک بار رخصت کے طور پر ریگستان کے کنارے جاتا، اپنے منہ اور داڑھی کا ریت جھاڑ دیتا اور پھر کبھی ریگستان کی طرف رخ بھی نہ کرتا۔ خشک اور حریص ریگستان، شیطانوں کا باپ! یہ اپنے ریت کے کنوؤں کو پوشیدہ کیا کرے۔ آندھیاں اڑایا کرے۔ ہر سال اور ہر صدی کے بعد، میری بددعاؤں کا اس پر کوئی اثر نہ ہو —— مجھے کچھ مطلب نہیں —— بس خدا —— اگر —— مجھے بادشاہ کر دے۔

ایوب لوگ کہتے ہیں تم بادشاہ سے مشابہ ہو۔

بالنارب ہاں میں مشابہ ہوں۔ اس کا باپ شتربان کا بھیس بدل کر ہمارے گاؤں میں چلا گیا تھا میں اکثر اپنے دل میں کہتا ہوں "خدا منصف ہے اگر میں بادشاہ کا بھیس بدل لوں اور اسے ساربان کی حیثیت سے نکال دوں تو میرا یہ فعل خدا کو پسند آئیگا کیونکہ خدا منصف ہے۔

ایوب اگر تم ایسا کرو گے تو خدا کہیگا کہ بالنارب کو دیکھو۔ میں نے اسے شتربان بنایا اور وہ اسے بھول گیا۔ پھر بالنارب وہ تمہارا خیال نہ کریگا۔

بالنارب کسی کو کیا معلوم خدا کیا کہیگا؟

ایوب ہاں، کیا معلوم، اس کے کام عجیب و غریب ہیں۔

بالنارب میں ایسا نہیں کرونگا۔ ایوب، میں ایسا نہیں کرونگا یہ تو صرف میں اس وقت سوچتا ہوں جب میں حقہ پیتا ہوں یا رات کو ریگستان

کے باہر یہ خیال کرتا ہوں۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں:" بالنارب ثانا کا بادشاہ ہے:" اور پھر میں کہتا ہوں:" دیوان! مالک سرائے کو معہ شراب کے بلواؤ، اس کی روشنیاں اور بورڈ منگواؤ۔ یہاں کھیلیں گے اور تمام شہر کے لوگ یہاں آئیں محل کے سامنے ہنسیں اور میرے نام کی قصیدے پڑھیں۔

زائرین بالنارب! بالنارب ـــــ اوگدھے! چلو ـــ اونٹ کھولو ـــــ اور مکہ شریف کو روانہ ہو۔

بالنارب لعنت ریگستان پر

ایوب اونٹ کھڑے ہو رہے ہیں۔ قافلہ مکہ روانہ ہونے والا ہے۔ رخصت! خوبصورت شہر رخصت!

{بادشاہ ریگستان بعد مکہ کو چلا جاتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ ایک سال بعد دوپہر کو اسی دن واپس آجائیگا۔ وہ حسب وعدہ بھیس بدلے ہوئے ایک صحرائی عورت کے ساتھ جس سے محبت ہوگئی تھی واپس آتا ہے جیسے بادشاہ شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے ساربان آگے بڑھتا ہے اور اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کرتا ہے ...}

بادشاہ اب اس ایک سالہ آزاد زندگی کا کچھ بھی باقی نہیں صرف چند افسردہ یادیں قائم ہیں۔ حافظہ ان کی یاد کو پھر تازہ کرنا چاہتا ہے لیکن اب وہ مسرت و شادمانی سے معمور نظر نہیں آتیں (عزنارزا کوئی جواب نہیں دیتی) ہم اپنی الوداع ریگستان کی مسرور آزاد فضا میں پیش کر چکے ـــــ شہر ـــ ناپاک شہر اس لائق نہیں کہ اسے یہ سنائی جائیں۔

(عزنارزا چہرہ چھپا لیتی ہے۔ بادشاہ جاتا ہے۔ دیوان اور زابرا ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

دیوان وہ آئینگے، ضرور آئینگے۔

زابرا اب دوپہر ہوگیا ہے۔ ہماری خوشحالی ہم سے رخصت ہوچکی ہے۔ ہمارے دشمن ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت نہیں آئینگے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا ہم کو بھول گیا ہے ـ ـ ـ ایسی صورت میں ہمارے دوست اظہار ہمدردی کرینگے۔

(بالنارب اور ایوب داخل ہوتے ہیں۔)

دیوان اگر حضور زندہ ہیں تو ضرور واپس آئینگے۔

زابرا دوپہر تو ختم ہوگیا۔

دیوان تو پھر وہ لوٹ گئے یا مارے گئے۔

(دیوان اور زابرا اپنے سروں پر خاک ڈالتے ہیں)

بالنارب (ایوب سے) خدا منصف ہے (دیوان اور زابرا سے) میں بادشاہ ہوں۔

(بادشاہ کا ہاتھ دروازے پر ہے جب بالنارب یہ کہتا ہے۔ وہ جاتا ہے اور عزنارزا کے پاس بیٹھ جاتا ہے وہ اپنا سر ہاتھوں کے اوپر سے اٹھاتی ہے اور اس کی طرف بغور دیکھتی ہے۔ وہ دیوان بالنارب اور زابرا کو بھی دیکھتی ہے اور اپنے چہرہ کو عربی انداز میں آدھا ڈھک لیتی ہے)

دیوان کیا آپ واقعی بادشاہ ہیں۔

بالنارب میں بادشاہ ہوں۔

دیوان جہاں پناہ آپ ایک سال کے عرصہ میں بہت تبدیل ہو گئے۔

بالنارب انسان ریگستان میں رہکر بہت تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایوب حضور بیشک بادشاہ ہیں جب آپ بھیس بدل کر ریگستان تشریف لے گئے تھے تب میں نے آپ کے اونٹ کی خدمت کی ـــــ آپ بیشک بادشاہ ہیں۔

زابرا آپ یقیناً بادشاہ ہیں۔ میں جب بادشاہ کو دیکھتا ہوں فوراً پہچان لیتا ہوں۔

دیوان تم نے بادشاہ کو کم دیکھا ہے۔

زابرا میں نے بادشاہ کو اکثر دیکھا ہے۔

بالنارب ہاں ہم اکثر ملے ہیں۔

دیوان اگر جہاں پناہ آپ کو اس شخص کے علاوہ جو آپ کے ساتھ آیا ہے کوئی اور پہچان لے تو حضور ہم کو کامل یقین ہو جائے۔

بالنارب اس کی کوئی ضرورت نہیں میں بادشاہ ہوں۔

(بادشاہ اٹھتا ہے۔ ہاتھ پھیلاتا ہے اس طرح کہ اس کی ہتھیلی زمین کی طرف رہتی ہے)

بادشاہ کہیں ہم حضور کو بادشاہ کی حیثیت سے جانتے تھے۔

بالنارب ہاں صحیح ہے میں نے اسے محل میں دیکھا ہے۔

دیوان (تعریف کرتے ہوئے) جہاں پناہ خطا معاف! ریگستان نے آپ میں بڑی تبدیلی کر دی ہے۔

زابرا میں حضور کو جانتا ہوں۔

ایوب میں بھی جانتا ہوں۔

بالنارب (بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس شخص کو معقول انعام دینا چاہئے۔ محل میں اسے کوئی منصب دیدو۔

دیوان بہتر! جہاں پناہ!

بادشاہ میں شتربان ہوں اور ہم اپنے اونٹوں ہی کے پاس جاتے ہیں۔

دیوان جیسے جی چاہے۔

(بالنارب۔ ایوب۔ دیوان اور زابرا مروانسے سے چلے جاتے ہیں ———)

عزنارزا تم نے بہت عقلمندی سے نہایت عقلمندی سے کام کیا اور عقلمندی کا پھل مسرت ہے۔

بادشاہ اب انھیں بادشاہ مل گیا۔ ہم پھر عربوں کے خیموں کی طرف چلتے ہیں ———

عزنارزا وہ بے وقوف لوگ ہیں۔

بادشاہ کچھ لوگ پیدائشی بادشاہ ہوتے ہیں اور ایک حد تک مجبور لیکن اس شخص نے خود ایسا ہونا پسند کیا۔

عزنارزا آؤ چلیں

بادشاہ ہاں واپس جائینگے۔

عزنارزا آؤ ہم لوگوں کے خیموں کی طرف چلو۔

بادشاہ ہم الگ ایک چھوٹے خیمے میں رہینگے۔

عزنارزا ہم پھر ریت کا ترنم سنیں گے جس سے نسیم سحری بھی ہوگی بڑا اندوز

بادشاہ ہم علی الصباح خانہ بدوش لوگوں کو دور ——— رخصت ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔

عزنارزا گیدڑ اپنے پاؤں سے شور کرتے ہوئے اور ہمارے سامنے سے بھاگتے ہوئے پہاڑیوں میں گھس جاویں گے۔

بادشاہ جب سورج غروب ہوگا ہمیں گذشتہ دن کا ذرا افسوس نہ ہوگا۔

عزنارزا میں رات کو اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاؤنگی اور میرے بالوں میں وہ ستارے چمکتے ہونگے جنھیں دنیا کی بڑی سے بڑی دولت نہیں خرید سکتی۔ اور ہم پھر دنیا کی کسی جواہر پوش ملکہ پر رشک نہیں کریں گے۔ (پردہ)

خواجہ احمد فاروقی کچھرایونی،

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۷-ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب جج خفیفہ لکھنؤ۔

درخواست دیوالیہ نمبر ۶ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دیئے جانے دیوالیہ مسمی چارلس ارنیسٹ میکلین ساکن چارباغ شہر لکھنؤ۔

بنام ——— ۲۔ بلائی مل بنکر لاہور ۷۔ آغا شاہ محمد خان بنکر حسین گنج لکھنؤ۔

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۰ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قلم درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۰ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جائداد غالباً مبلغ پانسو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور بتاریخ پچیس ۲۵ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بابت مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جائداد مدیون مذکور کی عندا کارروائی شروع کر سکتی ہے تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعوی کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۸ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط جج صاحب بہادر (مہر عدالت)

سمن بجز من انفصال مقدمہ

(حسب آرڈر ۵ قاعدہ ۲۰ ضابطہ دیوانی)

نمبر مقدمہ ۱۴ سنہ ۱۹۳۵ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ مقام لکھنؤ۔

جوگل کشور ولد رام نرائن قوم رستوگی ساکن کناری ٹولہ لکھنؤ مدعی بنام

سیتارام ولد کالکا قوم لودھ ساکن رانی گنج شہر لکھنؤ مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمھارے نام ایک نالش بابت مبلغ مو ۵ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۳ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بوقت ۱۰ بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے حاضر ہو اور جواب دہی دعوی کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمھارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوی کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمھارے مسموع اور فیصل ہوگا

آج بتاریخ ۱۵ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط جج صاحب بہادر (مہر عدالت)

محسوسات ماہر

جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری مدظلہٗ

تری نظر نے کبھی بیرخی جو کی ہوگی — مشاہدات کی دنیا اُلٹ گئی ہوگی

مریضِ ہجر نے اس طرح جان دی ہوگی — اجل بھی رحم سے منہ اس کا دیکھتی ہوگی

فضائے حُسن کی نیرنگیاں ارے توبہ — نگاہ دیکھ کے حیران ہو گئی ہوگی

تری جفاؤں پہ پردہ پڑا رہا ہوگا — کہ میری موت خود اک راز بن گئی ہوگی

میں جانتا ہوں کہ کیا ہے حقیقتِ خورشید — تری نگاہ کی گرمی ٹھہر گئی ہوگی

نگاہِ مست میں میخانے جھومتے ہونگے — حیا شباب میں کروٹ بدل رہی ہوگی

زہے نصیب کہ وہ آرہے ہیں بالیں پر — یہ سن رہا ہوں کہ تجدید زندگی ہوگی

وہ کیوں اٹھائے غمِ موج جس نے اے ماہر
خدا پہ کشتیٔ امید چھوڑ دی ہوگی؟

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی

ایک تنقیدی مبحث

از جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی۔ اے (کامل)

میں معاشیات ہند پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ یہ مضمون اس کے ایک باب کا نہایت مختصر خلاصہ ہے۔ ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کی اہمیت کے پیش نظر امید ہے کہ یہ مضمون غور سے پڑھا جائیگا۔ شبلی۔

امداد باہمی کا فلسفہ

امداد باہمی کوئی نئی تحریک نہیں۔ اس کا ارتقا بالعموم اسی جذبہ اخوت کا مرہون منت ہے جو دیہات کے رہنے والوں میں قدرتی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ روسی میسر" افلاطون کی جمہوریت" اور مور کے "یوٹوپیا" میں اسی جذبہ اخوت کی جھلک پائی جاتی ہے اور ازمنہ وسطیٰ کی انگریزی نظم "پائرس پلاؤمین" میں بھی اسی کا اظہار پایا جاتا ہے۔

اگرچہ آج کل امداد باہمی کا حیطہ عمل بہت بڑھ گیا ہے لیکن بنیادی اصول تقریباً وہی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے اس قسم کی انجمنوں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ ہورس پلنکٹ نے امداد باہمی کی تعریف یوں کی ہے۔

"امداد خود جس کو تنظیم سے موثر بنا دیا گیا ہو"

لیکن مسٹر کاروٹ جس کی توضیح اس بارہ میں زیادہ قابل قدر ہے کہتا ہے کہ "امداد باہمی تنظیم کی ایک شکل ہے جس میں لوگ اپنی مرضی کر اور انسان ہونے کی حیثیت میں مساوی طور پر اپنے ہی اقتصادی مفاد کو ترقی اور فروغ دیتے ہیں"۔

دوسرے معنوں میں

(۱) یہ انجمن ممبروں کی اپنی مرضی اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے معرض ظہور میں آتی ہے

(۲) اس میں انسانیت کا پہلو غالب رکھا جاتا ہے یعنی سرمایہ داری وغیرہ کی صورت میں کسی کے مفاد پر ڈاکہ نہیں ڈالا جاتا بلکہ سب ممبر مساوات کے کامل پر ترقی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ امداد باہمی اور سرمایہ داری میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری خریداروں کے حقوق چھینتی ہے اور امداد باہمی ان کو دلاتی ہے۔

(۳) اگرچہ اس انجمن کے پیش نظر لوگوں کی اقتصادی بہبودی ضرور ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد اعلیٰ نفع نہیں ہوتا۔ جو تھوڑا بہت نفع ہوتا بھی ہے وہ ممبروں کے درمیان ہی تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

تعاونی مجلس کا ارتقاء

یہ تحریک زرعی ممالک کا خاصہ ہے کیونکہ صنعتوں وغیرہ کے معاملہ میں کارٹل اور ٹرسٹ ایسی انجمنوں کے ذریعہ سے سرمایہ یکجا جمع کیا جا سکتا ہے لیکن زمینداروں کے درمیان ایسا کرنا محال ہے کیونکہ ان کے پاس سوائے اپنی زمین کے کوئی سرمایہ نہیں ہوتا اور وہ تعاون صرف اس طور پر کر سکتے ہیں کہ چندہ جمع کیا جائے اور اسی چندہ جمع کرنے اور ضرورتمند کسانوں کے امداد کرنے کا نام ہی کوآپریشن ہے۔ چنانچہ اس وقت ڈنمارک اور آئرلینڈ عام طور پر سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک ہیں اور ان کی کامیابی کا راز ہی کوآپریشن ہے۔ آج کل زمیندارہ اتحاد پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ بھی نکل آیا ہے یعنی اشتراکیت کے ذریعہ سے اشتمال اراضی کرنا لیکن اس کے لئے روس کی طرح مضبوط دیسی

اور شخصی حکومت کی ضرورت ہے۔

یہ تحریک اپنی موجودہ صورت میں منصۂ شہود پر اس طرح آئی کہ گذشتہ صدی کے آخری ربع میں جرمنی، فرانس اور اٹلی کو دیہاتی قرض کے انہی مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو اس وقت ہمیں ہندوستان میں درپیش ہیں۔ یعنی ان کا "بنیا" دیہاتوں میں اپنے جال پھیلا رہا تھا اور اس کے زبردست ہتھکنڈوں کے آگے زمیندار بیچارہ جونک کے چوسے ہوئے انسان کی طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ قرض دہندگی کی تعاونی کمیٹیاں (کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹیز) بنائی گئیں اور شرح سود کو ایک نظام کے ماتحت لایا گیا تاکہ زمینداروں کو قرضہ لینے میں بھی دشواری پیش نہ آئے اور نہ وہ اس کے نیچے بہت زیادہ دب جائیں۔

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی

اسی اصل کو پیش نظر رکھ کر سنہ ۱۹۰۴ء میں ہندوستان میں بھی اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی اور کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹیز ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس وقت سے یہ تحریک تین منازل طے کر چکی ہے۔

(۱) سنہ ۱۹۰۴ء تا سنہ ۱۹۱۲ء اس عرصہ میں یہ تحریک اپنی ابتدائی صورت میں رہی یعنی اس کے ذریعے سے زمینداروں کو صرف قرض دیا گیا اور زمینداروں کے دیگر مفاد کا خیال نہ رکھا گیا۔

(۲) سنہ ۱۹۱۲ء تا سنہ ۱۹۱۹ء اس دوران میں قرضہ کے علاوہ دیگر صورتوں میں بھی زمینداروں کی امداد کی گئی اور میکلگن کمیٹی سنہ ۱۹۱۵ء کی سفارشات کی بنا پر صوبجاتی اور مرکزی بنک جاری کئے گئے جو ان تعاونی مجلسوں کی مالی امداد کرتے ہیں۔

(۳) سنہ ۱۹۱۹ء سے یہ محکمہ صوبجاتی وزراء کے ماتحت آگیا ہے جو اس کی بہبودی میں خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگرچہ اتنا نہیں جس قدر درکار ہے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک روز بروز ترقی پذیر ہے چنانچہ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں کل اسی ہزار سے زائد کوآپریٹیو سوسائٹیاں تھیں جن کا مجموعی زیر استعمال سرمایہ اٹھاون کروڑ روپیہ تھا اور تیس لاکھ ممبر تھے۔

سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں سوسائٹیوں کا شمار ایک لاکھ سے زیادہ، بانوے کروڑ روپیہ زیر استعمال سرمایہ اور چالیس لاکھ ممبر ہو گئے ان میں سے صرف پنجاب میں سولہ ہزار سے بیس ہزار تک سوسائٹیاں بڑھیں۔ پانچ لاکھ سے سات لاکھ تک ممبر ہو گئے اور سرمایہ گیارہ کروڑ سے بڑھ کر اٹھارہ کروڑ تک ہو گیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہماری کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا نظام بھی بہتر ہو رہا ہے۔ ابھی اس شعبہ میں بہت سی ترقی کی گنجائش ہے۔ کیونکہ موجودہ طریقہ تعاون ابھی بہت سی باتوں میں ناقص اور قابل اصلاح ہے۔ اس بارہ میں رکاوٹیں بھی بہت ہیں لیکن پہلے ہم اس نظام کے نقائص کو واضح کرتے ہیں۔

ہندوستان کی تعاونی مجالس میں نقائص

ہم نے مسٹر کالورٹ کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ امداد باہمی ایک ایسی تنظیم ہے جو ممبروں کی اپنی مرضی سے معرض ظہور میں آتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ تحریک افسروں کی طرف سے رائج کردہ ہے۔ وہی اس کو فروغ دے رہے ہیں اور انہیں کے فولادی نظام کے ذریعہ سے یہ کام کر رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس تحریک میں "خود نظمی" کا جزو مفقود ہے۔ کسی نے لکھا تھا اور وہ اب بھی صحیح ہے کہ

"جو کچھ قائم ہوا وہ گورنمنٹ کے ایماء پر ہوا۔ گورنمنٹ ہی اس کو اپنی پڑتال کی مدد سے چلا رہی ہے اور چونکہ لوگ اپنا روپیہ بنکوں کی نسبت گورنمنٹ کے پاس زیادہ محفوظ خیال کرتے ہیں اس لئے اس کی مالی امداد بھی گورنمنٹ کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔"

پھر کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے رجسٹراروں کو ضرورت سے زیادہ اختیارات تفویض کر دیئے گئے ہیں اور وہ اس محکمہ پر پوری طرح سے حاوی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دیہاتی لوگ ان سے حد درجہ خائف ہیں چنانچہ مس ہف کو (جو اس تحریک کا مطالعہ کرنے کے لئے امریکہ سے آئی تھی) کسی نے کہا۔

"ہمارا رجسٹرار وشنو، شیوا اور برہما ہے"

پس ہندوستان کی تحریک امداد باہمی میں پہلا نقص یہ ہے کہ اسے محکمہ جاتی ضابطہ کے ذریعہ سے چلایا جاتا ہے اور یہ چیز امداد باہمی کے ابتدائی اصولوں کے منافی ہے۔ پروفیسر کاجی نے گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے پرزور سفارش کی تھی کہ

"عوام الناس کی تحریک عوام الناس کے ہی سپرد کر دینی چاہیئے"
خود سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی (مرکزی مجلس تحقیقات بنکنگ)
کا خیال ہے کہ

"بعض صوبوں میں جو حاکمانہ ضبط پایا جاتا ہے اس میں نرمی
کرنی چاہیئے۔"

امداد باہمی کی کامیابی کے لئے دوسری بات جو ضروری ہے وہ ممبروں
کی ابتدائی تعلیم ہے اگر وہ جاہل ہوں تو ان کو اس کی ضرورت ذہن نشین نہ ہو سکے گی
اس معاملہ میں ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی سوسائٹیوں کے
ممبر تو درکنار خود عہدیداران نہایت جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ سوسائٹیاں
زیادہ تر دیہاتوں میں پائی جاتی ہیں اور دیہاتوں کی تعلیمی زندگی اظہر من الشمس ہے
یہی وجہ ہے کہ زمینداروں کو اس تحریک کی ضرورت کا احساس بھی نہیں۔

پھر امداد باہمی کی مجلس کا صرف یہی مقصد نہیں ہوتا کہ زمینداروں کو
قرضہ بہم پہنچایا جائے بلکہ ان کا یہ بھی کام ہوتا ہے کہ اقتصادی زندگی کے تمام شعبہ
جات میں تعاون کی تحریک پھیلائی جائے۔ چنانچہ ڈنمارک اور آئرلینڈ وغیرہ
کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں دودھ اور مکھن وغیرہ کی ایک نظام کے ماتحت خرید و
فروخت کرواتی ہیں۔ مرغیوں اور انڈوں وغیرہ کی خود پرداخت کرتی ہیں،
اور زراعتی پیداوار کے لئے خاطر خواہ بازار ڈھونڈھ دیتی ہیں لیکن ہندوستان
میں ان سوسائٹیوں کا صرف یہ فرض خیال کر لیا گیا ہے کہ وہ زمینداروں کو روپیہ
بطور قرض دیں اور وہ بھی اغلباً شادی اور اسی قسم کی دوسری رسومات کیلئے۔

ہماری کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا ایک اور نقص یہ ہے کہ زمینداروں کو
روپیہ دینے اور ان کی جائدادوں وغیرہ کا محاسبہ کرنے میں یہ بہت دیر لگا دیتی ہیں
اسی وجہ سے وہ قرض لینے کے وقت ان اداروں کی نسبت اپنے سیدھے سادھے
اور واقف کار ساہوکاروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ دیکھ
بھال کے لئے زیادہ قابل اور ماہر اشخاص مقرر کئے جائیں اور ساہوکاروں کو زمیندار
کے درمیان روپیہ تقسیم کرنے کے لئے امداد باہمی کی سوسائٹیوں کا ایک آلہ کار
بنایا جائے یعنی جو قرض دینا ہو وہ ساہوکاروں وغیرہ کے ذریعہ سے دیا جائے پھر
سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں میں اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائے
تاکہ اس تحریک میں ترقی ہو جب دونوں کا مقصد ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں
کہ وہ آپس میں تعاون نہ کریں۔

ترقی میں رکاوٹیں

ان نقائص کے علاوہ راستہ میں کئی رکاوٹیں بھی ہیں جن میں سے
چند ایک کا ذکر ہم کرتے ہیں۔

(۱) معاملہ کی پیچیدگی

تعاونی مجلسوں کا مقصد اعلیٰ زمینداروں کو قرض بہم پہنچانا ہے لیکن
صرف قرض سے ان کی مشکلات کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی
ہے کہ ان کی مستقل آمدنی کو بڑھانے کے کوئی ذرائع سوچے جائیں۔ مثلاً اشتمال
اراضی کی جائے زمین کی دولت کو بڑھانے کے لئے طریق سوچے جائیں مثلاً آلہ
جات زراعت، اکتشافات عصریہ کے مطابق استعمال کئے جائیں۔ وغیرہ

پھر معاملہ کی پیچیدگی یہ ہے کہ قرض نہ صرف زراعت پیشہ لوگوں کو
درکار ہے بلکہ صناعوں اور دیگر پیشہ وروں کو بھی اس کی ضرورت ہے۔

تیسرے ہمارے پیش نظر در اصل دیہاتی غربت کا حل سوچنا ہے
اور اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے روپیہ کی کمی صرف ایک اور وہ بھی
کسی حد تک ہے لہذا مسئلہ اور بھی نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ہم صرف
روپیہ بہم پہنچائیں تو اس کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ زیادہ روپیہ سے زمینداروں
کی خوشحالی کی بجائے فلاکت اور غربت زیادہ بڑھتی ہے۔

(۲) جہالت اور کاروباری اصولوں سے ناواقفی

دیہاتوں میں تعلیم کم ہے اس لئے کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے سیکرٹری
اور پریزیڈنٹ وغیرہ بننے کے لئے لائق آدمیوں کا فقدان ہے ان کو امداد باہمی
کے اصول نہیں آتے اور نہ وہ معاشیات سے شغف رکھتے ہیں۔ چنانچہ بنگال
بنکنگ انکوائری کمیٹی نے لکھا ہے کہ تعلیم کی کمی ہی اس تحریک کے سست چلنے
کی بڑی وجہ ہے۔ . . . (جلد اول صفحہ ۱۴۰)

(۳) روپیہ کی کمی

یہ عام شکایت ہے کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے پاس روپیہ کی کمی ہے
آسام بنکنگ انکوائری کمیٹی کا خیال ہے کہ نقص دراصل بدنظمی کا ہے نہ کہ کمی
زر کا۔ صوبجات متوسط کی کمیٹی حکومت سے امداد لینے کے خلاف ہے۔ لیکن
صوبجات متحدہ کی کمیٹی اپنے صوبہ میں امداد باہمی کی ناکامی حکومت کی امداد
کے نہ ہونے ہی کو قرار دیتی ہے۔ بہرحال یہ مسلمہ امر ہے کہ کمیٹیوں کی دیکھ بھال

اور خورد و برداخت کے لئے روپیہ کا ہونا لازمی ہے۔

(۴) زراعت کا موسم کی کیفیت پر منحصر ہونا

ایک اور مشکل یہ ہے کہ ہماری زراعت کا انحصار زیادہ تر بارش کی کیفیت پر ہے۔ اگر بارش کم ہو تو لازمی طور پر قرضہ کی مانگ زیادہ ہوگی لیکن کوآپریٹیو سوسائٹیاں اس ناگہانی مطالبہ کو پورا کرنے سے عاجز رہی ہیں جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ موسم کی کیفیت کو مد نظر رکھ کر کافی روپیہ اپنے پاس نہیں رکھ سکیں۔ پس موسم کی کیفیت بھی ہمارے کام میں ایک حد تک روک ہے لیکن اگر فنڈ محفوظ رکھا جائے اور تحریک کو احسن طریقہ پر منظم کیا جائے تو بہت کچھ ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔

کامیابی

لیکن باوجود ان نقائص اور مشکلات کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہماری تحریک امداد باہمی اس ملک میں بالکل ناکام رہی ہے۔ اگرچہ اس درجہ تک تو نہیں پہونچ سکی جس درجہ پر اُسے پہونچنا چاہئے تھا تاہم اس کے بعض اثرات بالکل نمایاں ہیں مثلاً دیہاتوں میں جو قرضہ تعاونی مجالس اپنے ممبروں کو دیتی ہیں وہ نہایت کم شرح سود پر ہوتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ اکثر ممبروں کے قرضے یا تو بالکل اتر گئے اور یا پھر ہلکے ہو گئے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں معلوم ہوا تھا کہ بیاسی ہزار ممبروں میں سے دو ہزار ممبر اس سال کے عرصہ میں قرض سے بالکل سبکدوش ہو گئے قرضہ کی معدومی اس بات کا نشان ہے کہ لوگوں کی بچتیں بڑھ رہی ہیں۔

اگرچہ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تعاونی مجالس کی وجہ سے گاؤں کا بنیا کسی حد تک بھی ناپید ہو چکا ہے لیکن مسٹر ڈارلنگ کے الفاظ میں "اگر اس کا ذاتی اثر نا قابل زوال تھا تو اس کا نفسیاتی اثر کمزور ہو چکا ہے۔" (رسٹک ڈرالوکی بر ڈارلنگ صفحہ ۳۲۲)۔

تعاونی مجالس نے ممبروں کی اخلاقی حالت پر بھی معتد بہ اثر ڈالا ہے مثلاً ان میں کفایت اور اقتصاد کی عادت ڈالنے میں کسی حد تک یہ کامیاب ہوئی ہیں۔ ہمارے لوگ روپیہ بچانے میں تو ہوشیار ہیں لیکن وہ کسی مفید جگہ لگانے کی بجائے ذاتی اخراجات کے لئے بچاتے ہیں۔ مدراس، یوپی، بہار و اڑیسہ میں کسی حد تک یہ مقصد پورا ہوا ہے لیکن دیگر صوبجات میں ابھی اس کی بہت گنجائش ہے۔

پھر ان مجالس نے ہمارے ممبروں کو تعاونی اصولوں میں ماہر کیا۔

اور انہیں رہنمائی کرنے کی صفت پیدا کی ہے۔ ان کو معاشرتی زندگی کے بہتر بنانے کی طرف مائل کیا ہے۔ مثلاً راؤ بہادر ملکارجن لکھتے ہیں کہ

"اس تحریک سے چھوٹے چھوٹے جھگڑے بند ہو گئے ہیں اور دیہات کی زندگی میں جو تلخی تھی وہ دور ہو گئی ہے"

کئی جگہ تعلیم پھیلی ہے جس سے معاشرتی کمزوریاں رفع ہو گئی ہیں۔

میدان ترقی

مگر یہ سب نتائج اصلی مقاصد کے وسیع سمندر میں ایک قطرہ کے مانند ہیں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ درحقیقت ابھی کچھ حاصل ہی نہیں ہوا تحریک امداد باہمی تو ایک ستون ہے جس پر اقتصادی ترقی کی عمارت کھڑی ہے اگر اس کو مضبوط بنایا جائے تو بہت مفید نتائج مرتب ہو سکتے ہیں مثلاً اگر ہم غیر ممالک کی مثالیں پیش نظر رکھیں تو ہمارے اکثر اقتصادی شعبہ جات میں بھی ترقی ہو سکتی ہے جرمنی اور ڈنمارک کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں نہ صرف قرضہ دہندگی کے مقاصد کے لئے تعاونی مجالس قائم کی گئی ہیں بلکہ دیگر غیر قرضہ دہندگی کے کام بھی اس کے ذریعہ سے چلائے جاتے ہیں۔ مثلاً خام اجناس اور زرعی ہتھیاروں وغیرہ کی خرید و فروخت کا انتظام، بیمہ اور تعمیر وغیرہ کا کام انہی کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں امداد باہمی کا اصل کام "بہتر رہنا اور بہتر کاشتکاری کرنا" ہے۔

ابھی ہمارے ملک میں غیر قرضہ دہندگی کی مجالس بہت کم قائم کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں کا سب سے اہم مسئلہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دیہاتی قرضہ کو کیا جائے اور اس کو دور کرنے کا طریق صرف یہ ہے کہ امداد باہمی کی تحریک کو ملک میں فروغ دیا جائے چنانچہ رائل کمشن آف انگریکلچر نے لکھا تھا: "دیہاتی طبقہ کو قرضہ کی تباہ کاریوں سے نجات دلانے کی امید صرف امداد باہمی کی تنظیم اور اس کے احسن طریق پر نفاذ پر منحصر ہے۔" لیکن اگر سوچا جائے تو ہماری مشکلات کا حل صرف قرضہ کو دور کر دینا ہی نہیں بلکہ جیسا کہ مسٹر ... کا خیال ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کی آمدنی بڑھانے کے ذرائع سوچے جائیں اور اس کا یہ طریق ہے کہ ان کی زرعی زمین کو اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج مرتب کرنے کے قابل بنایا جائے اور جیسا کہ میکلگن کمیٹی کا خیال ہے غیر قرضہ دہندگی کی مجالس کثرت سے قائم کی جائیں۔ دیہاتیوں کا معیار زندگی بڑھے اور ان میں ترقی کی روح پیدا ہو۔ پس اگر ہم ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم کوآپریشن کو اپنے ملک کا منتہی المقصود قرار دیں، اور حکومت کو توجہ دلائیں کہ وہ اس تحریک کو دیگر ممالک کی تحریکوں کے نمونہ پر چلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔

جذباتِ فضا

جناب فضا صاحب جالندھری

ہر اشک ہے اک سُرخیِ عنوانِ تمنا
دیکھے تو کوئی گوشۂ دامانِ تمنا

ہیں ان کی نگاہوں میں بھی سامانِ تمنا
لختِ جگر و دل سے بڑھی شانِ تمنا

اے شمع یہ تکمیلِ وفا کی ہے نشانی
برباد نہ ہو خاکِ شہیدانِ تمنا

ناکامِ تمنا مجھے کہتا ہے زمانہ
شایانِ تمنا ہو تمہیں جانِ تمنا

میں اور ترے حُسنِ نظر نور کے جلوے
پیدا یہ کیا عشق نے سامانِ تمنا

ہے پیشِ نظر میرے مآلِ دلِ مضطر
وہ چشم ہے پھر سلسلہ جنبانِ تمنا

اے جوشِ فغاں چھیڑ نہ افسردہ دلوں کو
پنہاں ہے ہر اک قطرہ میں طوفانِ تمنا

میں ذرۂ برباد ہوں دنیائے وفا میں
دل کیا ہے مرا سوختہ سامانِ تمنا

اللہ رے وارفتگیِ شوق کا عالم
دشوار ہی منزل بھی ہے اب جانِ تمنا

یہ حُسن یہ جلوے یہ فضا اور یہ عالم
تیرے ہی کرشمے ہیں یہ اے جانِ تمنا

کس جوش سے آئی ہے بہار اب کے چمن میں
ہے خلد بداماں مرا دامانِ تمنا

مجبورِ فضاؔ آج ہے شاداں نظر آئے
ہلکا سا تبسم ہے ترا جانِ تمنا

بیگم

ایک مزاحیہ افسانہ

جناب مولوی غلام قادر صاحب فرید

آج صبح سے ان کا منہ پھولا ہوا تھا اور ہم چونکہ قریب قریب اس پھولے ہوئے منہ کے عادی ہو چکے تھے اس لئے کچھ زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔ بڑی ہمت کر کے دو ایک سوال بھی کئے لیکن مہاتما گاندھی کی طرح ہم کو بھی ہوم گورنمنٹ سے کوئی جواب نہ ملا اور ہم نے بھی دن بھر چپ رہنے کی ٹھان لی۔ لیکن ڈر تھا تو اس کا کہ کہیں ہم کو بھی مہاتما کی طرح زبردستی کا برت نہ رکھنا پڑے۔

یوں تو روز ناشتہ سات بجے ہی مل جاتا تھا۔ لیکن آج سات بجے اور پھر ساڑھے سات، لیکن کھانے کی میز اب بھی ویسی ہی صاف پڑی تھی جیسے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وائٹ پیپر۔ باہر نکل کر خانساماں کو پکارا اور اس بد تمیزی کی وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ صبح ہی اس کو ہوم گورنمنٹ کی طرف سے خفیہ احکامات موصول ہو چکے ہیں کہ آج سے ناشتہ آٹھ بجے میز پر لگایا جائے اس سے وجہ پوچھنا تو بیکار سی بات تھی کیونکہ اس بیچارے کو کیا علم — مجبوراً چپ ہو رہے۔ خدا خدا کر کے آٹھ بجے اور نہ پوچھئے کہ اس درمیان میں ہمارے غریب پیٹ پر کیا گذری۔ ناشتہ میز پر لگا اور شیطان کی طرح جھٹ میز پر جا ڈٹے لیکن اب بیگم کا پتہ نہ تھا۔ خانساماں سے پوچھا کہ کیا بیگم صاحبہ کو خبر نہیں اس نے کہا نہیں حضور اطلاع کر دی ہے۔ سنگار میز پر ہیں۔" پندرہ منٹ اور گذرنے پر بیگم بڑے ٹھسے سے سوجا ہوا منہ لئے ہوئے آئیں اور بغیر ہماری طرف دیکھے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہم نے کوشش بھی کی کہ ان کے لئے چار کی پیالی ہم ہی بنا دیں۔ لیکن وہ تو پہلے ہی سے تیار تھیں جھٹ اپنی پیالی کھسکا کر چار بنا ناشتہ شروع کر دی۔ اب نہ توس کو ہاتھ لگاتی ہیں نہ انڈے کو۔ خالی چار ہی پی جا رہی ہے۔ ہم نے بہت محبت سے کہا۔ "خالی پیٹ چائے نہیں پینی نقصان کرتی ہے"

جواب ملا۔ "آپ کو مطلب، ہمارا پیٹ ہے چاہے ہم اس میں آگ بھریں یا انگارے۔"

بات معقول تھی اس لئے ہم چپ ہو رہے۔ ایک پیالی پی کر وہ تو اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہم نے اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ آج دن کے کھانے کا بھی وقت بدل دیا گیا ہو خوب خوب داد شجاعت دی اور جو توس کہ ان کے حصے میں آتے وہ بھی ہضم کر گئے۔

ناشتہ وغیرہ کر کے ہم دفتر میں گئے۔ اس خیال سے کہ چلو وقت گذاری کے لئے تھوڑا بہت کام ہی کر ڈالیں۔ کئی دن سے کچھ کام بھی نہ کیا تھا۔ ابھی مشکل سے ایک مسل ہی دیکھی ہوگی کہ ایک شور مچ گیا۔ بیگم بڑے زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ سچ جانئے دل دہل ہی تو گیا کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت آئی "ہمت مرداں مدد خدا" کہتے ہوئے ہم لپکے۔ کمرے کے بیچ میں بیگم کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں ایک بنارسی ساری تھی جس پر پان کا ایک دھبہ پڑا ہوا تھا۔ سامنے ان کی منہ چڑھی خادمہ نرگس تھوتھنی لٹکائے کھڑی تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ نرگس نے ساری میں بیل ٹانکتے ہوئے شاید خندہ فرمانے کی کوشش کی کیونکہ منہ تو ہمیشہ پان سے بھرا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کے آنچل پر دھبہ پڑ گیا۔ بیگم کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک ایک سانس میں سینکڑوں صلواتیں اس کو سنا رہی تھیں دل میں ہم بھی خوش تھے کہ اچھا ہوا اس مردار کی آج خوب درگت بنی کیونکہ

بیگم کی منہ چڑھی ہونے کی وجہ سے وہ ہم کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ لیکن پھر۔ ساری کی طرف دیکھ کر دل بیٹھ ہی تو گیا۔ ستر روپیہ کی ساری ناس ہو گئی ان دونوں کا کیا گیا۔ روپیہ تو ہمارا تھا۔ بیگم تو پھر کہہ ہی گئی "۔ اللہ! ہماری یہ ساری تو خراب ہو گئی دوسری لادو ۔۔۔ اس لئے کچھ تو اس ساری کے خراب ہونے کا غم! اور کچھ اس کا صدمہ کہ اب آج کل ہی میں دوسری ساری کی فرمائش ہو گی، ہم تو گم صم ہی ہو گئے۔ لیکن کب تک؟ آخر بیٹھا کر کہا ۔۔۔ " لاؤ مجھے دو، پٹرول لگانے سے شاید دھبہ اڑ جائے "۔

بیگم نے ساری دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ " کہیں اڑ ہی نہ گیا ہو۔ کم بخت نے اچھی خاصی ساری ناس کر دی ۔ کہیں غلطی سے اس بخت مارے کو ہم سمجھ رہے تھے نہ سمجھ لیجئے گا گو مخاطب تو ہماری طرف ہی تھیں) اب کہیں یہ پہننے کی رہی "۔

دھبہ چھوٹا سا تھا۔ پٹرول لگانے سے بہت کچھ صاف ہو گیا۔ اس کے علاوہ دو دو پیسے ہی باندھتے ہیں جھول میں آ جاتا ۔۔۔ لیکن بیگم کی ناک بھوں چڑھی ہی رہی ۔

ہمارا معمول تھا کہ بارہ بجے کھانا کھا کر دفتر جاتے اور دو تین گھنٹے کام کر کے لوٹ آتے اس لئے یہ خیال تھا کہ اگر آج کھانا دیر میں ملا تو دفتر جانے میں دیر ہو جائیگی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کھانا وقت ہی پر مل گیا۔ لیکن مینو میں تبدیلی کر دی گئی تھی۔ ایک طرح کا سالن اور ایک طرح کی ترکاری، وہ بھی کدو کی جس کی بابت ہم کو ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ بیماروں کے کھانے کی چیز ہے اور اگر یہیں تک ہوتا تو بھی غنیمت تھا لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج گھی کو دور ہی سے دکھا کر کام چلایا گیا ہے ابھی بیگم میز پر آئی نہ تھیں اس لئے ہم نے خانساماں سے وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ کفایت شعاری کا خیال کرتے ہوئے کھانے کے بجٹ میں اسی فیصدی کٹ کر دیا گیا ہے اور آج سے ایک وقت کے کھانے کے لئے صرف ایک چھٹانک گھی کی منظوری دی گئی ہے خواہ اس وقت میں دو چیزیں پکیں یا تین۔ ایسا کھانا خوشی سے تو کیا کھایا جاتا بس کسی نہ کسی طرح زہر مار کر لیا اور دفتر چلے گئے ۔

ساڑھے تین بجے دفتر سے واپس آئے۔ یہ تو قسمت ہی میں نہ تھا کہ جب تھکے ہارے آئیں تو پھول سا ہنستا ہوا چہرہ خیر مقدم کو موجود ہو۔ لیکن آج سوجا ہوا چہرہ بھی نظر نہ آیا تو کمرے میں پہنچے۔ [illegible] بیگم سو رہی ہیں یا پھر شیشے میں سے تو جھانک کر دیکھا۔ لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے آہستہ سے پردہ ہٹایا۔ آہٹ پاتے ہی لمحوں میں منظر بدل گیا۔ اب بیگم سو رہی تھیں۔ کتاب ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ باوجود ضبط کے ہم کو ہنسی آ گئی۔ دبے پاؤں پلنگ کے قریب گئے اور ایک طرف بیٹھ گئے ۔۔۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں، ایک انگڑائی لی گئی۔ گویا واقعی سو رہی تھیں اور پھر بڑے انداز سے کہا ۔۔۔ " تم تو چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔ آ گئے پریشان کرنے اور جی جلانے کو۔ "

ہم نے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہا " بیگم اٹھو، یہ بھی سونے کا وقت ہے ۔۔۔ بس سو چکیں ۔۔۔ آج سینما دیکھنے چلو نا بڑا اچھا کھیل ہے۔ " اچھا گنی " ۔۔۔ "

ہماری چال ٹھیک پڑی جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ " سچ مچ چلوگے؟ کون کون ایکٹر اور ایکٹریس ہیں؟ "

اب بتائیے ہم اس کا کیا جواب دیتے۔ ہم نے تو یونہی ان کے خوش کرنے کو کہدیا تھا ورنہ خدا معلوم اس نام کا کوئی کھیل ہے بھی کہ نہیں ۔۔۔ بہر حال ادہر ادھر کے چند نام گنا دیئے ۔

بس یہ ہے ہماری اور ہماری بیگم کی روزانہ زندگی کا دھندلا سا خاکہ اب پانچ بجے سے ہی تیار ہو گئیں اور ضد ہو رہی ہے کہ چلو۔ اللہ جلدی چلو۔ ہم یہ مضمون لکھ رہے ہیں اس لئے جلدی کیسے کریں ۔۔۔ قریب آ کر کرسی کے پیچھے پر بیٹھ گئیں مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھا اور ہنس کر کہا " اللہ کی قسم تم بڑے جھوٹے ہو کیسی من گھڑت کرتے ہو "۔

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ سب من گھڑت ہی ہے کیونکہ در حقیقت ہماری ابھی تک شادی ہی نہیں ہوئی ہے پھر بیگم کہاں سے آئیں لیکن ہم نے محض حفظ ماتقدم کے طور پر یہ مضمون لکھ دیا ہے کہ اگر ہماری کبھی ہونے والی بیگم صاحبہ ہوئے پکڑنے سے عالمگیر کا کوئی پرچہ اور چاہ یہ مضمون ان کی نظر سے گذر جائے تو ممکن ہے کہ ہم ان بیگم صاحبہ کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو جائیں ۔

[illegible]

الہاماتِ ادب

حضرت رازؔ یزدانی رامپوری

نہ موت پر ہے نہ جینے پر اختیار مجھے — اور اس پہ کرتے ہیں زندوں میں سب شمار مجھے

نگاہِ ناز سے کر کر کے بے قرار مجھے — مذاقِ یار نے جانچا ہے بار بار مجھے

کیا یہ کر کے حقیقت کا راز دار مجھے — کہ اب بہار بھی ہے ماتمِ بہار مجھے

ہزار بار اگر مٹ کے میں سنبھل جاؤں — تمہیں قسم کہ مٹا دو ہزار بار مجھے

اگر سکون وہی دو جہاں کو دیتا ہے — تو کچھ سمجھ کے بنایا ہے بیقرار مجھے

کسی نے برق کی بیدادی کبھی نہ سنی — اور اس سزا میں کہ ہے شکوۂ بہار مجھے

دل اس کو کہتے ہیں شاید کہ عشق میں ہیں ہیچ — نہ اختیار انھیں ہو نہ اختیار مجھے

تمام عمر میں دیکھا ہے ایک بار تمھیں — یہ چاہتا ہوں ملو پھر تم ایک بار مجھے

نظر مجاز نہیں اور اگر مجاز بھی ہو — کہاں نصیب تماشائے حسنِ یار مجھے

عجب کرم ہے کہ بے اختیاریاں دیکر — عطا کیا ہے دو عالم پہ اختیار مجھے

مرا جنون ہے اے رازؔ لاعلاجِ جنوں
کہ عقل پر ہے محبت میں اعتبار مجھے

نقلی جواہرات

جناب مفتاح الدین صاحب ظفر

مسٹر لانٹن کی ملاقات لڑکی سے اپنے محکمے کے افسر دوم کے یہاں ایک تقریب میں ہوئی تھی اور اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔

وہ ایک انکم ٹیکس کے افسر کی لڑکی تھی جو کئی برس ہوئے مر چکا تھا۔ وہ اور اس کی ماں پیرس میں رہنے چلی آئی تھیں جہاں اس نے آس پاس تعلقات پیدا کر کے اپنی لڑکی کے لئے مناسب شوہر کی جستجو شروع کر دی تھی۔ ان کے ذرائع آمدنی بہت محدود تھے۔ وہ لوگ باوقار تھے مرنجاں مرنج تھے اور خاموش۔

نوجوان لڑکی اوصاف حمیدہ کی ایک زندہ تصویر تھی اس کی طبیعت میں انگڑائی لیتی ہوئی جوانیاں اپنی مسرتوں کا صحیح اندازہ لگا سکتی تھیں۔ اس کے ملیح حسن میں آسمانی حوروں جیسی نزاکت تھی۔ اس کا دلکش تبسم، جو ہر وقت لبوں پر رقصاں نظر آتا تھا اس کی فطرت کی سادگی اور روح کی پاکیزگی کا پتہ دیتا تھا۔ اس کی تعریف ہر شخص کی زبان پر تھی ——— لوگ ہر وقت یہ کہتے تھے ——— "خوش نصیب ہے وہ ہستی جو اس کی محبت پا سکے جو اس کو اپنا رفیق حیات بنا سکے"

مسٹر لانٹن اس زمانے میں محکمہ خارجی میں میر منشی تھے ان کی آمدنی تین ہزار پانسو فرانک تھی انھوں نے اس نیک سیر نوجوان لڑکی سے شادی کا پیغام دیا جو فوراً منظور کر لیا گیا۔ وہ اس کے ساتھ بے انتہا خوش تھی۔ اپنے گھر کا انتظام اس قدر خوش اسلوبی اور کفایت شعاری سے کرتی تھی کہ وہ لوگ خوب اچھی طرح زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے تھے۔ اس نے اپنی نازک ترین توجہات اپنے شوہر کی طرف مبذول کر دی۔ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہنستی تھی۔ بولتی تھی۔ اس کی کشش اس قدر زیادہ تھی کہ شادی کے چھ سال بعد مسٹر لانٹن کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی بیوی سے ان دنوں سے زیادہ محبت ہے جب کہ ان کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ اس کے صرف دو مشاغل کو وہ اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ تماشہ کا شوق اور جھوٹے ہیروں کی محبت، اس کی سہیلیاں (جو دفتر کے چھوٹے چھوٹے افسروں کی بیویاں تھیں) کبھی کبھی نئے کھیلوں کے شروع ہونے پر اس کے واسطے نشست کا انتظام کر لیتی تھیں۔ ہر چند اس کے شوہر کو دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد ان تفریحوں سے سخت تکلیف ہوتی تھی مگر پھر بھی مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑتا تھا خواہ مرضی ہو یا نہ ہو۔

کچھ عرصے کے بعد مسٹر لانٹن نے اپنی بیوی سے التجا کی کہ کھیل سے واپسی پر وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ گھر واپس آجایا کرے۔ پہلے تو اس نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن پھر بہت خوشامد کے بعد وہ راضی ہوئی جس سے اس کا شوہر بے حد خوش ہوا۔

اب تھیئیٹر کی محبت کے ساتھ ساتھ اس کا شوق زیورات کے لئے بڑھتا گیا۔ اس کی پوشاک جوں کی توں رہی سادہ سلیقہ کی اور نازک لیکن جلد ہی اس نے اپنے کانوں کو بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں سے مزین کرنا شروع کیا جو کہ اصلی ہیروں کی طرح چمکتے اور جگمگاتے تھے۔ اپنی گردن میں وہ جھوٹے موتیوں کی مالا پہنے رہتی تھی۔ ہاتھوں میں نقلی سونے کے جڑاؤ کنگن پہنتی تھی، اور اس کے بالوں میں شیشے کے ٹکڑوں سے جڑاؤ کلپ لگے رہتے تھے۔ اس کا شوہر اکثر اس کی حالت پر افسوس کرتا اور کہتا تھا۔

"پیاری جب تم اصلی ہیرے نہیں خرید سکتیں تو کیوں صرف اپنے زیور حسن اور نزاکت سے ہی مزین نہیں ہوتیں ——— عورتوں کے لئے تو یہی انمول زیور ہیں"

لیکن وہ صرف مسکرا دیتی اور کہتی۔

"میں کیا کروں مجھے تو ہیرے جواہرات بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہی تو مجھ میں ایک کمزوری ہے انسان اپنی عادت نہیں بدل سکتا۔"

تب وہ موتیوں کے ہار کو اپنی انگلی پر لپیٹ لیتی۔ بلوری شیشہ کی مصنوعی ہیروں میں چمک پیدا کر دیتی اور کہتی۔ "دیکھو کیا یہ خوبصورت نہیں ہیں؟ کوئی دوسرا تو قسم کھالے کہ یہ اصلی نہیں۔"

تب مسٹر لانٹن مسکراتے ہوئے جواب دیتے۔ "تمھاری باتیں تو لونیا والوں جیسی ہیں۔"

بعض وقت شام کو جب وہ دونوں آگ کے پاس بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوتے وہ چار کی میز پر مراکو چمڑے کا چھوٹا سا ڈبہ رکھ دیتی جس میں مسٹر لانٹن کے رکھے ہوئے نام کے مطابق "نقلی نقیر" ہوتا تھا۔ وہ جھوٹے ہیروں کو بہترین توجہات سے معاینہ کرتی اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کہ ان سے اس کو ایک پوشیدہ مسرت ایک حقیقی خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ اکثر تو وہ کوئی ہار اپنے شوہر کے گلے میں پہنا دیتی اور خوب خوب ہنستی اور کہتی ——— "ارے دیکھو تم کیسے معلوم ہوتے ہو۔" تب وہ اس کی گودیوں میں گر جاتی اور محبت میں ڈوب کر اسے پیار کر لیتی۔

موسم سرما کی ایک شام کو وہ سینما دیکھنے گئی تھی اور جب گھر واپس ہوئی تو اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی دوسرے دن صبح کو اسے کھانسی ہو گئی اور آٹھ دن کے بعد وہ نمونیے میں مر گئی۔

مسٹر لانٹن کو اس درجہ صدمہ ہوا کہ ایک مہینے کے اندر اندر اس کے بال سفید ہو گئے وہ ہر وقت روتا تھا۔ جب وہ اس کا تبسم اس کی آواز اور اس کی دلفریب باتوں کا خیال کرتا تھا اس کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔

وقت نے اس کے رنج میں کچھ کمی پیدا نہ کی اکثر دفتر میں جب کہ اس کے ساتھی روزانہ کے کسی واقعہ پر گفتگو کرتے ہوتے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے اور اس کا رنج دلشکن سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتا اس کی بیوی کے کمرے کی ہر چیز جوں کی توں تھی ویسے ہی جیسی اس کی زندگی میں تھی اس کا تمام سامان میز کرسی اس کے کپڑے تک بھی سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے اس کی موت کے بعد کسی نے ان کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

یہاں وہ روزانہ اپنا وقت تنہائیوں میں گذارتا اس کی یاد ہی جو اس کی جان تھی۔ اس کے وجود کی مسرت بے پایاں تھی۔

لیکن جلد ہی زندگی اس کے لئے مصیبت ہو گئی۔ اس کی آمدنی جو اس کی بیوی کے ہاتھوں تمام گھر کے اخراجات کے واسطے کافی ہوتی تھی اب اس کی فوری ضروریات کے لئے بھی ناکافی تھی۔ اس کو حیرت ہوتی تھی کہ اس کی بیوی کس طرح ایسی نفیس شراب اور عمدہ عمدہ چیزیں خرید سکتی تھی جب کہ وہ خود ان کو اپنی محدود آمدنی میں نہ خرید سکتا تھا۔

اس نے کچھ قرضہ لیا اور جلد ہی بہت غریب ہو گیا۔ ایک دن صبح کو اس کی جیب میں ایک پیسہ تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ کچھ چیز فروخت کرے اس کو فوراً خیال ہوا کہ اپنی بیوی کے جھوٹے ہیرے فروخت کر ڈالے۔ اس کو ان مصنوعی ہیروں سے جو اس کی روح کو پچھلے زمانہ میں تکلیف پہونچاتے تھے بے حد نفرت ہو گئی تھی۔ ان کو دیکھ کر ہی وہ از خود رفتہ ہو جاتا تھا اور کچھ لمحوں کے لئے اپنے گم شدہ محبوب کی یاد کو اپنے دل سے نکال دیتا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ برابر خریداری کرتی رہی تھی اور قریب قریب ہر روز شام کو نئے نئے ہیرے اپنے گھر لاتی رہی تھی وہ تھوڑی دیر تک ان سب کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پیشتر اس سے کہ ایک بھاری ہار کو فروخت کرنے کا ارادہ کرے۔ اس ہار سے مرحومہ کو زیادہ الفت تھی اور اس نے خیال کیا کہ اس کی قیمت چھ سات فرانک ہوگی کیونکہ وہ صناعی کا بہترین نمونہ تھا۔ ہر چند کہ صرف مصنوعی تھا۔

اس نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کسی دیانت دار جوہری کی دوکان کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ آخر وہ ایک دوکان پر پہونچا اور اندر داخل ہوا۔ پریشان اور شرمندہ اپنی بیکسی کے اظہار پر ——— اور ایک بے حقیقت سی چیز کی فروختگی پر۔

اس نے دوکاندار سے کہا ——— "جناب من۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟"

جوہری نے ہار اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کا معاینہ کیا اپنے منشی کو بلایا اور دبے دبے لفظوں میں آپس میں کچھ گفتگو کی۔ تب اس نے زیور کو اپنے سامنے تخت پر رکھ دیا اور دور سے اس کی طرف دیکھا ——— اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کے لئے۔

مسٹر لانٹن ان تمام حرکات پر بے حد پریشان تھا اور وہ یہ کہنے ہی والا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بیکار سی چیز ہے کہ جوہری نے کہا۔

"جناب عالی! یہ ہار بارہ ہزار سے لے کر پندرہ ہزار فرانک تک کی مالیت کا ہے لیکن میں اس کو آپ سے نہیں خرید سکتا تاوقتیکہ آپ مجھے یہ نہ بتائیں کہ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا۔؟"

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور منہ کھل گیا ـــــ اس کی سمجھ میں دوکاندار کی بات بالکل نہ آئی ـــــ آخر اس نے رک رک کر کہا ـــ "کیا یہ جو کچھ ـــ تم کہتے ـــ کہہ رہے ہو ـ سچ ہے ؟ ـ"

دوکاندار نے لاپروائی سے کہا ـــــ "آپ اس کو کہیں اور دکھا سکتے ہیں ـ میں تو سمجھتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار کی مالیت کا ہوگا ـ ممکن ہے آپ کو کہیں زیادہ دام مل جائیں ـــــ لیکن اگر کہیں زیادہ نہ ملیں تو ہم ہی کو دے جائیں۔"

مسٹر لائمن نے حیرت و استعجاب میں ہار کو اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا اور دوکان سے چل دیئے ـــــ اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت کی ضرورت تھی ـ

دوکان سے باہر نکل کر وہ اپنے دل میں خوب ہنسا ـ "بیوقوف کہہ رہا ہے ـــــ اگر میں اس کی باتوں کو مان لیتا تو ـــــ وہ نقلی اور اصلی ہیرے میں امتیاز تک نہیں کر سکتا ـ"

چند منٹ بعد وہ روڈ نے لاپے کی ایک اور دوکان میں داخل ہوا دوکاندار ہار کو دیکھتے ہی چلا اٹھا ـ

"ارے یہ تو پرپیر ہے ـ میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں ـ اس کو یہیں سے خریدا گیا تھا"

مسٹر لائمن نے پریشانی کے لہجہ میں پوچھا ـــــ "اس کی قیمت کیا ہے ـــ ؟"

"میں نے اس کو بیس ہزار میں فروخت کیا تھا ـ اب میں اس کو اٹھارہ ہزار فرانک میں لینے کو تیار ہوں لیکن اس وقت جب کہ آپ مجھ کو باضابطہ اطلاع کریں گے کہ یہ آپ کے قبضہ میں کیسے پہونچا ـ؟"

اس مرتبہ لائمن گم گھبرا رہا آخر کار بولا ـ

"لیکن ـــــ لیکن تم اس کو خوب دیکھ تو لو ـ ابھی تک تو میرا یہ خیال تھا کہ یہ نقلی ہے"

جوہری نے دریافت کیا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"لائٹن۔ میں وزیر خارجہ کے محکمہ میں ملازم ہوں ——— میں نمبر ۱۶ سولہ ریوڈلے مارٹر میں رہتا ہوں۔"

دوکاندار نے اپنی کتابوں میں دیکھنا شروع کیا اس کو ایک جگہ لکھا مل گیا۔ اس نے کہا۔ "اس ہار کو مسز لائٹن کے پتہ نمبر سولہ ۱۶ ریوڈلے مارٹر پر ۲۰ جولائی سنہ ۱۸ء کو بھیجا گیا تھا۔"

دونوں آدمی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک حیرت و تعجب میں اور دوسرا چور کے خیال میں۔ آخر کار دوکاندار نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ مہربانی کر کے ہار کو یہاں چھوڑ جائیں ——— میں آپ کو رسید لکھ دیتا ہوں۔"

مسٹر لائٹن نے جلدی سے کہا ——— "ہاں ضرور!" پھر رسید کو جیب میں رکھ کر دوکان سے باہر نکل آیا۔

وہ گلیوں گلیوں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کا دماغ پریشان وحشتناک خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اس نے چاہا کچھ سوچے سمجھے ——— اس کی بیوی میں ایسا قیمتی ہار خریدنے کا مقدور نہ تھا۔ یقیناً بالکل نہ تھا۔ تو کیا۔ یہ ایک تحفہ تھا ——— تحفہ! ——— لیکن کس کی طرف سے......؟ اس کو یہ کیوں دیا گیا؟......"

وہ رک گیا اور بیچ گلی میں کھڑا ہو گیا ——— ایک خوفناک بدگمانی اس کے دل میں پیدا ہوئی ——— اس کی بیوی! ——— تو دوسرے تمام ہیرے بھی یقیناً تحفہ ہی ہونگے۔

زمین اس کے قدموں میں کانپتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ——— درخت اس کے سامنے گرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے ——— اس نے ہاتھ پھیلا دیئے اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اس کو ایک ڈاکٹر کی دوکان میں ہوش آیا جہاں راہگیر اسے اٹھا کے گئے تھے اس نے لوگوں سے گھر پہنچا دینے کے لئے کہا۔ اور جب وہ مکان پر پہنچ گیا اس نے خود کو اپنے کمرہ میں بند کر لیا اور دیر رات گئے تک روتا رہا۔ آخر کار تھکن سے چور چور ہو کر بستر پر لیٹ گیا ——— اور فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن صبح کو سورج کی کرنوں نے اس کو بیدار کیا اور اس نے دفتر جانے کے لئے آہستہ آہستہ کپڑے پہننے شروع کئے۔

اس قدر پریشانیوں کے بعد کام کرنا بہت مشکل تھا اس نے اپنے افسر کو غیر حاضری معاف کرنے کے لئے ایک عرضی لکھی ——— پھر اس کو یاد آیا کہ اسے جوہری کے پاس جانا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ نہ جائے لیکن ہار کو اس شخص کے پاس چھوڑنا بھی پسند نہ کرتا تھا اس نے کپڑے پہن لئے اور باہر چلا گیا۔ دن بہت اچھا تھا۔ سارا نیلگوں آسمان نیچے شہر کی مصروف فضا پر متبسم تھا۔ بیفکرے لوگ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

لائٹن نے ان کو دیکھ کر کہا "واقعی امیر لوگ ہی خوش رہتے ہیں روپیہ اگر پاس ہو تو دنیا کا بڑے سے بڑا رنج بھی غائب ہو جائے۔ جہاں دل چاہے آئیں جائیں اور سفر میں اپنا دل بہلائیں ——— اور یہی رنج مٹانے کا بہترین علاج ہے ——— کاش میں امیر ہوتا۔"

اس کو کچھ بھوک محسوس ہوئی۔ لیکن اس کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ اس کو پھر یاد آیا ——— "اٹھارہ ہزار فرانک۔ اٹھارہ ہزار فرانک! کتنی بڑی رقم۔"

وہ فوراً رو ڈے لا پے پہنچ گیا اور جوہری کی دوکان کے سامنے "اٹھارہ ہزار فرانک" دسیوں مرتبہ اس کی زبان سے نکلا...... اس نے دوکان میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن شرمندگی مانع رہی۔ مگر وہ بھوکا تھا اور جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا ——— وہ فوراً ایک نتیجہ پر پہنچ گیا ——— سڑک کو جلدی سے پار کیا تاکہ اس کو اور سوچنے کا موقع نہ ملے اور دوکان میں گھس گیا۔

مالک دوکان فوراً باہر نکل آیا اس کے بیٹھنے کے لئے کرسی دی ملازموں نے اس کی طرف پر معنی نظریں ڈالیں۔

جوہری نے کہا ——— "مسٹر لائٹن میں نے تحقیقات کر لی ہیں اور اگر آپ کا ارادہ اب تک ہیرے فروخت کرنے کا ہے تو میں نے جو قیمت کہی تھی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

لائٹن نے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ضرور جناب!"

اس پر دوکاندار نے دراز سے اٹھارہ ہزار کے نوٹ نکالے ان کو گنا۔ اور مسٹر لانٹن کو پکڑا دیئے۔ اس نے ایک رسید لکھی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے روپیہ جیب میں رکھ لیا۔

وہ دکان سے جانے ہی والا تھا کہ سوداگر کی طرف جس کے ہونٹوں پر اب تک پر معنی تبسم تھا مخاطب ہوا اور اپنی آنکھیں نیچی کر کے اس سے کہا

"میرے پاس —— میرے پاس اور بھی قیمتی پتھر ہیں —— جو اسی طریقے سے میرے قبضہ میں آئے ہیں —— کیا تم ان کو بھی خرید لوگے؟"

دوکاندار نے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔ "یقیناً جناب عالی"

مسٹر لانٹن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ان کو ابھی تمہارے پاس لاتا ہوں" گھنٹہ بھر بعد وہ پتھر لے کر واپس آگیا۔

بڑے بڑے کانوں کے بندوں کے دام پچیس ہزار تھے۔ جڑاؤ کنگن سینتیس ہزار فرانک کے تھے۔ چھلے اور انگوٹھیاں سولہ ہزار کے نیلم اور زمرد کا ایک ہار چھ دہ ہزار کا۔ ایک سونے کی زنجیر جس میں طرح طرح کے ہیرے لگے تھے چالیس ہزار کی —— اس طرح کل رقم ایک لاکھ تینتالیس ہزار فرانک کی ہوئی۔

جوہری نے ازراہ تمسخر کہا۔

"ایک ایسی بھی ہستی تھی جس نے اپنا تمام روپیہ قیمتی پتھروں پر لگا دیا"

مسٹر لانٹن نے متانت سے جواب دیا۔

"یہ تو اپنا روپیہ پس انداز کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے"

اس دن اس نے وازن میں کھانا کھایا اور بیس فرانک قیمت کی بوتل پی۔ تب اس نے ایک گاڑی کرایہ کی اور ہا ئس کا چکر لگایا۔ وہ حقارت آمیز نگاہوں سے سب بے فکروں کی طرف دیکھتا رہا اور آخر خود یہ چیخ چیخ کر کہنے سے باز نہ رہ سکا۔

"میں بھی اب امیر ہوں میرے پاس دو سو ہزار فرانک ہیں"

فوراً ہی اسے اپنے افسر کا خیال آیا —— وہ دفتر چلا گیا اور خوش و خرم اندر داخل ہوا۔

"جناب میں استعفیٰ دینے آیا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی وراثت میں تین سو ہزار فرانک ملے ہیں"

اس نے اپنے سابقہ ساتھیوں سے مصافحہ کیا ان کو اپنے مستقبل کے ارادے بتلائے اور پھر کیفے انگلے میں کھانا کھانے چلا گیا۔

وہ ایک شخص کے پاس بیٹھا جو صورت سے خوشحال معلوم ہوتا تھا اور کھانے کے دوران میں اسے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ اس کے ہاتھ چار سو ہزار فرانک کی رقم لگی ہے۔

اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کو تھیٹر میں کوفت نہ ہوئی اور باقی رات خوب رنگ رلیوں میں بسر کی۔

چھ مہینے کے بعد اس نے پھر شادی کر لی اس کی دوسری بیوی نیک عورت تھی لیکن بہت بدمزاج۔ وہ اس کو بہت رنج پہونچاتی تھی۔

(موپاسان) مفتاح الدین ظفر۔

غزل

جناب آغا انعام اللہ خاں صاحب بیدل

تماشائے جور و ستم دیکھتے ہیں
کرشمے محبت کے ہم دیکھتے ہیں

کبھی روئے جاناں کو ہم دیکھتے ہیں
کبھی زلف کے پیچ و خم دیکھتے ہیں

ترا نور ہر چیز میں جلوہ گر ہے!
عبث لوگ سوئے حرم دیکھتے ہیں

وہ اے کاش دیکھیں ہماری طرف بھی
ہم ان کی طرف دمبدم دیکھتے ہیں

یقیں ان کے وعدے کا ہرگز نہیں ہے
مگر اب کے ان کی قسم دیکھتے ہیں

محبت کا سجدہ ادا کرنے والے
تمہارا نشانِ قدم دیکھتے ہیں

انھیں رحم آتا نہیں کیوں خدایا!
مجھے گو سراپا الم دیکھتے ہیں

جو راہِ محبت میں دل کھو چکے ہیں!
وہی اس فلک کے ستم دیکھتے ہیں

میں آتا ہوں جس وقت پوجا کو تیری
فرشتے بھی تجھ کو صنم دیکھتے ہیں

تجھے زاہدا ہو مبارک یہ قرآں،
مگر ہم کو روئے صنم دیکھتے ہیں

وہ کرتے ہیں خط کو مرے پرزے پرزے
اگر حرفِ مطلب رقم دیکھتے ہیں

تجھے چھوڑ کر ہو بتوں سے محبت
الٰہی تری شان ہم دیکھتے ہیں

ہمیں موت ہی یاد آتی ہے اپنی
جو ہر وقت خواب عدم دیکھتے ہیں

توقع تو در اصل کوئی نہیں ہے
مگر آپ کا ہم بھرم دیکھتے ہیں

زمانے میں ہے جن کو شوقِ شہادت
وہ ابرو کی تیغ دودم دیکھتے ہیں

وہ ہمراہ دشمن جب آتے ہیں بیدل
تباہی کے سامان ہم دیکھتے ہیں

یہ بیدل تجھے آج کیا ہو گیا ہے
بہت تجھ کو مغموم ہم دیکھتے ہیں

غزل

جناب حکیم سید خورشید علی صاحب مہر تلمیذ حضرت سائل دہلوی مرحوم

نہیں معلوم اب تک کس کے جذبِ حسنِ عریاں سے
کھینچی جاتی ہے میری روح خود میری رگِ جاں سے

بچا سکتے تھے ہم دل کو نگاہِ برق ساماں سے
مگر مجبور تھے اس کے مذاقِ سوزِ پنہاں سے

کبھی وہ معنیٔ گل ہیں کبھی وہ صورتِ گل ہیں
تبسم ہائے پنہاں سے ادا ہائے نمایاں سے

بجھا ڈالا اسے میری ہوائے تیرہ بختی نے
ذرا بالیں پہ رونق تھی چراغِ شامِ ہجراں سے

چلیں گے ساتھ تیرے ہم بھی حج کرنے کو اے واعظ
کبھی فرصت اگر پائی طوافِ کوئے جاناں سے

مری رگ رگ میں اس کافر ادا نے بجلیاں بھر دیں
گرا کر بجلیاں پیہم تبسم ہائے پنہاں سے

وصالِ یار ممکن ہے مگر کس وقت ممکن ہے
گزر جائیں تلاشِ یار میں جب حدِ امکاں سے

مجھے ڈر ہے کسی در پر کہیں کعبے کے دھوکے میں
کسی دن شیخ صاحب ہاتھ دھو بیٹھیں نہ ایماں سے

مرا خورشید روئے مہر یوں ناراض ہے مجھ سے
کہ میرے نام کو نسبت ہے کچھ مہرِ درخشاں سے

رابعہ دورانی

جناب محمد شمس الدین صاحب شمس حیدر آبادی

حسن مرزا شاہ طہماسپ اول کا بھتیجا تھا طہماسپ نے حسن مرزا کو قلعہ قندھار اور اس کے مضافات عطا فرمائے۔ حسن مرزا کے دو لڑکے مظفر حسین اور مرزا رستم تھے۔ مرزا مظفر حسین نے قندھار کے بجز اطلاع اور بغیر زد خیر معاملات شہنشاہ اکبر کے حوالے کر کے یہ خواہش کی کہ دربار شاہی میں ممتاز خدمت عطا فرمائی جاوے۔ اکبر نے قندھار کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے مظفر حسین کو ممتاز عہدے پر سرفراز کیا۔

شاہان مغلیہ نے ایران کے شاہی خاندان میں رشتۂ مناکحت قائم کئے تھے۔ حسب دستور شاہجہاں نے بھی مرزا مظفر حسین کی لڑکی سے شادی کر لی۔ شہزادہ پرویز اور شہزادہ شجاع کے ساتھ مرزا رستم کی دو لڑکیاں بیاہی گئیں۔ مرزا رستم کو ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام بدیع الزماں تھا۔ جو مرزا دکنی کے نام سے معروف تھا۔ اس نے عہد جہانگیر میں ترقی کی اور صوبہ ٹھٹھہ اور بہار کا صوبہ دار رہا۔ اور شاہ نواز خاں کا خطاب پایا۔

شاہنوازخاں کی شادی نورس بیگم سے ہوئی جس کے بطن سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ شاہ نوازخاں صوبہ اڑیسہ کے انتظام میں مصروف تھا کہ شاہجہاں کا فرمان ملا کہ چھوٹی لڑکی کے ساتھ دہلی آئے۔ اور شہزادہ مراد بخش کے ساتھ اس کی شادی کرے لیکن چونکہ اس کی عدم موجودگی میں ملک کے نظم و نسق میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اپنی بیوی نورس بانو بیگم کو مع چھوٹی لڑکی کے روانہ کر دیا اور شادی میں شریک نہ ہوسکنے کی معافی چاہی۔

شاہنوازخاں کی بڑی لڑکی عالمگیر سے منسوب ہوئی اس وقت عالمگیر اورنگ آباد میں تھا شاہجہاں نے اورنگ زیب کے نام فرمان بھیجا کہ وہ جلد آگرہ آئے اورنگ زیب ۱۵ اپریل ۱۶۳۷ء کو آگرہ پہونچا ۳۰ ذی الحجہ ۱۰۴۶ھ کو دھوم دھام اور کروفر سے شادی کی تیاری شروع ہوئی اور نیک ساعت میں نکاح ہوا چار لاکھ مہر باندھا گیا اور دلرس بانو کو "رابعہ دورانی" کا خطاب ملا۔ شادی کے بعد عالمگیر کے محلسرا میں بہاری کو ولیمہ کی دعوت ہوئی شادی کے بعد ۴ ستمبر کو عالمگیر دکن روانہ ہوگیا۔

رابعہ دورانی نیک نفس اور اوصاف حمیدہ سے متصف تھیں۔ انھوں نے بہت سی غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے روپیہ دیا اور متعدد سرائیں اور مساجد تعمیر کرائیں۔ عالمگیر کو اس باعفت اور نیک ملکہ سے بہت محبت تھی۔ اس نے رابعہ دورانی کی زندگی میں دوسرا عقد نہیں کیا۔

رابعہ دورانی کے بطن سے پانچ بچے ہوئے (۱) زیب النساء بیگم (۲) زینت النساء بیگم (۳) زبدۃ النساء بیگم (۴) شہزادہ محمد اعظم (۵) محمد اکبر۔

محمد اکبر کی ولادت کے بعد رابعہ دورانی زچگی کے عارضہ میں مبتلا ہوگئیں اور اسی بیماری میں یہ نیک دل خاتون ۸ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہوئی جو مقبرہ رابعہ دورانی میں محو استراحت ہے۔

یہ بے نظیر و شاندار مقبرہ رابعہ دورانی شہرہ آفاق "تاج محل" کے نمونہ پر شہزادہ محمد اعظم نے حسب ایمائے عالمگیر سات سال میں بنوایا جس کی تعمیر میں چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار روپیہ صرف ہوئے جس کے احاطے کا طول پانچسو گز ہے۔ اور عرض تین سو گز ہے۔ اورنگ آباد جو تاریخی یادگاروں کے لحاظ سے مرقع چغتائی کی طرح دلفریب اور عمر خیام کی شاہکار رباعیوں کی طرح پر کیف ہے وہیں پر مقبرہ رابعہ دورانی اپنے شاندار و پرشکوہ تاثرات ہر سیاح کے سامنے پیش کرتا ہے۔

شمس الدین شمس

حسن تغزل

حضرت عرش مظلی رام پوری

یہ کیا کہوں کہ مجھے تم سے دوستی کیوں ہے
تمہیں بتاؤ تمہیں مجھ سے دشمنی کیوں ہے

جہانِ عشق کی ہر بات عام بھی کیوں ہے
یہ موت کیوں ہے الٰہی یہ زندگی کیوں ہے

یہ سوچتا ہوں کہ آخر یہ بیخودی کیوں ہے
بھلا رہا ہوں جسے میں وہ یاد ہی کیوں ہے

ہنسو ہنسو مری حالت پہ تم ہنسو لیکن
اگر کسی نے یہ سوچا کہ یہ ہنسی کیوں ہے

جفا کا شکوہ تو کرتا مگر سمجھ نہ سکا
مجھے کسی سے وفا کی امید ہی کیوں ہے

تری نظر سے ملی تھی رضائے مرگ جسے
مآل کار وہ مجبورِ زندگی کیوں ہے

سہی بہار کا موسم سہی چمن میں بہار
قفس میں رہ کے خیالِ بہار ہی کیوں ہے

شبِ فراق کے منظر تو اور ہوتے ہیں
فلک پہ آج ستاروں میں روشنی کیوں ہے

تلاشِ عرش پہ کلیاں بھی ہنس رہی ہیں مگر
نہیں ہیں آپ تو پھولوں میں تازگی کیوں ہے

مخفی طاقتیں

مولانا شبیر مارہروی

اللہ پاک نے اپنی قدرت کاملہ سے کچھ ایسے ذرائع پیدا فرمائے ہیں جو موسموں میں ردوبدل، رات دن کے قیام، موت وحیات کی کشمکش اور جملہ کائنات کے تمام فطری امور کو مقررہ اوقات اور اصولوں کے اندر وقوع پذیر ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ ہم دنیا والوں نے ان ذرائع کو فطری یا قدرتی طاقتوں کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس مختصر مضمون میں یہی دیکھنا ہے کہ وہ فطری و مخفی طاقتیں کون سی ہیں جن سے کائنات کا ہر ذرہ مستفیض ہوتا رہتا ہے۔

دنیا میں اور دنیا کے اردگرد جتنی بھی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ تحقیقات سے ان سب میں کچھ نہ کچھ مادیت کا جز پایا جاتا ہے اور ہم انہیں عام طور پر "مادہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ مادہ تین صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ٹھوس سیال اور ابخراتی۔

مادہ ذروں کا مجموعہ ہوتا ہے اور ٹھوس جسم میں یہ ذرے بمقابلہ سیال شے کے ایک دوسرے سے زیادہ اچھی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔ جو قوت ان ذروں کو ایک دوسرے سے ملا کر انھیں ٹھوس جسم کی صورت میں منتقل کر دیتی ہے اس کا نام قوت اتصال ہے۔ اگر دنیا میں اس قوت کا وجود نہ ہوتا تو نہ سرسبز وشاداب باغات ہوتے نہ آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑ ہوتے نہ دنیا کی حسین ودلکش صورتیں نظر آتیں۔ غرض دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں ریزہ ریزہ ہو کر غیر معلوم خاک کے ذروں میں مل جاتیں اور کسی چیز کے اجزا ایک جگہ قائم نہ رہ سکتے۔

جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے قوت اتصال بہ نسبت سیال چیزوں کے ٹھوس اجسام میں بہت زیادہ قوت کے ساتھ کام کرتی ہے اس لئے سیال چیز کے ذرات میں حرکت کرنے کے لئے زیادہ آزادی پائی جاتی ہے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو اپنے سے جدا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مختلف قسم کے مادوں کو پہچاننے کے لئے ہمارے پاس پانچ راستے ہیں جو خود اپنی اپنی جگہ مختلف قوتیں ہیں اور انھیں حس کے نام سے پکارتے ہیں مثلاً قوت باصرہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ، قوت شامہ اور قوت سامعہ۔ انھیں قوتوں یا حسوں کے ذریعہ سے ہم ہر قسم کے ٹھوس سیال اور ابخراتی مادوں کو نہ صرف پہچانتے ہیں بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر قسم کے مادہ کی مختلف خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر مادہ میں قوت مقابلہ بھی ہوتی ہے اور ایک مادہ دوسرے مادہ میں حرکت پیدا کرنے کا بھی باعث ہوتا ہے۔

اس حرکت کا مطلب سمجھنے کے لئے اگر فٹ بال کی فیلڈ پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ مسئلہ زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ فٹ بال فیلڈ کے بیچ میں رکھی ہے۔ اگر اسے بالکل نہ چھوا جائے تو وہ اپنی جگہ پڑی رہیگی کیونکہ اس میں ذاتی طور پر حرکت کرنے کی قوت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ پڑی رہیگی جب تک کوئی بیرونی یا خارجی قوت اس پر اثر انداز نہ ہو۔ گیند میں ٹھوکر لگتی ہے تو وہ گول کی جانب چلتی ہے اور راستہ میں کوئی دوسرا ٹھوکر لگائے تو وہ دوسرا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں ٹھوکر ہی وہ خارجی قوت ہے جو اسے اپنی جگہ سے متحرک کر دیتی ہے اور پھر دوسری ٹھوکر بھی وہی خارجی قوت ہے جو اس کا رخ بدل دیتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کھیلنے والے کا پاؤں ایک ایسا ٹھوس مادہ ہے جو مردہ اور لاچار گیند کے مادہ میں حرکت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ٹھوکر لگنے کے بعد گیند چلتے چلتے رک کیوں جاتی ہے اس کا باعث زمین کا مادہ ہے یا دوسرے الفاظ میں سے رگڑ بھی کہہ سکتے ہیں گویا یہ مادہ کی ایک اور صفت ہے

جس کا فعل بجائے دوسرے مادہ کو حرکت میں لانے کے اسے روکتا ہوتا ہے۔

یہی گیند اگر برف کی چکنی سطح پر لڑھکائی جائے تو روک اور رگڑ کے مواقع کم حاصل ہونگے اس لئے وہ دور تک لڑھکتی چلی جائیگی لیکن بالآخر وہاں بھی وہی قوت اپنا کام کرکے اسے روکے گی گو پہلے موقع کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ کے بعد ہی سہی۔

تمام بیرونی اثرات جو ایک ساکت جسم کو متحرک اور متحرک اجسام کو ساکت کر دیتے ہیں قوت یا طاقت کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں مثلاً گیند کو حرکت میں لانے والی چیز کھلاڑی کی جسمانی قوت ہے جسے عضلاتی قوت بھی کہا جاسکتا ہے۔

وحشی لوگ خواہ اس زمانہ کے ہوں یا ازمنہ سالقہ کے انھیں کسی قوت کا علم نہیں بجز اُس جسمانی قوت کے جو خود ان میں موجود ہے یا ان جانداروں میں جنھیں مغلوب کرنے کے لئے انھیں اپنی قوت صرف کرکے ان کی قوت کی آزمائش کا موقع ملتا رہتا ہے۔ انھیں اس کا علم نہیں کہ جسمانی قوتوں کے علاوہ بھی دنیا میں مختلف انواع کی عجیب عجیب قوتیں کام کر رہی ہیں۔

لیکن ایک مہذب اور واقف انسان نہ صرف ان قوتوں کو جانتا ہے بلکہ وہ اس ادھیڑبن میں بھی رہتا ہے کہ ان قوتوں کو کیونکر بہتر سے بہتر مصرف میں لایا جائے۔ جس طرح ٹھوکر کی جسمانی قوت گیند کو حرکت میں لے آتی ہے یا وہ متحرک ہو تو اسے ساکن کر دیتی ہے اسی طرح دوسری قوتیں بھی دوسرے اجسام پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

ایک دوسری مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے اگر گیند ہاتھ میں لے کر چھوڑ دی جائے تو وہ زمین پر گر پڑے گی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ زمین میں ہر ایک چیز کو اپنی جانب کھینچنے کی ایک قوت پنہاں ہے جسے قوت کشش کے نام سے موسوم کرتے ہیں تمام مادے بشرطیکہ ان کے اور زمین کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو زمین پر گر پڑتے ہیں کیونکہ زمین کی کشش انھیں اپنی جانب کھینچتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت کشش اور قوت اتصال دونوں میں کشش کی قوتیں مخفی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قوت کشش حرکت پیدا کرتی ہے اور قوت اتصال رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے۔

ایک مثال اور لیجئے فرض کیجئے کہ آپ اپنے ہاتھ میں بجائے گیند کے ایک وزنی پتھر لیتے ہیں۔ گیند آپ زیادہ عرصہ تک تھامے رہ سکتے ہیں لیکن وزنی پتھر کا بار آپ جلد محسوس کرنے لگیں گے واقعہ یہ ہے کہ زمین کی قوت کشش اس چیز کو اپنی جانب کھینچتی اور آپ کی جسمانی قوت اسے نیچے جانے سے روکتی ہے۔ اگر وہ چیز زیادہ وزنی ہے تو آپ کی جسمانی قوت زمین کی قوت کشش سے جلد مغلوب ہو جائیگی اور وہ چیز زمین پر گر پڑے گی اس کے علاوہ قوت کشش تمام اجسام پر یکساں اثر انداز بھی نہیں ہوتی وہ دوسرے اجسام کے وزن کی مناسبت سے اپنی قوت صرف کرتی ہے چنانچہ ہم اجسام کو ہلکا یا بھاری اسی قوت کشش کی مناسبت سے کہتے ہیں جو ان کے کھینچنے پر [illegible]

یہ بھی بتا دینے کی ضرورت ہے کہ زمین اپنی قوت کشش کا اثر ہر چیز پر ڈالتی ہے۔ خواہ وہ چیز میز پر رکھی ہوئی ہو۔ رسی میں بندھی ہو یا ہاتھ میں ہو۔ میز پر ہونے کی صورت میں میز اس شے کے زمین پر گرنے میں حارج ہوتی ہے دوسری صورت میں رسی کی بندش اور تیسری صورت میں جسمانی قوت اسے زمین پر نہیں آنے دیتی۔

شمیم مارہروی

کیفیات

جناب مولوی حکیم حبیب الرحمن خاں صاحب حبیب،

ارمان و آرزو ہیں مگر دل نہیں رہا
محفل تو ہے خلاصۂ محفل نہیں رہا

وہ جلوہ گاہِ خاص کا حاصل نہیں رہا
یعنی جو تھا تحیّرِ کامل نہیں رہا

اس بیخودی کے ساتھ ہوئی راہِ شوق طے
منزل کا ہوش بھی کئی منزل نہیں رہا

گم ہو نہ جائیں یونہیں کہیں تیرے عقل و ہوش
اے جوشِ حسن پردہ حائل نہیں رہا

سعیٔ خرد سے کس کو ملا آستانِ دوست
غافل رہا جو عشق میں غافل نہیں رہا

یہ کیا کیا کہ کھینچ لیا دل سے تیرِ ناز
سرمایۂ تسلّیِ بسمل نہیں رہا

اللہ رے تحیرِ نظارۂ جمال
گویا حجابِ ہستیٔ باطل نہیں رہا

حالِ مزاج ہنس کے وہ پوچھیں خوشا نصیب
مرنا بھی اب مریض کو مشکل نہیں رہا

مشقِ جفا سہی نہ سہی لطفِ التفات
وہ اپنے غم نصیب سے غافل نہیں رہا

وہ کیفِ اضطراب وہ ذوقِ تپش نہیں
سینے میں اب رہا بھی ہے یا دل نہیں رہا

تسکین دی ہے آکے تمہارے خیال نے
جب کوئی بھی شریکِ غمِ دل نہیں رہا

جوشِ شکستہ پائی نے منزل قریب کی
اب رنج دوریِ رہِ منزل نہیں رہا

ذرّوں میں ڈھونڈھتا ہوں میں اس آفتاب کو
افسوس وہ تحیرِ کامل نہیں رہا

پہونچا دیا ہے جوشِ طلب نے کہاں حبیب
مطلق خیالِ سرحدِ منزل نہیں رہا
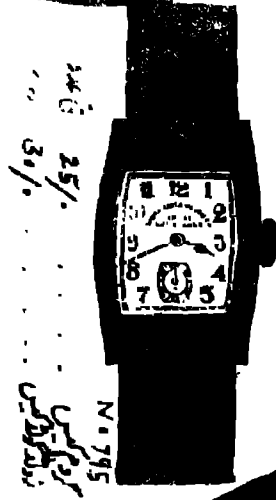
دولت

پیدا کرو ——— جو کچھ ایمانداری سے کر سکتے ہو۔
پس انداز کرو ——— جو کچھ دور بینی سے کر سکتے ہو۔
خیرات کرو ——— جو کچھ مسرت سے کر سکتے ہو۔　　جان دلیزلی

کوئی شخص زر کے انبار لگانے سے دولتمند نہیں بن جاتا بلکہ خدا کی راہ میں خیرات کرنے سے۔　　کرسیستم

ہم جس قدر زر جمع کرتے ہیں اس کو ہم اسی حد تک اپنے قبضہ میں کر سکتے ہیں جس حد تک خواب میں اس دنیا سے باہر کچھ نہیں لیجا سکتے۔ بانل

مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جس کو زر کی خواہش ہو نہ ایسے زر کی جس کے لئے آدمی کی ضرورت ہو۔　　تھمتا کلس

محشر عابدی۔ بی۔ اے،

گھڑی خریدتے وقت

"ویسٹ انڈیا" رائل کو یاد رکھیے یہ نہایت مضبوط اور صحیح وقت بتانیوالی گھڑی ہے اپنی خوبیوں کے باعث ضرب المثل بن کر دنیا میں مقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ پوری تفصیل معلوم کرنے کے واسطے مصور فہرست طلب فرمائیں ویسٹ انڈیا واچ کمپنی چاندنی چوک دہلی

WEST INDIA WATCH Co.

CHANDNI CHOWK DELHI.

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی - ادبی - باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۲ | فہرست مضامین عالمگیر ماہ مئی ۱۹۳۵ء | نمبر ۵

حافظ محمد عالم اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

مُلاحظات

خدائے بزرگ و برتر کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مئی ۳۵ء کے زیر نظر شمارہ کے ساتھ عالمگیر نے اپنی زندگی کے گیارہ سال ختم کر لئے - جون ۳۵ء کا عالمگیر حسب معمول سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء کے نام سے شایع ہوگا بارہویں سال کا پہلا پرچہ ہوگا - اس عرصہ میں عالمگیر اردو علم و ادب کی اگر مفید خدمت انجام دے سکا تو میں اسے اللہ تعالیٰ کا احسان اور معاونین عالمگیر کی نوازشوں کا حاصل سمجھتا ہوں - اپنے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا شاید کافی ہوگا کہ میں نے عالمگیر کی محبت میں جس طرح اپنے آپ کو ناقابل بیان پریشانیوں اور ناگفتہ بہ مصائب میں مبتلا کر لیا - وہ میری والہانہ شیفتگی کا ایک بین ثبوت ہے - عالمگیر کے ناظرین کو بھی اس حقیقت صحیحہ کا علم ہوگا کہ میں نے بعونہ تعالیٰ ان تمام روح فرسا تکالیف اور جانگزا آلام کا نہایت مستقل مزاجی سے مقابلہ کر کے آپ کے عالمگیر کو شہرت و عزت کے اس قدر بلند مقام اور ترقی و کامیابی کے ایسے بام رفیع پر پہنچا دیا جو اس کیلئے بجا طور پر باعث فخر اور اس کے مخالفین و معاندین کیلئے وجہ حسد و رشک ہے -

عالمگیر کے محترم ناظرین یہ بھی جانتے ہیں کہ عالمگیر نے اپنا انگریزی اور اردو کا الیکٹرک پریس بھی قائم کر رکھا ہے جو خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے نہایت کامیابی کے ساتھ موجودہ اقتصادی حالات کا مقابلہ کر رہا ہے - مجھے مسرت ہے کہ عالمگیر الیکٹرک پریس کی حالت تسلی بخش ہے - میں نے پریس کے خریدنے میں اس وقت تک کم و بیش آٹھ ہزار روپیہ خرچ کیا اور مجھے یہ عرض کر دینے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ اس اقتصادی بدحالی کے زمانہ میں اتنی بڑی رقم کی ادائگی میں بہت سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - اللہ جل شانہٗ کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ میں نے یہ سب روپیہ ادا کر دیا اور اب میرے ذمہ پریس کے سلسلہ میں ایک کوڑی بھی واجب الادا نہیں - یہ خوشخبری عالمگیر کے محترم ناظرین کے لئے یقیناً بہت بڑی خوشخبری ہے اور میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ عالمگیر کو اب پہلے سے زیادہ کامیابی کے ساتھ شایع کرنے اور اس کی خصوصیات کو وسعت دینے کے سامان اور مواقع حاصل ہیں - اگلے مہینہ عالمگیر کا ہنگامہ خیز سالانہ نمبر شایع ہو رہا ہے - اس کے بعد **انشاء اللہ تعالیٰ عالمگیر ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں ٹھیک مقررہ وقت پر شایع ہوتا رہیگا -**

سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے - یہ حقیقت ہے کہ اس کی کسی ایک خصوصیت کو بھی بیاں کما حقہٗ بیان کرنا بہت مشکل ہے - تصاویر اور مضامین کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر اپنی نظیر آپ ہے - بلند پایہ افسانوں اور بیحد دلکش نظموں کے لحاظ سے بھی یہ سالانہ نمبر فقید المثال ہے - کتابت و طباعت بھی نہایت دیدہ زیب اور دلفریب ہے - آپ جب سالانہ نمبر کو ملاحظہ فرمائینگے تو آپ اس اعتراف کیلئے یقیناً مجبور ہونگے کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر فی الحقیقت لاجواب اور عدیم النظیر ہے -

کرم فرمایان عالمگیر کی خدمت میں یہ مودبانہ گذارش ہے کہ وہ بھی اپنے حلقہ احباب میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے ضرور کوشش فرمائیں - اگر عالمگیر کے تمام خریدار حضرات اپنے حلقہ اثر سے صرف ایک ایک نیا خریدار ہی بہم پہونچا دیں تو آج عالمگیر کی اشاعت دوگنی ہو جاتی ہے اور اشاعت کی یہ وسعت میرے ارادوں کی تکمیل میں مد و معاون ثابت ہو گی -

اگر آپ

عالمگیر کا ہنگامہ خیز اور دل آویز سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء جو اگلے مہینہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہو رہا ہے **مفت** حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے عالمگیر کی خریداری قبول فرمالیجئے - اس صورت میں عنقریب شایع ہونیوالا خاص نمبر بھی آپ کو مفت ملے گا - سالانہ قیمت صرف چار روپے (للعہ) ہے -

نیازمند **مینجر عالمگیر لاہور**

آغا حشر مرحوم

ہندوستان کے مایہ ناز ادیب اور ڈرامہ نگار جناب حشر کاشمیری کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ علمی و ادبی دنیا میں آپ کے نام کو جو شہرت و عزت حاصل تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی طبیعت ایک عرصہ سے ناساز تھی۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں جب میں انھیں کلکتہ میں ملا تو اس وقت بھی ان کی طبیعت خراب تھی اور وہ بار بار ارسطوئے زماں شفاءالملک حضرت حکیم فقیر محمد صاحب چشتی مدظلہ العالی سے اپنے علاج کی خواہش کا اظہار فرماتے تھے لیکن ان کی بہت بڑھی ہوئی مصروفیتیں انھیں کلکتہ چھوڑنے نہ دیتی تھیں۔ بالآخر ان کی خرابی صحت نے انھیں کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے اور حضرت شفاءالملک مدظلہ کی مسیحا نفسی اور دست شفا کی بدولت معجزانہ طور پر ان کی بے حد بگڑی ہوئی صحت بحال ہو گئی چنانچہ صحتیاب ہونے کے بعد انھوں نے یہاں اپنا کاروبار شروع کر کے ایک فلم کمپنی قائم کی لیکن افسوس ہے کہ یکایک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اور ایسی خراب ہوئی کہ چار دن کے اندر اندر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا اور دنیا کی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔

زیر نظر اشاعت میں برادر مکرم مولانا خدا بخش صاحب اظہر کی ایک نظم "آغا حشر مرحوم" کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ نظم ایک مقامی روزنامے میں بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ تاہم موضوع کی اہمیت ہمیں اس کی دوبارہ اشاعت پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس مایہ ناز ادیب کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ اس زمانہ قحط الرجال میں پُر کرنا بہت ہی مشکل ہے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حافظ محمد عالم عفی عنہ

شبابیات

رباعیات

شباب کی نیند

میخانہ میں شب بھر وہ لئے جام شراب
بھٹکا ہوا ساقی نے کرا لے نہ خراب
آیا ہے نظر خواب عجب جس میں
اس نشے بھری نیند کا ہے نام شباب

شغل جوانی

ایام جوانی میں یہ اے قلب حزیں
ہو ہاتھ میں بنت تو نظروں میں حسیں
زاہد جو سمجھتا ہے سمجھنے دو اسے
بیچارے نے دنیا ابھی دیکھی ہی نہیں

یاد جوانی

غفلت کی گھڑی کا تو نہ احساس ہوا
یوں ہی گیا مقصود نہ کچھ پاس ہوا
پیری میں جب آئے ہوش تو روتے ہیں
اے کاش جوانی میں یہ احساس ہوا

شباب کی یاد

اسباب مسرت کی فراوانی تھی
دل واقف لطف ... تھی
جب سے کہ گیا ساتھ سے عہد شباب
قسمت کی ... پشیمانی تھی

تلاش جوانی

مردہ ہوئے جذبات جو پیری آئی
لیکن ہے طبیعت میں وہی زندہ دلی
کرتا ہوں حسینوں کے گھروں میں جا کر
دیکھو تو سہی میری جوانی ہو گی

خواب شباب

اک حسن و مسرت کی تھی تصویر شباب
وہ نشہ ہوا تیز وہ دیرینہ شراب
آنکھیں کھلیں پیری میں تو معلوم ہوا
جس کی نہیں تعبیر جوانی ہے وہ خواب

اظہر امرتسری

قسمت

مصوّر اسرار ڈاکٹر خان شاطر غزنوی

(۱) قسمت ہی سب کچھ ہے۔
(۲) قسمت اندھی ہے۔
(۳) قسمت ایک برق پرواز پرندہ ہے۔
(۴) قسمت بیوقوفی کی طرفداری کرتی ہے۔
(۵) قسمت بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔
(۶) خوش قسمتی حوصلہ اور استقلال بخشتی ہے۔
(۷) قسمت آزادانہ طور پر تنہا آتی ہے۔
(۸) بدقسمتی سے بری اور شے کیا ہے؟
(۹) قسمت تھوڑی سی عقل چاہتی ہے۔
(۱۰) قسمت امیر اور غریب بنانے کی قدرت رکھتی ہے۔
(۱۱) کوئی سپر قسمت کی تلوار کی مدافعت نہیں کر سکتی
(۱۲) خوش قسمت انسان کو صلاح و مشورہ کی کیا ضرورت؟
(۱۳) قسمت کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں۔
(۱۴) بدقسمتی اکثر خوش قسمتی کو آواز دیکر بلاتی ہے۔
(۱۵) خوش قسمتی تاک نمبروں کی تہہ میں بیٹھی ہے۔
(۱۶) خوش قسمتی کامیابی کی رہنما ہے۔
(۱۷) اچھی قسمت تلاش کے بعد ملتی ہے۔
(۱۸) بُری قسمت آئندہ موقع پر اچھی قسمت ثابت ہوگی۔
(۱۹) خوش قسمت شخص کو نصیحت کی کیا ضرورت؟
(۲۰) قسمت اس کے پاس آتی ہے جو اسے بلاتا ہے۔
(۲۱) کون ہے جسے اچھی قسمت کی تلاش نہیں۔
(۲۲) جو ملکی حالت کو بدل سکتا ہے وہ قسمت کو بدل سکتا ہے۔
(۲۳) قسمت جس کا ساتھ دے دیتا اس کا ساتھ دیتی ہے۔
(۲۴) خوش قسمت انسان کو ارادہ کی ضرورت نہیں۔
(۲۵) اچھی قسمت مجھے دیدو — ایک لاکھ روپیہ مجھسے لے لو۔
(۲۶) جب قسمت سامنے مسکراتی نظر آئے فوراً پیش قدمی کرو
(۲۷) قسمت دستک دے رہی ہے۔ اٹھو۔ جلد دروازہ کھولدو۔
(۲۸) قسمت اس کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد کرے۔
(۲۹) اچھی قسمت ساتھ لے کر پیدا ہونا قاروں کا خزانہ ساتھ لیکر پیدا ہونے سے بہتر
(۳۰) خوش قسمت ہو تم؟ تو پھر جاؤ۔ دنیا کے کسی کونے میں چلے جاؤ مت سوچو
(۳۱) قسمت کا ہاتھ تمھارے لمبے بازوؤں سے زیادہ دور پہونچتا ہے۔ یاد رکھو۔
(۳۲) مجھے اچھی قسمت دیدو اور پھر جہنم میں پھینکدو۔
(۳۳) انسان قسمت کو تلاش نہیں کرتا۔ قسمت انسان کو ڈھونڈھتی ہے۔
(۳۴) قسمت ایک ہی دروازہ پر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی۔
(۳۵) خوش قسمتی اور بدقسمتی ایک کنوئیں میں لٹکے ہوئے دو ڈول ہیں۔
(۳۶) مجھسے میری تمام عقل چھین لو اور ایک قطرہ قسمت کا دیدو۔
(۳۷) ہر انسان کی زندگی میں کم از کم ایک دفعہ قسمت ضرور اسکے دروازے پر دستک دیتی ہے
(۳۸) قسمت کے رانندے ہوئے شخص کی فریاد کون سنتا ہے؟
(۳۹) قسمت ان سے دور بھاگتی ہے جو اسے پکڑنا چاہیں۔
(۴۰) قسمت ان کے پاس آتی ہے جو اس کی پرواہ نہیں کرتے۔
(۴۱) مجھے مٹھی بھر اچھی قسمت دیدو اور میری عقل و خرد کا ایک ڈھیر لے لو۔
(۴۲) قسمت ایک پہیہ ہے جو برق رفتاری سے گھومتا ہے۔
(۴۳) دنیا میں اس سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہیں جو اپنے آپکو خوش قسمت سمجھتا ہے
(۴۴) غالباً قسمت بیوقوفوں کے پاس بھی آتی ہے لیکن ان کے پاس بیٹھتی نہیں۔
(۴۵) بعض اوقات قسمت ان کا ساتھ دیتی ہے جنھیں بعد میں تباہ کرنا چاہتی ہے
(۴۶) تمھاری باری آنے پر خدا قسمت کی پری کو تمھارے پاس بھی بھیجے گا۔
(۴۷) قسمت تمھارے لئے اچھی صورت پیدا کر رہی ہے اور ٹھیک اسی لمحہ کسی اور کیلئے بری صورت
(۴۸) قسمت ایک عورت ہے۔ اگر آج تم اسے رد کروگے تو کل وہ تمھیں رد کریگی۔

نیا سال اور نئے ارادے

ہیں چرخِ کہن سال سے کُشتی کے ارادے
بازی تو بڑی اونچی ہے پر جس کو خدا دے

جون ۱۹۳۵ء سے حسبِ معمول عالمگیر کا نیا سال شروع ہوگا۔ آپ کا عالمگیر، عالمگیر الیکٹرک پریس کے سات آٹھ ہزار روپے کے سلسلہ میں جن مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُن کا قطعی خاتمہ ہوچکا ہے اور اب عالمگیر یا عالمگیر الیکٹرک پریس کے ذمہ ایک کوڑی بھی باقی نہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے آپ کے عالمگیر کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی ایک شاندار سکیم ہے اگر خدائے بزرگ و برتر کا کرم اور محبانِ عالمگیر کی نوازشیں شاملِ حال اور شریکِ کار رہیں تو سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء کے فوراً بعد ہم اس باصرہ نواز لائحہ عمل کو عملی صورت میں آپ کے سامنے پیش کرینگے۔ عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء بھی قابلِ دید و لائقِ رشک خصوصیات کا ایک بے نظیر مرقع ہوگا۔ عالمگیر کے ناظرین کرام کا فرض ہے کہ وہ خود بھی اپنی خریداری کا سلسلہ قائم رکھیں اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی عالمگیر کی توسیعِ اشاعت کیلئے کوشش کرکے ہمارے ارادوں کی معاونت فرمائیں۔

آئندہ عالمگیر انشاء اللہ تعالیٰ مقررہ وقت پر ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا رہے گا۔

نیازمند:۔ **مینجر عالمگیر لاہور**

آغا حشر مرحوم

مرقومہ ذیل نظم اگرچہ ایک مقامی روزنامے میں چھپ چکی ہے مگر موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے مزید اشاعت کی طالب ہے

مدیر

اے حشر اے سپہرِ بلاغت کے آفتاب
تیری شعاعِ فکر سے اُردو ہے ضو بدوش

تیرا خیال حُسن کی رودادِ خامشی
تیرا کلام عشق کا افسانۂ خموش

ہے مُردہ دل کو نثر تری درسِ زندگی
خوابیدہ روح کو ہے تری نظم شورِ ہوش

تو نے قلم کی نوک سے چھیڑے وہ زمزمے
مدت سے تھے جو سازِ دل و روح میں خموش

تو نے لباسِ شعر و سخن میں دکھا دیا
امروز کے دماغ سے لا کر خیالِ دوش

تیرا ہر ایک لفظ ہے وہ نغمۂ خموش
کہتے ہیں اہلِ دل جسے آوازۂ سروش

کہتی ہے عقل "شکریۂ یورپ" کا دیکھ کر
آئینۂ سخن میں ہے تصویرِ زندگی،

خاموشیٔ حیات میں ہنگامۂ جہاد
تاریکیٔ ممات میں تنویرِ زندگی،

تیغوں کے سائے میں جو لگاتے ہیں شیر مرد
ہر شعر ہے وہ نعرۂ تکبیرِ زندگی،

ظاہر ہے لفظ لفظ سے ترغیبِ "جاہدوا"
رقصاں ہے حرف حرف میں شمشیرِ زندگی،

دیکھا تھا قوم نے جو غلامی کی نیند میں
اس خوابِ موت کی ہے یہ تعبیرِ زندگی،

ہنگامہ تھا جو اہلِ وطن کو جگا گیا ÷
شعلہ تھا جو متاعِ تغافل جلا گیا ÷

تاریک ہے "ڈرامہ نگاری" کا غمکدہ
اب اس میں شمعِ نورِ مسرت جلائے کون؟

ظاہر کو ترجمانیٔ باطن کا دیکے درس
عشرت کے آئینے میں مصیبت دکھائے کون؟

لفظوں میں پھونک کر عمل و اصلیت کی روح
تمثیل سے حقیقتِ فطرت بتائے کون؟

آنسو سے، اضطراب سے، نالے سے، آہ سے
جذبات کا فسانہ جہاں کو سنائے کون؟

یہ حسرتیں تو قابلِ تکمیل ہیں — مگر
اے حشر تجھ کو خوابِ عدم سے جگائے کون؟

ظاہر ہے مرگِ حشر سے رازِ دوامِ حشر،
یعنی کلامِ حشر سے زندہ ہے نامِ حشر،

اظہر امرتسری

بے اثری

مولانا روشؔ صدیقی

غمِ پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
مجھے دیکھو نہ باندازِ پشیماں نظری

ہر طرف عظمتِ کونین کو خم پاتا ہوں
لائی ہے مجھکو کہاں پر مری بے بال و پری

شمع بے نور ہے ادراک رہِ الفت میں
یہ وہ منزل ہے کہ رہبر ہے جہاں بے خبری

مجھ تک آتی تھی کہاں نکہتِ گیسوئے نگار
وحشتِ عشق مبارک غمِ شوریدہ سری

تھا وہ اک پردۂ حسنِ رخِ لیلائے بہار
جسے سمجھی تھی خزاں میری پریشاں نظری

آہ کہ اب حسرتِ دیدار بھی ہے مرگ پذیر
چشمِ افسردہ ہے ہمرنگِ چراغِ سحری

کششِ شوق تو اب تک رہی محرومِ اثر
دیکھنا اب ہے مآلِ کششِ بے اثری

اس نے کچھ سوچ کے سب پردے اٹھا ہی ڈالے
کر گئی آج بڑا کام ــــ مری بیخبری

کیا غمِ عشق بھی محتاجِ تلافی ہے روشؔ
نگہہِ یار ہے کیوں مضطربِ چارہ گری

ویران سرائے

تاریخ فرانس کا ایک رومانی ورق

مصوّر اسرار خان شاطر غزنوی

رات تاریک تھی۔۔۔۔ ہیبتناک تاریک۔ میں گھوڑے پر بیٹھا سرائے کی اس کھڑکی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ جس سے ہلکی ہلکی روشنی چھن چھن کر میری امید بندھا رہی تھی۔ موسلادھار بارش اور تند ہوا کی سرسراہٹ کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ دن بھر کے سفر کی تکان نے مجھے چور کر رکھا تھا ــــ مجھے شب بھر کے آرام کی ضرورت تھی اور میرے نفس کی بھٹی کو ایندھن درکار ــــ

میں پیرس جا رہا تھا۔ جہاں ظلم و استبداد کا دور دورہ تھا۔ یہ واقعہ ہے ان دنوں کا جب پیرس میں گلوٹین کی حکومت تھی۔ میں گھوڑے سے اترا اور سرائے کے دروازے پر زور سے دستک دی ــــ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اندھیرے میں غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ دروازہ کی زنجیر بھی نہیں چڑھی ہوئی۔ میں نے اس کھڑکی میں سے اندر جھانکا جس سے روشنی آرہی تھی ــــ کمرہ بالکل خالی تھا۔

مجھے خیال گذرا کہ شاید سرائے کا مالک کہیں ادھر اُدھر کسی کام میں مصروف ہے۔ گھوڑے کو چھپر کے نیچے ایک ستون سے باندھ دیا۔ اور کسی ذی روح کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ گذر گئے لیکن کسی جاندار کی موجودگی کا احساس نہ ہوا مزید انتظار کئے بغیر میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کمرہ میں پہنچا جس میں روشنی تھی۔ ایک کمرہ میں پرانی وضع کا غلیظ لمپ ٹمٹما رہا تھا۔ آتش دان میں آگ روشن تھی مگر ــــ خاموشی ــــ موت کی سی خاموشی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس خاموشی سے کسی حد تک خائف بھی ہوا۔ میں نے چلا چلا کر سرائے کے مالک کو پکارنا شروع کیا ــــ لیکن میرے چلانے کی آواز کے سوا کچھ نہ تھا مجھے محسوس ہوا کہ اس سرائے میں میں ہی ایک اکیلا جاندار ہوں یا ــــ میرا بے زبان گھوڑا۔

بھوک نے تنگ کر رکھا تھا۔ لمپ اٹھایا اور سامان خورد و نوش کی تلاش میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ایک کمرہ میں چھتیس گھنٹوں کے بعد مجھے شکم پری کے لئے کافی چیزیں مل جانے کے علاوہ شراب کی دو بوتلیں میسر آگئیں۔ زمین ہی پر بیٹھ گیا اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا ــــ میں حیران تھا کہ "سرائے والا" کہاں غائب ہے اور کب آئیگا؟

اب میں ایک میلی کچیلی جسیم کرسی پر آگ کے سامنے بیٹھا ہوا "مالک سرائے" کا منتظر تھا۔

تیز و تند ہوا کے جھونکے کھڑکیوں سے متصادم ہوتے تھے اور نہایت خوفناک آواز پیدا ہوتی۔ بارش۔ طوفان باد۔ بجلی کی چمک۔ بادل کی گرج تاریکی۔ غیر آباد سرائے۔ غرض ایک عجیب ہیبتناک سماں تھا۔ میں رہ رہ کر سرائے کے مالک ــــ مالک ــــ یا چوکیدار کو جی ہی جی میں کوستا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اس خوفناک رات میں کہاں غائب ہے؟ اور کہ وہ سرائے کا دروازہ کیوں کھلا چھوڑ گیا ہے۔ قریب تھا کہ میں لیمپ اٹھا کر ایک بار کسی جاندار کی تلاش کروں کہ یکایک باہر دروازہ پر گھوڑوں کے ٹاپوں

کی آواز اور پھر گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں سواری کے بھیگے ہوئے لباس میں ملفوف لیمپ کی زرد روشنی میں کھڑا تھا ——— میزبان کا منتظر ——،

روانگی سے قبل مجھے انگلینڈ میں فرانس کے متعلق بہت سے حوصلہ شکن واقعات سنائے گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ فرانس کے سر پر خوف و خطرہ کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ ظلم و بربریت نے فرانس کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا ہے ——— آج کل وہاں جانا اپنے آپ کو خطرات کے اندھے کنویں میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ میرے دوستوں نے مجھے وحشی باغیوں کے متعلق جنھوں نے سرزمین فرانس کے بخیے ادھیڑ دیئے تھے بہت سی لرزہ خیز کہانیاں سنا کر مجھے فرانس جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھے باغیوں کے متعلق انتہائی دردناک لہجے میں سنایا کہ کس طرح انھوں نے امراء کے مکانات نذر آتش کر دیئے ہیں ان کی املاک لوٹ لی ہے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا اور کن کن انسانیت سوز طریقوں سے باغیوں نے حکومت پرست امراء کو تہ تیغ کر کے وحشت و بربریت کا ثبوت بہم پہنچایا۔

اب مجھے انسانی قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی اور پھر دو ہی منٹ بعد ——— میں حیران و ششدر رہ گیا جب خلاف توقع اپنے سامنے "سرائے والے" کی بجائے ایک کریہہ المنظر ——— لحیم و شحیم ——— وحشی ——— انسان نما درندے کو کھڑے پایا۔ یقین کیجئے میں نے اپنی تمام عمر میں اس قدر مکروہ صورت ——— وحشی انسان نہ دیکھا تھا۔ اور پھر ایک ہی سکنڈ بعد میری حیرانگی دو چند ہو گئی جب میں نے ایک لڑکی ——— نوجوان و خوبصورت ——— اوندھے منہ ——— بیہوش۔ اس کے کندھوں پر لٹکتی دیکھی لڑکی کے سر کے گرد پٹی بندھی ہوئی تھی ——— جس سے اس کا زخمی ہونا ظاہر تھا۔

فوراً مجھے اس وحشی انسان پر ان بدمعاشوں میں سے ایک ہونے کا شبہ گذرا جنھوں نے ان دنوں فرانس میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھا تھا اور جن کے نزدیک ——— انسان گاجر مولی سے زیادہ وقیع نہ تھا۔

اس پاجی نے لڑکی کو بے پروائی سے فرش پر ڈال دیا۔ "بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پھینک دیا" اور مجھے انتہائی غصے سے گھورتے اور میان سے تلوار کھینچتے ہوئے بولا۔

"حکومت پرست! تم شیطان حکومت پرست کیا کر رہے ہو یہاں؟" اس کا لہجہ انتہائی وحشیانہ تھا۔ "غالباً تم اس قلعہ سے بھاگ کر یہاں آئے ہو جسے آج ہم نے تاراج کیا۔ تم بدذات حکومت پرست ——— کیا اکیلے ہو تم؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"بالکل اکیلا" میں نے سنجیدگی سے لبوں پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں انگلینڈ سے آیا ہوں اور "جمہوریت" کے ظل عاطفت میں پیرس جا رہا ہوں۔ میرے پاس "نالین" کے دستخط شدہ پروانہ راہداری بھی ہے ——— شب بسر کرنے کی غرض سے میں اس سرائے میں ٹھہر گیا ہوں مگر آپ کون ——— ستم رسیدہ لڑکی کون ہے ——؟"

اس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ "اس پرانے شیطان حکومت پرست کی لڑکی ہے جسے ہم مع اس کی املاک کے صفحہ ہستی سے نابود کر چکے ہیں۔ ہاہاہاہا۔ وہ بڈھا خبیث کس قدر شیطان سیرت شخص تھا ہماری مدافعت کا خیال خام اس کے دماغ میں سمایا۔ اس نے ہم وطن دوست بہادروں کے جتھے کی مقابلہ کی ٹھانی جس کی کمان "مارکوئین" ایسے سنگدل انسان کے ہاتھ میں تھی۔ ہاہاہا اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ ہم نے اس کا سر کاٹ کر اسی کے قلعہ کی فصیل پر چڑھ ہوا میں اچھالا۔ میں ——— میں "بھیڑیئے" کے نام سے مشہور ہوں۔ ہم بہت ہی جلد اس لڑکی ——— حسینہ کے باپ کے قلعہ میں ——— اس پاجی کونٹ کے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خون سے اپنی تلواروں کی تشنگی بجھائی۔ ہم نے اس حسینہ کو قلعہ کی سیڑھیوں سے اترتے پکڑ لیا۔ یہ حسینہ ——— جو اس وقت بیہوش پڑی ہے ——— یہ بہادر حور وش دوشیزہ ہمارا مقابلہ کرتی رہی ——— خادماؤں کی جماعت ساتھ لئے ہمارا مقابلہ ——— مدافعت ڈٹ کر کرتی رہی۔ ہمارے کئی بہادر اس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے جبکہ وہ سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر ہمارے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔ سب کے دل میں اس مہ جبین کو حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا

کہ یہ زنگ حور میری زوجیت میں آجائے۔ آخر تجویز ہوئی کہ قرعہ اندازی کے ذریعے اس امر کا تصفیہ کر لیا جائے۔ قرعہ فال جس کے نام نکلے وہی اس لڑکی کا "مالک" قرار دیا جائے۔ خوش قسمتی سے قرعہ اندازی کا نتیجہ میرے حق میں نکلا۔ ٹارکوئین کسی حالت میں بھی گوارہ نہ کر سکتا تھا وہ میری کامیابی پر نعل در آتش ہو گیا۔ میری طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ مجھ پر حملہ آور ہوگا اور اس دوشیزہ کو مجھ سے چھین لینے کی سعی کرے گا۔

موقع نازک تھا۔ میں نے حسینہ کو اٹھا گاڑی میں ڈالا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ رستے میں میں نے اس کے گلے میں جواہرات کا بیش بہا ہار دیکھا۔ خوش قسمتی سے میرے ساتھیوں کی نگاہ اس بیش قیمتی شے پر نہ پڑ سکی۔ سو اب میں یہاں ہوں ——— حسینہ میرے قبضے میں ہے۔ اور بیش قیمت جواہرات کا ہار میری جیب کی حفاظت میں۔ لڑکی خوف کے مارے بیہوش ہو گئی تھی جب میں نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ کیا یہ دوشیزہ خوبصورتی کی ملکہ نہیں۔ خوبصورتی کا خواب نہیں۔ کیا نہیں؟

میں نے فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی لڑکی پر نگاہ ڈالی فی الحقیقت وہ خوبصورت تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں میں ایک حسین۔ موقع خوب تھا میں بھی اکیلا تھا اور بھیڑیا بھی تنہا گو وہ وحشی مضبوط اور طاقتور تھا تاہم میں بھی اس سے کم نہ تھا۔ بارہا انگلینڈ میں مجھے تیغ زنی کا موقع ملا تھا اور نہ بیجا ہوگا اگر میں اپنے آپ کو تلوار کا دھنی کہوں۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کو کس نیت سے یہاں لائے ہیں" میں نے جرات کی۔ "اب اس سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اسے مجبور کر دوں گا کہ میری محبت کا اعتراف کر رہے ——— یہاں اس کمرہ میں ——— تمہارے یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ تم اوپر جا کر سو رہو۔ آنے والی صبح میں اسے قریبی قصبہ میں پادری کے پاس لے جاؤں گا۔ جو ہم دونوں کو سلسلہ مناکحت میں منسلک کر دیگا۔ آہا ہا کیا ہی پرلطف ساعت ہوگی ——— کونٹ کی لڑکی میری بیوی ——— ٹارکوئین میرے تعاقب میں آرہا ہوگا ——— آہا آہا ہا امیدوں پر پانی پھر جائیگا ——— اس کی آرزوئیں خاک میں مل جائینگی۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ دوشیزہ میری بیوی بن چکی ہے۔ اور وہ اسے کبھی بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ ہا ہا ہا۔ ٹارکوئین ——— بدنصیب ہارا ہوا جواری ——— "

دفعتہً وہ مڑا اور لڑکی پر جھک گیا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور سیکنڈ بھر کے لئے آنکھیں کھولدیں ——— اور پھر ——— پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"بہت جلد اسے ہوش آجائیگا۔ میں پانی لے آؤں تھوڑا سا۔ مگر نہیں مجھے گھوڑے کو سایہ میں باندھنا ہے۔ تم جا کر پانی لے آؤ اور میں گھوڑے کو باندھ آتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہارے قیدی کی حفاظت کرتا ہوں ——— حتیٰ کہ تم واپس آجاؤ" میں نے جواب دیا۔

"بہتر" اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "مگر یاد رکھو کسی قسم کا دھوکا۔ فریب یا چالبازی موجب موت ہوگی تمہارے لئے۔"

"آپ تسلی رکھئے ——— جائیے اپنا کام اطمینان سے کیجئے۔ میں آپ کی معشوقہ کی حفاظت کرتا ہوں۔"

وہ مجھ پر قہر آلود نگاہیں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اٹھا اور دوشیزہ کے قریب گیا اور اس کے معصوم چہرے کو بہ نظر غور دیکھنے لگا۔ یکایک اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولدیں مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"ہش" میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے نہایت آہستگی سے کہا۔ "وہ درندہ باہر گیا ہوا ہے اور ہر لمحہ اس کی واپسی کی امید ہے۔ تم مجھ پر ایک دوست کی طرح اعتماد کر سکتی ہو۔"

پیشتر اس کے کہ دوشیزہ کے منہ سے کوئی لفظ نکلے بھیڑیا زمین پر زور زور سے قدم مارتا واپس کمرہ میں آگیا۔

"آہا! وہی خوبصورت فاختہ اپنے پر پرزے درست کر رہی ہے ——" اس نے کہا اور دوشیزہ کو اپنی آغوش میں لے لینے کی غرض سے آگے اس کی جانب بڑھا مگر ——— مگر میں اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"میرے خیال میں خاتون کو آرام کی ضرورت ہے اور اس کے خورد و نوش کا بندوبست کرنا لازمی ——" میں نے اسے مطلع کیا۔

چنانچہ ہم دونوں نے دوشیزہ کو سہارا دیکر اٹھایا اور آگ کے

سامنے کرسی پر بٹھلایا۔

اب وہ لڑکی کے پہلو میں کھڑا للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے سینے میں اس کے متعلق آتش نفرت وخشم کی بھٹی روشن ہو رہی تھی اور دل یہی کہتا تھا کہ پورے زور کے ساتھ اس کی بھدی ناک پر ایک مکا رسید کردوں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ خبیث بہت محتاط ہے اور کنکھیوں سے میری حرکات وسکنات کا مطالعہ کررہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا۔ میں نے انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے جوش وغصہ کو ضبط کیا۔ اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اوپر کے کمرہ میں گیا اور ان کے لئے خوراک وشراب لایا۔ وہ بھوکے شیر کے مانند جھپٹا۔ میرے ہاتھ سے خوراک چھین لی اور میز پر بیٹھ کر وحشیانہ انداز میں کھانے لگا۔ خدا جانے وہ کتنے دن سے بھوکا تھا۔ آن کی آن میں سارا کھانا چٹ کرگیا اور پھر شراب کی سالم بوتل غٹ غٹ چڑھا گیا۔

یکایک وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور مجھے شانوں سے پکڑ کر بولا — "اب تم ہمیں شب بخیر کہہ سکتے ہو۔ ماسٹر انگلش ہمیں جاؤ اور جاکر سو رہو۔ یہ کمرہ اور یہ آگ عشاق — پرستاران محبت کے لئے مخصوص ہے۔ یہ لڑکی دلدادگان محبت کے لئے باعث آرام ہوسکتا ہے۔"

"مگر مجھے بھی حرارت کی ضرورت ہے۔ اس سرد طوفانی رات میں" میں نے کہنے کی جرات کی۔ "اوپر سرد کمرہ میں مجھے سخت تکلیف ہوگی۔ اگر معزز خاتون کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے سامنے اسی کمرہ میں پڑا ہوں گا۔"

لمحہ بھر کے لئے بھیڑیا خاموش ہوگیا اور غضبناک نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ دوشیزہ بھی حیران وششدر ساکت وصامت۔ لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی چلی جارہی تھی۔ لیکن آگ کے شعلے کمرہ میں تمام منظر کو نمایاں کررہے تھے۔ میں نے لڑکی پر نظر ڈالی اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ آنے والے واقعات کی بے صبری سے منتظر تھی۔ پھر میں نے بھیڑیے کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہورہی تھیں پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ یکایک اس نے دانت پیستے ہوئے تلوار میان سے آدھی باہر کھینچ لی۔

"اس تلوار نے آج تک سینکڑوں حکومت پرستوں کے سر گاجر کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے ہیں"۔ وہ گرجا۔ "اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر اس کمرہ سے باہر نہ نکل گئے تو .... آہا! تمہارے پاس بھی تلوار ہے مگر یاد رکھو تمہارا یہ کھلونا۔ میری شمشیر خارا شگاف کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا — بھاگ جاؤ — سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

"میں یہیں ٹھہرونگا۔ اور کوئی طاقت جیتے جی مجھے اس کمرہ سے باہر نہیں نکال سکتی"۔ میں نے پرجوش لہجہ میں کہا اور اپنی چمکدار تلوار بے نیام کرلی اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک پرلطف جنگ ہوگی اور فاتح کے لئے حسین وجمیل انعام"۔

"دعوت مبارزت۔ چہ خوش، گویا بلی شیر سے مقابلہ کرنا چاہتی ہے" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میری معشوقہ کا حسن وجمال دیکھ کر مارکوئین کی طرح تیرے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہے۔ مارکوئین کی طرح تمہیں بھی خفت اٹھانی پڑیگی — ماسٹر انگلش مین۔ یہ حسینہ میری ہے اور میری ہی رہیگی"۔

اب وہ میری طرف بڑھا اور سر پر تلوار کا وار کیا لیکن میری خوش قسمتی سے اسے یاد نہ رہا کہ کمرہ کی چھت اونچی نہیں تلوار بجائے میرے سر پر پڑنے کے چھت میں جا لگی۔ اپنی غلطی کے احساس پر اسے سخت ندامت ہوئی اور اس نے انتہائی غصے کی حالت میں جھلا کر دوسرا وار کرنا چاہا لیکن میں نے اسے موقع نہ دیا اور پھرتی سے اپنی تلوار کی نوک اس کے دائیں بازو میں بھونک دی۔ میں نے گوشۂ چشم سے دوشیزہ کو دیکھا وہ ایک کونے میں ہراساں کھڑی ہماری جنگ آزمائی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوف ودہشت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔

بھیڑیے کا دایاں ہاتھ بیکار ہوچکا تھا۔ چند منٹ تک وہ تلوار لہراتا رہا۔ لیکن بازو میں سے خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے وہ مزید مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بہت بہتر! میں تمہیں اس کمرہ میں شب باشی کی اجازت دے سکتا ہوں بشرطیکہ تم علی الصبح یہ سرائے چھوڑ دو"۔

"میں اس سلسلے میں کوئی وعدہ نہیں کرتا" — میں نے بارعب لہجہ میں جواب دیا۔

"خیر میں تمہاری موجودگی برداشت کر لونگا" اس نے مجبور ہو کر کہا اور اپنی تلوار میز پر رکھدی۔ "مجھ سے اور میری معشوقہ سے دور — جس قدر ممکن ہو لیٹ رہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد سو جاؤ گے اور ہمارے اختلاط میں مداخلت کی جرات نہ کروگے۔"

میں نے بھی تلوار ہاتھ سے رکھدی۔ لیکن دوسرے ہی سیکنڈ وہ نہایت سرعت کے ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ ہم آپس میں گتھم گتھا ہو کر فرش پر گر کے اور ادھر سے ادھر لڑھکنے لگے۔ میں نے سرکتے ہوئے لڑکی کو دیکھا۔ اس نے لپک کر بھیڑیئے کی تلوار اٹھالی اور پوری قوت کے ساتھ تلوار کے قبضہ کی ضرب میرے حریف کے سر پر لگائی۔ "بھیڑیئے" کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یہاں اس نے مجھے چھوڑ دیا اور اوندھے منہ فرش پر لڑھکنے لگا۔

"آپ نے میری جان بچائی معزز خاتون!" میں نے دوشیزہ سے خطاب کیا۔ "شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"میں نے اس پاجی کے پاس ایک لمبا چاقو دیکھا" لڑکی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اور وہ چاقو نکال کر وار کرنا چاہتا تھا جبکہ تم اس کے نیچے دبے ہوئے تھے — مگر خبردار وہ محض بیہوش ہے۔"

میں نے بھیڑیئے پر نظر ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت فرش پر بیہوش پڑا تھا۔

"اب ہمیں بسرعت تمام یہاں سے سرک جانا چاہیئے۔" میں نے ایڈی (دوشیزہ کا نام تھا جو بعد میں مجھے معلوم ہوا) سے کہا۔ "میں انگلینڈ سے آیا ہوں اور اپنے کاروباری سلسلہ میں پیرس جا رہا ہوں۔ میرے پاس پروانہ راہداری موجود ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں — میں "ہال مالین" کے پاس ٹھہروں گا۔ جس نے بہت سے حکومت پرستوں کو "گلوٹین" سے بچایا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ تمہاری حفاظت بھی کرے گا۔ خصوصاً اس کی بیوی بہت ہی رحمدل واقع ہوئی ہے۔ میرا نام "لودیس" ہے — گائی لودیس۔ میں فرانس سے اچھی طرح واقف ہوں کیونکہ میرے والد مسٹر جان لودیس بینکر ہیں اور انقلاب سے قبل ان کی کاروباری شاخ لندن کے علاوہ پیرس میں بھی تھی۔ میں ایک خفیہ ضرورت سے پیرس جا رہا ہوں اور میری میزبانی کے فرائض "مالین" کے ذمہ ہیں۔"

"مگر پروانہ راہداری تو صرف ...."

"میں اس کا بندوبست ابھی کئے دیتا ہوں۔" میں نے بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "روشنائی اور قلم میرے پاس ہے۔ تھوڑی سی ترمیم سے میرا کام بن سکتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم دونوں کی شکل و صورت میں ذرہ بھر بھی باہمی مشابہت نہیں اور میں تمہیں اپنی بہن ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر تم اجازت دو اور تمہیں ناگوار نہ گذرے تو میں "گائی لودیس" کے ساتھ دو الفاظ "اور بیوی" کا اضافہ کر لوں۔"

اس مختصر عرصہ ملاقات میں پہلی بار میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں چمک دیکھی۔ اس کے رخساروں پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔

"بہت خوب! میں تمہاری بیوی کا پارٹ ادا کرنے کی سعی کرونگی حتیٰ کہ ہم پیرس پہنچ جائیں۔ آہ اپنی زندگی میں آج پہلی بار مجھے اتنے صدمات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تم میری اس وقت کی پریشانی اور بے بسی کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ اور رشتہ داروں کو ان بدمعاشوں کے ہاتھ سے تہ تیغ ہوتے دیکھا۔ میرا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا مگر آہ — میں کیا کر سکتی تھی۔ ہمارا قلعہ آگ کی نذر کر دیا گیا اور مجھے یہ تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور کیا گیا۔ اور آہ، وہ وقت میرے لئے کس قدر شرمناک تھا جب ان پاجیوں نے مجھے حاصل کرنے کی غرض سے قرعہ اندازی کی۔ اُف، اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا کوئی میری روح کو سرخ انگاروں پر گھسیٹ رہا ہے۔ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا اگر تم یہاں — اس غیر آباد سرائے میں موجود نہ ہوتے۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔

"خدا نے آج رات تمہیں میری مدد کو بھیجا۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس سنسان و غیر آباد سرائے میں میری دعائیں مستجاب ہوئیں اور تم نے بھی اس وحشی درندے کو بچا لیا۔ میں تمہیں بہادر اور شریف النفس

سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو تمہاری شرافت اور انسانیت کے سپرد کرتی ہوں مجھے یقین ہے کہ تم میری حفاظت کرو گے۔"

"ایڈمی! مجھ پر اعتماد کرو۔ میں ہر حال میں تمہاری حفاظت اور استعانت کروں گا۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "مگر آؤ اب ہم یہاں سے چلدیں۔ ٹارکوئین اور اس کے ساتھی عنقریب ہی یہاں سے بھیڑیئے کی تلاش میں گذرینگے۔ اور کیا تعجب کہ اس سرائے میں بھی آ داخل ہوں۔ میرا لبادہ پہن لو۔ جب ہم قصبہ میں پہنچیں تو تم دیگر ضروریات بھی خرید لینا۔ بارش تھم چکی ہے اور سفر کے لئے وقت غنیمت ہے۔"

میں نے کمال چالاکی سے پروانہ [illegible] "خدا نگہبان" اور بیوی بڑھا دیئے۔ اور بھیڑیئے کو اس حالت میں بے حس و حرکت ـــــ بیہوش پڑا چھوڑ، لڑکی کو ساتھ لے کر سرائے سے باہر نکل آیا۔ اپنا گھوڑا گاڑی کے آگے باندھ دیا اور دوسرے گھوڑے کو اصطبل سے باہر نکال کر بھگا دیا۔ بارش تھم چکی تھی اور چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ خسرو انجم چمکتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ میں نیلگوں آسمان پر ایک انداز دلفریبی سے مسکرا رہا تھا۔

دوشیزہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور میں سوار ہونے ہی لگا تھا کہ تلوار کا خیال آگیا جو میں اندر کمرہ میں ـــــ میز پر بھول آیا تھا ـــــ بھیڑیئے کی تلوار اور چاقو کے قریب۔

"ایک منٹ یہاں انتظار کرو۔" میں نے ایڈمی سے کہا۔ "تاکہ اپنی تلوار اٹھا لاؤں۔" اور عنان اس کے ہاتھ میں دیدی۔

بھاگا ہوا گیا لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچکر حیرت و استعجاب نے میرے احساسات کو اس درجہ سلب کر دیا کہ میں ٹھٹک کر وہیں ٹھہر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ کھلا پڑا ہے حالانکہ ہم جاتے وقت دروازہ اچھی طرح بند کر گئے تھے۔ خیر میں اندر داخل ہوا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

لیمپ غائب تھا۔ تاہم مجھے آگ کی روشنی میں اپنی تلوار اور اپنے حریف کی شمشیر نظر آگئی مگر ـــــ [illegible] ـــــ وہ چاقو ـــــ بھیڑیئے کا چاقو لکڑی کا دستہ والا چاقو ـــــ [illegible] مجھے [illegible] اتار دینا چاہتا تھا۔ یہ چاقو دونوں تلواروں کے درمیان رکھا ہوا تھا

کیا بیان کروں میری حیرانگی و سراسیمگی کس حد تک تجاوز کر گئی جب میں نے دو ہی سیکنڈ بعد مجروح بھیڑیئے کی طرف توجہ کی اور چاقو اس کے پہلو میں دستہ تک گھسا ہوا پایا ـــــ پسلی میں ـــــ عین دل کے اوپر دستہ تک گھسا ہوا۔ اب جسم چت پڑا ہوا تھا۔ حالانکہ ہم اسے اوندھے منہ پڑا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے جرات کی اور اس کے جسم پر جھکا۔ نبض دیکھی ساکت ـــــ بے حرکت ـــــ بھیڑیا مر چکا تھا۔

میں نے کان لگا کر کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن سرائے میں بدستور خاموشی کا تسلط تھا ـــــ موت سے زیادہ بھیانک خاموشی۔

میں اس ہیبتناک اور پراسرار منظر سے خوفزدہ ہو کر اپنی تلوار اٹھا دیوانہ وار بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور ایڈمی کے پہلو میں بیٹھ گھوڑے کو چابک رسید کی اور چاند کی روشنی میں سفر پر روانہ ہو گیا۔

بھیڑیئے کو کس نے قتل کیا؟ سرائے میں کون موجود تھا جب ہمیں اس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا؟ میں نے ایڈمی سے اس کے متعلق بالکل ذکر نہ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے مزید پریشانی ہو۔ دراصل وہ پہلے ہی بہت سی پریشانیوں اور خطرات سے متاثر ہو۔ میں نے نہایت پرتکلف پیرائے میں نرم و شیریں لہجہ اختیار کرتے ہوئے "ٹائبن" اور اس کی بیوی کے متعلق جن کے پاس ہم بطور مہمان جا رہے تھے بہت سے واقعات سنائے تاکہ اس کا غم غلط ہو جائے اور آئندہ کی توقعات سے اس کا جی بہلا رہے۔

میں نے اسے بتایا کہ کیونکر ہم ٹائبن کے [illegible]
شرفا کی جانیں بچائیں۔ جبکہ [illegible] انہوں کے [illegible]
تھے اور ان کی زندگی کی [illegible] ٹائبن [illegible]
کے تعلق [illegible] باتیں سنائیں [illegible]
[illegible] کی قدرت [illegible]
[illegible] میری اپنی تمام [illegible]
پہنچانے کی غرض سے [illegible]
پھر [illegible] سرائے [illegible]
[illegible] کافی [illegible]

لیکن اس وقت جبکہ صبح کا آخری ستارہ دم توڑ چکا تھا ہم ایک قصبہ میں پہونچ گئے۔ جہاں ایڈمی نے اپنے لئے ایک لبادہ اور دوسری ضروریات خریدیں۔ یہاں ایک سرائے میں آرام کی غرض سے ٹھہرے۔ مالک سرائے کے لئے مزید استفسار یا شک وشبہ کا موقع نہ تھا جب میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس پروانہ راہداری موجود ہے۔ میں انگلینڈ سے آیا ہوں اور اپنے کاروباری سلسلہ میں پیرس جا رہا ہوں۔ سرائے والا مسکرایا اور بولا کہ میں نے سنا ہے کہ آج کل بہت سے انگریز فرانس آرہے ہیں تاکہ یہاں کے حالات بچشم خود دیکھیں۔ پھر ہم نے چند گھنٹے اس سرائے میں قیام کیا اور پھر پیرس روانہ ہوگئے۔ رستے میں ایڈمی نے مجھ سے انگلینڈ ۔۔ میری بود و باش وغیرہ کے متعلق متعدد سوالات دریافت کئے میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکا ہوں اور اس سے قبل میں نے کئی دفعہ پیرس کا سفر کیا ہے۔ میں اپنے بنکر باپ کے کاروبار میں مدد معاون ہوں لیکن امید کر سکتا ہوں مس ایڈمی کہ میری پیاری تم میرے ساتھ انگلستان چلوگی میں تمہیں یہاں فرانس میں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں ہر اس شخص کی زندگی خطرہ میں ہے جو حکومت پرست ہو یا جس کے متعلق ذرہ بھر حکومت کی غداری کا شبہ پیدا ہو جائے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں مس ایڈمی انگلستان میں میرے لواحقین ۔۔۔ تمہارا پرتپاک خیر مقدم کریں گے میری ماں تمہیں اپنی آنکھوں میں جگہ دیگی اور یقیناً تم میری والدہ سے مل کر خوش ہوگی۔ وہ تمہیں اپنی خوش قسمتی سمجھے گی اور اپنی بیٹی کی طرح تم سے محبت کریگی۔ کیونکہ اس کے اپنے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی۔ پیاری مجھے تم سے محبت ہے ۔۔ میں تمہیں چاہتا [illegible] اپنی زندگی کے آخری سانس تک چاہونگا۔"

[illegible] ایڈمی کے چہرے پر نظر ڈالی ۔۔ وہ [illegible]

"مگر اس قدر مہربان ہو" آخر وہ بولی اور پھر ۔۔ [illegible] کاش میں [illegible] پر خطر زمین کو چھوڑ کر جہاں انسانیت کا [illegible] وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی ۔۔ فرانس [illegible] ہراس ۔۔ ہر طرف وحشت یا ظلم و ستم ہے۔ آہ پیرس کا [illegible] مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے ۔۔ پیرس ۔۔ خوفناک پیرس ۔۔ جہاں منافرت و مناقشت کے چہرے خون سے رنگین ہو رہے ہیں۔ جہاں جور و استبداد کا دور دورہ ہے۔ پیرس جہاں میرے ملکہ اور بادشاہ کے لئے دار و رسن ۔۔ آہ ہمیں پیرس کے متعلق ہولناک اطلاعات سینٹ کیرس میں موصول ہو چکی تھیں ۔۔ اف، لرزہ براندام کر دینے والی خبریں۔ میری والدہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ شر پسند، بدمعاش ہمیں بھی ہدف ستم بنائیں گے۔ مگر انھوں نے گوارا نہ کیا کہ اپنا آبائی اور پیارا قلعہ چھوڑ کر فرار کر جائیں۔ لوگ میری والدہ سے محبت رکھتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ مصیبت کے وقت لوگ ہماری استعانت کریں گے اور ہمیں امداد پہنچائیں گے۔ مگر آہ ان درندوں، وحشی بھیڑیوں کے سامنے کوئی چارہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ میرا باپ حکومت پرست تھا لہذا اسے قتل کر دیا گیا۔ خبیث باغیوں نے ہمارے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہمارا مال اسباب نذر آتش کر دیا گیا۔"

"گذرے ہوئے واقعات کی یاد سے اپنے زخموں کو ہرا کرنا قرین عقل نہیں" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم تمام گذشتہ مصائب کو ذہن سے خارج کر دو۔ جو کچھ ہونا تھا ہو لیا۔ میں ملتجی ہوں کہ اب اپنے مستقبل کے لئے سوچو ۔۔ اپنی آئندہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے سامان ۔۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں تمہارے ان تمام زخموں کا اندمال ہو جائیگا اور تمہاری روح کو آرام حاصل ہوگا۔"

شام ہو چکی تھی اور جب ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ دن کے گھنٹوں سے غلط رستے پر سفر کرتے آرہے۔ پیرس جانے والی "شاہراہ" کئی میل پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

ہم اس بستی کی سرائے کے قریب پہونچے تو بہت سے لوگوں کے [illegible] اور شور و غل کی آوازیں سنائی دیں اور آگے بڑھے تو تاریکی میں باغی شر پسندوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ بعض کے ہاتھوں میں لالٹین بھی تھی ان میں [illegible] ایک مسلح تھا اور گانے بجانے میں محو تھا۔ یکایک ایک لحیم شحیم گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور مجمع کے قریب آکر رک گیا یہ شخص بھی باغی شر پسندوں کا سردار معلوم دیتا تھا۔ بلند قامت، تنومند [illegible] ہم نے اس کی شکل اچھی طرح دیکھ لی تھی جبکہ وہ لالٹین کے سامنے کھڑا ایک

ایک باغی سے باتیں کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ ہم کچھ سوچ لیں باغیوں کی نظر ہم پر پڑی اور سب کے سب ہماری طرف لپکے اور ہماری گاڑی کو محصور کر لیا ——— آہ، ہمارے لئے فرار کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس ہجوم میں سرائے کا مالک بھی تھا۔ میں نے حواس جمع کر کے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے انگلی کے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور آہستہ سے کہا۔

"کیا آپ ہمارے لئے خورد و نوش کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ غالباً آپ کے پاس کوئی خالی کمرہ بھی ہوگا۔؟"

"نہیں جناب! میں اس وقت آپ کی خدمت نہیں کر سکتا معاف فرمایئے۔" سرائے والے نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ بہت نرم آواز میں۔ "دیکھئے باغیوں کا یہ گروہ آج میری سرائے میں اترا ہوا ہے میرا ذخیرہ خورد و نوش تمام کا تمام چٹ کر گئے اور تمام کمروں پر انہیں کا تسلط ہے۔ میرے خیال میں آپ گاؤں میں کسی جھونپڑی سے رجوع کیجئے جہاں تک ممکن ہو جلدی یہاں سے کھسک جایئے۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے جناب۔ کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں آپ ہوا خواہان حکومت میں سے ایک معلوم ہوتے ہیں"

ابھی سرائے والے کو جواب نہ دینے پایا تھا کہ ایڈی بسرعت تمام میرے ساتھ چمٹ گئی اور ہجوم میں اشارہ کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز سے بولی ——— "ٹارکوئین ——— ٹارکوئین ——— وہ سامنے، پاجی شیطان جس نے ہم پر قیامت برپا کی۔"

وہ اس شخص کی طرف اشارہ کر رہی تھی جسے میں نے چند منٹ قبل سفید گھوڑے پر سوار آتے دیکھا تھا ——— اور اب وہ ہجوم میں سب سے آگے کھڑا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ ٹارکوئین اپنے ساتھی کے ہاتھ سے لالٹین چھین لی آگے بڑھا اور لالٹین کی روشنی میرے ساتھی کے چہرے پر ڈال کر سینٹ کیرین کی ہیروئن! اہاہا" وہ بولا اور ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ "مگر تمہارا شوہر کہاں ہے خوبصورت تیتری! بھیڑیا ——— میرا رقیب ——— حریف کہاں ہے؟" اس نے ایڈی سے پوچھا۔

"یہ ہے میرا شوہر" ایڈی نے کمال سنجیدگی سے میرے بازو پر جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"آہا! ٹارکوئین نے کہا۔ یہ چہرہ پر مکروہ مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ "مگر تمہاری شادی کہاں ہوئی ——— تمہارا نکاح کس نے پڑھا! اور بھیڑیئے کا کیا حشر ہوا؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ ابلیس میرا مضحکہ اڑا رہا ہے میرے سر پر آنے والی مصیبت کا تاریک بادل چھا گیا۔ شرپسند ہمارے نزدیک بڑھتے چلے جا رہے تھے اور ان کی للچائی ہوئی خونخوار نظریں ایڈی کے چہرے پر لگ رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" ٹارکوئین نے گرج کر مجھ سے دریافت کیا۔

"میں انگریز ہوں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرے پاس میرا اور میری بیوی کا پروانہ راہداری موجود ہے۔ دیکھو یہ رہا پروانہ راہداری ——— "نالین کے دستخط اس پر موجود ہیں ——— انقلاب کے رئیس رواں کے دستخط"

"کیا تم اس لڑکی سے شادی کرنے کی غرض سے فرانس آئے تھے؟ اس گھاگ، حکومت پرست، قلعہ سینٹ کرین کے مالک کی لڑکی سے شادی کرنے" اس نے طنزاً کہا اور پھر سر ہلانے لگا۔ نہیں نہیں بلکہ تم ویران سرائے میں اس لڑکی سے پہلی بار ملے جسے میرا لفٹنٹ بھیڑیا مجھ سے جیت کر لے گیا تھا۔ تم نے بھیڑیئے کو قتل کر دیا اور اس لڑکی کو وہاں سے لے بھاگے۔ میں اس کی تلاش میں تھا مگر امید نہ تھی کہ اس قدر جلد میں اس کا سراغ پا لونگا۔ سینٹ کیرین کو آگ کے شعلوں کے سپرد کر دینے کے بعد۔ ہم نے پیرس کا رخ کیا۔ راہ میں جب ہم اس سرائے میں اترے تو وہاں ایک کمرے میں بھیڑیئے کی لاش پڑی پائی۔ اس کا اپنا چاقو اس کے پہلو میں پیوست ——— لاش کے پاس ہمیں ایک سنہری بٹن ——— تمہارے کوٹ کا بٹن ——— پڑا ملا۔ یہ رہا تمہارا بٹن ——— ماسٹر انگلش مین۔"

اس نے لالٹین کی روشنی میں میرے کوٹ کے بٹن گنے واقعی وہ بٹن میرے ہی کوٹ سے گر گیا تھا اور اس کا احساس مجھے اب ہوا۔

"تم بھیڑیئے سے مبارزت آزما ہوئے۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا اور اسے مغلوب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کا چاقو چھین کر اس کے پہلو میں گھونپ دیا۔ درست ہے نا ماسٹر انگلش مین؟"

ایڈی میرے جسم سے لپٹی سرتاپا لرز رہی تھی۔ میں اپنی تمام امید دل اور آرزوؤں کا جنازہ اپنے سامنے نکلتے دیکھ رہا تھا ——— اب ہم دونوں ٹارکوئین کے رحم پر تھے۔

"تمھارے جرم کی سزا بہت سخت ہوگی ماسٹر!" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی طاقت تمھیں نہیں بچا سکتی۔ نالین کا پروانۂ راہداری ایک ردّی کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تم نے ایک فرانسیسی کے قتل کا ارتکاب کیا۔ علاوہ ارتکاب قتل کے تم ایک اور جرم کے مرتکب ہوئے ہو ــــ فریب دہی ــــ جعل سازی ــــ تم نے پروانۂ راہداری پر "بیوی" کا لفظ بڑھایا ہے۔ درآنحالیکہ حدود فرانس میں داخل ہوتے وقت تمھارے ساتھ کوئی بیوی نہ تھی۔ تم جعل ساز ــــ قاتل ــــ یاد رکھو۔ تمھاری سزا بہت سنگین ــــ عبرت ناک ہوگی۔ گرفتار کر لو ان کو۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو گرجدار آواز میں حکم دیا۔ جو اگلے ہی سیکنڈ ہم پر ٹوٹ پڑے۔

"اس سے پاسپورٹ چھین لو۔ ادھر دو ــــ مجھے دو پاسپورٹ۔ ان دونوں کو باندھ دو۔"

"تمھیں نالین کے سامنے اس واہیات حرکت کے بارہ میں جوابدہ ہونا پڑیگا" میں چلایا "اور سن رکھو میں نے ہرگز بھیڑیئے کو قتل نہیں کیا۔ یہ ثمن صرف اس جنگ کا ثبوت ہے جو میرے اور اس کے درمیان ہوئی۔ میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ ہم جنگ آزما ہوئے۔ مگر بھیڑیئے کی شکست پر میں نے تلوار ہاتھ سے رکھدی۔ وہ پھر مجھ پر جھپٹا اور مجھے نیچے گرا کر اپنا چاقو میرے پیٹ میں گھونپنا چاہا۔ بیگم سنیٹ کرین دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھیڑیئے کے سر پر ضرب لگا کر میری جان بچالی۔ ہم اُسے سرائے میں زخمی صرف زخمی چھوڑ کر چلے آئے مگر قتل نہیں کیا۔ یہ کسی پُر اسرار شخص کی کارستانی ہے غالباً تم نے ...... ہاں ہاں تم نے خود اُسے قتل کر ڈالا ہوگا ــــ" میں نے چلا کر کہا۔

اس پر مارکوئیں نے قہقہہ لگایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "یہ تمام معزز اشخاص" اس نے اپنے خبیث ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہر وقت میرے ساتھ رہے اور گواہ ہیں کہ میں نے بھیڑیئے کو قتل نہیں کیا۔ ماسٹر انگلش مین۔ تمھارے سوا اس کا قاتل اور کوئی نہیں ہو سکتا اور تمھیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

"میں تمھیں آخری بار مطلع کرتا ہوں" میں نے جھلا کر کہا۔ "نالین میرا منتظر ہوگا اسے ایک اہم کام کے سلسلے میں میری ضرورت ہے۔ میں اس کا مہمان ہوں۔ یاد رکھو اگر تم نے مجھے ایذا دی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اپنی موت کو آواز دیکر بلا رہے ہو۔ نالین کا عتاب تم پر نازل ہوگا اور اس کے قہر و غضب کی بجلی تمھارے خرمن ستم کو جلا کر راکھ کر دیگی۔"

میں نے دیکھا کہ وہ خبیث کسی حد تک خائف ہوگیا اور اس نے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا۔

"خیر مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں"۔ وہ بولا۔ "اس لڑکی کو حاصل کرنے کی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ بھیڑیا مارا گیا اور آخر کار یہ حسین دوشیزہ مجھے مل گئی اب یہ میری ہے اور ہمیشہ میرے قبضہ میں رہے گی"

"یہ لڑکی بھی نالین کے ظل حمایت میں ہے یاد رکھو"۔ میں چلایا۔

"میں تم دونوں کو پیرس لے جاؤنگا" اس نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ نالین تمھارا دوست ہے۔ مگر یہ بھی سن رکھو کہ مجھے "روس پیری" کی دوستی کا فخر حاصل ہے۔ نالین اور روس پیری کے درمیان سخت دشمنی و عداوت کی دیوار استادہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے رقیب ــــ حریف ــــ جان کے لاگو ہیں۔ ماسٹر انگلش مین! شاید تمھیں علم نہیں کہ ان دنوں میرے دوست ــــ روس پیری کی حشمت کا آفتاب نصف النہار پر ہے ــــ ہاں اس کا ستارہ غالب ہے۔"

چنانچہ یہ رات ہم نے شر پسندوں کی نگرانی میں گزاری اور اگلی صبح وہ ہمیں اپنی حراست میں لے کر پیرس کو چلدیئے انھوں نے ہمیں اتنی اجازت دیدی کہ ہم (لیڈی اور میں) اس گاڑی پر اکٹھے سفر کریں جس میں ہم "ویران سرائے" سے سفر کرتے چلے آرہے تھے۔

الغرض خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا اور ہم پیرس ــــ خونیں شہر میں داخل ہوگئے۔ پیرس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی خبر جو ہمارے کانوں تک پہنچی وہ یہ تھی کہ روس پیری اپنی جملہ قوتیں متحد کر کے نالین پر حملہ آور ہوا ہے اور اس نے نالین کی نیک دل بیوی کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا ہے اس نیک بخت پر حکومت پرست امرا کو فرار میں امداد دینے کا الزام عاید کیا گیا تھا۔

"اب میرا دوست ــــ روس پیری۔ نالین کو بھی گرفتار کریگا۔ تمھارے نالین کو ــــ اور اسے گلوٹین کی بھینٹ چڑھا یگا۔" مارکوئیں نے ہاتھ ہلاتے

ہوئے متکبرانہ لہجہ میں مجھے مطلع کیا: "روس پیری کی طاقت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا ہے اور تمہارا نالین بے دست و پا ——— تم اور تمہارا خوبصورت ساتھی بھی زندان میں پھینکے جاؤ گے۔ نالین کی بیوی کی طرح - اور اس کے بعد بالکل نالین کی بیوی ہی کی طرح تم بھی گلوٹین کی نذر کئے جاؤ گے - ہاں - مگر مسٹر انگلش مین - ایک شرط پر تمہاری جان بچ سکتی ہے - صرف ایک طریق ہے ——— وہ یہ کہ میری دلارام - قلو سینٹ کیرینا کی ہیروئن میری بیوی بننا قبول کرے - سنو" اس نے ایڈمی سے خطاب کیا "میں بھیڑیئے سے بدرجہا بہتر ہوں - خوبصورت ——— جوانمرد ——— سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں فرد ہوں - بھیڑیئے سے کئی گنا متمول ہوں - اور ایک دن میری طاقت دیکھ کر دنیائے فرانس انگشت بدنداں ہوگی - میں تمہیں اپنی آنکھوں میں جگہ دونگا - مجھے تم سے محبت ہے اور محبت کرونگا ——— تمہارے ایک ادنیٰ اشارے پر جان چھڑکنے کو تیار ہونگا - اور . . . ."

" شاید " ایڈمی نے بات کاٹ کر کہا " تم وہ وقت بھول گئے جب تم نے ہمارے باپ کے خون سے ہاتھ رنگے "

" نہیں " میں نے تمہارے باپ کو قتل نہیں کیا - میں اس پر حملہ آور ہوا صرف اس کی املاک پر قبضہ کرنے کی غرض سے - تمہارے باپ کا قاتل بھیڑیا تھا - وہ تمہارے باپ کے پیچھے کھڑا تھا اور اس نے اس کی پشت کی طرف سے وار کیا ——— میری خوبصورت تیتری - یقیناً میں تمہارے لئے ایک بہترین شوہر ثابت ہونگا ——— وفادار ——— نازبردار ——— اگر تم میری بیوی بننا قبول کر لو - یاد رکھو تمہاری "ہاں" ہی میں اس انگریز کی آزادی ——— اور زندگی پوشیدہ ہے - اگر تم مجھ سے شادی کا اقرار کر لو تو یہ انگریز آزاد ہو سکتا ہے ہاں اسی شرط پر تم اس کی زندگی خرید سکتی ہو ——— ورنہ ——— بصورت دیگر ——— دنیا کی کوئی طاقت اسے گلوٹین ——— موت سے نہیں بچا سکتی "

ایڈمی نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا ——— اب وہ منتظر تھی کہ میں کچھ بولوں -

" مجھے یقین ہے ایڈمی اپنے جذبات میری آزادی کے بھینٹ نہ چڑھائیگی - " میں چلایا -

" تمہاری بیوی بننے سے موت بدرجہا بہتر ہے میرے لئے " ایڈمی نے پرجوش لہجہ میں ٹارکوئین سے کہا -

" تمہیں میری بیوی بننا ہوگا اور ضرور بنوگی - " ٹارکوئین نے دعویٰ کیا - " میں تمہیں زندان میں لے جاؤں گا جہاں گورنر میرے شناساؤں میں سے ہے ——— نہیں بلکہ میرا دوست ہے - میں تمہیں اس انگریز کی جان بچانے پر مجبور کر دوں گا - میں جانتا ہوں تمہیں اس سے محبت ہے چنانچہ جب تم اسے پھانسی کے تختے پر چڑھا ہوا دیکھو گی تو اپنی ضد سے باز آ جاؤ گی اور تمہاری "نہیں" - "ہاں" سے بدل جائیگی - اگر بالفرض محال تمہاری ہٹ قائم رہی اور یہ انگریز پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو بھی تم میری ملکیت و قبضہ میں ہو گی - آہ ! میں تمہیں جان و دل سے چاہتا ہوں - اور تمہیں ہاتھ سے دیدینا میرے لئے ناقابل برداشت ——— بہر صورت میں تمہیں حاصل کرونگا ——— تمہیں جیت لونگا "

ایک گھنٹہ بعد ہم جیل میں ٹھونس دیئے گئے - ایک دوسرے سے الگ الگ - علیحدہ زندانوں میں رکھے گئے - میں نے ٹارکوئین کو گورنر جیل سے مصروف گفتگو دیکھا - اب سے پہلے میں انہیں خیالات سے کھیلتا رہتا تھا کہ ایڈمی کے دل میں میری محبت گھر کر چکی ہے اور ایک دن ضرور ایڈمی میری محبت کا اعتراف کریگی - مگر اب ——— اب جبکہ میں موت کے دہانہ پر کھڑا تھا ——— مجھے گلوٹین ——— پھانسی کے متعلق خیالات نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا - میں لرز اٹھتا - جب یہ خیال آتا کہ ایڈمی میرے دل کی مالکہ ایڈمی کی قسمت ——— بدمعاش ٹارکوئین کے رحم میں پوشیدہ ہے - ٹارکوئین - بدمعاش - خبیث ——— بھیڑیئے سے زیادہ ابلیس -

اگلے دن محافظ نے مجھے مطلع کیا کہ تم تفریح خانہ میں جاکر باقی زندانیوں سے مل سکتے ہو - یہ تفریح خانہ ایک وسیع کمرہ تھا جس میں تمام قیدیوں کو ہر روز دو گھنٹہ کے لئے جمع ہونے اور بات چیت کرنے کی اجازت دی جاتی - اس کمرہ میں ہر روز ایک معین وقت کے لئے قیدی باپ اپنے بچوں سے بھائی بہن سے دوست اپنے دوستوں سے ملتے اور آہستہ آہستہ گفتگو کرتے - پہرہ دار ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے اور قیدیوں کی حرکات و سکنات کا معائنہ کرتے - اس جیل میں تمام قیدی حکومت پرست اشخاص تھے جن کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ شر پسند باغی نہ تھے اور شر پسندان حکومت

پرست خرفا کے وجود سے فرانس کو پاک کرنا چاہتے ہیں اس جیل کے تمام قیدیوں کی سزا موت تھی اور ہر قیدی مقررہ تاریخ اور معینہ وقت پر نہنگ اجل کا لقمہ بننے والا تھا۔

میں اس کمرہ میں گیا۔ ایڈمی سے ملاقات ہوئی۔ اسے اپنی زندگی سے زیادہ میری فکر تھی۔ وہ عجیب تذبذب میں تھی۔ نہ تو وہ نارکولین کی بیوی بننا گوارا کر سکتی تھی نہ ہی یہ برداشت کر سکتی تھی کہ میں پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں۔

دن گذرتے گئے اور اجل رسیدہ قیدی جام اجل نوش کرتے گئے باپ قتل ہو جاتے اور ننھے ننھے بچے یتیم رہ جاتے۔ شوہر موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے اور بیوہ عورتیں اپنی زندگی کے باقی تاریک دن گن گن کر گذارنے کے لئے چھوڑ دی جاتیں۔

ایک دن تفریح خانہ میں ہم تمام زندانیوں کی توجہ ایک نئے حسین قیدی نے اپنی طرف کھینچ لی —— حسین و جمیل —— نوجوان —— اجل رسیدہ قیدی عورت۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی جب میں نے داروغہ جیل کو حسین قیدی سے ان الفاظ میں خطاب کرتے سُنا۔ "بیگم نالین"

میں حیرت زدہ ہو کر شوق آمیز دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھنے لگا —— آہ یہی تھی وہ نیک دل عورت جس کے پاس میں انگلینڈ سے یہاں آ رہا تھا۔ یہی تھی وہ عورت جسے عظیم الشان انقلابی —— نالین کی بیوی ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہی تھی وہ اولوالعزم اور جاں نثار عورت جو غیر معمولی شخصیت کے انسان نالین کا دست راست تھی۔ وہ نالین جس کے دستخط میرے پروانہ راہداری پر منقوش تھے۔ یہی تھی وہ خوش نصیب عورت جو حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے فرانس بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی —— اُف۔ بہ دست و پا —— لقمۂ اجل —— محبوس۔

"بیگم نالین" آپ ہی ہیں؟" داروغہ نے خوبصورت قیدی سے دریافت کیا۔

"ہاں" اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ "یہ فخر مجھے ہی حاصل ہے میرا گناہ صرف اتنا ہے کہ میں امرائے حکومت سے ہمدردی رکھتی ہوں۔ دیکھو میں نے اپنے سر کے بال خود ہی کاٹ دیئے ہیں تاکہ کسی کو میری شناخت میں دقت نہ ہو۔"

"ہمیں ضرور بیگم نالین سے ملنا چاہئے۔" میں نے ایڈمی سے کہا۔ "اپنے حسب ونسب نیز جملہ حالات سے اسے آگاہ کرنا چاہئے جن سے ہمیں دوچار ہونا پڑا ہے۔" دوسرے ہی لمحہ ایڈمی "خوبصورت بیگم" کو کمرۂ تفریح کے ایک پرسکون گوشے میں بُلا کے لے آئی جہاں میں کمال اشتیاق نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"میں گائی لوڈیس ہوں بیگم صاحبہ!" میں نے مودبانہ طریق سے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کرنا تھا مگر افسوس...... بدقسمتی سے ہماری ملاقات اس جہنم —— جیل خانہ میں ہو رہی ہے۔"

"ہش" بیگم نے جلدی سے مگر دھیمی آواز میں مجھے روکا۔ "آہستہ —— بہت آہستہ —— کہو تم کیونکر گرفتار ہوئے۔ کس علت میں؟"

میں نے اول سے آخر تک تمام قصہ کہہ سنایا —— وہ رحم آمیز نگاہوں سے ایڈمی کو دیکھنے لگی۔

"آہ، تمہاری حالت مجھ سے کہیں زیادہ قابل رحم ہے۔" بیگم نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "مگر دامن امید کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ میرا پیارا —— بہادر شوہر —— شوہر نالین ابھی دشمن —— روس بیری کے ہتھے نہیں چڑھا۔ وہ ابھی آزاد ہے۔ کسی مصلحت کی بنا پر روس بیری نے مجھے اس زندان میں تبدیل کر دیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ نالین ضرور میرا سراغ نکال لیگا۔ وہ جلد معلوم کر لیگا کہ میں کہاں ہوں۔ اس وقت تمام پیرس نالین اور روس بیری کی آئندہ نقل و حرکت کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔

تم بہت دیر سے پہونچے۔ ہم جانتے تھے کہ روس بیری ہمیں تباہ و برباد کر دینے پر تلا ہوا ہے ہم نے فرار کا تہیہ کر رکھا تھا۔ مگر ضروری تھا کہ ہم پہلے اپنے جواہرات کا ذخیرہ کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔ اس جواہرات کے ذخیرہ میں ہمارے مستقبل کی درخشانی مضمر ہے۔ میرا شوہر —— نالین، تمہارے والد نیک نام مینکر سے واقف تھا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ تمہارے باپ کی طرف سے کوئی معتبر اور قابل اعتماد شخص آئے اور ہمارے جواہرات انگلینڈ بحفاظت تمام لے جائے —— وہ معتبر شخص تم ہی تھے۔ مگر افسوس تم بہت بعد از وقت پہنچے۔ میں جانتی ہوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ صورت حالات غیر متوقع تیزی کے ساتھ بدل گئی۔ میں خوش ہوں کہ جواہرات ابھی تک محفوظ —— نالین کے قبضہ میں موجود ہیں۔ اگر میرا شوہر روس بیری پر غالب آ گیا تو تمہاری خدمات کی ضرورت نہ پڑیگی —— مگر تم دیکھو گے کہ ان تکالیف کا صلہ ہم تمہیں بیش از بیش دینگے۔ تمہاری میزبانی کے فرائض انجام دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ مجھے اپنی آزادی کی سو فیصدی امید ہے

اور میں اپنی آخری سانس تک ناامید و مایوس نہ ہونگی اور آزاد ہونے کے بعد تمہارے خوبصورت ساتھی کے تمام آلام عیش و مسرت میں بدل دونگی یقیناً وہ تمام رنج والم اور ظلم وستم بھول جائیگی جو اس بدنصیب پر ٹوٹنے۔ مگر سردست ہم قیدی ہیں اور نہیں جانتے کہ آنے والی صبح ہمارے لئے کن مصائب کی حامل ہو"۔

اگلی صبح ایک شخص ایڈمی سے ملنے آیا ——— وہی خبیث ٹارکوئین — ایڈمی نے اگلے دن مجھے کمرہ تفریح میں بتایا کہ ٹارکوئین علی الصبح اُسے زندان میں ملنے آیا۔ اس نے اظہار محبت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور ایڈمی کی محبت حاصل کرنے کی سرتوڑ سعی کی اسے سبز باغ دکھائے اور مستقبل کے متعلق بہت سی درخشاں امیدیں دلائیں۔ لیکن جب ایڈمی نے حسب سابق اس پاجی کے مشتبہ ہوا و حرص کو نفرت و حقارت کی ٹھوکر سے چور چور کر دیا تو اس نے انتہائی غصہ اور جوش کی حالت میں اسے مطلع کیا کہ تین دن کے اندر اندر تم اپنے عاشق انگلش مین کو پھانسی پر لٹکتا دیکھ لوگی۔ اور اس موقع پر تم اپنے فیصلہ میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی"

ایڈمی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے جب وہ یہ تازہ خبر مجھے سنا رہی تھی اس کے دل کی دھڑکن میں غیر معمولی تیزی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ دامن صبر و امید کو تھامے رکھو۔ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ ایڈمی کے دل میں میری محبت پیدا ہو چکی ہے۔

وہ شیطان تمہیں ضرور مروا دیگا۔ ایڈمی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اب پانی سر تک آپہنچا ہے اس نے جیل کے گورنر کو تبلا دیا ہے کہ تم بھیڑیئے کے قتل کے مرتکب ہوئے ہو۔ بھیڑیئے کی موت ٹارکوئین کے لئے باعث مسرت ہے۔ اس کا نخل مراد سرسبز ہو گیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب وہ مجھ پر قابض ہو جائیگا۔ آہ میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ تم مر جاؤ اور مجھے اس خبیث شیطان کے رحم و کرم کے سپرد کر جاؤ"۔

میں نے پھر اس کے زخموں پر تسلی و تشفی کی مرہم کا پھاہا رکھنا چاہا اور کہا کہ بارگاہ ایزدی میں دعا کرتی رہو کہ خدا کے سوا ہمارا کوئی نہیں۔

آخر وہ تیسرا دن آگیا۔ وہ دن جب کہ ٹارکوئین۔ "نازک دل" ایڈمی کو ایک نہایت نازک امتحان کی آگ میں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ دن جس کی روشنی میں میری زندگی و موت کا سوال حل ہونا تھا۔

جیلر آیا اور مجھے اس کمرہ میں لے گیا۔ جہاں اجل رسیدہ قیدیوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ اس بھیانک کمرہ کے ایک کونے میں عورتوں کے لمبے لمبے خوشنما بالوں سے بھری ہوئی ٹوکری رکھی تھی۔ عورتوں اور لڑکیوں کے بال ——— ان عورتوں اور لڑکیوں کے بال جیلر کی قینچی انتہائی بے دردی سے کاٹ دیتی جنہیں سفر آخرت پر مجبور کیا گیا تھا۔ دفعتاً ایڈمی نمودار ہوئی۔ وہ گورنر جیل اور ٹارکوئین کے عقب میں سر جھکائے ڈگمگاتی ہوئی چلی آ رہی تھی ——— دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس خوفناک کمرہ میں صرف چار شخص موجود تھے۔ دوسرے ہی لمحہ چیف جیلر مع دو نائب افسروں کے آیا اور میرے ہاتھ میری پشت پر باندھ دیئے گئے۔ اس وقت میں گرد و پیش کے حالات سے بے خبر تخیلات کی فضا میں کھویا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا میری تمام فطری قوتیں ایک ایک کر کے سلب کی جا رہی ہیں۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا ناگاہ مجھے ٹارکوئین کی آواز سنائی دی۔ بالکل اسی طرح جیسے عالم خواب میں کوئی آواز سنائی دے۔ وہ اس وقت بھی ایڈمی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے پر رضامندی کا اظہار کرے اور یوں مجھے آزاد کرائے چیف جیلر اور اس کے نائب کمرے کے باہر جا چکے تھے اور گورنر کمرہ کے نیم دروازہ میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست ٹارکوئین کے اشارے پر مجھے آزاد کرنے یا گلوٹین پر بھیجنے کا فرمان صادر کرنے کے لئے تیار ———،

ٹارکوئین کی یہ آخری کوشش بھی رائگاں گئی۔ ایڈمی بے حس و حرکت خاموش کھڑی رہی۔ یوں معلوم دیتا تھا گویا کسی مافوق الفطرت ہستی نے اس کے لب سی دیئے ہیں۔ اس کی کلائیاں بھی بندھی ہوئی تھیں اور اس کی نگاہیں ——— بالو سا تہ نگاہیں میرے چہرہ پر لگ رہی تھیں۔ میں صبر شکن انتظار کے ساتھ امید و بیم کی لہروں میں ڈانواڈول ——— اس کے لبوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹارکوئین نے آخری کوشش کی۔ اب کے اس کا اس کا لہجہ بہت کرخت تھا ——— "تم نہیں مانو گی؟" وہ چلایا۔ "بہت خوب، تمہارا عاشق اب ضرور واصل جہنم کیا جائیگا۔ اسے گلوٹین پر ——— اور تمہیں اپنے زندان میں واپس جا کر میرے ارادہ ——— میرے آخری فیصلہ کا انتظار کرنا ہوگا یاد رکھو اور خوب یاد رکھو میں تمہیں ضرور حاصل کر کے رہونگا۔ اور اس وقت تک مایوس نہ ہونگا جب تک تم اس دنیا میں بقید حیات موجود ہو ———

"دوست گورنر" وہ اب گورنر سے مخاطب ہوا۔ "چھکڑا تیار ہے کیا؟"

آخر ایڈمی کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا۔

"ٹھہر جاؤ" اس نے چلا کر کہا۔ "میں مجبور ہو کر تمھارے سوال کے جواب میں "ہاں" کہتی ہوں"۔

مگر گورنر کی توجہ کسی دوسری طرف ٹھٹک رہی تھی۔ اس کے کان شور و غوغا پر لگے ہوئے تھے جو احاطہ جیل میں برپا تھا اور پھر ---- یکایک جیل کے گھنٹے بجنے لگے۔ گھنٹوں کی ہیبت ناک آواز ---- قیدیوں کا بے پناہ شور و غل۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں حیران تھا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ غل غپاڑہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ایک ہی لمحہ بعد گورنر مڑا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"روبس پیری ---- روبس ---- روبس پیری۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں ٹارکوین کو مطلع کیا۔ "مغلوب ہو گیا ہے ٹا... ٹا... لین ---- ٹالین نے اسے مار ڈالا ہے ---- ٹارکوین ---- ٹارکوین ---- ٹالین کی حکومت کا اعلان ہو چکا ہے۔"

اب لوگوں کا شور و غل ہمارے نزدیک تر چلا آ رہا تھا۔ احاطہ میں ایک عجیب ہنگامہ بپا تھا۔ دو ہی منٹ بعد سینکڑوں اشخاص۔ لاٹھیاں۔ بندوقیں تلواریں مختلف قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہال میں گھستے ہوئے نظر آئے ان کے آگے آگے ---- بطور رہنما۔ ایک کڑیل جوان ایک ہاتھ میں برہنہ شمشیر اور دوسرے میں پستول تھامے چلا آ رہا تھا۔ ہجوم "ٹالین زندہ باد۔ حکومت ٹالین پائندہ باد۔ خونی دور ختم ہو گیا۔ روبس پیری جہنم میں پہنچ گیا ہے ---- ظلم و استبداد کا خاتمہ۔ ہم ٹالین کو اس کی بیوی سے ملانے لائے ہیں۔ کہاں ہے ٹالین کی بیوی۔ ٹالین کی بیوی کو مبارک ہو" اس قسم کے پرجوش نعرے لگا رہا تھا۔

اب یہ ہجوم اس کمرہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ جس میں ہم گرفتار بلا تھے ---- میں نے ایک عورت کو ---- ہاں ٹالین کی بیوی کو ہانپتے ہوئے دروازے میں سے دیکھا جو اپنے خاوند ---- ٹالین سے لپٹ گئی۔ ہجوم کا رہنما بہ نفس نفیس تھا۔ میں بندھا ہوا تھا۔ ایڈمی نے بھاگ کر نکل جانے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھاگ کر ٹالین کے پاس پہنچے اور میری رہائی کی طرف توجہ دلائے۔ لیکن ابھی وہ کمرے کے دروازے تک بھی پہنچنے نہ پائی تھی کہ ٹارکوین نے بڑھ کر اُسے شانوں سے پکڑ لیا۔ اس وقت میں رسیوں میں جکڑا ہوا تھا اور ایڈمی کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ میں نے زور زور سے چلانا شروع کیا ---- "ٹالین ---- ٹالین ---- بیگم ٹالین مدد ---- مدد ---- مدد۔"

خوش قسمتی سے میری آواز ٹالین کے کانوں تک پہنچ گئی اور چند ساتھیوں کی معیت میں ہمارے کمرہ میں آ گیا۔ ٹارکوین کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آتش غضب کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ چہرہ انگارہ کی طرح دہکنے لگا۔

"اہا، روبس پیری کا وفادار کتا یہاں موجود ہے۔" ٹالین نے ٹارکوین کی طرف اشارہ کیا۔ "نمک حرام مخبر، جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی، آیئے ماسٹر انگلش مین، گلوٹین ابھی تک اپنی معین جگہ پر کھڑی روبس پیری کے ساتھیوں کی راہ تک رہی ہے۔ آیئے اپنے دوستوں میں شامل ہو جایئے"

ٹالین کے ساتھی ٹارکوین کو پکڑ کر کشاں کشاں لے گئے۔ ایک ہی ساعت بعد میں اور ایڈمی ٹالین کے سایہ عاطفت میں اس کے مکان پر بیٹھے تھے میری اور ایڈمی کے مصائب و مشکلات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

ایک ہفتہ بعد ---- ایک خوشگوار صبح جبکہ آفتاب عالمتاب اپنی آڑی ترچھی کرنوں کے تیر چلاتا تخت مشرق پر جلوہ فگن ہو چکا تھا۔ ہم (میں اور ایڈمی) ٹالین کے عنایت کردہ چار گھوڑوں والی گاڑی میں سوار ہو کر انگلینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بالکل بے خوف و خطر۔ ہشاش بشاش اُس وقت میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان تصور کر رہا تھا۔ جس چیز کے لئے میں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ وہ مجھے حاصل تھی ایڈمی۔ میری روح کی باریک ترین رگوں میں کیف جمود و فسردگی پیدا کر دینے والی ہستی ---- میرے کاشانۂ تیرہ و تار میں شمع محبت فروزاں کرنے والی قوت مجھے نصیب تھی۔

ٹالین نے ازراہ مسافر نوازی ایک کوچبان اور دو خدمتگار بھی بطور محافظ ہمارے ساتھ کر دیئے تھے اور انھیں ہدایت کر دی تھی کہ ہمیں بحفاظت تمام انگلستان کے حدود تک پہنچا آویں۔ میں اس سرائے کو کبھی نہ بھولوں گا جہاں سے میری مشکلات کا آغاز ہوا جہاں میری حسین بیوی سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ انگلینڈ جاتے ہوئے رستے میں جب ہم اس سرائے کے سامنے پہونچے تو ایڈمی میرے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا دل سینے میں [illegible]

مگر اب یہاں کسی قسم کا خوف و خطرہ نہ تھا۔ سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ایک بڈھا شخص اور اس کی بیوی دوڑتے ہوئے سرائے کے دروازے پر باہر نکل آئے۔ انھوں نے ہماری گاڑی کو گذرتے دیکھا تھا۔ میں نے کوچبان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اترا اور سرائے والوں کے پاس گیا۔

بھیڑیئے کی پراسرار موت اور لیمپ کے غایب ہو جانے کی یاد میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ اور مجھے اس راز کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ سفید ریش سرائے والا اور اس کی بیوی دونوں چونک پڑے جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس طوفانی رات میں وہ دونوں کہاں غائب تھے؟

میں نے انھیں بتایا کہ اس رات تمھاری سرائے میں ایک شرپسند سے میری مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ بھیڑیئے کو مجروح کر کے ہم یہاں چھوڑ گئے تھے لیکن کسی پراسرار ہستی نے چاقو گھونپ کر اسے واصل جہنم کر دیا۔" یہ سن کر بڈھے کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی بیوی لرزنے لگی۔

"ڈرو مت" میں نے کہا۔ "جو کچھ تم جانتے ہو صاف صاف کہدو۔ میں ہمیشہ کے لئے فرانس چھوڑ رہا ہوں"۔

"جناب عالی!" بڈھے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں۔۔۔۔نے۔۔۔۔بھیڑیئے کو قتل کیا تھا۔ میرا اکلوتا بیٹا قلعہ سینٹ کیرن کی چوکیداری پر مامور تھا۔ ہم نے اس کی زبانی سنا تھا کہ قلعہ پر شرپسندوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ ہم اپنے لڑکے کی معیت میں سرائے سے نکل بھاگتے ہوئے قلعہ کی طرف گئے تاکہ تمام حالات بچشم خود دیکھیں۔ میں اور میری بیوی قلعہ سے تھوڑی دور درختوں کے جھنڈ میں تمام تماشہ دیکھنے گئے مگر میرے بیٹے سے نہ رہا گیا وہ جوش اور غصہ میں دیوانہ وار تلوار سونت کر بھاگتا ہوا قلعہ کی طرف بڑھا۔ تاکہ دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر شرپسندوں کی مدافعت کرے۔ میں نے اسے منع بھی کیا کہ جلتی آگ میں خوامخواہ نہ کودو لیکن اس نے نہ مانا۔ وہ کہتا رہا کہ میرا فرض ہے کہ اپنے مالک کے قلعہ کی حفاظت میں جان لڑا دوں۔ آہ میں اسے آوازیں دیتا رہا لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ قلعہ کے دروازے پر شرپسندوں کا قبضہ تھا۔ میں دور کھڑا دیکھ رہا تھا میرے بچے نے قلعہ میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا اسے راستہ نہ ملا آخر اس کی نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی۔ وہ چھپکلی کے مانند دیوار پر چڑھ گیا لیکن پیشتر اس کے کہ دریچہ میں داخل ہو جائے۔ بھیڑیئے کا چاقو اس کی پشت میں پیوست ہو گیا آہ آہ میرا جگر پارہ بیس فٹ کی بلندی سے زمین پر آ رہا اور تڑپ کر جان دیدی

جناب میں نے اپنی آنکھوں سے چاقو مارتے دیکھا تھا۔ وہ فصیل پر کھڑا اپنے ساتھیوں کو احکام دے رہا تھا ناگاہ اس کی نظر میرے بیٹے پر پڑی اور اس نے اس کی پیٹھ میں چاقو مار دیا۔ ہم روتے دھوتے اور قسمت کو کوستے سرائے میں واپس آ گئے جب ہم یہاں پہونچے تو اس کمرہ میں جہاں ہم آگ جلتی چھوڑ گئے تھے آوازیں سنیں ہم حیران تھے کہ ایسے وقت میں یہاں کون آیا ہے ایک سوراخ میں آنکھ لگا کر اندر دیکھا تو آپ نظر آئے اور وہی ناپاک بھیڑیا میرے لخت جگر کا قاتل اور جناب میرے بیٹے کے آقا کی لڑکی مس ایڈمی۔ میں نے وہ تمام باتیں اپنے کانوں سے سنیں جو آپکے اور بھیڑیئے کے درمیان ہوئیں پھر آپ دونوں کے درمیان لڑائی کا تماشہ بھی ہم دیکھتے رہے آخر آپ بھیڑیئے کو گھائل کر کے مس ایڈمی کو ساتھ لے کر سرائے سے نکل گئے چنانچہ آپ کے بعد میں کمرے میں داخل ہوا اور بھیڑیئے کو زمین پر پڑا دیکھا۔ میری رگوں میں خون کھولنے لگا سینے میں آتش انتقام کی بھٹی روشن ہو گئی اور میری روح اس میں ایندھن کی طرح جلنے لگی۔ میں نے میز پر سے بھیڑیئے کا چاقو اٹھایا اور اس کے پہلو میں عین دل کے اوپر پیوست کر دیا۔ اور یوں اپنی آتش انتقام کو سرد کیا۔ جناب یہ وہی چاقو تھا جو اس خبیث نے میرے بیٹے جوان بیٹے۔ اکلوتے بیٹے کی پشت میں گھونپا تھا۔ میں اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ آپ اپنی تلوار لینے واپس آ گئے ابھی پھاٹک کے پاس ہی پہنچے تھے کہ میں نے آپ کو آتے دیکھ لیا اور کمرہ سے سرک گیا آپنے تلوار اٹھائی اور چلدیئے اب ہمیں خوف پیدا ہوا کہ سارے بھیڑیئے کے ساتھی یہاں آ نکلیں ہم سرائے چھوڑ کر بھاگ نکلے اور وہاں ایک جھونپڑی میں چھپ رہے۔ جب ظلم و ستم کی حکومت ختم ہوئی تو ہم پھر واپس اپنی سرائے میں آ گئے۔ جناب میں نے تمام واقعات بحرف درست آپکے سامنے رکھ دیئے ہیں اور جناب یہ رہا۔ وہ موتیوں کا بیش بہا ہار جو بھیڑیئے نے مس ایڈمی کے گلے سے اتارا تھا۔ یہ مجھے بھیڑیئے کے قریب ہی پڑا ہوا ملا تھا۔ حضور میں نے مس ایڈمی ـــــ بیگم سینٹ کیرن کو پہچان لیا ہے۔ وہ آپکے ساتھ گاڑی پر سوار ہیں۔ لیجئے یہ ہار ان کی ملکیت ہے ان کے سپرد کر دیجئے"۔

میں نے ہار اس سے لے لیا اور چند طلائی سکے اسے انعام کے طور پر دیئے اس سرائے پر الوداعی نگاہیں ڈالیں اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسے خیرباد کہتے ہوئے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ میں نے محبت کی ادائیں تمر ایک لو سکی شکل میں ایڈمی کے لعل لبوں پر اس وقت ثبت کی جب میں نے سرائے کے دروازے سے چند گز دور جا کر ہار اس کے گلے میں پہنا رہا تھا

طوفانِ نوح

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی مدظلہ

وفا دہی کر کے بعد آپ کا معذور ہو جانا — یہ ایسا ہے کہ جیسے پاس ہو کر دور ہو جانا

مناسب ہے انھیں عشق و وفا سے دور ہو جانا — نہ ہو قسمت میں جن کی سرمد و منصور ہو جانا

نہ بھولا ہے نہ بھولے گا مجھے مسرور ہو جانا — کسی کا پاس آنا اور غم کا دور ہو جانا

ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا — پھر اس کا رفتہ رفتہ مستقل دستور ہو جانا

اثر اتنا دکھایا چارۂ آزار الفت نے — مرے زخم جگر کا زخم سے ناسور ہو جانا

یہ دُہری دُہری مجھ پر آپ کیوں بیداد کرتے ہیں — نظر سے دور رکھنا خود بھی دل سے دور ہو جانا

دیا یہ حکم ان کو حسن دے کر دینے والے نے — چمکنا اس قدر رشکِ چراغِ طور ہو جانا

نہیں یہ گردشِ قسمت مسافر کی تو پھر کیا ہے — بھٹک کر منزلِ مقصد سے کوسوں دور ہو جانا

مجھے دیکھو مری ناکامیوں کو عشق میں دیکھو — نہ دیکھا ہو اگر مختار کا مجبور ہو جانا

نشاط و عیش و عشرت نے نہ دیکھا پھر مجھے مڑ کر — کسی کا دور ہو جانا تھا سب کا دور ہو جانا

ہماری تو گذرتی ہے پری رویوں میں اے زاہد — مبارک ہو تجھی کو مبتلائے حور ہو جانا

بہت دشوار ہے رہنا الگ ان کو تخیل سے — بہت آسان ہے میری نظر سے دور ہو جانا

تغافل سے تو یہ طرزِ ستم پھر بھی غنیمت ہے — مجھے مغموم کر کے آپ کا مسرور ہو جانا

جنھیں تھا دید کا دعویٰ حواس اپنے وہ کھو بیٹھے — یہ کس نے کہہ دیا تھا تم سے برقِ طور ہو جانا

جو آتا ہے تو شمعِ حسنِ جاناں ہی کو آتا ہے — سراپا ناز بن جانا سراپا نور ہو جانا

دوبالا کر گیا آزار کو غم کو مصیبت کو — مری عرضِ مکرر کا بھی نامنظور ہو جانا

خراشِ ناخنِ غم پر یہ تاکیدِ محبت ہے — کہ پہلے زخم بننا اور پھر ناسور ہو جانا

نہ آیا کچھ سوا اس کے ہمارے داغِ فرقت کو — شبِ دیجور میں شمعِ شبِ دیجور ہو جانا

بنایا برق خصلت کیا انھیں حسن و شرارت نے — نظر کے سامنے آ کر نظر سے دور ہو جانا

زمانے کی دورنگی میں نشاط و رنج شامل ہیں — مری تاریک شب کا صبح دم کافور ہو جانا

یہ دی تعلیم بھی دے کر خط اپنا ہم نے قاصد کو — اگر غصہ انھیں آ جائے تو معذور ہو جانا

جہاں بدلی اٹھی رندوں کو سوجھی محفل آرائی — بہم مل جل کر ان کا خوشۂ انگور ہو جانا

دکھائے پانچ عالم اک پیامِ شوق نے مجھ کو — الجھنا۔ روٹھنا۔ لڑنا۔ بگڑنا۔ دور ہو جانا

جہانِ حسن میں شہرت تمھاری لے اڑی تم کو — پری تو بن گئے اب رہ گیا بس حور ہو جانا

جنابِ نوح بحرِ غم میں طوفانی علامت ہے
یہ ساحل سے مرے بیڑے کا بھر کر دور ہو جانا

زریاب

اسلامی دنیا کا نامور مغنّی

اور مغربی وضع اور فیشن کا اوّلین موجد

از

جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

مسلمانوں کی فتح کے بعد سے ملک اندلس تہذیب و تمدن کا مرکز بنگیا تھا جہاں باکمال اہل فن اور اہل علم و فضلا کی سرپرستی اور قدردانی نے مشرق کے باکمالوں کو اس مغربی خطہ کے سلاطین اور خلفاء کے درباروں میں کھینچ بلایا چنانچہ علماء و ادبا، شعراء و اہل فن بکثرت عازم اندلس ہوئے مورخ مقری نے اپنی ضخیم تاریخ نفح الطیب میں الوافدین علی الاندلس کے عنوان سے ان کے حالات میں ایک مستقل باب لکھا ہے مشرق قریب سے انہی اندلس جانے والوں میں بغداد کا ایک گمنام مغنی زریاب بھی تھا جس نے اندلس پہنچکر نہ صرف کمال فن سے مغربی دنیا کو انگشت بحیرت بنا دیا بلکہ اپنی نت نئی ایجادات اور مفید جدت طرازیوں، جدید اوضاع و اطوار اور خوشنما آئین و آداب معاشرت سے اندلس کی تہذیب کو چار چاند لگا دئیے اور یہ اسی کا پرتو فیض تھا جس نے یورپ کے تمدن پر گہرا اور پائیدار اثر ڈالا۔

نام اور وجہ تسمیہ | خلیفہ مہدی عباسی (۱۵۸ھ - ۱۶۹ھ) کا پروردہ تھا نام علی بن نافع کنیت ابوالحسن اور لقب زریاب تھا۔ بقول صاحب مقتبس[2] خوش آوازی اور فصاحت اور سانولی رنگت کے لحاظ سے اس کو زریاب کہتے تھے کیونکہ زریاب نام ہے ایک کالی چڑیا کا جو بہت خوش آواز ہوتی ہے۔ دمیری نے زریاب کے معنے "الوزریق" لکھے ہیں یعنے نیل کنٹھ۔

زریاب ہارون رشید کے دربار میں | شاعری اور موسیقی میں زریاب بہرہ ور تھا بالخصوص عود بجانے میں اسکو کمال حاصل تھا۔ گانے بجانے میں وہ بغداد کے مشہور مغنی اسحاق[4] الموصلی کا شاگرد تھا۔ اسحاق ایک زبردست ماہر علوم و فنون اور دربار خلافت میں باریاب تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی نے زریاب کو بغداد[5] سے نکلوایا اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ اسحاق نے ہارون الرشید کے سامنے اپنے اس شاگرد کا تذکرہ کیا اور اس کے گانے بجانے کی بہت تعریف کی اس پر ہارون نے اس کو لانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ جب زریاب دربار خلافت میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس سے گفتگو کی اور اس نے شائستگی کے ساتھ ہارون کے سوالات کا جواب دیا جب گانے کے متعلق اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "جو کچھ تعریف کی جائے اس سے بھی اچھا گا سکتا ہوں اور اکثر میں جس گانے کو پسند کرتا ہوں وہ لوگوں کو پسند نہیں ہوتا۔ البتہ حضور اس کی داد دے سکتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو ایسا گانا سناؤں جو حضور نے پہلے کبھی نہ سنا ہوگا۔ اس پر ہارون نے گانے کی فرمائش کی چنانچہ اس کے استاد اسحاق کا عود (ساز) منگوایا اور اس کو دیا گیا تو زریاب نے اس کے لینے میں تامل کیا اور کہا کہ "میرا اپنا عود ہے جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے اور اپنی عقل و دانش کے مطابق ترتیب دیا ہے اس کے سوا میں کسی دوسرے کا عود پسند نہیں کرتا۔ وہ دروازے پر رکھا ہوا ہے اگر حضور حکم دیں تو لایا جاوے۔

---

[1] کتاب بغداد مصنفہ احمد بن ابی طاہر طیفور صفحہ ۲۹۴ طبع جرمنی، [2] نفح الطیب مقری جلد ۲ صفحہ ۹۰ طبع مصر [3] حیوۃ الحیوان جلد ۲ ص ۹ مصر

[4] اسحاق بن ابراہیم موصلی - ہارون الرشید کا مصاحب اور ندیم خاص اس کے مفصل حالات کے لئے دیکھو کتاب الاغانی ابن خلکان وغیرہ [5] ابن عبدربہ (عقد الفرید جلد ۳ ص ۱۰۸) نے اسحاق کے بجائے اس کے باپ ابراہیم کا نام لکھا ہے جو یقینا غلط ہے۔

چنانچہ رشید کے حکم سے وہ لایا گیا اور دیکھا تو اس کے اگلے عود سے مشابہ پاکر زریاب سے کہا کہ تم نے اپنے استاد کا عود استعمال نہیں کیا آیا اس کی کیا وجہ ہے؟ زریاب نے عرض کی کہ اگر حضور کو میرے استاد کا گانا سننے کی خواہش ہو تو انہی کے عود پر سناؤں اگر میرا گانا سننا منظور ہو تو میں اپنے عود پر گا کر سناؤں۔ اگرچہ میرا عود جسامت میں اسی عود کے برابر اور ایک ہی قسم کی لکڑی سے بنا ہوا ہے لیکن یہ وزن میں اس سے تیسرے حصہ کے برابر ہے۔ میرے عود کے تار ریشم سے بنائے گئے ہیں جو گرم پانی میں ڈال کر بٹے گئے ہیں جس سے ان کی کھلاوٹ اور بل دور ہو گیا ہے اس کا مثلث تار بچہ شیر کی آنتوں سے بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے اس میں ترنم صفائی گونج اور تیزی پیدا ہو گئی ہے جو دوسرے سازوں میں کم پائی جاتی ہے وغیرہ۔" اس کے بعد ہارون نے گانے کا حکم دیا چنانچہ اس نے عود پر یہ گانا گایا۔

یا ایہا الملک المیمون طائرہ ہارون راح الیک الناس ابتکروا

"اے مبارک چہرے والے بادشاہ ہارون! لوگوں کے صبح و شام تیرے پاس آنے کا سلسلہ لگا ہوا ہے"

اس کے گانے سے ہارون الرشید وجد میں آ گیا اور اسحٰق سے کہنے لگا مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے قصداً اس کے گانے کا حال مجھ سے چھپایا اور پہلے تم نے اس کا گانا نہیں سنا؟ اس کی تصدیق نہ کرتے تو تمہیں ضرور سزا دیتا۔ اب اسے اپنے پاس رکھو اور اس کی تعلیم کی طرف توجہ کرو اور جب میں فرصت میں ہوں تو اسے دوبارہ میرے پاس لاؤ کیونکہ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے۔"

اس واقعہ سے اسحاق کے دل میں زریاب کی طرف سے آتش حسد بھڑک اٹھی اور ایک دن اس نے زریاب کو تنہائی میں یوں مخاطب کیا۔

"دیکھو اے علی! حسد سب سے بڑا اور بدترین مرض ہے دنیا جائے فتنہ اور ہمیشگی عداوت کا باعث ہے تم نے اپنے کمال فن کو چھپا کر میرے ساتھ فریب کیا اور اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہا اور میں ایسے اور نے کام بیمار آیا کہ تمہیں خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیا مجھے معلوم ہے کہ تھوڑے عرصہ میں تم میری وقعت گھٹا دو گے اور مجھ سے تمہارا مرتبہ بلند ہو جائے گا لہٰذا آئندہ سے میں تم کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا خواہ تم میری اولاد کے برابر کیوں نہ ہو۔ اگر تمہاری تربیت میرے ذمہ نہ ہوتی تو میں تمہاری جان لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا پھر خواہ اس میں کچھ ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ اب تم کو دو باتوں سے ایک پسند کرنی ہی پڑے گی۔ یا تو پختہ یہ عہد و پیمان کرو کہ میرے پاس سے اس وسیع دنیا میں کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ جہاں سے مجھے پھر تمہارا حال معلوم نہ ہو سکے اور جو کچھ مال اسباب کی ضرورت ہو وہ میں تمکو دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر میری مرضی کے خلاف میرے مخالف بن کر یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو تو میری مخالفت سے ہوشیار رہو کیونکہ میں اپنی مال اور جان سے تم کو تباہ و برباد کرنے کے در پے رہوں گا۔"

زریاب اسحٰق کے مرتبہ اور اس کے رسوخ سے واقف تھا اس لیے اس نے وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ اسحٰق نے فوراً اس کو وہاں سے نکل جانے میں مدد کی اور وہ راتوں رات بغداد سے روانہ ہو گیا جس سے اسحٰق کے دل کو تسکین ہو گئی مگر جب ہارون نے بوقت فرصت زریاب کو یاد کیا اور اسحاق کو اس کے حاضر کرنے کا حکم دیا تو اس نے عرض کی کہ امیر المومنین! وہ غلام تو دیوانہ ہے اسے یہ خبط ہو گیا ہے کہ جن اس سے باتیں کرتا ہے اور عمدہ گانے اس کو سکھاتا ہے اور اپنے برابر دنیا میں کسی کو نہیں سمجھتا اور چونکہ حضور نے اسے پھر یاد فرمایا نہ انعام و اکرام دیا اس لیے وہ اپنے فن کی توہین اور ناقدری کا خیال کر کے غصہ میں مجھ سے چھپ کر کہیں فرار ہو گیا ہے اس میں بھی حضور کے لیے خدا نے بہتری رکھی تھی کیونکہ اسکو دورے پڑتے تھے۔ اور حالت دیوانگی میں وہ بہت خوفناک نظر آتا تھا۔"

ہارون الرشید کو اس بات سے یقین ہو گیا اور اس نے افسوس کیا کہ خیر جیسا بھی کچھ تھا مگر اس سے خوشی حاصل ہونے والی تھی وہ یقیناً مفقود ہو گئی۔[1]

اس واقعہ کے بعد زریاب مغرب کی طرف روانہ ہو گیا اور اس دن سے مشرق میں اس کے حالات پر گمنامی کا پردہ پڑ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کے مورخین میں سے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ احمد بن طاہر طیفور نے اس کی نسبت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ بغداد سے شام کی طرف گیا۔[2]

زریاب قیروان میں ابن عبد ربہ نے زریاب کے قیروان پہنچنے کا حال لکھا ہے کہ وہ خاندان بنو اغلب کے فرمانروا زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن الاغلب (۲۰۱ھ تا ۲۲۳ھ) کے دربار میں پہنچا وہاں ایک دن اس نے عنترہ (ابو الفوارس) کے اشعار ذیل گائے۔

فان تك امى غرابية	اگر میری ماں کوے کے رنگ کی ہوتی
من ابناء حام بها عبتنى	بنی حام (حبش) کی اولاد ہے تو مجھے طعن کرتا
فانى لطيف ببيض الظبى	میں تلواروں اور نیزوں میں ماہر ہوں

[1] مقری جلد ۲ صفحہ ۱۱۰۹۰۵ [2] کتاب بغداد ص ۲۸۴ طبع جرمنی

وسمر العوالی اذا جئتنی — جب تو میرے مقابلہ میں آئے
ولولا فرارک یوم الوغی — اور اگر لڑائی کے دن تو میدان نہ بھاگ گیا
لقد تک فی الحرب ادقابتی — ہوتا تو میں تجھکو ان تیروں کھینچتا یا تیرے کھینچتا!

اس پر زیادۃ اللہ غضبناک ہوگیا اور زریاب کو درے لگا کر نکال دینے کا حکم دیا، اور کہا کہ اگر تین روز کے بعد میں تجھے اپنے ملک میں دیکھوں گا گردن مار دوں گا چنانچہ بیچارہ وہاں سے بھاگ سمندر کے راستہ سے اندلس پہنچا۔

زریاب اندلس میں مقری نے لکھا ہے کہ زریاب نے اندلس کے فرمانروا امیر الحکم کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنے اندلس چلے آنے اور فن موسیقی میں اپنی دسترس کا تذکرہ کیا اور باریابی کی اجازت چاہی، اس کے جواب میں امیر نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا، اور جلد اسکی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا، ساتھ ہی اپنے دربار کے ایک مغنی منصور یہودی کو اس کے لانے کے لیے بھیجا، چنانچہ زریاب اپنے اہل وعیال سمیت آبنائے جبل الطارق سے کشتی میں سوار ہوکر جزیرۃ الخضراء کیطرف روانہ ہوگیا، ابھی وہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ راستہ میں اسکو الحکم کی وفات کی خبر ملی، تو اس نے لوٹ جانے کا قصد کیا، مگر منصور نے اسکو روک لیا، الحکم کے فرزند اور جانشین عبدالرحمٰن کے پاس چلنے پر آمادہ کیا، اور امیر کو زریاب کے آنے کی اطلاع دی[1]، اس کے جواب میں عبدالرحمٰن نے زریاب کے آنے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا مختلف شہروں میں حکام کے نام فرامین جاری کردیئے، کہ وہ زریاب کا استقبال کریں اور عزت وشان کے ساتھ اس کو قرطبہ تک لے آئیں، اور اپنے خواجہ سراؤں میں سے ایک بڑے خواجہ سرا کو سواریاں لے کر بھیجا، چنانچہ زریاب اور اس کے اہل وعیال عزت کے ساتھ قرطبہ میں داخل ہوئے، ایک بہترین مکان میں ان کے فروکش ہونے کا انتظام کیا گیا، اور تین دن تک زریاب کو آرام لینے کی اجازت دی گئی۔

زریاب عبدالرحمٰن کے دربار میں تین روز کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے زریاب کو اپنے دربار میں باریابی کا شرف بخشا، اس کے لیے اور اس کے اہل وعیال کے لیے حسب ذیل مشاہرے اور وظیفے مقرر کیے۔

۱- زریاب کے لیے ۲۰۰ دینار ماہوار۔

۲- اس کے چار بیٹوں کے لیے ۲۰،۲۰ روپے ماہوار۔

۳- سالانہ ۳۰۰۰ دینار

یعنے عیدین پر ہزار ہزار، اور مہرجان ونوروز پر پانسو پانسو دینار۔

۴- سالانہ خوراک کے لیے ۳۰۰ مد اناج (تقریباً ۱۵ من یعنی ۱۰ سیر ۱۰ من جو اور ۵ من گیہوں)

۵- چند قطعات اراضی- باغات، باڑیں، وغیرہ جنکی آمدنی چالیس ہزار دینار تھی۔

جب امیر نے زریاب کی تمام ضروریات زندگی کا انتظام کرکے ان کو مہیا کرنے کا عہد کرلیا اور یہ معلوم کرکے کہ وہ ان عطیات اور وظائف پر راضی ہوگیا ہے- تب اس کو اپنی مجلس نبیذ میں بلوا کر گانا سنا- امیر نے زریاب کا گانا سننے کے بعد دوسرے مغنیوں کا گانا سننا ترک کردیا، اور وہ اس کو بے حد چاہنے لگا- خلوت میں اسکی تعظیم وتکریم کرتا رہا- اور اس کی توقیر بڑھاتا رہا، اور جب اس نے سلاطین اور خلفاء کے حالات اور اہل علم کے نوادر میں گفتگو کی تو زریاب کو معلومات کا ایک بحر زخار پایا- امیر اسکی باتوں کو سنکر محو حیرت ہوگیا- کھانے کے وقت زریاب اور اس کے بڑے بیٹے کو امیر اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھاکر کھلاتا- زریاب سے اسکو اسقدر محبت ہوگئی تھی کہ اس کے لیے امیر نے محلسرا میں ایک مخصوص دروازہ بنادیا تھا کہ جس وقت وہ چاہتا زریاب کو اس راستہ سے بلالیتا

زریاب کی مہارت علمی وفنی زریاب کو نہ صرف موسیقی میں دسترس حاصل تھی بلکہ وہ فن نجوم اور جغرافیہ طبعی کا بڑا عالم تھا- چنانچہ تقسیم اقالیم سبعہ، اختلاف طبائع، دریاؤں کے علیحدہ ہونے، شہروں کے بسنے وغیرہ امور کی نسبت بہت وسیع معلومات رکھتا تھا موسیقی میں دس ہزار گانوں کے مقطوعات (اشعار) یاد اور ان کے قسم اس کو ازبر تھے، علاوہ بریں ادب وشاعری میں بھی اسکو بہت دخل تھا، حسن معاشرت عادات رسمیہ سلاطین کی ہمنشینی اور مصاحبت وغیرہ کے آداب اور طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا۔

زریاب کا اندلس میں موسیقی کی تعلیم دینا زریاب سے پہلے بھی اندلس میں موسیقی کا چرچا تھا چنانچہ امیر عبدالرحمٰن الداخل کے عہد میں اور ان کے بعد کے سلاطین اندلس کے درباروں میں موسیقی کا رواج برابر جاری رہا امیر الحکم (اول) کے دربار میں عباس بن نساعی، منصور یہودی، علون، اور زرقون مشہور گویئے تھے- مگر زریاب کے اندلس جانے کے بعد سے موسیقی کا شوق انتہا کو پہنچ گیا اور لوگ اس کے طرز غنا کے ایسے دلدادہ ہوگئے کہ ان اگلے گویوں کو بھول گئے- زریاب کے اندلس

[1] عقد الفرید جلد ۴ ص ۱۱۰ مصر- [2] ابن خلدون نے مقدمہ ص ۴۰۵ میں لکھا ہے کہ امیر الحکم سواری لے کر زریاب کو لینے کے لیے نکلا اور بے انتہا انعام واکرام اور جاگیر دیکر اسے اپنا ندیم خاص بنایا، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ زریاب کے اندلس پہنچنے سے پہلے ہی الحکم کا انتقال ہوچکا تھا۔

پہنچنے سے اس فن نے بڑا فروغ پایا۔ اور لوگ موسیقی کی تحصیل کے لیے اس کے پاس آنے لگے، مورخ مقری نے زریاب کی تعلیم موسیقی سے متعلق حسب ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

اندلس میں ہمیشہ گانا سکھانے کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے مبتدی سے بلند آواز میں اشعار گوائے جاتے تھے اسکی ابتدا البسیط (بے، سے ہوتی تھی اور منیح (سادہ گیت) پر اسکو ختم کیا جاتا تھا۔ یہ زریاب کے طریقہ کی پیروی تھی وہ جب کسی شاگرد کو گانا سکھاتا تو اولاً اسکو ایک گول چمڑے کی گدی پر جسکو مسورہ کہتے ہیں، بٹھاتا اور اگر اسکی آواز بلند ہوتی تو اُسے زور سے آواز نکالنے کو کہتا، اور اگر اسکی آواز پست ہوتی تو اس کے پیٹ پر خوب کس کر پٹی بند ہوتا جس سے اسکی آواز بلند ہو جاتی، اور لاپ نکلنے میں پیٹ نہ پھولتی۔ پھر اگر اس کے دانت ملے ہوئے ہوتے اور وہ اپنا منہ اچھی طرح نہ کھول سکتا یا بولتے وقت دانت بھینچنے کا عادی ہوتا تو اُسے فرمائش کرتا وہ رات کو سوتے وقت تین انگشت کا ایک لکڑی کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا کرے تاکہ اس کے جبڑے کھل جائیں پھر اس شاگرد کی سریلی آواز کا امتحان کرنا چاہتا تو اس سے کہتا کہ وہ اپنی بلند ترین آواز میں "یاحجام" یا "آہ" پرتان لگائے پھر اگر اسکی آواز صاف اور بلند ہے اور تنگ یا دبی ہوئی نہیں ہے، تو معلوم کر لیتا کہ اسمیں گانا سیکھنے کی صلاحیت ہے، ورنہ بصورت دیگر اسکو رخصت کر دیتا۔[1]

زریاب کا کمال فن اور ایجادات موسیقی

فن موسیقی میں زریاب کو یدطولے تھا اس کا اندازہ خود اس کے استاد اسحاق موصلی کے ساتھ گذرے ہوئے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ غالباً اس کے کمال فن کی بنا پر یہ عجیب روایت مقری نے روایت کی ہے، کہ زریاب اس بات کا مدعی تھا، کہ ہر شب کو خواب میں ایک جن اس کے پاس آتا ہے، اور کوئی راگ اسکو سکھا جاتا ہے چنانچہ وہ فوراً نیند سے اٹھ بیٹھتا اور اپنی دو کنیزوں، غزلان، اور ہنیدہ کو پکارتا، وہ اپنا اپنا عود لیے ہوئے آتیں یہ اپنا عود اٹھا لیتا، کوئی گت بجاتا، اس کے بعد کچھ اشعار لکھتا اور پھر فوراً سو جاتا یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس کسی آدمی کو کسی خاص فن سے شغف اور مزاولت ہوتی ہے، تو وہ خواب میں بھی وہی کام کرتا رہتا ہے اور بعض اوقات خواب میں اپنے فن سے متعلق کوئی نئی بات معلوم کر کے اُٹھ بیٹھتا ہے، اور اسکو عمل میں لانے کی تدبیر کرتا ہے، خود اس کا استاد ابراہیم موصلی بھی اسی بات کا مدعی تھا کہ جن اسکو موسیقی کی تعلیم دیتا ہے، بہر حال عقلاً یہ واقعہ مستبعد معلوم نہیں ہوتا، زریاب کے حافظہ کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں، کہ دس ہزار گانوں کے مقطوعات اسکو حفظ تھے، مگر زریاب نے راگ راگنی کے سلسلہ میں کیا کیا اضافے کیے اس کی تفصیل سے ہم محروم ہیں، صرف اسقدر معلوم ہو سکا ہے کہ مشہور اندلسی شاعر و ادیب، ابوالحسن اسلم بن احمد نے اس کے گانوں کو جمع کر کے "اغانی زریاب" کے نام سے کتابی صورت میں قلمبند کیا تھا جو آج مفقود ہے۔[2]

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ اندلس میں زریاب کی موسیقی کا رواج طوائف الملوکی کے زمانہ تک رہا، خصوصاً اشبیلیہ میں اس کا بہت چرچا رہا، اور جب اشبیلیہ کی حالت زوال پذیر ہوئی تو اس فن کے ماہرین وہاں سے نکل کر مغرب و افریقیہ میں پہنچے اور تمام ملک میں پھیل گئے۔[3]

زریاب کو نہ صرف گانے میں کمال حاصل تھا بلکہ ساز بجانے میں بھی وہ یکتائے روزگار تھا۔ جیسا کہ ہم ابتدا میں اسکو خلیفہ بغداد کے دربار میں دیکھ چکے ہیں، وہ اپنے جس مخصوص عود پر گاتا تھا۔ اس کا حال بھی ہم معلوم کر چکے ہیں۔ عام سازوں کے خلاف اس کے عود میں کتنی زائد خوبیاں تھیں، اسی طرح اندلس پہنچکر اس نے اس ساز (عود) میں ایک پانچویں تار کا اضافہ کیا، جو اس کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عود کا مختصر حال بیان کیا جائے۔

اہل عرب کے ہاں گانے کے لیے عموماً سازوں کی نسبت عود زیادہ مستعمل تھا اسی کو بربط، کرینہ اور مزہر بھی کہتے تھے۔ مورخ مسعودی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں عربوں کا گانا بغیر ساز کے ہوتا تھا، پھر جب نضر بن حارث کسریٰ کے دربار میں بمقام حیرہ پہنچا تو وہاں اس نے عود پر گانا سیکھا، اور جب مکہ آیا تو اس نے وہاں کے لوگوں کو سکھا دیا، اس دن سے عرب میں عود کا رواج ہوا[4] لیکن اصفہانی لکھتا ہے کہ سنہ ۶۲ھ میں جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خانہ کعبہ کے تعمیری کاموں کے لیے ایرانی غلاموں کو لائے تو ان کے ذریعہ سے ابن صریج نے عود فارسی (بربط) حاصل کیا، اور یہ پہلا شخص ہے جس نے مکہ میں اس عود پر عربی گانا گایا[5]۔ یہ عود عباسی عہد حکومت کی ابتدائی نصف صدی تک مروج اور مقبول رہا پھر ہارون الرشید کے درباری مغنی زلزل نے "عود الشبوطی" ایک قسم کی مچھلی

[1] اوپر کی تفصیلات مقری جلد ۲ ص ۱۱۰-۱۱۲) سے ماخوذ ہیں [2] معجم الادبا لیاقوت جلد ۲ ص ۲۲۲ و ۶۹ یاقوت کا بیان ہے کہ ابوالحسن اسلم نے زریاب کے ترتیب دیے ہوئے راگوں پر متعدد کتابیں لکھیں [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۵ طبع بولاق، [4] عقد الفرید جلد ۴ ص ۱۳۰ مصر [5] مروج الذہب برحاشیہ ابن اثیر جلد ۱ ص ۲۲۔

"تنبوتی" سے مشابہ ایجاد کیا جس میں اوپر کا حصہ جہاں انگلیاں رکھ کر بجاتے ہیں بہ نسبت اس کے بطن کے زیادہ چوڑا تھا، مگر اس پر پہلے کی طرح وہی چار تار تھے، عود فارسی کے بعد یہی عود زیادہ تر مستعمل رہا۔ بقول مورخین مسعودی و مقری[1] یہ چار تار اخلاط اربعہ[2] کی مناسبت سے رکھے گئے تھے، ان تاروں میں زیر کا تار خلط صفراوی کی مناسبت سے زرد رنگ کا، دوسرا تار جو موٹائی میں دگنا ہوتے کی وجہ سے مثنیٰ کہا جاتا ہے، اور زیر کا دم ہوتا ہے وہ دم (خون) کی مناسبت سے سُرخ رنگ کا۔ تیسرا تار بے رنگ کا یعنے سفید ہوتا ہے جو بمنزلہ بلغم کے ہے، اور مثنیٰ کا دم ہے اس لیے اسکو مثلث کہتے ہیں، اور چوتھا تار سودا کی مناسبت سے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے جسے بم کہتے ہیں، اور یہ عود کے بلند ترین تاروں میں سے ہے، اور مثلث تار کا دم ہوتا ہے یہ چاروں تار چاروں خلطوں کے مقابل اس لیے وضع کیے گئے تاکہ انسانی طبیعتوں کو اعتدال پر رکھیں، اس لحاظ سے بم گویا گرم و خشک بمقابلہ مثنیٰ کے ہے، جو گرم تر ہے، جس سے وہ بم کو مساوی رکھتا ہے جس طرح جسم اخلاط کے اعتبار سے، اب اسمیں ایک چیز یعنے نفس یا قلب کی کمی تھی اور چونکہ وہ دم سے بالکل متصل ہے اس لیے زریاب نے ایک پانچواں تار "مُوی" کے نام سے اضافہ کیا، اس مناسبت سے اس کا رنگ سُرخ رکھا اور اسکو مثلث کے نیچے اور مثنیٰ کے اوپر رکھا۔

اس سلسلہ میں زریاب کی ایک اور ایجاد بھی قابل ذکر ہے، کہ اس نے اندلس پہنچکر عقاب کے پنجہ کے ناخنوں (قوادم) سے عود کا مضراب بنایا، بجائے لکڑی کے مضراب کے اسمیں یہ خوبی تھی یہ وہ سبک ہونے کے لحاظ سے انگلیوں پر ٹھیک بیٹھتا تھا اور بکثرت عود بجانے میں تار بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہتے تھے

زریاب کی تمدنی و معاشرتی اختراعات زریاب نے اندلس پہنچکر وہاں کی طرز معاشرت اور تمدن میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اس کی اختراعات کی فہرست بہت طول طویل ہے جس کو ہم مجملاً مقری سے اخذ کر کے درج ذیل کرتے ہیں۔

۱۔ اوس نے مختلف اقسام کے ظروف اور برتن ایجاد کیے پہلے اندلس میں سونے چاندی کے برتن مستعمل تھے، زریاب نے آکر شیشے کے برتنوں کا استعمال رائج کیا۔

۲۔ طرز معاشرت، ملاقات، اور میل جول میں خوشگوار تبدیلیاں کیں۔

۳۔ پہلے اندلس میں یہ فیشن تھا کہ مرد اور عورتیں بیچ سر میں مانگ نکالا کرتے تھے، زریاب نے بالوں کو کٹوا کر، ٹیڑھی مانگ نکالنے کا فیشن ایجاد کیا یہ طرز اہل اندلس کو بہت پسند آیا اور سب لوگ اسی طرز پر بال بنانے اور مانگ نکالنے لگے۔

۴۔ بغل کی بدبو رفع کرنے کے لیے مردا سنگ (غالباً سنگ جراحت یا چاک مٹی) سے مرتک (غازہ) بنانا اہل اندلس نے اسی سے سیکھا، ورنہ اس سے پہلے امرائے اندلس گلاب اور ریحان کے پھولوں کا سفوف اور اس قسم کی دوسری بعض اشیاء استعمال کرتے تھے، مگر اس سے ان کے کپڑے میلے ہوجاتے تھے اس کے لیے زریاب نے ایک قسم کا نمک تجویز کیا (غالباً سوڈا) جس سے کپڑے صاف ستھرے دھلنے لگے۔

۵۔ سب سے پہلے زریاب ہی نے ہلیون نامی ترکاری کا استعمال بتایا جس کو ان کی زبان میں اسفراج کہتے ہیں، اس سے پہلے اندلس والے اس ترکاری سے واقف نہ تھے یہ اسفراج وہی ایسپیراگس ASPARAGUS ہے جو آج کل اہل یورپ کی بہت مرغوب ترکاری اور جس کے بغیر کوئی دستر خوان خالی نہیں ہوتا، عموماً ڈبوں میں بند ہو کر مختلف ممالک میں بھیجی جاتی ہے۔

۶۔ اندلس میں کئی قسم کے کھانے اور پکوان زریاب کے نام سے منسوب ہیں۔ ایک قسم کا پکوان جس کو نقایا کہتے ہیں وہ زریاب ہی سے منسوب ہے یہ سبز دھنیے کے پانی سے بنتا ہے اور سنبوسہ اور کباب کی طرح بھرا جاتا تھا اسی طرح، ایک پکوان تقلیہ ہوتا تھا، جو زریاب سے منسوب ہے، آج بھی عربی میں اسکو "تقلیہ زرلابیہ" کہتے ہیں جو دراصل زریابیہ کی خرابی ہے ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کی مشہور مٹھائی جسکو جلیبی کہتے ہیں وہ بھی زریاب ہی کی نسبت سے موسوم ہے اور زریابیہ سے بگڑ کر زولابیہ اور جلیبی ہوگئی ہے۔

۷۔ اندلس میں پہلے لکڑی کی چوکیوں (غالباً میزوں) پر کھانا کھایا جاتا تھا زریاب نے اس پر چمڑے کا دستر خوان بچھانے کو رواج دیا، کہ اگر وہ میلا ہو جائے تو ذرا گھسنے سے صاف ہو جایا کرے،

۸۔ ہر موسم کے مطابق کپڑے کا رواج اندلس میں زریاب ہی کی بدولت

[1] نفح الطیب جلد ۲ ص ۹۰۔ [2] مروج الذہب بر حاشیہ ابن اثیر جلد ۱ ص ۲۳

[3] دائرۃ المعارف بستانی جلد ۹ ص ۱۲۱۔

ہوا پہلے وہاں کے لوگ تین مہینوں تک یعنی مہرجان (جسکو وہ عنصرہ) کہتے تھے، اور جو شمسی سال کے ماہ جون کی ۲۴ کے مطابق تھا سے لیکر یکم اکتوبر شمسی تک، سفید کپڑے بلا رنگ کے پہننے کے عادی تھے، اور باقی سال بھر رنگین کپڑے پہننے کا رواج تھا، زریاب نے اس میں حسب ذیل تغیر کیا ہے۔

ا۔ ربیع یا موسم بہار میں رنگین کپڑے، مثل نیم ریشمی، اور حریر کے جبے اور کرتے پہنے جائیں جو بغیر استر کے ہوں۔

ب۔ خریف یا موسم خزاں کے آغاز میں دہاری دار چادریں اور یک رنگے ہلکے، اور سبک کپڑے پہنے جائیں، جو رنگین اور استردار ہوں۔

ج۔ جاڑے کے موسم میں زیادہ گرم اور رنگین کپڑے ہوں، اور بوقت ضرورت ان کے نیچے فر اسے پہنے جائیں

زریاب کا رسوخ اور دخل امیر عبدالرحمٰن کے مزاج میں جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں زریاب کو کمال فن کی بنا پر امیر کے مزاج میں بہت دخل تھا اسی لئے رعایا میں سے، جو لوگ حکمران تک اپنی معروضات پہنچانا چاہتے تھے، وہ زریاب کے نام عریضے لکھ کر پیش کرتے تھے، لیکن اس نے کبھی سیاسی معاملات میں دخل در معقولات نہیں دیا کیونکہ حکومت کے معاملات میں پڑنا، اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں شریک ہونا زریاب جیسے صاحب فن لطیف کے لئے ایک کھلی ہوئی بدمذاقی کا ثبوت تھا۔

زریاب کی وفات اگرچہ زریاب کا سال وفات مقری، یا کسی اور مورخ نے بیان نہیں کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے محمد کے عہد حکومت (۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ) سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زریاب نے عمر طویل پائی، کیونکہ وہ خلیفۃ المہدی عباسی کے جو ۱۵۸ھ میں تخت نشین اور ۱۶۹ھ میں فوت ہوا، غلاموں میں سے تھا، اور مہدی کے عہد سے لیکر امیر عبدالرحمٰن کی وفات تک جو ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی، اسّی برس ہوتے ہیں اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس نے تقریباً اسّی برس سے زائد عمر پائی ہوگی بقول مقری زریاب ۲۰۶ھ میں اندلس آیا، اس حساب سے تقریباً تیس بتیس سال اس نے اندلس میں گذارے۔

اولاد زریاب نے اپنے پیچھے کئی اولادیں چھوڑیں اس کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ عبدالرحمٰن۔ ۲۔ عبیداللہ ۳۔ یحییٰ۔ ۴۔ جعفر۔ ۵۔ محمد ۶۔ قاسم۔ ۷۔ احمد۔ ۸۔ حسن۔ لڑکیوں میں ۱۔ علیہ۔ اور ۲۔ حمدونہ

یہ سب کے سب فن موسیقی کے ماہر تھے، ان میں عبیداللہ سب سے زیادہ ماہر فن تھا اس کے دوسرے نمبر پر عبدالرحمٰن تھا لیکن وہ مغرور اور بد مزاجی کی وجہ سے بہت بدنام تھا، حمدونہ کی شادی وزیر ہشام بن عبدالعزیز سے ہوئی تھی۔

زریاب کی قدر و منزلت اسلامی دنیا کے نامور مشاہیر میں زریاب کا بھی شمار ہوتا ہے اور اگرچہ بغداد سے گمنام حالت میں اندلس چلے آنے کے باعث زریاب کے ذکر سے مشرق قریب کی تواریخ خاموش ہیں لیکن غنیمت ہے کہ المقری کی مبسوط تاریخ میں اسکا تذکرہ موجود ہے۔ اسکی قدر و منزلت ہماری نظر میں اس لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس عہد کا مشہور صناع تھا جسے مغرب کو فنون لطیفہ، تمدن، اور رسم و رواج اور معاشرت کے آداب و طریقوں سے آشنا کیا اور جسکے آثار اب بھی مغربی دنیا کی وضع اور فیشن میں جلوہ گر ہیں بقول مریکن مصنف اسکاٹ مذہب اسلام میں ناموری پرستی اور اشیاء پرستی کی مخالفت ہے ورنہ کسی اور قوم میں زریاب جیسا باکمال پیدا ہوتا تو لوگ اسکے مجسمے تیار کرتے

محسوسات ماہر

از جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری

سے چلے دو قدم اور قیامت اُٹھا دی — ذرا ہنس پڑے اور بجلی گرا دی

خطائے محبت کی اچھی سزا دی — مرے دل کی دُنیا بنا کر مٹا دی

کرم سے مجھے اپنی محفل میں جا دی — جو سچ پوچھئے میری دُنیا بنا دی

بتاؤ کوئی کس کا یہ آستاں ہے؟ — ارے! کس نے یہ میری گردن جھکا دی

یہ کن مست آنکھوں کا آیا تصور! — مرے ہاتھ سے جس نے بوتل گرا دی

غم و درد سے پہلے دل کو بنایا، — جو باقی رہا اس سے دُنیا بنا دی

مجھے کیا خبر ہے شرابِ محبت — کہاں؟ کس طرح؟ اور کس نے پلا دی؟

محبت میں دل نے مرا ساتھ چھوڑا، — بھنور میں مجھے ناخدا نے دغا دی

تری خود نمائی کے قربان جاؤں — مری آنکھ سے میری ہستی چھپا دی

ستمگر کی شانِ تجاہل تو دیکھو — نظر کی خطا، دل پہ تہمت لگا دی

مرے دم قدم سے ہے شاداب ماہر
تغزل کی منزل، تخیل کی وادی

دشمن کا دل

از قلم جناب سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی

(خاص برائے عالمگیر)

گو کہ جنگ عظیم کو ختم ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے اور بہتیرے قصے، ڈرامے، افسانے اس پر لکھے جا چکے ہیں تاہم یہ افسانہ پیشِ ہے جو سر فلپ گبس کے قصے "سنگر من آف شیپ" سے ترجمہ کیا گیا ہے، جو خاص جذبات کا حامل ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے بھی ندرت لئے ہوئے ہے، خاکسار نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس ہو، اور اصل مطلب فوت نہ ہو جائے۔ بعض بعض جگہ میں نے اپنے جذبات کی مدد سے اضافہ کیا ہے فقط ——— (قیس)

جنگ عظیم کو ختم ہوئے دو سال ہو چکے تھے، نفرت کی چنگاریاں مدہم پڑ گئی تھیں۔ خونخوار جذبات آہستہ آہستہ دب رہے تھے، ہر طرف صلح و دوستی کے علم بلند ہو رہے تھے، شکست خوردہ قومیں اپنی کھوئی ہوئی قوت کو حاصل کرتی جا رہی تھیں۔

میں بلغاریہ کے ایک ہوٹل کے بالائی حصہ میں کھڑا سمندر کے تموج کو دیکھ رہا تھا جس کی موجوں نے بہت سارے خون کئے تھے، اور کئی جوانوں کو اپنی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔ میں جس کمرے میں مقیم تھا اسکی دیواروں پر برطانوی بحری افسروں اور ملاحوں کی بے ڈھنگی تصاویر Caricatures اور ڈراونے مناظر اترے ہوئے تھے، جنگ کے زمانہ میں یہاں ایک جرمنی کا بحری دستہ مقیم تھا، ہوٹل کے مالک نے مجھ سے کہا۔ میری بیوی اور ایک بیٹی میرینا جنوبی کمرے میں رہا کرتی تھیں میں اس وقت اپنے کاروبار کے سلسلہ میں انگلستان گیا ہوا تھا۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ میرینا اور لفٹنٹ فریڈرک سے یہیں پر ملاقات ہوئی تھی۔ اور اسی افسر نے یہ تصاویر بنائی ہیں۔ اس نے سگار کی نوک کو کترتے ہوئے کہا۔ "عورت ایک معمہ ہے، میرینا بھی ایک، گہری فطرت کی لڑکی تھی، وہ میری گود میں پلی تھی لیکن میں خود اس کو پہچان نہ سکا تھا۔

وہ ایک طالب علم تھی، جنگ کے آغاز کے وقت ۱۹۱۴ء میں اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، نظر فریب حسن اور مسحر کن اداؤں کو لئے ہوئے اس نے شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھا تھا، اسکول کے اوقات کے بعد وہ ملک کی خدمت کرتی، بجز ایک دو عورتوں کے دنیا اس کے خفیہ کارناموں سے ناواقف تھی، نوجوان سپاہی جب اس کے پاس سے گذرتے، تو بانکپن سے فوجی سلام کرتے اور اپنی جانب ملتفت کرنے کی کوشش کرتے ——— مگر لا حاصل۔ وہ ان کی دشمن تھی اور نفرت کرتی تھی۔

میں ہوٹل کے ایک پوشیدہ تہ خانے میں ایک بوڑھی راہبہ مس کلیار (جس کا اصلی نام کچھ اور تھا) رہا کرتی تھی، اس نے میرینا کو اپنا مرید بنا لیا تھا، اس کے دو بھائی جنگ میں کام آ چکے تھے اس لئے

اس نے ایک روز ہائکی چار کی دعوت قبول کرلی، رسٹورنٹ میں اور بھی جرمن افسر موجود تھے، ان کے علاوہ دو گرفتار برطانوی ملاح بھی تھے جنہیں دشمنوں نے کچھ مراعات دے رکھی تھیں، انہوں نے میرنیا کو ایک دشمن کے ساتھ دیکھ کر نفرت سے دیکھا، ملاحوں نے اس کی اس طرز روش پر ناک بھوں چڑھائی۔ فریڈیک نے چار کے بعد خوب شراب پی لی، اور اس خوشی کے عالم میں چند جرمن افسران کے نام اور اُن کے کارناموں کو افشا کر دیا ——— ہینڈرلین سے ملاقات کراتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے ایلزبتھ نامی جہاز کو ڈبو دیا تھا" پھر کچھ محجوب ہو کر "مجھے یہ سب کچھ تمہیں بتلانا نہیں چاہیئے"

"میں تو ایک طالب علم ہوں مجھے لڑائی بھڑائی سے کیا کام" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ملاتے ہوئے دلربایانہ انداز سے کہا۔ اور فریڈیک کی نگاہیں چکا چوند ہو گئیں۔

تم حد درجہ حسین ہو پیاری لڑکی، تمہارا معصوم اور ننھا دل ان تمام چیزوں سے ناآشنا ہے۔ تمہارے التفات نے جنگ کے خوفناک مناظر پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پھر شائستہ زندگی میں سانس لے رہا ہوں جس کی کارفرمائیاں پھر نظروں کے سامنے ہیں۔ شاید تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جس شب کو وہ توپوں کے منہ میں جانے والا تھا اسی شام کو وہ اس کو راستہ میں ملی، وہ حد درجہ رنجیدہ، غم میں ڈوبا ہوا۔

میں تمہارا شکر گذار ہوں، میرے سوئے ہوئے جذبات تمہاری صحبت میں جاگ اُٹھے تھے تمہارے وجود سے میرا وقت خوب کٹا۔ میں آج رات کے آخری حصہ میں جب کہ تم سو رہی ہو گی، تم سے جدا ہو جاؤں گا ——— شاید ہمیشہ کے لیئے۔ اگر میں واپس نہ آؤں تو اُمید ہے کہ تم ایک شریر جرمن کو یاد کر لیا کرو گی اس لیئے کہ اسے جنگ و جدال سے نفرت تھی۔ اور دنیا کی تمام حسین چیزیں پیاری تھیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"مجھے اُمید ہے کہ تم صحیح سلامت لوٹو گے۔"

اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ساتھ ہی وہ اپنے فرض، کے خیال سے چونک گئی، اس نے اسے خدا حافظ کہا اور ریتہ خانے میں پہنچ کر میڈم کلا تینیر کو اطلاع دے دی۔

وہ ایک ہفتہ میں واپس آگیا، لیکن اس کے ساتھی لڑائی میں کام آگئے اور ان کا نام میرنیا نے فہرست سے قلم زد کر دیا۔ اس چار ماہ کے عرصہ میں اس نے بہت کچھ خبریں بہم پہنچا دیں۔

اس کا ایک شب کا کارنامہ بڑا صبر آزما تھا ——— شام کو فوجی خوب رنگ رلیاں کرتے رہے، بعض ہنس کو در ہے تھے اس لئے کہ شب کے آخری حصہ میں انہیں لڑائی پر جانا تھا۔ مرنے سے پیشتر دو گھڑی کے لیئے خوشیاں منا رہے تھے، اور آنے والی آفتوں کو تھوڑی دیر کے لیئے بھول گئے تھے، بارہ بجے تک اس نے الوداعی گیت سُنے اور سیڑھیوں پر سے اُترنے کی آوازیں سنیں۔ میڈم کلیا سے نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ فوجوں کے کوچ کر جانے کے بعد رات میں کمرے ڈھونڈ ڈالے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی سُراغ مل جائے، یا کوئی خط دستیاب ہو جائے۔ میرنیا کے پاس ایک کمرے کی مشنی چابی موجود تھی جو اُن کے جانے کے بعد بند رہتا تھا۔

جب تمام فضا خاموش ہو گئی، تب وہ زینے پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگی۔ سایہ کیطرح دیوار سے لگی ہوئی، بغلی کمرے میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ سہم گئی ——— پھر جوتوں کی کھٹ کھٹ ——— بہت دور ایک بم پھٹا۔ بندوق کی آواز آئی ——— اس کا کلیجہ منہ تک آگیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کا وقت قریب آگیا ہے۔ پھر موت کی سی خاموشی چھا گئی ہمت کر کے وہ بڑھتی گئی ——— اس کا دل دھڑک رہا تھا، اس قدر کہ اسے صاف سنائی دے رہا تھا۔

دروازہ پر پہونچ کر آہستہ سے چابی قفل میں ڈالی۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ مقفل نہیں کیا گیا تھا۔

وہ سہمی ہوئی اندر داخل ہوئی ——— جان کو ہتھیلی پر لیئے

ہوئے ـــــ اس نے احتیاط سے شمع روشن کی، جو تیز ہوا میں د بار بجھ بجھ گئی، کمرے کی تمام چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں شراب کی بوتلیں اور گلاس اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ نیم سوختہ سگاروں سے فرش میلا ہوگیا تھا ــــ ایک ٹوپی اور ایک چمڑے کی تھیلی لاپرواہی سے چھوٹ گئی تھی، اس نے دھیمی روشنی کی مدد سے تھیلی کو ٹٹولا، ان میں کاغذات تھے ــــ "شاید ان سے سراغ لگانے میں مدد ملے" اس نے دلمیں سوچا، اس نے جلدی سے تھیلی اور چند بکھرے ہوئے پرزے اُٹھا کر اپنے لباس کے اندر چھپا لیے، وہ پیانو کے قریب گئی کسی کے سانس لینے کی آواز سُنائی دی، مارے خوف کے شمع ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور کانچ کے ایک گلاس سے ٹکرا گئی، سونے والا اُٹھ بیٹھا اندھیرے میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا ـ

"کون ہے جلد بتا" ایک کرخت آواز آئی اور وہ اس کے اوپر کھڑا ہوگیا۔

"میں ہوں میرینا" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ چند سکنڈ تک خاموشی چھا گئی، اس نے آواز سے پہچان لیا تھا کہ وہ فریڈرک ہے۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں"۔ "ذرا شمع روشن کر دیجئے"۔ اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ اندھیرے میں اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میرے پاس دیاسلائی موجود ہے" اور اس نے دیاسلائی دے دی۔ اس نے موم بتی روشن کرکے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں"

اسے جھوٹ سے نفرت تھی، لیکن ایسے آڑے وقت میں اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ "ابھی ابھی قریب ہی بم پھٹا۔ اور بندوق کی آواز سُنائی دی۔ اس لیئے میں اپنے بچاؤ کے لیئے تمہارے پاس دوڑ آئی۔

"لیکن میں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی" اس نے شمع کو اس کے چہرے کے قریب لاکر کہا۔ "شاید میں شراب میں مست ہوکر نیند میں چور ہوگیا تھا ــــ میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں ــــ میں تو صلح اور محبت کرنے کے لیئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میں حسن کا پرستار ہوں"

وہ میز کے سہارے سے کھڑا رہا۔

"معاف کرنا خاتون! آج میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ تم بہت کمسن اور معصوم ہو۔ تم ان باتوں سے ناواقف ہو!"

"میرے خیال میں جنگ نے ہم اسکول کی لڑکیوں کو بھی بیدار کر دیا ہے"۔

"اگر یہ خونریزی کا زمانہ نہ ہوتا" اس نے محبت سے بیتاب ہو کر کہا۔ "تو میں تمہارے قدموں پر گر کر محبت کی التجا کرتا۔ اور تم پر قربان ہو جاتا"

"لیکن تم جرمن ہو اور میں بلغیری"

"تاہم ہم انسان ہیں دونوں جواں ہیں۔ دونوں کو لڑائی سے نفرت ہے۔ محبت کو مذہب اور قومیت سے کیا سروکار؟ ہمیں تھوڑی دیر کے لیئے عداوت اور بغض کو دل سے نکال پھینکنا چاہیئے ــــ تمہاری جوانی کا صدقہ میرے حال پر رحم کرو"

"ہوش میں آؤ کیسی بہکی باتیں کر رہے ہو۔" میرینا نے تیزی سے کہا اور وہ دروازہ کی جانب بڑھی۔

"ذرا ٹھہرو" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھ سے خوف نہ کرو اب میرے ہوش بجا ہیں۔ نشہ ہرن ہو چکا ہے۔ البتہ محبت کی شراب سے دیوانہ ہو رہا ہوں۔ لیکن مجھے تمہاری عزت اور حرمت کا بڑا لحاظ ہے۔ میرے ہاتھ قطع کر دے جائیں۔ اگر تمہیں ان سے کوئی ضرر پہنچے ــــ لِللہ ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار اپنے ہونٹوں کو چوم لینے دو اور بس"

"نہیں" اس نے گھبرا کر کہا "یہ نہیں ہوسکتا"

"خیر گالوں کا سہی" "ہرگز نہیں" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھے جانے دو"

"اچھا ہاتھوں کا" ــــ میری پیاری!" آہستہ سے اس نے اپنا گداز ہاتھ اس کیطرف بڑھا دیا۔ اور اس نے دیوانہ وار متعدد بار اسے چوم لیا۔ آنکھوں سے لگالیا۔ "اب مجھے چھوڑ دو"۔ "میں تمہیں نیچے تک پہنچا دیتا ہوں"۔ اس نے کہا اس کی آنکھوں سے محبت کے شرارے نکل رہے تھے۔ شمع اُٹھانے سے قبل اسے اپنی چمڑے کی تھیلی کا خیال

آیا۔ اور ادھر اُدھر ڈھونڈھنے لگا۔

"میری چمڑے کی تھیلی لاپتہ ہے اس میں اہم کاغذات رکھے ہوئے تھے۔" میرینا تو زبر نفرین کر رہی تھی، وہ شرم سے گڑی جا رہی تھی۔"

"شاید کسی سپاہی نے اُٹھالی ہوگی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔ "مگر ڈر ہے کہ کہیں دشمنوں کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔" دشمن کے لفظ پر فریڈرک نے معذرت چاہی۔ مگر اس نے اس مار آستین پر ذرا بھی گمان نہیں کیا۔ وہ حسین ناگن کی زلف گرہ گیر میں پھنس چکا تھا، محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اُسے کمرے تک پہنچا دیا اور "شب بخیر" کہہ کر چلا آیا۔

راحیلہ کی تمام تدبیریں کارگر ثابت ہوئیں۔ ان کاغذات میں ایک نقشہ بھی تھا جس میں نقل و حمل کے راستے اُترے ہوئے تھے ——

"شاباش بیٹی!" اس نے اسکو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تو نے بہت بڑا کام انجام دیا۔ قوم تجھ پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

"ان کاغذات کی مدد سے بعض برطانوی جہاز بچا لیے گئے، اور عین موقعوں پر خطرے کی اطلاعات سے بہت ساری جانیں تلف ہوتے ہوتے بچ گئیں۔"

یکایک میرینا رونے لگی۔ "تم کیوں رو رہی ہو تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو۔" اس نے چاپلوسی کے انداز میں کہا۔

"اب مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی۔ میں دغا بازی کر رہی ہوں —— اس سے جو نہایت شریف اور با اخلاق شخص ہے۔ یعنی لفٹنٹ فریڈرک۔"

"وہ جرمن افسر ہے نادان لڑکی! خدانخواستہ وہی ہماری بربادی کا باعث ہوگا۔"

۵ . . . .

فریڈرک پھر جنگی مہم سے لوٹ آیا۔ لیکن اس کے بشرے اور جسمانی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی صحت جواب دے رہی ہے۔ یکایک ایک روز رات کو پھر اسے حکم ہوا کہ لڑائی پر روانہ ہو جائے۔ اس نے نو بجے میرینا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرینا کو اس کی حالت دیکھ کر تعجب ہوا

اس کا چہرہ بہت غمگین اور اُداس تھا۔ "معاف کرنا" اس نے کہا —— "تمہارے آرام میں خلل انداز ہوا۔ میں پو پھٹنے سے قبل یہاں سے کوچ کر جاؤں گا —— شاید ہمیشہ کے لئے" —— اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

"خدا نہ کرے" اس نے کہا "موت سے اب تک بچوں گا۔ گذشتہ رات میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میری لاش خونخوار موجوں میں تھپیڑے کھا رہی ہے۔ شاید یہ میری موت کی اطلاع ہے۔

"ایسی باتیں نہ کیجئے" اس نے بے اختیار ہو کر کہا "آپ اندر آیئے" وہ ایک مختصر سے خوش وضع کمرے میں داخل ہوا جس کی دیواروں پر اچھی اچھی تصاویر آویزاں تھیں۔ "تم بہت مہربان ہو" لفٹنٹ نے کہا "اور کس قدر سلیقہ مند لڑکی ہو۔" وہ کتابوں کی الماری کے پاس کھڑا ہو گیا "یہ زندگی بھی کس قدر پرکیف ہے۔ کیا میں ان کتابوں کو دیکھ سکتا ہوں صرف چند منٹ کے لیے۔"

ان میں صرف ناولیں ہیں —— شاید آپ کی دلچسپی کی نہ ہوں۔"

لیکن اس نے سلسلے سے دیکھتے ہوئے جیسے ہی ایک ناول نکالی اس کے پیچھے اسکو چمڑے کی تھیلی نظر آئی

"یہ تمہیں کیسے ملی" اس نے بلند آواز میں دریافت کیا۔ "مجھے خوب یاد ہے کہ جس شب کو تم میرے کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور میں نے شراب کے نشے میں اس کے کھو جانے کو اہمیت نہیں دی تھی۔"

لڑکی نے جواباً ایک لفظ نہ کہا۔

"کیا میں یہ یقین کر لوں" اس نے آہستہ سے کہا کہ تم جاسوس عورت ہو۔ اس لیے کہ باوجود تمہیں اس کا علم ہونے کے تم نے میری چیز مجھے واپس نہیں دی اپنے چہرہ ریز حسن کی آڑ میں مجھے اُلو بنا رہی تھیں۔ گویا میں اپنے ملک کا غدار ٹھہرا۔" آخر میں اس کے الفاظ تیز ہو گئے تھے۔ اس نے اس کے چہرے سے تاڑ لیا کہ اسے جرم کا اعتراف ہے۔ ڈر —— شرم —— ندامت سے وہ سرد پڑ گئی تھی۔ معاً وہ مڑا اور اپنا منہ چھپا کر رونے لگا —— وہ اس کے قریب آ کر سینے سے لگ گئی۔

"فریڈرک مجھے معاف کرو" اس نے روتے ہوئے کہا یہ سب کچھ

میں نے اپنی قوم کے بچاؤ کی خاطر کیا تھا۔ میں نے تم جیسے شریف شخص کو دھوکا دیا مجھ پر لعنت ہے —— اب جو چاہے سزا دو میں مجرم ہوں۔ وہ اس کو اپنے سینہ سے لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا تھا —— بے پناہ محبت۔ یہ سمجھا تھا کہ تم معصومیت کا مجسمہ ہوگی۔ تمھارے جاسوس ہونے کا مجھے شائبہ تک نہ تھا۔ میں حسن کے جال میں پھنس کر تڑپ رہا تھا اور تم نے میری کوئی پروا نہ کی، کیا اسی کا نام انسانیت ہے، کیا بلغاری عورتوں کے دل پتھر بن گئے ہیں —— اگر میں چاہوں تو تمہارے خلاف کارروائی کر سکتا ہوں۔ ورنہ میں باغی کہلاؤں گا ——" "غدار" اس نے غصہ سے کہا۔ وہ بے اختیار ہوکر اس سے لپٹ گئی۔ "رحم! رحم!!" دو بار اس کی زبان سے نکلا اور وہ نڈھال ہوگئی۔

"دلبر میں آج لڑائی پر جا رہا ہوں شاید پھر تمہاری صورت نہ دیکھ سکوں، خیر میں تمہیں معاف کرتا ہوں —— میری روح تمہارے لیے، ایک بے وفا محبوبہ کے لیے ہمیشہ تڑپتی رہے گی —— اس نے محبت سے اس کے بالوں کو پیار کیا، اور خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا پیارے خدا حافظ۔ کوچ کے وقت اس نے ایک آواز سنی۔

کئی روز تک وہ اس کے انتظار میں تڑپتی رہی۔ اسے ہمیشہ اپنی جان کا دھڑکا رہتا تھا۔ کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ شاید وہ گرفتار کر لی جائے اور اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی نہ کر دیا جائے فوجی جوتوں کی آواز سے وہ چونک پڑتی تھی

جنگ ختم ہوئی لیکن ایک عرصہ تک اسے فریڈرک کی خبر نہیں ملی۔ اس نے خیال کیا کہ غالباً وہ مر چکا ہوگا۔ یا زخموں سے چور ہوکر اسپتال میں نیم جان پڑا ہو

ایک روز اسے اس کا خط ملا کہ اس کا دایاں ہاتھ ضائع ہو چکا ہے لیکن بائیاں تصویر کشی کے لیے صحیح و سالم ہے۔ میرنیا کے مردہ جذبات میں جان پڑ گئی۔ فریڈرک جیسے شریف شخص سے محبت کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی، اور اس کے ایک ہفتہ بعد جرمنی کلیسا میں ایک بڑے مجمع کے سامنے وہ اس کے پہلو میں دلہن بنی کھڑی ہوئی تھی دونوں ابدی محبت کی زنجیر میں گرفتار ہوگئے تھے۔

غزل

جناب باسط بسوانی

بیخودی میں رازِ الفت اُن پہ افشا کر دیا
آپ میں آئے تو سوچے ہم نے یہ کیا کر دیا

روز کا جھگڑا چکا۔ طے سارا قصہ کر دیا
آپ نے اچھا کیا۔ خونِ تمنا کر دیا

خیر ہم تو ہو گئے بدنام اپنے عشق سے
تجھکو لیکن حسن والے کس نے رسوا کر دیا

یہ کسی سے کیوں بتائیں ہم کہ ہم نے کیا کہا
جس سے شکوہ چاہئے تھا اس سے شکوہ کر دیا

طور والے۔ تیری شانِ خود نمائی کے نثار
کیا تماشا ہے کہ موسیٰ کو تماشہ کر دیا

جان لینا ہی مریضِ غم کے حق میں خوب تھا
تم نے یہ اچھا کیا۔ دراصل اچھا کر دیا

میں ترے رازِ محبت کو چھپاتا ہی رہا
دیکھ افشا ہو گیا۔ یا میں نے افشا کر دیا

داستانِ دردِ دل سن کر کہا۔ آتی ہے نیند
لیجئے اک بات میں طے سارا قصہ کر دیا

کیا بتائیں عشق نے ہم سے کئی کیا کیا سلوک
جو نتیجہ چاہئے تھا وہ نتیجہ کر دیا

تم اٹھے بالیں سے آنکھیں بند کیں بیمار نے
جاتے جاتے کس قیامت کا اشارہ کر دیا

اشکِ حسرت رات دن رویا کئے پوچھا کئے
آستیں میں جذب ہم نے ایک دریا کر دیا

آنکھ پھیری تم نے۔ ابھرے داغِ حسرت قلب کے
دیکھتے ہی دیکھتے کیا دل کا نقشہ کر دیا

ہم کسی سے کیوں بتائیں تم کسی سے کیوں کہو
کوئی کیوں جانے کہ تم نے کیا اشارہ کر دیا

پھر بہار آئی ہوئی سرسبز شاخِ آشیاں
پھر نشیمن پر مرے پھولوں نے سایہ کر دیا

آئینہ رکھا ہے گویا آئینہ کے سامنے
یوں دلِ حیراں کو محوِ روئے زیبا کر دیا

جان دیدی اب انھیں آنے سے کیوں انکار ہے
آج تو بیمارِ غم نے ان کا کہنا کر دیا

خون کے آنسو جو تم روتے ہو باسط رات دن
کیا کسی بیدرد نے خونِ تمنا کر دیا

فلسفۂ حیات

ماہرِ روحانیات سر الیور لاج کا دلچسپ نظریہ

موت بظاہر ایک نہایت ہیبتناک اور یاس انگیز چیز معلوم ہوتی ہے، لیکن میں اسے ہیبتناک نہیں بلکہ دردناک احساس سے تعبیر کروں گا۔ ایک جگہ سے، دوسری جگہ جانے پر بھی انسان کی حالت دردناک، اور دل غم سے بھر جاتا ہے۔ ایک نوجوان سمندر پار جانے کے لیے تیار کھڑا ہے، گو وہ خود غمناک نہیں لیکن اس کے اعزہ اور اقربا سب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، باوجودیکہ اُن کو اس نوجوان کا، ایک شاندار مستقبل سامنے نظر آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ اُمیدیں بھی وابستہ ہیں، کہ سمندر پار ملکوں سے واپس آکر وہ انہیں کے لیے باعث فخر ہوگا۔

جدائی کا احساس روح فرسا ہو لیکن ساتھ ساتھ خوشگوار اُمیدیں بھی، سربستہ ہیں۔

موت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم زندگی کی ماہیت پر غور کریں اور زندگی تو اس قدر ادق چیز ہے کہ قریب قریب حیطۂ الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ لیکن جہاں تک ہمارے ادراک نے کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی صرف طاقت اور حواس کی حدود تک ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو ایک مقصد اور منزل کیطرف راہنمائی کرتا ہے، طاقت اور حواس، صرف اس کے استعمال کی چیزیں ہیں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ زندگی جسد انسانی، اور حواس کے ماتحت ہے، ایک بیج سے ایک تناور درخت، پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ایک درخت کا اُگ آنا اس کی طاقت روئیدگی منحصر ہو لیکن اس درخت کا بے شمار پھلوں سے بار آور ہو جانا ایک اور بات ہے۔

تاثیر حیات سے وابستگی پیدا کرنے کیلیے زندگی کو جسم کی ضرورت تھی؛ جسم کیا ہے؟ اظہار کا ذریعہ۔ یا ایک آلہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ایک مغنی کی روح میں موسیقی کوٹ کوٹ کر بھری ہو لیکن اس کے اظہار کے لیے اسے ایک آلہ کی ضرورت ہے، ایسا ہی تعلق روح کو جسم کے ساتھ ہے

خارجی شکل بھی ایک اہمیت رکھتی ہے، لیکن وہ اہمیت صرف ستر اسی سال یا ایک معین وقت تک محدود رہتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ روح کا رشتہ جسم سے ناگزیر ہے، لیکن وہ عنصر جو روح سے متعلق ہے، اور جس سے انسان کا ارادہ، اُمید، محبت، نفرت، اور اسی قبیل کے دیگر حسیات کو، وابستگی ہے محدود نہیں، جسد انسانی کی ایک حد ہے۔ لیکن روحانی دنیا، غیر محدود ہے۔

اس حقیقت سے بھی گریز نہیں ہو سکتا کہ عالم کُل کی نسبت ہم صحیح، طور پر واقف نہیں، زمین بہت سے سیاروں میں سے ایک سیارہ ہے جس پر حیوانی دنیا قدیم سے ہی موجود تھی اور ان حیوانات کی نقل اُتارتے ہوئے ہم زندگی بسر کرنے لگے اور انہیں کیطرح ہم پر بھی موت چھا جانے لگی۔ ایک لطیف شے کا مادہ سے علیحدہ ہو جانے کا نام موت ہے۔ موت صرف جدائی ہے ——— بالکل نابود ہو جانے کا نام نہیں۔ موت کے بعد جسم کی کیا حالت ہوتی ہے؟ یہ ایک الم انگیز افسانہ ہے۔ درحقیقت جسم سوہانِ روح ہوتا ہے، لیکن ماہرین علم الحیات کی رائے میں تمام جسم پر موت واقع نہیں ہوتی، دماغ اور جسم میں بعض خانے اور حجرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر موت اپنا اثر نہیں کر سکتی، اور وہ لافانی عنصر موت کے بعد کئی شکلوں اور حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، مثلاً ہاتھ پاؤں وغیرہ بلاشبہ گوشت پوست کی فضول سی چیزیں ہیں اور موت کے بعد ان کی وقعت خاک سے زیادہ نہیں رہتی، لیکن تمام جسم پر موت نہیں آسکتی، بلند پایہ شعراء نے بھی اس امر کو محسوس کیا ہے۔

شیکسپیر ــ اس دوشیزہ کو دفن کر دو، لیکن دیکھنا اس کے نازک اور مرمریں جسم سے کلیاں پھوٹ کر باہر نکل آئینگی

غالب ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

موت کا خوف ایک بے معنے چیز ہے، میرا خیال ہے کہ اگر انسان ایک دفعہ یہ سمجھ لے کہ موت مطلق نابود ہو جانے کا نام نہیں تو موت کا احساس ہراس انگیز نہیں رہتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ موت صرف ایک "فراق" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جو لوگ آج تک موت کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ بالکل نابود نہیں ہوئے، لیکن ہمارے اردگرد رہتے ہیں یا جیسے ٹینی سن کہتا ہے۔

"پہلے کیطرح نہیں لیکن حقیقی زندگی ان لوگوں کی ہے"

میں فرانس میں اپنے بیٹے کی قبر پر کبھی نہیں گیا کیونکہ اس نے مجھے کہہ رکھا ہے۔

"میں اپنی قبر میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اور وہاں کبھی نہیں گیا"[1]

اس دنیا میں رہنے والا انسان جس کے دماغ پر صرف یہیں کے احساسات حاوی ہوچکے ہیں، ان باتوں کا یقین نہیں کرے گا جہاں تک مجھے روحوں سے معلوم ہوسکا ہے، ان کے جسم بھی ہیں لیکن وہ جسم ضائع ہونے والے نہیں، جیسا میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ کہ جسم صرف اک آلہ اظہار ہے اسی طرح وہ بھی اپنے جسموں کے ساتھ اپنی زندگی کا اظہار کرتے ہیں، اور وہ اپنی اس حیات ثانی میں مسرور و شاداں ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں۔

"ہم دوبارہ واپس نہیں آئیں گے ہم نے ایک بہتر زندگی کو پالیا ہے"

مکان اور زمان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس بات کا صرف خدا کو ہی ہے کہ وہ کب تک اسی طرح رہیں گے، لیکن یہ بات مجھ پر ثابت ہوچکی ہے کہ وہ ہمارے اردگرد ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے احساسات ان کو نہیں پا سکتے تارے دن کے وقت انکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں، لیکن بالکل نابود نہیں ہوجاتے، اور ہمارے احساسات اسی بچے کیطرح ہیں جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ تارے دن میں کبھی نابود ہوجاتے ہیں اور سر شام پھر لوٹ آتے ہیں۔

زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے، کائنات اس قدر لافانی اور غیر متغیر ہے کہ موت اسمیں انقلاب پیدا نہیں کرسکتی، موت انفرادی نکتہ نگاہ سے درست ہے اور اسی حیثیت سے فرد اپنے میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے، اس پر موت واقع ہوئی تو اسکا نظریہ حیات بدل گیا۔ ایک زندگی سے نکل کر دوسری زندگی میں چلا گیا، جسے ہم عالم عقبے کہتے ہیں۔ لیکن اس کائنات اور عالم کل میں سے وہ باہر نہیں گیا کیونکہ کائنات صرف ایک ہے اور بس، فرق صرف اتنا ہے کہ اس حیات فانی میں رہ کر ہم حیات ثانی سے آگاہ نہیں ہوئے، اور موت کے بعد اس سے آگاہ ہوجاتے ہیں، اور ممکن ہے حیات ثانی کی وساطت سے وہ لوگ اور بہت سی زندگیوں سے متعارف ہوجاتے ہوں گے، جن کا ہمیں گمان بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہمارا جہان تو اس قدر تنگ ہے، کہ "بیضہ مور" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا۔ "ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ لوگ ابھی تک زندہ ہیں" یقین جانئے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں کیونکہ میں ان سے باتیں کرتا ہوں جیسا کہ تم آپس میں بات چیت کرتے ہو

آپ کسی دور دراز ملک میں کسی شخص سے ٹیلیفون پر بات کرتے ہیں حالانکہ آپ نے آج تک اسکی شکل نہیں دیکھی۔ اور نہ ہی اس کے جسم کے متعلق کوئی اندازہ کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ ٹیلیفون پر بول رہا ہوتا ہے اس لیے آپ کو اس کے بقید حیات ہونے کا یقین ہوتا ہے میں ان لوگوں سے باتیں کرتا ہوں اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ وہ لوگ نابود نہیں ہوئے۔

زندگی کوئی ختم ہوجانے والی چیز تو ہے نہیں ایک روپ ختم ہوا تو دوسرے کی ابتدا ہوئی، ذرائع اظہار تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مہیجات بدلتے رہتے

[1] مصنف مضمون ہذا سر اولیور لاج ایک شہرہ آفاق ماہر علم الحیات ہے اور اپنی زندگی میں ہی ایک عیر فانی خراج تحسین وصول کرچکا ہے، بڑھاپے میں اس کا ایک جواں عمر بیٹا ریمنڈ اسے داغ مفارقت دے گیا اس کو اپنے بیٹے کی جسمانی موت کا ایک حد تک افسوس تو ہوا لیکن اس کے مرنے کے بعد جلدی ہی وہ بشاش نظر آنے لگا۔ کیونکہ بقول اس کے ریمنڈ ہر روز اسے ملنے آتا ہے اور اس کی روح سے وہ باتیں کرتا ہے اس پر اس نے "ریمنڈ" ایک ضخیم کتاب بھی قلمبند کی ہے۔

ہیں لیکن نقوش حیات وہی ہیں جو پہلے تھے۔

ہم ایک ہی کنبے کے آدمی ہیں، اور ہماری محبت کبھی برباد نہیں ہوسکتی، اور محبت سے ہی یہ ہولناک خلیج پر ہوسکتی ہے، کیونکہ محبت کی شدت متوفی کو اس کے عزیز کے زیادہ نزدیک لیجاتی ہے۔

زندگی کی اہمیت اس قدر گراں پایہ ہے کہ ہم یہاں سے اپنے ساتھ دوسری دنیا میں سوائے زندگی کے اور کچھ نہیں لیجاسکتے آئندہ زندگی میں مسرور یا مغموم رہنا، ہماری اس جہاں کی ذمہ داری پر منحصر ہے خواہ وہ اوج اعلےٰ پر پہنچ جائے یا اسفل ترین گہرائیوں میں ڈوب جائے، یہ ضمناً یہاں آگیا تھا اس کی بحث اختلافات کے تحت میں ہوگی۔

جسم بذات خود ایک بالکل بے حقیقت سی شے ہے اگر ہم سائنس کی دوربین سے اس پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ جسم "کہکشاں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، بظاہر ایک مادہ اور وزنی چیز نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بھی نہیں۔

ہم آپس میں محبت کرتے ہیں اور جبتک کائنات باقی ہے کئے جائیں گے ہمارا رشتہ غیر منقطع ہے، ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، تو موں نے اس احساس کو پالیا ہے، کیونکہ بین الاقوامی اتحاد دن بدن ترقی پذیر ہے اور اس سے ایک غیر فانی محبت کا سلسلہ قائم ہوجائے گا۔

زندگی ایک عظیم ترین تجربہ ہے، اور اس تجربہ گاہ میں ایک مقصد ہمارے پیش نظر ہے، اپنی امیدیں خاک میں نہ ملنے دو۔ آئندہ دنیا کے متعلق تنگ خیال ہونا انسانیت پر ظلم ہے، اپنے ہی کو کڑا کر کے بلکہ ہنستے ہوئے آئندہ زندگی میں قدم رکھو۔

آپس کی محبت خوف کو نزدیک نہ آنے دیگی اپنے میں تکمیل محبت کرلو اور دنیائے مستقبل کے لیئے خندہ پیشانی سے تیار ہوجاؤ۔ کیونکہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ زندگی اس زندگی سے بہتر اور زیادہ وسیع ہوگی، لیکن محبت شرط ہے ——— عشق لازوال کائنات پر حکومت کر رہا ہے اور عشق لازوال ہی خدا کا دوسرا نام ہے جسکی ستارے اور سیارے بھی پرستش کرتے ہیں۔

(خلیل بی اے)

جذبات فضا

از جناب سید دل محمد صاحب فضا جالندھری

سرگرمِ ستم ہو کر دم بھر میں فنا کرنا — ان شوخ نگاہوں کو آیا بھی تو کیا کرنا

اندازِ تبسم سے بجلی تو گرا ڈالی — اب عشق کی دنیا میں محشر نہ بپا کرنا

دنیائے محبت میں ناکامِ تمنا ہوں — ہے کوششِ بے حاصل اب میری دوا کرنا

بیرحم حسینوں کی فطرت ہی میں داخل ہے — مانوسِ جفا ہونا۔ مایوسِ وفا کرنا

نظروں میں ابھی تک ہے وہ لطف کے پردے میں — اے شوخ مرے دل کو پہلو سے جدا کرنا

ہر گل میں تری بو ہے ہر شے میں ترا جلوہ — زیبا نہیں پھر تجھکو نظروں سے حیا کرنا

محشر میں کوئی مجھ سے کہتا ہے بصد منت — بہلائے شکایت کو اس وقت نہ وا کرنا

بیمارِ محبت کی چھوٹی ہوئی نبضیں ہیں — اب وقتِ دوا گزرا لازم ہے دعا کرنا

پیدا ہو فضا دل میں کیفیتِ یکسوئی

اک ساغرِ مے پی لو پھر ذکرِ خدا کرنا

مرزا برجیس قدر

قدرت کا ناٹک اپنے دلفریب پردوں میں کبھی ایسی دل خوش کن تصویر دکھا دیتا ہے جو انسانی امکان سے خارج ہوتی ہے۔ کون کہتا تھا کہ جب اودھ کا آخری بادشاہ اپنی بدنظمی کے سبب ملک و مال سے دست بردار ہو کر اور اپنی خوشی سے انتظام ملک گورنمنٹ برطانیہ کے حوالے کرکے چلا جائیگا، اور ایک محفوظ جگہ میں امن وامان کی زندگی بسر کریگا، تو اس کی اولاد سے کسی کو تخت سلطنت پر بیٹھنا نصیب ہوگا، اور پھر ہزیمت کا تلخ مزہ چکھنا ہوگا، آخری تاجدار اودھ نے اپنے زمانے میں لکھنؤ کو پرستان بنا دیا تھا۔ کوٹھی بادشاہ منزل ایسی آراستہ کی کہ جنت کا نمونہ معلوم ہوتی تھی، ایک سڑک دریائے گومتی کے کنارے کنارے ہوا خوری کے لیے بنوائی جس کے دونوں طرف قندیلیں اور بلوری کنول روشن تھے۔ "قیصر باغ" کی کوٹھی میں لاکھوں روپیہ صرف کیا۔ اور جس زمین پر عمارت بنوائی رعایا کو راضی کرکے اور قیمت دیکر حاصل کی —— "معشوق منزل" ایسی دلکش بنوائی کہ لوگ دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے اس کے بعد بوجہ بدانتظامی کے سلطنت اودھ زوال پذیر ہوئی اور ساتویں فروری ۱۸۵۶ء کو شامل انگریزی ہوگئی۔

۱۰ اپریل ۱۸۵۷ء چھاؤنی لکھنؤ میں ایک واقعہ پیش آیا، اس زمانے میں چھاؤنی "منڈیاؤں" میں تھی، ڈاکٹر ویلر نے ایک شاہی مریض کو ایک دوا دینا چاہی، اور اس کے اطمینان خاطر کے لیے پہلے اس دوا میں سے کچھ چکھ لیا۔ سپاہی ہندو مذہب کا آدمی تھا اس نے کہا صاحب ہم تمہاری جھوٹی دوا نہ کھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اردو سے ناواقف، اشاروں میں کہتے تھے۔ "ہم نے خود تمہارے سامنے یہ دوا کھائی اب تم کو کھانے میں کیا عذر ہے" سپاہی نے دوا نہ کھائی اور پامر صاحب اڑتالیسویں پلٹن کے کرنیل سے اس بات کی شکایت کی کہ ڈاکٹر صاحب ہمارا دھرم ناس کرنا چاہتے ہیں۔ کرنیل صاحب نے کہا نہیں، یہ بات نہ تھی، مگر سپاہیوں نے اس غصہ میں ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ میں آگ لگا دی۔ اور اس کے بعد تیرہویں رجمنٹ کے پیادہ نے چھاؤنی کو پھونک دیا۔ مگر کوئی مجرم معلوم نہ ہوا۔ اس کے بعد واٹس صاحب ساتویں پلٹن کے افسر کو معلوم ہوا کہ نئی بھرتی کے سپاہی کارتوس قدیم کو کاٹنے میں عذر کرتے ہیں، صاحب نے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ یکم مئی کو پھر سپاہیوں نے عذر کیا اس عدول حکمی پر بہت سے سپاہی قید ہو گئے دوسرے دن کپتان والش صاحب اور بارلو صاحب لین میں آگئے اور ہر ایک کمپنی سے پوچھا۔

"تمکو کارتوس کاٹنا منظور ہے یا نہیں" سب نے انکار کیا صاحب بہادر نے رات کو اس پلٹن کی نگہبانی کی، اور مقدمے کو دوسرے روز پر ملتوی کیا تیسری تاریخ کو گرانڈ کمپنی کے ہتھیار بند سپاہی عذر پر آمادہ ہوگئے اور قتل و فساد کرنے لگے۔ موتی باغ کی چھاؤنی میں جو ہوا آخر حکام عالیمقام کے حسن انتظام سے یہ آتش فرو ہو گئی، لیکن اس شکایت نے دوسرے مقامات پر اپنا پورا اثر کیا اور دہلی و میرٹھ کے غدر کی افسوسناک خبریں لکھنؤ میں آنے لگیں حکام نے حفظ ماتقدم کے لیے اعلان نافذ کئے، چیف کمشنر اودھ نے لکھنؤ کے قلعہ کو از سر نو آراستہ کیا، اور امام باڑہ نواب آصف الدولہ کو خالی کرا کے قلعہ بنا لیا۔ دمدمہ بندی شروع ہوئی۔ مینا بازار کے تمام مکانات منہدم کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی، چار ہزار فوج جدید بھرتی کی گئی آخر مئی ۱۸۵۷ء کی تیسویں تاریخ کو آتش فتنہ جاگ اٹھی، انگریزی فوج نے باغیوں کو "سیتاپور" تک بھگا دیا، اور جنگی قانون جاری کیا۔ دوبارہ باغیوں کی فوج چھنٹ میں جمع ہو کر لکھنؤ میں داخل ہوئی اور شہر میں بہت لوٹ مار کی، پولیس بھاگ گئی۔ آخر تمی اور نادری پلٹن باغیوں کی شریک ہو گئیں۔ احمد اللہ شاہ نے اپنے انتظام سے شہر میں تھانہ مقرر کئے۔ اور اعلان کیا کہ رعیت اطمینان سے آباد ہو۔ شہدوں نے بھی "مچھی بھون" کے سامنے اپنا مورچہ قائم کیا۔ قلعہ "مچھی بھون" کی سرکاری فوج نے سرنگ اڑا دی۔ اور خود قلعہ سے نکل کر "بیلی گارد" میں چلی گئی، قلعہ باغیوں کے قبضہ میں آگیا، اب باغیوں کو یہ فکر

ہوئی کہ سلطنت اودھ کا کوئی وارث صاحب تاج و تخت بنایا جائے تو اس کے حسن انتظام سے اودھ میں امن و امان قائم ہو۔ ابھی سلطنت اودھ کے ایک وارث کے نصیب میں کچھ دنوں کی سلطنت لکھی ہوئی تھی۔ راجہ جیپال سنگھ نے یہ صلاح دی کہ شاہ اودھ کا ایک فرزند شہزادہ مرزا برجیس قدر رمضان علی خاں نامی حضرت محل سے ہے اسکی عمر تخمیناً دس برس کی ہے۔ اسکو بادشاہ اودھ بنانا چاہیئے۔ باغی فوج کے افسران حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور مرزا برجیس قدر کو مسند نشینی کے لیئے طلب کیا حضرت محل غریب کا اسوقت بجز ممو خاں داروغہ، ٹھاکر پرشاد دیوان، اور غلام حضرت اتالیق مرزا برجیس قدر کا کوئی شریک حال نہ تھا ان سب سے مشورہ کیا صلاح یہ ٹھہری کہ باغیوں سے انکار کرنے میں جان کا خوف ہے ناچار تن بہ تقدیر ان کی درخواست منظور کرلی اور بتاریخ بارہویں ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق پانچویں جولائی ۱۸۵۷ء رسم مسند نشینی عمل میں آئی افسران فوج نے موافق قاعدہ شاہی کے، مرزا برجیس قدر کو مسند نشین کیا سلامی کی توپ سر ہوئی اہل عملے نذریں پیش کیں، متوسلان قدیم شاہی دربار میں طلب ہوئے شرف الدولہ محمد ابراہیم کو خلعت نیابت عطا ہوا تو وہ رونے لگے اور عرض کی کہ یہ خلعت نہیں ہے کفن ہے۔ مشیر الدولہ مہاراج بال کرشن کو عہدہ دیوانی عطا ہوا منشی غلام حضرت اتالیق کو عہدہ کا غذات پیشی مرحمت ہوا۔ داروغہ ممو خاں آلات حرب کی تیاری پر مامور ہوئے، شہر میں امن و امان کے اشتہارات جاری ہوئے کچہریاں قائم ہوئیں، راجہ ہرپرشاد خیرآباد کے ناظم مقرر ہوئے، راجہ شیو ناتھ سنگھ سنڈیلہ کے ناظم مقرر ہوئے، چودہری منصب علی سلطانپور کے ناظم مقرر ہوئے، راجہ دیبی بخش ناظم گونڈہ دہرایچ ہوئے، چودہری حشمت علی ناظم سنڈیلہ ہوئے رعایا سے زر مالگذاری وصول کیا گیا۔ مرزا علی رضا بیگ کوتوال شہر مقرر ہوئے شرف الدولہ غلام رضا علی خاں، امجد علیشاہ کا چیلا دربار میں طلب ہوا اور انتظام رسد رسانی اسکے سپرد ہوا۔ یوسف خاں کلکٹر مقرر ہوا امروز دولت سحر شاہی دربار میں افسران فوج کی کونسل ہوتی تھی اور احکام نافذ ہوتے تھے جو کوئی شخص مشتبہ یا مخبر ثابت ہوتا تھا اسکو گولی ماردی جاتی تھی آخر یہ دستور کونسل کے خلاف ٹھہرا۔ سات مہینے تک مرزا برجیس قدر بادشاہ نے لکھنؤ میں سلطنت کی۔ آخر فوج انگریزی لکھنؤ میں اسقدر جمع ہونے لگی۔ کہ باغیوں کو تاب مقاومت نہ رہی تو سپاہ نے مشورہ کرکے مرزا برجیس قدر بادشاہ اودھ اور ان کی والدہ کو پالکی میں سوار کرکے حسین آباد کیطرف منتقل کردیا سولہویں مارچ ۱۸۵۸ء کو مرزا برجیس قدر معہ اپنی والدہ کے ریاست "محمود آباد" میں بھیجدیئے گئے، پھر "نانپارہ" میں آئے اور وہاں سے چند معاونین کے ہمراہ "ڈیوگڑھ" میں داخل ہوئے۔ ہرمنجن سنگھ والی نیپال کے بھانجے نے مرزا برجیس قدر سے ملاقات کی آرزو ظاہر کی جو بخوشی منظور کیا اور چند افسر اسکی استقبال کو بھیجے ہرمنجن سنگھ نے بعد ادائے رسم تعظیم و تکریم نامہ والی نیپال پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ "آپ نیپال میں داخل ہو کر انگریزوں سے صلح کرلیجیے"

مرزا برجیس قدر نے سفیر نیپال کو خلعت مرحمت فرمایا اور اپنی کچھ فوج کو انگریزی فوج کی مدافعت کی غرض سے چھوڑ کر آپ معہ جملہ اراکین کے نیپال کیطرف روانہ ہوئے، ایک مہینے کی مسافت طے کی تھی، کہ ایک دریا پر لشکر خیمہ زن ہوا، یہ لوگ عبور دریا کی فکر میں تھے کہ جنگ بہادر جو اس مقام کا حاکم تھا ان کو دیکھ کر واپس گیا اور اپنے مقام پر پہنچ کر لکھ بھیجا کہ اس طرف آنا مناسب نہیں ہے یہ سن کر سب کو فکر پیدا ہوئی آخر ممو خاں کی صلاح ہوئی کہ بٹول کیطرف چلنا چاہیئے۔ سب نے اتفاق کیا۔ بٹول پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ انگریزی فوج تعاقب میں آرہی ہے۔ حضرت بیگم صاحبہ نے بدری سنگھ سپہ سالار نیپال کو خط لکھا کہ تمہاری "عملی کی ہمکو خبر نہ تھی، ہمارے تعاقب میں انگریزی فوج آرہی ہے اسوقت تو اپنا قول پورا کرو اور ہماری کمک کو فوج بھیجدو"

اس نے پھر مثل سابق کے فوج بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اور چند ماہ تک امیدوار رکھا، جب انگریزی فوج پہاڑی کے قریب پہنچ گئی تو نیپالیوں نے مرزا برجیس قدر کو لکھ بھیجا کہ

"اگر جان کی امان آپ چاہتے ہیں تو دیوگڈھ میں قیام کیجیے اور فوج کو پہاڑی کے نیچے اُتر جانے کا حکم دیجیے۔ اگر معہ فوج پہاڑی پر آئیے گا تو گویا اعلان جنگ ہوگا" اس وعدہ خلافی سے فوج نے سبق حاصل کیا اور صلاح یہ ٹہری کہ اب نیپال سے مخالفت کا موقعہ نہیں ہے، کیونکہ ہم سب کو برجیس قدر کی زندگی عزیز ہے۔ سب نے بخوشی مرزا برجیس قدر اور بیگم کو نیپال روانہ کیا اور آپ فوج انگریزی کا مقابلہ کرکے اپنی جانوں کو بیکار تلف کیا۔ آخر مجبور ہو کر آپ بھی پہاڑی پر چڑھ گئے اور پہاڑی،

فوج کا محاصرہ کرلیا۔ پہاڑیوں نے مجبور ہوکر فوراً صلح کرلی۔ رسنہ یجری او حضرت محل سے کہا کہ آپ مع پانچسو فوج کے کوٹ جدید میں قیام کیجے مرزا برجیس قدر کوٹ جدید میں داخل ہوئے جنگ بہادر والی نیپال نے دعوت کا زر نقد روانہ کیا، بادشاہ نے بھی خلعت بیش قیمت عطا فرمایا کچھ مدت تک یہ سب لوگ کوٹ جدید میں تکلیفیں اُٹھاتے رہے اور آب وہوا کی ناموافقت سے بہت سے لوگ مرگئے اور بہت سے متوسلان سلطنت انگریزوں سے جاملے تو جنگ بہادر نے برجیس قدر کے ایک معزز عہدیدار کو طلب کیا برجیس قدر خود بہ نفس نفیس اسکی ملاقات کو گئے اس نے ایک کوس کے فاصلے سے اُن کا استقبال کیا اور نہایت تعظیم سے اپنے گھر لے گیا اور کرسی دی۔ برجیس قدر نے فرمایا۔ "ہمارے بزرگ اعلیٰ سیر وشکار کی غرض سے تمہارے ملک میں ہمیشہ آتے رہے اور کوہی حاکموں کو خلعت سے سرفراز فرمایا گئے، ہم اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں، اور گردش فلک سے تمہارے ملک میں آئے ہیں اب تمکو ہماری

الغرض اس جواب سے بیگم بہت مایوس ہوگئیں اور مدت تک نیپالیوں اور فوج انگریزی سے ان کا لشکر لڑتا رہا اور سب لوگ غربت کی تکلیف اُٹھا اُٹھاکر قتل وغارت ہوئے۔ آخر مرزا برجیس قدر نیپال میں مقیم ہوگئے اور آخر وقت کلکتہ میں آکر انتقال فرمایا، اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ زبردستی کا بادشاہ سات ماہ تواسے سایہ میں سلطنت کرکے عمر بھر غربت نصیب رہا۔ اور اسی غربت میں انتقال کیا۔ دس برس کے سن میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ سات کے بعد خانہ بدوش شہر درشہر آوارہ گرد ہوئے، نیپال کے مصائب جھیلے۔ آخر بعد خرابی نیپال میں قیام کی صورت نکلی، چالیس برس تک پہاڑی زندگی قبول کی، آخر وقت میں باپ کی، زیارت کو کلکتہ آئے اور وہیں انتقال کیا۔

حقیقت میں اگر باغی فوج برجیس قدر کو زبردستی کا بادشاہ نہ بناتی تو اس پروردۂ ناز ونعم کی اسطرح مٹی خراب نہ ہوتی۔

دشمن

حضرت دعاؔ ڈبائیوی

آ۔ اے مرے دشمن تجھے سینے سے لگا لوں ۔۔۔ دل میں تجھے رکھ لوں تجھے آنکھوں پہ بٹھا لوں
برہم ہو اگر مجھ سے تو سو بار منا لوں ۔۔۔ الفت میں تری سارے زمانے کا مزا لوں
جو عیب ہیں مجھ میں وہ بتا دیتا ہے مجھ کو ۔۔۔ تو وہ ہے رہِ راست دکھا دیتا ہے مجھ کو

طعنوں نے ترے خلق کو خود دار بنایا ۔۔۔ معیارِ بد و نیک زمانے کو سکھایا
فطرت نے تری جوشِ عمل سب کا بڑھایا ۔۔۔ گرویدۂ احساں ہے ترا اپنا۔ پرایا
آگاہ زمانے کو کیا سود و زیاں سے ۔۔۔ مخلوقِ خدا چونک پڑی خوابِ گراں سے

احباب نے دھوکے میں ہمیشہ مجھے رکھا ۔۔۔ واقف ہی برائی سے نہ ہونے دیا اصلا،
پردہ مرے عیبوں پہ ہر اک حال میں ڈالا ۔۔۔ موقع نہ ملا مجھکو سنبھلنے کا ذرا سا،
دشمن کی ملامت نے بڑا کام سنبھالا ۔۔۔ ڈوبی ہوئی کشتی کو مری آ کے اچھالا

دشمن کی ملامت کا اگر خوف نہ ہوتا ۔۔۔ ہمت سے کوئی کام بھی ہوتا نہ بشر کا
جو عزم بھی کرتا وہی رہ جاتا ادھورا ۔۔۔ باتوں سے کہیں جوشِ عمل ہوتا ہے پیدا
دشمن کے کچوکوں کا اثر لیتا ہے انساں ۔۔۔ جو کام نہ ہو جن سے وہ کر لیتا ہے انساں

رہنے کا طریقہ ہمیں دشمن نے سکھایا ۔۔۔ دنیا میں سمجھ سوچ کے رہنا ہمیں آیا،
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ذرا بھی نہ چھپایا ۔۔۔ دھوکے میں نہ رکھا ہمیں ہر راز جتایا
پردے میں عداوت کے محبت نظر آئی ۔۔۔ دشمن میں ہمیں دوست کی صورت نظر آئی

یہ راز سمجھ میں مری مطلق نہیں آیا ۔۔۔ انسان کی آنکھوں پہ عجب پڑ گیا پردا
دشمن سے عداوت کا سبب کچھ نہیں کھلتا ۔۔۔ ہے لائقِ تعریف ہر اک فعل عدو کا،
جو کام صفائی سے کرے دوست وہی ہے ۔۔۔ آگاہ برائی سے کرے دوست وہی ہے

دشمن کو اگر دوست بنائے ہوئے رکھتا ۔۔۔ دنیا میں کسی بات کا رہتا نہیں کھٹکا،
ہو جاتا ہے انسان کو پھر تجربہ ایسا، ۔۔۔ دنیا میں دعاؔ وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتا
دشمن کی عداوت سے سبق پاتا ہے انساں
لگ جاتی ہے ٹھوکر تو سنبھل جاتا ہے انساں

"تماشا"

"تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے، جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں مگر آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونی حادثے کا پیغام لا رہی تھیں، سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبتناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو آج سے کچھ عرصہ پیشتر لوگوں کے ہجوم سے پُر ہوا کرتے تھے، اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سونے پڑے تھے۔۔۔۔ شہر کی فضا پر ایک پراسرار خاموشی مسلط تھی، بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد شہر کی خاموش و پرسکون فضا سے سہما ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا مجھے آپ سکول کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا! آج سکول میں چھٹی ہے"

"ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائیگا اُسے سخت سزا دیجائیگی۔

"وہ اطلاع دینی بھول گئے ہوں گے"

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہوگی۔؟

"ہاں ہمارا دفتر بھی آج بند ہے۔

"چلو اچھا ہوا۔۔۔۔ آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنونگا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے ان کے سر سے گزر گئے، خالد ان کو دیکھ دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے پھرتے ہیں وہ اُن کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آ کر بولا۔

"ابا مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے آپ ان کے چلانے والوں کو کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گذرا کریں۔"

"خوف!۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد"

"ابا، یہ جہاز بہت خوفناک ہیں، آپ نہیں جانتے یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولے پھینک دیں گے۔۔۔ ۔کل صبح ماما جی جان سے کہہ رہی تھی کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں، اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی تو یاد رکھیں، میرے پاس بھی ایک بندوق ہے۔۔۔۔ وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجھے دی تھی۔

خالد کا باپ لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنسا۔ "ماما تو پاگل ہے میں اس سے دریافت کروں گا کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے۔۔۔۔ اطمینان رکھو وہ ایسی بات ہرگز نہ کر سکیں گے"

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا، تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے۔۔۔۔ کاش انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جبکہ ایک ننھا بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے۔ جس سے خالد کو دہشت ہو۔

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دیکر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا رہا تھا، کہ خادم ایک دہشتناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں لہٰذا یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

خالد کا باپ یہ سنکر بہت خوفزدہ ہوا۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ فضا کا غیر معمولی سکون طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندہیوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کی پیش خیمہ تھی۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہوگا؟ - یہ خالد کے باپ کیطرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا، مگر پھر بھی سارا شہر کسی نہ معلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے بھی تبدیل کرنے نہ پایا تھا کہ طیاروں کا شور بلند ہوا وہ سہم گیا —— اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور وغل سُنکر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑ آیا اور انہیں غور سے دیکھنے لگا تاکہ وہ جس وقت گولے پھینکنے لگیں تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گرا دے —— اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ و استقلال کے آثار نمایاں تھے جو کہ حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں پکڑے ایک جندی سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اس چیز کو جو اسے عرصے سے خوفزدہ کر رہی تھی مٹانے پر تلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کچھ چیز گری جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کیطرح اُڑنے لگے اُن میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہوا اوپر گیا اور وہ کاغذ اُٹھا لایا۔

"ابا جی - ماما سچ مچ جھوٹ بک رہی تھی جہاز والوں نے گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔

خالد کے باپ نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا تو رنگ زرد ہو گیا —— ہونے والے حادثے کی تصویر اب اُسے عیاں طور پر نظر آنے لگی اس اشتہار میں صاف لکھا تھا کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اسکی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو نتائج کی ذمہ دار خود رعایا ہو گی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشاں دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے؟"

"خالد، اس وقت تم جاؤ! —— جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو!"

"مگر اس پہ لکھا کیا ہے۔"

"لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشہ ہو گا، خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"تماشا ہو گا! —— پھر تو ہم بھی چلیں گے نا؟ -

"کیا کہا؟"

"کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے؟"

"لے چلیں گے —— اب جاؤ جا کر کھیلو۔"

"کہاں کھیلوں؟ —— بازار میں آپ مجھے جانے نہیں دیتے۔ ماما مجھے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آجکل یہاں نہیں آتا۔ کھیلوں تو کس سے کھیلوں —— شام کے وقت تماشہ دیکھنے ضرور چلیں گے؟"

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا، اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا، جس کی کھڑکیاں بازار کیطرف کھلتی تھیں، کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کیطرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں، مگر آمد و رفت جاری ہے —— (لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے) وہ سخت حیران تھا کہ دو تین روز سے دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لئے اسنے اپنے ننھے دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اس تماشا دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں اب اس نے خیال کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہو گا جس کے لئے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا اور وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب اس کا ابا اُسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گذرتا گیا —— وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا، خالد اس کا باپ، اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کیطرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے —— ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔

تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کیطرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اسقدر کہہ سکا ـــ "گولی ـــ"

خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود اسکی چھاتی میں گولی اتر رہی ہے

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی اُنگلی پکڑ کر کہنے لگا۔ "ابا جی چلو چلیں تماشا تو شروع ہو گیا ہے۔"

"کونسا تماشا؟" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح جہاز بانٹ رہے تھے ـــ کھیل شروع ہو گیا ہے تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"ابھی بہت وقت باقی ہے، تم شور مت کرو ـــ خدا کے لئے اب جاؤ۔ ماما کے پاس جا کر کھیلو۔"

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانے کیطرف گیا۔ مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشستگاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کیطرف دیکھنے لگا۔

بازار آمد و رفت بند ہو جانے کیوجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا ـــ دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دیتی تھیں چند لمحات کے بعد اُن چیخوں میں کسی انسان کی دردناک آواز بھی شامل ہو گئی۔

خالد کسی کو کراہتے سُنکر بہت حیران ہوا ابھی وہ اس آواز کی جستجو کے لیے کوشش ہی کر رہا تھا کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا جو چیختا چلاتا، بھاگا چلا آ رہا تھا

خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا۔ اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا ـــ اسکی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا جس سے فوارہ خون نکل رہا تھا۔

یہ سماں دیکھ کر خالد بہت خوفزدہ ہوا بھاگ کر اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "ابا، ابا بازار میں ایک لڑکا گر پڑا ہے ـــ اسکی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کیطرف گیا اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔

بادشاہ کے خوف سے اُسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اُٹھا کر سامنے والی دکان کے چبوترے پر لٹا دے ـــ بے ننگ

وبرگ افراد کو اٹھانے کے لیئے حکومت کے ارباب حل وعقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں، مگر اس معصوم بچے کی نعش جو انہی کے تیغ ستم کا شکار تھی، وہ غنچہ یوداجو انہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا، وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے انہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی، کسی کے دل کی راحت جو انہی کے جور واستبداد نے چھین لی تھی، اب انہی کی تیار کردہ سڑک پر ـــ آہ موت بھیانک ہے مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔

"ابا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"

"خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا تو وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی جب کہ ایک دفعہ قلمتراش کی نوک چبھنے سے اسے تمام رات نیند نہ آئی تھی اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اسمیں شدت کا درد ہے ـــ یکلخت وہ رونے لگ گیا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر اُسکی والدہ دوڑی آئی اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی۔

"میرے بچے رو کیوں رہے ہو؟"

"امی اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے۔"

"شرارت کی ہو گی اس نے"

"خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سن چکی تھی۔

"مگر سکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں۔ لہو تو نہیں نکالتے" خالد نے روتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا۔

"چھڑی زور سے لگ گئی ہو گی"

"تو پھر کیا اس لڑکے کا باپ سکول میں جا کر اس استاد پر خفا نہ ہو گا۔ جس نے اس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سرخ کر دیئے تھے تو ابا جی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا کر شکایت کی تھی نا؟"

"اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے"۔

"اللہ میاں تنے بھی بڑا ؟"

"نہیں اُن سے چھوٹا ہے !"

"تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا۔"

"خالد اب دیر ہو گئی ہے چلو سو رہیں"

"اللہ میاں میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اس لڑکے کو پیٹا ہے، اچھی طرح سزا دے اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے ——— میں نے پہاڑے یاد نہیں کئے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے ——— اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں تو یاد رکھیو میں بھی تم سے نہ بولوں گا۔

سوتے وقت خالد دل میں دعا مانگ رہا تھا ۔

(سعادت حسن منٹو)

بادۂ حافظ

جناب مولانا کفیل احمد صاحب غازی پوری

حُسن کو بے حجاب ہونا تھا — کچھ نہ کچھ انقلاب ہونا تھا
دل کو میرے خراب ہونا تھا — ہاں مگر کامیاب ہونا تھا
اصل حاصل ہے ذوقِ بیداری — نغمۂ بے رباب ہونا تھا
ہوش و عرفاں مآل ہستی ہیں — مستِ جامِ شراب ہونا تھا
کھل ہی جاتی حقیقتِ عالم — مرکزِ اجتناب ہونا تھا
شورشوں میں جمالِ ہستی ہے — واقفِ اضطراب ہونا تھا
سایہ و جلوہ کیا دلِ مضطر؟ — "محور" آفتاب ہونا تھا
جام و ساغر کی نسبتیں کیسی؟ — بس مجسم شراب ہونا تھا
فرقِ احساس ہے حجابوں سے — بے نیازِ نقاب ہونا تھا
مقصدِ زندگی مسرت ہے — غرقِ حُسن و شباب ہونا تھا
خود اچھلتا اچھال کر ساغر — کیف کو بھی شراب ہونا تھا
مرگِ احساس ہے سکوں کوشی — گرۂ اضطراب ہونا تھا
نسبتِ حُسن کا یہ مطلب ہے — سایہ کو آفتاب ہونا تھا
کھل نہ جائے فریبِ نیرنگی — چشمۂ بے سراب ہونا تھا
کس لئے یہ کرم نما باتیں — اک مسلسل عتاب ہونا تھا
شورشِ عشق بھی نہیں بس میں — کیا یہی انقلاب ہونا تھا

غرقِ حیرت نہ ہو سکا حافظ
اور بھی بے حجاب ہونا تھا

برادری سے خارج

شادی کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی تھیں۔ رام چرن نے تمام برادری میں نیوتہ دیا۔ لڑکی کا بیاہ ہے آپ سب لوگ شریک ہوں لیکن شادی ہوئی اور پھر رات کو برات جو دوسرے گاؤں سے آنا تھی آگئی مگر گاؤں کے ایک دو آدمیوں کے علاوہ اور کوئی شریک نہ ہوا۔ رام چرن نے سب کچھ دیکھا تھوڑا بہت مطلب بھی سمجھا۔ مگر منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔

بارات دوسرے دن رخصت ہوگئی اور رام چرن خوش تھا کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔ وہ آرام سے نیم کے نیچے چارپائی پر پڑا حقہ پی رہا تھا کہ گاؤں کے نائی نے دروازے پر آواز دی۔

"بھیا رام چرن جی۔ دن چھپے چودھری کی چوپال پر پنچائت ہے وقت پر آجانا—"

رام چرن نے ہاں تو کہدی مگر دل دھک دھک کرنے لگا کہ یہ آج یکایک پنچائت کی طلبی کیسی۔ خدا خیر کرے۔ دن چھپتے ہی وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا چوپال کی طرف چلدیا۔ قریب قریب ساری برادری جمع ہوچکی تھی اس کے وہاں پہونچتے ہی پنڈت دیو کی ناتھ کھڑے ہوئے۔

"سجنو! آپ سب کو آج جس وجہ سے تکلیف دی گئی ہے اس کو آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ رام چرن جی نے اپنی لڑکی کا جو بیوہ ہوچکی تھی کل دوسرا بیاہ کردیا ہے میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ شاستروں کی رو سے انھوں نے ایک مہا پاپ کیا ہے۔ جس دھرم میں شوہر کا رتبہ دیوتا کے برابر ہو جس دھرم میں شوہر کے مرنے پر استری کو ستی ہونا لازم رکھا گیا ہو کیا وہ کبھی بیوہ کے دوسرے وواہ کی اجازت دے سکتا ہے۔ ستی کی رسم قانون نے بند کردی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بیوہ کا دوسرا وواہ جائز کردیا ہے۔ رام چرن جی آپ نے اپنے پوتر دھرم کا نشٹ کیا ہے؟ آپ کے اس گناہ کی پراشچت بھی نہیں ہوسکتی۔ کہئے آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "دھرم کے نشٹ کرنے والے پاپی سے کیا پوچھنا اس کو گاؤں سے باہر نکالدو۔"

کسی اور نے کہا۔ "کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے ہی پر نہیں بلکہ ساری برادری پر لگانے والے کی یہ سزا ہے کہ منہ کالا کرکے اور گدھے پر سوار کرکے باہر نکالدو۔"

رام چرن نے سب کچھ سنا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ مگر ضبط کرکے کہا۔

"بھائیو، میں نے جو کچھ کیا وہ فرض سمجھ کر کیا۔ چودہ برس کی لڑکی جس نے شوہر کا منہ تک نہ دیکھا ہو۔ جس نے اپنے پران ناتھ کی چوکھٹ پر قدم تک نہ رکھا ہو۔ بیوہ ہوگئی۔ کیا میں اس کو ہمیشہ یوں ہی بٹھائے رکھتا۔ بونہی اس کی ساری زندگی برباد کردیتا۔ کیا یہ گناہ نہ ہوتا۔ ضرور ہوتا اور اس سے بڑا بہت بڑا۔ جو آپ لوگ مجھ پر لگا رہے ہیں۔ اور کون جانتا ہے کہ اگر میں اس کو یوں ہی بٹھائے رکھتا تب بھی برادری مجھ کو طعن وتشنیع سے چھوڑ دیتی۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے میں جانتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کے جو جی میں آئے کیجئے۔"

تھوڑی دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں اور اس کے بعد پنڈت دیوکی ناتھ نے کھڑے ہوکر کہا۔ "رام چرن جی پنچائت کے فیصلے سے آپ برادری سے خارج کئے گئے آج سے آپ ہمارے لئے اچھوت ہیں۔"

اچھوت۔ نجس۔ ناپاک کے شور میں وہ خاموش اٹھا اور گھر واپس آگیا ضبط اب قابو سے باہر ہوچکا تھا آتے ہی چارپائی پر گر پڑا آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "ہے ایشور یا تو مجھے ان پاپیوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت دے یا پھر میری زندگی لے لے۔"

پھول کنور نے جو دور سے شوہر کو آتے اور چارپائی پر گرتے دیکھا تو دوڑ کر نزدیک آئی اور کہا۔ "پران ناتھ کیوں خیر تو ہے۔ رو کیوں رہے ہو؟"

رام چرن نے سر جھکائے ہی جواب دیا۔ "وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ برادری نے ذات سے خارج کردیا۔"

پھول کنور کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تن کر بولی۔ "تو پھر کیا ہوا۔ خارج کردیا تو کیا کریں۔ اگر وہ ذات والے ہیں۔ نام والے ہیں تو ہوا کریں۔ میرے

کیا دیدیتے ہیں۔ پران ناتھ کیوں دشواش کرتے ہو"۔

اتنے میں نو برس کی لڑکی روتی ہوئی آئی۔ ماں نے پوچھا۔ کیوں ری شیاما کیا ہوا؟"

اس نے روتے ہوئے کہا ـــــ مجھے کیلاش نے مارا۔ میں بھیا کے لئے مٹھائی لینے گئی تھی۔ میں نے کہا لڈو دیدے۔ میرے انگلی لگانے پر اس نے تھال پھینک دی۔ مجھے تھپڑ مارے اور کہا۔ اچھوت۔ شودر کی بچی۔ انگلی لگا کر سارے تھال کو نجس کر دیا۔ جا۔ چل یہاں سے دور ہو ـــــ"

رام چرن سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے لاٹھی کو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمت، میری لڑکی پر ہاتھ اٹھایا ابھی نبٹ لیتا ہوں سب سے۔"

مگر جلد ہی غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ساری برادری کا مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا۔

وہ پھر لیٹ گیا۔ پھول کنور نے لاکھ کہا۔ "تھال لاؤں کچھ کھا پی لو"۔ مگر اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

صبح ہوئی۔ سارا زمانہ جاگ اٹھا۔ مگر رام چرن ابھی تک سو رہا تھا۔ پھول کنور نے جا کر پیر ہلایا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ سارا بدن ٹھنڈا ہو اکڑا ہوا ہے اور منہ پر بھی نیلے نیلے دھبے ہیں۔ گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھا۔ مگر وہ ان کا دشوار حیات پاکر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو چکا تھا۔ صرف اتنا منہ سے نکلا "ہے برادری کے لوگ! میرا گھر ناس کر کے تجھے کیا ملا"۔ اور غش کھا کر گر پڑی۔

غلام قادر۔ فرید

WEST INDIA
ROYALS
USE ALL OVER THE WORLD
No 800
34/0
No 799
32/0
No 796
32/0
No 795
25/-
30/-
طلب فرمائیں ویسٹ انڈیا واچ کمپنی چاندنی چوک دہلی
WEST INDIA WATCH CO.
CHANDNI CHOWK DELHI.

محبوبہ سے خطاب

(از ایم۔ اے شکور "شاما" کرنولی)

میری جان! میری زندگی سے بدرجہا عزیز محبوبہ! ایک روز میں تیرے در پر ——— ہاں تیرے آستانے پر اپنی محبت کا ثبوت دینے ——— اپنا رازِ دل کہنے ——— شاید اپنی آرزؤں اور اُمیدوں کو تجھ سے بیان کرکے اُن کو پورا کرنے کی التجا لے کر سر جھکائے کھڑا تھا!۔ مگر تو نے اے میری حسین محبوبہ مجھے بے نوا گدا سمجھ کر ٹھکرا دیا۔ اور بے مایہ فقیر سمجھ کر دھتکار دیا!

مگر کیا کہیں عاشق نامراد بھی ہمت ہارتا ہے؟

اے محبوبہ ——— میری نادان اور بھولی بھالی محبوبہ میں نے ——— ہاں تیرے جاں نثار عاشق نے ایک شام تجھے اپنی محبت کا ثبوت دیا ——— اپنا رازِ دل کہا ——— اور اپنی آرزؤں اور دیرینہ اُمیدوں کو تجھ سے بیان کرکے اُن کو پورا کرنے کی التجا کی اور تو نے ——— اے میری عزیز ترین محبوبہ خود تو نے اُن کو پورا کیا۔ مگر تجھے خبر تک بھی نہ ہوئی۔ شاید تجھے گمان تک بھی نہ ہوا ہو!

میں نے کیا کیا؟

پھول کے حسن میں اپنی جوانی اور اس کے تناسب کو رعنائی بنا کر سمو دیا!

اس کی پنکھڑیوں میں اپنے جسم کے عضو عضو کو رنگ گل بنا کر چھپا دیا اس کی بھینی بھینی مہک میں اپنی پریشان روح کو بسا دیا اور اس کو خون جگر سے رنگ کر تیرے چمن کے ایک نازک اور خوش نما پودے کو رونق بخشتا رہا! یہ کس طرح ———؟ تو مجھ سے نہ پوچھ اور جاننے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ کیا کوئی ایسی بات بھی ہے جو عاشق نامراد کے لیے محال اور ناممکن ثابت ہو؟

تو سیر گل کے لیے چمن میں آئی اور میں نے ——— ہاں تیرے جاں نثار نے اس پھول کی صورت میں تجھے اپنی طرف کھینچا۔ تو دوڑتی ہوئی آئی! یہ تھا میری محبت کا ثبوت! ——— تیرے عاشق نے اپنی محبت کا ثبوت یوں دیا تھا۔

تو خاموش کھڑی ہوئی اس گل کو دیکھتی رہی ——— نہیں نہیں ——— میں اپنا رازِ دل کہہ رہا تھا اور تو ہمہ تن گوش سُن رہی تھی ——— اس طرح میں نے تجھے اپنا پورا پورا رازِ دل سُنا دیا!

پھر اپنی وہ آرزوئیں اور وہ اُمیدیں جو میں نے تجھ سے وابستہ کی تھیں، ایک ایک کرکے بیان کر دیں۔ اور ان کے پورا کرنے کی التجا کی۔ تو نے اے محبوبہ فوراً مجھے اس پودے سے الگ کرکے اپنے نازک ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی طرح ——— ہاں ہاں اسی طرح! اے میری جان تو نے میری محبت سے معمور التجا قبول کی!

تو مجھے اس ——— پھول کو جس کی خوشبو میں میری پریشان روح پوشیدہ تھی اپنی ناک سے لگا کر سونگھنے لگی تو میں نے تیرے نرم اور نازک ہونٹوں کے سینکڑوں بوسے لے لیے۔ اور سانس ہی کے ذریعہ میری روح تیری رگ رگ میں پہنچ گئی ——— اے میری محبوبہ تو نے ——— تو خود نے دل میری دیرینہ آرزوئیں پوری کیں۔!

پھر تو نے مجھے ——— اس پھول کو اپنے عنبرین بالوں میں لگا لیا اے میری جان! میں نے ساری رات تیرے وصال کا لطف حاصل کیا! اور میری بھولی بھالی محبوبہ تجھے خبر تک بھی نہ ہوئی ——— شاید تجھے گمان تک بھی نہ ہوا ——— ہاں یونہی میری نادان محبوبہ

ساغرِ سرشار

از جناب سرشار صاحب کمنڈوی

سامنے بٹھلا کے پہروں اُنکی صورت دیکھنا
دیکھنا! سرشار کا ذوقِ محبت دیکھنا

خود انہیں سمجھا رہا ہوں شرطِ اُلفت دیکھنا
کسقدر ہوں صاف باطن پاک طینت دیکھنا

جلوہ گاہ حسن ہے آرامگاہِ عاشقاں
آگ کے بستر پہ شانِ استراحت دیکھنا

ہوگیا محفل میں آخر موجبِ افشائے راز
اُنکی جانب وہ مرا ساعت بساعت دیکھنا

پرسشِ بیمارِ ہجراں کے لئے جاتے تو ہو
نبض کی رفتار، اندازِ طبیعت دیکھنا

آگیا لب تک بالآخر کم نگاہی کا گلہ!
خامکارانِ محبت کی حماقت دیکھنا

وقت آخر بھی ہے رنگیں مزاجی کا لحاظ
دیکھنا اور مسکرا کر میری حالت دیکھنا

ہاتھ سینے پر، غبار آلود آنکھیں، دم بخود
اُنکی صورت دیکھنے والے کی صورت دیکھنا

اب ہوائے یاس کے جھونکے ہیں اور دنیائے دل
گل ہُوا ہی چاہتی ہے شمعِ حسرت دیکھنا

اے نگاہ فتنہ پرور اے جمالِ برق پاش
رنگ محفل دیکھکر میری بھی حالت دیکھنا

پوچھنے بیٹھا ہے کوئی آج وجہ دردِ دل
یہ نئی افتاد یہ تازہ مصیبت دیکھنا

زندگی اور ایک بربادِ وفا کی زندگی
یوں ہوا کرتی ہے پامالوں کی شہرت دیکھنا

دل ہلا جاتا ہے گورستاں کا عالم دیکھکر
کیا اسی منظر کو کہتے ہیں قیامت دیکھنا

پیار کی باتیں بھی اب ہوتی ہیں اُنکو ناگوار
یہ ہجومِ ناز و طغیانِ نزاکت دیکھنا

چھیڑ دینا اس ستم ایجاد کا ذکر جمیل
ہو اگر سرشار کا جوشِ عقیدت دیکھنا

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی - ادبی - (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۳ فہرست مضامین عالمگیر ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء نمبر ۵

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

شفا منزل

عالمگیر کے ناظرین کرام کے لئے یہ خبر بہت ہی باعث مسرت ہوگی کہ عالمگیر کے معاون خصوصی حضرت شفاء الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی مدظلہ العالی کی جو عظیم الشان بلڈنگ زیر تعمیر تھی وہ اب مکمل ہو چکی ہے اور اس قابل دید بلڈنگ کا نام شفا منزل تجویز ہوا ہے۔ حضرت شفاء الملک مدظلہ کا مطب بھی شفا منزل میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ہم بصمیم قلب شفا منزل کی تکمیل پر حضرت ممدوح کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء

جو گذشتہ مہینے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو چکا ہے عالمگیر کے ناظرین کرام نے اسے بہت پسند فرمایا ہے اور یہی پسندیدگی کارپردازان عالمگیر کی کوششوں کا صحیح معاوضہ ہے۔

حشر اُردو کالج

حضرت آغا حشر مرحوم کی ادیبانہ قابلیت، شاعرانہ فوقیت اور علمی فضیلت روز روشن کی طرح ظاہر ہے مرحوم کی وفات حسرت آیات سے بزم علم میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے اس کے پُر کرنے والا مستقبل قریب میں شاید نہ مل سکے۔ ہیں جہاں حشر کی موت خون رلوا رہی ہے وہاں ہمارے غمگین دل میں اس امر سے مسرت کی جھلک بھی پیدا ہو رہی ہے کہ اہل ملک مرحوم کی جلیل القدر علمی و ادبی خدمات کی یاد زندہ رکھنے کی فکر میں ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ کی یادگار قائم کرنے کا مسئلہ زیر غور ہے اس خواہش کو مظاہرہ عمل بنانے کی غرض سے بعض حلقوں میں انتہائی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے ہم اس تجویز کا بصد شکریہ خیر مقدم کرتے ہیں لیکن جہاں تک یادگار حشر کی نوعیت کا مسئلہ ہے اس کا حل زیر بحث تجویزوں سے بہت زیادہ غور و فکر کا محتاج ہے۔ جس طرح حشر کی خدمات زندہ جاوید ہیں اسی طرح ان کی یادگار بھی مفید اور نتیجہ خیز ہونی چاہیے ہمارے خیال میں اس مقصد کی تکمیل حشر اُردو کالج کے قیام کے بغیر ناممکن ہے۔ پنجاب نے اُردو کی ترقی و فلاح کا جو بوجھ عرصہ سے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے اس سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے ایک مفید اور زندۂ جاوید اقدام کی ضرورت ہے اور اس اقدام کی عملی صورت "حشر اُردو کالج" کے لباس میں ظاہر ہو اس کالج کا طریقہ تدریس اور نصاب تعلیم اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ زندہ دلان پنجاب بالخصوص اور دوسرے صوبوں کے ہمدردان اُردو بالعموم ہماری استدعا پر غور فرمائینگے۔ اگر مجوزہ یوم حشر کے پروگرام میں اس کام کے متعلق سرمایہ کی فراہمی میں انتہائی کوشش کی جائے تو موقع سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کا اظہار ہو سکتا ہے، ہمیں امید ہے کہ "حشر اُردو کالج" کے قیام میں حکومت کا شعبہ تعلیم بھی امداد و اعانت سے دریغ نہیں کریگا۔ کیونکہ حکومت نے اُردو کے متعلق جو غفلت اختیار کر رکھی ہے اس کی تلافی کے لئے یہ بہترین موقع ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت کو تلافی مافات کی طرف متوجہ کرنے کے ذرائع موثر اور زور دار ہوں۔ ہم اس کام کے لئے ہر ممکن خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جو حضرات اس تجویز سے متفق ہوں وہ ہم سے خط و کتابت کریں تاکہ مختلف افکار و آراء کی روشنی میں کوئی صحیح پروگرام مرتب ہو سکے

آہ! مولانا ممتاز علی مرحوم

شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی گذشتہ ماہ حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اس جہان سے رخصت ہو گئے مرحوم کا وجود پنجاب کی علمی دنیا کیلئے غنیمت تھا آپ اُردو زبان کے جلیل القدر ادیب تھے "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے ذریعے سے آپنے صنف نازک اور نونہالان قوم کی ذہنی اصلاح اور اخلاقی تہذیب کا کام جس سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا وہ آپ کی علمی فضیلت پر روشن شہادت ہے علاوہ ازیں آپ متعدد درسی اور اخلاقی کتابوں کے مصنف تھے دار الاشاعت پنجاب آپ کی مصنفانہ سرگرمیوں کا عملی مظاہرہ ہے مرحوم اگرچہ سرسید مرحوم کے ہم مسلک دوستوں میں سے تھے تاہم زہد و تقویٰ اور مذہب پرستی کے اعتبار سے آپکے خیالات و مشاغل میں طرز قدیم کی جھلک غالب تھی ہم سید صاحب کی جدائی کو استادان ادب کی جماعت میں ایک ناقابل تلافی کمی سے تعبیر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سید امتیاز علی صاحب تاج اور سید حمید علی صاحب سے متوقع ہیں کہ وہ اپنے باپ کی درخشاں روایات کو زندہ رکھیں گے۔ حافظ محمد عالم (مدیر)

خلافت عباسیہ پر ایک طائرانہ نظر!

از

مولانا شبیر مارہروی

ایران کے شاہان صفوی بھی عباسیہ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں جن کا سلسلہ عباس اول (سنہ ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۶ء) سے عباس سوئم تک (سنہ ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء) پہنچتا ہے لیکن اس لقب سے وہ خلفائے بغداد زیادہ مشہور ہیں جو رسول مقبول کے عم محترم عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ خلفائے راشدہ اور خلفائے امیہ کے زمانے میں اس خاندان کے لوگ ممالک مفتوحہ کے ہر گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ اور رسول مقبول کی قرابت کے باعث خاص احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں کے بڑے بڑے قابل لوگ خراسان میں رہتے تھے جو ایک ایرانی صوبہ تھا اور موجودہ صوبہ خراسان سے بہت بڑا تھا۔ رفتہ رفتہ عباسیوں کو خود اپنی خلافت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں انھیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد سے بہت کافی مدد پہنچی جو مشرقی ممالک میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ عباسیوں نے علویوں کی امداد سے ایرانیوں اور ان عربوں پر جو مشرقی ممالک کی افواج میں تھے کافی اثر پیدا کر لیا خلافت امیہ کی تباہی میں سب سے زیادہ ہاتھ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کا تھا۔ ان کی وفات کے بعد جو سنہ ۱۲۴ھ اور سنہ ۱۲۶ھ (مطابق سنہ ۷۴۲-۴۳ء) کے درمیان واقع ہوئی تھی عباسیوں کا سردار ابراہیم مقرر ہوا تھا جو روز بروز امیوں کا خوفناک و طاقت ور ترین دشمن ہوتا چلا گیا۔ ابھی تک تمام کارروائیاں اور سازشیں خفیہ ہوتی تھیں لیکن رمضان سنہ ۱۲۹ھ مطابق جون سنہ ۷۴۷ء میں علی الاعلان خراسان سے خلافت امیہ کے خلاف بغاوت کی گئی اور رفتہ رفتہ اس نے زبردست طاقت حاصل کر لی۔ خلیفہ کی فوجوں کو شکست ہوئی اور چونکہ قدرت خود امیہ کے خلاف تھی عباسیوں کی قوت اور حصول مقاصد میں اضافہ ہوتا رہا۔ مروان ثانی (خلیفہ امیہ) نے سنہ ۱۳۰ھ مطابق سنہ ۷۴۸ء میں اس میں شک نہیں کہ ابراہیم کو قید کر لیا لیکن اب ابراہیم کی قید کچھ مفید نہ ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے خاندان میں بہت سے ابراہیم پیدا کر دیئے تھے چنانچہ خود ابراہیم کے دو بھائیوں ابوالعباس اور ابوجعفر نے اپنے گروہ کی قیادت شروع کر دی اور فتح کوفہ کے بعد ابوالعباس نے سنہ ۱۳۲ھ مطابق سنہ ۷۴۹ء میں خود اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور مروان اپنی بہادری کے باوجود جمادی الثانی سنہ ۱۳۲ھ مطابق جنوری سنہ ۷۵۰ء میں مارا گیا۔ ابوالعباس نے اپنا لقب "السفاح" اختیار کیا جس کے معنی ظالم یا خونریز کے ہیں اور اس نے امیہ خاندان کے ایک ایک بچہ کو بیدردی کے ساتھ قتل کر کے اس خاندان کا نام مٹا دینے کا تہیہ کر لیا لیکن ان میں سے ایک عبدالرحمن بن معاویہ کسی نہ کسی طرح بچ کر اندلس پہنچ گیا جہاں اس نے امیہ خاندان کی ایک دوسری عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔

سفاح کے بعد اس کے جانشین بھائی ابوجعفر المنصور نے اپنا دارالخلافت بغداد کو بنایا اور اس طرح مرکز سلطنت اور مشرق کی جانب آ گیا۔ سلطنت عباسیہ نے علم و حکمت کی ترقی میں جو حصہ لیا وہ حقیقتہً اسی کا کام تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے نامی خلفاء گزرے ہیں۔ ہارون اور مامون الرشید اسی خاندان کے خلفاء تھے جن کی اولوالعزمیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ سلطنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے مغربی حصے سے افریقہ کے مغربی گوشہ تک پھیل گئی اور اس کے زوال کا

ایک باعث یہ بھی تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کا انتظام کچھ آسان کام نہ تھا نتیجہ جا بجا بغاوتیں رونما ہونی شروع ہوئیں - احمد بن طولون نے جو ۲۵۴ھ مطابق ۸۶۸ء سے مصر کا گورنر تھا بغاوت کی اور شام تک اپنے قبضہ میں کر لیا اس میں شک نہیں کہ طولون خاندان کا قبضہ ۳۰ سال سے زیادہ نہ رہ سکا لیکن آئندہ چل کر بہت جلد مصر نے بہت جلد عباسیہ خلافت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا

اس کے علاوہ خلیفہ المعتصم باللہ (۲۱۸–۲۲۷ھ مطابق ۸۳۳–۸۴۲ء) کے ایک خطرناک عمل نے سلطنت کو کمزور کرنے میں خاص حصہ لیا یعنی اس نے غیر ملکی ترکوں پر خاص عنایات کر کے انہیں کثرت سے اپنی فوجوں میں بھرتی کیا جو روز بروز قوی اور قابو سے باہر ہوتے رہے حتیٰ کہ ۲۹۶ھ مطابق ۹۰۸ء میں خلیفہ المقتدر کو مجبور ہو کر اپنے محافظ دستہ کے خواجہ سرا سردار مونس کو امیر الامرا کا خطاب دیکر اسے غیر محدود اختیارات دینے پڑے۔ ترک جسے چاہتے تھے خلیفہ بناتے اور جسے چاہتے معزول کر دیتے۔

خلفائے عباسیہ کا اقتدار اور بھی خطرہ میں پڑ گیا جب کہ فاطمی میدان میں آئے بغرض کہ اب عباسی خلفاء کی یہ حیثیت تھی کہ کبھی سلجوق کے اثر میں اور کبھی دوسرے کے حتیٰ کہ ۴۴۷ھ مطابق ۱۰۵۵ء میں ترکوں کی قوت کم ہو جانے پر عباسیوں کو اطمینان نصیب ہوا لیکن اب ان کی حکومت محدود تھی بغداد اور اس کے قرب و جوار پر ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں مغلوں نے ہلاکو خاں کی معیت میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور آخری خلیفہ عباسیہ المستعصم باللہ کو قتل کر ڈالا۔ کچھ عباسی چھپ کر مختلف اکناف کو نکل بھاگے ان میں سے کچھ مصر پہنچے جہاں مصر کے مملوک سلطانوں نے ان میں سے ایک کو المستنصر باللہ کے لقب سے خلیفہ بنایا۔ قاہرہ کے خلفاء کو بجز دینی اقتدار کے اور کسی قسم کا اقتدار حاصل نہ تھا۔

۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں ترکی سلطان سلیم نے مملوکوں کا خاتمہ کر کے مصر پر قبضہ کر لیا اور عباسی خلیفہ المتوکل کو اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ جہاں اس نے خلافت سلطان سلیم کے سپرد کر دی اور خلافت عباسیہ کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد تقریباً چار سو سال تک خلافت ترکوں میں رہی۔

شبیر، مارہروی

تجلیات!

جناب مولانا حسرت صاحب موہانی بی۔ اے

وفا تجھ سے اے بیوفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تری آرزو ہے اگر جرم کوئی
تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

وہ مجھکو برا جانتے ہیں تو جانیں
میں اس پر بھی ان کو بھلا چاہتا ہوں

تجھے خیل خوباں سے اے جانِ خوبی
جدا جانتا۔ مانتا۔ چاہتا۔ ہوں

میں بیمارِ غم ہوں مداوائے غم کو
ترے در کی خاکِ شفا چاہتا ہوں

نصیحت گروں کی ملامت سے بے غم
میں اس شوخ کو برملا چاہتا ہوں

اُسے بے بتائے وہ خود جانتے ہیں
جو میں اپنے حق میں دُعا چاہتا ہوں

ترے زلف و رخ کے تصوّر کی نعمت
شب و روز صبح و مسا چاہتا ہوں

میں اس طرۂ زلفِ مشکیں کو حسرت
پئے غارتِ جاں دوتا چاہتا ہوں

"شُتریت"

جناب فیروز شاہ خاں صاحب (رامپوری)

"اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ہے؟" — "بیائید! گردنم بہ بینید —"

ایں! — یہ کیا؟ اونٹ اور ناطق۔ وہ بھی فارسی داں! ہماری نظر میں تو اس کی وقعت ایک چوپایہ سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج معلوم ہوا۔ ع

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم!

حضرت! تعجب نہ کیجئے اور اس شبہ میں نہ پڑیئے کہ وہ اونٹ ایرانی ہوگا۔ نہیں موجودہ زمانہ کے اونٹ تعلیم یافتہ ہیں۔ فارسی ہی نہیں۔ عربی ترکی، انگریزی، سنسکرت۔ غرض تمام علوم میں کامل اور ہر فن میں یکتا — وہ سڑکوں بازاروں، دفتروں اور عدالتوں میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، علم و حکمت، صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت کے تمام شعبوں میں دخل رکھتے ہیں۔ وہ حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ راعی بھی ہیں اور رعایا بھی، قائد قوم بھی ہیں اور مصلح ملک بھی۔ لطف یہ ہے کہ یہ مدارج طے کرنے کے بعد پھر ہیں اونٹ کے اونٹ — زمانہ ماضی میں جاہل اور اونٹ مترادف تھے موجودہ زمانہ ترقی کر رہا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ شتریت ترقی نہ کرے۔

اونٹ ایک جنگلی جانور ہے اور اس کا حلم و استقلال، اس کی قناعت و اطاعت اس کی محنت و جفاکشی ضرب المثل ہے۔ اسی طرح اور ٹھیک اسی طرح ڈگری دار (سند یافتہ) مہذب اور تعلیم یافتہ اونٹ کے بھی چند مخصوص صفات زباں زد عوام ہیں۔ وہ حلیم نہ سہی لیکن اس میں حلم کے بجائے قوت غضبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ گو اس میں استقلال نہیں لیکن اس کا تمرد بھی شہرت میں استقلال کا جواب ہے اگر قناعت کی قائم مقامی حرص اور اطاعت کی جانشینی سرکشی کرے تو کیا بیجا ہے؟ محنت اور جفاکشی کے عوض کچھ نہ بھلے سے تو کاہلی کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ خود غرضی و مطلب آشنائی۔ عیاری و مکاری کینہ پروری اور ایذا رسانی ہزار ہا صفات اس کی افضلیت و اشرفیت کے ضامن ہیں ؎

کذب و بہتان افترا، کر و دغا۔ فتنہ فساد — کیا ہی شیوہ تھا اول حضرت انسان کا
اب ہے دانا جس میں سو درجن سے زائد بھلے صف — واہ دانائی کہ انساں نام ہے شیطان کا

وہ اپنی گردن کی درازی یا یوں کہئے کہ اپنی رسی کی درازی (کیونکہ ..... کی رسی دراز ہے) کے باعث زمین کو دیکھ ہی نہیں سکتا تو کیا پھر یہ ان ناہلوں کا قصور نہیں کہ خواہ مخواہ اس کے رستہ میں حائل ہو کر پامال ہو جائیں؟ بدقسمتی کہ اسی کا تو راستہ کھوٹا ہوا اور پھر فرعونیت کا الزام بھی اسی کے سر لگنے کو تو وہ اونٹ ہی ہے لیکن اگر اس پر اخلاق کی کمی۔ محبت و انسانیت سے بے تعلقی، یاری اور غمخواری کے اصول سے ناواقفیت جیسے صدہا اتہامات بھی لگائے جائیں تو وہ ان کا جواب شافی اپنی ایک اور صرف ایک شتریت سے دینے کے لئے ہر دم تیار ہے۔

برقی اور دخانی قوتیں اب لگے قوانین پر مسلط ہوتی جا رہی ہیں پہلے (اور اب بھی کہیں کہیں) اونٹ قافلوں کی شکل میں ایک کے پیچھے ایک میلوں کی قطاروں میں چلا کرتے تھے جس سے راہبر کی اطاعت، باہمی ہمدردی اور حفظ مراتب کا قدم قدم پر ثبوت ملتا تھا۔ اسی طرح بالفاظ دیگر تعلیم یافتہ اونٹوں کیلئے ان کا مذہب ان کا قافلہ تھا۔ شریعت ان کی نکیل تھی اور شارع ان کا رہنما۔ فلسفہ جدید نے جب شارع اور شریعت ہی کو باطل کر دیا تو پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ قافلہ (اتحاد) کہاں؟ اور حفظ مراتب کیسا؟ اطاعت واجب ہی تو کس کی؟ سرکشی اور لامذہبی کا الزام اگر افترا نہیں تو اور کیا ہے؟ ہیں تو ان کی مہار کے گم ہو جانے کا (گو وہ عمداً ہی ضائع کر دی ہے) بظاہر ملال ہے۔ اور یہ نیم وحشی، جاہل، پرانی لکیر کا فقیر فرقہ

خواہ مخواہ ان پر پھبتیاں اڑاتا اور آوازے کستا ہے۔ اسے شاید یہ علم نہیں کہ گو وہ شتر بے مہار سہی لیکن ہنوز طاعت و اطاعت کا ملکہ تمام بہ سلب نہیں ہوا چنانچہ اب بھی وہ اپنے نفس کے قابل فخر غلام اور جنس لطیف کے بندۂ بے دام ہیں ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

کیا اس کی ضرورت نہیں کہ ان کے مطلع علی الرؤس الاشہاد اس سے کام لیں؟ اور کاہلی اور بیکاری سے بچانے کیلئے گو خود پردہ وغیرہ کا بار اٹھانا پڑے انہیں ٹھکانے لگائیں۔ احسان فراموش اور ناشکر گزار اسے بے پردگی اور بے حیائی سے تعبیر کریں تو یہ ان کا نہیں ان کی عقلوں کا قصور ہے۔

دنیا جانتی ہے اور علوم مروجہ سے ثابت ہے کہ "انسانیت" میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔ دونوں کا حصہ مساوی ہے۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت و فوقیت نہیں۔ جو کام عورت کر سکتی ہے مرد بھی کر سکتا ہے اور کرتا ہے مثلاً کھانا پکانا سینا پرونا۔ گھر کی صفائی اور نگہداشت۔ بچوں کی پرورش وغیرہ تو کوئی وجہ نہیں کہ جو کام مرد کر سکتا ہو اسے عورت نہ کر سکے کیا وہ تلوار اور بندوق لے کر میدان جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے سے گریز کر سکتی ہے؟ کیا وہ کشت و خون۔ قتل و غارت۔ ملکی حفاظت، فوجی ملازمت، علمی لیاقت، عملی مہارت میں مرد کے ہمدوش نہیں؟ کیا اس کا یہ احسان نہیں کہ وہ مردی کا جوہر جو دنیا سے ناپید ہوتا جا رہا ہے اپنی ذات میں پیدا کر کے اسے مٹنے اور فنا ہونے سے بچا لے؟

اس کے جواب میں مرد کی جوانمردی یہ ہے کہ جوہر نسائیت کی (جو جوہر مردی کا نعم البدل ہو سکتا ہے اور پھر کچھ نہ ہونے سے تو بدرجہا بہتر ہے) بکشادہ پیشانی حفاظت اور مشق کرے اور عورت کے احسان سے سبکدوش ہو۔

زمانے کے انقلاب اور ترقی سے کسی شخص کو انکار نہیں۔ محالات ممکن اور ممکنات بدیہی ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا عجب کہ زمانہ آئندہ میں بچہ پروری کی بجائے بچہ کشی کی خدمت بھی مرد سے مختص ہو جائے۔

ڈارون کا یہ نظریہ کہ انسان کا باوا آدم بندر ہے میری نظر میں غلط سا معلوم ہوتا تھا اس فخر و عزت کے تاج کا اگر کوئی سر مستحق ہو سکتا ہے تو وہ سر شتر کے سوا نہیں۔

کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصلِہ۔ تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان میں پڑی جوہر نمایاں ہوتے جائینگے۔ آزادی ہی کو دیکھ لو کہ یہ ملک و مال سے آزاد جاہ و جلال سے آزاد صنعت و کمال سے آزاد۔ مذہب و ملت سے۔ قوم و قومیت سے علم و حکمت سے اخلاق سے اشفاق سے۔ رحم و کرم سے۔ حیا و شرم سے۔ ہمدردی و مروت وغیرہ سے غرض ہر صفت سے آزاد ہو چکے اور ہوتے جا رہے ہیں اور تا وقتیکہ انسانیت سے بھی آزادی حاصل نہ کر لیں مطمئن نہیں ہو سکتے اور جب ایسا کر چکیں تو بتلایئے کہ ان کا سلسلہ کس عالی نسب جا ملیگا۔؟

پرانے بیوقوف موجودہ علامات کو آثار قیامت بتاتے اور قیامت کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں سے پوچھو کہ اب اور کیا کوئی نئی قیامت ہو گی؟ ؎

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ شفقت نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ رحمت نہ پدر را بہ پسر می بینم

کیا ہمارے عدم وجود کی ایک نوعیت نہیں؟ مُردگی کے آثار نہیں پائے جاتے؟ نفسی نفسی کا شور سنائی نہیں دیتا؟ مصائب کی کچھ کمی ہے؟ ہم میں انسانیت کا کوئی جزو باقی ہے؟ عذابوں سے نجات ہے؟

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کیا ہوئی عذاب ہوا

ہم تو بقول فصیح الملک ؎

لذتِ سیر دگر چشم تماشا لیگی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی

نئے جنم اور نئے تماشے کے منتظر ہیں۔ کسے خبر ہے کہ یہ آرزو پوری ہونے والی بھی ہے یا نہیں؟

فیروز شاہ خاں رامپوری

جذباتِ عالیہ!

اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا ۔ جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

تسکین و ضبط کا متحمل نہیں رہا ۔ ناصح ترے فریب میں اب دل نہیں رہا

معراجِ چشمِ شوق ہے اے قیس وہ مقام ۔ حائل جہاں سے پردۂ محمل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ گناہ ۔ مجکو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

ٹکرائے سر کہاں کوئی مایوسِ آرزو ۔ مشقِ ستم تو شیوۂ قاتل نہیں رہا

آئی صدا کہ اب تری منزل قریب ہے ۔ جب امتیازِ جادۂ منزل نہیں رہا

وارفتگی نے مجھکو پھرایا جہاں جہاں ۔ ان مرحلوں میں ساتھ کہیں دل نہیں رہا

ہر سجدۂ نیاز ہے محرومِ آستاں ۔ میری جبیں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا

کیا کہئے آستانِ محبت کی داستاں ۔ یاد اُس کی رہ گئی ہے مگر۔ دل نہیں رہا

اے دلؔ بہارِ حسنِ حقیقی نظر میں ہے

ہو محوِ رنگ و بو وہ مرا دل نہیں رہا

چاکولیٹ کا بکس

ایک جدید فرانسیسی افسانہ کا خاکہ

از

مولانا صہبائی بی۔اے (آنرز)

مسٹر بہرام یا مسٹر منوچہر بہرام جی (جو ان کا پورا نام تھا) نے ۱۲ مئی کی صبح کو ایک پارسل وصول کیا۔ یہ چاکولیٹ کا ایک خوبصورت بکس تھا ۱۲ مئی ان کی سالگرہ کا دن تھا۔ آج وہ پورے پینسٹھ سال اپنی عمر کے گذار چکے تھے وہ دادر میں پارسی نوآبادی کے قریب ہی ایک کھلے ہوئے بنگلہ میں رہتے تھے جس میں آرام و آسائش اور تمول کے تمام لوازم موجود تھے ان کی آمدنی اس ذاتی جائداد سے ہوتی تھی جو پونہ اور مہابلیشور میں انھوں نے خریدی تھی اور اس وقت کم و بیش ایک لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی کے مالک تھے۔

عمر کے آخری حصے میں انھوں نے بوجہ ضعف اور کمزوری بصارت کے کاروبار چھوڑ دیا تھا اور اب ان کی زندگی زیادہ تر قومی کاموں اور ملک کے نادار و لاوارث بچوں کی نگہداشت میں صرف ہوتی تھی انھوں نے سول کورٹ میں اپنے مرنے کے بعد اپنی دولت کا مصرف بطور ایک تمسک کے لکھ کر داخل کر دیا تھا۔ یہی ان کی وصیت بھی تھی۔ یہ وصیت نہایت فیصلہ کن اور نہایت صاف و صریح الفاظ میں تحریر تھی اس میں اُن کی جائداد کا ½ حصہ ہندوستانی یتیم خانے کے لئے وقف تھا ¼ طبقہ نسواں کی بہبودی کے لئے اور جس کا وہ ایک بورڈ بنا چکے تھے اور خود اس کے ڈائرکٹر تھے۔ بقیہ روپیہ انھوں نے اپنی بھتیجی کے لئے (جو ان کی تنہا رشتہ دار اور وارث تھی اور فورٹ میں اپنے شوہر مسٹر شاپور جی ٹاٹا کے ساتھ رہتی تھی) چھوڑ دیا تھا۔

چاکولیٹ کے بکس کے ساتھ ہی ایک ان کی بھتیجی مسز ٹاٹا کا خط بھی تھا۔

"پیارے چچا بہرام!

میری دعا ہے کہ تمھاری سالگرہ اسی طرح ہمیشہ آتی رہے میں چھوٹا سا ایک سالگرہ کا ایک تحفہ اپنے اور مسٹر ٹاٹا کی جانب سے بھیجتی ہوں۔ پیارے چچا جان نئی سالگرہ مبارک ہو!

تمھاری عزیز بھتیجی

فردوس بہرام ..."

(۲)

"بیکار روپیہ ضایع کرتے ہیں۔" بہرام جی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے خادم سے کہا اس کے بعد بکس کھولا کہ دیکھیں کیا تحفہ آیا ہے ایک چاکولیٹ کی ٹکیہ کھائی بکس کو پھر بند کیا اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھدیا اور ملازم سے جھارا منگایا تاکہ باغ کے پھولوں اور ترکاریوں میں پانی دیں۔

صرف دس منٹ ہی گذرے ہونگے کہ انھیں اپنے پیٹ میں شدید درد محسوس ہوا اور فوراً ان کا خادم آواز کے سنتے ہی دوڑتا ہوا ان کے نزدیک پہونچا جہاں اس نے دیکھا کہ بہرام جی سخت بیمار ہو گئے ہیں ڈاکٹر

فرڈینینڈ کو فوراً ٹیلیفون دیا گیا اور ڈاکٹر نے آکر غریب سرمایہ دار کو بستر ہی میں پڑے ہوئے پایا۔

"آپ نے کیا کھایا ہے؟" ڈاکٹر نے نبض اور قلب کی حرکت دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ اس نے بوڑھے بہرام جی کی زبان کا رنگ دیکھا۔

"کھایا؟؟" تعجب سے بہرام جی نے پوچھا "میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کھانا پینا ہی چھوڑ دینا چاہئے۔ ڈاکٹر مجھ سے کھانے پینے کی گفتگو ذکرو۔ میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

تیمور نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! صبح کو ناشتے میں ماسٹر نے صرف دو انڈے اور ایک توس اور ایک پیالی چاء پی تھی۔ باقی ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا پیا ہے — البتہ ایک چاکولیٹ بھی نصف گھنٹہ سے کچھ ہی زیادہ ہوا جب کھائی تھی۔"

"بیوقوف، بیوقوف" کیا یہ جو کچھ میں نے کھایا ہے وہ خلاف معمول ہے جو مجھے اتنا سخت نقصان پہنچا دے اور چاکولیٹ میں کوئی خرابی ہی موجود نہ تھی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ فردوس میری بھتیجی کے پاس سے بطور تحفہ آئے ہیں اُف! اُف! ڈاکٹر درد بہت سخت ہے۔"

(۳)

ڈاکٹر فرڈینینڈ کو یہ حال یکلخت ناقابل اطمینان معلوم ہوا وہ اس قسم کا طبیب تھا جو اپنے فن میں ماہر ہو صرف اسباب و علل کی روشنی میں تشخیص اور علاج کرتا ہو اور اس تمام تفصیل کو نظر انداز کر دیتا ہو جو خود مریض یا اس کے تیماردار ظاہر کرتے ہوں ایک انجکشن کے بعد جو اُس نے ضروری خیال کیا وہ ڈرائنگ روم میں گیا اور تیمور سے پوچھا۔

"تم نے کیا کہا تھا؟ کہ ماسٹر نے ایک چاکولیٹ بھی کھایا تھا؟"

تیمور نے اس کی تفصیل سنائی۔ ڈاکٹر نے پورا بکس اپنے ساتھ لے لیا اور جیب میں لیکر روانہ ہو گیا وہ اسی کے ہمراہ وہ خط بھی لے گیا جو فردوس نے بھیجا تھا اور جسے بہرام جی نے بکس ہی میں رکھدیا تھا۔ اُس نے ملازمت سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ پارسل آج صبح ہی ایک ملازم دیکر گیا ہے۔

ڈاکٹر ایک بے انتہا مصروف آدمی تھا۔ اس کے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہ تھا کیونکہ وہ اپنی پرائیویٹ پریکٹس کے ساتھ ساتھ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ایک سرجن بھی تھا چنانچہ اسی شام سے قبل چاکولیٹ بکس گورنمنٹ کے کیمیاوی اینالائزر کے پاس سے مع رپورٹ واپس آگیا۔ پورے بکس میں وہ چاکولیٹ کی ٹکیاں زہریلی تھیں جو اوپر کی تہہ میں رکھی تھیں اور ان ٹکیوں کا بھی صرف نصف بالائی حصہ زہر آلود تیار کیا گیا تھا۔

(۴)

کیمیاوی محلل کی رپورٹ کے ساتھ بکس اور خط خفیہ پولیس میں بھیجدیئے گئے اور اس کی تفتیش انسپکٹر شیرازی کے سپرد کی گئی۔ شیرازی کو یہ مقدمہ سپرد کرتے وقت چیف کمشنر نے اُس کے امکانی شہادت اور اسباب پر غور کیا اور کہا۔

"دیکھو صندوق کے اندر کچھ بھی نہیں ہے جس سے بطور علامت کچھ کا اندازہ ہو سکے کہ یہ کس کمپنی کا بنا ہوا ہے اوپر ایک معمولی تصویر ہے۔"

انسپکٹر شیرازی نے بھی دیکھ بھال کے بعد اس کا اعتراف کیا۔ چیف کمشنر نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ بکس کس طرح بہرام جی کو ایک آدمی کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ پھر اس خط کا جو لفافہ پر تحریر تھا اصل خط کے حروف کی کشش سے مقابلہ کیا گیا اور دونوں خط ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ انسپکٹر نے ان ابتدائی معلومات کے بعد پوچھا۔

"شاپور جی ٹاٹا اور مسز ٹاٹا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"نہایت باعزت ساہوکار اور شریف شہری ہے۔ ڈائرکٹری اور رائے دہندگان کی فہرست میں اس کا نام درج ہے علاوہ ازیں اس کے دفتر اور مکان دونوں میں ٹیلیفون ہے وہ ایک تھوک فروش بزاز ہے۔"

"کیا مسٹر بہرام جی کے مرجانے کا خوف تو نہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر فرڈینینڈ نے اپنی رپورٹ یہ پیش کی ہے کہ وہ جلدی صحتیاب ہو جائیں گے۔"

"کیا مسٹر اور مسز ٹاٹا بہرام جی کی علالت سے باخبر ہیں؟"

"میں ایسا قیاس نہیں کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے یہ بھی اطلاع دی کہ خادم نے بہرام جی سے اور اس کے علاوہ ڈاکٹر سے خود یہ اجازت چاہی تھی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ان کے اعزا یعنی فردوس و شاپور جی کو بلا لیا جائے لیکن اسے منع کر دیا گیا اور یہ کہدیا گیا کہ مریض کو مکمل آرام کی ضرورت ہے اور کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں اس لئے اگر مسٹر و مسز ٹاٹا نے

یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کے بوڑھے چچا نے چاکولیٹ پسند کئے یا نہیں آپ نے کی تکلیف گوارہ نہ کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں اس کا علم ہی نہیں۔"

(۵)

انسپکٹر شیرازی نے اس پر کافی غور کر کے کہا۔ "زہر کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے نہ چاکولیٹ کی تیاری میں (بشرطیکہ دانستہ ایسا نہ کیا جائے) پورا پورا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اثرات صرف ان کے بالائی سروں میں موجود ہیں یقیناً اس کا مقصد بالکل صاف ہے کہ چاکولیٹ ہلاکت کے لئے بھیجے گئے ہیں مگر تعجب ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے ہوتے ہوئے لوگ ایسی زہر آلود اشیاء یا شکنجہ موت اپنے خطوط کے ساتھ کیسے بھیج سکتے ہیں؟

"بظاہر یہ مسز فردوس ٹاٹا کا کام ہے۔ لیکن اس میں یہ پہلو بالکل اس کے حق میں ہے کہ اگر وہ عقل و حواس سے بے بہرہ نہیں تو اُسے نہیں معلوم کہ چاکولیٹ میں زہر کی آمیزش کی گئی ہے ہم کو اس کا فوری فیصلہ کر لینا چاہیئے جناب والا آپ مجھے اجازت دیں کہ میں آزادی کے ساتھ جس طرح چاہوں تفتیش و تحقیقات کروں۔"

پولیس کمشنر نے انسپکٹر کو اجازت دیدی اور وہ دفتر سے روانہ ہو گیا اس وقت ۶ بجے تھے اور ٹھیک ۶ بجکر دس منٹ پر انسپکٹر شیرازی بہرام جی کے مکان پر پہونچ گیا۔ بہرام جی آرام میں تھے اور ایک نرس اور چند ملازم ان کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ خادم تیمور نے کچھ اشارات بتائے اور چند سوالات کا جواب دیا۔ بدوران گفتگو خادم نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر فرڈ نینڈ کی زیر ہدایت نہ تو اس نے کسی رشتہ دار کو اطلاع دی نہ خاص طور سے مسز فردوس ٹاٹا کو بلایا بہرام جی کو کلیتہً آرام ہے صرف کمزوری باقی ہے اور اس وقت وہ سو رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون تو موجود ہے؟" اور اثبات میں جواب ملنے پر خادم سے کہا کہ وہ مسز فردوس ٹاٹا کو ٹیلیفون کر کے وہی الفاظ کہے جو وہ لکھ کر دیتا ہے اس نے نوٹ بک نکالی اور لکھا۔

"ماسٹر یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ چاکولیٹ کا بکس جو آپ نے بھیجا تھا کہاں سے خریدا گیا تھا کیونکہ اس ڈبہ کے چاکولیٹ کی بو انھیں بالکل پسند نہیں ہے اور اسی لئے وہ پھنکوادی گئیں۔"

ملازم اور انسپکٹر دونوں کمرے میں گئے اور ملازم نے فون پر مسز ٹاٹا کو بلانے کے لئے اس کے ملازم سے کہا جب تک وہ ٹیلیفون پر آئیں ایک مرتبہ پھر لکھے ہوئے کو غور سے پڑھ لیا اور گفتگو شروع کر دی۔

ایک منٹ گفتگو ہوئی ہوگی اور جب سلسلہ منقطع ہو گیا تو تیمور نے پلٹ کر انسپکٹر سے کہا۔

"فردوس بائی پہلے تو یہ سوچ ہی نہ سکیں کہ انھوں نے کس دوکان سے چاکولیٹ خریدے ہیں وہ کل اتنی دوکانوں پر پھری تھیں کہ انھیں ٹھیک یاد بھی نہیں شاید ان کا خیال ہے کہ چاکولیٹ "مال جنی" ریسٹورنٹ سے خریدے گئے ہیں۔ انھیں یہ سن کر بہت تکلیف ہوئی کہ چچا جان اس چاکولیٹ کو پسند نہیں کرتے وہ خود کل ان سے ملنے کیلئے آئیں گی۔"

انسپکٹر تیمور کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔

(۶)

انسپکٹر شیرازی کا مقصد پورا ہو گیا تھا کیونکہ فون پر مسز ٹاٹا نے نہ صرف اس چاکولیٹ کے بکس کو بھیجنے ہی کا اقرار کر لیا تھا بلکہ اُس کی خریداری کا اعتراف اور دوکان کا نام بھی ظاہر کیا تھا۔ یقیناً آخری حصہ بیان اس کے لئے نہایت اہم تھا کیونکہ ایک دوکان یا ایک کارخانہ میں خورد و نوش کی اشیاء میں اتفاقیہ طور پر زہر کی آمیزش تو ہو سکتی ہے لیکن نہیں کہ ایک چاکولیٹ کے بکس میں صرف بالائی سرے ہی زہریلے ہو جائیں۔ وہ فوراً ٹیکسی میں بیٹھا اور فردوس ولا ([illegible]) کی طرف روانہ ہو گیا مسٹر شاپور جی ٹاٹا موجود نہ تھے اور مسز فردوس ٹاٹا لباس تبدیل کرنے کے بعد کہیں باہر جانے والی تھیں لیکن انسپکٹر کے نام بتلانے اور یہ ظاہر کرنے پر کہ وہ خفیہ پولیس سے آئے ہیں فوراً شیرازی کو اندر بلا لیا گیا اور کمرۂ نشست میں بٹھا دیا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پانچ منٹ کے بعد مسز ٹاٹا کمرۂ نشست میں داخل ہوئی۔

اس کے بال سُرخ تھے اور اس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جدید ملاقاتی کی آمد سے وہ بہت متعجب ہے۔ وہ کسی دردناک ٹریجیڈی کی تصویر معلوم ہو رہی تھی اور بلاشبہ اس کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے خلاف توقع کسی شدید حادثہ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

"کہئے انسپکٹر صاحب! مجھ سے ملاقات کی کیا ضرورت محسوس ہوئی" اور مسز ٹاٹا نے یہ کہہ کر انسپکٹر پر بالکل ایک ایسی ہی نظر ڈالی جیسی کسی مشتبہ

کئے پر کوئی شائف آدمی نظر ڈال لے۔

"مسز ٹاٹا! میں صرف آپ سے ایک چاکولیٹ کے بکس کی بابت کچھ باتیں دریافت کرنے آیا ہوں۔ یہ وہ بکس ہے جو آپ نے اپنے چچا مسٹر بہرام جی کو تحفتہً کل بھیجا تھا۔"

اس سوال کے جواب سے نتیجۃً میں ایک تعجب خیز غصہ اور جھنجھلاہٹ مسز فردوس کے چہرہ پر دکھائی دینے لگی۔

"اوہ! وہ چاکولیٹ، کاش میں نے وہ بکس اپنے چچا کو نہ بھیجا ہوتا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ مجھے ٹیلیفون پر پیام پہونچا چکے ہیں کہ ان کی بو خراب تھی اور اب خفیہ پولیس انہیں کے متعلق مجھ سے سوال کرنے کے لئے آگئی۔"

"مسز ٹاٹا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی مضر اجزا شامل ہیں۔ میں صرف اس کے بنانے والوں کا نام یا کارخانہ کا پتہ پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ حقیقتہً وہ تمام چاکولیٹ زہریلی ہیں۔"

"زہریلی؟"

"ہاں انتہائی زہریلی اور جس سے صرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بہرام جی کو قتل کرنے کے لئے وہ بھیجی گئی تھیں۔"

مسز ٹاٹا ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انسپکٹر شیرازی کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں میں ایک خوفناک ارتعاش تھا۔

"لیکن انسپکٹر وہ زہر آلود کیسے ہوسکتی ہیں۔؟"

"میڈم! وہ زہر آلود تھیں اور آپ نے ابھی ٹیلیفون پر تیمور سے کہا تھا کہ وہ "ملن جنی" ریسٹارنٹ سے خریدی گئی ہیں۔ کیا میڈیم یہ واقعہ صحیح ہے۔؟"

اس سوال کے سنتے ہی غریب مسز فردوس ٹاٹا بالکل اس بے خبر انسان کی حالت میں نظر آنے لگی جو کسی زبردست عمل تسخیر کا معمول ہو اور انسپکٹر کے سوالات کا جواب دینا شروع کیا۔

"انسپکٹر... نہیں... میں نے یہ غلط کہا تھا۔ وہ مجھے ایک دوست نے بھیجی تھیں... لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ ان میں...."

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں" اور یہ کہنے کے بعد انسپکٹر نے نہایت نرمی کے ساتھ جیسے ایک ڈرے ہوئے بچے سے خطاب کیا جائے کہا: "میڈم آپ سچ نہیں بولیں۔ کیا آپ مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہیں؟"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں چچا بہرام کو اس سے لاعلم رکھنا چاہتی تھی۔"؟

"کس چیز سے آپ انہیں لاعلم رکھنا چاہتی تھیں۔؟"

"اس حقیقت سے کہ میں نے چاکولیٹ خریدے نہیں بلکہ ایک تحفہ جو مجھے دوسری جگہ سے پہونچا تھا۔ انہیں بھیج دیا ہے۔"

"میڈیم آپ مہربانی تمام واقعات کی تفصیل مجھے بتائیں۔"

(۷)

مسز فردوس ٹاٹا نے بیان کرنا شروع کیا۔

"کل میری ایک خاتون دوست مسز کہکشاں واڈیا نے مجھے ایک چاکولیٹ کا بکس بھیجا تھا۔ لیکن اتفاقاً مجھے پرسوں شام کو ہی میرے پرائیوٹ ڈاکٹر نے شکر کا استعمال کرنے سے بالکل روک دیا اس لئے میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ اس بکس کو چچا کے پاس بھیجدونگی۔ کل ان کی سالگرہ بھی ہے اس لئے فطرتاً جب تیمور نے مجھے ٹیلیفون پر بلا کر دریافت کیا تو میں نے یہ جواب دیا کہ وہ خود مجھے بھی کسی دوسرے دوست کے پاس سے بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔"

"اچھا تو گویا وہ آپ کو بھی بطور تحفہ مسز کہکشاں کے پاس سے پہنچی تھیں کیا یہ میڈیم کہکشاں آپکے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔"

"ہاں انسپکٹر کہکشاں اور مجھ سے برسوں کی دوستی ہے۔"

"آپ سے آخری مرتبہ کب ان سے ملاقات ہوئی ہے۔؟"

"گزشتہ جمعہ کو۔"

"تو میڈیم کہکشاں کو یہ علم نہ ہونا چاہئے کہ آپ کے لئے شکر کا استعمال ممنوع کردیا گیا ہے؟ کیا آپ کو شیرینی سے بہت رغبت تھی؟"

"جی ہاں!"

"اور یہ بات آپ کے پورے حلقہ احباب میں غالباً معلوم ہوگئی کیا آپکے کسی دوسرے دوست کو اس کا علم ہے کہ آپ کیلئے شکر کا استعمال ممنوع ہے؟"

"نہیں انسپکٹر یہ صرف جمعہ کا واقعہ ہے اور میں نے سوائے اپنے شوہر کے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے جو واقعتہً اس وقت میرے ساتھ ہی تھے جب ڈاکٹر نے میری معمولی غذا میں تبدیلی تجویز کی میرے پرائیوٹ ڈاکٹر بہت مشہور طبیب ہیں۔ ڈاکٹر نشا: کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل وہ آپ کو بتائیں گے کہ جو کچھ میں نے کہا صحیح ہے۔"

"اچھا میڈیم کیا مسز کہکشاں نے بکس کے ساتھ آپ کو کوئی خط بھی بھیجا تھا؟"

مسز ٹاٹا بطور اثبات اشارہ کر کے کھڑی ہو گئیں اور رائٹنگ ٹیبل کھول کر کافی تلاش اور الٹ پھیر کے بعد جب ناامید ہونے کو تھی تو وہ خط اسے ملا، وہ ایک ہلکے گلابی رنگ کا سنہر نوٹ پیپر تھا۔ جس کی دو تہیں تھیں اور جس پر یہ عبارت تحریر تھی۔

۲۲۲ - بھارت لواس -

سینڈہرسٹ روڈ ــ ۳۰ راپریل

پیاری فردوس کیلئے!

بزریز کہکشاں دادیا کی جانب سے"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا میڈیم، یہ مسز کہکشاں کا خط ہے"

"جی ہاں یہ انھیں کی تحریر ہے"

"آپ کے پاس پارسل کس طرح پہنچی تھی؟" کیا ڈاک کے ذریعہ؟ اور کیا آپ کے پاس اس کا لفافہ موجود ہے"؟

مسز ٹاٹا نے پہلے کچھ سوچا پھر گھنٹی بجائی خادمہ نے جو آئی دریافت کرنے پر لفافہ کے متعلق یہ جواب دیا کہ اُسے یاد ہے لفافہ ایک ریشمی فیتے سے بندھا ہوا تھا اور غالباً ردی کی ٹوکری خالی کرتے وقت پھینک دیا گیا یا جلا دیا گیا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ پارسل اور خط ڈاک کے ذریعے آئے تھے انسپکٹر خادمہ کے کمرہ سے باہر جانے تک خاموش رہا پھر اُس نے پوچھا۔

"کیا میڈیم آپ کو مسٹر بہرام کی موت سے کسی قسم کا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟" میں اُن کی پوری ½ حصہ جائداد کی مالک ہوں بقیہ حصہ میں سے نصف نصف یتیم خانہ اور قومی کاموں کے لئے وقف ہے.....

لیکن انسپکٹر کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں نے....."

مسز ٹاٹا جملہ پورا نہ کر سکی اس کے گلے میں الفاظ اٹک گئے۔

"نہیں میڈیم، میں ایسا قیاس نہیں کرتا۔ جو آپ خیال کر رہی ہیں ہاں یہ بتایئے کیا میڈیم کہکشاں کو آپ کی موت سے کوئی فائدہ پہونچنے کی اُمید ہے؟"

مسز ٹاٹا نے ایک لمحہ غور کیا پھر بولی ــ "بالکل نہیں۔ کہکشاں صرف میری عزیز دوست ہی نہیں بلکہ میری موت سے انھیں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ واقعہ ہے اور وہ بھی اس کو بخوبی جانتی ہیں"

انسپکٹر نے صرف ایک آخری سوال اور کیا:

"کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتی ہیں جس کو آپ کی موت سے کوئی فائدہ پہونچے"؟

"بالکل نہیں، میرے پاس ذاتی دولت ہے ہی نہیں۔ البتہ ہم لوگ نہایت خوشحالی سے زندگی گذارتے ہیں کیونکہ جتنی دولت اور سرمایہ ہے اس کے مالک میرے شوہر ہیں۔ کسی کو میری موت سے فائدہ پہونچنے کی امید نہیں ہو سکتی"

انسپکٹر نے مسز ٹاٹا کو بہت تسکین دی اور ہدایت کی کہ وہ کسی کے سامنے اس قصّہ کا اعادہ نہ کرے۔

ــــــــ (۸) ــــــــ

راستے میں انسپکٹر شیرازی غور کر رہا تھا کہ اگر مسز کہکشاں کے خط کی کشش اس خط سے مشابہت رکھتی ہے جو مسز فردوس کو بھیجا گیا ہے تو معاملہ بہت بڑی حد تک سلجھ جائیگا۔ لیکن شیرازی نے اس معاملہ کے نازک ترین پہلو پر بھی اسی وقت غور کر لیا تھا جب اس نے چیف کمشنر پولیس سے یہ کہا تھا کہ لوگ موت کا شکنجہ اپنے خطوط کے ہمراہ نہیں بھیجتے ہیں"

اس واقعہ کی بنا پر اس کو مسز فردوس ٹاٹا کے ملزم ہونے میں شبہ تھا قبل اس کے کہ وہ اس سے ملا ہو، اور اس سے تفصیلی ملاقات کے بعد وہ اس کی جانب سے قطعاً مطمئن ہو چکا تھا۔ یہ بالکل فطری تھا کہ وہ بہرام جی کو اس حقیقت سے لاعلم رکھنا چاہتی تھی کہ مسز کہکشاں کے پاس سے آئے ہوئے چاکولیٹ انھیں بھیجے گئے اور ٹیلیفون پر دفعتہً یہ سوال کر لینے سے اس نے گھبراہٹ میں جھوٹ بول دیا۔ اس کی ملازمہ نے اس کی تصدیق ہی کر دی کہ پارسل اور خط اس کے نام ڈاک سے آئے ہیں۔ اور آخری بات سب سے اہم یہ ہے کہ مسز فردوس ٹاٹا نے نہایت صفائی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ بہرام جی کی موت سے اس کو فائدہ پہونچے گا۔ یہ ایک ایسا اقرار تھا کہ معمولی آدمی کی نگاہ میں وہ یقیناً مجرم قرار دیدی جاتی ــ یہ دلیل کہ دانشمند لوگ موت کا شکنجہ اپنے خط کے ہمراہ نہیں بھیجتے ہیں صحیح ثابت ہو چکی تھی لیکن وہ غور یہ کر رہا تھا کہ آخر مسز کہکشاں کی پوزیشن اس جرم میں کیا ہو سکتی ہے؟

(۹)

مسز کہکشاں اپنے مکان پر موجود تھی اپنے کمرہ کا دروازہ خود اسی نے کھولا۔ اس کی عمر تقریباً پچپن سال تھی آنکھوں میں ایک بھورے رنگ کا چشمہ لگا ہوا تھا اس کے انداز میں ایک غیر معمولی متانت موجود تھی۔

جب انسپکٹر نے یہ بتایا کہ وہ خفیہ پولیس کا انسپکٹر شیرازی ہے تو وہ اُسے ایک بہت ہی آراستہ کمرہ میں لے گئی جس میں ایک جانب بڑی سی میز پر کاغذوں کا ایک انبار بے ترتیبی سے پھیلا پڑا تھا کچھ حساب کی فہرستیں پڑی ہوئی تھیں کچھ فائل وغیرہ ادھر اُدھر پڑے تھے۔ یہ کھانے کا وقت تھا کیونکہ کھڑکی کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر شام کا ہلکا سا کھانا رکھا تھا جس کو ابھی تک کام میں مصروفیت کے باعث مسز کہکشاں نے نہ کھایا تھا۔ مسز کہکشاں فی الاصل ایک کاروباری عورت تھی اور ایک بڑے دواخانے کی مالک تھی۔

"بیٹھ جائیے"۔ اس نے ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر سے کہا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ایک سگریٹ جلا کر کہا۔ "فرمائیے!"

"میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اس دکان کا پتہ دریافت کروں جس سے آپ نے چاکولیٹ کا وہ بکس جو مسز فردوس ٹاٹا کو تحفتہً بھیجا تھا خریدا ہے"

اس سوال سے مسز کہکشاں اس قدر متعجب ہوئی کہ سگریٹ جو مُنہ تک لے جانے والی تھی ہاتھ میں ہی رہ گئی اور چند سکنڈ اسی حالت میں رہ کر اس نے خاکدانی میں ڈال دیا۔ پھر بولی۔

"اس کے کیا معنی ہیں؟ میں نے مسز فردوس کو چاکولیٹ کا کوئی بکس نہیں بھیجا۔ تعجب ہے کہ آج صبح ہی خود مسز فردوس کا بھی ایک خط مجھے ملا ہے جس میں چاکولیٹ کے بکس کا شکریہ ادا کیا گیا ہے اور میں نے جواباً اسے لکھا ہے کہ مجھے اس چاکولیٹ کے بکس کا کوئی علم نہیں"۔

شیرازی نے جواب دیتے ہوئے وہ خط نکالا جو مسز کہکشاں کی جانب سے فردوس بائی ٹاٹا کو بکس کے ہمراہ بھیجا گیا تھا اور پوچھا — "کیا یہ خط آپ نے لکھا تھا؟"

خط پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہی فوراً مسز کہکشاں نے جواب دیا کہ "نہیں یہ خط میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ البتہ یہ میرے خط کی ناکام نقل ضرور ہے — ٹھہریئے!"

وہ میز کے پاس گئی اور ایک خط جو کسی خریدار کو لکھا گیا تھا نکال کر لائی اور انسپکٹر کے ہاتھ میں دونوں خط مقابلے کے لئے دیدیئے۔ انسپکٹر شیرازی ایک ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ تھا اور اس نے بیک نظر پہچان لیا کہ مسز فردوس ٹاٹا کو جو خط لکھا گیا ہے جعلی ہے دونوں خطوں میں شباہت تھی اور دونوں خطوں کے بالمقابل ہونے پر بھی ایک ناواقف آدمی کی سرسری نگاہ تو دھوکہ کھا سکتی تھی لیکن ایک ماہر کی نگاہ میں فوراً حقیقت کا اظہار ہو گیا کہ بکس کے ہمراہ جو خط بھیجا گیا مسز کہکشاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ تھا اور کسی دوسرے ذہین انسان نے اس کو پھنسانے کے لئے ایسا کیا تھا اس نے کہا۔

"یہ انتہائی دغابازی ہے کیونکہ وہ چاکولیٹ زہر آلود تھے"۔

مسز کہکشاں نے ایک حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے خود کو بمشکل سنبھالا "اور زہریلے؟ زہریلے؟" الفاظ اس کی زبان سے بحالت استعجاب ادا ہوئے۔

"ہاں میڈیم! بکس کے اوپر کی پوری تہ میں جتنی ٹکیاں تھیں زہر آلود تھیں لیکن اتفاق سے وہ بھیجنے والے کی توقع کے خلاف مہلک نہ ثابت ہوسکیں"۔

مسز کہکشاں جو یہ خبر سن کر متحیر سی ہو گئی تھی سنبھل گئی اور فطری متانت و سنجیدگی اس پر غالب آگئی۔

"انسپکٹر صاحب اگر نامناسب نہ سمجھئے تو مجھے تمام تفصیلات بتائیے یہ میرے لئے ایک نہایت بدنما دھبہ اور ایک اہم معاملہ ہے جیسا کہ آپ بھی غور فرما سکتے ہیں"۔

"میں اس باب میں آپ کے کاروبار اور سوشل تعلقات کی نسبت صرف چند سوالات کرتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ بتائیے کہ کیا آپ کے بعض لوگ دشمن ہیں جو آپ کو کوئی گزند پہونچانا چاہتے ہیں"۔؟

"نہیں میرے کاروبار کا تقاضہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی میں دوست بناؤں نہ یہ کہ برعکس اس کے دشمن پیدا کروں کاروباری حریف یقیناً میرے موجود ہیں لیکن میں انھیں دشمن نہیں تصور کرتی"۔

"آپ کے اور مسز فردوس بائی ٹاٹا کے سوشل تعلقات ہیں؟"

"ہاں ہماری ملاقات کو برسیں ہی گذر چکی ہیں"۔

"کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا آدمی ہے جو مسز فردوس بائی ٹاٹا کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہو؟"

"اوہ، وہ سوسائٹی میں بہت ہی ہردلعزیز اور پیاری لڑکی ہے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس کا دشمن نہیں ہے۔"

"بہرحال جس نے بھی یہ حرکت کی ہے وہ اس حقیقت سے ضرور باخبر ہے کہ آپ کے اور فردوس بائی ٹاٹا کے بہت ہی مخلصانہ تعلقات ہیں بلکہ غالباً اس کے مراسم بھی آپ دونوں سے مشترکہ طور پر نہایت شگفتہ ہو چاہئیں"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ ہمارے بہت سے احباب ہیں اور بعض تمنا سا بھی ہیں جن کے تعلقات مشترک ہیں اس لئے کہ ہم دونوں سوسائٹی کے ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں"۔

"کیا کسی کے لئے یہ آسان ہے کہ آپ کے خط کی نقل کر سکے؟"

"یقیناً میں ذاتی خطوط کو شاذ و نادر ہی ٹائپ کراتی ہوں۔ میری خط و کتابت بہت زیادہ ہے۔ لیکن میں کم از کم نصف درجن خطوط روزانہ میں اپنے ہاتھ ہی سے لکھ کر بھیجتی ہوں"۔

"کیا بعض خریدار بھی آپ کے دوست ہیں؟"

"ہاں تمام خریدار میرے دوست ہیں لیکن سوشل تعلقات صرف چند ہی سے ہیں"۔

"اب میں چاہتا ہوں کہ آپ غور کر کے مجھے ان لوگوں کے نام بتائیں جو آپ کی اور مسز فردوس بائی ٹاٹا کی دیرینہ دوستی اور خلوص سے لاعلم نہیں ہیں آپ بالکل مطمئن رہیں کیونکہ میں ان اطلاعات کا کسی طرح ایسا استعمال نہیں کروں گا جس کے باعث آپ کے کاروبار کو کسی قسم کا نقصان پہنچ سکے۔ مہربانی کر کے کل صبح مجھے فہرست دیدیجئے"۔

(۱۰)

مسز کہکشاں سے رخصت ہو کر انسپکٹر شیرازی اپنے ہیڈ کوارٹر پہونچا۔ اپنے کمرہ میں ایک آرام کرسی پر لیٹ کر اس نے ایک کافی کی پیالی پی اور ایک سگریٹ جلا کر معاملہ کی تمام کڑیاں ملانا شروع کیں اپنے طور پر یہ طے کیا کہ مسز کہکشاں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا یہ ممکن ہے کہ مجرم مرد یا عورت نے مسز کہکشاں کو نقصان پہونچانے کی غرض سے ایسا کیا ہو لیکن یہ یقینی نہیں اس خیال کو دماغ سے قطعاً نہ نکالتے ہوئے اس نے دوسرے امور پر غور کرنا شروع کیا لیکن اس کے دماغ میں یہ خیال بالکل ابھی تک نہ آیا تھا کہ اس جرم کا مقصد مسز فردوس بائی ٹاٹا کی موت بھی ہو سکتی ہے۔

زہر دینے والا یقیناً اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ بھیجنے والے کا نام شکوک پیدا کر دیگا۔ چاکولیٹ ایک دوست کے پاس سے آئے تھے اور یہ واقعہ اس دلیل کے لئے کافی تھا کہ مسز کہکشاں کے نام کا استعمال ہی مقصود تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یکس بھیجا ہی کیوں گیا؟

انسپکٹر شیرازی کے وسیع تجربہ نے ایسے جرائم کے مقاصد کے متعلق ایک اصول وضع کر لیا تھا اور وہ یہ کہ (سوائے مخبوط الحواس مجرمین کے) تمام مجرم تین مقاصد کے ذیل میں ارتکاب جرم کرتے ہیں یا تو فطری خواہشات کی ذیل میں یا انتقاماً یا حرص کے ماتحت۔ مسز فردوس ٹاٹا کے معاملہ میں حرص جرم کا مقصد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی موت سے کسی کو کوئی مالی یا مادی نفع نہیں ہو سکتا۔ انتقام؟ یہ بالکل غیر یقینی ہے کہ مسز ٹاٹا جیسی خاتون کے ساتھ کوئی شخص بطور انتقام کے ایسا طرز عمل جائز رکھے فطری خواہشات؟ اس کا کوئی پہلو نمایاں نہیں ہے! تاہم معاملہ میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے۔

شیرازی تھوڑی دیر اپنے دونوں ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا رہا پھر اس نے گھنٹی بجائی اور رشید زبیر سارجنٹ کو بلایا۔ چند منٹ بعد رشید زبیر آگیا۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا جس کے بال بھورے تھے اور آنکھیں شکاری کتے کی طرح متجسس نظر آتی تھیں کشادہ پیشانی تھی اور گفتگو بہت کم کرتا تھا ڈاڑھی مونچھیں غائب تھیں اور رنگ اتنا صاف تھا کہ ضرورت کے وقت اسے پارسی بھی کہا جا سکتا تھا اور یوریشین یا اینگلو انڈین بھی۔

انسپکٹر شیرازی نے کہا "زبیر دیکھو مسٹر شاپورجی ٹاٹا تمہارے سامنے ایک نام ہے اس کا پتہ ۲۶۔ فردوس ولا مقابل جنرل پوسٹ آفس اور دوکان کا پتہ نیوچرنی روڈ ہول سیل شاپور کلاتھ اسٹورز ہے۔ میں اس کے موجودہ حرکات و سکنات اور گذشتہ زندگی کے متعلق پورا پورا ریکارڈ چاہتا ہوں"۔

"بہتر ہے۔" اور رشید زبیر چلا گیا۔

(۱۱)

چار دن گذر گئے چوتھے دن شام کو مسٹر شاپورجی ٹاٹا جو بطور خاص بھیجا گیا تھا شیرازی کے کمرے میں بلا لیا گیا۔ وہ ایک جوان العمر سنہری بال والا نوجوان پارسی تھا اور بمبئی کے مشہور خاندان ٹاٹا سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کاروباری ذہنیت سے زیادہ سوسائٹی کا دلدادہ معلوم ہوتا تھا۔ اور اس

آمد کا اثر اس کے چہرے سے عمدہ نہ ظاہر ہوتا تھا۔ شیرازی نے نہایت مشفقانہ لب و لہجہ اختیار کیا اور ایک آرام کرسی پر اپنے بازو میں بیٹھ جانے کی خواہش کی۔ شاپور جی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا سلک کا ہیٹ نیچے فرش پر رکھ دیا انسپکٹر شیرازی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ مسٹر شاپور جی ۲۶ - فردوس ولا . . . ؟"

"جی ہاں . . . . اور کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ . . . ؟"

"ایک لمحہ! میں نے آپ کو ایک چاکولیٹ کے بکس والے معاملہ میں طلب کیا ہے؟ جو آپ کی بیوی کو بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔"

"اوہ، وہ،" شاپور جی نے چلا کر کہا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بالکل سکون سا ہوگیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مسٹر آپ کو جو حالات اس چاکولیٹ کے بکس والے سلسلے میں معلوم ہوں مجھے بتائیے کہ وہ کس طرح آیا اور پھر کیا ہوا؟

"جی تو جناب ایک ہفتہ ہوا جب میری بیوی مسز فردوس نے ایک چاکولیٹ کا بکس بطور تحفہ وصول پایا۔ اس کو مٹھاس کے استعمال کی ممانعت کردی گئی ہے اور اس نے کہا کہ میں اس بکس کو اپنے چچا کیلئے کل ان کی سالگرہ کے موقع پر بطور تحفہ بھیجدونگی۔ میں نے کل شام تک اس کے متعلق کچھ بھی نہ سنا۔ کل شام جب میں مکان پر پہنچا تو وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھی سوئی نہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ مجھے اس چاکولیٹ کے بکس کو بھیجنے سے بہت تکلیف ہوئی کیونکہ ان کی وجہ سے چچا بہرام علیل ہوگئے اور دو تین دن پہلے ایک شریف صورت انسان انہیں کے متعلق مجھ سے دریافت کرنے آیا۔ وہ یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے ان کو کہاں سے خریدا اور میں نے اسے بتادیا کہ یہ مسز کہکشاں کے پاس سے تحفۃً میرے پاس آیا ہے۔ وہ مسز کہکشاں کے پاس بھی پوچھنے گیا ہوا ہے وہ خفیہ پولیس کا انسپکٹر تھا۔ اور چاکولیٹ زہریلے تھے وہ یہ کہکر رونے لگی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ تم فکر نہ کرو۔ یہ مسز کہکشاں جانیں اور انسپکٹر انہیں علم ہوگا کہ چاکولیٹ کہاں سے خریدے گئے ہیں۔ میں تھکا ہوا تھا اور یہ کہہ کر سونے چلا گیا لیکن دوسرے ہی دن علی الصباح مسز کہکشاں کا ایک خط فردوس بائی کے نام موصول ہوا جس میں اس نے چاکولیٹ بھیجنے کے شکریہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ چاکولیٹ اس نے نہیں بھیجے تھے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم مناسب یہ ہے کہ یہ قصہ پورا خفیہ پولیس سے کہدو چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔"

انسپکٹر شیرازی نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں اُس نے ایسا ضرور کیا لیکن میں نے حالات کو پہلے ہی تمام و کمال معلوم کرلیا تھا کیونکہ میں خود بھی میڈم کہکشاں کے پاس گیا تھا۔ کیا آپ کو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں؟"

"ہاں اس سے زیادہ میرے علم سے باہر ہے لیکن اس کا مجھے اعتراف ہے کہ اس قصے سے مجھے تکلیف ضرور ہوئی۔ یہ اب تک ایک راز ہے میرا ارادہ تھا کہ خود آکر پولیس سے اس کے متعلق دریافت حالات کروں لیکن میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ خفیہ پولس سے جو انسپکٹر تفتیش کیلئے یہاں آیا تھا اس نے مجھے منع کردیا تھا کہ میں کسی سے کچھ نہ کہوں اس لئے خاموش رہا"

یہ تمام گفتگو مسٹر شاپور نے نہایت ایماندارانہ اور صفائی کے ساتھ کی جس کے اختتام پر انسپکٹر نے کہا۔

"مسٹر شاپور جی ہم نے معلوم کرلیا ہے کہ وہ شخص جس نے چاکولیٹ کا بکس بھیجا تھا یہ مقصد رکھتا تھا کہ آپ کی اہلیہ مسز فردوس بائی ٹاٹا کو زہر سے ہلاک کردے۔"

"میری بیوی کو ہلاک کردے! فردوس کو!! جناب عالی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ چاکولیٹ کارخانہ کی غلطی وغیرہ کی بنا پر حادثہ کے طور پر خراب نہیں تھے کیونکہ ان کی صرف بالائی تہ میں زہر کی آمیزش تھی۔ یقیناً یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ وہ کس طرح آئے تھے اور یہ دریافت ہوجانے پر کہ ان میں زہر کا اثر تھا آپ کو یہ شبہ ہونا چاہئے تھا کہ انہیں بھیجنے کا مقصد صرف آپ کی بیوی کی ہلاکت تھی۔"

"یقیناً جناب عالی، یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ کوئی میری بیوی کے درپے ہلاکت نہیں ہے، وہ بہت ہی منکسر المزاج اور مہربان خاتون ہے علاوہ ازیں اس کی موت سے کسی کو فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔"

"کیا آپ کو بالکل یقین ہے؟"

"یقیناً، اس کی ہلاکت سے مالی اور مادی اعتبار سے کوئی مستفید نہیں ہوسکتا۔"

ٹھیک ہے۔ لیکن ایک عورت آپ کی طرح قیاس آرائی نہیں کرسکتی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک عورت کے متعلق جس کو آپ اور فردوس بائی دونوں خوب جانتے ہیں۔ ہم نے چاروں میں کافی معلومات فراہم کرلی ہیں۔ مسز کہکشاں نے ایک فہرست مجھے ایسے ملاقاتیوں کی بھیجی تھی جو مسز فردوس بائی اور اس کے درمیان مشترک ہیں۔ اس عورت کا نام بھی اس فہرست میں موجود تھا اس کے علاوہ اس فہرست سے مجھے کوئی امداد نہیں ملی حتیٰ کہ سید زبیر سارجنٹ نے کل سلسلہ کی سب کڑیاں ملادیں اور اس نے اس عورت کا نام اور صحیح پتہ مع ضروری حالات بہم پہونچا دیئے۔

تحقیقات سے یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف اس نے زہر خریدا بلکہ انجکشن دینے کے لئے سرنج بھی خریدی اس کے ملازمین دوسری باتوں کے متعلق شہادت دینے کے لئے تیار ہیں اور جرم اس کے خلاف بالکل ثابت ہے۔"

"بدنصیب!" مسٹر شاپور کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا " لیکن یہ کون عورت ہے؟"

" وہ ایک نوجوان بیوہ ہے اور اس کی عمر ۲۶ سال ہے اس کا نام آئرین بلینک ہے اور وہ اینگلو انڈین فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔"

" آہ، آہ،" مسٹر شاپور جی نے چلا کر کہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس پر برف کا پانی ڈالدیا ہے" کیا۔ کیا فرمایا آپ نے؟"

" جی .... فرمائیے! آئرین بلینک! ...." انسپکٹر نے شاپور جی کی گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔

" مسٹر شاپور جی! مجھے تمام حالات سے آگاہی ہے۔ آپ کے اس عورت سے تقریباً ایک سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ اندرونی اور گہرے تعلقات ہیں آپ نے اپنی فرشتہ خصلت بیوی کو دھوکہ دیا ہے لیکن آپ اپنے اور اس کے ملازمین کو دھوکہ نہ دے سکے ہیں" آئرین بلینک" اپنی اس پوزیشن میں رہتے رہتے مجبور ہوگئی تھی۔ وہ آپ کی بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی اور آپ کی دولت کی حصہ دار ہوکر گذر کرنے کی فکر میں تھی اور اس کا یہ مقصد حاصل ہونے کے لئے صرف ایک راستہ تھا جو آپ کی موجودہ بیوی فردوس بائی کی موت سے صاف ہوسکتا تھا۔"

شاپور جی نے ایک گہری سانس لی وہ کمرے میں ایک ۳۰ سالہ جوان انسان کی شکل میں داخل ہوا تھا لیکن چند منٹ گذرتے ہی اس کی عمر زیادہ معلوم ہونے لگی ——— انسپکٹر شیرازی کو اس پر بہت رحم آیا اور اس نے کہا۔

" میں آپ کو اس کا الزام نہیں دیتا۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ایک شخص اپنی بیوی سے بھی محبت کرسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی دوسری عورت سے بھی وابستہ رہ سکتا ہے ایک آدمی ہمیشہ اس نفسانی یا نظری خواہش کا مالک نہیں ہوسکتا جو اس کے اندر موجود ہے لیکن اگر مشکل حالات میں بھی وہ اس پر قادر نہ ہوسکے تو یہ اس کی ذات وصفات دونوں کے لئے مہلک ثابت ہوسکتا ہے غور کیجئے کہ اگر یہ خطرناک عورت جرم میں آپ کو بھی بطور معین جرم شریک ثابت کرنے کی کوشش کرتی یا آپ ہی اوپر اس کا سارا بار ڈالدیتی تو آپ اس سے کس طرح بچ سکتے تھے؟

یہ صحیح ہے کہ آپ بے گناہ ہیں کیونکہ آپ کی بیوی نے یہ واقعہ برسبیل تذکرہ بیان کردیا تھا کہ اس کو شکر کے استعمال کی ممانعت سے آپ باخبر ہیں ڈاکٹر شا" نے جس سے میں ملاقات کرچکا ہوں نہ صرف اس کی تصدیق کی بلکہ یہ اظہار بھی کیا کہ غذا کی تبدیلی اور شکر کی ممانعت کئے جانے کے موقع پر آپ بھی کمرہ مطب میں موجود تھے۔ اور چونکہ ایک آدمی یہ جانتے ہوئے کہ دوسرے آدمی کو شکر کے استعمال کی ممانعت ہے شکر ہی میں زہر ملاکر ایسے نہیں دے سکتا ——— صرف اس واقعہ کی بنا پر مجھے آپ کی معصومیت کا یقین ہے۔ ورنہ میں آپ کو گرفتار کرلیتا۔"

حالات جس مرحلہ پر ہیں ان میں صرف ایک معجزہ کی بنا پر آپ بچ گئے۔ اب آپ جاکر اپنا کاروبار سنبھال سکتے ہیں اور گھر کی دیکھ بھال کرسکتے ہیں لیکن دانشمندی کے ساتھ اپنی عزت خود کیجئے۔ آپ کے وقار کو اس واقعہ سے تھوڑا سا نقصان پہونچا ہے لیکن ناقابل تلافی نہیں آپ کی معصوم اور نیک بیوی کو اس واقعہ کا قطعاً علم نہ ہونا چاہئے نہ اس کے متعلق آپ کے احباب کو کوئی آگاہی ہونی چاہئے نہ خریداروں کو۔"

شاپور جی نے ایک آہ کے بعد کہا" انسپکٹر شیرازی یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تم نے ابھی کہا کہ ہم نے اسے گرفتار ......"

انسپکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" ہاں وہ آج صبح دس بجے گرفتار کی گئی تھی۔ اپنے کمرہ نشست میں وہ اس وقت موجود تھی

جس کے متعلق آپ خوب جانتے ہیں کہ گویا ایک چڑیں بلڈنگ میں واقع ہے۔ جب اس کو جرم بتایا گیا تو وہ سپاہیوں کے حلقے سے نکل کر ایک کرہ تاریک گاہ میں جا چھپی اور جب دروازہ توڑا گیا تو وہ مردہ پائی گئی۔

مجھے یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ گذشتہ چند دنوں میں پولیس نے خفیہ طور پر اس کی سابقہ تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ دو مرتبہ شادی کر چکی ہے اور اس کے دونو سابقہ شوہر مشتبہ حالات میں مرے ہیں اور جناب من یہی وہ عورت ہے جس کو قدرت نے آپ کا شریک زندگی بنانا چاہا تھا اور جس کو آپ پر اس طرح مسلط کر دیا تھا کہ آپ اپنی نیک اور شریف الخلق بیوی کو بھول جائیں۔"

—— (۱۲) ——

انسپکٹر شیرازی نے میرے ایک دوست سے یہ واقعہ سناتے وقت بیان کیا کہ اس سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ باوجود اپنے اس سنہرا اصول کے کہ ہر جرم میں انھیں تینوں مقاصد یعنی فطری خواہشات، انتقام اور حرص و زمین سے ایک مقصد ہوتا ہے اس نے حرص کو بھی اس حلقہ میں جگہ دی۔ بہرحال یہ آئرین بلیک کی ہرگز خواہش نہ تھی کہ وہ مسٹر شافع جی پر کل قبضہ کر لے صرف ایک آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کیسۂ زر کی حیثیت سے۔"

اس نے کہا۔ "ایک سال میں خالی کیسہ زمین میں دفن کر دیا جاتا اور وہ رقم اس کی جیب میں ہوتی اس کا مجھے کامل یقین ہے۔"

میرے دوست نے ازراہ خوشمزاجی پوچھا۔

"مگر شیرازی اس کے بعد کیسۂ زر کا کیا حال ہے؟"

"اوہ! اب وہ نہایت بلند اور محترم مقامات پر پایا جاسکیگا۔ بلکہ گذشتہ اتوار کو سید زبیر نے مجھ سے یہ کہا کہ مسز فردوس بائی ٹاٹا اس کو سنبھالے ہوئے چرچ گیٹ لوکل اسٹیشن کی طرف جا رہی تھیں۔

التجائے محبت

میرے محبوب! مجھے تم سے عشق ہے۔ میں تمہاری محبت کا بھکاری ہوں۔ مجھے محبت کی بھیک دیدو، میں گرفتار محبت ہوں اس انجان طائر کی طرح جو اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر قید ہو گیا ہو، میرا شیشۂ دل ٹوٹ کر شراب محبت سے خالی ہو چکا ہے —— میرے محبوب! اسے مئے الفت سے لبریز کر دو —— میری محبت مجھے بخش دو۔

اگر تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے تو پھر میرا درد، میری خلش مجھے دیدو، مجھ پر نگہ غلط انداز نہ ڈالو، میں اپنے سیاہ خانے میں واپس چلا جاؤں گا —— ہجر کی سختیاں ظلمت فرقت میں بیٹھ کر برداشت کر لونگا —— اس کھلی تحقیر محبت پر ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر غم کے آنسو بہالوں گا —— مجھ بدبخت کی طرف نہ دیکھو۔ میری تکلیف میرا آزار مجھے دیدو۔

اگر تمہیں کچھ پاس وفا ہے۔ میرا کچھ درد رکھتے ہو تو مجھے میری خوشی اور شادمانی دیدو۔ اگر میرا دل محبت میں سرشار ہو کر سیلاب مسرت میں بہ جائے تو تم اس کی اس ظاہری خوفناک بربادی پر خندہ استہزا کو کام میں نہ لاؤ۔

جب میں اپنی خوشیوں پر حکمراں ہو جاؤں، محبت و خلوص کے شاہانہ احکام صادر ہونے لگیں —— اس وقت جب میں رحم و کرم کا دیوتا بن کر تمہیں اپنا مقرب بنالوں تو تم آہ! میرے محبوب!! بصد ناز و فخر میرا عیش، میری عشرت مجھے دیدو، اے جان! کسی کا محبوب ہونا خدا ہو جانا ہے ——!

ٹیگور —————— سید یوسف بخاری دہلوی،

تبرکات

حضرت حسان الہند علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ

اے نمک بر زخمِ دل از لعلِ خندانِ شما | صبحِ محشر داغ از شورِ نمکدانِ شما

تشنۂ مارا بساقی تواں سیراب کرد | بوسہ کافیست از چاہِ زنخدانِ شما

تا کجا از فیضِ یکرنگی دلِ آشفتہ را | صحبت گیر است بازلفِ پریشانِ شما

کردہ ام سیراب از کوثر زبانِ تشنہ را | تا شدم رطب اللسان از شکر احسانِ شما

جوہرِ خوشگوئی آزاد می باید شناخت

عندلیبے نیست چوں او در گلستانِ شما

یمین السلطنۃ مدظلہ کی شاعری

جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدرآباد

زمین اپنے محور پر بیشمار گردشیں کر چکتی ہے اور آفتاب افق مشرق سے ہزاروں بار طلوع ہو لیتا ہے اس وقت کہیں جاکر ایک ایسی جامع و باکمال ہستی کا دنیا میں ظہور ہوتا ہے جس کے انوار کمال سے فضائے عالم جگمگا اٹھتی ہے۔ راجہ بکرماجیت کو کالیداس جیسا مشیر و ادیب۔ ہارون الرشید کو یحییٰ جیسا مدبر وزیر اور اکبر اعظم کو ٹوڈرمل جیسا فرزانہ سیاست داں حسن اتفاق سے مل گیا۔ قدرت کی یہ سنت ناقابل تبدیل قانون کی حیثیت میں ہمیشہ جلوہ گر رہی ہے کہ نیک دل فیض رساں۔ عدل گستر اور رعایا پرور بادشاہ کو باتدبیر۔ ہردلعزیز، مرجع انام اور صاحب کمال وزیر ملا ہے۔ الحمدللہ کہ قدرت کی اس سنت جاریہ کا ایک منظر دنیا نے ارض دکن میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا یعنی اعلیٰحضرت سلطان العلوم جلالۃ الملک آصف سابع خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ کو یمین السلطنۃ جلالت مآب سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شادؔ مدظلہٗ جیسا صاحب تدبر نایب حکومت مل گیا اس "قران السعدین" کو یقیناً اہل دکن کی خوش قسمتی سمجھئے ورنہ اس پر آشوب دور میں جب کہ ہر طرف قحط الرجال رونما ہے ایسی ہردلعزیز اور جامع کمال ہستیوں کا وجود قدرت کا بہترین عطیہ ہے۔

ہزاکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر کے اوصاف و کمالات کی تحدید نہیں کر سکتا ہوں اور نہ کسی رسالے کے چند صفحات اس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ آپ کا ہر وصف تاریخ اخلاق کا ایک مستقل عنوان ہے جس پر نگارش و تصنیف کی بلند سے بلند عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔

سر یمین السلطنۃ ظاہری طور پر ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے وزیر اعظم ہیں۔ ذاتی حیثیت سے آپ کا قلمرو دکن کے امرائے عظام میں شمار ہے۔ لیکن اس امارت اور جاہ و مرتبت کے باوجود آپ کا دل "درویش صفت" اور آپ کا ضمیر "فقیرانہ" ہے۔ کوئی شک نہیں کہ امارت و ثروت کو لات مار کر اور عیش و آرام کو تج کر فقر و غنا حاصل کرنا ایک مستحسن فعل ہے لیکن امیری میں فقیری کرنا اس سے کہیں زیادہ مستحسن اور مشکل ہے۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن ان عنوانات پر اگر میں نے زیادہ وقت صرف کیا تو شاید میں اپنے موضوع سے ہٹ جاؤنگا۔ میرا موضوع یمین السلطنۃ کی شاعری ہے لہذا میں تصویر کے اسی رخ سے بحث کرونگا۔

قبل اس کے کہ ہزاکسلنسی سر یمین السلطنۃ کی شاعری سے بحث کی جائے میں اصولی طور پر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ "شعر" کے لئے کس نوعیت کے قلب و دماغ کی ضرورت ہے اور کس جام میں اس تیز و تند مگر لطیف و روح پرور شراب کو ڈھالا جاسکتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہر دل میں شعر کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ہر دماغ فکر سخن نہیں کر سکتا۔ لہذا معلوم ہوا کہ قدرت نے مخصوص دل و دماغ بنائے ہیں جن میں شعر کہنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس چیز کو اگر پھیلا کر بیان کیا جائے تو میرے خیال میں شاعر کے کریکٹر کے تمام خد و خال اس آئینے میں نظر آسکیں گے اور اس طور پر شاعر اور غیر شاعر کے مابین ایک حد فاصل خود بخود قائم ہو جائیگی۔

شاعر کی خصوصیات

شاعر کو سب سے پہلے انتہائی حساس اور نرم دل ہونا چاہیے جب تک

ہزاکسیلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر
صدر اعظم مملکت آصفیہ

کسی شخص کا دل درد سے لبریز نہ ہوگا اس میں شعر گوئی کی استعداد پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ درد کی مضراب ہے جو سازِ دل کو چھیڑ کر نغمہ خلق کرتی ہے۔ یہ درد کا آبحیات ہے جو شعر کے نرم و نازک پودے کو سیراب کرتا ہے۔ غرض شعر کا وجود تمام تر درد سے عبارت ہے۔ شاعر کو دنیا میں قدرت صرف فلسفۂ درد بیان کرنے کے لئے بھیجتی ہے جو مخلوق خدا کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اگر سوز و گداز کو قلب شاعر سے جدا کر دیا جائے تو وہی شخص جس کے ایک ایک شعر پر لوگ سر دھنتے تھے اب اس کی پوری غزل بھی دنیا کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیگی اور ان کی ساری شاعری ایک جسد بے روح کی حیثیت میں باقی رہ جائیگی۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جاہ و امارت کے تخت پر متمکن ہونے کے بعد دل پتھر اور ضمیر سخت ہوگئے ہیں۔ اپنے ذاتی عیش و راحت پر اہل امارت نے دنیا کی ہر چیز کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ہز اکسلنسی سر یمین السلطنۃ کی ہستی نے جاہ و امارت کی اس قدیم روائت کو بالکل الٹ دیا۔ آپ کو قدرت نے ایک ایسا درد مند دل عطا فرمایا جو سوز و گداز سے لبریز ہے اور جو غیروں اور بیگانوں کی تکلیف و پریشانی سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ آپ بابِ حکومت کے معزز صدر نشین ہیں لیکن خاک نشینوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ اسی چیز نے سر مہاراجہ بہادر شاد کے قلب کو شعریت سے لبریز کر دیا اور یہ بالکل مسلّم اور قطعی محقق ہے جو شعر سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے اس کو دنیا کبھی نہیں بھولتی۔ اور ایسے شعر کو "بقائے دوام" حاصل ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر ذاتی حیثیت سے کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے لیکن وہ بالکل غیر متعصب اور پاک باطن ہوتا ہے تعصب انسان کو تنگ نظر بناتا ہے اور شاعر وسیع النظر ہوتا ہے پس دوسرے معنی میں تعصب شاعری کی ضد ہے۔ جو لوگ تعصب کے شراروں سے دل کو گرما کر شعر کہتے ہیں کبھی کامیاب شاعر نہیں بن سکتے۔ اس ذہنیت کے افراد ہمیشہ ناکام زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے اشعار قوم و ملک میں افتراق و انشقاق پھیلاتے ہیں اور دنیا اس قسم کی شاعری کو ہمیشہ ٹھکراتی ہے سعدی۔ حافظ۔ ابن یمین۔ خیام۔ خسرو۔ حسن اور غالب کے کلام پر گہری نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ مقدس نفوس اگرچہ اپنے مذہب کے انتہائی پابند تھے لیکن ان کے گوشۂ قلب میں تعصب کی ایک جھلک بھی موجود نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام کو قبول عام حاصل ہوا اور آج در و دیوار سے ان کے اشعار کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ہز اکسلنسی سر یمین السلطنۃ شاد نہ صرف غیر متعصب بلکہ تعصب کے دشمن ہیں۔ حضرت شاد کے دامن کو مذہبی عصبیت نے کبھی نہیں چھوا۔ اسی رواداری وسیع النظری اور فراخ حوصلگی کا عکس آپ کی شاعری میں نمایاں ہے اور اسی چیز نے آپ کی شاعری میں مقبول عام ہونے کی استعداد پیدا کر دی ہے۔

تصوف شاعری کی روح ہے۔ میرا ایقان ہے کہ اگر تصوف کو شاعری سے جدا کر دیا جائے تو پھر شاعری ایک ایسے جسم کی شکل میں باقی رہ جائیگی جس کی روح نکل چکی ہو۔ حضرت شاد مدظلہٗ کو تصوف سے فطری لگاؤ اور قلبی مناسبت ہے۔ آپ نے تصوف کا علمی اور عملی طور پر مطالعہ کیا ہے شراب تصوف کا نشہ صوفی شاد کے قلب و دماغ پر پورے طور پر چھایا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ حافظ و خسرو کے ایک ایک شعر پر حضرت شاد پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ جسم کانپنے لگا اور آنکھوں سے اشکوں سے لڑیاں جاری ہو گئیں۔ نظیری نیشاپوری نے شاید اسی کیفیت کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا تھا ؎

بر صوفیٔ بے وجد و بال است عبادت
بر شیشہ کہ خالیست زِ مے سجدہ حرام است

ہز اکسلنسی سر یمین السلطنۃ شاد کی زندگی کو اگر دو جامع عنوانوں پر تقسیم کیا جائے تو اس کی یہ صورت قائم ہوگی۔

(۱)۔ سخاوت

اور

(۲)۔ تصوف

سطور بالا میں فلسفۂ درد کے تحت دکھایا جا چکا ہے کہ حضرت شاد کس قدر درد مند دل رکھتے ہیں "سخاوت" اور بذل و عطا بھی اسی تصویر کا ایک رخ ہے آپ کی داد و دہش ضرب المثل بن گئی ہے لہذا اس عنوان پر میں مزید روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ تصوف کے متعلق میں یہ کہونگا کہ آپ کی ساری زندگی اسی سے عبارت ہے اور اس پر آپ نے

تھی۔ جب انسان اس دنیائے ہنگامہ زا میں آیا تو عالت اول کے نقوش اس کے دوح پر باقی تھے اور وہ بالکل مطمئن تھا۔ لیکن دنیا میں کثرت کو دیکھکر وہ جو وحدت مطلق سے تعلق خاص رکھتا تھا گھبرا گیا۔

اک دو حرفی کن سے یاں سب کچھ ہوا سب کچھ بنا
لفظ حرفوں سے بنے، لفظوں سے جملہ بن گیا

آیہ کن فیکون" کی کتنی بلیغ تشریح کی ہے۔ مصرعہ اولیٰ کا اخیر ٹکڑا اپنی جگہ ایک مستقل حقیقت ہے "سب کچھ ہوا اور سب کچھ بنا" کہہ کر حضرت شاد نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جملہ موجودات کی تخلیق لفظ "کن" کی رہین منت ہے۔

ہے اس کی ذات کا جلوہ تمام عالم میں
عیاں ہے وحدت و کثرت کسی کو کیا معلوم

"کسی کو کیا معلوم" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وحدت و کثرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کثرت کے بغیر وحدت ظاہر نہیں ہو سکتی اور وحدت کے بغیر کثرت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس چیز کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ع کثافت بے لطافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔

حضرت شاد فرماتے ہیں کہ کثرت کے تمام مظاہر وحدت کے دم سے قائم ہیں اور ذات احدیت "وحدت مطلق" کا نام ہے پس دنیا میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ذات کا پرتو ہے شعر کی سلاست تعریف سے مستغنی ہے۔

وہ حکم دیں جب ہاتھ لگا سکتا ہے کوئی
شیشہ نہ کسی کا ہے نہ پیمانہ کسی کا

اس شعر میں بھی حقیقت نگار صوفی شاد نے حقائق و معارف کی تفسیر فرمائی ہے۔ دنیا کی تمام اشیاء کی مالک و مختار ذات خداوندی ہے ایک ذرہ پر بھی غیر اللہ کا قبضہ نہیں ہے پس جو بھی غیر اللہ ہستی کسی چیز پر قابض و متصرف نظر آتی ہے اس کو خدا کی طرف سے اجازت حاصل ہے اپنی ذاتی مرضی اور ارادہ سے کوئی ایک تنکے کو بھی جنبش نہیں دے سکتا۔ مصرعہ ثانی اس قدر شیریں انداز میں فرمایا ہے کہ ہر مرتبہ پڑھئے اور قند مکرر کا لطف اٹھایئے۔

ہم کسی اہل دل سے پوچھیں گے
پردۂ دل میں بولتا کیا ہے ؟

"اہل دل" سے حضرت شاد نے کتنا لطیف کام لیا ہے کہ شعر کی سطح عرش کے قریب تک بلند ہو گئی ہے۔ مصرعہ ثانی میں استفسار کا پیرایہ اتنا بلیغ و معنی خیز ہے کہ وجدان کو وجد آیا جاتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے اہل دل کے سوا ساز دل کے نغموں سے اور کون باخبر ہو سکتا ہے۔

لے لئے دنیا نے زینت کے لئے
مختلف رنگ آپ کی تصویر کے

کتنا رنگین شعر فرمایا ہے کہ دل و دماغ فردوس کی رنگینیوں میں جذب ہوئے جاتے ہیں۔ لفظ "مختلف" نے شعر کی معنویت کو "سحر حلال" بنا دیا حضرت شاد فرماتے ہیں کہ دنیا کے مختلف مظاہر و اعیان کی زیب و زینت پرتو نور باری سے عبارت ہے اس صورت میں تمام کائنات کی زیب و زینت کا باعث ذات واحد ہوئی اور یہی عقیدہ وحدت الوجود کی بنیاد ہے۔

ہر چند زمانے میں ہزاروں ہی حسیں ہیں
صورت تری ان سے کسی صورت نہیں ملتی

مجاز کی نظر سے اس شعر پر تفکر کیا جائے تو بھی چوٹ کھایا ہوا دل بہت کچھ حظ حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ شعر ایک مستقل دیوان ہے "حسن مطلق" کی سب سے نمایاں جھلکی انسان میں نظر آتی ہے اور انسان و دوسری مخلوقات کے مابین یہی شرف مابہ الامتیاز ہے اس اعتبار سے انسان کونین کی حسین ترین مخلوق ہے حضرت شاد فرماتے ہیں کہ ان تمام محاسن کے باوجود کوئی صورت بھی صورت الٰہی سے نہیں ملتی مصرعہ ثانی میں صورت کی تکرار اس بات کی ضامن ہے کہ شاعر کو الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔

نظارہ سوز جلوۂ رخسار یار ہے
اس پر بھی کوئی دید کا امیدوار ہے

مصرعہ ثانی میں "بھی" اور "کوئی" نے شعر میں جس قدر (معنویت) پیدا کر دیا اس کی تشریح حیران ہوں کہ کن الفاظ میں کروں؟ لذت دید کو کس عنوان سے ظاہر کیا ہے کہ ہر لفظ "جنت نگاہ" بن گیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مرنے کے بعد روح کو دنیا سے تعلق رہتا ہے تو غالب دہلوی کی روح پر اس شعر کے تاثرات سے حال طاری ہو جانا چاہئے۔

تو اپنی شوخیوں سے وہاں ہے جہاں نہ تھا
میں اپنی بیخودی سے جہاں ہوں وہاں نہیں

اپنی زندگی کے قیمتی اوقات صرف کئے ہیں۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ "تصوف" شاعری کی روح ہے لہذا اجابت یمین السلطنت کے کلام کو اگر "روح شعریت" کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ چونکہ قلب وضمیر کو تصوف سے لگاؤ ہے لہذا جب مسائل تصوف بیان فرماتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "شاعر" واردات قلب بیان کر رہا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کے قریب آتا ہوں لیکن قربت موضوع سے قبل مجھے اتنا اور کہنے دیجئے کہ ہز اکسلنسی سر یمین السلطنت شاعر بھی ہیں اور شاعر نواز بھی۔ جس طرح کہ آپ کی ذات سے معنوی طور پر شاعری مستفید ہے اسی طرح شعراء پر آپ کے ابر کرم کی بارش شاعری کو نوازتی ہے اور سچ تو یہ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خصوصیات شاعری

ہز اکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت شاد کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے یہاں قدیم وجدید دونوں رنگ کے اشعار ملتے ہیں آپ کی شاعری پر اگرچہ قدیم رنگ غالب ہے لیکن قدیم رنگ میں جدید رنگ اس اعتدال وموزونیت کے ساتھ سمویا ہے کہ ایک ہی ساغر میں دو قسم کی شرابوں کا لطف آتا ہے آپ کو مغلق الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے بالکل دلچسپی نہیں ہے اس لئے آپ کے یہاں سلیس سے سلیس اور سادہ سے سادہ الفاظ نظر آتے ہیں اشعار کی برجستگی اور روانی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت شعر فرماتے ہیں جب طبیعت شعر کہنے پر آمادہ ہوتی ہے اسی چیز کا نام آمد ہے۔ بعض جگہ لطیف کنایوں۔ حسین وجمیل استعاروں اور پاکیزہ تشبیہوں کا اس قدر برمحل استعمال فرماتے ہیں کہ معنوی حیثیت سے شعر بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہ قادر الکلامی کافی مشق ومہارست کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ الفاظ کی نشست اور جملوں کی ترکیب کا آپ کو خاص سلیقہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چابکدست صناع نے نگینے جڑ دیئے۔ چونکہ حضرت شاد کی نظر "عروض" پر بھی ہے اور اس سنگلاخ میدان میں بھی آپ کے توسن فکر نے کافی جولانی کی ہے لہذا آپ کا کلام عموماً عروض کی غلطیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اور موجودہ دور میں یہ بات بہت کم شعراء کو حاصل ہے۔

ان تمام شاعرانہ خوبیوں کے باوجود آپ شعر بہت ہی جلد فرماتے ہیں اور یہ چیز کسبی نہیں "وہبی" ہے جو آپ کے شاعرانہ درجہ کو اور زیادہ بلند کر دیتی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اردو فارسی دونوں زبانوں پر آپ کو قدرت ہے۔ میں ذیل میں آپ کے صرف اردو اشعار سے بحث کرونگا جو میں نے آپ کی اس بیاض سے منتخب کئے ہیں جس میں تقریباً دو سال کی مدت کا کلام درج ہے۔ میرے اس مضمون کو نہایت ہی اجمالی مضمون سمجھنا چاہئے اگر زمانہ نے فرصت دی تو انشاء اللہ شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالوں گا۔ اس وقت تو حضرت شاد کے صرف چند اشعار سے آپ کی تواضع کی جا رہی ہے۔

احسانمند ہوں نگہ امتیاز کا
پہلا مجھی پہ وار کیا تیغ ناز کا

اس شعر میں "نگہ امتیاز" نے شعر کی معنویت کو جس قدر بلند کیا ہے اس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ پھر الفاظ کی نشست۔ دونوں مصرعوں کا باہمی ربط، جزالت ترکیب اور سلاست لفظی اس پر مستزاد۔ اس شعر پر اگر مجاز سے ہٹ کر غور کیا جائے تو بڑے ہی لطیف معنوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یعنی "مجھی" سے "انسان" اور "نگہ امتیاز" سے "ذات احدیت" مراد لی جائے۔ ظاہر ہے کہ خدائے قادر وبرتر نے اپنے عشق ومحبت کے لئے انسان کے کاشانۂ قلب ہی کو منتخب فرمایا اس لئے تمام عالم انسانیت کو ذات احدیت کا احسانمند ہونا چاہئے کہ معبود برحق کی نگہ امتیاز سب سے پہلے قلب انسان پر پڑی۔

مطمئن تھا جب بشر آیا عدم آباد سے
دیکھ کر ہنگامۂ ہستی کا پریشاں ہو گیا

یہ شعر خالص تصوف میں ڈوبا ہوا ہے اور صوفی شاد نے تصوف کے معرکۃ الآرا مسئلہ کو اس سلاست کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ نفس مسئلہ میں کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہا۔

صوفیوں کی اصطلاح میں "عدم" سے مراد وہ زمانہ یا وہ حالت ہوتی ہے جب انسان علم الٰہی میں تھا وہ حالت انتہائی سکون واطمینان کی حالت

کہا جاتا ہے کہ "ایک اور صرف ایک شعر شاعر کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے" اگر یہ قول صحیح ہے تو حضرت شاد کے کمال شاعری کا آئینہ دار صرف تنہا یہی شعر ہو سکتا ہے اس شعر کا ایک ایک ٹکڑا تفصیل کا طالب ہے میں چند سطور میں اس پر کس طرح تبصرہ کر سکتا ہوں۔ مصرع اولی میں معشوق کی ترقی کا ذکر کیا ہے کہ اس کی شوخیوں نے اس کے درجہ محبوبیت کو بلند کر دیا اور اپنے لئے عاشق کہتا ہے کہ بیخودی کے ہاتھوں میں جس جگہ نظر آتا ہوں وہاں بھی نہیں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر مدح و تصنیف سے بے نیاز ہے اور میں اپنے مطالعہ اشعار اور حافظہ کی ضمانت پر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی فارسی اور اردو شاعر کے یہاں اس خیال کو نہیں پایا۔

میری نظروں میں تم بسے ایسے
جس کو دیکھا تمھیں نظر آئے

"ایسے" کی کتنی محکم توجیہ کی ہے دوسرا مصرعہ سلاست و بیساختگی کی جان ہے۔ نظروں میں بسنے کے یہی معنی ہیں کہ جس پر نظر پڑے وہی ہستی نظر آئے جو نظروں میں بس چکی ہے ورنہ نظروں میں لینا ممکن نہیں ہوتا اور اس میں خامی باقی رہ جاتی ہے۔

آپ چھپنے سے ہوئے مشہور خلق،
ہو گئے بے پردہ، پردہ کیا کیا؟

بالکل سادہ شعر ہے مگر سادگی، حقائق و معارف کی ایک دنیا اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ "پردہ کیا کیا؟" میں کس قدر زبان کا چٹخارہ اور بیان کی شوخی پنہاں ہے اور پھر لطف یہ کہ سچی اور صحیح حقیقت کا اظہار۔ نہ مبالغہ سے کام لیا گیا اور نہ استعارہ کی ضرورت داعی ہوئی ایسے شعر کو الہامی شعر کہا جاتا ہے۔

اے شاد دیکھ چشم حقیقت شناس سے
دامان دشت و کوہ میں عالم بہار کا

"بہار" سے یہاں مراد پر تو ذات باری ہے "صوفی شاد" فرماتے ہیں کہ وہ مقامات جن کو عام لوگ اپنے نقطۂ نظر سے زیادہ مقدس نہیں سمجھتے ہیں وہاں بھی انوار ربانی نظر آتے ہیں صرف چشم حقیقت شناس کی ضرورت ہے بہار کی صحیح کیفیت چمنستان میں نظر آتی ہے لیکن وہ نگاہ جس میں بہار بس گئی ہو اگر پہاڑ اور بیابان پر پڑ گئی تو اس کو وہاں بھی بہار کا عالم نظر آئے گا۔ اختلاف مکانی سے ہیئت جلوہ پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔

فرع ہوں میں اصل کی اے شاد اس گلزار میں
بحر کن کی موج ہوں جس کا کہیں ساحل نہیں

یہ شعر واقعی ایک تصوف میں ڈوبے ہوئے شاعر کے کہنے کا ہے صوفی شاد مدظلہ کس مزے سے فرماتے ہیں کہ انسان فرع ہے اور اس کی اصل ذات باری ہے یعنی وہ ایسے دریا کن کی موج ہے جو ناپیدا کنار ہے۔ ہستیٔ انسان کو موج سے کس قدر بلیغ تشبیہ دی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جب تک بحر وحدت میں سکون تھا موجودات کا ایک نقش بھی ظاہر نہ تھا۔ بحر وحدت میں موج کا پیدا ہونا تھا کہ کائنات ہویدا ہو گئی اور انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے بحر کن کی موج انسان ہی کو کہنا چاہئے۔ اس کے بعد کا فیصلہ اکبر الہ آبادی کی زبان سے سنئے میں کچھ کہونگا تو مجھ پر شاید کفر کا فتویٰ لگا دیا جائیگا۔ یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں۔

میکش کو ترے ساقی یہ نشۂ وحدت ہے
میخانہ عالم میں آج اس کی حکومت ہے

ایک ایک لفظ شراب حقیقت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس شعر کو ذوق کے ساتھ پڑھئے اگر آپ پر مستی طاری نہ ہو جائے تو میرا ذمہ! میں اس کیفیت کو شرمندہ الفاظ کرنا نہیں چاہتا۔

برق عصمت کے شراروں سے نہ جل جائیں کہیں
ہاتھ اٹھا دامن یوسف کو زلیخا اپنا

بالکل نیا خیال اور اچھوتا مضمون ہے۔ "دامن" کے ساتھ "ہاتھ اٹھانے" نے اتنا لطف دیا کہ پیراہن یوسف کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہو گئے۔

طور پر ہوتے تو ہم بھی یہ مقرر دیکھتے
برق گرتی دیکھتے موسیٰ کو ششدر دیکھتے

لفظ "مقرر" نے مصرعہ میں جان ڈالدی۔ یہ مضمون اگرچہ عام الورود ہے لیکن شعر کے تیور اتنے تیکھے ہیں کہ ندرت و اختراع کا گمان

ہوتا ہے۔

بے خبر کیوں قافلے والے ہیں منزل سے مری
میری گم کردہ رہی کو کاش مڑکر دیکھتے،

اس شعر میں یاس و رجا کے دو پہلو ہیں لیکن میں "یاسیت" پر ہمیشہ رجائیت کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس اعتبار سے اس شعر کا یہ مفہوم نکلتا ہے کہ قافلے والوں سے جو میں جدا ہو کر پیچھے رہ گیا ہوں تو وہ اپنی نظر میں مجھے گم کردہ راہ سمجھتے ہیں۔ کاش وہ مڑکر اصل حقیقت پر نظر ڈالتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں کس منزل میں ہوں۔؟

وعدے پہ نہ آنے کی کوئی وجہ بھی آخر
فرصت نہیں یا تم کو اجازت نہیں ملتی

کوثر میں دھلی ہوئی زبان کا شعر ہے "فرصت" اور "اجازت" میں جو نازک فرق دکھایا ہے وہ حضرت شاد کی نزاکت آفرینی کا ناقابل ابطال ثبوت ہے۔ یہ مفہوم اس سے زیادہ شوخ اور رمزیدار الفاظ میں کیا بیان ہو سکتا ہے؟ پہلے مصرعہ کے بعد دوسرے مصرعہ کی ترقی ملاحظہ طلب ہے!

یہ وحشت قبر کی یہ ہو کا عالم اور یہ تاریکی
مگر آتے ہیں آنیوالے انساں یاں بھی مر مر کے

لکھنوی رنگ کا شعر ہے مگر تکلف و بناوٹ سے پاک و صاف، ردیف نے شعر کو بہت کچھ پرلطف بنا دیا۔ مصرعہ اولیٰ کی تدریجی ترقی کو توصیف و مدح سے مستغنی ہے۔ سبحان اللہ۔

منعمو در خیر کا کھولو اگر ہے دسترس
بخل کیوں ہے مستحق لطف و احساں کیلئے

سرمایہ داروں کو حاتم ثانی یمین السلطنۃ نے ایک ایسا بصیرت افروز درس دیا ہے جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد سرمایہ داروں اور مزدوروں کی موجودہ کشمکش کا خاتمہ ہو سکتا ہے کاش اس فلسفہ کو اس کی صحیح روشنی میں سمجھا جائے۔

ہوتا ہے وہی جو ہو مقدر تقدیر پہ زور ہے کسی کا

اس "زور ہے کسی کا" کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ صحیح بات سادہ الفاظ سلیس ترکیب، دلنواز انداز بیان! اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ۔

تدبیر کوئی ہو نہ سکی دست جنوں کی
دامن کو سنبھالا تو گریباں نہیں دیکھا

ردیف کا مصرعہ سے ربط دیکھئے پھر مصرعہ اولیٰ کی سلاست معنوی ملاحظہ فرمائیے دوسرا مصرعہ حضرت شاد کی قادر الکلامی کا گواہ ہے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

منہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار لے شبنم کا قطرہ قطرہ دُر شاہوار ہے

بہار یہ مضمون ہے پہلے مصرعہ میں پھولوں کا منہ موتیوں سے بھر کر شعر کو دُر یکدانہ بنا دیا دوسرا مصرعہ بھی موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔

کہتے ہو تم کہ صبر سے لو کام ہجر میں یہ جبر تو نہیں ہے مرے اختیار کا

مصرعہ ثانی میں جبر اور اختیار نے شعر کے لطف کو دوبالا کر دیا حضرت شاد فرماتے ہیں کہ ہجر میں جو صبر کرنے کی تاکید کی جا رہی ہے یہ حقیقت میں مجھ پر جبر کیا جا رہا ہے اور ایسا جبر ہے جس پر میں اختیار نہیں رکھتا۔ یہ شعر ایک دفعہ پڑھنے کے بعد ہمیشہ یاد رہنا چاہیئے۔

میرے نالوں کی ہمت کہہ رہی ہے شاد و آج بنیاد آسماں کی

دونوں مصرعے برابر کے ہیں جن کی طاقت کا اندازہ اہل ذوق ہی کچھ کر سکتے ہیں شاد کا حکمانہ لہجہ (Commanding) شعر کو کتنا ٹھوس اور مضبوط بنا رہا ہے۔

بروں کے ساتھ بنجاتے ہیں اچھے باغ دنیا میں
گلستاں میں گلوں کے زیر سایہ خار بیٹھے ہیں

کتنی سچی اور صحیح بات فرمائی ہے جس کو تمثال نے اور زیادہ مستحکم بنا دیا۔ اخلاقی شعر ہے لیکن الفاظ کی نشست اور اسلوب بیان نے شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

آخری نکتے!

میں نے تمہید میں ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر شاد مدظلہ کی شاعری کے متعلق کچھ دعوے کئے تھے میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ مندرجہ بالا منتخب اشعار کو پڑھنے کے بعد میرے دعاوی کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے آپ بھی میرے ہمنوا ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں دو باتوں کی طرف مجھے ضمناً اشارہ کرنا ہے جن کو میرے مضمون کی آخری کڑی سمجھئے،

حضرت شاد مدظلہ دکن میں پیدا ہوئے اور یہیں آپ نے نشو و نما پائی لیکن آپ کو حضرت شاد کی زباندانی کی داد دینی چاہئے کہ آپ کی شاعری پر دکنی اردو کا مطلق اثر نہیں پڑا آپ کے اشعار پر اسی معیاری زبان، (Standard Language) کا اثر غالب ہے جس نے قصر معلیٰ کی فضاؤں میں پرورش پائی اور جس پر صحیح معنوں میں اردو کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ چیز حضرت شاد کی صحت وجدان اور پاکیزگی مذاق کا ثبوت ہے۔

شاعری کے لئے بڑی فرصت اور یکسوئی درکار ہے خدا سی فکر اور پریشانی بھی خیالات کی تعمیر کو ہلا دیتی ہے اندازہ لگائیں کہ وہ ہستی جس کے کاندھوں پر حکومت کا سارا کاروبار ہو جس کو حکومت کے پیچیدہ مسائل سلجھانے پڑتے ہوں جو کم و بیش دو کروڑ انسانوں کی عافیت کا ذمہ دار ہو جس کا ہر لمحہ صرف ہو اس کا بھا فکر سخن کرنا اور ایسے پاکیزہ شعر کہنا یقیناً حیرت میں ڈالدینے والی بات ہے لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے قدرت الٰہی جب کسی کو نوازتی ہے تو دنیا والوں کے قواعد و ضوابط دھرے رہ جاتے ہیں۔

ماہر القادری

پروانے کا انتقام

از محمد عثمان خاں صاحب کمالی

۱

میں فرش پر بیٹھا سر کانن ڈائل کا ایک سائنٹفک افسانہ دیکھ رہا تھا۔ سامنے چھوٹی سی تپائی پر شمع روشن تھی میرے ایک ہاتھ میں جلتا ہوا سیگرٹ تھا ـــــ چند سطریں دیکھنے کے بعد ایک آدھ کش لیکر پھر پڑھنے میں محو ہو جاتا۔

۲

ابھی ایک تہائی سیگریٹ ختم نہ ہوا تھا کہ ایک پروانے نے مجھے دق کرنا شروع کیا ـــــ کبھی شمع کے گرد گھومتا اور کبھی ـــــ گردش کرتے ہوئے کتاب کی ان سطروں پر آپڑتا ـــــ جہاں میری نظر پر اسرار طریقہ پر ـــــ دوڑ رہی تھی۔

۳

میرے جسم میں غصّہ کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ غصّہ انتقام کی صورت میں بدل گیا۔ اور آہ ـــــ میں نے جلتے ہوئے سگرٹ سے اسے داغ دیا ـــــ وہ تڑپنے لگا۔ آہ! ـــــ پھر دوسری بار ـــــ وہ نیم جان تڑپ رہا تھا۔ یکایک ـــــ ظالم سیگریٹ اس پر ا ور جا پڑا ـــــ اور ہمیشہ کے لئے اس کو خاکستر بنا دیا۔

۴

غصّہ ٹھنڈا ہوا اور ساتھ ہی ضمیر نے آواز دی ـــــ "ایک ننھی سی جان کا قاتل ایک ذی ہوش انسان ہے۔ گو دنیا کی تعزیرات میں اس بیرحمی کی سزا نہیں ہے مگر آسمانی عدالت اس ظلم پر چشم پوشی نہیں کر سکتی ـــــ"

۵

میرا جسم لرز گیا۔ دل نے توبہ کا خیال کیا۔ میری پیشانی پر پسینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں نمودار ہوئیں جنہیں پریشانی دور کرنے کیلئے سگرٹ کا ایک لمبا کش لیا یہ کش مجھے سکونا سے بھی زیادہ کڑوا معلوم ہوا اور میں نے دل ہی دل میں سارا الزام اسکے سر تھوپ کر اسے ایک پانی سے بھرے ہوئے برتن میں دے مارا۔ (کمالی)

پیغام جنون

مولانا صہبائی بی۔ اے (آنرز)

رندو اہلِ دل ہیں خوش سن کر بہت نامِ جنوں — فصلِ گل لائی ہے شاید ساتھ پیغامِ جنوں

بن گئے عیشِ دوامی سارے آلامِ جنوں — دہر میں لائی محبت جب سے پیغامِ جنوں

اس طرح کرائے نگاہِ ناز اہتمامِ جنوں — اک بھی فرزانہ رہے باقی نہ ہنگامِ جنوں

مے کا مینا کا تصور تھا۔ کسی کی یاد تھی — اتنی رنگینی میں گذرے اپنے ایامِ جنوں

کائناتِ عقل و دیں سے ہے مائلِ دیوانگی — لا رہا ہے رنگ تیرا فتنۂ عامِ جنوں

شوق میں ہیں ہر قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں — سہل کیوں سب نے سمجھ رکھا ہے انجامِ جنوں

بن گیا بربادیٔ کامل ہی وہ کیفِ مجاز — خوشنما آغاز میں پنہاں تھا انجامِ جنوں

میں بری الذمہ ہو جاؤں گا ہر الزام سے — ناصحِ ناداں لگا دے مجھ پہ الزامِ جنوں

رازِ ہستی کیف و مستی میں ہی جب مضمر تمام — کیف و مستی پڑ گیا کیوں دوسرا نامِ جنوں

عام ہوں الطاف سب پہ تیرے ہم نے تو مگر — اک تری سرکار سے پایا ہے انعامِ جنوں

وہ نگاہِ اولیں وجہِ تباہی بن گئی — جس کے ہر ہر تار میں پنہاں تھا اک دامِ جنوں

اک پریشاں خاطری، وارفتگی اک بیخودی — عشق پر ہیں کس قدر الطاف و اکرامِ جنوں

بے محبت ہے جو صہبائیؔ جنوں کا مدعی
صرف بدنامِ جنوں ہے صرف ناکامِ جنوں

زرد بلی!

مصور اسرار جناب جان شاطر صاحب غزنوی

سلسلہ محبت کی آخری کڑی ہے یک جان دو قالب ہو جانا اور یہ ضروری نہیں کہ انسان اولاد آدم ہی سے محبت کرے۔ گھوڑا۔ کتا بلی۔ گاڑی۔ مرغ کائنات کی ہر شے سے محبت کی جاسکتی ہے اور ہر ایک شے سے یک جان دو قالب ہو جانا ممکن ـــــ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک بچہ اپنا کھلونا ٹوٹ جانے یا کھو جانے یا چھن جانے پر رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی محبت آخری حد تک نہیں پہونچی ہوتی اور اگر آخری حد تک پہونچ جائے تو کیا تعجب کہ کھلونے کی موت یا گمشدگی کے ساتھ ہی بچے کی موت بھی واقع ہو جائے

واللہ اعلم بالصواب

وہ ـــــ حشمت ـــــ خاموش ـــــ متفکر آرام کرسی پر برآمدہ میں بیٹھی تھی ـــــ اس کی نگاہیں ـــــ سامنے باغیچہ کے پار سڑک پر لگ رہی تھیں اس سڑک کا براہ راست تعلق ریلوے اسٹیشن سے تھا۔

"وہ دونوں ـــــ جہانگیر اور ساحرہ اسی سڑک سے آئینگے۔ شاید وہ اسٹیشن سے روانہ ہو چکے ہونگے" ـــــ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

آج صبح ـــــ ناشتہ کے وقت بیگم ـــــ جہانگیر کی ماں نے بیٹے کو مطلع کیا تھا۔

"جہانگیر! آج عصر کے وقت ۵ بجکر کی گاڑی سے ساحرہ آرہی ہے وہ ہمارے یہاں چند ہفتے قیام کریگی جیسا کہ اس کے خط سے ظاہر ہوتا ہے وہ ملازمت کھو بیٹھی ہے۔ تمہیں اس کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن تک جانا چاہئے ـــــ"

جہانگیر نے ماں کو کوئی جواب دیا۔ اُس نے چُپ چاپ وقت آنے پر مکان سے باہر نکل کر گیرج کا رخ کیا۔ حشمت نے بھی اُسے وہاں جالیا۔

"جہانگیر آج تم غیر معمولی طور پر اداس نظر آتے ہو؟" حشمت نے کہا۔ "یہ آنے والی بہن کون ہے؟ تم اس کی آمد پر خلاف توقع افسردہ کیوں نظر آتے ہو؟ ـــــ ناخوش؟"

"کون کہتا ہے میں ناخوش ہوں؟" جہانگیر نے کھسیانے لہجہ میں کہا۔

حشمت مایوس ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ جہانگیر کو اس موضوع پر زیادہ گفتگو ناگوار ہے۔ تاہم اس کے دل میں امید کی جھلک باقی تھی۔ بولی "کیا میں بھی چلوں تمہارے ساتھ اسٹیشن تک؟"

اور اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب جہانگیر نے توقع کے سراسر خلاف جواب دیا۔ "نہیں تمہاری ضرورت نہیں"۔

اور اتنے میں وہ موٹر گاڑی پر سوار ہو چکا تھا۔ حشمت پژمردہ و مغموم پلٹی اور برآمدہ میں آکر اپنا آپ آرام کرسی پر ڈال دیا۔ اس کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی تھی اور دل پر ایک چوٹ ـــــ آج جہانگیر بے حد بیرخی سے پیش آیا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ ساحرہ کے نام کی تہ میں کوئی اہم راز پوشیدہ ہے اور جہانگیر وہ راز مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے جہانگیر اس چچیری بہن کی آمد پر ناخوش ہے۔ یقیناً ناخوش"۔

اور اب ـــــ وہ بے حد مغموم برآمدہ میں بیٹھی ان کی راہ تک رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ آجائیں گے۔

وہ دیر تک اس معاملہ پر غور کرتی رہی اور سوائے اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکی کہ جہانگیر ساحرہ کو پسند نہیں کرتا مگر ـــ کیوں ؟ یہ جہانگیر ہی جانے ـــ جہانگیر ساحرہ کی آمد پر مسرور نہیں بلکہ اس کا آنا جہانگیر کو ناگوار ہے ـــ کیوں ؟ یہ جہانگیر ہی جانے ۔ جہانگیر نہیں چاہتا کہ اس بارہ میں مجھ سے گفتگو کرے مگر کیوں ؟ آہ ! یہ جہانگیر ہی جانے ؟

وہ حیران تھی کہ جہانگیر یہ راز مجھ سے کیوں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ آج تک اس نے کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی ۔ ہماری نسبت قرار پانے کے بعد جہانگیر کا کوئی راز ایسا باقی نہیں رہا جس تک میری رسائی نہ ہو اور اب جب کہ ہماری شادی بالکل قریب ہے ۔ صورت حالات نازک ہے جہانگیر یہ راز مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھتا ہے ۔ غالباً اُسے ساحرہ سے محبت ہے ـــ یا تھی ـــ لیکن وہ کئی مواقع پر خود ہی تو اعتراف کر چکا ہے کہ حشمت ! آج تک میں نے تیرے سوا کسی ہستی سے محبت نہیں کی ۔ تم وہ پہلی ہستی ہو جسے میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے دل میں جگہ دی ـــ اور میں نے اس پر یقین بھی کر لیا ۔

وہ دیر سے سوچ رہی تھی اور نہ جانے کب تک سوچتی رہتی کہ دفعتہ اس کے خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا ۔ سامنے ـــ سڑک پر سے جہانگیر کی چھوٹی سی نیلے رنگ کی موٹر کار آتی دکھائی دی ۔

انجن کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی ـــ انجن کی رفتار حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی ۔ اب گاڑی باغ کے پھاٹک میں داخل ہو رہی ہے ـــ اور اب رکی ۔ جہانگیر ڈرائیور کی جگہ پر تھا اور ساحرہ ـــ آہ ! اس کے پہلو میں ۔

حشمت اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی اور حیران و سراسیمہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی ۔ اب ایک پراسرار نفرت کے جذبہ نے اس کے دل میں کروٹ لی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ خود بھی ساحرہ سے ملنا اور اسے دیکھنا پسند نہیں کرتی مگر کیوں ؟ کیا سبب ؟

اب وہ دونوں برآمدہ کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے جہانگیر نے سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا ۔ ساحرہ کے چہرے سے غرور و تمکنت کے آثار ٹپک رہے تھے ۔ وہ حسین تھی لیکن حشمت کی نگاہوں میں اس کے حسن میں شرارت و چالاکی کی لہریں کھیل رہی تھیں ۔

حشمت نے اپنی جگہ سے حرکت کی ۔ خیر مقدم کے طور پر آگے بڑھی چند قدم ـــ جہانگیر کے چہرہ سے پژمردگی اور اداسی برس رہی تھی ـــ ہونٹ خشک ـــ سخت ،

قریب پہونچکر جہانگیر نے بزبردستی اپنے چہرہ پر تبسم کے آثار پیدا کئے ۔ اور یہ آثار بھی ہونٹوں تک محدود رہے اس نے ساحرہ کا حشمت سے تعارف کرایا ۔

"یہ ہے میری منگیتر حشمت کاؤس ! اور یہ ہیں مس ساحرہ یوسف میری چچازاد بہن ـــ "

ساحرہ مسکرائی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ حشمت اور ساحرہ کی آنکھیں چار ہوئیں لیکن بہت جلد حشمت کو احساس ہوا کہ میں ان بلی کی طرح چمکدار پراسرار اور ڈراونی آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتی ـــ بلی کی طرح سبز اور درندوں کی طرح چمکدار ۔

بہرکیف حشمت کا ہاتھ مصافحہ کیلئے آگے بڑھا ، اور ساحرہ سحور کن آواز میں بولی لیکن اس کا لہجہ حشمت کے نزدیک تنفر و اکراہ کی دلیل تھا ۔

"خوب ، تو یہ ہے ننھی حشمت ، میں جہانگیر کی ہونے والی بیوی سے ملنے کی مشتاق تھی ۔ اب اسے دیکھ کر بہت مسرور ہوئی ہوں "۔

حشمت کے دل میں وقت کے ساتھ ساتھ ساحرہ کے خلاف نفرت کا جذبہ بڑھتا چلا جا رہا تھا ـــ وہ ساحرہ سے آنکھیں ملانے سے گریز کر رہی تھی ۔

ساحرہ پھر گویا ہوئی ۔

"اب میں آپ کا تعارف "ننھی پشو" سے کراتی ہوں میرے اور پشو کے درمیان گہری دوستی ہے ـــ دوستی اور محبت ـــ ایسی محبت جو ہم دونوں میں لمحہ بھر کا تفرقہ بھی برداشت نہیں کر سکتی ۔ کیا تم بلیاں پسند کرتی ہو حشمت ؟ ـــ "

ساحرہ نے اپنے کندھوں سے فر کا خوبصورت کوٹ الگ کر دیا ۔ اب حشمت کی نگاہ ایک ننھی سی ـــ زرد بلی پر پڑی ۔ جو ساحرہ کے بائیں ہاتھ پر ـــ اس کی چھاتی کے ساتھ دبکی سکڑی بیٹھی تھی ۔

حشمت پر ایک پراسرار ضعف و نقاہت کی کیفیت چھا گئی ـــ تاہم اس نے جواب دینے کی کوشش کی ۔

"اوہو ، یہ تو بہت خوبصورت ہے ننھی پشو "

اس نے بلی کو بادل ناخواستہ پچکارا ۔"

"کیا تم نے تمام سفر کے دوران میں اسے سینے سے لگائے رکھا؟"

"ہاں" ساحرہ نے جواباً کہا۔ "پشتو ہر جگہ سفر و حضر میں میرے ساتھ ہی رہتی ہے"۔

اس کے لہجے میں فخر و غرور کا وافر حصہ تھا۔ بلی اپنی پراسرار نگاہوں سے ادھر ادھر گھور رہی تھی۔

وہ تینوں مکان میں داخل ہوئے۔ ساحرہ نے بلی کو زمین پر چھوڑ دیا۔ بیگم نے مہمان کا استقبال تپاک سے کیا۔ بخندہ پیشانی خیر و عافیت پوچھی اور پھر اسے اوپر کی منزل میں لے گئی جہاں ساحرہ کے لئے خوبصورت آراستہ کمرہ پہلے ہی سے مخصوص کر رکھا تھا۔

حشمت اور جہانگیر ——— دونوں خاموش ——— اداس ڈرائنگ روم میں گئے۔ بلی بھی ان کے پیچھے داخل ہوئی اور ایک کوچ پر چڑھ کر اس بے تکلفی سے بیٹھ گئی گویا وہ ایک مدت سے اس مکان اور مکان والوں سے انس و واقفیت رکھتی ہے۔

حشمت نے نگاہیں اوپر کو اٹھائیں اور جہانگیر کو دیکھا۔

"میں اس بلی سے صد درجہ متنفر و مستخیف ہوں"۔ اس نے کہا۔

جہانگیر نے حیرانی کے ساتھ جواب دیا۔

"مگر میرا تو خیال تھا کہ تم بلیاں پسند کرتی ہو"۔

"ہاں یہ درست ہے۔ درحقیقت مجھے بلیاں پسند ہیں لیکن ——— یہ بلی ——— آہ! ——— میں نہیں سمجھ سکتی"۔

حشمت نے ملتجیانہ نگاہوں سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ حشمت کے چہرے سے غم و رنج کا راز صاف ظاہر تھا۔

"آہ میں اس کی توضیح و تشریح نہیں کر سکتی لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ جب سے میں نے اس منحوس بلی کو ساحرہ کی گود میں دیکھا ہے میری لوح دل پر اس کے متعلق نفرت کے نقوش لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ——— بلی اور ساحرہ کو ——— ایک دوسرے سے ایک خاص ——— پراسرار ——— ناقابل بیان تعلق ہے۔ غیر معمولی مناسبت"۔

"حشمت! تم وہم میں مبتلا ہو"۔ جہانگیر نے ہنستے ہوئے کہا "محض وہم ——— ظن باطل"۔

حشمت نے ایک بار پھر جہانگیر پر غائر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"مگر تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ جہانگیر"۔

جہانگیر نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔ اور فوراً اسے حلقۂ آغوش میں لے لیا۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے دہرایا۔ "آہ، حشمت آہ ——— میں نہیں ——— بتا سکتا۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا ——— اور یہ بتانے کا موقع نہیں، میں نادم ہوں پیاری ——— سخت شرمندہ! فی الحقیقت میرا طرز عمل تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا ہو گا۔ لیکن میں مجبور ہوں ——— پیاری سخت مجبور ——— اس محبت کے نام پر معاف رکھو"۔

وہ جھکا اور حشمت کے احمریں لبوں پر محبت کی مہر ثبت کر دی اور جب ——— جہانگیر اپنے آتشیں لبوں سے اس کے گلابی رخساروں کی شراب جذب کر رہا تھا ٹھیک اس لمحہ اپنی جگہ سے اچھلی ——— اچھلی ——— اور چشم زدن میں وہ حشمت پر تھی ——— اس کے تیز ——— درندہ پنجے حشمت کے عریاں شانے کی نازک جلد میں گھسے جا رہے تھے۔

ایک ہی سیکنڈ میں جہانگیر کا فولادی ہاتھ بلی پر تھا اس نے بلی کو دبوچا اور غصہ میں تھرتھراتے ہوئے اسے کھڑکی کے رستے باہر دے مارا۔

"نامراد، وحشی" وہ چلایا اور حشمت کی طرف پلٹا۔ وہ سرتاپا سفید پڑ چکی تھی۔ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا تاہم اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بولی۔

"میں جو کہتی تھی، میں جانتی تھی، یہ ایک خوفناک ارادے سے مجھے گھور رہی ہے۔ مجھے اس سے خوف تھا"۔

جہانگیر نے کرسی کھینچ کر قریب کر لی اور حشمت کو سہارا دیکر اس پر بٹھا دیا۔

"کچھ زیادہ زخمی تو نہیں کیا؟" اس نے دریافت کیا۔

"نہیں، خراش ہے معمولی، فکر نہ کرو"۔

وہ اپنے کندھے پر جھکی بلی کے پنجوں کے نشانات دیکھ رہی تھی۔ خراش خاصی خراش ——— کہ اتنے میں ساحرہ بیگم کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ——— حشمت نے جلدی سے جہانگیر کو مطلع کیا۔

"ان سے کوئی ذکر نہ کرنا اس بارہ میں"۔

لیکن جب ساحرہ حشمت کے پاس کرسی پر آ کر بیٹھی تو اس نے حشمت کے کندھے پر بلی کے پنجوں کے نشانات ——— خراشیں دیکھ لیں ———

یہ خواہشیں ساحرہ کے نزدیک اس کے وحشیانہ عزائم کی کامیابی کا پیش خیمہ تھیں۔ فتحمندی کی دلیل، وہ دل ہی دل میں اس نیک فال پر مسرور تھی اور اس نے عمداً اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں گویا اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں ——

بلی اب پھر کمرہ میں آ گئی اور ساحرہ کی گود میں چڑھ بیٹھی اور اپنی خوفناک آنکھوں سے ادھر اُدھر گھورنے لگی —— ساحرہ اور پشو کی آنکھیں آپس میں بالکل مشابہ تھیں —— ساحرہ اور پشو کی آنکھوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا

ساحرہ کو آئے ایک ہفتہ گذر چکا تھا اور اس عرصہ میں حشمت اس نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ وہ حالات کا مزید مقابلہ نہیں کر سکتی وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ اپنی ساس کے یہاں کم از کم ایک ماہ رہیگی لیکن حشمت کو بیاہے آئے چھ ہی دن گذرے تھے کہ ساحرہ مع اپنی شیطنتوں کے آنازل ہوئی —— اس کے عیش و آرام اور مسرتوں کا شیرازہ درہم برہم کر دینے کے لئے —— اس کی حسرتوں اور ارمانوں کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے اور اب —— اب حشمت نے ارادہ کر لیا کہ اپنے گھر واپس چلی جائے —— اگر مناسب سمجھا اور حالات نے اجازت دی تو وہ پھر چلی آئیگی —— دوبارہ آجائیگی جب کہ ساحرہ یہاں سے دفع ہو چکی ہو گی۔

گو بذات خود ساحرہ اس کے لئے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہ تھی لیکن اس کی پر اسرار نگاہیں —— خوفناک آنکھیں اور پشو —— منحوس بلی۔ اس کی موجودگی میں حشمت کے آرام و قرار کو ہر لمحہ ایک غیر متوقع تباہی و نقصان کا خطرہ لاحق تھا۔

اور جب تک پشو اور ساحرہ کے درمیان ایک پر اسرار علاقہ —— ایک ناقابل بیان نسبت موجود تھی —— حشمت ان کے درمیان سرسبز ہونے والی سازش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتی تھی —— وہ اس صورت حالات کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکتی تھی۔

ساحرہ کی آمد و رفت بالکل ایک بلی کی طرح تھی —— ساحرہ بلی کی طرح خاموش —— دبے پاؤں —— بغیر آہٹ پیدا کئے ایک کمرہ سے دوسرے میں جاتی۔ کبھی اوپر اور کبھی نچلی منزل میں —— یہاں —— وہاں —— ٹھیک بلی کی طرح —— یا تو یہ حقیقت تھی اور یا حشمت کا وہم۔ تخیلات باطلہ

اور جہاں کہیں بھی وہ جاتی زرد بلی سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ موجود، خاموش —— دبے پاؤں —— ٹھیک اپنی مالکہ کی طرح —— ہر وقت گھات لگائے۔ ٹھیک اپنی مالکہ کی طرح پر اسرار اس کی نقل و حرکت اور پر اسرار اس کی ڈراونی آنکھیں۔

اور جب کبھی حشمت و جہانگیر باہم تخلیہ میں ہوتے زرد بلی ان کی نگرانی کرتی نظر آتی۔ زرد بلی کی تیز نگاہیں چمکدار آنکھیں ہر جگہ ان کا تعاقب کرتیں اور حشمت —— حشمت بلی اور بلی کی مالکہ کی ان جگر دوز نگاہوں سے سخت خوفزدہ تھی۔

اسے یہ نگاہیں اپنے دل و دماغ میں آتشیں سوئیاں بن کر چبھتی محسوس ہوتیں اسے بلی اور ساحرہ کی غیر معمولی حرکات و سکنات اور باہمی مطابقت میں ایک سازش چلتی نظر آتی تھی —— لیکن وہ سازش کیا تھی؟ اس سوال کا حل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ ان سے ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی۔ مگر کیوں؟ وہ اس خوف کی کوئی توضیح نہ کر سکتی تھی۔

اور ایک دن جب کہ حشمت کچھ لکھنا چاہتی تھی —— میز کے پاس جا بیٹھی —— لیکن قلم غائب تھا۔ وہ تلاش کرنے لگی لیکن نہ ملا۔ وہ سرگرم جستجو تھی کہ اتنے میں ساحرہ بھی ادھر آ نکلی اور قلم کی تلاش میں اس کی امداد کرنے لگی

اتفاق سے قلم ساحرہ کو مل گیا اور اس نے فاتحانہ تبسم کے ساتھ قلم حشمت کے ہاتھ میں دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مس ہو گئے۔ صرف نصف سیکنڈ کے لئے —— یا شاید اس سے بھی کم عرصہ کیلئے —— اور حشمت کو یوں معلوم ہوا گویا اس کی جلد میں کوئی زہر میں بجھی ہوئی سوئی چبھو دی گئی ہے اس نے ایک فوری اضطراب سے گھبرا کر ساحرہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور پرجوش لہجہ میں بولی۔

"یہ رہا قلم! کم بخت میز کے پلئے تلے چھپ رہا تھا"

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ حشمت کے ہاتھ کی پشت پر پنجے کا نشان پڑ چکا تھا —— بلی کے پنجہ کا سرخ نشان۔

اور اسی لمحہ سے حشمت کو گھر واپس چلے جانے کا خیال پیدا ہوا اور پھر اس خیال نے ارادہ کی صورت اختیار کر لی۔ شام کو تخلیہ میں حشمت نے

جہانگیر کو اپنے ارادے سے مطلع کیا اور بتایا کہ اب میں ساحرہ اور پشو کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ میرے صبر و ضبط اور برداشت کے پیمانے لبریز ہو چکے ہیں۔ کسی ناخوشگوار واقعے سے متصادم ہونے سے پہلے پہلے میرا یہاں سے چلے جانا ہی مناسب ہے۔"

پشو اور ساحرہ کی پراسرار نقل و حرکت اور نگرانی میری قوتیں سلب کئے دیتی ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ بہت جلد کوئی روح فرسا حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ ایک ایسا حادثہ جو میری تباہی کا سبب ثابت ہوگا مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ساحرہ کے دماغ میں کوئی خوفناک ارادہ پرورش پا رہا ہے ایسا ارادہ جس کی تکمیل و ناکامی پر میری زیست اور موت منحصر ہے' اب بھی ــــ اب بھی وہ دیکھو ــــ وہ منحوس، خوفناک بلی ہماری نگرانی کر رہی ہے۔ تم اس سے بے خبر ہو، لیکن میں دیکھ رہی ہوں وہ دیکھو وہ سامنے جھاڑیوں میں چھپی ہمیں گھور رہی ہے۔ آؤ جہانگیر ہم یہاں سے چلے جائیں۔ پیشتر اس کے کہ میری چیخ نکل جائے ــــ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔

"حوصلہ کرو" جہانگیر نے کہا۔ "حشمت اپنے آپ کو سنبھالو۔"

حشمت نے اشک آلود آنکھوں سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ اس پر پژمردگی کی آخری حالت طاری تھی۔ وہ بغیر کوئی لفظ مُنہ سے نکالے اٹھی اور آہستہ آہستہ مکان کی طرف چلدی ــــ جہانگیر کو پیچھے باغ میں اکیلا چھوڑ کر۔

جہانگیر کی مغموم نگاہیں اس دل شکستہ ہستی کا تعاقب کر رہی تھیں' وہ دل ہی دل میں اپنی پیاری حشمت کی موجودہ حالت پر بیحد متاسف و پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حالات واقعی ناقابل برداشت ہیں۔

بلی جھاڑی میں سے نکلی اور باہر نکل کر کان کھجانے لگی جہانگیر نے غصے میں جھلا کر اسے ایک وحشیانہ ٹھوکر رسید کی جس کے نتیجے کے طور پر بلی ایک بار پھر اسی جھاڑی میں جا چھپی اور جہانگیر کو خوفناک نگاہوں سے گھورنے لگی۔

"واقعی اس نامراد کی آنکھیں بہت خوفناک ہیں اور ان سے شرارت ٹپکتی ہے۔" وہ چلایا۔ "لیکن آخر حشمت ان آنکھوں سے ایسی غیر معمولی طور پر کیوں خوفزدہ ہو رہی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ آہستہ آہستہ روش پر چلنے لگا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی کسی خطرے سے دوچار ہونے والا ہے ــــ وہ سیڑھیاں طے کر کے برآمدہ میں پہنچا ــــ یہاں اسے ساحرہ بیٹھی ملی۔ وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس نے جہانگیر کو دیکھا اور......

"مجھے افسوس ہے جہانگیر! ننھی حشمت صبح اپنے گھر واپس جا رہی ہے" وہ بولی۔ "کیا وہ میری وجہ سے تو نہیں جا رہی؟ کہیں میرا آنا اسے ناگوار تو نہیں گذرا جو اس قدر جلد واپس ہو رہی ہے۔"

"وہ جہانگیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھ رہی تھی اور جہانگیر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ساحرہ کی آنکھیں ایک خطرناک شرارت اور شیطنت کی حامل ہیں۔

"نہیں، وہ تمہاری وجہ سے کیوں جانے لگی؟ تمہاری موجودگی یا آمد سے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟"

اور وہ اس کے قریب خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"ساحرہ میں چاہتا ہوں کہ تم اس منحوس بلی کو دریا میں غرق کر دو۔" اس نے ساحرہ سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ سگریٹ کیس کھولا اور سگریٹ سلگا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"ننھی پشو کو غرق کر دوں؟" ساحرہ نے جلدی سے دہرایا۔ "پشو ہی تو میری کائنات ہے ــــ میری ہست و بود ــــ جہانگیر!"

"ساحرہ اب بھی وقت باقی ہے اور میرے خیال میں جلد از جلد تمہیں اس وحشی بلی کو الگ کر دینا چاہئے۔"

ساحرہ نے اپنی کرسی اور قریب کر لی اور انتہائی دردانگیز لہجہ میں کہنے لگی۔ "جہانگیر! یہ محض ــــ ایک معمولی بلی نہیں جسے آسانی سے علیحدہ کیا جا سکے، میرا سب کچھ یہی پشو ہے۔ میری زندگی اور میری زندگی کا سہارا ــــ اور جب تک جو کچھ میں چاہتی ہوں مجھے مل نہ جائے یہی پشو میرا سب کچھ ہوگا تم جانتے ہو کہ ایک عورت محبت کرنے پر مجبور ہے۔ کوئی ایک چیز ضرور موجود ہونی چاہئے جس سے عورت محبت کرے۔ آہ، عورت کو ضرورت رہتی ہے ایسی چیز کی جس پر وہ اپنی محبت کا ذخیرہ خرچ کر سکے۔"

وہ اٹھا ــــ جانے کیلئے اٹھا لیکن ساحرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اور جہانگیر! تم نے ہی تو مجھے دی تھی پشو! بھول گئے کیا، یاد نہیں؟"

"اُف! خداوندا"۔ جہانگیر نے جھنجھلا کر کہا۔ "اے کاش میں بول سکتا"۔

ساحرہ نے جہانگیر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تن کر بولی۔

"اور تم پھر بھی کہتے ہو کہ پشو کو غرق کر دو۔ اگر میں اسے غرق کر دوں تو بالیقین مجھے اپنی زندگی کی کشتی بھی غرق کرنا ہوگی"۔

وہ پھر اٹھا ہونٹوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس وقت اس پر پریشانی کی آخری حالت طاری تھی ــــ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔

"خدا کے لئے ساحرہ!" وہ چلایا۔ "اس ذکر کو خدا کے لئے چھوڑ دو"۔

وہ مسکرائی ایک فاتحانہ مسکراہٹ ــــ لیکن خاموش۔ جہانگیر نے اس پر سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی۔ وہ فاتحانہ انداز سے سر بلند کئے کھڑی تھی جیسے پرجوش کی لہریں رقصاں ــــ سامنے باغ میں جہانگیر کو بلی آہستہ آہستہ رینگتے دکھائی دی۔ وہ ان ہی کی طرف آ رہی تھی۔

بلی کو دیکھتے ہی ساحرہ کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی جہانگیر مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

اس رات گرمی قدرے زیادہ تھی ــــ اور رات تاریک تھی ــــ تاریک و پرسکون۔ حشمت اپنے کمرہ کی کھڑکی میں کھڑی باہر تاریک و خاموش فضا کا مطالعہ کر رہی تھی ــــ باغ کا پتہ تک پرسکون و خاموش تھا ــ تاریکی سکوت ــــ مکمل سکوت۔

نیچے ــــ باغ میں کسی کے جلد جلد چلنے کی آواز کا احساس ہوا ــ حشمت نے باہر جھانک کر بغور دیکھا ــــ اب آواز قریب آ رہی تھی ــــ پھر ایک دھندلا سا سایہ، اس کے بعد حشمت نے ساحرہ کو پہچان لیا ــــ وہ دیکھ رہی تھی ــــ دیکھتی رہی ــ حتیٰ کہ ساحرہ باغ کے حدود ــــ اور پھر حشمت کی حد نظر سے باہر ہو گئی۔

"یہ اس وقت کہاں جا رہی ہے آخر؟"

حشمت نے دل سے سوال کیا اور کھڑکی سے پلٹی۔

اور حشمت نے ساحرہ کو شام سے پہلے بھی باغ میں بلی کی طرح دبے پاؤں ادھر ادھر پھرتے دیکھا تھا۔

بہرحال وہ صبح اپنے گھر واپس جا رہی تھی اور پھر اس وقت تک یہاں آنے کا قصد نہ کرے گی جب تک یہ ڈائن یہاں سے دفان نہ ہو جائے ــــ آنے والی صبح وہ ان تمام اسرار کی حدود سے باہر ہو جائیگی۔

وہ روشنی گل کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ بہت جلد اس کی آنکھ لگ گئی ــــ لیکن پھر اس نے کروٹ پر کروٹ بدلنی شروع کر دی حتیٰ کہ نیند جاتی رہی ــــ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ــــ کمرہ میں تاریکی سکوت ــــ باہر خاموشی ــــ اسے اپنے دل کی دھڑکن اور سانس صاف سنائی دے رہا تھا، اس کے سوا ــــ اور کچھ نہ تھا جو اس کی سماعت قبول کرے ــــ تاہم ایک ناقابل بیان خوف اس پر طاری تھا ــــ کسی آنے والی مصیبت کی خوفناک تاریکی اس پر محیط تھی۔ ایک پراسرار خطرہ ــــ خود وہ پریشانی سے اس کے بدن کا رُواں رُواں متاثر ہو رہا تھا۔

اور پھر ــــ یکایک اس نے اپنے سانس کے بعد ایک اور عجیب و غریب آواز محسوس کی۔ آواز ــــ جس نے اس کی تمام توجہ کھینچ لی، آواز ــــ جیسے کوئی کھڑکی پر جھپٹ رہا ہو ــــ شیشے کو کھرچنے ــــ نوچنے کی آواز ــــ ایک ہی سکنڈ بعد اس کھڑکی میں ــــ شیشے کے پیچھے، ایک متحرک سایہ نظر آیا ــــ اس کا دل غیر معمولی تیزی سے حرکت کرنے لگا ــــ خوف و اضطراب رگ و ریشہ پر مسلط ــــ اب کھڑکی کھل چکی تھی اور دو ہیبناک خونخوار چمکتی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں ــــ اگلے سیکنڈ وہ متحرک چیز ــــ حشمت کے اوپر تھی۔

ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی اور فضا میں گونج گئی ــــ حشمت نے اسے چھوا ــــ نرم ــــ ملائم بال ــــ اف نشتر ایسے تیز پنجے اس کے جسم میں گھسے جا رہے تھے ــــ آہ ــــ بلی ــــ پشو ــــ۔

حشمت نے ایک بار اور روح فرسا چیخ ماری ــــ اور اپنی پوری قوت سے بلی کو الگ پھینکنے کی کوشش کی ــــ بے سود، پشو کے خونخوار پنجے حشمت کے گلے کو نوچ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں دو انگاروں کی طرح تاریکی میں چمک رہی تھیں ــــ اور اس کے غرانے کی آواز حشمت کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔

حشمت اپنا آپ بلی سے چھڑانے کی دیوانہ وار جدوجہد کر رہی تھی وہ خوف و دہشت سے سراپا پیپل کے پتے کی طرح کانپ رہی تھی ــ لیکن بلی ــ بلی مشین کی سی تیزی کے ساتھ سرگرم عمل تھی ــ اسے برابر نوچ رہی تھی ــــ اس کے حملے زیادہ تر حشمت کے گلے پر تھے۔

اس اثناء میں باہر دروازے پر انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں

پھر یکلخت کمرہ بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھا حشمت نے لباس خواب میں ملبوس جہانگیر کو دروازے میں کھڑے ہوئے دیکھا — اس کے پیچھے بیگم — خوفزدہ، حیران و ششدر — جہانگیر آگے بڑھا — اور اس سے پہلے کہ کیفیت حشمت کی یاد سے باہر تھی — وہ بیہوش ہو کر جہانگیر کے بازوؤں میں جا پڑی۔

اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سورج کی کرنیں کھڑکی کی راہ سے کمرہ میں آتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بستر پر تھی اور جہانگیر اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ جہانگیر کا رنگ سفید پڑ چکا تھا — چہرے سے بھی پریشانی کے آثار ظاہر تھے۔ رات کی آخری کیفیت بستر شرح تھی۔ اس کی آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سویا۔

وہ آہستہ سے نحیف آواز میں بولی۔

"پیارے جہانگیر!" اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

جہانگیر نے حشمت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے ہونٹوں کے قریب لے گیا... چوما — اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اب بھی جہانگیر اس کے پہلو میں موجود تھا اب حشمت کے دماغ سے بیہوشی کے اثرات زائل ہو چکے تھے۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا، جہانگیر؟" اس نے غمگین آواز اور رقت خیز لہجے میں دریافت کیا۔ "میں بیمار ہو گئی تھی یا کیا؟"

جہانگیر نے بھرے ہوئے گلے سے کہا۔

"ہاں بیاری، بیار ہی سمجھو، تمھاری دماغی قوتوں پر بھی حملہ ہوا تھا۔"

"لیکن — لیکن — وہ تو رات — ہاں رات ہی تو تھی — رات کی تاریکی میں بلی نے مجھ پر حملہ کیا تھا — اور اس کے بعد پھر کیا ہوا؟"

"ہم تمھاری چیخوں کی آواز سن کر آئے اور پھر تو بیہوش ہو گئی — بیہوش ہو کر میرے بازوؤں پر آ گری تمھیں ریاد نہ ہوگا۔"

وہ کانپ اٹھی۔ لمحہ بھر خاموش رہی۔ اور پھر ایک سرد آہ کے ساتھ بولی۔ "ہاں مجھے یاد ہے، رات کس قدر خوفناک حملہ — کس قدر بھیانک منظر — توبہ"

"اب ڈر اور فکر کی کوئی وجہ باقی نہیں حشمت۔" جہانگیر نے اس کے ہاتھ سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "اس ہولناک ڈرامے کا آخری باب ختم ہو چکا ہے۔ میں بلی کو دریا میں غرق کر آیا ہوں۔ میں نے احتیاطاً ایک بھاری پتھر بھی اس کی گردن سے باندھ دیا تھا، اب وہ یہاں دنیا میں نہیں آ سکتی۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تیر گئی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور خاموش تھی۔

"لیکن جب ساحرہ پہنچیگی تو کیا کہیگی! بلی کی موت اسے شاق گزرے گی"

آخر حشمت نے کہا۔

"حشمت یہ وقت نہیں ایسی باتوں کا — ہم کسی اور وقت پر ساحرہ کے متعلق گفتگو کرینگے۔"

جہانگیر نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر کر کہا۔

"کیا وہ یہاں سے چلی گئی ہے؟"

جہانگیر نے اثبات کے طور پر سر ہلایا اور ایک وقفہ کے بعد بولا۔

"ہاں چلی گئی — اور پھر کبھی یہاں نہ آئیگی۔"

جہانگیر نے اسے مزید گفتگو کرنے سے منع کر دیا۔ اور کہا "تم بہت کمزور ہو زیادہ بولنا تمھاری صحت کے لئے مضر ہے۔" حشمت نے بھی مزید استفسار کی ضرورت نہ سمجھی اور چپ ہو رہی۔

اور پھر جب حشمت کی طبیعت بحال ہو گئی — اور وہ دونوں ایک شام کے وقت برآمدہ میں بیٹھے تبادلہ خیالات کر رہے تھے تو جہانگیر نے حشمت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے کہا۔

"غالباً تم ساحرہ کے متعلق کوائف سے آگاہی پانے کی اشتیاق ہوگی۔"

"یقیناً" حشمت نے جواباً کہا۔

"کیا تم ایک غیر معمولی صدمہ برداشت کر سکوگی؟"

"میں کوشش کروں گی!"

لمحہ بھر کے لئے اس نے تامل کیا اور پھر بولا۔

"ساحرہ مر گئی!"

"مر گئی؟"

"ہاں، اس رات تمھارے کمرہ میں بلی کے داخل ہونے سے قبل ہی وہ مکان سے نکل چکی تھی۔"

"میں جانتی ہوں، میں نے اس رات اسے باغ میں پھرتے دیکھا تھا اور پھر باہر جاتے۔"

"ہاں، وہ باہر گئی اور پھر جیتے جی واپس نہ آئی صبح اس کی لاش دریا

سے نکالی گئی ۔"

"تو کیا اس نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی؟" حشمت نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"تحقیقات کرنے والے افسر کا بیان تھا "ڈوب مری" لیکن یہ بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے خودکشی کی یا پاؤں پھسلا اور غرق ہو گئی —— تاریک رات تھی اور چڑھاؤ پر دریا۔"

جہانگیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کے نتائج کے طور پر معلوم ہوا کہ وہ کم از کم آٹھ گھنٹے دریا میں پڑی رہی۔ صبح آٹھ بجے لاش پانی سے نکالی گئی —— تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ساحرہ نے آدھی رات کے قریب اپنے آپ کو موجوں کے منہ میں دیا —— ہوں —— اور آدھی رات کے قریب ہی میں نے بلی کو دریا میں پھینکا تھا ۔۔۔۔ تمہارے بے ہوش ہو جانے کے بعد۔"

جہانگیر نے حشمت کے چہرہ پر حیرانی اور خوف کی کشمکش دیکھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھ سکی تاہم اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"حشمت! ساحرہ کے ساتھ ایک اہم راز وابستہ ہے جو اب موقع آ گیا ہے تو میں تم پر منکشف کر دوں ۔۔۔ سلسلہ کلام ۔۔۔ ساحرہ اور اس کا متعلق ہے ۔۔۔

حشمت جلدی سے پرجوش لہجے میں ۔۔۔

"ہاں ہاں، میں جانتی تھی کہ ساحرہ کے ساتھ کوئی ۔۔۔ جس کی تہ تک میری رسائی نہ ممکن ہے اور جو تم جانتے ہو مگر عمداً چھپاتے ہو۔ پیارے اگر تم اب بھی اس راز کو راز رکھنا چاہتے ہو تو میں تمہیں افشا پر مجبور نہیں کرونگی۔"

"نہیں اب کوئی وجہ نہیں کہ میں چھپاؤں، میری خواہش تھی —— اور کئی دفعہ میں نے ارادہ بھی کیا کہ تمہیں بتا دوں —— لیکن افسوس ساحرہ کی موجودگی میں اس راز کی نقاب کشائی مناسب نہ جانتا تھا —— حشمت درحقیقت میں مجبور تھا —— باور کرو ——"

اس نے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں لیکن سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"یہ ذکر ہے میری اور تمہاری ملاقات سے پہلے کا —— میں اور ساحرہ پہلی دفعہ کشمیر میں ملاقی ہوئے۔ ساحرہ اکیلی تھی وہ ۔۔۔ ایک بدمعاش آدمی تھا جس سے ساحرہ خوفزدہ تھی —— بہرحال ہماری ملاقات اتفاقاً شالامار باغ میں ہوئی

اور ہم بہت جلد ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے ۔۔۔ ہمارے درمیان غیر متوقع طور پر دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا اور پھر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں آئے دن بدمعاش سے بچاؤں اور اس کی حفاظت کروں ۔۔۔ میں نے وعدہ کیا اور ہر شریف آدمی کا اخلاقی فرض ہے کہ ایسے موقع پر عورت کی امداد اور حفاظت کرے میں نے محسوس کیا کہ ہماری دوستی غیر معمولی تیز رفتاری سے مضبوط اور گہری ہوتی چلی جا رہی ہے ۔۔۔ اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس دوستی کے بڑھنے کی نشو و نما میں ساحرہ کی کوششیں مجھ سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں ۔۔۔ حشمت میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ساحرہ ایک دور کے رشتے سے میری چچیری بہن بھی ہوتی ہے غرض چند دن بعد وہ اپنا " ہوس بوٹ " بھی میرے ہوس بوٹ کے قریب کھنچوا لائی ۔۔۔ اب ہم دوست کے علاوہ پڑوسی بھی تھے ۔ اور پھر ۔۔۔ آخر کار ایک دن ساحرہ نے مجھے بتایا کہ اس کی دوستی محبت میں تبدیل ہو چکی ہے اور کہ وہ مجھ سے دیوانہ وار محبت کر رہی ہے ۔ اس کے چند دن بعد اس کی درخواست تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں اور وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" اور تم ؟ " حشمت نے جلدی بات کاٹ کر پوچھا ۔

" ہاں ، مجھے اس سے ہرگز محبت نہ تھی ۔ اس کی محبت کا ایک شمہ بھی میرے دل میں موجود نہ تھا اور میں نے اسے بتا بھی دیا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور نہ آئندہ کے لئے مجھ سے محبت کی امید رکھو لیکن اس کی ہمت پست نہ ہوئی ۔۔۔ میرے کورے جواب نے اس کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام دیا اس کی محبت بڑھتی ہی گئی اور وہ آئے دن مجھ سے اظہار محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگی ۔۔۔ اور حشمت سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی احساس تھا بلکہ یقین تھا کہ ساحرہ کو مجھ سے دلی محبت ہے اور میرے عشق کی آگ میں اس کی تمام قوتیں ایندھن کی طرح جل رہی ہیں ۔ لیکن حشمت ، میں مجبور تھا ۔ میرے دل میں اس کی محبت کی گنجائش نہ تھی اور جوں جوں اس کا مرض بڑھتا جاتا تھا یہ حقیقت ہے کہ میرے دل میں اس کا احترام بھی بڑھتا جاتا تھا لیکن یاد رکھو کہ یہ احترام محبت سے یکسر خالی تھا ۔ اور آخر ایک دن جب اس نے روتے ہوئے اپنے دل کے ٹکڑے میرے سامنے پھینکے اور دامن سوال پھیلا کر مجھ سے محبت کی بھیک مانگی تو میں اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا اور میں نے اسے آخری ۔۔۔ بالکل صاف جواب دے دیا اور اسے مطلع کر دیا کہ آئندہ کبھی میری محبت کا لفظ زبان پر نہ لائے اور میری محبت کو اپنے دل کی حدود سے باہر نکال دے حشمت ، میں حیران ہوں اور اب سوچتا ہوں کہ خدا جانے میرا دل اس وقت اس قدر سخت کیوں ہو گیا تھا ۔۔۔ بہرحال وہ مایوس و دل شکستہ ہو کر اپنے ہاؤس بوٹ میں اٹھ کر چلی گئی ۔۔۔ اور پھر تین چار دن تک میرے سامنے نہ آئی ۔

لیکن خلاف توقع پانچویں دن شام کے وقت جب کہ میں سیر کے جانے کی تیاری کر رہا تھا وہ پھر آئی اور آخری ۔۔۔ بالکل آخری درخواست کی ۔۔۔ ایک معمولی درخواست ۔۔۔ یہ کہ آج میں آخری بار اسے اپنے ساتھ دریا کی سیر کو لے جاؤں ۔۔۔ اور بس !

حشمت یہ ایک ایسی درخواست تھی جسے قبول کرنے کے سوا میرے پاس چارہ نہ تھا اور غالباً انسان اتنا سنگ دل نہیں ہو سکتا کہ اتنی معمولی درخواست کو بھی رد کر دے چنانچہ میں نے اسے قبول کر لیا اور ہم دونوں " شکارہ " میں سوار ہو کر ۔۔۔ خوبصورت و پرفضا جھیل " ڈل " کی سیر کو روانہ ہو گئے ۔

شکارہ میں خود کھے رہا تھا ۔۔۔ چھوٹا ہلکا سا شکارہ تھا میں نے ملاح کو ساتھ لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور پھر ۔۔۔۔ خیر ۔۔۔ ،

جھیل پر سیر و تفریح کرتے ایک گھنٹہ گذر گیا ۔۔۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ۔ جھیل پر چاروں طرف خاموشی تھی ۔۔۔ اور فضا بھی خاموش و خوشگوار دور ۔۔۔ بہت دور ۔۔۔ جھیل کے کنارے پر ہاؤس بوٹوں کی روشنیاں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ۔ کیف انگیز سماں تھا ۔ شکارہ کی رفتار بہت سست تھی کہیں پرے ۔۔۔ مشرقی کنارے پر ایک کشمیری لڑکا دلدوز گیت الاپ رہا تھا ۔۔۔ الفاظ سمجھ سے باہر تھے لیکن آواز تھی وجد آفریں ۔

ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے لیکن اب ۔۔۔ ہاں اب وہ اٹھی اور آہستہ سے میرے پہلو میں آ بیٹھی ۔ پھر چند ہی منٹ بعد اس کا سر میرے زانوں پر تھا ، اس کی انگلیاں میرے گریبان سے کھیل رہی تھیں ۔۔۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ۔ اس کی آنکھیں اس وقت مجھے کیف و مستی کا چھلکتا ہوا ساغر نظر آ رہی تھیں اور چہرہ ؟ حشمت کچھ نہ پوچھو ، میں نے محسوس کیا کہ چاند آسمان سے اتر کر میرے زانو پر آ بیٹھا ہے ۔

حشمت ! ساحرہ نے اسی حالت میں چند منٹ خاموش رہنے کے بعد پھر ایک زہد شکن اور خرد کا سر کچل دینے والے لہجہ میں مجھ سے دلدوز آواز میں ۔۔۔ شادی کی درخواست کی ۔

میں خاموش رہا۔ اقرار کی گنجائش نہ تھی ۔۔۔ اور ایسے وقت میں انکار کے لفظ میری زبان پر آنے سے گریز کر رہے تھے۔ میں خاموش رہا اس کے دوبارہ سوال پر بھی خاموش رہا ۔۔۔ آخر وہ بھی خاموش رہی ۔۔۔ شاید روتی رہی۔

جب ہم واپس لوٹے تو ہوس بوٹ کے آگے ایک کشمیری کو کھڑا پایا اس کے پاس کبوتر۔ بٹیر۔ تیتر۔ مرغیاں۔ خرگوش اور بلیاں پالتو جانور الگ الگ پنجروں میں بند پڑے تھے۔

وہ کوئی ایک جانور ہمیں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ہم ان اپنے ساتھ ہاؤس بوٹ میں بلا لائے۔ اس نے ایک بلی ۔۔۔ ہاں یہی منحوس بلی ۔۔۔ پشو بہت لمبی چوڑی تعریف کے ساتھ ہمیں دکھائی۔ ساحرہ کی نظر انتخاب و پسند بھی بلی ہی پر پڑی۔ واقعی بلی بہت خوبصورت اور معصوم نظر آتی تھی۔ کشمیری نے بلی کو زمین پر چھوڑ دیا۔ ساحرہ نے اسے پچکارا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف آئی اور اس کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ ساحرہ کا جی نہ چاہتا تھا کہ اسے الگ کرے چنانچہ اس نے بلی خریدنے کی خواہش ظاہر کی حشمت! میں نے یہ بلی اسے خرید دی۔ اور ساحرہ نے قسم کھائی کہ میں اسے اپنی ناکام محبت کی یادگار کے طور پر اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھونگی۔

جہانگیر کی آواز بھاری ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس واقعہ کی یاد سے وہ بے حد متاثر ہو رہا ہے۔ حشمت نے طلسم سکوت توڑا۔

"سو اس نے اپنی تمام تر محبت اس بلی پر صرف کی ۔۔۔ بلی کے ساتھ اسے عشق ہو گیا۔ یہ عشق جنون کی حد تک پہونچ گیا حتی کہ بلی اب اس کی روح ۔ اس کی جان سب کچھ تھی ۔۔۔" حشمت نے کہا۔

"ہاں!" جہانگیر نے جواب دیا ۔۔۔ "اور یہ خونخوار بلی تھی جو تم پر اگلے دن جھپٹی۔ تمہیں یاد ہوگا اس دن جب میں نے تمہارا بوسہ لیا تھا اور پھر اس رات۔ اس رات بھی بلی تم پر حملہ آور ہوئی تھی بلکہ یہ بذات خود ساحرہ تھی ۔۔۔ خود ساحرہ ۔۔۔ ساحرہ جو کھاتی ۔ پیتی ۔ چلتی۔ پھرتی اور سوتی تھی محض ایک بھوت تھا یا بالفاظ دیگر خالی قالب وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ ساحرہ کی روح بلی میں سما چکی تھی بلی ہی اسکی جان تھی"

"اور تم نے آدھی رات کے وقت بلی کو دریا میں پھینکا اور ٹھیک اسی وقت ساحرہ نے اپنا آپ دریا میں ڈالدیا صبح اسکی نعش ملی۔" حشمت نے کہا جہانگیر نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔

"لیکن درحقیقت ہم غلطی پر ہیں" جہانگیر بولا "میرے خیال میں یہ ایک الوکھی خونخوار بلی تھی، اور دونوں کی موت کا ایک ہی وقت واقع ہونا محض اتفاقی امر ہے۔ اسے اتفاقی مطابقت کہا جا سکتا ہے"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو، خدا ہی جانتا ہے۔" قسمت،

ساون کی اندھیری راتوں میں!

پھر میں اپنے کوٹھے بیٹھا، ساون کی اندھیری راتوں میں
پھر بادل گھر کر آیا ہے، گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
پھر بھیگی بھیگی سرد ہوا خاموش فضا میں چلتی ہے
پھر تارے چھپتے آتے ہیں خاموشی ہوش اڑاتی ہے

یارب یہ کیا کیا ہوتا ہے؟

پھر ڈھونڈھ مجھے او برق نظر ان طوفانی برساتوں میں!
پژمردہ طبیعت والوں کو پیغام مسرت لائی ہیں!
اور مست ترانے گا گا کر موسم کا رنگ بدلتی ہے!
دنیا پر ایک بھیانک سی تاریکی چھائی جاتی ہے!

ساون کی اندھیری راتوں میں!

بادل پر بادل چھائے ہیں گویا جنگل میں منگل ہے!
کہیں جھینگر شور مچاتے ہیں کہیں مینڈک مل کر گاتے ہیں!
کہیں جھم جھم جھم جھم جگنو تاریکی میں اڑتے پھرتے ہیں!
کہیں چم چم چم چم بجلی چمک چمک کر رہ جاتی ہے!

یہ طرفہ تماشہ ہوتا ہے!

کل تک جہاں پر اڑتی تھی آج اسی جگہ پر جل تھل ہے
پھر آنے جانے والے کو برسات کا گیت سناتے ہیں!
کہیں چھم چھم چھم چھم بارش کے قطرے پانی پر گرتے ہیں
پھر کڑک کڑک کر اٹھتی ہے کوسوں تک شور مچاتی ہے!

ساون کی اندھیری راتوں میں!

اک شور مسرت اٹھتا ہے آبادی اور ویرانوں سے
کہیں جھولے جھولے جاتے ہیں اور سکھیاں مل کر گاتی ہیں
کوئی لمبی پینگ بڑھاتی ہے کوئی ہلکے جھونٹے لیتی ہے
کوئی کمسن آگے بڑھتی ہے اور جھول پکڑ کر کہتی ہے

یہ حشر نظارہ ہوتا ہے!

قلقل کی صدائیں آتی ہیں ہر چار طرف میخانوں سے!
شوخی سے باہم ہنس ہنس کر کچھ مست ملہار سناتی ہیں!
کوئی گورے گورے ہاتھوں سے جھولے کو جھکولے دیتی ہے!
"اب تم اترو ہم جھولینگے" کس بھولے پن سے کہتی ہے!

ساون کی اندھیری راتوں میں

موجوں نے شور مچایا ہے زوروں ندی نالے ہیں!
جس سمت نگاہیں اٹھتی ہیں طغیانی ہی طغیانی ہے!
اک سناٹا سا ہوتا ہے تا دور سیاہ فضاؤں میں!
جب گرج گرج کر آتے ہیں شب کو بادل کالے کالے!

بیڑے والے مضبوطی سے بیڑوں کو اپنے سنبھالے ہیں!
اس پانی کے کچھ قطروں میں آئینہ محشر سامانی ہے!
پروائی موجیں لیتی ہے ہر سمت وسیع خلاؤں میں!
آغوش میں ڈر کر چھپتے ہیں کمسن بھولے گیسو والے!

ساون کی اندھیری راتوں میں!

طالب باغپتی

"شکریۂ یورپ"

آزادانہ شاعری کی خشتِ اساس!

آغا حشر مرحوم کی ایک شہرہ آفاق نظم پر سیر حاصل تبصرہ

کہتی ہے عقل شکریۂ یورپ کا دیکھ کر
آئینۂ سخن میں ہے تنویرِ زندگی،

پنہاں ہے لفظ لفظ میں ترغیب جہاد و
رقصاں ہر ایک شعر میں شمشیرِ زندگی،

تیغوں کے سائے میں جو لگاتی ہیں شیر مرد
ہر شعر ہے وہ نعرۂ تکبیرِ زندگی،

جناب مولانا خدا بخش صاحب اظہر، امرتسری

"نظم کے تیور، الفاظ کی بندش، نرالی اور انوکھی روش سب گواہ ہیں کہ یہ نظم قیامت ہے یا قرب قیامت کی نشانی۔ یورپ کو اگر ایشیا کے ستانے اور مسلمانوں کے ٹھکرانے میں مزہ آتا ہے تو ہم کو بھی آغا حشر کے اس طمانچہ سے لطف حاصل کرنا چاہیے جو رخسار سفید پرست سیاہ سے مارا گیا ہے"۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو "شکریہ یورپ" کے دیباچہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے سپرد قلم کئے ہیں۔ حشر کے شاعرانہ اعجاز کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس نے گوشہ نشین صوفیوں کو بھی لفظی جہاد کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ یہ لوگ تو صرف دعا ہی سے شمشیر و سنان کا کام لینے کے مدعی ہیں۔ خواجہ صاحب کے الفاظ ان جذبات کی حرکت کا آئینہ ہیں جو نظم کے مطالعہ سے دل میں خود بخود تڑپنے لگ جاتے ہیں۔

"شکریہ یورپ" کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اگر اس پیغام کی روشنی میں دیا جائے جو نظم کے ہر مصرعے سے ظاہر ہے تو تاریخ انقلابات امم کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنا پڑیگی۔ اس کے بعد بھی یہ مقصد بوجوہ تمام پورا ہو تو تعجب نہیں کیونکہ "شکریہ یورپ" صرف وہ طمانچہ نہیں جو بقول خواجہ صاحب سفید پرست سیاہ سے مارا گیا بلکہ ایک بے آواز اور نظر نہ آنے والا تازیانہ ہے جو اسلامی ہند کے سوئے ہوئے احساس زندگی کو جگانے کی غرض سے استعمال کیا گیا۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک میں جس سیاسی افسردہ دلی کا دور دورہ تھا اس میں ایسے آزاد ماحول کا پیدا ہونا ہی ناممکن تھا جس میں کوئی بیدار کرنے والی منظوم یا منثور آواز گونج سکے۔ مسلمانوں کی سیاست لے دیکے ملازمتیں حاصل کرنے کی جدوجہد تک محدود تھی۔ جس قدر جو شخص حکام کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا اسی قدر اس کی رہبرانہ شہرت بڑھ جاتی۔ اس محکومانہ فضا میں جذبات حریت کو جامہ الفاظ پہنانا اپنے آپ سے عداوت کرنے کے مترادف تھا لیکن جنگ بلقان کے نتائج نے اسلامی ہند کو قومی بیداری کا احساس قبول کرنے کے قابل بنا دیا تھا مسلمانوں کے

دل میں نفرت کی آگ یورپ کے خلاف شعلے برسا رہی تھی مگر قانون و آئین کی ہمہ گیر گرفت نے ماحول کو اس درجہ محکومانہ بنا دیا تھا کہ اس میں کسی ایسی آواز کے لئے جس میں دل کی فدا سی گرمی بھی موجود ہو گنجائش ہی نہیں تھی اگر بھولے سے لفظ آزادی زبان پر آ بھی جاتا تو قوم کی وفادارا غفلت اس پر کان دھرنے کی اجازت تک دینے کو تیار نہیں تھی گویا قومی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کا وجود احساس حریت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔

آوازۂ حیات ہی کا فقدان نہ تھا بلکہ قوم میں کوئی ترقی پسندانہ آواز سننے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ چنانچہ بڑے بڑے لیڈر آج جن کے ہر لفظ میں ہنگامہ بیداری تڑپ رہا ہے اس زمانے میں وفاداری کے گیت، گانے ہی میں قوم کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے تھے۔

اس درجہ تاریک زمانے میں "شکریہ یورپ" ایسی شعلہ افشاں نظم کی تصنیف شاعر کے فطری جوش کی انتہا پسندانہ تصویر ہے جس کی نظیر اس دور بیداری میں بھی کسی سخنور کا قلم خیال نہیں کھینچ سکا سچ پوچھئے تو ہندوستان میں جس بناء پر دلیرانہ شاعری کا ایوان تعمیر ہو رہا ہے وہ آغا حشر ہی کے دست سخنوری سے رکھی گئی ہے۔ اگر شکریہ یورپ نہ لکھا جاتا تو دلیرانہ شاعری کا ظہور یقیناً آج پوری طرح نہ ہوا تھا۔ حشر نے یہ نظم لکھ کر جہاں قوم کے احساس زندگی کو جگا دیا وہاں شاعروں کو بھی ادائے فرض کی طرف متوجہ کر دیا حقیقت تو یہ ہے کہ "شکریہ" کا ہر شعر اپنے اندر عملی و علمی جہاد کا پیغام پوشیدہ رکھتا ہے جس کے مطالعہ سے خود بخود جذبات و وجدان میں حرکت عمل قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ملک کو حضرت شفاء الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی کا ممنون ہونا چاہئے جن کی فرمائش آغا مرحوم کے لئے یہ عدیم النظیر نظم موزوں کرنے کی محرک ہوئی جو دلیرانہ شاعری کی تاریخ کا ورق اولیں کہلانے کی مستحق ہے اس رسمی تمہید کے بعد میں زیر تنقید نظم پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(۱)

زوال مسلم،

"شکریہ یورپ" کے پہلے بند میں آغا مرحوم اسلامیان ہند کے قومی و ذہنی انحطاط کی تصویر کھینچتے ہیں کہ

مدتوں سے نغمۂ توحید محو خواب تھا

(۱) سازِ ہستی مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی
(۲) شعلہ ریزی نواہائے اخوت سرد تھی
کر چکا تھا اپنی ہستی مسلم پر جوش گم
(۳) گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشر خاموش گم

یہ تین شعر آج سے پچیس سال پہلے کی دنیائے اسلام کا روشن ترین نقشہ ہیں پہلے شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ نغمۂ توحید کے محو خواب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کی ہستی کا ساز تشنۂ مضراب تھا یعنی مسلمان پر حوادث کی کوئی ایسی چوٹ نہ پڑی تھی جو اس کے سوئے ہوئے احساس زندگی کو جگا دے اس فلسفہ کو جو شاعری کے روپ میں اپنے حقائق کی نمائش کر رہا ہے اچھی طرح سمجھنے کیلئے تاریخ اسلام کے ابتدائی حصے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر خود بخود سمجھ میں آ جائیگا کہ اسلام کو ہر عہد میں اپنی ترقی کے لئے ایک نئے آشوب، نئی مصیبت، نئے انقلاب اور نئے حادثہ کی ضرورت رہی ہے۔ مسلم کا جذبہ عمل ہمیشہ مخالفت کی چوٹ کھا کھا کر ابھرتا رہا ہے اس کا طلسم گراں خوابی توڑنے کیلئے نغمۂ شیریں کافی نہیں بلکہ اس کے لئے جہاں آشوب محشر کی ضرورت ہے جو ہلاکت و خونریزی اور عداوت و مخالفت کے ہزاروں ہنگاموں سے مرکب ہو۔ ابراہیم کے سامنے نمرود کی ظالمانہ غوغا آرائی دیکھیے۔ موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون کی مخالفت کا مطالعہ کیجیے۔ عیسیٰ کی مصیبت پر یہود کی خاک افشانی پر نظر ڈالئے۔ محمد صلعم کے آواز صداقت کے مقابلہ میں ابوجہل۔ ابولہب وغیرہ کی ہنگامہ آرائی اور مسلیمہ، اسود، طلیحہ، اور سجاح کی ملحدانہ غوغا آرائی پر غور فرمایئے حسینؑ مظلوم اور یزید ظالم کی داستان چہلش پڑھئے ہلاکو کی آتش ستم کے شعلوں سے شوکت بغداد کی راکھ اڑنے کا ماجرا ذہن نشین کیجیے۔

ان سب واقعات کے نتائج پر جب آپ تاریخ و تحقیق کی روشنی میں غور کرینگے تو یہ حقیقت آپ کا دماغ قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا کہ اسلامی روح جوش زندگی کی تجدید کے لئے ہر عہد میں ایک ایک ہلاکت انگیز ہنگامہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس حقیقت کو ایک اور شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

مولانا روم اس حقیقت کو تعمیر فی التخریب کے فلسفہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں کہ

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اولیں بنیاد را ویراں کنند

اسلامی فطرت کی بیداری اور مسلمانوں کی حیات تازہ کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے اس کو حشر مرحوم نے صرف ایک شعر میں بتا دیا ہے اب رہا یہ کہ مسلمان بیداری کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو جانے کے بعد ایک اچانک ہنگامہ سے کس طرح چونک پڑتا ہے؟ اس سوال کا جواب آغا صاحب نے دوسرے شعر میں دیدیا ہے کہ روح درد جس سے قومیت کا تخیل عالم وجود میں آتا ہے رخصت نہیں ہو جاتی بلکہ پیکر احساس میں سو جاتی ہے جس کی بیداری کے لئے ایک انقلابی ہنگامہ کی ضرورت ہے۔ تیسرے شعر میں اس غفلت کا لازمی نتیجہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان حوادث کے بالمقابل نہ رہنے کی وجہ سے ردعمل کی افسردگی کا شکار ہو چکا ہے تو اس کی معنویت کا محشر تماشا میں گم ہو جانا لازمی ہے اس خود فراموشی کی تفصیل آغا صاحب کی زبان شعر سے سنئے!

ماضیٔ رنگیں تماشہ حیرتی حال تھا
(۴) روزگار جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا

ماضی کے رنگین تماشے اگرچہ داستان پارینہ بن چکے تھے لیکن وہ حیرت سے حال کا مطالعہ کر رہے تھے کہ آخر اس انقلابی تفوق کے وجوہ کیا ہیں اور کیا عصر حاضر کا کوئی گوشہ عہد گذشتہ کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے لئے تیار ہے؟ اس توقع کا جواب عصر حاضر کی نظر فریب روشنی "کیف الحال" کے طنز آمیز جملہ کے بغیر کچھ نہ دے سکی۔ اس محرومی کی وجہ آغا صاحب کی نظر میں مسلمان کی معنوی موت تھی۔ گو وہ بظاہر ایک پیکر متحرک تھا لیکن باطن میں بےحس نعش سے زیادہ نہ تھا چنانچہ آغا صاحب فرماتے ہیں کہ۔

آمد و رفتِ نفس لاتی تھی پیغامِ حیات
ورنہ نذرِ خود فراموشی تھا نا کامِ حیات
چشمِ بینا حیرتِ طفلانہ کا گہوارہ تھی،
صرف تعمیر تحیر طاقتِ نظارہ تھی،
نغمہ سنجِ قدس چپ تھا گلشنِ تکبیر میں
بند تھا شورِ انا مسلم لبِ تقریر میں
مدفنِ صد جلوۂ آشوب زا آئینہ بود
یک جہانِ بیقراری دم بخود در سینہ بود

(۲)

پیغام اسلام

لفظ اسلام اپنے مفہوم و منشا کے اعتبار سے جس قدر وسیع المطالب اور جامع المعنی ہے اسی قدر اس کے اظہار کے لئے ایسے الفاظ و اسالیب کی ضرورت ہے جن کی وسعت بیان تصور اسلام کی پوری طرح ترجمانی کر سکے شاعر کو خیال سے شعر بنانے کیلئے جن لوازم و اسباب کی ضرورت ہے ان میں سے الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ زباندانی پر فخر کر لینا آسان ہے، محاورات و روزمرہ کی خوبیوں پر منثور قصیدہ لکھ لینا مشکل نہیں لیکن کسی ایسے خیال کو کلام بنانا دشوار ہے جس کی وسعت کیفیات قلبی اور افکار دماغی سے لیکر روح و وجدان تک حاوی ہو۔ یہ خوبی سوائے حشر کے کسی قادر الکلام سخنور میں نہیں ملیگی کہ ایک ہی شعر دل و دماغ اور روح و جذبات کی ہزاروں کیفیتوں کا روشن ترین آئینہ بن کر رہ جائے اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ حشر نے شکریہ میں صرف وہی نظریہ نظم کرنے کی کوشش کی ہے جو افکار و جذبات کے طویل امتزاج کا نتیجہ ہے چنانچہ اسلام کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ۔

وہ پیامِ آخری اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہورِ صدق جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلی حقیقت جو ضلالت سوز تھی،
گرمیٔ قلبِ محمدؐ سے تپش اندوز تھی،
روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالمتاب نے
زنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے

اسلام کے جامع اور قریب الفہم تعریف کے لئے اس سے زیادہ عام

فہم انداز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ان تین شعروں میں درحقیقت اسلام کے ان بڑے فلسفی رازی، غزالی اور ابن ماجہ کے نظریات کا نچوڑ موجود ہے جن کے فلسفہ کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اسلام اس تخیل کی عملی صورت کا نام ہے جو دماغ قدرت میں تربیت و تکمیل کے تمام منازل طے کر لینے کے بعد لباس نبوت میں ظہور پذیر ہوا اور آدم سے لے کر عیسیٰ تک مختلف زمانوں اور فضاؤں میں انسانیت کے تمام مدارج کا مطالعہ کرنے کے بعد حضور علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہری و معنوی کمالات کا آخری سرچشمہ بن کر اُبلا اور دامن انسانیت کے تمام منحوس دھبے صاف کر گیا اس کے بعد جو اصلاحی انقلاب رونما ہوا اس کی تفصیل آغا صاحب کی زبان حقیقت ترجمان سے سنئے۔

ظلمت آگیں خلقت انساں کو بینا کر دیا
سنگریزے کو جلا دے کر نگینا کر دیا
شعلے پیدا کر دیئے خاکسترِ افسردہ میں
زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں
شورش ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈال دی
شور بادل کا گرج بجلی کی دل میں ڈال دی
ایک ہلچل ڈال دی جذبات زنگ آلود میں
آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں

ان شعروں کے ظاہری و معنوی محاسن کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے لیکن "حیات مردہ" کی ترکیب میری سمجھ سے بالاتر ہے!

اسلام کی تعریف اور اس کے انقلابی اثرات پیش کرنے کے بعد آغا صاحب دین ہدیٰ کا تبلیغی پہلو پیش کرتے ہیں۔ یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ اتنا بڑا مذہب جس نے عالم انسانیت کے فرسودہ پیکر میں تجدید حیات کی تڑپ پیدا کر دی ہو اس کا پیغام بھی حیات افروز ہونا چاہئے اس حقیقت کے پیش نظر آغا صاحب فرماتے ہیں۔

بارہا نالید و گفت اے قوم ما بیدار شو
حصۂ خود از حریفاں گیر و گرمِ کار شو

(۳)

ضرورت بیداری

کسی قوم یا فرد میں احساس عمل پیدا کرنے کیلئے دلائل و براہین کی ضرورت ہے اور دلائل بھی اس کے حالات و واقعات سے متعلق ہوں تاکہ انکے سمجھنے میں اس کو دقت محسوس نہ ہو چنانچہ مجدد العصر حضرت علامہ جمال الدین افغانی کا قول ہے۔

"کسی قوم میں عملی انقلاب قبول کرنے کی صلاحیت محض تاریخی افسانے سنانے سے پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ گزرے زمانے کی باتیں اس کی بصیرت پر کوئی طاقتور اثر نہیں ڈال سکتیں مثلاً کسی شخص کو کہا جائے کہ زمانہ گذشتہ میں ایک شخص نے تلوار کی نوک سے شیر کا سینہ چیر دیا تھا وہ یہ بات تو مان لیگا کہ انسان تلوار کی مدد سے شیر پر غالب آ سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھے گا کیونکہ اس کے ہاتھ میں تلوار نہیں یہ نہتا شخص اسی وقت ہی شیر سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوگا جب اس کو بتایا جائے کہ شیر تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے تم شیر کے پنجہ سے محفوظ تو نہیں رہ سکتے بزدلی کی موت مرنے سے یہی بہتر ہے کہ تم اس کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ یہ مثال پیش کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ تاریخی افسانے انسان کے لئے تحریک عمل کا ذریعہ نہیں ہو سکتے ہر انسان کے جوش عمل کا انحصار اس کے پس و پیش کے حالات اور ہنگامی تاثرات پر ہے"

آغا حشر نے "ضرورت بیداری" کا نقشہ بالکل افغانی علیہ الرحمہ کے ارشادات عالیہ کی روشنی میں کھینچا ہے یہ الگ بات ہے کہ نثر ہزاروں لال و معارف کی موجودگی میں نظم کی روحانیت حاصل نہیں کر سکتی چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ

پر ز غوغا شد جہاں شورم ز ہفت اختر گذشت
پنبہ در گوشی چرا؟ برخیز کآب از سر گذشت
مایۂ صد آفت است ایں گوش ناشنوائے تو
ہوش کن زمروز گردد خوار تر فردائے تو
شرم کن محو ادائے کفر ساماں کردۂ
آں دل و جاں کہ اول نذر قرآں کردۂ

"ضرورت بیداری" پیش کرنے کے بعد آغا صاحب براہ راست اہل

عمل کو لوگ تقریبا چھوڑتے ہیں کہ

اے کہ فطرت نرم ہمت ہمچو آہن داشتی
قطرۂ بودی ولے طوفاں بدامن داشتی
پر کن از صہبائے دوشیں ساغر ایام را
باز رنگ جلوہ دہ از صبح ماضی شام را
صرف نسیاں ہیبت غرناطہ و بغداد شد
باز برخواں آں سبق کو خلق را از یاد شد
سطوت فاروقؓ بنما شیوہ از حیدر بگیر
تاج از کسریٰ ستاں و باج از قیصر بگیر
حال و استقبال ہر دو حاصل تدبیر تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دست تو تقدیر تست

مسلمان فطرتاً حلیم الطبع اور بردبار ہے لیکن جب انسانی فلاح کیلئے وہ جنگ کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس کی ہمت میں لوہے کی کرختگی پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتی ہے وہ مدبرانہ حربہ جو کسی سادہ لوح انسان کو ابھارنے کی غرض سے استعمال ہو سکتا ہے پہلے شعر میں یہ فطری وصف بتلانے کے بعد کہا گیا ہے کہ اگر تیرے پاس تدبیر کے ساتھ ساتھ جوش جہاد بھی موجود ہے تو بزم حال کی تاریک اور افسردہ فضا میں ماضی کی شمع عمل کیوں نہیں کرتا یہ تیری غفلت کا نتیجہ ہے کہ دنیا شوکت بغداد اور سطوت غرناطہ کی داستان بھول چکا ہے - اہل دنیا اسلام کی روحانی سیاست کی اس عملی صورت سے جس کے فاتحانہ نعرہ میں ملوکیت کے ہنگامے دفن ہو چکے تھے ایک خاموش اور بے نتیجہ آوازسے تعبیر کر رہے ہیں حالانکہ اس زمانے میں بھی یہی اسلام تھا اس کی پیروی بھی اسی طرح ہوتی تھی - مسلمان اسی طرح کلمہ توحید کی گرمی سے حرارت زندگی حاصل کرتے تھے اسی قرآن پر ایمان لانے والوں کے جوش عمل کی تصویریں فتح دہلی، شوکت بغداد اور شکوہ اندلس کے مرقع میں جگمگا رہی تھیں - آخر تیری زبوں حالی کی وجہ کیا ہے ؟ غلامی و نکبت کے اسباب کیا ہیں ؟ تیرے گھر کی دہلیز پر ہاتھے رگڑنے کی علت کیا ہے ؟ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تیرے دل میں وہ شعلہ بجھ چکا ہے جو محمد عربی صلعم کے چراغ عمل سے تڑپ کر اٹھا اور دلوں میں حرارت ایمانی بن کر جذب ہو گیا تھا اگر تیرا دل پھر اسی آگ سے روشن ہو جائے تو تیری محکومانہ زندگی ایک انقلاب انگیز کروٹ بدل کر کسریٰ سے تاج چھیننے اور قیصر سے خراج لینے کے قابل ہو سکتی ہے -

آخری شعر میں جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ بذات خود اتنی جامع ہے جس کی وسعت ہزاروں شعروں میں بھی نہیں سما سکتی خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جو اشخاص ایمان لائے اور ایمان لانے کے بعد اچھے کام بھی کئے تو خدا ان کو زمین کی خلافت کا انعام دیگا - فلاسفہ اسلام نے عمل صالح کو ہمیشہ مخلصانہ جدوجہد سے تعبیر کیا ہے جو قوم کی فلاح و ترقی اور آزادی و خوشحالی کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے - آغا صاحب نے بھی کسی قدر اختصار کے ساتھ اس جدوجہد کی طرف دعوت آمادگی دی ہے اور جو قوم جہد آمادہ ہو جائے اس کے قوائے عمل دوسروں کی امداد و اعانت سے خود بخود بے نیاز ہو جاتے ہیں اس کی مجاہدانہ تدبیر مستقبل کو اپنی منشا کے مطابق تعمیر کر سکتی ہے لیکن یہ صلاحیت جب ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ حال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق بنا لیا جائے

قومے بہ جدوجہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند

جو قوم اپنی فلاح کے لئے خود جدوجہد نہیں کر سکتی اس کی اصلاح کے لئے مدت کی غیبی طاقتیں اور زمانے کے اتفاقات بھی بروئے کار نہیں آسکتے کیونکہ اس کی خود فراموشانہ افسردہ دلی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اصلاح و انقلاب کا پیغام قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اگر تم خدا سے اپنی مدد کرانا چاہتے ہو تو اپنی مدد آپ کرنا سیکھو -

خود جو اپنی مدد نہیں کرتے
ان کا حامی کبھی خدا نہ ہوا

اس مسئلہ میں مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر (جس کا مفہوم آیہ کریمہ سے ماخوذ ہے) کتنا بلند پایہ ہے -

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(۴)

درس تجدید

نظم کے چوتھے بند میں آغا صاحب مسلمانوں کو درس تجدید دیتے ہیں کہ

ہاں چھڑک پیشانی ظلمت پہ افشان سحر
ٹانک دے دامان شب میں پھر گریبان سحر

بہرہ ور کر دل کو سوزِ جذبِ تسلیم سے
جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قربانگاہ کو
زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو
ڈال دے شورِ نوا معمورۂ ظلمات میں
دوڑ جا آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
خاک کو بھر دے سرورِ آسماں پرواز سے
گرم کر دے روحِ مستی شعلۂ آواز سے
حسنِ آرائش سے زینت عالمِ امکان کو دے
خلعتِ تجدید آئینِ کہن ساماں کو دے
کلیاتِ دہر کی اک شرحِ نو تحریر کر
نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر
طرحِ نو انداز بنیادِ جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہنی آتش بہ خشک و تر فگن

کسی فلاکت زدہ اور محکوم قوم میں تجدید وانقلاب کا صحیح احساس پیدا کرنے کے لئے جس پیرایہ، جس اسلوب، جس انداز اور جس معجزانہ طریقہ گفتگو کی ضرورت ہے وہ ان آٹھ شعروں میں بوجوہ تمام موجود ہے ورنہ اس نظم سے پہلے اُردو شاعری میں یہ چیز موجود نہیں تھی اُردو شاعر تجدید احساس کے لئے اگر کوئی موثر کوشش عمل میں لاتے بھی تھے تو ان کو اپنے خشک پسند ذہن کے تقاضا پر صاف اور غیر مبہم طرز گفتگو اختیار کرنے کی بجائے تشبیہ واستعارہ کی زبان سے کام لینا پڑتا تھا اور یہ طریق بھی ان کی مجتہدانہ مساعی کا نتیجہ نہیں بلکہ متقدمین کی بنائی ہوئی ایک شاہراہ ہے جس پر آئے دن نئی نئی طرز رفتار سے چلنے کی کوشش کی جاتی تھی آغا حشر نے درس تجدید کا یہ نرالا اور انوکھا انداز اختیار کر کے اپنے آپ کو آتش کا یہ شاعرانہ نعرہ لگانے کے قابل بنا دیا ہے کہ

مضمون رفتگاں سے طبیعت ہے اپنی تنگ
گاہک نہ ہونگے ہم کبھی مُردے کے مال کے

اب قدما کا پیرایہ درس تجدید بھی ملاحظہ فرمایئے چنانچہ خواجہ حافظ علیہ الرحمت کے چند شعر ہیں کہ

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک کا سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم
بہشتِ عدن اگر خواہی بیا با ما بمیخانہ
کہ از پائے خمت یکسر بحوضِ کوثر اندازیم
بیا جاناں منور کن ز رویت مجلسِ ما را
کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے اشعار میں روح وضمیر کی آوازیں تڑپ رہی ہیں ان میں وہ اثر پوشیدہ ہے جس کے وجدانی معنی دل تو سمجھ لیتا ہے لیکن نطق والفاظ سے اس کی خفیف سی تعبیر بھی نہیں ہو سکتی اس کے مقابلہ میں آغا صاحب کے اشعار دل کی ہیجانی کیفیتوں اور جذبات کے اشتعال پذیر حالت کا آئینہ ہیں۔ میں رسمی ادب واحترام کا قائل نہیں۔ میرے ضمیر کی لغت میں سوء ادب اور حسن ادب کے لفظ محض لسانی ریاکاری کے لئے ہیں اس لئے میں یہ کہتے ہوئے ندامت محسوس نہیں کرتا کہ خواجہ صاحب کا ہر شعر روحانی مستی کا پیغام بر ہے لیکن قوم میں کتنے لوگ ہوتے ہیں جن کی ترقی یافتہ روحانیت تیغ وسناں کا کام "نعرہ یاہو" سے لے سکے۔ وہ شیر مردان بیشہ معرفت کہاں ہیں جن کے متعلق حضرت علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خواجہ صاحب کا زمانہ سیاسی اعتبار سے موجودہ عہد سے بہت زیادہ قابل توجہ تھا اس زمانے کے تمام شاعروں کا طریق سخن آغوش انقلاب میں پرورش پا کر منزل ترقی تک پہنچا اس لئے حالات ووقت کے تقاضے کے سوال کی بھی اس بحث میں گنجائش نہیں حقیقت یہ ہے کہ حشر کا پیغام ساری قوم کے لئے اور حافظ کا ارشاد صرف اہل روحانیت کے لئے ہے۔ ایشیائی شاعری میں عرصے سے اس قسم کے عمل آموز پیغام تجدید کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کو آغا حشر نے پورا کر کے آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسی شاہراہ تجویز کر دی جس پر گامزن ہو کر وہ قومی شاعری کی حقیقی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ شاعری صرف روحانی لذات فراہم کرنے کا نام نہیں بلکہ اس کے فرائض میں قوم کی مادی وعملی بیداری بھی شامل ہے

کیونکہ دم کے بغیر کوئی درج کام نہیں کر سکی۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

(۵)

نتیجۂ غفلت

مسلمان کی غفلت کے نتائج جس ہولناک صورت میں رونما ہو چکے ہیں ان کا تصور بھی کسی آزاد قوم کا دماغ برداشت نہیں کر سکتا، یہ خفتہ بخت ان حوادث کی آواز تو سنتا ہے جو اس کے سر پر سے دندناتے ہوئے گذر رہے ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں ہنگامۂ عمل برپا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، ان انقلابات سے بھی بے خبر نہیں جن کے نتائج سے قومیں اسباب حریت اخذ کر رہی ہیں لیکن اس کو صرف اپنی زنجیر غلامی کی کڑیوں کے شمار سے فرصت نہیں اس درد انگیز خودکشی کا نقشہ آغا صاحب ان شعروں میں کھینچتے ہیں کہ

تیری لب بندی سبق آموز گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان فردوں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے ہی نقش سجدہ جس کی پیشانی پہ ہے

اس تڑپا دینے والے پیرایہ بیان کی مثال اردو شاعری میں مشکل ملیگی لیکن پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں قافیہ کی مجبوری اس درجہ غاصب ثابت ہوئی کہ اس نے "ہوئیں" کا حق چھین کر "ہوئی" کو دیدیا ہے۔ تاہم دوسرے شعر کے معنوی وظاہری محاسن اس درجہ وسیع ہیں کہ ان کی موجودگی میں یہ خفیف سا سقم نظر ہی نہیں آتا۔

بایں ہمہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ سامان کامیابی تو موجود ہیں صرف ان کے حاصل کرنے کی صلاحیت چاہئے چنانچہ آغا صاحب فرماتے ہیں کہ۔

منتظر نظارے ہیں چشم خمار آلود کھول
اٹھ کلید فتح بن باب در مقصود کھول

اس کے بعد آغا صاحب پھر مسلمان کی غفلت پر زبان شعر سے نالہ سرائی کرتے ہیں کہ۔

اے خوشا غفلت کہ ممنون اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا دل پر اثر کچھ بھی نہیں

حالانکہ اسباب بیداری ذرہ ذرہ سے پیدا ہو رہے ہیں قدرت کی انوکھی کارفرمائیاں زبان حوادث سے پیغام عمل دے رہی ہیں ہر تازہ واقعہ ایک معلم بیداری ہے لیکن مسلمان موت سے شرط باندھ کر سو یا ہے انقلاس کو زمانہ کی کروٹوں سے ذرا بھی آگاہی نہ تھی چنانچہ آغا صاحب فرماتے ہیں۔

گو صدائے ہمت افزا تا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر ہم آواز سروش آتی رہی
پھر بھی ننگ زندگی آسودۂ خواری رہا
سونے والے پر وہی خواب گراں طاری رہا

جب قدرت کی معمولی کارفرمائیاں مسلمان کو خواب ہلاکت سے جگانے میں ناکام رہیں تو مختار الٰہی نے اپنی سنت کے مطابق ایک اور دردناک طریقہ اختیار کیا جو آگ اور خون کا مرکب طوفان ہونے کے باعث ملت بیضا کی تباہی کا موجب تو ہوا لیکن مسلمانوں کو خواب ہلاکت سے ضرور بیدار کر گیا اس لئے آغا صاحب اس طریق عذاب کو شعری استحسان کے ساتھ پیش کرتے ہیں یہ ہولناک انقلاب اہل مغرب کی ہوس ملک گیری کا وہ نتیجہ تھا جس سے دنیائے اسلام کا ذرہ ذرہ خون انسانی سے لالہ بدامن ہو گیا چنانچہ آغا صاحب فرماتے ہیں کہ

جب تغافل پیشہ اپنا خفتہ قسمت نے کیا
اور ہی سامان بیداری مشیت نے کیا
دفعتہ از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شد،
قم باذنی گفت مغرب روح مشرق زندہ شد،

(۶)

ستم مغرب!

جس سرزمین کے باشندوں کے ہنگامہ ستم وتشدد سے فطرت مسلم بیدار ہوئی اس کے تعارف کا فرض آغا صاحب نے یوں ادا کیا ہے۔

اے زمین یورپ اے معراض پیراہن نواز
اے حریف ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشک حسرت زا سے چشم حریت نمناک ہے
خوں چکاں روداد اقوام گریباں چاک ہے

صرف تصنیفِ ستم ہے فلسفہ ذاتی تری
آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری
عظمت دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسن قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہ شوکت مشرق کو سونا کر دیا،
جنت دنیا کو دوزخ کا نمونا کر دیا،
اٹھ رہا ہے شور غم خاکستر پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبان حال سے
"بر مزار ما غریباں نہ چراغے نہ گلے
نے پر پروانہ سوزد نہ صدائے بلبلے"

اہل یورپ کی ہوس استعمار کے تمام پہلوؤں کی تصویریں اس سے زیادہ دلچسپ انداز میں کھینچی نہیں جا سکتی اگر یورپی قوموں کی کارفرمائیوں اور اس کی قومی ذہنیت کے متعلق تاریخ لکھی جائے تو یہ اشعار اس تاریخ کا خلاصہ کہلانے کے مستحق ہونگے۔ اردو شاعری میں سیاسی طور پر تلخ حقائق کا اظہار انھیں شعروں سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد جتنی بھی سیاسی نظمیں لکھی گئیں وہ ان کی صدائے بازگشت متصور ہونگی۔ آغا صاحب نے جس وقت یہ شعر لکھے ہونگے اس وقت ان کو خود بھی معلوم نہ ہوگا کہ چند منظوم جملے جو مطالب کے اعتبار سے ان جذبات منافرت انگیز کے آئینے ہیں جن کی نمائش کی راہ میں ہزاروں رکاوٹیں حائل ہیں دراصل شعرا کے افکار و خیال سے قیود توڑنے کے موجب ہیں۔ چنانچہ یہ شعر جس قدر مشہور ہونے گئے اسی قدر دلیرانہ قومی شاعری کا بند میدان پابندیوں سے جو آزادانہ خیال کو لفظ بننے سے روکتی ہیں آزاد ہوتا گیا یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں شاعر حکومت کے متعلق کسی قسم کی لگی لپٹی رکھے بغیر جذبات صادقہ کو قالب نظم میں ڈھال لیتے ہیں سچ پوچھئے تو یہ بند ہی "شکریہ یورپ" کی قابل رشک مقبولیت کا موجب ہوا ورنہ دامان شاعری میں ہزاروں آبدار موتی موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی لمعانی "انا ولا غیری" کا نعرہ لگانے کی مستحق ہے۔ شکریہ کو جس خصوصیت نے امتیازی شان بخشی ہے وہ اس کی دلیرانہ تعلیم ہے۔

آغا صاحب نے یورپ کی ستم رانیوں کو بیان کرنے کے بعد اس کے تشدد سے وہی حقیقت اخذ کی ہے جس کا اظہار میں نظم کے پہلے شعر کی تشریح میں کر چکا ہوں یعنی مسلمان کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے ہر عہد میں ایک خونریز ہنگامہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عصر حاضر میں یہ ضرورت اہل یورپ کی ہوس ملک گیری نے پوری کر دی جس سے مسلمان از سر نو بیدار ہو کر تیرہ سو سال کا بھولا ہوا سبق یاد کرنے کے قابل ہو گیا چنانچہ آغا صاحب نے اس حقیقت کا نہایت دلپذیر لہجہ میں اظہار کیا ہے۔

(۷)

بیداری مسلم

آغا صاحب یورپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امت خیر الورا لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم ملت کھل گئی،
چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذت ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ بشکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خون تن بیجاں میں ہیجان آ گیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفان آ گیا
چونک اٹھی روح اخوت ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
مل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے
از کرم بپذیر یا رب جوش بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار ایں زندگی تازہ را

غلبہ مغرب کے باعث مسلمانوں میں "پان اسلامزم" کی نفلی صورت میں انقلاب انگیز جو بیداری پیدا ہوئی اس کے نتائج نے مسلمانوں کو معنوی طور پر ایک لڑی میں پرو دیا شعر بذات خود اپنی خوبیوں پر آپ شہادت ہیں آخری بند مناجات ہے آغا صاحب فرماتے ہیں۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے

اے دُعا ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رخ گردش ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسر پیکار ہیں،
وقت اور تقدیر دونوں درپئے آزار ہیں،
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزش غم کیلئے
کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کیلئے
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن تری محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دینگے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

خاتمۂ کلام

جہاں تک شکریہ یورپ پر تبصرہ کا تعلق تھا وہ اس مضمون میں کسی حد تک پورا کر دیا ہے لیکن اس آئینہ حقیقت کے تمام جلوؤں کو فردوس نظر بنانے کیلئے ابھی ناقدانہ تجسس کیلئے گنجائش باقی ہے میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ نظم اُردو شاعری کا سب سے پہلا ارتقائی نمونہ ہے جس کی تفسیر پیش کرنے کیلئے ابھی بہت سی ذہنی ترقی کی ضرورت ہے آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں نے شکریہ یورپ کی روح کی جاذبیت و کشش سے متاثر ہو کر یہ چند سطریں لکھنے کا شرف حاصل کیا ہے نظم کی روحانیت نے مجھے جسم یعنی الفاظ کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں دی اس لئے میں ان حضرات سے معافی چاہتا ہوں جو شعر کی معنویت سے بے نیاز ہو کر صرف الفاظ و زبان کے عیوب و محاسن پر زور تنقید صرف کرنے کے عادی ہیں۔

برادر محترم حافظ محمد عالم صاحب مدیر رسالہ "عالمگیر" خاص طور پر میرے شکریہ کے مستحق ہیں جن کا زور دار ارشاد مجھ سے یہ مضمون لکھوانے کا موجب ہوا گویا ؎

فیض سے مستی کے دیکھا ہم نے گھر اللہ کا
جا رہے مسجد میں شب گم کردہ کاشانہ ہم،

عالمگیر بکڈپو کی چند قابل دید کتابیں!

کھرپا بہادر
مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار۔ نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ ساتھ لنکرا اعظم کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک اور قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ تشریر کے دربار حرام پور کو بھول جائینگے بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت ایک روپیہ محصول ۵؍

خطوط کی ستم ظریفی
مصنف مصور ظرافت مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ہنسانے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کی مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے فوراً طلب فرمایئے قیمت ۱۲؍

کتاب التقدیر
علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب تھے آپ نے تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تحریر و تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب بقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس صرف پانچسو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف ۱؎ علاوہ محصولڈاک میں ملے گی۔

شادی
آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے دلچسپ حالات خود ملا صاحب کے فاؤنٹن پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھایئے حجم ۲۰۰ صفحے قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے ؏

صبح لطافت
ملا رموزی صاحب کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابل دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں پڑھتے جایئے اور ہنستے جایئے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف ۱؎

(نوٹ) ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے ۱۲ (۳؎) علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا درخت ۱۲؍ مجبوبہ فیروز ۱۲؍

حجم ۳۰۰ صفحے — حجم ۲۷۵ صفحے

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے کتاب کی عمدگی کیلئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے آپ بھی جلد از جلد طلب فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

عالمگیر بکڈپو۔ لاہور

فلسفۂ خواب

ایک بہترین مزاحیہ افسانہ

جناب قاضی محمد شفیع صاحب بی اے (علیگ)

میں نے جاپان روانہ ہونے سے پیشتر اپنے عزیز دوست اسمٰعیل کو خدا حافظ کہنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ عجلت میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا میں اس کے مکان پر پہونچا اور نشست گاہ کو خالی پاکر سیدھا اس کی خوابگاہ میں بلا تکلف جا داخل ہوا۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ باوجود اس امر کے کہ آفتاب نصف النہار پر آرہا تھا اسمٰعیل اب تک اپنے بستر پر محو خواب تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ گالوں کا گوشت اس قدر ڈھیلا پڑ گیا تھا کہ وہ مرض استرخا میں مبتلا نظر آتا تھا۔ چہرہ کی رنگت پھیکی تھی۔ جمود و سکوت کسل کی علامات اس کے بشرہ پر پوری قوت سے کھیل رہی تھیں غرض اس کے پژمردہ اور مضمحل چہرہ سے ہر طرح عیاں تھا کہ اسمٰعیل حیاتی کے روشن پہلو سے یک قلم غافل ہے۔ میں چلا یا۔

"میرے یار بڑا افسوس ہے کہ بارہ بجنے کو آئے اور آپ اب تک سوئے ہوئے ہیں"۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بغیر کروٹ کی تکلیف گوارہ کرنے کے اپنے لبوں کو خفیف سی جنبش دی جو مہر سکوت توڑنے سے قاصر ہی رہ گئی۔

اسمٰعیل ابتدا میں نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا مشہور و دولتمند چچا انتقال کرگیا اور اس کے لئے اتنی جائداد ورثہ میں چھوڑ گیا جس سے اس کو تین سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہوجاتی تھی۔ بس اسمٰعیل نے اسی پر قناعت کرتے ہوئے لاابالی اور بیکاری پر اکتفا کی اور زندگی کا بیشتر وقت بستر پر بسر کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ بیکار محض ہوکر رہ گیا۔

نہ وہ کسی کام کو چھوتا تھا نہ اس کو کھیل تماشہ سے شوق تھا۔ نہ سیر و تفریح سے علاقہ۔ غرضیکہ وہ کسی طرح بھی اپنے نفس کو حرکت نہ دیتا تھا میں نے بارہا آزمایا مگر سوائے بستر پر پڑا رہنے کے اس کو کسی حالت میں نہ پایا اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ خدانخواستہ بوجہ انحراف مزاج صاحب فراش تھا نہیں، بالکل نہیں، محض کسل، خمول اور بےفکری اس کی اس حرکت کی ذمہ دار تھیں ورنہ اس کی صحت ماشاءاللہ اچھی خاصی تھی۔

کسل بھی عجیب اصطلاح ہے جو مختلف نظریات اور معتقدات کی حامل نہیں بلکہ بنا ہے۔

میں نے بےصبری اور غصہ سے مرعوب ہوکر کہا کہ "اگر لوگ تمہارے سے طور طریق اختیار کرلیں اور اسی نہج پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیں تو دنیا کا مآل کیا ہو؟"

اُس نے نہایت اطمینان سے جواب میں کہا کہ اگر ایسا ہو سکے تو دنیا دنیا سعادت مطلقہ ہو جائے۔ جنگ وجدل کا یک قلم خاتمہ ہو جائے جرائم کا ارتکاب دنیا سے اٹھ جائے۔ نزاع۔ طمع۔ حسد۔ چغلی۔ شماتت۔ بیر عداوت۔ مردم آزاری غرض جملہ اخلاق ردیہ کا بالکلیہ قلع قمع ہو جائے۔

میں دوست: لیکن ساتھ ہی ذہانت و [illegible] ختم ہو جائے۔

اسمٰعیل (اطمینان سے پہلو بدلتے ہوئے) میرے عزیز دوست! میں نہیں کہنا چاہتا کہ آپ خفیف العقل ہیں نہ ہی آپ کے ادراک کی تحقیر کرنا میرا منشا ہے۔ حاشا! مگر میرا عقیدہ ہے کہ حیات کا راز سکون تام اور عدم حرکت میں مرکوز ہے سلحفہ تین سو سال تک زندہ رہتا ہے

مگر شکاری کتا دس سال سے زیادہ کی زندگی نہیں پاتا - وجہ اس کی ظاہر ہے اول الذکر اپنے آپ کو کامل سکون سے رکھتا ہے اور آخر الذکر اپنے قویٰ سے حد سے زیادہ کام لیتا ہے اور ان کو قبل از وقت فنا کر لیتا ہے -

قتال و جدال، ریاضت و محنت، جد و کد یہ جملہ اوصاف حیوانات متوحشہ کی شان ہے برعکس اس کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کا واحد مکان بستر ہے - بستر ہی میں اس کی روح کو حظ و لطف میسر آتا ہے اس کا ذہن ترقی کرتا ہے - اس کے افکار صاف ہوتے ہیں غرضیکہ بستر سے انسان ہزار نوع سے متمتع ہوتا ہے - یقین جانئے کہ اس میں انسان کے جسم و روح کے آرام و راحت کے ہزاروں راز ہیں جن کو تیرے جیسے پلید اور غبی آدمی بالطبع سمجھ ہی نہیں سکتے دیکھئے بستر کے چاروں زاویوں میں انسانی جسم کے ہزاروں گونہ آرام کی خاطر کس قدر وسیع میدان ہے اور یہ تو حقیقت ہے کہ میں نے اپنی حیات کا نصف سے زیادہ حصہ اب تک بستر میں بسر کیا ہے اور ابھی تک روز بروز جسمانی و روحانی اطمینان و راحت کے نئے نئے راز مجھ پر منکشف ہو رہے ہیں "

میں مگر آپ جیسے نکھٹوں کو بستر میں خواب غفلت کے مزے جبھی لوٹنے نصیب ہوتے ہیں کہ بقیۃ الناس کد و کاوش، محنت و مشقت جد و جہد سے اپنی جانوں کو ہلکان کرتے ہیں "

اسمٰعیل دوست! اس میں میرا کیا قصور، حکومت منظم عبارت ہونی چاہئے ایک وسیع غرفۂ خواب سے - باور کیجئے کہ یہ اجباری جد و جہد اور نام نہاد کشمکش حیات جو بغیر جسمانی کوفت اور روحانی کرب کے ممکن نہیں، اس میں سے ننانوے فی صدی بالکل اکارت اور بے فائدہ ہے مہمل ہے - لاحاصل ہے - واجب ہے کہ لوگ بستر سے نکلیں مگر ایسی شدید ضرورتوں کے وقت جو بقائے حیات کے لئے عمل کی لازمی طور پر محتاج ہوں - برعکس اس کے اقوام متمدنہ نے جن مابہ الاحتیاج اشیاء کی ایجاد و اختراع کی ہے وہ سب لغائد باطلہ کی قبیل سے ہیں اور باعث تضییع اوقات - حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے لئے انسان صرف تین چیزوں کا محتاج ہے کھانا، پینا اور نیند - اور مجھے ذاتی طور پر اس میں ایک حد تک اعتراض بھی نہیں کہ آدمی روزانہ ایک آدھ گھنٹے کے واسطے ماکول و مشروب کے لئے اپنے بستر کو خیرباد کہدے "

میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا - اس کی ڈاڑھی خاصی بڑھی ہوئی تھی - اس لئے کہ وہ ہفتہ بلکہ دو ہفتہ میں ایک بار حجامت بنواتا تھا - اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا -

"لابدی ہے کہ دنیا کے عالم ابدی راحت اور دائمی سکوت کے معنی سمجھے اور اگر وہ چاہیں تو یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے مثلاً آپ دیکھتے نہیں کہ حزب العمال نے اپنی مشکلات کے لئے "مقاطعہ" کی شکل میں اس حل کو پا لیا ہے - مقاطعہ فی زمانہ سب سے قوی سیاسی حربہ ہے یہاں تک کہ وہ جنگ و جدل" عدالت ہیگ" اور مجلس بین الاقوامی" سے بھی بازی لے گیا ہے - یہی نظریہ مہاتما گاندھی کا ہے وہ انگریزوں سے کسل خواب اور عدم حرکت کے ہتھیاروں سے مقابلہ کر رہا ہے اور انھیں سے حکومت کو نیچا دکھانا چاہتا ہے -

یقین جانئے کہ ہم عصر جدید میں سے گذر رہے ہیں یہ وہ دور ہے کہ جسے کسل کا دور کہنا چاہئے اور کیسی کسل؟ ایسی جو انسان کو حوائج باطلہ سے مستغنی کر دے جب قومیں بستر خواب کی پناہ لینگی اس وقت تمدن نیا جنم لیگا جسے صحیح معنوں میں احیائے عالم کہنا چاہئے اور جو دوا رماسبق کے جسم پر جسے بجا طور پر عالم کون و فساد کہا گیا ہے ایک زخم کاری ہوگا - جو انسان اپنے بستر استراحت میں محو خواب ہو اس کا بھلا آپ کیا بگاڑ لینگے - آخر آپ اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخنے سے تو رہے - مختصر طور پر عرض کروں میرا مطمح نظر تو بس یہی ہے کہ میں ایک "بستر پسند سوسائٹی" کی داغ بیل ڈالوں - اور جب میرے معتقدات کی کافی نشر و اشاعت ہوگئی تو عجیب و غریب نتایج آپ کے دیکھنے میں آئیں گے - پھر اگر کوئی ایسا سیاسی فرقہ یا ہیئت جس کا استبداد اور جذبۂ حرص و آز جنون کی حد تک پہنچ گیا ہو اٹھ کھڑا ہو اور ہم سے کہے کہ آؤ ہم فلاں ملک یا قوم سے جنگ کریں تو ہم ان سے "بہت خوب" کہہ کر اپنے بستر راحت میں کود پڑینگے اور اپنے استقلال اور پائے ثبات سے ان کو بھی مجبور کر دینگے کہ وہ بھی بستر کی آڑ لیں پس شر زائل ہو جائیگا ـــــ جنگ ٹل جائیگی ـــــ اور قتل و غارتگری سے بنی نوع انسان کی صیانت و امانت محفوظ ہو جائیگی "

یہ کہکر اس نے لمبی انگڑائی لی - ہاتھ بڑھا کر چادر کھینچی اور منہ

پرسے لی - یہ کہہ کر میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا -
اس کو متوجہ رکھنے کیلئے میں نے دوسرا سوال کیا -
میں نشاط اقوام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟
اسمٰعیل نشاط حقیقی تو لزوم بستری سے قابل الحصول ہے - ہاں
اگر نشاط سے آپ کی مراد قتل و غارت جنگ و جدل سے ہے
تو معاف فرمائیے یہ نشاط نہیں بلکہ ارتکاب جرائم ہے جس کی
تلافی خواب ہی سے ہو سکتی ہے - ہاں میں بزور کہوں گا کہ نشاط معروفہ
کی قبیل سے جو کچھ انسان نے اختراع کیا ہے وہ سب "قاتلاً مقاتلاً"
سے عبارت ہے - پس تجارت جنگ کی - صنعت جدل کی - سیاست
دروغ گوئی کی اور استعمار پرستی غصب فاحش کی مرادف ہیں -
میں میں بحث میں سارا دن ضائع کرنا نہیں چاہتا - خصوصاً
جب کہ میرا جہاز ۹ بجے چھوٹنے والا ہے - مگر میں اس قدر
ضرور دریافت کروں گا کہ فنون لطیفہ - احسان - جمال اور
محبت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟
اسمٰعیل بس بستر خواب ! یہ سب کچھ بستر خواب سے
میسر ہو سکتا ہے - ان سب چیزوں کا تعلق روح سے ہے
اور روح کا مکان بستر استراحت ،
بستر ہی سے دماغ کا تزکیہ ہوتا ہے اور اسی سے افکار کی جلا
ہوتی ہے - رہا احسان ! ——— تو آپ ایک بستر خواب انسان
کو دیدیجئے ——— گویا آپ نے اس پر اتنا بڑا احسان کیا کہ
گویا مملکت بخشدی "
یہ کہکر اس نے منہ ڈھانپ لیا اور مغالطہ تکلم کا قطعی فیصلہ دیدیا -

---

عالمگیر میں اشتہار کامیاب ہے
یہ بہت ہوتا ہے آزمائش شرط ہے (مینجر)

محسوساتِ ماہر

مولانا ماہر القادری مدظلہ

ہر نفس پیغامِ بربادی ہے انساں کیلئے
نبض کی ہر موج ہے حرکت رگِ جاں کیلئے

زندگی دی ہی گئی تھی کشمکش کے واسطے
دل بنایا ہی گیا تھا سوزِ پنہاں کیلئے

اپنے اندازِ کرم کی مجھ سے تاویلیں نہ کر
یہ بھی اک تقریب تھی جورِ فراواں کیلئے

کچھ نہ پا کر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پالیا
زندگی سب سے بڑا دھوکہ ہے انساں کیلئے

اے مری حسنِ عقیدت اے مرے نورِ یقیں
کفر کی بھی اک جھلک تکمیلِ ایماں کیلئے

پھول ذرّے کہکشاں تارے شفق قوس قزح
نذر لائے ہیں ترے حسنِ فراواں کیلئے

رہ گئی ہے دولتِ ایمان و دیں ماہر کے پاس
یہ بھی حاضر ہے نگاہِ کفر ساماں کیلئے،

بیٹے کی ضمانت

جناب مولانا سید یوسف بخاری صاحب دہلوی

مجھے اپنے دوست کی عیادت کے لئے شفاخانے جانا پڑا۔ جب میں اس سے مل کر واپس آرہا تھا میں نے ایک نوجوان آدمی کو دیکھا جو برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے کسی گہرے خیال میں غرق تھا تفکر اور رنج کے ایک لامتناہی جنگل میں دھکے کھا رہا تھا۔ انتہائی ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے بارش ہو رہی تھی۔ میں نے افسردہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور تاثر آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"تم کیوں روتے ہو؟"

وہ سر جھکائے ہوئے بدستور روتا رہا۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہوگئی تھیں اس کے آراستہ بال پریشان اور منتشر تھے وہ سر سے پاؤں تک بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کا دل غم کے سمندر میں ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح بہہ رہا تھا۔ میں کچھ دیر اسے یونہی دیکھتا رہا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا اٹھارہ سالہ لڑکا یاد آگیا کیونکہ جوان شکل و صورت میں بالکل میرے جمشید کی مانند تھا۔ ہر چیز میں اس کی مشابہت پائی جاتی تھی غالباً وہ اس کا ہم سن تھا۔ مشابہت اور مطابقت کے اس جذبے نے مجھ کو بیحد متاثر کیا۔ میں بے اختیار اس کے پہلو میں بنچ پر بیٹھ گیا اس کو تسکین دینے اور غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں حائل کردیا اس نے میری اس ہمدردی کا احساس کیا اور بظاہر اس بات پر مجبور ہوا کہ اپنا کچھ حال بیان کرے۔

نوجوان کا نام شمشاد تھا۔ اس کے ماں باپ گزر چکے تھے وہ ایک موٹر کمپنی میں بحیثیت موٹر ڈرائیور ملازم ہوگیا تھا۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا صبح کو وہ ایک تنگ خمدار راستے سے گزر رہا تھا۔ ایک راہگیر بالکل اتفاقیہ موٹر کی زد میں آگیا۔ دراصل راہگیر کے پیچھے ایک موٹر آرہی تھی۔ وہ اس کی زد سے نکل کر دوسری جانب جانا چاہتا تھا کہ اس موٹر کی جھپٹ میں آگیا۔ اس سے قبل کہ ڈرائیور اپنی موٹر کو روکے غریب آدمی پہیوں کے نیچے کچلا جا چکا تھا۔ ڈرائیور کے لئے اب کوئی چارہ کار نہ رہا۔ وہ زخمی کو نیم مردہ حالت میں شفاخانے لے گیا لیکن وہ کسی طرح جانبر نہ ہوسکا۔ اور بغیر کوئی آمکئے مرگیا۔

شمشاد کی آنکھوں میں اب دنیا اندھیر ہوگئی۔ وہ شفاخانے میں بنچ پر بیٹھا ہوا پولیس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یاس کی دنیا قائم تھی جس کے دیکھنے میں مایوسی اور مایوسی میں سراسر تکلیف و اضطراب ——— وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ عنقریب اب ملزم کی حیثیت سے ہتکڑیاں پہن کر بازاروں میں سے گذریگا۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھائینگے وہ جیلخانے جائیگا جہاں اُسے ایک وحشی درندے کی مانند محبوس ہونا پڑیگا ظالم اور بیدرد انسان اسے دکھ اور ایذا پہونچائیں گے۔ جہاں مایوس دلوں کی فریاد۔ رحم کے طلبگاروں کی چیخیں۔ بیکس روحوں کے کراہنے کی آوازیں سب صدا بصحرا ثابت ہوتی ہیں۔ آخرکار موت رہائی دیتی ہے۔ میں نے اس کو اطمینان دلانے کی کافی کوشش کی کیونکہ مجھکو یقین تھا کہ یہ حادثہ محض اتفاقیہ ہوا تھا۔ وہ بالکل بے قصور تھا اور بلاشبہ اس پر کوئی جرم عائد نہ ہوسکتا تھا۔ مزید اطمینان کیلئے میں نے اس سے کہا۔

"میں عدالت کا وکیل ہوں۔ میں تمھاری ضمانت دونگا اور تمھاری طرف سے مقدمے میں کام بھی کرونگا۔"

اسی وقت پولیس کا ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے پاس ایک نوٹ بک تھی اس نے ان اطلاعات کو جو اسے ڈاکٹروں کے ذریعہ حاصل ہوئی تھیں اس کتاب میں درج کرلیا تھا میں نے اس سے اپنا تعارف

کرایا اور بتایا کہ میں اس مقدمہ میں شمشاد کی جانب سے پیروی کرونگا چنانچہ اس نے میرے موکل کا نام و پتہ لکھ کر وہ بیان قلمبند کیا جسے میں نے صورت حادثہ سے متعلق مرتب کیا تھا۔ سپاہی نے نرم لہجہ میں کہا۔

"شمشاد کو اس وقت عارضی طور پر تھانے جانا پڑیگا۔ وہاں پہونچکر وہ آپ کی ضمانت پر رہا ہو سکتا ہے شمشاد کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ مقدمہ کی مقررہ تاریخ پر بلا عذر حاضر ہو۔"

میں نے اس بات کو بلا پس و پیش منظور کر لیا۔ پھر سپاہی سے متوفی کے متعلق پوچھا لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔ پولیس کو ابھی صرف یہ اطلاع ملی تھی کہ متوفی خیاط کی دوکان سے چند کپڑے لیکر روانہ ہوا تھا۔

ہم تینوں تھانے پہونچے۔ داروغہ نہایت معقول اور بردبار آدمی تھا۔ وہ سوالات کرتے وقت میرے موکل کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ بالآخر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"واقعی اس کا بیان درست ہے شمشاد کا اس میں کوئی قصور نہیں وہ باقاعدہ سند یافتہ ہے اس کے علاوہ وہ نہایت تجربہ کار ڈرائیور بتایا جاتا ہے، حادثہ بیشک افسوسناک ہوا، کیا کیا جائے، غریب کی موت اسی بہانے ہونی تھی۔"

میں اس کی بریت اور رہائی کے خیال سے خوش ہو گیا۔ معاً مجھ کو متوفی کا خیال آیا۔ میں نے داروغہ سے دریافت کیا۔

"متوفی کے متعلق کیا معلوم ہوا وہ کون تھا؟"

داروغہ نے میز کے کاغذوں پر سرسری نگاہ ڈالکر پڑھنا شروع کیا

"وہ جمشید تھا! نمبرہ پالک سٹریٹ کا رہنے والا۔"

یہ سنتے ہی مجھ پر ایک غشیانہ کیفیت نے حملہ کیا۔ داروغہ نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں بت کی طرح غمناک کھڑا تھا۔ میرا دماغ ان الفاظ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ کیا متوفی میرا اپنا فرزند تھا؟ میں نے بولنے کی ایک ناتمام کوشش کی۔ شمشاد میرے قریب کھڑا تھا اس نے میری پیشانی سے میرے دل کا تمام حال پڑھ لیا وہ فوراً میرے صدمے سے واقف ہو گیا، میری حالت زیادہ خراب ہونے لگی۔ میں لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ اور قریب تھا کہ میرا سر میز سے جا ٹکرائے کہ شمشاد نے مجھے سنبھال لیا۔ میرے لبوں سے بیساختہ ایک چیخ نکل گئی اور چیخ کے ساتھ "جمشید! میرا لڑکا!" یہ الفاظ تھے جو یکبارگی تمام کمرے میں گونج اٹھے۔ یہ ایک صدائے درد تھی جو کلیجہ چیر کر نکلی تھی۔ پولیس مجھے ہسپتال لے گئی۔ میں نے نعش کو شناخت کیا۔ وہ میرا فرزند جمشید ہی تھا —— خاک و خون میں غلطاں اور مُردہ —— شمشاد میرے برابر کھڑا تھا۔ دونوں رو رہے تھے —— غم کے سمندر میں عنقریب غرق ہو جانے والی کشتیوں کی طرح غوطے کھا رہے تھے۔

جمشید کی ماں کا کئی برس پہلے انتقال ہو چکا تھا اب جمشید کے گذر جانے سے زندگی بالکل بے کیف ہو گئی۔ مہینوں حالت خراب رہی لیکن اس کے باوجود شمشاد کے واسطے میرے خیالات ہمدردانہ رہے، ہم دونوں میں دوستی قائم ہو گئی۔

میں دوران مقدمہ میں شمشاد کی جانب سے بحیثیت وکیل لڑتا رہا اور عدالت کے لئے یہ بات نہایت تعجب خیز تھی کہ خود متوفی کا باپ ملزم کی حمایت کر رہا ہے اور فی الحقیقت مقدمہ کی اس نوعیت نے شمشاد کو بالکل بری اور آزاد کرا دیا۔

شمشاد پر یہ صداقت روشن کرنے کے لئے کہ میرے دل میں اس کی طرف سے کوئی خلش اور برائی نہیں ہے۔ میں نے اسے کئی بار کھانے پر مدعو کیا۔ ان متعدد صحبتوں کے باعث ہمارے تعلقات میں ایک خوشگوار اضافہ ہو گیا —— اور رفتہ رفتہ فراق اور جدائی کی کلفت بھی دور ہو گئی۔

محبت اور دلداری کے اصولوں میں شمشاد بھی انھیں اوصاف کا مالک تھا جو کبھی جمشید کو حاصل تھے آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا اور مجھکو شمشاد سے یہ کہنا پڑا کہ وہ ہر وقت میرے پاس رہا کرے —— وہ شمشاد نہیں جمشید ہے۔

مفتوح قوم!

مفتوح قوم ایک سرطان کے مریض کی سی حیثیت رکھتی ہے ـــــ جس کو بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ تمام صحبتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے کو ان نیم حکیموں کے حوالے کردے ـ جو مرض کے اچھا کرنے کا ادعیٰ رکھتے ہیں ـــــ ایک بیدار قوم اپنی قومیت سے اسی طرح بے نیاز ہے جس طرح ایک تندرست و توانا شخص اپنے جسم سے ـ لیکن اگر آپ ایک قوم کی قومیت فنا کردیں گے تو اُس کو سوائے اس کے اور کوئی خیال نہ ہوگا کہ وہ اُس کو حیات تازہ بخش سکے ـ وہ کسی مصلح، کسی فلسفی، کسی واعظ کی طرف التفات نہ کریگی جب تک کہ "قوم پرست" کا مطالبہ تسلیم نہ کرلیا جائے ـ

(برنارڈ شا)

(خواجہ احمد فاروقی بچھرایونی)

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۲۳ — نمبر ۲

فہرست مضامین عالمگیر ماہ اگست ۱۹۳۵ء

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

خدا کے فضل و کرم سے عالمگیر کے سالانہ نمبر ۱۹۳۵ء کو جو قابل رشک مقبولیت حاصل ہوئی اس کے حوصلہ افزا اثر نے میرے ارادوں میں نئی روح پھونک دی، اور عالمگیر کی کامیابی کا جو تصور عرصہ سے میرے دماغ کو روشن کر رہا تھا آخر اس کی شعاعیں فانوس عمل میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہوئیں کہ میری امیدوں کا مستقبل منور نظر آتا ہے لیکن میری آرزوئیں جو "عالمگیر" سے وابستہ ہیں ان کی تکمیل اچھی طرح جب ہی ہو سکتی ہے کہ "عالمگیر" یورپی رسائل کے مقابلہ میں "انا ولا غیری" کا اعلان کرنے کے قابل ہو جائے اگر خدا نے چاہا تو یہ حسرت بہت جلد پوری ہو کر رہیگی کیونکہ جس ارادے میں مخلصانہ عزیمت اور بیباکانہ جوش عمل کی آمیزش ہو قدرت اس کے لئے خود بخود لباس عمل مہیا کر دیا کرتی ہے۔

سالانہ نمبر کی مقبولیت نے میرے عزائم کو اور بھی بلند کر دیا ہے چنانچہ خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی تیاریاں جن اصول ترقی پر ہو رہی ہیں ان کی نوعیت دنیائے صحافت کیلئے پیغام انقلاب سے کم نہیں خاص نمبر من حیث المجموع جن خوبیوں کا حامل ہوگا ان کی تفصیل بعض مصالح کے پیش نظر مناسب نہیں تاہم اتنا عرض کر دینا غیر موزوں نہ ہوگا کہ خاص نمبر موجودہ تمام اردو صحافت کی حقیقی ترقیوں کا شاندار نمونہ ہوگا۔ اس کے لئے جو علمی مضامین لکھوائے جا رہے ہیں ان میں سے ہر ایک علمی تحقیق و تدقیق اور ادیبانہ معجز نگاریوں کا آئینہ ہے۔ افسانوں میں سے کوئی افسانہ نہیں جو فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کا ترجمان اور جذبات و کردار کا روشن ترین آئینہ نہ ہو۔ نظمیں اور غزلیں اردو شاعری کا ارتقائی منظر ہیں ان میں جہاں رنگ قدیم کے پیش نظر اساتذہ کے لطف توجہ سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں طرز جدید کی نظمیں اور غزلیں بھی شاعری کی انقلابی ترقی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

خاص نمبر کی تصاویر اپنے محاسن کے اعتبار سے شرق و غرب کی مصوری کے نادر ترین شاہکاروں پر مشتمل ہیں مصوروں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے رنگوں اور خطوں کے امتزاج سے جذبات و وجدان کیلئے ذریعہ ترجمانی مہیا کر دکھایا ہے مجھے امید ہے کہ آپ ہر تصویر کو حسن و محسوسات کا خاموش ہنگامہ سمجھنے پر مجبور ہونگے مزید تفصیلات آئندہ پرچوں میں ملاحظہ فرمایئے غرضیکہ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۶ء ہر لحاظ سے ادب، مصوری، شاعری کا مظاہرہ کمال ہونے کے علاوہ طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی بہترین ہوگا۔

مختلف علمی و ادبی مسائل پر تنقید و تبصرہ کا جو فرض ایک رسالہ نگار پر عاید ہوتا ہے اس کی ادائگی کے بغیر مقصد ادارت پورا نہیں ہو سکتا "عالمگیر" نے اس امر کی طرف اس سے پہلے توجہ کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن موجودہ زمانہ میں جو علمی و ادبی الجھنیں ہر روز پیدا ہو رہی ہیں ان کے سلجھاؤ کی فکر نے ادارہ عالمگیر کو بھی اس کمی کے پورا کرنے پر مجبور کر دیا ہے چنانچہ اس اشاعت سے عنوان "احتساب" ذیل میں مختلف علمی و تعلیمی اور ادبی مسائل پر بیباکانہ تنقید کی جائیگی۔ یہ عنوان مستقل ہوگا۔ امید ہے قارئین "عالمگیر" اس اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

ادبیات اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یہ خبر سن کر یقیناً خوش ہونگے کہ شمالی ہند کے مشہور و معروف ادیب مصنف اور شاعر علامہ میر ولی اللہ ایڈوکیٹ ایبٹ آباد کے اردو کلام کا مجموعہ چھپکر تیار ہو گیا ہے۔ میر صاحب کی نظمیں ملک کے موقر جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں اس مجموعہ میں ان کا تمام غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے زبان کی سلاست اور خیالات کی فراوانی داد کی مستحق ہے۔ رشید احمد شاہ صاحب (لٹریس) پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ چودھری بخش صاحب وکیل ایبٹ آباد اور خانصاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی ریزیڈنسی کشمیر سری نگر کے دیباچے حرف بحرف پڑھنے کے قابل ہیں۔ کتاب کا نام گلبانگ ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ ہے کتاب مجلد ہے امید ہے کہ ناظرین عالمگیر اس مرقع ادب کی ضرور قدر کرینگے۔ قیمت صرف دو روپیہ ہے جو زیادہ نہیں کتاب منیجر دارالاشاعت بادہ ناب ایبٹ آباد سے مل سکتی ہے۔

حافظ محمد عالم مدیر عالمگیر عفی عنہ

اِحتساب

پراپاگنڈا کی ضرورت

پنجاب اُردو کی ترقی و مقبولیت کیلئے جو شاندار خدمات انجام دے رہا ہے وہ محتاج تشریح نہیں لیکن اس سلسلہ میں اہل پنجاب نے جن فرائض کی ادائگی اپنے ذمہ رکھی ہے وہ ابھی تک تشنہ تکمیل ہیں۔ ادبار پنجاب نے جہاں اخبارات و رسائل اور دوسرے مطبوعات کے ذریعے سے اُردو کی تبلیغ و اشاعت کا کام نہایت سرگرمی سے انجام دیا ہے وہاں اس مقصد کے پیش نظر کوئی اجتماعی حرکت عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی ورنہ آج ہم علمی و لسانی نقطۂ نگاہ سے جن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں وہ اول تو پیدا ہی نہ ہوتیں اگر ہوتیں بھی تو ان کا تدارک بآسانی ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لاہور میں ایک نمائندہ اور موثر انجمن خدام اُردو کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی شاخیں تمام شہروں اور قصبوں میں قائم کی جائیں۔ یہ شاخیں مرکزی مجلس کی ہدایت کے مطابق وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار کرتی رہیں جو اُردو کی عمومی ترقی و فلاح کے لئے ضروری ہیں اگر ایسا کوئی نظام عمل میں لایا جا سکے تو خدام اردو اپنے خیالی نقشوں میں بہت جلد رنگ عمل بھرنے کے قابل ہو سکیں گے اور یہ ہمہ گیر پراپگنڈہ جو ان مجالس کے ذریعے سے ہر شہر میں کیا جائیگا حکومت، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو بہت جلد اُردو کی طرف عملی توجہ کے قابل بنا دیگا۔ اگر مرکزی انجمن قائم ہو جائے تو شاخوں کی ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی ہے۔ ہر شہر میں مشاعرے کرنے والی ادبی مجلسیں تو موجود ہی ہیں جن کو نام کی تبدیلی کے بعد مرکزی انجمن کی شاخ بنایا جا سکتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اردو کے ہمدرد ہماری گذارش پر ضرور توجہ فرمائینگے۔

جاپان میں اردو

ایک ملک کی زبان کو دوسرے ملک تک پہونچانے کا سب سے آسان ذریعہ تجارتی و سیاسی تعلقات ہیں۔ جاپان نے اپنے مصنوعات کو ہندوستانی منڈیوں میں پھیلانے کے لئے جو نتیجہ خیز تدابیر اختیار کیں ان میں سے ٹوکیو میں اردو کالج کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کالج کامیاب طریقے سے چل رہا ہے اس کی رفتار ترقی کے متعلق جو اطلاعیں موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں کثیر التعداد جاپانی اُردو زبان و ادب کے جواہر کا اپنے خزینہ علم میں اضافہ کر سکیں گے چنانچہ انگلستان کا ایک رسالہ "اورنٹیل میگزین" لکھتا ہے کہ

"اُردو کی تعلیم سے حکومت جاپان کا یہ مقصد نہیں کہ اس کی رعایا میں سے چند لوگ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں گفتگو کر سکیں وہ اس زبان کو تعلیمی اعتبار سے اس درجہ ترقی دینا چاہتی ہے جس کی توقع کسی غیر ملکی حکومت سے نہیں ہو سکتی چنانچہ ایک جاپانی اخبار کے ذریعے سے یہ خبر ہم تک پہنچی ہے کہ حکومت جاپان اُردو کے متعلق جو فرض اپنے ذمہ لے چکی ہے اس کی رسم ادائگی بیگار کے طور پر پوری کرنا نہیں چاہتی بلکہ تکمیل فرض کے ساتھ اس کی اُردو دوستی کا مخلصانہ جذبہ وابستہ ہے اس کی دلی خواہش ہے کہ جاپان میں اُردو زبان کے اخبار نویس، ادیب، مصنف اور شاعر پیدا ہوں۔ اس توقع کے ساتھ حکومت جاپان اپنی ہندوستانی تجارت کی حیرت انگیز ترقی کا خواب دیکھ رہی ہے جس کی عملی تعبیر جب ہی ظہور پذیر ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی اہل جاپان کے متعلق اچھے خیالات رکھنے کے قابل ہو جائیں۔"

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے ادب اُردو کی جو ہلکی سی روشنی جاپان میں پہونچی تھی وہ ماحول و اسباب کی مناسبت سے

دریائے نور بن کر پھیل رہی ہے۔ خدا کرے کہ جاپان نے جس طرح اپنی مذہبی زندگی کو ہندوستان کے چشمۂ روحانیت میں غوطہ دیکر منور کیا تھا اس طرح اس کا ذہن ودماغ بھی ہندوستان کے چراغ زبان وادب سے روشن ہو جائے لیکن ہندوستان کو جاپان کی اردو پرستی سے درس عمل لینا چاہیئے کہ زبان تو اس کی ہے لیکن ترقی مے رہے ہیں جاپانی ؎

غمی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

ہندی و اردو کی نزاع

فرقہ وارانہ کشمکش کے نتائج میں سے ہندی و اردو کی نزاع خاص طور پر افسوسناک ہے۔ زبان کا مسئلہ قوم کی ذہنی ترقی سے تعلق رکھنے کے باعث وطنیت کا بنیادی اصول ہے جس کا حل بھی صلح و آشتی کے ساتھ ہونا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں لیڈروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا ہے جو وطنی معاملات کو بھی جماعتی تعصب کی تاریکی میں دیکھا ہے۔ یہ لوگ جب قوم کی ذہنیت میں زہر نفاق کے ودیعت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو ہندی و اردو کا جھگڑا چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں زبانوں میں رسم الخط کے بغیر کوئی چیز وجہ اختلاف نہیں جو فرقہ دارانہ عناد کو بڑھانے کی موجب ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ اس افسوسناک نزاع کو ختم کرنے کی ٹھان لے اور اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل سوچے جو اہل وطن کے لئے سرمایہ اطمینان ہو ورنہ فرقہ پرست لیڈروں کو جو زبان کا جھگڑا محض فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھانے کی غرض سے چھیڑتے رہتے ہیں وطن کی فضا مکدر کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائیگی۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بال جبریل!

حضرت علامہ اقبال کی شاعری عہد حاضر کے نیم مُردہ پیکر کے لئے تجدید حیات کا پیغام ہے۔ "بانگ درا" کی اشاعت کے بعد آپکے ساز خیال کے نغموں نے اپنے ظہور کے لئے صرف فارسی کا لباس منتخب کر لیا تھا۔ یہ انتخاب ان لوگوں کے لئے قدرتی طور پر باعث اضطراب تھا جو شاعری کے ارتقائی جلوے آئینہ اردو ہی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ الحمدللہ بال جبریل کی اشاعت نے اس خواہش کو بوجہ تمام پورا کر دیا ہے۔ "بال جبریل" من حیث المجموع ان فطری حقائق ونظریات کی تصویر ہے جو روح ودماغ اور وجدان وقلب کی بیدار قوتوں کے امتزاج سے تخلیق پذیر ہوتے ہیں۔ ہم اس جلیل القدر تصنیف پر تبصرہ کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ آفتاب کا وجود بذات خود اپنی اہمیت کی دلیل ہے البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ "بال جبریل" اقبال کی پہلی تصنیف سے زیادہ موثر اور جاذب توجہ ہے اس میں ان روحانی کیفیات کو بآسانی دکھایا گیا ہے جن کے اظہار سے الفاظ وزبان قاصر ہیں۔ اکثر اشعار تو سرتاپا وجدانی تاثرات میں ڈوبے ہوئے ہیں یہ اقبال کی قادر الکلامی اور جامع البیانی کا روشن ترین ثبوت ہے کہ آپنے ان وجدانی کیفیات کو قالب شعر میں ڈھال لیا جو الفاظ وزبان کی تنگ دامانی سے مجبور ہو کر اپنے اظہار کے لئے کبھی نالہ، کبھی آہ، کبھی آنسو اور کبھی خاموشی کا لباس اختیار کرتی ہیں باایں ہمہ روحانی پیام میں بھی اقبال کی حقیقی تعلیم یعنی "خودی آموزی" جھلک رہی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ بال جبریل کا مطالعہ اہل ملک کے روحانی تصور کی تکمیل وتہذیب کا ذریعہ ثابت ہوگا اور اہل نظر کی ذہنی بصیرت کے ناتمام پہلو مکمل ہو جائیں گے۔

الماس (ریویو)

مولفہ جناب خانصاحب حاجی محمد غلام حسن خانصاحب پشاوری آنریری مجسٹریٹ
قیمت ۱۲ ؎ ملنے کا پتہ۔ اقبال منزل پل بنگش دہلی

یہ ایک دردانگیز حقائق ناول ہے جس کے ذریعہ سیرت انسانی کے تمام عیوب ومحاسن کی تصویر کشی کی گئی ہے موجودہ زمانہ میں ناولوں کی اشاعت جتنی کثرت سے ہو رہی ہے اسی قدر ناول نویسی کے حقیقی مقاصد فوت ہو رہے ہیں چنانچہ اکثر ناولوں کی افسانویت سرتاپا ان امور میں ڈھل رہی ہے جو سفلی جذبات کے لئے باعث اشتعال اور اخلاقی انحطاط کا ذریعہ ہے لیکن "الماس" کا دامن ان قباحتوں سے پاک ہے اس ناول میں جہاں دلچسپ افسانویت بوجہ تمام موجود ہے وہاں انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی بھی نہایت عام فہم پیرایہ میں کی گئی ہے الماس کے مطالعہ سے وہ تمام نفسیاتی کیفیتیں منظر عام پر دکھائی دیتی ہیں جن پر الفاظ ونطق کی تنگ دامانی کا پردہ پڑا رہتا ہے ہمارے خیال میں الماس کی اشاعت نے اس اعتراض کو کہ مشرقی افسانہ نگاری قلب ووجدان اور سیرت واخلاق کی آئینہ دار نہیں بالکل بے معنی ثابت کر دیا ہے اس بہترین تصنیف پر حاجی صاحب قابل صد ہزار تحسین ہیں۔ ہم "عالمگیر" کے ناظرین سے پر زور سفارش کرتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے استفادہ کریں۔

(ادارۂ عالمگیر)

حقیقت یا افسانہ

جناب مولانا صہبائی بی۔اے (آنرز)

۱

بالآخر عرفان نے یہ طے ہی کر لیا کہ اپنی شریک حیات مرحومہ کا سامان غربا اور محتاج ہمسایوں کو تقسیم کر دے اب وہ تنہائی کا عادی بھی ہو چلا تھا۔ ایک مہینہ گذرا ہوگا کہ اس کی عزیز رفیق زندگی دوسری دنیا کو سدھار چکی تھی رنج والم اور تنہائی و مایوسی ابھی تک اس کے لئے بے انتہا پریشانی کا موجب تھے لیکن اس کے آخری فیصلے میں اسے کچھ کچھ سکون سا محسوس ہو رہا تھا اس نے سوچا کہ دلپذیر کی ذاتی اشیا رکھنے سے کیا فائدہ؟ چند ضرورت مند کو ہی ان سے مستفید ہونا اس کی سکون روح کا باعث ہو سکتا ہے وہ روحانیات کا قائل تھا اور سوچتا تھا کہ اگر اس نے جلد دلپذیر کی ذاتی چیزیں علیٰحدہ نہ کر دیں تو اس کی روح اس کو بیحد پریشان کریگی اور وہ خود بھی مطمئن نہ رہ سکیگی۔

زندگی میں وہ ایک کامیاب انسان نہ تھا لیکن وہ اس اعتبار سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ اس کی شادی بہت کامیاب تھی دلپذیر اس سے محبت کرتی تھی اس کے سوا دلپذیر نے کسی مرد کی طرف پسندیدگی کی نگاہ بھی نہ اٹھائی تھی یقیناً ایک شوہر کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی تھی؟

آہ! دلپذیر ایک سادہ مزاج اور عالی فطرت لڑکی تھی۔ وہ بالکل بچوں کے مانند تھی۔ بچوں کی طرح اسے جھوٹے نگینوں اور مصنوعی جواہرات کا بہت خبط تھا۔ عرفان کے دماغ میں یہ خیال اس وقت چکر لگا رہا تھا جب وہ دلپذیر کے جواہرات کا صندوقچہ کھولے بیٹھا تھا اور مصنوعی موتیوں کے ایک ہار کو روشنی میں دیکھ رہا تھا اس نے ہار میز پر ڈالدیا اور ایک بادامی کاغذ اٹھا کر یہ چاہتا تھا کہ ہار کو اس میں لپیٹ دے۔ لیکن دوسری بار جونہی اس کی نظر موتیوں کی درخشندگی پر پڑی وہ ٹھٹک کر بیٹھ گیا اس کے دماغ میں کوئی پرانا قصہ گشت لگا رہا تھا لیکن اسے یہ یاد نہ آتا تھا کہ آخر وہ افسانہ تھا کیا؟۔ وہ سوچتے سوچتے آخر کامیاب ہو گیا

"ہاں! وہ منشی پریم چند کا ایک مختصر افسانہ تھا"

"ٹھیک! بالکل ٹھیک!" اس نے سوچا "وہ افسانہ بھی موتیوں ہی کے متعلق تھا ایک متوسط الحال شخص کی بیوی کے متعلق جو مر چکی تھی اور جسے دلپذیر ہی کی طرح مصنوعی جواہرات اور نقلی موتیوں کا شوق تھا یقیناً اس شخص کی بیوی اور دلپذیر میں ایک غیر معمولی مشابہت موجود تھی لیکن جب وہ شخص ان نقلی موتیوں کو جوہری کے پاس لے گیا تاکہ انھیں چند آنے میں فروخت کر دے تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سچے موتی ہیں اور وہ کم از کم اسی ہزار روپیہ کی ملکیت پر قابض ہے"۔

عرفان نے سوچا مگر یہ تو محض ایک خیالی افسانہ تھا اگرچہ حقیقت کا رنگ ظاہر کرنے کی اس میں پوری کوشش کی گئی تھی لیکن اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس شخص کی بیوی قابل اعتماد نہ تھی جو اس نے اپنے شوہر سے اتنی اہم شے کو چھپایا۔ لیکن حقیقی زندگی میں باوجود منشی پریم چند کی بہترین کوشش کے ایسے واقعات نہیں ملتے"۔

۲

عرفان نے پھر موتیوں کے ہار پر نگاہ ڈالی اور انھیں اٹھا کر قریب سے جانچنے کی کوشش کی لیکن اسے موتیوں کے جانچنے سے کیا علاقہ ہو سکتا تھا۔ وہ نہ خود جوہری تھا۔ نہ اس کے خاندان میں کسی نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی صحیح رائے نہ قائم کر سکا حتیٰ کہ موتیوں کے نقلی ہونے کی شکل میں بھی وہ ہار کی قیمت کے متعلق سوائے چار طلائی دانوں کے کوئی قیمت نہ مقرر کر سکا۔ لیکن پھر اسے کسی ماہر نسائیات کا یہ قول یاد آیا کہ عورتیں بعض اوقات غیر معمولی قابلیت سے کام لیتی ہیں" دلپذیر اگرچہ مر چکی تھی لیکن اس کا کوئی خاص تعلق عرفان اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا۔ شاید روحانی تعلق۔

اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک فاضل اور مشہور ادیب اور انشا پرداز خصوصاً منشی پریم چند جیسا لکھنے والا گو لکھنے کو تو ایک

افسانہ لکھ گیا لیکن اس کی واقعیت کے متعلق اسے خود بھی ذرا یقین نہیں ہوگا یہ تو صحیح ہے کہ مصنف اور ماہر نسائیات ہمیشہ زندگی کی کوئی نادر مثال یا باریک پہلو نظر کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن سچ یہی ہے کہ "زندگی — صحیح مفہوم میں ایک مختلف چیز ہے"

باوجود اس کے بھی عرفان کچھ دیر تک غور کرتا رہا اس نے کہا "اگر اسی موتیوں کے ہار سے میں دلپذیر کی وفاشعاری اور اعتماد کا اندازہ کرسکتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کی تمام خوبیاں فراموش کردیں"۔ اس نے ہار کو کاغذ میں لپیٹنا چاہا لیکن وہ پھر کسی گہری سوچ میں پڑگیا۔ وہ تقریباً تین گھنٹہ خاموش کرسی پر بیٹھا ہوا دلپذیر کے خیال، ہار کے موتیوں کے اصلی ہونے کے امکان منشی پریم چند کے افسانہ کی الجھن اور خدا جانے کن کن خیالات میں مستغرق رہا جب وہ اٹھا تو ایک قطعی فیصلہ ہار کے متعلق کرچکا تھا۔

۳

ترپ بازار میں یحیٰی جوہری کی دوکان ایک گلی میں واقع تھی۔ چھوٹی سی دوکان تھی اور یحیٰی معمولی زیورات کے علاوہ امٹیشن جواہرات اور نقلی موتی کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ وہ گھڑی ساز بھی تھا اور گراموفون کی درستی سے بھی کچھ کما لیتا تھا اس کی دوکان میں صرف ایک گھڑی ساز اور نوکر تھا جو اس کی کاروباری ضروریات کے لئے کافی تھا۔

عرفان ہار کو کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے نیچے اترا۔ یحیٰی نے اسے دیکھتے ہی زور سے سلام کیا۔ مصافحہ ملایا اور برابر پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جب عرفان بیٹھ گیا تو تعزیتی لہجہ میں یحیٰی نے (جس کا وہ دلپذیر کی موت کے بعد سے عادی ہوسا چلا تھا) اس سے گفتگو شروع کی۔

"بھائی عرفان! دلپذیر کی موت واقعی تمہارے لئے بہت روح فرسا ہے اس جیسی حسین ہنس مکھ اور بااخلاق بیوی ملنا اب مشکل ہے"

"ہاں بھائی! میری قسمت، جس کے ساتھ آٹھ سال سے نہایت فراغت اور پوری خوشگواری سے زندگی گذاری ہو اس کی دائمی جدائی کیوں نہ محسوس ہوگی۔ دلپذیر وفاداری کا نمونہ تھی۔ افسوس"

یحیٰی نے سر ہلا کر کہا "سچ ہے تمہیں افسوس ہونا ہی چاہئے۔ مجھے آج تک ایسا نظر آرہا ہے کہ دلپذیر زندہ ہے اور جب اوپر کچھ سنتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یا تو زینہ پر چڑھ رہی ہے یا اتر رہی ہے۔ مجھے یہ علم ہے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی تھی۔"

"مجھے بھی اس سے بہت محبت تھی — بھائی یحیٰی میں اس وقت ایک خاص ضرورت سے آیا ہوں"

یہ کہکر عرفان نے ہار اپنی جیب سے نکالا "اس کے زیورات کو میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اس ہار میں سونے کے چار دانے بھی ہیں"

یحیٰی کی آنکھوں میں ہار کو دیکھتے ہی ایک تعجب آمیز جھلک پیدا ہوئی پھر اس نے ہار کو ہاتھ میں لیکر دیکھا اور جانچا۔ روشنی کے رخ پر ہار کو لٹکا کر اس کا ایک ایک موتی اس نے خوردبین سے دیکھا اور کہا۔

"ہاں! یہ دلپذیر کا ہار ہے؟" عرفان نے بطور اثبات سر ہلایا اور جواب دیا "ہاں! اب میرے کسی مصرف کا نہیں اسے ایسی چیزوں کا بہت شوق تھا"

یحیٰی کھانس رہا تھا جب اس کی سانس درست ہوئی تو اس نے کہا "بھائی عرفان! دوکان میں بیسیوں درجن ڈبے ایسے ہاروں کے جو ابھی تک کھلے بھی نہیں ہیں پڑے ہیں آج کل بالکل نہیں بکتے۔ لیکن چونکہ اس میں تقریباً پانچ ماشے سونا موجود ہے اس لئے میں بارہ روپیہ قیمت اس کی دے سکتا ہوں"

۴

عرفان نے قیمت وصول کرلی اور اگلے وقت واپسی کا وعدہ کرکے چلدیا یحیٰی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ خاندانی جوہری تھا۔ باپ کا کاروبار بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ مملکت نظام میں جوہری کی حیثیت سے اس کا نام کافی دور دور مشہور تھا لیکن بیٹے نے صرف چھ سال ہی میں باپ کی سب دولت عیش و عشرت میں ٹھکانے لگا دی تھی۔ جب برا وقت سر پر پڑا ہوا معلوم ہوا اور آنکھیں کھلیں تو تین سال سے یہ دوکان لگائی تھی اب خدا خدا کرکے پچاس ساٹھ روپیہ ماہانہ دوکان میں سے نکل آتا تھا۔ تھا وہ تعلیم یافتہ نوجوان اور پیسے کی بربادی اور زندگی کے تجربے نے اسے کافی سبق پڑھا دیا تھا۔

عرفان کو وہ بہت غور سے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو پھر اس نے ہار کو دیکھنا شروع کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے جیسے تسبیح کے دانوں پر زاہد بزرگ صورت کی انگلیاں چلتی ہیں ہار کے موتیوں کو رول رہا تھا اور کسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتہ ملازم گھڑی ساز نے سوال کیا۔

"واقعی تقریباً آٹھ درجن ہار ایسے موجود ہیں۔ ایک ہفتہ سے تو ایک بھی فروخت نہیں ہوا — کیا آپ —"

ابھی اس کا سوالیہ جملہ پورا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک چھوٹی سی رسنگ موٹر

گلی سے داخل ہوکر کیپٹن یحییٰ کی دوکان کے سامنے ٹھہری اور ایک مغربی لباس میں ملبوس ہندوستانی شریف صورت نوجوان اس کی دوکان میں اندر چلا آیا۔ اس کے خریدار کے انداز میں خود اعتمادی اور اولوالعزمی موجود تھی اس نے یحییٰ سے گراموفون کی سوئیاں اور گھڑی کے شیشے دیکھنے کی خواہش کی۔

ہار ابھی تک یحییٰ کے ہاتھ میں تھا۔ دفعتہً اجنبی کی نظر ہار پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک گیا لیکن ایک سیکنڈ میں سنبھل گیا۔ یحییٰ یا اس کے ملازم اس کے اس تعجب کو نہ بھانپ سکے نہ انھوں نے وہ اضطراری کیفیت جو اجنبی کے انداز میں پیدا ہو گئی تھی دیکھی یحییٰ نے ہار کو سامنے ہی میز پر ڈال دیا اور اجنبی سے مطلوبہ اشیاء کی تفصیل پوچھنے لگا ملازم اندرونی کمرے سے چیزیں لیکر آیا اور یحییٰ کے برابر کھڑا ہو گیا۔

اجنبی نے جو یحییٰ اور ملازم کے بالمقابل کھڑا تھا دونوں کی پشت پر ایک ڈبہ کی جانب اشارہ کیا دونوں نے مڑ کر دیکھا اور چشم زدن میں ایک ہاتھ سے وہ ہار اس نے میز پر سے جو دونوں کے درمیان میں تھی اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال کر دونوں سے بالکل خاموش رہنے کی ہدایت کی اور کہا۔

"مسٹر یحییٰ! تم نے عرفان سے یہ ہار بارہ روپیہ میں خرید لیا لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ہار میرے ہاتھوں سے خریدا ہوا ہے میں نے ہی دلپذیر کو تحفۃً یہ ہار دیا تھا وہ مجھ سے اور میں اس سے محبت کرتے تھے۔ عرفان کو اس کا علم نہ تھا۔ میں کبھی ان کے مکان پر نہ آتا تھا لیکن عرفان مجھے دوست تو کیا صورت آشنا ضرور سمجھتا تھا۔ اسے دلپذیر کی وفاداری اور محبت پر کامل اعتماد تھا۔ لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔ البتہ ہم دونوں کی فہم و فراست نے کوئی ناگوار صورت حال نہ پیدا ہونے دی۔ اچھا! اب میں جاتا ہوں لیکن تمھارے لئے بھی یہی مناسب ہوگا کہ خاموش رہو ——— ورنہ نتائج پر غور کر سکتے ہو!"

۵

اجنبی موٹر میں بیٹھ کر چلدیا۔ ملازم نے دوڑ کر پولیس کو مطلع کرنے کی کوشش کی لیکن یحییٰ نے اسے روک لیا۔

"معاملہ کو نہ بڑھاؤ۔ اجنبی سچ کہتا تھا۔"

"لیکن اسے اس طرح ہار لے جانے کا کیا حق حاصل تھا؟" ملازم نے تخت لہجے میں پوچھا۔

"چھوڑ دو۔"

"لیکن پولیس کو مطلع کرنے میں کیا نقصان ہے؟" وہ اسے قیمت دے کر خرید سکتا تھا۔ صرف بارہ روپیہ ——— "

"ہشت! وہ سچے موتیوں کا ہار تھا اور اس کی قیمت کم سے کم ساٹھ ہزار روپیہ تھی۔"

ملازم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں اور یحییٰ کا منہ تکنے لگا۔ "سچے موتی!" صرف یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔

"خاموش رہو، خاموش رہو!" یحییٰ نے کہا۔ "پولیس کو معلوم ہونے پر مجھ پر دغا کا مقدمہ چل جائیگا۔"

"لیکن ——— "

عرفان کو آتا دیکھ کر دونوں دم بخود اور خاموش ہو گئے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "میری بیوی تو وفادار نہ تھی۔ لیکن تم بھی بے ایمان ہو۔ لاؤ میرا ہار واپس کرو۔ ورنہ پولیس......"

"بھائی عرفان کیسے بیوقوف ہو؟ میں نے سونے کے دانوں کی قیمت ادا کی ہے۔ انھیں نکالنے کے لئے سنار کے پاس ہار بھیج دیا ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد دل چاہے تو مع سنہری دانوں کے دل چاہے تو سادہ ہار لیجانا۔"

عرفان اوپر چلا گیا شام کو جب وہ نیچے اترا تو ایک ہار جس میں سنہری دانے موجود نہ تھے یحییٰ نے اسے دیا اور عذر کیا کہ سنار نے سونا گلا دیا۔ اگر وہ پسند کرے تو ایسے دانے اس کے ہار میں ڈالنا ممکن ہیں۔ عرفان نے اس کی ضرورت نہ سمجھی اور مصنوعی موتیوں کو اپنا ہار سمجھ کر لے گیا۔

اجنبی نے اس سے کہا تھا کہ یحییٰ بے ایمان ہے۔ دلپذیر کے اور اس کے چار سال سے تعلقات تھے اور وہ ہار سچے موتیوں کا تھا۔ لیکن شام کو جب وہ ہار دوسرے جوہری کے پاس لے گیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی قیمت صرف دس آنے ہے ——— اسے اپنی مرحومہ بیوی کی وفاشعاری کا کامل یقین ہو گیا اور وہ اس کے سکون روح کی دعا کرتا ہوا گھر واپس ہو گیا۔

حشرِ جذبات

حضرت ثاقب کانپوری

طوفانِ اضطراب کا محشر لئے ہوئے
خاموش ہوں یہ وسعتِ منظر لئے ہوئے

دُنیائے بے ثبات کا منظر لئے ہوئے
ہر اشکِ غم ہے ایک سمندر لئے ہوئے

اے ہمنشیں نہ کر مجھے مجبورِ گفتگو
کچھ ایسے راز ہے دلِ مضطر لئے ہوئے

رخصت ہو مجھ سے آج تو اے عصمتِ خیال
وہ آرہے ہیں ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

حیرت نواز کتنی ہیں دل کی تجلیاں
آئینہ ہاتھ میں ہے سکندر لئے ہوئے

ہو جائے گرم پھر وہی ہنگامۂ حیات
محشر میں ایک ایسا ہوں محشر لئے ہوئے

اب اور کیا کریگا تماشائے حسنِ دوست
اب تک تو اُس کی چوٹ ہوں دل پر لئے ہوئے

آنکھیں ہیں بند لذتِ نظارہ سے ہنوز
بے پردہ حسنِ دوست کا منظر لئے ہوئے

رندانِ خام کار کو توبہ کا ہے خیال
بیٹھے ہوئے ہیں شیشہ و ساغر لئے ہوئے

اس فکر میں کہ کون سی رگ جانِ عشق ہے
بیٹھا ہوا ہوں ہاتھ میں نشتر لئے ہوئے

ثاقب خموش اُس کی مشیت سے ہو گیا
اندازۂ وجودِ مقدر لئے ہوئے

اساطیر الاوّلین

اسرائیلیوں کے نیم الہامی افسانے

جناب مولٰنا خدا بخش صاحب اظہر، امرتسری

مغرب نے افسانہ نویسی میں جس قدر ترقی کی ہے۔ اس کا روشن ترین ثبوت یہ ہے کہ اہل مغرب افسانوں کے ذریعہ سے فلسفہ کے مختلف مسائل کی تفسیر و تبلیغ کا کام لینے لگ گئے ہیں اس ضمن میں ادبا یورپ نے جو کوشش کی وہ ان کے تنوع پسند ذوق علم اور ادیبانہ جدت طرازی کا بالکل نیا کارنامہ سمجھی جاتی ہے لیکن اس جدت کو جب تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائیگا تو اس میں کوئی نئی خوبی نظر نہ آئیگی بلکہ آج سے ہزاروں برس پہلے کے تخیل کا ایک دھندلا سا نقشہ معلوم ہوگی۔

قدیم اقوام کی مذہبی روایات اور ان کے ادبی ذخائر بزبان حال بتا رہے ہیں کہ پہلے زمانہ میں جب انسانیت کی علمی و تعلیمی ذہانت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ تو ان کو مذہب و روحانیت کے فلسفیانہ حقائق سمجھانے کے لئے جو طریقہ اختیار کرنا پڑا وہ افسانوں سے متعلق ہے کیونکہ دلچسپ کہانیوں کے ذریعہ سے مذہبی شعائر اور تزکیہ نفس و قلب کی تعلیم عوام کی قابلیت کے مطابق تھی۔ یہی چیز آج ادیبانِ مغرب نئی صنعت کے نام سے پیش کر رہے ہیں گویا تاریخ غیر اختیاری طور پر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے —— اقوام قدیم میں سے ہندو اور اسرائیلی کہانیوں کے ذریعہ سے تعلیم کا کام لینے میں ممتاز خصوصیت کے مالک ہیں۔ ہم اس صحبت میں ہندوؤں کے مذہبی ادب کے متعلق تو کچھ لکھنا نہیں چاہتے البتہ اسرائیلیوں کے افسانہ طرازی کا تعارف ضروری سمجھتے ہیں۔

قدیم اقوام میں سے بنی اسرائیل ایک ایسی امت ہے جس کی اختراعی ترقی ہمیشہ دلچسپ افسانوں کے لباس میں ظاہر ہوتی رہی ہے اگر آج ہم اسرائیلی ادب کے تمام ظاہر و نہاں ذخائر کو سامنے رکھ کر ان کا خلاصہ تجویز کریں تو چند دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیوں کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔ ان افسانوں میں صرف اعتقادی غلو ہی کی جھلک نہیں بلکہ حقائق و معارف کی روشنی بھی پائی جاتی ہے۔ عرفانیات و الٰہیات اور تزکیہ نفس اصلاح اخلاق تہذیب خیالات اور تنویر روح کا کوئی مسئلہ نہیں جس کی ان کہانیوں کی وساطت سے تعلیم نہ دی گئی ہو اور تعلیم بھی اس قدر جامع کہ جس کی غرض و غایت سیکڑوں فلسفیانہ بحثوں کے بعد بھی تشنۂ تکمیل رہے تو بعید از حقیقت نہیں۔ اسرائیلیات کے تمام پہلوؤں کے مطالعہ سے ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہاں جن حقائق کو کہانیوں کا لباس عطا کیا گیا ہے ان کا اظہار عام انداز میں بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ عمومیت بھی اپنی وسعت کی بدولت ایک خشک اور بے جذب فلسفہ کی صورت اختیار کر لیتی۔ جس کے سمجھنے کی عام ذہنیت میں صلاحیت نہیں۔ اگر عوام اس فلسفہ کو سمجھ بھی لیں تو دماغ میں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے اور پھر اس زمانہ میں جبکہ انسانیت کا علمی تخیل ترقی و وسعت کے زیادہ مراحل طے نہیں کر سکا تھا۔ ان مجبوریوں کے پیش نظر اسرائیلی علماء کو تعلیم و تدریس کے طریقہ میں کہانیوں کی جاذب توجہ رنگینی اور عوام فریب چاشنی پیدا کرنی پڑی۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ اپنی مقبولیت کے باعث مستقل صورت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد ہر واعظانہ پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے افسانوں کے بغیر کسی اور طرز بیان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی یہاں تک کہ یہ

چیز عام گمراہی و الحاد کا موجب بن کر رہ گئی۔ بدعت پسند علما نے اپنے ذاتی خیالات میں مذہبی صداقت پیدا کرنے کی غرض سے وہ وہ شرمناک کہانیاں پیغمبروں سے منسوب کیں جن کا تصور بھی دماغ انسانیت برداشت نہیں کر سکتا۔

مگر اس بدعت کی مقبولیت کا وہ زمانہ بیحد افسوسناک ہے جبکہ قوم افسانوں کی ضرورت سے زیادہ شائق بن گئی اس کی طبیعت کو قصے کہانیوں سے اس درجہ رغبت ہو گئی کہ حقیقت قبول کرنے کی صلاحیت ہی جاتی رہی پہلے تو مذہبی حقائق کی تسلیم کے لئے کہانیاں بطور تشریح سنائی جاتی تھیں اب حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل بیان کی جانے لگیں اس غلط فہمی و کوراندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب و روحانیت کی معرفت روایات و توہمات میں روپوش ہو کر رہ گئی بالآخر الہامی دستور کی جگہ سنی سنائی باتیں نظر آنے لگیں اور انھیں باتوں کو کتب سماوی کا نچوڑ قرار دیا جانے لگا۔

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی (اقبالؔ)

اسرائیلیوں کے افسانے سچے ہوں یا جھوٹے اس سوال کا جواب تو ہر افسانے کا مفہوم اچھی طرح دے سکیگا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بیحد دلچسپ، حیرت انگیز اور سبق آموز ہونے کے باعث ادبی خوبیوں سے لبریز ہیں ان کی مقبولیت کا اس سے زیادہ روشن ثبوت اور کیا ہوگا کہ مسلمان مصنفوں، محدثوں، بلکہ بعض آئمہ کو بھی اپنی تصنیفات میں جذب و کشش کا عنصر پیدا کرنے کی غرض سے انھیں افسانوں کو اسلامی صورت میں پیش کرنا پڑا۔ اسی باعث عام مسلمانوں میں بھی جن کا مذہب سرتاپا سادہ اور عام فہم حقیقت کا آئینہ ہے توہم پسندی کی کسی حد تک صلاحیت موجود ہے۔ اس تعارفی تمہید کے بعد میں ناظرین کی خدمت میں چند اسرائیلی افسانے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں یہ افسانے تاریخ و زمانہ کی ترتیب کے مطابق نہیں ہیں بلکہ اوراق پریشاں کا ایک غیر منظم مجموعہ ہیں۔

پہلا افسانہ

عورت کی سیرت

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا ۔۔۔ نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

صبح کی پہلی تجلی قبرستان پر نور کی چادر بچھا چکی تھی۔ شہر خاموشاں میں آفتاب عالمتاب کے ظہور سے رنگ و نور کا ہنگامہ انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں کی معیت میں یہاں سیر کرتے ہوئے آنکلے۔ شکستہ قبریں عبرت و موعظت کا بزبان حال درس دے رہی تھیں آفتاب کی ہر کرن اپنی نورانی جگمگاہٹ سے بے ثباتی دنیا کی تصویر کھینچ کھینچ کر زندگی کے انجام پر روشنی ڈالتی تھی۔ حضرت کی نظر ایک قبر پر پڑی۔ یہ قبر ایک حسین و جمیل عورت کی تھی جس کے نورانی چہرے کو گذشتہ شام قضا کے بے مہر ہاتھوں نے سینۂ زمین میں چھپا دیا تھا۔ بالین مزار پر ایک نوجوان چپکے چپکے رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس پھول کی طرح پژمردہ تھا جو لو کے تیز ترین جھونکوں کا تختۂ مشق بن چکا ہو۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے اس درجہ لبریز تھیں کہ نظر و مناظر کے مابین ایک چادر آب لٹک رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک تصویر ماتم بنا ہوا رو رہا تھا۔ حضرت مسیح کی رحیمانہ طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک انسان مصیبت میں اس درجہ مبتلا ہو۔ آپ نے قبر کی بالین پر جا کر نوجوان کا شانہ ہلا کر اس کو خواب محویت سے بیدار کیا۔ نوجوان نے آنکھیں ہتھیلیوں سے مل کر جب نظر اٹھائی تو اپنے آپ کو پیغمبر کے حضور میں پایا۔ حضرت مسیح کے سوال پر نوجوان نے کہا کہ "یہ قبر میری بیوی کی ہے جو کل مجھے داغ مفارقت دیکر لقمۂ زمین ہو گئی۔ میرا اس کے ساتھ وعدہ تھا ــــ آہ وہ وعدہ جس کی ایفا مجھے اس ویرانے میں بسر کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مرحومہ اور میرے مابین یہ معاہدہ تھا کہ ہم میں سے جو پہلے مرے دوسرا اس کی قبر پر اپنی زندگی کے باقی دن گذار دے۔ آخر میری بیوی مر گئی اور میں وعدہ کی ایفا کرتے ہوئے فیصلہ کر چکا ہوں کہ آخری سانس تک اس کی قبر کے سرہانے بیٹھا رہوں گا۔ نوجوان رو رہا تھا شدت گریہ کے باعث اس کی باتیں ہچکیوں سے الجھی ہوئی تھیں اس کی طرز گفتگو نوحہ کے قالب میں ڈھل ڈھل کر درد انگیز بن رہی تھی۔ حضرت مسیح نے سارا واقعہ سننے کے بعد کہا کہ تمھیں صبر کرنا چاہئے اس دار فنا میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ دنیا میں ہر ہستی کا ظہور معدوم ہونے کے لئے ہوتا ہے۔ تم نے بیوی کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا وہ جوش محبت کا اضطراری نتیجہ تھا جس کی نباہ عالم اختیار میں ممکن نہیں۔ جاؤ اور ان فرائض کو پورا کرو جو دنیا میں تم پر عاید کئے جا چکے ہیں۔ حضرت مسیح کے ارشادات اگرچہ جذب و اثر سے لبریز تھے لیکن جو آب رحمت نوجوان کے

آتشکدۂ ملال کو بجھا نہ سکا۔ وہ ایک سرد آہ کھینچ کر کہنے لگا کہ جب جمیلہ ہی موجود نہیں تو دنیا میرے لئے جہنم کا نمونہ ہے۔ مجھے چاہے کتنی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں لیکن میں اس کی بالین سے اٹھ کر جا نہیں سکتا۔ محبت نے میری قوت حرکت و نقل وفائی زنجیروں میں جکڑ رکھی ہے۔ میں معذور ہوں اور یہ معذوری روز اول ہی سے میرے حصے میں آئی ہے۔"

پیغمبر نے نوجوان کی الجھی ہوئی باتوں سے اس کی قلبی کیفیات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ان کی چشم بصیرت کے سامنے اس کی وفادارانہ تمنائیں متشکل حقائق کی صورت میں آگئیں۔ اب پیغمبر کا دل بھی جوش رحمت سے لبریز ہو گیا انہوں نے نوجوان سے پوچھا۔ "اگر جمیلہ زندہ ہو جائے تو تم اپنی بقیہ عمر کا نصف حصہ اس کو دیدو گے تاکہ اس کے بعد دونوں کو ایک ہی وقت موت آئے؟" ۔ یہ الفاظ نوجوان کے لئے نامرادی و مایوسی کی تاریک رات میں شعاع امید سے کم نہ تھے۔ وہ مارے خوشی کے سر سے پاؤں تک خندۂ مسرت کی موج بن گیا۔ اس کے دل کی فرحت آمیز کیفیت چہرے پر شگفتگی بن کر بکھر گئی اور شوق آمیز لہجہ میں کہنے لگا کہ "ہاں اگر یہ ہو جائے تو میری جہنمی زندگی ایک بار پھر بہشت نشاط سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔"

"لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ عورت کی سیرت تنوع و جدت کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہے۔ وہ پرانے آشنا کے ساتھ کبھی وفا نہیں کرتی۔" پیغمبر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن جمیلہ وفا کی چلتی پھرتی پتلی اور محبت کی بولتی چالتی تصویر ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"تم خواب کو تعبیر سمجھ رہے ہو۔ عورت کا وعدہ وفا گرمکے پریشان بادلوں کی طرح زیادہ دیر تک نہیں رہتا" حضرت مسیح نے فرمایا۔

"خواہ کچھ بھی ہو، جمیلہ میں عام نسوانی نقائص نہیں۔ براہ کرم آپ جلدی کیجئے کہ جمیلہ زندہ ہو جائے۔ میں حضور کے ارشاد کے مطابق اس کو اپنی عمر کا نصف حصہ بخشنے کو تیار ہوں۔"

نوجوان کے الفاظ اگرچہ ایک فریب خوردہ انسان کی توقعات سے مشابہ تھے لیکن پیغمبر نے ازراہ کرم اس کی استدعا قبول کر لی اور "قم باذن اللہ" کا ایک نعرہ جو لگایا تو جمیلہ کی قبر کانپ اٹھی۔ نوجوان نے خوشی خوشی قبر کھودی تو جمیلہ زندہ تھی۔ جمیلہ کی زندگی نے نوجوان کے بجھے ہوئے دل میں زندگی کی لہر دوڑا دی اس نے کفن کی چادر میں لپٹا کر جمیلہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ حضرت مسیح یہ کہہ کر چلتے ہوئے کہ

"تمہیں مبارک ہو لیکن عورت کسی کی بھی نہیں ہوا کرتی۔"

(۲)

سورج کی روشنی قبرستان کے ذرے ذرے کو تجلی پوش کر رہی تھی شکستہ قبروں پر شعاعیں بزبان حال "کل من علیہا فان" کا ورد کر رہی تھیں کہ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے نوجوان سے اٹھکیلیاں کرنے لگے۔ رات کی بیداری نے اس پر غنودگی طاری کر رکھی تھی۔ جمیلہ کے زندہ ہو جانے کے باعث اس کے قلب و وجدان کے ہر گوشہ سے نشہ مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں اس لئے وہ جمیلہ کو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

شب ہجر کی ہے تلافی جو منظور
ذرا بیٹھئے میں کچھ آرام کر لوں

نوجوان خواب شیریں کے مزے لے رہا تھا۔ جمیلہ اس کے سرہانے بیٹھی اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں قبرستان کی خاموش سرزمین میں گرد و غبار کے ساتھ ایک ہنگامہ اٹھا۔ جمیلہ کی آنکھیں کسی آنے والے منظر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ چند منٹ کے بعد گرد و غبار کا دامن پھٹا اور ایک خوش رو اسپ سوار جمیلہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

نوجوان کی پہلی نظر ہی جمیلہ کے دل میں پیام محبت بن کر اتر گئی اور دنیائے جذبات کو بیدار کرتی ہوئی نشہ محبت بن کر وجدان پر چھا گئی۔ نوجوان بھی جمیلہ کی شراب ریز صورت سے نیم مدہوش ہو گیا اور دونوں شرمیلی نظروں کے ساتھ دل کی وہ باتیں کرنے لگے جن کا اظہار راز دنیا کی ہزاروں خلوتوں میں بھی محال ہے۔ دونوں کے چہرے پر راز محبت خاموشی بن کر چھا گیا۔ بجس ہونٹوں پر نوائے محبت تڑپ تڑپ کر رموز عشق کی خاموش ترجمانی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں اشتیاق آلود نگاہوں کے ساتھ بارگاہ حسن و عشق میں ہدیہ سجود دنیاز پیش کرتے رہے۔ آخر احساس محبت نے رگ و پے میں روح عمل پھونک دی اور دونوں اٹھ کر بغلگیر ہو گئے۔ جمیلہ کا یہ فعل اگرچہ بیحد شرمناک اور غیر وفادارانہ تھا لیکن بیخودی محبت نے اس کو واقعات ماضی بھلا دینے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اب جمیلہ اپنے نئے محبوب کے لئے تمام شریفانہ جذبات کی قربانی کار ثواب سمجھتی تھی۔ نوجوان نے اپنے

تڑپتے ہوئے ہونٹوں سے جمیلہ کے بیاض حسن پر مہر محبت ثبت کر دی اور اشتیاق آلود لہجہ میں کہا۔

"پیاری میں تمھارے دام محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ اب محبت میری زندگی کا ایک ہی مقصد باقی ہے وہ یہ کہ میں تادم مرگ تمھاری حسین و جمیل صورت سے اپنی زندگی کی ساعتیں روشن کرتا رہوں لیکن مذہب و انسانیت نے جو اخلاقی قواعد پیش کئے ہیں وہ میرے اور تمھارے درمیان حد فاصل سے کم نہیں ؟"

"میں تمھاری باتوں کا مفہوم سمجھ نہیں سکی۔ آخر کون سا وہ اخلاقی ضابطہ ہے جو مجھے تم سے جدا رکھنا چاہتا ہے"۔ جمیلہ نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو دلفریب جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔

"تم روز روشن کی موجودگی میں پوچھتی ہو کہ سورج کہاں ہے؟" نوجوان نے متانت سے جواب دیا۔

"تم باتیں تو کرتے ہو لیکن معمہ کی زبان سے"۔ جمیلہ نے حسینانہ سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"لو اب میں صاف لفظوں میں بتلائے دیتا ہوں کہ تم منکوحہ ہو۔ اور تمھارا خاوند سویا پڑا ہے۔ کسی منکوحہ عورت کے ساتھ تعلق قائم کرنا انسانی شرافت اور مذہبی قوانین کے خلاف مجرمانہ بغاوت ہے"۔

یہ کہنے کے بعد نوجوان سراپا موج اضطراب بن گیا۔ اس کی قوت ناطقہ کسی نومولود جذبہ نے اٹھ کر سلب کر لی۔ اس کی ایک ایک بات اضطراری لکنت کے باعث سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہونے لگی۔ اس کی شفاف اور چمکیلی آنکھیں آنسوؤں کے انتظار میں جھک گئیں گویا وہ ایک بہت بڑے گناہ کی عقوبت کے تصور میں ڈوب چکا تھا۔ جمیلہ اس کے چہرے کے تغیرات نگاہ حیرت سے مطالعہ کر رہی تھی آخر یکایک اس کے اعضا میں جنبش پیدا ہوئی اور پاؤں رکاب میں رکھ کر سوار ہونے لگا لیکن جمیلہ نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ تھام لی اور عجز آمیز انداز میں کہنے لگی۔ "

داستان دل مہجور تو سن کر جاؤ

آخر جمیلہ کا سحر حسن دوبارہ نوجوان کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ گھوڑے سے اتر کر سبزہ پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی داستان کا اس طرح آغاز کر دیا۔

"میں ایک برگشتہ بخت دوشیزہ لڑکی ہوں اور ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جس کی خاندانی شرافت دنیا بھر میں ضرب المثل ہے آج سے پہلے میری صورت کو چاند کی معصوم چاندنی اور سورج کی عفیف شعاعیں بھی نہیں دیکھ سکیں لیکن قسمت کی مصلحتیں بعض اوقات سخت دل آزار ہوا کرتی ہیں۔ میں گذشتہ شب اپنی والدہ کے ساتھ ماموں کے یہاں جا رہی تھی رستہ میں اس زور کی آندھی آئی کہ زمین سے آسمان تک گرد و غبار کا طوفان چھو گیا۔ دنیا گرد و خاک کے پردہ میں روپوش ہو کر رہ گئی میری حالت اس وقت اس بے ناخدا کی ناؤ سے مشابہ تھی جس کے چاروں طرف طوفان خیز موجیں ناچتی ہوں۔ آخر خدا خدا کر کے ہوا کے چہرے سے گرد و غبار کی نقاب اتری میں نے ادھر ادھر بڑے غور سے دیکھا مگر والدہ نظر نہ آئی۔ شاید اسے ہوا کے تیز جھونکے اڑا لے گئے تھے یا مٹی سے اٹے ہوئے اندھیرے میں رستہ بھول کر کہیں نکل گئی۔ مجھے والدہ کی جدائی نے مضطرب کر دیا۔ میں چلا چلا کر اس کو پکارنے لگی۔ آخر میری آواز بھرا گئی۔ میں دیوانگی کی حالت میں کہاں سے کہاں نکل گئی۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک تندخو نوجوان وحشیانہ انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہتا تھا کہ اگر جینا چاہتی ہو تو خاموش رہو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا لیکن تا بہ حد نظر مجھے سنسان جنگل کے بغیر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب میرے ہوش ٹھکانے تو آگئے لیکن موت کی موجودگی میں دوا کام نہیں کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ننگ انسانیت انسان جہنم معصیت کا شعلہ ہے جو میری متاع شرافت جلائے بغیر نہیں رہیگا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے مجبوراً اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے گاؤں میں لے گیا جہاں اس نے میرے زیورات اور کپڑے اتار کر مجھے چادر اوڑھنے پر مجبور کیا اس کے بعد وہ مجھے نشانہ سیاہ کاری بنانا چاہتا تھا لیکن میں نے شور مچا کر اس کا ملعون ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ آخر وہ مجھے آبادی سے دور یہاں لے آیا اور اس نے اپنے مذموم ارادہ کو دوبارہ جامہ عمل پہنانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کو ٹال ٹول بہانوں سے روک رکھا آخر ٹھنڈی ہوا نے چل کر میری عصمت کی حفاظت کر لی اور وہ قابل صد ہزار لعنت نوجوان اپنے شیطانی جوش کو ساتھ لے کر سو گیا۔ ان حالات کے پیش نظر اگر تم مجھے ساتھ لے چلو تو جہاں فرض محبت کی ادائگی ہو جائگی وہاں ایک مظلوم عورت ایک ڈاکو کے پنجے سے نجات

حاصل کریگی۔ یہ انسانی اور اخلاقی فرض ہے جس کا پورا کرنا دنیا و عقبیٰ کی بہتری حاصل کرنا ہے۔"

جمیلہ نے طلسمی افسانہ سے نوجوان کے دل پر قبضہ کرلیا۔ اب وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور تھا کہ اس مظلومہ کو یہاں چھوڑ جانا تہذیب و شرافت کے خون سے ہولی کھیلنا ہے۔ وہ جمیلہ کو اپنے ساتھ لیکر گھوڑے پر سوار ہوا اور قبرستان کی فضا کو نادانستہ طور پر خون وفا سے رنگین کرتا ہوا غایب ہوگیا۔

—— (۱۴) ——

تھوڑی دیر بعد جمیلہ کا خاوند بیدار ہوا اور جمیلہ کو غایب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی لیکن اس نے اپنے جنون آمیز اضطراب پر فوراً قبضہ کرلیا اور گھوڑے کے سموں کے نشان پر چل دیا۔ شہر کے قریب اس نے اپنے گوہر گم گشتہ کو پالیا۔ آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ جو پکڑی تو جمیلہ نے چلانا شروع کیا کہ لوگو خدا کے لئے میری مدد کرو۔ یہ ڈاکو دوبارہ مجھے پکڑ کر لیجانا چاہتا ہے۔ نوجوان اسپ سوار دونوں کے جھگڑے پر غیر جانبدارانہ غور کررہا تھا لیکن جمیلہ کے ہنگامۂ مظلومی نے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کرلیا۔ نوجوان کہتا تھا کہ یہ عورت میری ہے۔ جمیلہ چلاتی تھی کہ میں اس کو جانتی بھی نہیں۔ یہ موا مجھے دھوکہ دیکر لیگیا تھا اور میری عصمت داغدار کرنا چاہتا تھا لیکن اسپ سوار کے بر وقت پہنچ جانے سے خدا نے میری عزت بچالی۔ ادھر یہ دونوں میاں بیوی جھگڑ رہے تھے ادھر لوگوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے آپس میں گرماگرم بحث چھیڑ دی۔ کوئی کہتا تھا کہ عورت ایک خوشرو نوجوان کو دیکھکر بیچارے خاوند کو دھکا دے رہی ہے کوئی کہتا تھا کہ یہ مرد ہی جرائم پیشہ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تو سہی آنکھوں ہی سے مکاری ٹپکتی ہے بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ آخر ایک سرکاری ملازم بھی آپہونچا جس نے تینوں کو گرفتار کرکے حاکم شہر کے سامنے پیش کردیا۔ حاکم نے عدل و انصاف کی روایات پوری کرتے ہوئے معاملہ کی حقیقت تک پہنچنا چاہا۔ لیکن ملزمین کے متضاد بیانوں نے اس کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ حاکم کے سوال پر عورت نے مدعی کے دعوی کے تردید میں وہ افسانہ جس سے وہ اسپ سوار کی عقل پر ڈاکہ ڈال چکی تھی سنایا۔ اسپ سوار نے بھی عورت کے مزعومہ مظلومی کے پیش نظر اس افسانہ کی تائید کی رہا جمیلہ کا حقیقی خاوند تو اس کے پاس اس بات کے بغیر کوئی دلیل نہ تھی کہ ——

"عورت میری ہے۔"

"اگر عورت تمہاری ہے تو کوئی شہادت؟" حاکم نے سوال کیا۔

"جی ہاں، عورت میری ہے۔ اس بات کی شہادت حضرت عیسٰی علیہ السلام دینگے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"تمہارے گواہ تو بیحد قابل اعتماد اور واجب الاحترام ہیں لیکن وہ یہاں موجود نہیں۔" حاکم نے سوال کیا۔

"وہ جب تک تشریف نہیں لاتے مقدمہ کی کارروائی ملتوی کیجائے"

نوجوان یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ جمیلہ کی بے وفائی پر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ اتنے میں دربار کے سارے حاضرین اشتیاق کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور ایک نووارد بزرگ کے آگے ہدیۂ تعظیم پیش کرنے لگ گئے یہ تھے حضرت مسیح علیہ السلام۔

حضرت نے آتے ہی متانت آمیز مسکراہٹ سے جگمگاتے ہوئے لفظوں میں فرمایا۔ "لو میں گواہی دینے کے لئے آگیا ہوں۔ کہو حاکم شہر کیا کہنا چاہتے ہو؟"

حاکم حضور آج میری عدالت میں ایک عورت اور دو مرد پیش کئے گئے ہیں جن میں سے ایک کہتا ہے کہ عورت میری ہے۔"

حضرت "تو عورت کیا کہتی ہے؟"

حاکم "وہ اس امر سے انکار کرتی ہے۔"

حضرت مسیح نے عورت کو مخاطب کیا اور پوچھا کیا تم مدعی کی منکوحہ نہیں ہو؟ جمیلہ نے جواب دیا۔ حضور یہ بدمعاش شخص ہے۔ میری عصمت مکدر کرنے کی غرض سے مجھے بھگا لے گیا تھا۔ پیغمبر نے کہا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مدعی کی منکوحہ ہو یا نہیں۔ جمیلہ نے پھر انکار کیا۔ پیغمبر نے اس سوال کا تین بار اعادہ کیا لیکن جمیلہ ہر بار یہی کہتی رہی کہ میں تو اس کو جانتی بھی نہیں۔ اس کے بعد حضرت مسیح نے جمیلہ کو فرمایا کہ اگر تم مدعی کی زوجہ نہیں ہو تو —— بیت المقدس کی طرف منہ کرکے یہ کہدو کہ۔

"اے خدا جو چیز میں نے مدعی سے لی تھی وہ میں واپس کرتی ہوں اور ایسا کرنے کی مجھے توفیق عطا کر۔"

جمیلہ نے اس ارشاد کی تعمیل میں بیت المقدس کی طرف منہ کرکے مذکورۃ الصدر لفظوں کا اعادہ کیا۔ ابھی "عطا کر" پر پہنچی تھی کہ بیحس ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اب جمیلہ عالم فریب حسینہ نہیں تھی بلکہ ایک لعش تھی اس کے بعد دونوں نوجوان اور پیغمبر چپکے سے چلدیئے لیکن حاکم شہر نے

پیغمبر کا آگے روک کر بصد احترام حقیقت واقعہ بیان کرنے کی التجا کی جس کے جواب میں آپ نے تمام حالات بتا کر حاضرین کو صورت کی شیر کے ہو شربا پہلوؤں سے واقف کیا۔

دوسرا افسانہ

علاج ریاکاری

برزباں سبحہ حسین نیک نہاد   در دلش سنگ ابن زیاد

چڑیا اڑتی جا رہی ہے۔ اس کے پروں سے اڑنے کی طاقت رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ شاید بیچاری کو تین دن سے ایک دانہ میسر نہیں آیا ہے بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہونگی بیابان کے دامن میں ایک کھیتی میں دانے بکھرے پڑے ہیں۔ ایک کونے میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے سر پر سبز عمامہ پاؤں تک زعفرانی کرتہ۔ ملتے بر محراب" ہاتھوں میں کم سے کم تین گز لمبی تسبیح۔

یہ کوئی قطب ہوگا۔ شاید ساری عمر میں ایک گھڑی بھی یاد خدا سے غافل نہیں رہا اس کے دل میں مخلوق کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ساری دنیا کا درد اسی کے جگر میں ہے۔ ہر ذی روح کا ملال اس کو مضطر کر دیتا ہے۔ اگر معصوم فرشتہ نہیں تو کم سے کم انسانی لباس میں فرشتہ کی معصوم فطرت ضرور ہے۔

چڑیا آتی ہے اور بھوک کے علاج میں مصروف ہو جاتی ہے۔

"کہیں یہ ساری کھیتی چگ نہ جائے۔ زمین میری کھیتی باڑی میں کرتا ہوں۔ چلچلاتی دھوپ میں ہل چلایا۔ دانہ بکھیرے۔ پانی دیا اور مصیبتیں جھیلیں لیکن دانے چگنے آ گئی چڑیا۔۔۔" فرشتہ صورت صوفی یہ خیال کر کے تسبیح ہاتھ سے رکھ دیتا ہے اور غلیل اٹھا کر بیچاری چڑیا کے جگر پر غلولہ رسید کر دیتا ہے۔ ننھی چڑیا کا کلیجہ بلبلا جاتا ہے وہ ہانپتی کانپتی حضور سلیمان علیہ السلام کی کچہری میں حاضر ہو کر فریاد کرتی ہے۔

"حضور میری فریاد کو لطف توجہ سے سرفراز فرمائیے۔" چڑیا ابھی اپنی کہانی بیان کرنے نہیں پاتی کہ الہام کے ذریعہ پیغمبر پر ساری حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ پیغمبر صوفی کو بلا کر حکم دیتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں تمہاری کھیتی میں پرندے بھی خدا کی طرف سے حصہ دار بنائے گئے ہیں۔ تم نے چڑیا کو محض چند دانے چگنے کے جرم میں ظالمانہ طور پر جو اذیت پہونچائی اب اس کی تلافی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پیغمبر اسلام سپاہیوں کو حکم دیتے ہیں کہ صوفی کے کلیجہ پر زور سے پتھر مارا جائے تاکہ چڑیا کا انتقامی مقصد پورا ہو جائے۔ سپاہی پتھر اٹھا کر صوفی کی طرف آتے ہیں لیکن چڑیا اس حکم کی مخالفت کرتی ہے۔ دربار نبوت میں ایک مشت پر و بال کی گستاخانہ جسارت سے سناٹا چھا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چڑیا سے پوچھتے ہیں کہ آخر تو کیا چاہتی ہے۔ چڑیا کہتی ہے حضور اس کو جسمانی سزا نہ دی جائے بلکہ اس کی تسبیح، اس کی عبا اور اس کا عمامہ چھین کر اس کو شکل و صورت کے اعتبار سے عام دنیا دار بنا دیا جائے۔ تاکہ اس کی مومنانہ شکل و صورت اور فقیرانہ وضع و تراش آئندہ میری ایسی سادہ لوح چڑیوں کے لئے دھوکہ کا باعث نہ ہو سکے۔ اگر اس کو جسمانی سزا دی گئی اور اس کے انداز و لباس میں تبدیلی نہ کی گئی تو یاد رکھئے یہ گندم نما جو فروش آئندہ چڑیوں کے جگر پر اس زور کا غلہ بٹھائیگا کہ وہ حضور کے دربار تک پہونچنے کے قابل ہی نہ رہینگی۔

چڑیا کی معقول تجویز لطف قبول سے مشرف کی گئی اور صوفی صاحب زہد و تقدس کے پردہ میں مشق ستمرانی کرنے کے اسباب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ سچ ہے

"چور کو سزا دینے سے اس کی چوری کرنے والی طاقت کا اتلاف بہتر ہے۔"

تیسرا افسانہ

کرشمۂ رحمت

اللہ کی رحمت کے کرشموں پہ نظر کر
ڈوبے ہوئے بیڑے کے ابھرنے کا سماں دیکھ

خداوند کریم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ "اے موسیٰ آج مجھے تین کشتیاں غرق کرنا ہیں ساحل نیل پر جاؤ اور میری قدرت کی کارفرمائی دیکھو!"

موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد باری تعالیٰ کی تعمیل کی اور دریا کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

نیل کی موجیں خاموش روانی کے ساتھ اپنی عافیت آمیز فطرت کا اعلان کر رہی تھیں۔ پانی کا معمولی اضطراب بزبان حال کہہ رہا تھا کہ میرے دامن میں گرداب کے لئے جگہ نہیں۔ طوفان کے آثار تک بھی مفقود دکھائی دیتے

میں ایک کشتی آئی پیغمبر نے آواز دی کہ

"کشتی راں ہوشیار! اللہ کا حکم آ رہا ہے"۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ تقدیر خداوندی ٹل نہیں سکتی۔ اس کو جو منظور ہے ہو کر رہیگا"۔ ملاح یہ الفاظ کہنے ہی پایا تھا کہ ہزاروں موجوں نے باہمی تنظیم سے گرداب کی صورت اختیار کر لی اور کشتی کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اب کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ آخر گرداب اپنے حلقہ آغوش میں کشتی کو لیکر دریا میں ڈوب گیا

چند منٹ کے بعد دوسری کشتی آئی۔ حضرت موسیٰ نے ملاح کو پھر آواز دی کہ

"کشتی والے کشتی کو سنبھال، قہر خدا نازل ہونے والا ہے"۔

"دنیا کی کوئی طاقت قہر خداوندی کو روک نہیں سکتی۔ جو اس کی رضا ہے مجھے اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں"۔ ملاح ابھی اپنی بات ختم نہیں کر چکا تھا کہ ایک طوفان خیز ریلے نے کشتی کو سر پر اٹھا کر الٹ دیا۔ آخر تیسری کشتی بھی آگئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر آواز بلند کی۔

"اے ملاح کشتی کو بچا۔ قہر خدا نازل ہونے والا ہے"۔

"قہر خداوندی کے مقابلہ پر کوئی طاقت آ نہیں سکتی لیکن اس کی رحمت اس کے غضب سے زیادہ ہمہ گیر ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اور آپ بھی دعا کیجئے کہ ارحم الراحمین اپنے فضل و کرم سے کشتی کو آنے والی مصیبت سے بچائے۔ ملاح نے یہ کہا اور چپو مارتا ہوا خطرناک رقبہ سے کشتی نکال لے گیا۔ کشتی موجوں کے سینہ کو امن و عافیت سے روندتی ہوئی بخیریت منزل مقصود پر جا پہنچی۔ یہ خلاف توقع واقعہ حضرت موسیٰ کے لئے انتہائی حیرت کا موجب ہوا۔ آپ نے بارگاہ الہیٰ میں عرض کی اے قادر مطلق یہ کیا ماجرا ہے۔ تیرا وعدہ تو تین کشتیاں غرق کرنے کا تھا لیکن ان میں ایک بخیریت منزل مقصود پر جا پہنچی۔ بارگاہ الہیٰ سے اس سوال کا یہ جواب ملا کہ

"بیشک میرا وعدہ تو یہی تھا۔ پہلے دو ملاحوں نے میرے حکم کے آگے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر دیا اس لئے میں نے اپنے حکم کی تعمیل کروالی۔ لیکن تیسرا ملاح میری بارگاہ سے لطف و کرم کا طالب ہوا۔ چونکہ میں صرف قہار ہی نہیں ہوں بلکہ رحمٰن و رحیم بھی ہوں اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص مجھ سے لطف و رحمت کی درخواست کرے اور میں اس درخواست کو مسترد کر دوں۔ اس لئے تیسری کشتی غرق ہونے سے بچ گئی"۔

چوتھا افسانہ

خدا کا تصور

بزعم خود سمجھتا ہے وہی حد حقیقت بھی
بشر کے دامنِ افکار کی وسعت جہاں تک ہے

آفتاب کی روشنی اس کے ذرہ ذرہ پر کھیل رہی تھی۔ ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ اس کے گھنے اور الجھے ہوئے بال اس کی صحرائی زندگی کا اعلان کر رہے تھے اس کے پھٹے پرانے کپڑے اس درجہ میلے کچیلے تھے جن کے دیکھتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگ جائے۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں سیکڑوں کانٹے الجھے ہوئے تھے۔ پریشان لٹوں میں خشک گھاس کے تنکے اور کانٹے پیوست تھے۔ دیکھنے والوں کو اس انسانی پیکر پر غول بیابان کا دھوکہ ہوتا تھا۔ دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ نے جب اس کے سر پر آگ کی چادر بچھا دی تو وہ ایک درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ یہ جگہ اس کے لئے بہترین آرام گاہ تھی لیکن درخت کے سائے نے اس کے دماغ میں سوئے ہوئے خیالات بیدار کر دیئے اور وہ کسی گہرے تصور کی محویت میں کھو گیا اب وہ بکریوں کی حفاظت کرنے والا چرواہا نہیں تھا بلکہ ایک نیم مدہوش تصور پرست تھا جو خیالات کی عینک سے کسی ناگفتنی حقیقت کا نظارہ کر رہا ہو آخر اس کی محویت نے کروٹ لی اور وہ ایک پر لطف مستی کے عالم میں کہنے لگا۔

"اے خدا! اے میرے محبوب! اے میرے دل میں محبت کی آگ لگانے والے آ۔ آ۔ جلد آ۔ تجھے دھوپ کی جھلس دینے والی گرمی نے بیتاب کر دیا ہوگا۔ آ میں تجھے گھنی چھاؤں میں کمبل بچھا دوں۔ تیرے ہاتھ پاؤں سہلاؤں۔ تیرے بالوں میں سے کانٹے نکال کر ان پر تیل کی مالش کروں۔ جب تو سو کر اٹھے تو کنوئیں سے تازہ پانی نکال کر تجھے نہلاؤں۔ بکری کا تازہ دودھ پلا کر تجھے بھوک سے بچانے کی کوشش کروں جب شام ہو جائے تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سبزہ زاروں کی سیر کریں اور پھولوں کے کنج میں بیٹھ جائیں۔ بہار کے جو نو شگفتہ پھول صحرا کی فضا معطر کر رہے ہیں ان کو توڑ توڑ کر میں تیرے قدموں پر نچھاور کرتا جاؤں اس کے بعد ہم دونوں مل کر بکریاں چرائیں اور محبت کی وہ راگنی مل کر چھیڑیں جن سے صحرا کے ذرے ذرے پر مستی چھا جائے اے میرے خدا ۔۔۔ اے میرے دل کے مالک ۔۔۔ اے میرے محبوب۔ کیا مجھ سے زیادہ کوئی تیرے آرام و آرائش کا سامان مہیا کر سکتا ہے؟"

چرواہا مستی محبت میں اپنے خدا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ دنیا سے بے خبر اور اپنے احساس کے دریا میں غرق تھا کہ یکایک اس کے سامنے ایک نورانی شکل و صورت کے انسان نے آکر کہا کہ ہوش کی لو، خداوند کریم کے متعلق ایسی خواہشوں کا اظہار؟

"نووارد کی آنکھیں دل کو کھینچ لینے والی روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ اس کی باتیں جذب و کشش اور تسخیر و تاثیر کے اوصاف سے لبریز تھیں۔ چرواہے نے اپنے حواس پر قبضہ کر کے زوردار جواب دینے کی کوشش کی لیکن نووارد کی تیز نگاہیں اس کے دل میں ڈوب چکی تھیں بالآخر اس نے انتہائی کوشش کے بعد اپنی کھوئی ہوئی طاقت گفتار کو حاصل کر لیا۔

"آپ کو دخل دینے کا حق نہیں، میں تو اپنے خدا سے باتیں کر رہا ہوں۔"
چرواہے نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

"خدا سے باتیں کرو لیکن خدا کی بے نیازی اور برتری پر تو حملے نہ کرو۔"
نووارد نے متانت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"میں عرض کر چکا ہوں کہ باتیں تو میں کرتا ہوں خدا سے لیکن اعتراض کرتے ہیں آپ، آپ کو پرائی پیر میں ٹانگ اڑانے سے فائدہ؟" چرواہے نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے خدا ہی نے لوگوں کی اصلاح و تہذیب کیلئے بھیجا ہے میں مامور من اللہ ہوں!"

نووارد سے یہ بات سنتے ہی چرواہے کے ہوش ٹھکانے آگئے اب اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ماتھے سے ندامت کا پسینہ ٹپکنے لگ گیا اور وہ سرتاپا تصویر معذرت بن گیا پیغمبر نے چرواہے کی معافی مانگنے والی صورت سے اپنے تبلیغی مقصد کی تکمیل محسوس کی اور وہاں سے چل دیئے۔ دوسرے دن جب پیغمبر کوہ طور پر خدا سے باتیں کرنے کی غرض سے گئے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی حد نہ رہی کہ رحمت الٰہی کا لطف و کرم ناراضی کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ پیغمبر نے انتہائی عجز و لجاجت کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں عرض کی کہ "مالک دو جہاں مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی جس کی پاداش میں حضور کا لطف و توجہ مجھ سے دور ہو چکا ہے؟" بارگاہ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ تم نے میرے عزیز ترین محبوب کو کل مراط محبت سے ہٹانے کی کوشش کی اس لئے تم میرے ابر رحمت کے سائے میں آنے کے قابل نہیں رہے۔"

پیغمبر "حضور مجھے اس سرکار عالی مدار میں وہاں جواب کہنے کی جرات تو نہیں اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

آوازہ قدرت "ہاں! تم اپنے معروضات پیش کر سکتے ہو!"

پیغمبر "وہ چرواہا جس کے متعلق مجھ سے باز پرس کی جا رہی ہے حضور کو جس تخیل کی روشنی میں پیش کر رہا تھا وہ صفات خود اس کی لامذہبی اور ملحدانہ جہالت کا نتیجہ تھا۔"

آوازہ قدرت "تمہیں معلوم نہیں کہ ہر انسان کا میرے متعلق تصور اس کی دماغی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے چرواہے کا ماحول، اس کے پس و پیش کے حالات اس کا معیار زندگی اس کے محدود خیالات اس کی دماغی و ذہنی تربیت کے پیش نظر اس سے زیادہ اچھے تصور کی توقع ہو نہیں سکتی لیکن اس کے دل میں میرے متعلق محبت کی جو آگ شعلے برسا رہی تھی اس میں کوئی نقص یا عیب نہیں تھا۔ میں تصورات و الفاظ کو نہیں دیکھا کرتا بلکہ نیتوں کے حسن و قبح پر نظر کیا کرتا ہوں جس قدر چرواہے کا تصور دہقانی عقل میں ڈوب کر بھیانک پن کی سیاہی میں ملفوف تھا اسی قدر اس کی نیت نورانی اور جذبات مصفا تھے لیکن تمہاری نصیحت نے جذبات میں تذبذب و تزلزل پیدا کر دیا اس کے دل میں مخلصانہ محبت کی جو محکم بنیادیں تھیں یکایک تھرا گئیں جس کے باعث وہ ایمان و یقین سے محروم ہو کر میرے متعلق تذبذب و اشتباہ میں پڑ گیا تم نے یہ بہت بڑا قصور کیا ہے! باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے پیغمبر کو اپنی غلطی محسوس ہوئی اور وہ سجدے میں گر کر اظہار معذرت کرنے لگ گئے۔

ہمدردی و ایثار!

تنگدستی و افلاس کے باعث میری حالت خراب تھی۔ ایک امیر اور متمول آدمی کو اس بات کا علم ہوا اس نے اپنے ملازم کی معرفت مجھے کچھ روپیہ بھیجا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ اس طرح میری مصیبت اور پریشانی دور ہو گئی جس وقت میں خوشحال ہوا تو میں نے اس کی رقم اسے واپس کر دی پھر خوش ہو کر اس کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

کچھ دنوں بعد مجھے سفر درپیش ہوا میں غریب الوطنی کی حالت میں تھا۔ بیماری کے باعث نحیف و نزار تھا اور علاج و تیمارداری کے لئے ترس رہا تھا۔ ایک غریب اور نیکدل شخص میرے پاس سے گذرا اس نے مجھے تکلیف سے کراہتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی میرے غم میں بیتاب ہو گیا دو زانو ہو کر میرے پہلو میں بیٹھ گیا میرے سر پر اپنا رومال باندھا۔ پھر بازار سے کچھ لا کر مجھے کھلایا اور جب تک میں پوری طرح تندرست نہ ہوا برابر میرا علاج اور خبرگیری کرتا رہا ——— میں اس کارکردگی کا معاوضہ کس طرح ادا کروں؟ ——— زر ضرور بڑی چیز ہے لیکن جانی ہمدردی اس سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے۔

سید یوسف بخاری۔ دہلوی

کسان کی تعطیل!

جناب مولانا صہبائی صاحب بی۔ اے (آنرز)

فلک پر ہے چھایا اک ابرِ سیاہ — دماغِ جنوں کو جو کر دے تباہ
ابھی ننھی بوندیں سی پڑنے لگیں — وہی موسلا دھار ابھی بن گئیں
زمیں پر ہرا فرش اک مخملیں — سماں ہے عجب وجد و کیف آفریں
پہاڑی کا ہر چپہ رشکِ ارم — گلستاں کا ہر گوشہ بیت الصنم
گھنے بن میں طاؤسِ رقصاں کا شور — درختوں پہ کوئل کی کوکو کا زور
چمن میں ہر اک شاخ پر قمریاں — پپیہے کا نوحہ وہی "پی کہاں"

فضا میں ہے اک کیف و مستی تمام
ہوائے معنبر ہے بستی تمام

زمیں کا ہے ہر چپہ چپہ ہرا — یہ ساون کے آنے کی ہے ابتدا
ہر اک گھر کساں کا سراسر خوشی — ہر اک کی کلائی پہ راکھی[1] بندھی
بناکھی[2] کہیں اور کہیں لاونی[3] — کسی جا کہانی، کہیں دِرگلی!

---

[1] راکھی یا راکھی بندھن" ماہ ساون کے آغاز میں عزیز و اقربا خصوصاً عورتیں مرد کے ہاتھ میں ایک رنگین دھاگا جس میں حسب استطاعت موتی یا گوٹا لگا ہوتا ہے باندھ دیتی ہیں یہ ایک پرانی رسم ہے جو قدیم ہندو بہادروں کی یادگار ہے [2] بناکھی۔ گاؤں کے تمام مرد ایک حلقہ بنا کر اور ایک ایک ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور گاؤں کی عورتیں کچھ فاصلہ پر ایک حلقہ بنا کر بیٹھتی ہیں اور دیہاتی سوز و ڈھول پر گیت شروع کرتی ہیں جب عورتوں کے گیت میں پوری گرمی پیدا ہو جاتی ہے تو مرد اس حلقہ میں رقص شروع کرتے ہیں اور ہاتھ کی لکڑیوں سے ایک دوسرے کی لکڑی پر لکڑی مار کر مکمل تنظیم کے ساتھ تال دیتے جاتے ہیں یہ کھیل عموماً ساون کے مہینہ میں کھیلا جاتا ہے [3] لاونی۔ ایک دیہاتی راگنی کا نام ہے جسے "لبنگی" کھیلتے وقت

کسی کو ہے لینگی[۴] و گرئی[۵] کا ذوق　　کسی کو چکارے[۶] و گھیرے[۷] کا شوق

گوالا[۸] مویشی چرانے میں خوش

ہے موگی[۹] جڑی بوٹی لانے میں خوش

دہاتی حسینوں کا عالم ہے یا　　ہر اک گھاٹ پر اک بڑا جمگھٹا

وہ آپس کی چھیڑیں خدا کی پناہ　　وہ پانی کی چھینٹیں خدا کی پناہ

درختوں پر آموں کے جھولے پڑے　　حسینوں کے نیچے پرے کے پرے

کوئی ان میں ملہار[۱۰] گاتی ہوئی　　کوئی جوگیا[۱۱] گنگناتی ہوئی

کسی نے چھڑا دی کبھی گدگدی　　کوئی جھولے سے خود بخود گر پڑی

شباب و جوانی کی ہیں داستاں　　ہری سُرخ اور کاسنی ساڑھیاں

مئے ناز کا ان نگاہوں میں کیف

جوانی کا ہر اک کی آنکھوں میں کیف

اُدھر کی ہیں قدرت نے گلکاریاں　　اِدھر یوں ہیں ساون کی تیاریاں

ہر اک ان میں بوڑھا ہے وہ یا جواں　　منانے کو تعطیل اپنی کساں

نظر آتا ہے خرم و شاد کام

مہینہ ہے ساون کا تعطیل عام

گاؤں کے لوگ کورس کی شکل میں گاتے ہیں [۴] لینگی ۔ ساون کے میلوں میں لینگی ایک بہت مقبول رسم ہے ہاتھ ہاتھ بھر کے ڈنڈے لیکر آٹھ دس آدمی لاونی گاتے جاتے ہیں اور چھوٹے سے حلقہ میں ان لکڑیوں سے ناکھی کی طرح تال دیتے جاتے ہیں [۵] ڈہائی ڈہائی گز کے دو بانسوں پر نیچے کی طرف زاویہ قائمہ پر ایک ایک مضبوط لکڑی ڈوری سے باندھی جاتی ہے اور گاؤں والے کسانوں کو خصوصاً اس پر چڑھنے کی بہت مشق ہوتی ہے توازن قائم رکھنے کی یہ بہترین مثال ہے خاص مواقع پر گیرئی کی سواری اور فن کے کمالات بھی ساون ہی کے جلسوں میں دکھائے جاتے ہیں [۶] سارنگی کی طرح ایک چھوٹا ساز [۷] ایک طرف سے کھلا ہوا ڈھول طبل ۔ [۸] مویشی چرانے والا [۹] جڑی بوٹی بیچنے والا ۔ موگی گوند بھیل کی طرح ایک پرانا فرقہ ہے جو سنٹرل انڈیا کے پہاڑی علاقہ میں رہتا ہے ۔ [۱۰] ملہار ایک برساتی راگ [۱۱] آخری رات میں عموماً گایا جاتا ہے ۔

کورانہ تقلید

از
جناب محمد شمیم صاحب جاھی

(۱)

"میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بالکل آزاد کردوں۔"

"مجھے آزاد کردو؟"

"ہاں، آزاد کردوں۔"

"کیسے؟"

"آزادی دیکر۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھی!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں تمھیں ایسا بنا دوں کہ تم کسی مرد کی مدد کی ممنون نہ رہو۔"

"کس بات میں؟"

"خانہ داری کے معاملے میں۔ بازار سے چیزیں خریدنے میں۔ سفر وغیرہ جانے میں۔"

"لیکن میں ایسی آزادی نہیں چاہتی!"

"تم نہ چاہو، لیکن میں تو چاہتا ہوں۔"

"تم کیوں چاہتے ہو؟"

"میں اس لئے چاہتا ہوں کہ پرانے طرز کی بیویاں جو پردے میں رہتی ہیں ذرا ذرا سی بات کے لئے مردوں کا منہ تکتی ہیں مجھے پسند نہیں میں اپنے لئے یہ باتیں بہت شرمناک سمجھتا ہوں۔ میرے دوست آتے ہیں تو اپنی بیویوں کو ساتھ لاتے ہیں۔ ان کی بیویاں کتنی اپ ٹو ڈیٹ ہیں وہ بے جھجک ہم لوگوں کے درمیان بیٹھتی ہیں، باتیں کرتی ہیں۔ اپنے شوہروں کے ساتھ یا تنہا نڈر ٹہلتی پھرتی ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے تمھارا ہمیشہ پردے میں رہنا میرے دوستوں سے بات نہ کرنا۔ بے جھجک میرے ساتھ باہر نہ نکلنا۔ ان باتوں سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے تمھیں کیا خبر؟ اس دن میری غیر حاضری میں منصف صاحب آئے۔ تم نے نوکر کے ذریعہ کہدیا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ تمھاری اس دقیانوسی حرکت پر دوستوں میں مجھے کتنا شرمندہ ہونا پڑا اس کا تم اندازہ نہیں کرسکتی ہو۔ انھوں نے میرا کتنا مذاق اڑایا۔ یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

"تو اور میں کیا کرتی؟"

"تمھیں خود ان کا خیر مقدم کرنا چاہئے تھا۔ ان کو بٹھاتیں ان کی خیریت دریافت کرتیں۔ انھیں چائے پلاتیں۔ وہ مجھ سے کیوں ملنے آئے تھے اس کا سبب دریافت کرتیں۔ ممکن ہے وہ کسی کام سے آئے ہوں۔ میں جب کبھی ان کی غیر حاضری میں ان کے گھر پہنچ جاتا ہوں تو ان کی بیوی مجھ سے ملتی ہیں۔ خاطر کرتی ہیں۔ آنے کا سبب دریافت کرتی ہیں۔ مجھے ان کے شیریں برتاؤ سے کتنی مسرت ہوتی ہے جب میں ان کا مقابلہ تم سے کرتا ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔"

"لیکن مجھے تو غیر آدمی سے باتیں کرتے شرم آتی ہے!"

"تمھارے والد بالکل پنڈت ہیں۔ وہ اسی قسم کے دستور پسند کرتے ہیں جس کے مطابق عورتیں بھیڑ بکریوں کے مانند باڑے میں بند رکھی جاتی ہیں تم نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی ہے اس لئے تمھیں شرم آتی ہے لیکن اب تمھیں اس شرم کو طلاق دینی ہوگی۔"

"بہت مشکل کام ہے؟"

"مشکل وشکل کچھ نہیں۔ جب تک مشکل سمجھو گی مشکل معلوم ہوگا

جب آسان سمجھو گی آسان ہو جائیگا۔

"میری خواہش بھی نہیں کہ میں ایسا کروں۔"

"لیکن میری خواہش تو ہے۔ جس دن تم اپٹوڈیٹ ہو جاؤ گی مجھے بے انتہا مسرت ہو گی۔"

"اپ ٹوڈیٹ ہونے کے لئے انگریزی جاننا ضروری ہے اور میں انگریزی جانتی نہیں۔"

"انگریزی جاننا اچھی بات ہے۔ لیکن ضروری نہیں۔ پھر بھی تم کچھ تو انگریزی جانتی ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ کتے بلی کی انگریزی جاننا بھی کوئی انگریزی جاننا ہے۔"

"فی الحال اتنا کافی ہے آہستہ آہستہ مشق بڑھ جائیگی۔"

"تو اپ ٹوڈیٹ ہونے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"سب سے پہلے تو تمہیں شرم کو پھینکنا پڑیگا۔" بیوی کے منہ پر تعجب اور گھبراہٹ دیکھ کر شوہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب اس شرم سے نہیں ہے جو عورتوں میں فطرتی ہوتی ہے جس کے زائل ہونے سے عورت طوائف ہو جاتی ہے۔ میرا مطلب مصنوعی شرم سے ہے۔ جس کی وجہ سے عورتیں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے لئے ترستی ہیں۔"

"میں تو نہیں ترستی۔"

"اس لئے کہ تمہاری عادت ہی اس قسم کی پڑ گئی ہے۔ جس طرح ایک بھنگی پیشاب، پاخانہ اٹھانا اپنا پیدائشی فرض سمجھ کر کرتا ہے اور اسی میں خوش ہے اس کے علاوہ تمہیں پردے سے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی تمہارے رہنے کے لئے اس قدر بڑا ہوادار بنگلہ ہے۔ ٹہلنے کے لئے کمپونڈ ہے۔ باہر جانے کے لئے کار ہے لیکن ذرا اپنی ان بہنوں کا خیال کرو جو چھوٹے اور گندے مکانوں میں رہتی ہیں جن کے پاس سونے اور اٹھنے بیٹھنے کے لئے صرف ایک ہی کوٹھری یا کمرہ ہے کیا تم ایسی حالت میں رہنے سے خوش رہ سکتی ہو؟"

بیوی نے کانپ اٹھنے کا انداز دکھلاتے ہوئے کہا۔ "ایسی جگہ تو میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔"

"لیکن ہزاروں عورتیں ایسی حالتوں میں رہ کر بھی پردے کا نباہ اپنی خواہش سے کرتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کی عادت سی ہو گئی ہے اسی طرح تم کو بھی پردے میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ لیکن جو عورتیں آزاد ہیں۔ اپ ٹوڈیٹ ہیں وہ تمہاری حالت دیکھ کر اسی طرح کانپ اٹھتی ہیں جس طرح تم چھوٹے اور گندے مکانوں میں رہنے والی عورتوں کی حالت دیکھ کر کانپ جاتی ہو۔"

بیوی لاجواب ہو کر شوہر کا منہ تکنے لگیں۔ اس کا منہ بند تھا لیکن آنکھیں خاموش جواب دے رہی تھیں "ممکن ہے تمہارا ہی کہنا صحیح ہو۔"

۲

پنڈت ماتا پرشاد ڈپٹی کلکٹر روپئے میں چودہ آنے انگریزیت میں رنگے ہوئے ہیں۔ صرف دو آنے کی کسر باقی ہے۔ ایک آنے کی کسر تو اس لئے ہے کہ ان کا رنگ روپ انگریزوں کی طرح نہیں ہے ان کا رنگ سانولا ہے اور ان کو اپنے سانولے پن سے سخت تکلیف ہے لیکن کیا کریں خالق کی غلطی برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر کوئی عامل یا حکیم ان کا اور ان کی بیوی کا رنگ روپ انگریزوں کی طرح بنا دیتا تو وہ اس کام کے لئے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے کو تیار تھے۔ ان کی بیوی گندمی رنگ کی ہیں اور انگریزی بھی نہیں جانتیں۔ اسی طرح دوسرے آنے کی کسر یہ رہ جاتی ہے اس لئے کہ انہیں اپنے ماں باپ پر دانت پیسنا پڑتا ہے ان لوگوں نے اُن کی شادی اس عمر میں کردی تھی جب کہ وہ انگریزی طرز معاشرت کی خوبیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ پائے تھے۔ ورنہ وہ سفید رنگ اور گریجویٹ لڑکی سے شادی کرتے یا تمام عمر تجرد میں گزار دیتے۔

ان کی طرز رہائش بالکل یوروپین ہے دھوتی کو آپ جنگلی پوشاک سمجھ کر اس سے نفرت کرتے ہیں اور گھر میں بھی موسم کے مطابق پتلون یا ہاف پتلون ڈالے رہتے ہیں رات کو سلیپنگ سوٹ پہن کر سوتے ہیں۔ چھری کانٹوں کی مدد سے میز پر کھانا کھاتے ہیں۔

آپ کا نام مسٹر ایم۔ پی۔ پتنک مشہور ہے۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہونگے کہ ایم۔ پی۔ پتنک کی انگریزی کینچلی میں پنڈت ماتا پرشاد پاٹھک چھپا ہوا ہے۔ جب کوئی انگریز افسران کو مسٹر پتنک کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ خوش ہو کر اسے سروغیرہ قسم کے خطاب تصور کرتے ہیں۔ لیکن جب ہندوستانیوں کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں کیونکہ کبھی کبھی کوئی ہندوستانی

انھیں مسٹر پاٹھک، پنڈت جی، پاٹھک جی وغیرہ نام سے مخاطب کرکے اپنے بیدائشی گنوار پن کا ثبوت دے ہی دیتا ہے۔

مسٹر پاٹھک پر ابتدا ہی سے اپنی بیوی کو انگریزی سانچہ میں ڈھالنے کی دھن سوار تھی۔ بعض باتوں میں تو ان کی بیوی نے کچھ انگریزیت پیدا کرلی تھی وہ چینی اور شیشے کے برتن میں کھانا برا نہیں سمجھتیں۔ چوکے کے بجائے میز اور کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی اب انھیں قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتا۔ پلنگ اور تخت پر بیٹھنے کے بجائے دن بھر کرسی، بنچ یا آرام کرسی پر بیٹھے رہنے سے انھیں تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں تو ہو گئی ہیں لیکن ابھی تک پردے کا مرض نہیں دور ہوا ہے۔ صرف نوکروں اور دو چار دوستوں کے سوا کسی غیر مرد کے سامنے نہیں آتی ہیں۔ مسٹر پاٹھک کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ مسز پاٹھک بیرن کی طرح آزاد ہو جائیں۔

آخر میں شوہر کے بہت ضد کرنے پر صرف انھیں خوش کرنے کے لئے بیچاری کملا نے پردے کو بھی خیرباد کہہ دینا ہی بہتر سمجھا۔ اس کے اس فیصلہ سے مسٹر پاٹھک کو بے انتہا مسرت ہوئی۔

ایک دن مسٹر پاٹھک کے دوستوں اور شناساؤں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ جو مسز پاٹھک پہلے ان لوگوں کے سامنے بھی نہ ہوتی تھیں۔ وہی اب ان کی مجلس میں بیٹھی ہیں۔

پاٹھک جی نے بڑے غرور سے یہ خوشخبری سنائی کہ مسز پاٹھک نے خود اپنی خواہش سے پردے کو ٹھکرا دیا ہے۔ حاضرین مجلس بہت محظوظ ہوئے سبھوں نے مسٹر پاٹھک کو مبارکباد دی اور مسز پاٹھک کی فراست ہمت اور نہ جانے کن کن باتوں کی بے انتہا تعریف کی گئی۔

اب کملا شوہر کے ساتھ کھلے بند پیدل یا موٹر پر گھومنے نکلتی ہے تنہا بازار جاکر "شوپنگ" کر آتی ہے کملا بھی اس آزادی سے بہت خوش ہے اسے اب معلوم ہوا کہ آزادی میں کتنا مزہ ہے۔ جس طرح گرفتار جانور آزاد ہونے پر خوب اچھلتا کودتا ہے۔ اسی طرح کملا بھی اپنی آزادی کا خوب اظہار کرتی ہے۔ پہلے بازار سے خود کوئی سودا خرید کر لانا کملا چھوٹی بات سمجھتی تھی۔ لیکن اب اسے نوکر کی لائی ہوئی چیزیں پسند ہی نہیں آتیں۔ نوکر کمبخت اچھی چیزیں خریدنا کیا جانیں؟ اچھی چیز لاتے ہیں تو بہت زیادہ قیمت دے آتے ہیں اور اگر سستی چیز خرید کر لاتے ہیں تو وہ خراب نکل جاتی ہیں اس لئے خود ہی گئے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔

کملا نے موٹر چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔ اس فن کے سیکھ لینے سے کتنا آرام ہو گیا ہے۔ پہلے صرف کملا کی وجہ سے ڈرائیور رکھنے کی ضرورت تھی لیکن اب تو ڈرائیور کی کوئی ضرورت ہی نہیں صرف ایک کلینر سے کام اچھی طرح نکل رہا ہے۔ جب جی چاہا موٹر لیکر نکل گئے۔ ڈرائیور کا انتظار کرنے یا اس کے بھروسہ پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ جب سڑک پر لوگ اس کو موٹر چلاتے دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتے ہیں تو کملا کو کتنا غرور ہوتا ہے۔؟

جب وہ اپنی بعض بہنوں کو پردے کے سبب بند سواریوں میں دیکھتی ہے تو اسے ان کی حالت پر کتنا رحم آتا ہے؟ وہ خیال کرتی ہے کہ ایسی قفس کی زندگی میں عورتیں کیسے خوش رہتی ہیں؟

قصہ مختصر کہ کملا اب بالکل آزاد ہے۔ اسے اس آزادی سے بہت آرام ہے اور اس کے لئے وہ اپنے شوہر کی دل سے ممنون احسان ہے۔

۳

پاٹھک جی نے تار پڑھ کر کملا کو سنایا۔ "پنڈت جی سخت بیمار ہیں کملا کو فوراً بھیجو!"

کملا تار سن کر گھبرا گئی۔ کہنے لگی۔

"اس بار پتا جی شاید ہی بچیں۔"

پاٹھک جی نے کہا۔ "کیا تعجب ہے؟ عمر بھی تو کافی ہو گئی ہے۔"

"مجھے آج ہی جانا چاہئے۔"

"ہاں! ہاں! جاؤ، رات کی گاڑی سے جاؤ۔ کل دس بجے دن کو پہنچ جاؤ گی۔"

"جاؤ کے کیا معنی؟ کیا تم نہ چلو گے؟"

"مجھے اس قدر جلد چھٹی نہ مل سکے گی۔ دوسرے میری ضرورت ہی کیا ہے؟ اب بھی تم میرا سہارا ڈھونڈھتی ہو۔؟"

پاٹھک جی نے یہ بات طعنہ کے طور پر کہی۔

کملا نے کہا۔ "تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں تنہا ہی جاؤں؟"

"کیوں؟ کیا حرج ہے؟"

"تمہیں تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ شہر کی بات دوسری ہے لیکن سفر میں تنہا جانا......"

پاٹھک جی ہنسے۔ ہنسکر کہا ۔۔ "ابھی کسر باقی ہے۔ یہ کسر بھی نکالنی پڑے گی۔"

"خیر جب کسر نکل جائیگی تو دیکھا جائیگا۔ لیکن ابھی تو تمہیں چلنا ہی پڑیگا۔"

"میرا جانا تو ناممکن ہے۔ اگر تم تنہا جا سکتی ہو تو میں خوشی سے اجازت دے سکتا ہوں!"

"تنہا جانا تو بہت مشکل ہے؟"

"تنہا جانا کچھ مشکل نہیں۔ یہاں میں سوار کر دونگا۔ وہاں مارو یدگھا اسٹیشن پر آدمی آجائیگا۔"

"اور جو کیول میں گاڑی بدلی جاتی ہے؟"

"تو کون بڑی آفت ہے۔ کسی ٹکٹ کلکٹر سے دریافت کر لینا۔ وہ جس گاڑی میں بتادے بیٹھ جانا۔ آج کل تو سفر اتنا آسان ہو گیا ہے کہ تھوڑی سی سمجھ رکھتا ہو تو ایک بچہ بھی کہاں سے کہاں جا سکتا ہے اور پھر تم تو اس لائن سے کئی بار سفر کر بھی چکی ہو۔"

"میں نے تنہا تو کبھی بھی سفر نہیں کیا!"

"تنہا نہ سہی! لیکن تمہیں راستے کا علم تو ہے۔"

"تم چلتے تو اچھا تھا۔ خیر! ساتھ میں کسے لیجاؤں!"

"کیا مطلب؟ میں تو نہیں جا رہا ہوں، پھر ساتھ کا کیا مطلب؟"

"کوئی نوکر وو کر جائیگا یا نہیں؟"

پاٹھک جی ہنس پڑے۔ "ابھی ساتھ کا جھگڑا مٹا نہیں۔"

"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ بالکل تنہا ہی جاؤں؟"

"اگر جاؤ گی تو کون قیامت ہو جائیگی؟" کسی نوکر کو ساتھ لیجانے کے بجائے تمہارا تنہا جانا زیادہ محفوظ ہے۔"

"کیوں؟"

"نوکر پر میں اعتماد نہیں کرتا۔ نوکر کے لے جانے کے معنی ہیں کہ تم خطرہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔"

"نوکر خطرہ ہے؟"

"بیشک! جب تک قابل اعتماد نوکر نہ ہو وہ خطرہ ہی ہے۔"

اب کملا سوچ میں پڑ گئی۔ پتا جی کو دیکھنے کے لئے لمحہ لمحہ اسے پہاڑ ہو رہا تھا وہ جانتی تھی کہ اس کے والد کی عمر بہت زیادہ ہے۔ اگر ان کا انتقال اس کے پہونچنے سے پہلے ہی ہو گیا تو وہ آخری ملاقات سے بھی محروم رہ جائے گی۔

پاٹھک جی نے کہا۔ "میں تو کورٹ جا رہا ہوں۔ تم فیصلہ کر لینا اگر جانا چاہو تو تیار رہنا۔"

کملا نے کہا۔ "تم چھٹی کی کوشش تو کرنا۔ کل بھر کی چھٹی بھی اگر مل جائے تو پرسوں صبح لوٹ سکتے ہو۔"

"بیکار ہے۔ اولاً تو چھٹی ملیگی ہی نہیں دوسرے اتنی چھوٹی سی بات کے لئے میں چھٹی لینا بیکار سمجھتا ہوں ـــــ صرف تمہیں وہاں تک پہونچانے کے لئے چھٹی لوں۔ خوب"

یہ کہہ کر پاٹھک جی دفتر چلے گئے ادھر کملا نے بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آج ہی جانا چاہئے۔ خواہ تنہا ہی جانا پڑے۔

شام کو شوہر کے دفتر سے واپس آنے پر اس نے کہا۔ "میں نے طے کر لیا ہے کہ میں آج ہی جاؤں گی!"

"شاباش! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی جہاں اس بار تم نے تنہا سفر کر لیا پھر آئندہ کے لئے تمہاری ہمت بڑھ جائیگی۔"

"اسباب تھوڑا ہی لے جاؤں۔"

"اسباب بالکل نہ لے جاؤ۔ سردی کا موسم تو ہے نہیں۔ صرف ہینڈ بیگ لے لو اس میں تولیہ۔ فلاسک۔ برش، ٹوتھ پیسٹ۔ اور صابن رکھ لو۔ بس۔ اسباب لے جانے میں جھنجھٹ ہے۔ قلی بڑے بدذات ہوتے ہیں بہتر یہی ہے کہ اسباب کا جھگڑا نہ رکھو۔"

کملا کو یہ رائے پسند آئی اسباب کا خیال کر کے وہ گھبرا رہی تھی اب یہ معلوم کر کے کہ اسباب چڑھانے اتارنے کا کوئی جھگڑا نہ رہے گا۔ اس کی ہمت بڑھ گئی۔

ٹھیک وقت پر پاٹھک جی کملا کو اسٹیشن لے گئے۔ اسے زنانہ انٹر کلاس میں بٹھا کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ یکایک ایک دوست نے انھیں دیکھ کر کہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں پاٹھک جی؟"

"نہیں، میری بیوی میکے جا رہی ہیں۔"

"تنہا؟" دوست نے کچھ تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں! آپ اتنا چونک کیوں گئے؟"

"بالکل تنہا بھیجنا ٹھیک نہیں کم سے کم ایک نوکر ہی ساتھ ہوتا۔"

"نہل، ان باتوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ میری بیوی کافی ہوشیار ہے۔ تم بھی کہیں جا رہے ہو؟"

"نہیں، میں تو ایک مہمان کو لینے آیا تھا لیکن وہ اس گاڑی سے آئے نہیں۔"

اسی وقت گارڈ نے سیٹی بجائی۔ پاٹھک جی لپک کر زنانہ انٹر کے پاس پہونچے۔ بیوی سے الوداعی ملاقات کی دو چار جملوں میں مطمئن رہنے کی فہمائش کی۔ یہاں تک کہ گاڑی چلدی۔

۴

رات اطمینان سے کٹ گئی۔ صبح کو کملا دیوی کیول پہونچیں۔ کملا دیوی اس گاڑی سے اتر کر دوسری گاڑی پر جانے کے لئے سرنگ کی طرف چلیں انھیں دوسرے مسافروں سے معلوم ہوگیا تھا کہ دوسری گاڑی کے لئے سرنگ میں سے ہوکر جانا ہوتا ہے راستہ میں انھوں نے سوچا کہ پلیٹ فارم نمبر تو پوچھ لینا چاہئیے اس لئے انھوں نے ایک ٹکٹ چیکر سے کچھ شرماتے ہوئے پوچھا۔ "جمال پور کی گاڑی کس پلیٹ فارم سے جاتی ہے؟"

چیکر نے کہا —— "دوسرے نمبر سے۔"

کملا دیوی آگے بڑھیں۔ چیکر ان کی طرف تاکتا رہا اس کے بعد مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کملا دیوی سرنگ سے نکل کر پلیٹ فارم نمبر ڈھونڈھنے لگیں ایک جگہ نمبر ۲ لکھا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک چیکر سے دریافت کیا۔

"دو نمبر پلیٹ فارم یہی ہے؟"

چیکر نے جواب دیا —— "ہاں!"

"جمال پور اسی پلیٹ فارم سے گاڑی جاتی ہے؟"

"ہاں —— !"

اب کملا دیوی سیدھے اس پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی کے انٹر میں بیٹھ گئیں اب ان کے جی میں جی آیا۔ انھوں نے سمجھا کہ اب وہ بخیریت تمام گھر پہونچ جائیگی۔

فوراً ہی اسی پلیٹ فارم کے دوسری طرف ایک گاڑی آئی۔ کملا دیوی اس گاڑی کے مسافروں کے اترنے کا ہنگامہ دیکھ کر طبیعت بہلانے لگیں۔ کملا دیوی کی گاڑی نے سیٹی بجائی اور چل پڑی۔ اس ڈبہ میں تین اور پردہ نشین عورتیں تھیں۔ کملا دیوی انھیں دیکھ کر سوچ رہی تھیں۔ "یہ کتنی بے بس ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو تو یہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتیں۔ ایک میں ہوں کہ اتنا طویل سفر تنہا طے کر رہی ہوں۔ خود مختاری بھی کتنی آرام دہ ہے۔ وقت کاٹنے کے خیال سے کملا دیوی نے ایک ہم سفر سے پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"بختیار پور"

بختیار پور کا نام سنتے ہی کملا دیوی کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا سوچنے لگیں پہلے کئی دفعہ جب اس راستے سے گئی تھی تو یہ اسٹیشن نہیں ملا تھا۔ شاید یہ اسٹیشن جمال پور سے آگے ہو۔ یہ سوچ کر انھوں نے اس عورت سے دریافت کیا۔

"جمال پور یہی گاڑی جاتی ہے نا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔"

دوسری عورت بول اٹھی۔ "یہ اسٹیشن تو ہمارے علم میں ادہر نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟" کہتے ہوئے کملا دیوی کا قلب پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ "نہیں ضرور ہوگا! تمھیں معلوم نہیں ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

اب کملا دیوی سوچنے لگیں کسی اسٹیشن پر گاڑی رکے تو کسی سے دریافت کریں لیکن وہ اکسپرس تھی۔ دو اسٹیشن چھوڑ کر تیسرے پر رکی کملا دیوی اس انتظار میں تھیں کہ کوئی ریلوے کا آدمی آئے تو اس سے دریافت کریں۔ اتنے میں گارڈ ان کے ڈبہ کے سامنے سے گذرا لیکن ان کا گورا چہرا دیکھ کر اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گاڑی پھر چل پڑی اب کملا دیوی کی بےچینی بڑھنے لگی۔ انھوں نے پہلی عورت سے دریافت کیا

"تمھارے ساتھ تو مرد ہونگے۔؟"

عورت نے ہنس کر جواب دیا۔ "اور کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم تنہا ہیں!"

"تو اگلے اسٹیشن پر ان سے دریافت کرنا کہ جمال پور اس طرف ہے یا نہیں؟"

"دیکھو جو وہ آئے تو پوچھوں گی۔ تمھارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے کیا؟"

"نہیں! میں تنہا ہوں۔"

اس درجہ میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو بہت تعجب ہوا ان میں سے ایک نے کہا۔ "تمھارے گھر والے کیسے ہیں جو انھوں نے تمھیں تنہا بھیج دیا۔ واہ بھئی واہ!"

عورتوں نے کملا دیوی اور ان کے گھر والوں کا خوب مذاق اڑایا کملا دیوی بہت پریشان تھیں۔ یوں تو وہ انھیں گنوار سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں۔ لیکن انھیں یقین نہ تھا کہ وہ ٹھیک گاڑی پر جا رہی ہیں اس لئے انھیں ان عورتوں کا مذاق اڑانا بُرا معلوم ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں کُڑھی جا رہی تھیں۔ دو اسٹیشنوں کے بعد گاڑی پھر رکی۔ گاڑی رکتے ہی ایک صاحب زنانہ ڈبہ کے پاس آئے اور ایک عورت سے دریافت کیا "پانی وانی تو نہیں چاہئے؟"

اس عورت نے کہا۔ "پانی تو نہیں چاہئے لیکن یہ بتاؤ کہ یہ گاڑی جمال پور جائیگی؟"

اس مرد نے مسکرا کر کہا ــــ "کیوں تمھیں اس اسٹیشن سے کیا مطلب؟"

"مطلب ہے! ایک خاتون جا رہی ہیں۔"

"تو انھیں کہہ دو کہ وہ غلط گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ یہ گاڑی وہاں نہیں جاتی ــــ"

یہ سن کر لاکھ روکنے پر بھی کملا دیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ان کی حالت دیکھ کر عورتیں تسلّی دینے لگیں ایک نے کہا "تم کیسی تھیں جو تنہا چل پڑیں مجھ پر تو کیسی ہی آفت آجائے تنہا گھر سے پاؤں نہ نکالوں۔"

دوسری نے کہا "آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں جہاں ذرا انگریزی کے دو چار لفظ پڑھ لئے بس مردوں کے کان کاٹنے لگیں۔ اب کوئی بڑا اسٹیشن آئے تو تم وہاں اتر کر تار دیدینا۔ چھوٹے اسٹیشن پر مت اترنا۔"

بارہ بجے کے قریب مسٹر پاٹھک کو اپنی سسرال سے تار ملا "کملا دیوی اس گاڑی سے نہیں پہونچیں۔" مسٹر پاٹھک پہلے تو چکرائے پھر سوچا ــ "کملا کی گاڑی لیٹ پہنچی ہوگی اسی وجہ سے کیول میں گاڑی نہ ملی ہوگی۔" یہ سوچ کر انھوں نے تار دیا۔ "دوسری ٹرین دیکھ کر تار سے خبر دو۔" مسٹر پاٹھک بڑی بےچینی سے تار کا انتظار کر رہے تھے۔ تین بجے کے قریب کچہری میں انھیں دوسرا تار ملا۔ "کملا دیوی اس گاڑی سے بھی نہیں پہونچیں۔"

اب تو مسٹر پاٹھک کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سارا اپٹو ڈیٹ پن بھول گئے۔ انھیں اب خیال آیا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اپٹو ڈیٹ بنانے میں ضرورت سے زیادہ جلدی کی انھوں نے اسی وقت چھٹی کے لئے ارجنٹ درخواست دیکر چار دن کی چھٹی لی اور اسی رات کو کملا کی تلاش میں چل پڑے۔

رات کو تین بجے کملا لوٹ کر گیا پہونچیں۔ گھر پہونچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب ان کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ صبح کملا دیوی نے میکے تار دیا کہ میں غلط گاڑی میں بیٹھ جانے کی وجہ سے پٹنہ چلی گئی تھی اب گھر آگئی ہوں پتاجی کی خیریت سے مطلع کرو۔ انھیں جواب ملا "تمھارے پتاجی کا کل انتقال ہوگیا۔ تمھیں بہت یاد کرتے تھے۔" کملا تار پڑھ کر بہت روئی۔ پتا اسے یاد کرتے کرتے مر گئے۔ اور وہ ان سے آخری ملاقات بھی نہ کر سکی۔

دوسرے دن ڈپٹی صاحب لوٹ کر آئے جب انھیں معلوم ہوا کہ کملا واپس آگئی ہے تو ان کی جان میں جان آئی کملا سے ملاقات ہونے پر انھیں پورا واقعہ معلوم ہوا کملا نے کہا میں پٹنہ پہونچ کر اتر پڑی وہاں مجھ کو ٹکٹ کلکٹروں نے بہت پریشان کیا ان بدمعاشوں کی نیت خراب تھی وہ تو کہو میری قسمت اچھی تھی کہ ایک بوڑھا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر آنکلا اس نے مجھے روتے دیکھ کر واقعہ دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ غلطی سے یہاں آگئی ہوں۔ وہ بیچارہ بہت شریف نکلا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور اپنے کمرے میں بٹھائے رکھا یہاں تک کہ رات کو پٹنہ گیا کی گاڑی سے میں یہاں واپس آگئی خدا اسے خوش رکھے۔ وہ نہ آجاتا تو میری عصمت نہ بچتی۔" اتنا کہتے کہتے کملا دیوی رونے لگیں اور روتے روتے کہنے لگیں۔ "تمھاری ضد سے مجھے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی کہ میرا دل ہی جانتا ہے اور پتاجی سے بھی آخری ملاقات نہ کر سکی۔" مسٹر پاٹھک نے کہا۔ "تم ادھر کیوں چلی آئیں میکے کیوں نہ گئیں؟" "وہاں جاتی تو عورتیں طعنوں اور تشنوں سے میرا کلیجہ چھلنی کر دیتیں۔ وہاں جانے کی میری ہمت نہ ہوئی۔"

ڈپٹی صاحب منہ بنا کر بولے۔ "خیر جو ہوا وہ ہوا۔ خدا نے بچا لیا یہی غنیمت ہے ــــ واقعی میں نے بڑی حماقت کی جو تمھیں تنہا بھیجا۔ خیر آدمی ٹھوکر کھا کر ہی سیکھتا ہے۔"

نوائے مایوس

جناب مولٰنا اظہر صاحب امرتسری

پہلے تو تھا یہ عذر کہ پردہ اٹھا نہیں
اب دیکھنا ہے کچھ پس پردہ ہے یا نہیں

دیتے ہو اس غریب کو بیجا ہنسی کا طعن
کھا کر جگر پہ چوٹ جو رو بھی سکا نہیں!

مایوسیٔ دوام کی مجبوریاں نہ پوچھ
کہنا ہی پڑ گیا کہ ہمارا خدا نہیں

پھر گفتگوئے راز ہے نیچی نگہ کے ساتھ
شاید وہ جانتے ہیں میں رسوا ہوا نہیں

کیوں اے ادائے حسن تغافل ہے کس قدر؟
کیا واقعی میں جور کے قابل رہا نہیں

تیرے غرور سے تو میں عاجز نہیں، مگر
مجبور ہوں کہ اور کوئی آسرا نہیں

زاہد نے رات پی کے کہی کیا پتے کی بات
رندوں میں اہلِ صومعہ جیسی ریا نہیں

فطرت نے کس قدر مجھے مجبور کر دیا
جیتا ہوں اور جینے کے قابل رہا نہیں

تصویرِ دردِ دل تو ہے ظالم ہمارا اشک
مانا کہ اس میں نالۂ غم کی صدا نہیں،

مایوسیوں سے ہو کے جدا کر تو لی دعا
اب دیکھنا ہے یہ کہ خدا ہے بھی یا نہیں

اے حسن صرف بے ادبی کا ہے ڈر مجھے
ورنہ کوئی حجاب بھی ہے جو اٹھا نہیں

آئے ہیں سامنے مگر اس بیرخی کے ساتھ
جس طرح کوئی ان سے مرا مدعا نہیں

اظہر اگرچہ کفر ہے لیکن درست ہے
ہندوستاں میں اہلِ ہنر کا خدا نہیں

نپولین کا جنازہ

مترجمہ ہادی جعفری صاحب

صبح ساڑھے چھ ہی بجے سے میں بندوقوں اور توپوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب گھر سے باہر نکلا۔ راستوں پر ایک ایسا سکوت تھا جس کو دیکھ کر ایک اجنبی یہ خیال کر سکتا ہے کہ اس شہر میں انسان نہیں بلکہ روحیں بستی ہیں یا کسی زبردست فاتح نے یہاں کے تمام باشندوں کو قتل کر دیا ہے اور اس شہر کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ جو زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ

"من آفتابہ دارم"

تمام دوکانیں بند تھیں۔ راستوں پر کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بوڑھی عورت دکھائی دیتی تھی۔ آفتاب اپنے چہرے پر کہر کی چادر لئے ہوئے تھا۔ سڑک کی نالیوں میں برف جم گئی تھی۔ جب میں لوئی فلپ کے پل کے قریب پہونچا تو ایک کالا ابر میرے سر اور کپڑوں پر برف برساتے ہوئے گذر گیا۔ جب میں ناٹری ڈیم کے پاس پہنچا تو ایک چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ یہ کہ ہر روز کی طرح آج وہاں گھنٹہ نہیں بج رہا تھا۔

ریوسنٹ اینڈری ڈس آرٹس میں جلوس اور جنازے کی ہل چل اور شورش نمایاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہاں کسی خاص تقریب میں جمع ہوئے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک خاص تقریب تھی۔ ایک جلا وطن کا جنازہ شان و شوکت سے وطن میں داخل ہو رہا تھا۔ آج ایک عاشق فرانس کی لاش ہمیشہ کے لئے اپنے محبوب کی آغوش میں آرام کرنے کے لئے آ رہی تھی۔ ایک بچھڑا ہوا فرزند اپنی ماں کی گود میں ابدی نیند سونے کے لئے بے چین تھا۔ پھر کوئی عجب نہیں کہ یہ لوگ پیشوائی کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ تین غریب آدمی جن کا لباس پھٹا ہوا تھا اور جو غالباً بھوکے بھی تھے میرے سامنے شور و غل کرتے جاتے تھے ان میں ایک اچھلتا کودتا اور "خدا شہنشاہ کو سلامت رکھے" پکارتا ہوا جاتا تھا۔

فرانسیسی تاجروں کی نوجوان لڑکیاں نہایت ہی نفیس اور عمدہ پوشاک زیب تن کئے اپنے تو بہ شکن حسن کو غازہ و روغن سے دو چند کئے نوجوان لڑکوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے سڑکوں پر سے گذر رہی تھیں ان کو دیکھ کر دو گرم آنسو میری آنکھوں سے رخساروں پر بہنے لگے اور بے اختیار زبان سے نکلا۔

"آہ! مادر فرانس کیا یہی تیری وہ ہونہار اولاد ہے جن پر تو نازاں ہے۔ مسافروں سے بھری ہوئی کرایہ کی گاڑیاں نہایت تیزی سے میدان انولیدس کی طرف جا رہی تھیں۔ ریوڈ فور میں برف برس رہی تھی اور آسمان بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس سانحہ عظیم میں اظہار غم کر رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد برف باری رک گئی۔ ریو دی گرنیل اور یودی ایک کے درمیان روشنی کا ایک اہم خط نظر آ رہا تھا۔ میونسپل گارڈس نے یہاں اپنی گاڑیوں کو روک لیا۔ جب میں میدان انولیدس کے قریب پہونچا تو بہت سارے لوگوں کو لوٹتے دیکھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ شہنشاہ کا جنازہ جا چکا ہے اور یہ لوگ اپنے اپنے مکان کو واپس ہو رہے ہیں۔ مگر ایک شخص سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پولیس نے اس مجمع کو منتشر کر دیا ہے۔ میں نے اپنا ٹکٹ بتا کر دائیں جانب سے

پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو مجھے ہیبت اور دہشتناک آوازیں آنے لگیں۔ گویا کئی لوہار اپنے کام میں مصروف ہیں۔ دراصل تماشائی سردی کی تاب نہ لا کر اپنے پیروں کو پلیٹ فارم پر پٹک رہے تھے کہ خون میں روانی پیدا ہو عورتیں گرم اونی موزے پہنے اور اپنے چہروں کو پانٹ پروف کے ناچنے والی لڑکیوں کی طرح نقاب سے چھپائے کھڑی تھیں۔

چوراہے کو جس طرح چاہئے اس طرح سے آراستہ نہیں کیا گیا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے سنگ مرمر کے مجسمے نصب تھے درحقیقت وہ سنگ مرمر کے نہ تھے بلکہ انھیں اس طرح رنگا گیا تھا ان مجسموں میں ایک شہنشاہ کا مجسمہ بھی تھا اور ہر مجسمے کے درمیان ایک ستون تھا جس پر رنگین کپڑے لپٹے ہوئے تھے مجسموں کے پیچھے شاہی فوج تھی ان کے پیچھے پلیٹ فارم اور تماشائی تھے اور ہر پلیٹ فارم پر تقریباً سہ رنگی پھریرے لہرا رہے تھے۔ غالباً اس مقام کو اچھی طرح آراستہ کرنے کے لئے وقت نہیں ملا تھا۔

اب تقریباً نصف دن گذر چکا تھا۔

ہر پندرہ منٹ کے وقفے سے قلعہ کے قریب کی توپیں داغی جاتی تھیں۔ فرانسیسی سپاہی معمولی کپڑوں میں مگر ہاتھ میں برچھے لئے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

میرے سامنے جون آف یارک کا مجسمہ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک پام کی شاخ تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ آفتاب کی چمک سے جون آف یارک کی آنکھیں چندھیا رہی ہیں اور وہ اس ڈالی سے ان پر سایہ کر رہی ہے یہ ایک کمسن دوشیزہ تھی جس نے فرانس والوں میں ایک نئی روح پھونکی اور انھیں فاتح بنایا مگر اس محبِ وطن کا کیا انجام ہوا؟ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کے صفحے بھرے پڑے ہیں جس کا دل چاہے انھیں دیکھے مگر انصاف سے کہئے کہ کیا اس کے ساتھ یہ سلوک جائز تھا؟

کیا معمولی سی رقم کے لئے ایسے نازک اور حسین جسم کو نذرِ آتش کر دینا اس کی دلیل نہیں کہ انسان ایک خونخوار درندہ ہے۔ آرلینز کی دوشیزہ جانتی تھی کہ اپنی موت سے پہلے اپنا بچاؤ کرنا فضول ہے۔ مگر اس نے پھر ایسا کیوں کیا۔ صرف اس لئے کہ آنے والی نسلیں اس کی راست بازی اور سچائی سے آگاہ ہوں اور یہ جان لیں کہ تاریخ میں اس کا کیا درجہ ہے۔ ہاں! جون یہ انصاف کا دور لکھنے قابل ہے۔ تیری مظلومی اور بیکسی پر ہم آج خون کے آنسو روتے ہیں وہ آگ تجھے نہیں بلکہ تاریخ فرانس کو لگی تھی اور آج بھی اس کے مہیب شعلے دکھائی دے رہے ہیں اور نہ معلوم کس طرح فرانس والے اپنے اس گناہِ عظیم کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکیں گے۔

اس مجسمہ سے تھوڑی دور پر چند سپاہی آگ سلگا کر اپنے تئیں گرم کر رہے ہیں۔ فوجی باجے والے تھوڑے تھوڑے وقفے سے موسیقی شروع کرتے ہیں اور پھر مجمع میں غائب ہو جاتے ہیں غالباً وہ اس وقت کی نے کو موسیقی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چند کم عمر لڑکے ماتمی گیت اور جلوس کے حالات بیچ رہے ہیں۔ میں نے بھی دو خرید لئے۔ تمام مجمع کی آنکھیں بےچینی سے کوئے دی آرسے کی طرف لگی ہوئی تھیں جدھر سے جنازہ آنے والا تھا یکایک نیشنل گارڈس میں ایک حرکت ہوتی ہے اور ایک افسر گھوڑا دوڑاتا ہوا سڑک پر سے گذرتا ہے تمام سپاہی ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں انولیدس کے شرقی جانب فوجی سلامی دی جاتی ہے دھوئیں سے تمام فضا معمور ہو جاتی ہے جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سے بندوقیں نظر آ رہی تھیں اور سترھویں صدی کی دو توپیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اب ساڑھے بارہ بجے ہیں۔

میدان کے آخری حصہ میں دریا کے کنارے چند سوار نظر آتے ہیں جن کے شانوں پر نمدے لپٹے لٹکے ہیں غالباً وہ رسالہ سائیس کے سوار ہیں اور جلوس میں سب سے آگے وہی ہیں ان کے بعد بلدہ والوں کا دستہ ہے ان کے پیچھے برچھے والے ہیں آفتاب جو اب تک سحاب سے منڈھا ہوا تھا آہستہ آہستہ بےنقاب ہو رہا ہے۔

ایک شخص نیلا کوٹ پہنے نیچے سے ہمارے پلیٹ فارم پر چڑھ رہا ہے۔ زمین سے اونچا ہو گیا ہے خوف ہے کہ کہیں گر نہ جائے مجمع میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کی مدد کرے۔ ایک شخص دستانے پہنے بغور اس کی حالت کو دیکھ رہا ہے مگر خاموش ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھوں اور اس کی مدد کروں۔ مگر اس وقت تک ——— وہ اپنی منزل مقصود کو پہونچ چکا تھا۔

جلوس میں بہت سے جنرل اور مارشل شریک ہیں زرہ بکتر پوش اور قرابین والے سپاہیوں کے سینوں پر سورج چمک رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر سپاہی کے سینے پر ایک ستارہ جگمگا رہا ہے ان کے بعد تین فوجی درسگاہوں کے دستے ہیں۔ ان کے پیچھے توپخانے والے پیدل سپاہی ہیں چند اسلحہ جنگ سے بھری ہوئی فوجی گاڑیاں بھی ان کے ساتھ ہیں تھوڑی دور کے فاصلے پر کوئی چہار دہم کا مجسمہ حیرت و حسرت و یاس سے اس جلوس کی شان و شوکت کا تماشہ کر رہا ہے۔

سوار جب قریب آتے ہیں تو لوگ شور و غل مچانا اور ان کا مذاق اڑانا شروع کرتے ہیں۔ یہ مذاق میرے خیال میں جلوس کے رعب و دبدبہ کو کم کر رہا ہے۔ ایک کہتا ہے "بھئی اس موٹے کرنل کو تو دیکھو۔ تلوار بھی پکڑنی نہیں جانتا۔" دوسرا کہتا ہے "اجی وہ ہے کون؟" تیسرا جواب دیتا ہے "وہ مانٹیلوٹ ہے"۔

جلوس تھوڑے فاصلہ پر رکتا ہے پھر آگے بڑھتا ہے لوگوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ سینٹ پول کے گرجے کی ایک سیاہ گاڑی جس پر نقرئی کام کیا ہوا ہے آہستہ آہستہ جا رہی ہے اس میں ایک پادری سر جھکائے ہوئے نہایت ہی مغموم بیٹھا ہے۔ اس کے بعد سینٹ ہلینا کے کمیشن والوں کی دو گاڑیاں چار چار گھوڑوں کی ہے۔ یکایک تین سمتوں سے توپیں سر ہوتی ہیں پھر فوجی سلامی شروع ہوتی ہے۔ شہنشاہ کے جنازے کی گاڑی نظر آتی ہے اور مجمع پر ایک سکوت طاری ہوتا ہے۔ دور سے ایک سنہرا پہاڑ حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے یا ایک ستاروں کی خوج جو لہرا رہی ہے گاڑی کی چھت پر ایک سنہرا تاش ہے جو دھوپ سے چمک رہا ہے۔

گاڑی یکایک ایک مجسمے کے سامنے رک گئی یہ "مارشل نے" کا مجسمہ ہے تھوڑی دیر بعد گاڑی آگے بڑھتی ہے۔

اب ڈیڑھ بج چکا ہے۔

یلغت سامنے مارشل اور جنرل جنازے کے شامیانے کی ریشمی ڈوریاں تھامے ہوئے ہیں ان کے اطراف (۸۶) مختلف فوجی افسر اپنے اپنے رسالوں کے پھریرے لئے ہوئے ساتھ ہیں گویا مختلف رنگوں کا ایک سمندر ہے جو میدان میں لہریں مار رہا ہے یا رنگ برنگ کے پھولوں کا تختہ ہے جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا ہے۔ ان کے آگے ایک سفید گھوڑا ہے جس پر ایک سیاہ زین پڑی ہوئی ہے ایک شخص ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے اس کی لگام تھامے ہوئے ہے اور دو آدمی سبز لباس میں اس کے پیچھے ہیں۔ وہ شہنشاہ کا گھوڑا ہے تمام مجمع میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑتی ہے دس سال سے وہ ہر اس جنازہ کے ساتھ ہے جس میں حکومت حصہ لیتی ہے۔ اب اس کی پیٹھ پر بوناپارٹ کی وہ زین ہے جس کو اس نے میرانگو میں استعمال کی تھی۔ وہ قرمزی رنگ کی ہے اور اس کے اطراف سنہری فیتہ لگا ہوا ہے گھوڑے کے بعد پولی ٹیکنیک کے پانچسو نوجوان طالب علم گول جیکٹ چھوٹی ٹوپی پہنے کمر میں شمشیر اور پستول لگائے ساتھ ہیں ان کے بعد پرنس دی جوئن ولی گھوڑے پر ہیں جب جنازے کی گاڑی میرے سامنے پہونچی تو نہ معلوم کیوں رک گئی اب مجھے موقع ملا کہ اس کو اطمینان سے دیکھوں۔

بحیثیت مجموعی گاڑی تماشائیوں کو غیر معمولی طور پر متاثر نہیں کر رہی تھی وہ ایک بڑے صندوق کی طرح جس پر ملمع کیا گیا ہو چار پہیوں پر کھڑی کر دی گئی تھی اس پر ایک اودی شال پڑی ہوئی تھی جس پر شہد کی مکھیوں اور عقاب کی تصویریں تھیں جو وہ فتوحات کے نشانات ایک عقاب کی شکل میں اس پر بنائے گئے تھے یہ ایک بہت بڑا عیب تھا کیونکہ وہ نپولین کے جنازے کو پوشیدہ کر رہا تھا جس کی ہر آنکھ متلاشی تھی۔

اس فرضی تابوت پر شہنشاہ کا تاج تلوار اور لباس رکھا ہوا تھا میرے خیال میں نپولین کا جنازہ اس سے زیادہ شاندار ہونا چاہئے تھا یورپ کی قوموں سے چھینے ہوئے مختلف پھریرے گاڑی کے آگے اور پیچھے ہوا میں رقص کر رہے تھے گاڑی کا وزن مع جنازے کے چھبیس ہزار پونڈ تھا اور صرف جنازے کا وزن پانچ ہزار پونڈ تھا سولہ گھوڑے جن پر زرتار کپڑا تھا اور سفید پر لگے تھے گاڑی کو کھینچ رہے تھے بہت سے شاہی ملازم سر جھکائے گھوڑوں کے ساتھ تھے۔

گھوڑوں کے ساتھ سیدھی جانب دو مارشل ہیں ایک ڈیوک ڈگیلیں جن کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے دوسرے کونٹ بالیئر ہیں ڈاہنی جانب اڈمیرل بیرن دوپرے ہیں جو ایک نہایت ہی قوی اور مضبوط ملاح ہیں اور لفٹننٹ جنرل کاونٹ برٹرینڈ جو ایک وظیفہ خوار فوجی افسر ہیں یہ تمام لوگ سرخ لباس پہنے ہیں تماشائی جو اب تک پلیٹ فارم پر بیزار بیٹھے تھے اب بالکل خاموش ہیں مجمع پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ (ترجمہ از دکٹر ہیوگو)

آغاز و انجام

جناب نثار الملک میر احمدی اجمیری

سوز ہے ریڈیو میں یا نغمہ کسی کی ساز کا
چھائے جاتا ہے جو عالم پر فسوں آواز کا

لے اڑی مجھکو فلک تک میری پرواز خیال
جستجو نے ان کی سکھلایا چلن پرواز کا

کیوں نہ ہو پر لطف میرا قصۂ شیب و شباب
درس کچھ انجام کا ہے کچھ سبق آغاز کا

کہدیا ہنسکر یہ موجد نے "گراموفون" کے
قید کرنا کوئی مجھ سے سیکھ لے آواز کا

اہل کہدینا مری دانست میں نا اہل کو
مرتبہ دینا ہے گویا چیل کو شہباز کا

اک گناہِ سخت ہے اک جرم ہے اک عیب ہے
کھولنا عیبوں کا کہدینا کسی کے راز کا

وائے ناکامی بہت مشکل بہت دشوار ہے
ان کے کانوں تک پہنچنا میری پست آواز کا

کل وہ عالم تھا کہ تھا دل پر جہاں کے اقتدار
آج یہ حالت ہے دل بندہ ہے حرص و آز کا

میر کی بھی شاعری کا کچھ نرالا ڈھنگ ہے
شعر جو کہتا ہے کہتا ہے نئے انداز کا

محبت

ایک شکاری کی ڈائری کے تین ورق

از جمیل الرحمن صاحب کندیا پوری

مجھے شکار سے بے انتہا محبت ہے مگر جب کسی جانور کو خون میں لتھڑا پھڑپھڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری حرکت قلب ابھی ابھی بند ہو جائیگی۔

اس سال خزاں کے آخری دنوں میں سردیوں کا موسم یکلخت ہی شروع ہو گیا۔ میرے چچا زاد بھائی راول نے مجھ سے کہا "دیکھو بھائی کل صبح سویرے ہی میرے ساتھ شکار کو جھیل کی طرف چلنا میری خواہش ہے کہ چند بطخیں شکار کروں"۔

میرے بھائی تقریباً چالیس سال کے ایک خوش مذاق و قوی ہیکل آدمی تھے ان کا چہرہ بارعب تھا اور ڈاڑھی گھنی تھی۔ وہ گاؤں میں دریا کی وادی کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں ہمیشہ شاد و بشاش رہا کرتے تھے ان کے مکان کے دائیں اور بائیں جانب بہت دور تک چٹیل پہاڑیاں چلی گئی تھیں جن کے کنارے گھنے جنگل واقع تھے۔ یہ ایک نہایت ہی قدیم جنگل تھا جہاں کہ دیو قامت درخت ہاتھ پیر پھیلائے کھڑے تھے لوگوں کا خیال تھا کہ یہی فرانس کا نایاب اور بہترین شکارگاہ ہے۔ کبھی کبھی وہاں عقاب کا شکار بھی کیا جاتا تھا، اور طیور آوارہ جو ہمارے گنجان ملک میں شاذ و نادر ہی نظر آسکتے ہیں کبھی کبھی آکر اس وسیع جنگل کے شاہ بلوط کے درختوں پر بیٹھا کرتے اور اپنے پرانے مسکن کی یاد کو جو کبھی ان کا نشیمن بنا ہوا تھا تازہ کیا کرتے تھے۔

اس وادی میں بہت سے دلکش مرغزار تھے جو نہروں سے سیراب ہوتے تھے۔ ان کو سطح کا نشیب و فراز ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا تھا اور ندی کا پانی جو اس طرف آہستہ آہستہ بہتا تھا آگے چل کر ایک وسیع و عریض جھیل میں جا ملتا تھا۔ میرے بھائی اسی جھیل پر برابر فخر کیا کرتے اور ایک باغیچہ کی طرح اس کی حفاظت کیا کرتے تھے اور حقیقت تو یوں ہے کہ میں نے بھی آج تک اس سے عمدہ شکارگاہ کہیں نہیں دیکھی۔ سرکنڈوں کی گھنی قطار کے بیچوں بیچ جو ہمیشہ شور مچاتے اور لہلہاتے رہتے تھے میرے بھائی نے تنگ نہریں کھدوا رکھی تھیں جن کی ساکن سطح پر چوڑے پیندے والی کشتیاں جو بانسوں سے چلائی جاتی ہیں، آہستہ آہستہ تیرا کرتی ہیں۔ مرغابیاں اور مچھلیاں نہایت ہی دلکش انداز میں پانی کے اندر غوطہ لگاتیں اور آن واحد میں نظروں سے غائب ہو جاتیں۔

مجھے پانی سے بے انتہا رغبت ہے — سمندر! وسیع اور عریض سمندر — تلاطم خیز سمندر — ناقابل گرفت سمندر — ! دریا حسین و دلفریب دریا — جس کا پانی آتا ہے اور تیزی سے چلا جاتا ہے؟ اور ان سب سے زیادہ جھیل — جس کے پانی میں استوائی جانور چھپے رہتے ہیں۔ جھیل بذات خود ایک مختصر سی دنیا ہے — جس کے اندر جانور گھر بناتے ہیں — جس کے پاس سے مسافر گذر جاتے ہیں — جس میں عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں — اور سب سے بڑھ کر تو خود اس کا پراسرار وجود ہے۔

کبھی کبھی جھیل سے زیادہ حیرت انگیز و خشمناک اور دہشت خیز چیز کوئی بھی نہیں ہوتی۔ . . . لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تمام

خوف و ہراس ان پانی سے بھرے ہوئے میدانوں کے کس طرف سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا سرکنڈوں کی سرگوشیوں سے؟ کیا اس بھیانک سکوت سے جو رات کے وقت سنہ کے پتوں کو سفید کفن کی طرح ڈھانک لیتی ہیں یا موجوں کے نرم نرم تھپیڑوں سے جن کی آوازیں بعض وقت توپ یا برق کی آواز سے بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتی ہیں۔ جو جھیل کو ایک غیر حقیقی جگہ بنا دیتی ہیں ——— جو کہ صرف خواب میں ہی نظر آتی ہے ——— اور جس کے اندر کوئی خوفناک حقیقت مضمر ہوتی ہے۔

میں شام ہی کے وقت اپنے بھائی کے گھر پہنچ گیا۔ سردی اتنی شدت کی تھی کہ شاید پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔

وہ وسیع کمرہ جس کے اندر ہم کھانا کھا رہے تھے اس کی دیواریں چھت اور الماریاں، مُردہ چڑیوں سے اٹی پڑی تھیں جن کے کھالوں کے اندر بھوسا بھر کر انہیں میخوں کے ذریعہ لٹکا دیا گیا تھا۔ کچھ جانور اس طرح اپنے بازو پھیلائے ہوئے تھے جیسے یہ ابھی اڑا چاہتے ہوں۔ دنیا میں کوئی ایسی چڑیا نہ تھی جو وہاں موجود نہ ہو، عقاب، بگلے، ابابیلیں، مرغابیاں، شاہین، ٹلنکرے، گدھیں، غرض کہ سبھی قسم کے پرند وہاں موجود تھے۔ میرے بھائی سموردار کوٹ پہنے اس طرح بیٹھے تھے کہ خود بھی سرد ممالک کے کوئی عجیب و غریب جانور معلوم ہو رہے تھے۔ وہ مجھے ان تجاویز کو بتا رہے تھے جو انہوں نے شکار کی رات کے لئے سوچ رکھی تھیں۔ تجویز یہ تھی کہ ہمیں صبح ساڑھے تین ہی بجے روانہ ہو جانا چاہئے تاکہ شکار گاہ ساڑھے چار بجے تک پہنچ جائیں۔ وہاں میرے بھائی نے پہلے ہی سے برف کے تودوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تیار کرا رکھی تھی تاکہ صبح کی اس سرد ہوا سے جو طلوع آفتاب کے قبل تک نہایت ہی سرعت کے ساتھ چلتی ہے اس ہوا سے جو آرے کی طرح جسم کو چیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو جسم کو چاقو کی دہار کی طرح کاٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور جو بدن کو آگ کی طرح جلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ..... ہمیں کچھ پناہ مل سکے۔

میرے بھائی اپنے ہاتھ اچھی طرح ایک دوسرے سے مل کر کہنے لگے۔ "اُف اتنے غضب کی سردی تو میں نے آج تک اس سے قبل نہ دیکھی آج شام تو ٹمپریچر درجہ انجماد سے بھی بارہ درجے کم ہے"

کھانا کھا چکنے کے بعد میں فوراً ہی بستر پر دراز ہو گیا اور کمرے کے اندر چونکہ انگیٹھی کی آگ خوب روشن تھی۔ اس لئے مجھے فوراً ہی نیند آگئی۔ ٹھیک تین بجے مجھے جگایا گیا۔ میں نے بھیڑ کی کھال پہن لی۔ بھائی راول ریچھ کی کھال اوڑھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں قہوے کے گرم گرم دو پیالے چڑھا کر اوپر سے دو گلاس برانڈی پی گئے اور اپنے دربان اور دو کتوں پلانگن اور پیرو کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے۔

باہر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سردی میری ہڈیوں کے مغز تک سرایت کر رہی ہے۔ یہ ان راتوں میں سے ایک رات تھی جبکہ شدت برودت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا منجمد ہو کر رہ جائیگی اور ہوا کے سرد جھکڑ سے انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ عنقریب شل ہو کر وہیں کا وہیں رہ جائیگا۔

ٹھیک اسی قسم کی ہوا اس وقت انسانی جسم کو چیرتی پھاڑتی اس کا خون منجمد کرتی، درختوں، پودوں، کیڑوں، مکوڑوں اور ان چھوٹے پرندوں کو جو اس خوفناک سردی کی وجہ سے ٹہنیوں پر سے سخت و ساکن زمین پر گر رہے تھے بجلیاں گراتی چلی جاتی تھی۔

چاند جو اپنے آخری ربع میں تھا شفق کی نیلگوں سطح پر ایک فالج زدہ کی طرح، خاموش، زرد، بے نور اور کمزور کھڑا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سردی کی شدت نے اسے بھی ساکن و جامد بنا دیا ہے۔ وہ زمین پر زرد مدہم اور ماتمی روشنی ڈال رہا تھا۔ ٹھیک اسی قسم کی بے نور روشنی جو وہ ہر مہینہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ڈالا کرتا ہے۔

ہم دونوں پہلو بہ پہلو جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ اپنی پشت خم کئے اور بغلوں میں بندوقیں دبائے جا رہے تھے۔ ہمارے بوٹوں میں سے جو کہ اون کے نمدوں سے ڈھکے ہوئے تھے تاکہ منجمد دریا پر پیر پھسلنے سے ہمیں بچا سکیں کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی اور اس وقت ہمارے کتوں کے منہ سے جو سانس نکل رہی تھی وہ سفید دھوئیں سے مشابہت رکھتی تھی۔

ہم بہت جلد جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور وہاں ہم نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو اس جنگل کے اندر چلا گیا تھا۔

ہمارے کاندھے سبز پتوں کو چھو چھو کر ایک خاص قسم کی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی ایسی روح پرور آواز نہیں سنی جیسی کہ اس وقت ان پتوں کی

حبس ہونے سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس وقت زمین میں پر ہم چل رہے تھے کہر، برف، اور افتادہ پتوں کے نیچے دب جانے کے باعث بالکل مُردہ معلوم ہوتی تھی۔

ایک موڑ پر پہنچ کر میری نظر یکایک اس چھوٹی جھونپڑی پر پڑی جو ہمارے آرام کے لئے تیار کرائی گئی تھی۔ میں اس کے اندر داخل ہو گیا اور چونکہ جانور ابھی جاگے نہیں تھے اس لئے مجھے شکار کا ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔

میں نے اپنے جسم کو کمبل میں لپیٹ دیا تاکہ گرم ہو جاؤں پھر پیٹھ کے بل لیٹ کر چاند کے زوال پذیر چہرے کو غور سے دیکھنے لگے جس کے اندر اپنے خیال کے مطابق بہت سی شکلیں مجھے نظر آئیں لیکن جھیل کے منجمد پانی کی ٹھنڈک، دیواروں کی ٹھنڈک، فضا کی ٹھنڈک میرے اندر کچھ اس طرح سرایت کر رہی تھی کہ میں کانپنے لگا۔ میرے بھائی راولی نے مضطرب ہو کر کہا۔

"اگر ہم کچھ زیادہ شکار نہ بھی کر سکے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم کو کہیں سردی نہ ہو جائے۔ بہتر ہے کہ ہم انگیٹھی روشن کر لیں" یہ کہکر انھوں نے دربان کو حکم دیا کہ کچھ سرکنڈے لے آؤ"

ہم نے بہت جلد جھونپڑی کے درمیان سرکنڈوں کا انبار لگا دیا جھونپڑی کی چھت میں دھواں نکلنے کو ایک سوراخ بھی تھا۔ جب آتشیں شعلہ صاف و شفاف برفانی دیواروں کے درمیاں سے اٹھتا تھا تو ان کا عکس پگھلے ہوئے برف کے پانی کے اندر نہایت ہی حسن و خوبصورتی سے منعکس دکھائی دیتا تھا۔

میرے بھائی راولی جو باہر کھڑے تھے مجھے پکار کر کہنے لگے۔ "آؤ! ذرا ادھر تو دیکھو" میں باہر نکلا تو حیرت و استعجاب کے ہزاروں احساسات میں کھو گیا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ ہماری جھونپڑی ایک بہت بڑے شفاف ہیرے کی مانند معلوم ہو رہی تھی جس کا مرکز سُرخ آگ کی طرح تھا۔ اندر ہمارے کتوں کی صورتیں دکھائی دے رہی تھیں جو انگیٹھی کے پاس بیٹھے آگ سے اپنے جسم کو گرم کر رہے تھے۔

اس وقت اچانک ہمارے سروں پر ایک عجیب قسم کی وحشتناک آواز بلند ہوئی۔ یہ ایک پرندے کی آواز تھی جو خوشگوار ہوا کو چیرتا ہوا ہماری نظروں سے دور، زمستان کی ہولناک شعاع کے شفق پر نظر ہونے سے قبل اڑتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ صبح کے اس کہر آلود وقت میں اس اڑتے ہوئے پرندے کی آواز ساری دنیا کے غم و الم کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔

بھائی راولی بولے۔ "آگ بجھا دو، صبح ہوا چاہتی ہے"۔

اور درحقیقت آسمان پر ہلکی ہلکی مدہم روشنی پیدا ہونے لگی۔ جنگلی بطخیں بھگا ستارائی کرتی ہوئی۔ فضا میں سرعت کے ساتھ اڑتی ہوئی چشم زدن میں نظروں سے غایب ہو جاتی تھیں۔

اس وقت اس تاریک فضا میں یکایک ایک شعلہ سا نمودار ہوا۔ یہ بھائی راولی کا فیر تھا۔ ہمارے دونوں کتے بے تحاشا شکار کی طرف دوڑے اور پھر ہم یکے بعد دیگرے جب کبھی سرکنڈوں کے اوپر کوئی جانور یا اس کا سایہ نظر آ جاتا جلد جلد فائر کرنے لگے۔ ہمارے کتے ہانپتے کانپتے اور بیر دبائے انتہائی جوش و مسرت کے ساتھ ان خون آلود چڑیوں کو لے آئے جن کی آنکھیں ابھی ابھی ہم کو گھور رہی ہوتی تھیں۔

اب آفتاب نے جلوہ افگن ہو کر ساری کائنات پر نور کی چادر بچھا دیا۔ اس وقت ہم واپسی کا خیال کر رہے تھے کہ دو پرند گردنیں باہر نکالے پیر پھیلائے ہمارے سر پر سے بجلی کی طرح گذرے۔ میں نے گولی چلائی اور آن واحد میں ان میں سے ایک ہمارے پیروں پر آ گرا۔

یہ سفید چھاتی والی خوبصورت بطخ تھی۔ پھر اوپر آسمان پر سے کسی جانور کی آواز میرے کان میں آئی۔ یہ آواز جگر پاش، نوحہ خیز، آہ و فریاد سے بھری ہوئی دل ہلا دینے والی تھی۔

آہ! وہ چھوٹا سا پرندہ جو نشانہ سے بچ کر نکل گیا تھا، نیلگوں شفق پر ماتم کناں انداز میں چکر کاٹنے لگا۔ اور اپنے مردہ ساتھی کو جسے میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا مسرت آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بھائی راولی بندوق ہاتھ میں لے کر گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے اس چڑیا کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ وہ زد میں آئے تو فوراً گولی چلائیں۔ قدرے توقف کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا۔ "تم نے مادہ کو مار ڈالا ہے اب نر ہرگز نہیں جائیگا"۔ اور فی الحقیقت وہ اس جگہ سے نہ ہٹا۔ وہ برابر ہمارے سروں پر چکر کاٹتا اور چیختا رہا۔ اس وقت تک

کی آواز اس قدر جگر پاش تھی کہ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ کسی غمگین کیفیت ندا کی آواز نے مجھے کبھی اس قدر متاثر نہیں کیا جتنا اس بدبخت پرندے کی نوحہ خیز آواز نے کیا۔

اکثر وہ بندوق کے خوف سے دور بھاگ کر چلا جاتا تھا اور وہیں تنہا اڑنے لگتا تھا لیکن جب اس کے دل کا اضطراب بڑھ جاتا تو وہ اپنی مادہ کو دیکھنے کے لئے فوراً نیچے کا رخ کر لیتا تھا۔

بھائی راولی نے کہا "مادہ کو زمین پر چھوڑ دو۔ یہ فوراً زمین پر اتر کر ہماری زد میں آجائیگا" ......

...... پرندہ ہر خوف خطر سے بے پرواہ ہو کر اپنی رفیقہ کی محبت دل میں لئے زمین پر نیچے اتر آیا۔ بھائی راولی نے فوراً گولی چلائی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا گویا کوئی رسی تھی جس نے اس جانور کو تھام رکھا تھا اور وہ کٹ کر علیحدہ ہو گئی ہے میں نے کوئی سیاہ چیز اوپر سے آتی دیکھی جو سرکنڈوں میں ایک کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گر پڑی ہیرو فوراً دوڑ کر اسے میرے پاس اٹھا لایا۔

دونوں چڑیوں کے جسم میں موت کی سردی سرایت کر چکی تھی میں نے دونوں کو ایک ساتھ ہی اپنی شکاری تھیلی میں رکھ دیئے اور خود آج دوڑ پیرس روانہ ہو گیا۔

غزل

جناب باسطؔ صاحب بسوانی،

اُس شخص کے ایمان کا بھی کوئی یقیں ہے
جس کو یہ خیال آئے۔ "خدا ہے کہ نہیں ہے"!

بتخانہ میں وہ ہے نہ تو کعبہ میں مکیں ہے
دل خوب سمجھتا ہے۔ وہاں ہے نہ یہیں ہے

یوں درد سے خالی نہیں دل کا کوئی پہلو
جس جا پہ ترا ہاتھ ہے۔ اُس جا پہ نہیں ہے

کیا غم جو مرے سر پہ نہیں افسرِ شاہی
دنیائے محبت تو مرے زیرِ نگیں ہے

وہ مجھکو دکھاتے بھی نہیں گیسوئے پُرخم
اور یہ بھی کہے جاتے ہیں دل اس میں نہیں ہے

گو سیکڑوں سجدوں کے نشاں ہیں ترے در پر
سب سے جو الگ ہے وہ مرا نقشِ جبیں ہے

وہ دل کے طلبگار ہیں باسطؔ سرِ محفل
یہ جان کے اب دل مرے پہلو میں نہیں ہے

افلاس کی برکتیں!

جناب حسن عابد صاحب جعفری ایم اے آکسن بیرسٹرایٹ لا

۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ میں سڑک کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ہی ایک بوسیدہ دوکان کے اوپر ایک ٹوٹی ہوئی کھپریل تھی۔ جس کا میں کرایہ دار تھا۔ میری عمر بیس سال سے کچھ زائد ہوگی۔ صبح کا وقت تھا۔ لوگ صاف ستھرے لباس پہن کر گذر رہے تھے مگر میں قصداً اس بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ میرے دماغ میں چند خیالات تھے اور وہ اس طرح جاگزیں ہوگئے تھے کہ میں مجبور ہو کر سخت انہاک اور استغراق کے عالم میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا، میری جیب میں صرف پانچ آنہ پیسے تھے کوئی ایسا نظر نہ آتا تھا۔ جس سے میں چند آنے پیسے بھی قرض لیکر آئندہ کے واسطے کوئی تدبیر سوچتا، پانچ آنے پیسوں میں اتوار کو دونوں وقت اور پیر کے دن دوپہر تک کے کھانے کا انتظام کرنا بظاہر میرے امکان سے باہر تھا۔ پیر کے دن دوپہر بعد جب کہ میرے دفتر کے آدمیوں کو کھانا کھانے کی مہلت ملیگی، اس وقت ممکن ہے کہ کسی دوست سے کچھ روپیہ آئندہ ہفتہ تک کی ادائگی کے وعدہ پر دست گرداں مل جائے۔ اس خیال کو لے کر میں بنچ سے اٹھ کر اپنی کھپریل میں آگیا۔ وہاں صبح کی ڈاک رکھی ہوئی تھی ڈاک میں ایک سوداگر کا خط تھا۔

"مہربانی فرما کر آپ ہم کو ایک فہرست کے ذریعہ سے مطلع فرمادیں کہ آپ کی دولت کن کمپنیوں میں لگی ہی ہے تاکہ ہم آپ کو صحیح رائے دے سکیں کہ کن کمپنیوں کے حصے رکھنے کے قابل ہیں اور کون سے حصے قابل فروخت ہیں......"

ان الفاظ کو پڑھ کر میرے ہونٹوں پر طعن آمیز مسکراہٹ آگئی آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے سڑک پر ایک نہایت کریہ صورت ضعیفہ کھڑی تھی جو مجھ سے منت کر رہی تھی۔

"اے میاں خدا گواہ ہے میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے بھوک کے مارے جسم کانپ رہا ہے برائے خدا میری مدد کرو۔"

میں نے ہنسکر جواب دیا "مجھے بھی کل سے کھانے کو کچھ میسر نہیں آیا ہے ——"

اس جواب میں مطلق جھوٹ نہ تھا۔ لیکن بڑی بی کا مزاج برہم ہوگیا اور وہ بد دعائیں دیتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ ان کی بد دعاؤں نے ایسا اثر کیا کہ پانچ آنے جو میری جیب میں تھے رخصت ہوگئے۔ یعنی میں نے بڑی بی کو بلا کر وہ پانچ آنے ان کی نذر کر دیئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے واسطے سونے کے لئے کھپریل اور صبح اٹھ کر روزی کمانے کے واسطے روزگار موجود تھا۔ میری آمدنی بہت تھوڑی تھی اور اس کا بھی ایک جزو قرضہ کی ادائگی میں جاتا تھا۔ لیکن میری حمیت نے گوارہ نہ کیا کہ میں اپنے والدین سے امداد طلب کروں۔ یہ زمانہ جس کو عہد عسرت کہنا غلط نہ ہوگا میرے لئے خاص دلچسپیوں کا موجب تھا۔ میں متاہل نہ تھا۔ مجھ پر کسی قسم کی ذمہ داری نہ تھی اور اگر اس زندگی میں مجھے کئی برس صرف کرنے پڑے لیکن عسرت کے متعلق مجھ کو بعض عجیب و غریب مشاہدات میسر آئے اور بعض ایسے سبق حاصل ہوئے جو میری آئندہ زندگی کو درست کرنے میں کام آئے۔

میرا خیال ہے کہ سخت غربت، انسانی صفات کے اظہار کی کسوٹی ہے۔

زمانہ قدیم میں ماں باپ اپنے بچوں کو پانی میں ڈال دیتے تھے۔ بچے عموماً تیر کر کنارے پر آجاتے تھے اور اس طرح تیرنا سیکھ جاتے تھے مگر اس میں ایسے بھی ہوتے تھے جو پانی میں گر کر پھر نہ ابھرتے تھے۔

سخت افلاس ایسا دریا ہے جس کی گہرائی کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی ہے اس میں جو گرتے ہیں سب نہیں ابھرتے۔ کچھ ہاتھ پیر مار کر کنارے پر پہنچ جاتے ہیں لیکن میلا کیچڑ جو ایک مرتبہ ان کے جسم پر لگ جاتی ہے کبھی نہیں چھوٹتی مگر میرا خیال ہے کہ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو صفائی کے ساتھ تیر کر کنارے پر آجاتے ہیں۔ اُن کے جسم کی کثافت پانی میں دھل جاتی ہے۔ وہ زیادہ ہوشمند اور سمجھدار بن جاتے ہیں اور آئندہ کے خطروں سے مقابلہ کرنے کے لئے اچھی طرح مستعد رہتے ہیں۔

کیچڑ سے لتے ہوئے لوگوں میں صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو تمام عمر اپنے تلخ تجربات کے اثرات کو فراموش نہ کر سکے بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو دوسروں نے پانی سے کھینچ کر نکالا ہے اور جو تیرنے کی خفیف کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کی اعانت اور ان کے بھروسہ پر کنارے تک پہنچنے کی امیدیں کیا کرتے ہیں۔ یہی لوگ سخت خطرناک ہیں اور ایسے ہی لوگ اپنی ہستی کو ذلیل سے ذلیل تر اور ذلیل تر سے ذلیل ترین بنا ڈالتے ہیں۔

ایسے ہی غربت زدہ لوگ ملک میں تباہی اور بربادی پھیلاتے ہیں اور انہیں کی بدولت سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی ہے۔

دنیا کے مشہور متمول مسٹر جے پیر پوائنٹ مارگن کا قول ہے —
"آدمی اس لائق ہے کہ اس کی ایک مرتبہ مدد کی جائے۔ لیکن جس آدمی کو دوبارہ مدد کی ضرورت ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ اس کی کبھی مدد کی جائے۔" اس قول پر ذرا دیر توجہ سے غور کیجئے حقیقت میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

میں اس قول کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انسان زندگی کی سخت بلاؤں میں گرفتار ہو کر ایک مرتبہ مالی مشکلات میں اس طرح پھنس سکتا ہے کہ بغیر امداد کے ان مصائب سے اس کو نجات نہیں مل سکتی۔ لیکن جب وہ تکالیف سے بچ جاتا ہے تو اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے کاموں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ خواہ کیسی ہی بلاؤں کا سامنا ہو وہ آئندہ ان میں اپنے آپ کو مبتلا نہ ہونے دیگا۔ اس کے تلخ تجربہ کی یاد اس کو دوسرے بدنصیبوں کی امداد کے لئے ہر وقت آمادہ رکھے گی اور یہ سلسلہ دوستی تاقیامت جاری رہیگا۔ برخلاف اس کے ایسے بہت لوگ ہیں جو مالی مصیبتوں سے بچائے جانے کے بعد کہتے ہیں گزشتہ مصائب کا معاوضہ یہی ہے کہ آئندہ کا زمانہ ہنسی خوشی کے ساتھ گذاریں اور اس تکلیف دہ زمانہ کو فراموش کر دیں۔ اس کے علاوہ اب معلوم ہو گیا ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مشکل کے وقت ہمارے کام آسکیں گے۔

ایسا آدمی دوبارہ مالی مشکلات میں گرفتار ہونے کی تیاریاں کرتا ہے اور اس کو اخلاقی طور پر یقین رہتا ہے کہ ایک دن وہ پھر اسی مصیبت میں مبتلا ہو کر رہے گا۔ بقول مسٹر مارگن ایسا آدمی ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی کبھی مدد کی جائے۔

مجھے اپنے سخت افلاس کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس میں سخت خفت اٹھانی پڑی۔ ان دنوں میں چونکہ میری آمدنی بہت قلیل تھی اس لئے میں ایک ارزاں فروش نانبائی کی دوکان پر صبح کا کھانا کھاتا تھا۔ ایک دن میری موجودگی میں ایک شخص نے نانبائی کو کھانے کی قیمت ادا کرتے وقت دس روپے کے نوٹ کے روپے مانگے۔ نانبائی نے انکار کر دیا اور کہا کہ صبح کے وقت اس کے پاس ہمیشہ روپیہ کی کمی رہتی ہے لیکن کھانا کھانے والا دوسرے دن قیمت ادا کر دے تو مضائقہ نہیں، ایک ہفتہ کے بعد میرے ذہن میں یہ ترکیب آئی کہ بلا قیمت ادا کئے صبح کا کھانا وصول کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی نانبائی کے یہاں پہونچکر میں نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اور چلتے وقت میں نے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر نانبائی سے دریافت کیا۔ "تمہارے پاس بیس روپے کے نوٹ کے روپے ہیں؟"

میں سمجھ رہا تھا کہ جس کے پاس دس روپے نقد نہیں رہتے وہ بیس روپیہ کہاں سے دیگا؟ اسی لئے میں نے بنظر ہوشیاری بیس روپے کے نوٹ کا نام لیا تھا۔ نانبائی نے میری طرف غور سے دیکھ کر جواب نہ دیا میں نے اسی بے فکری کے انداز میں اپنے سوال کو دہرایا۔ "تمہارے پاس بیس روپے کے نوٹ کے روپے ہیں؟"

نانبائی نے جواب دیا۔ "ہاں، موجود ہیں۔"
میں نے کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس بیس روپے ہیں

لیکن مجھے یہ رقم دینے کی تم کو ضرورت نہ پڑیگی کیونکہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں ہے۔"

"ہوں" نانبائی نے کہا "میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمھاری جیب خالی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ میرے پاس بیس روپے موجود ہیں حالانکہ میرے پاس اتنے روپے اس وقت نہیں ہیں، خیر، اس وقت تو تم جاؤ آج کے کھانے کی قیمت پھر ادا کر دینا۔ لیکن آئندہ اس قسم کی حرکت کبھی نہ کرنا۔ تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ ایسی چالاکیاں کرو اور تمھارا راز تمھاری صورت سے عیاں ہو جائے۔"

میں گردن جھکا کر دوکان سے باہر نکل آیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی اس طرح کی چالاکی کرنے کی جرأت نہیں کرونگا۔ ایسی حرکتوں کے واسطے ذہانت اور ذکاوت کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو خدا کے فضل و کرم سے مجھ میں موجود نہ تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دن میرے ایک ملاقاتی تشریف لائے وہ اخباروں کے واسطے تصاویر بنا کر فروخت کیا کرتے تھے، مجھ سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ ان کی رفیق زندگی یعنی ان کی بیوی سخت علیل تھی اور ان کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ وہ نسخہ کی دوا خرید سکیں چنانچہ انھوں نے وہ نسخہ مجھے بھی دکھایا اور نہ صرف آبدیدہ ہو گئے بلکہ بے اختیار ہو کر رونے لگے۔ پکی عمر کے آدمی کی گریہ وزاری کا سماں بہت دلخراش ہوا کرتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنا پس انداز کردہ روپیہ جس کی مجموعی تعداد بیس تھی ان کے سامنے حاضر کر دیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے روپیہ جیب میں رکھ کر رخصت ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ ان حضرت نے وہی نسخہ دکھا کر اور آنسو بہا کر کئی آدمیوں سے اور بھی روپیہ وصول کیا تھا۔ اس قسم کے لاتعداد آدمیوں نے مجھے دھوکے دیئے اور ہر مرتبہ ان کے مصنوعی دردناک افسانوں کو سن کر میرا خون جوش میں آیا۔ لیکن اس قسم کے بداعمال لوگوں کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر صاحب حاجت امداد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انسانی فطرت سچی ہے اور انسانی ہمدردی آسانی سے جوش میں آجاتی ہے مگر پے در پے دھوکہ بازوں کا نشانہ بن کر اس میں احتیاط اور شک کا معاملہ پیدا ہو جاتا ہے اور مستحق لوگ بسا اوقات نامہربانی کے برتاؤ کو برداشت کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ دھوکہ باز لوگ ایماندار مستحقین امداد کے سخت حق تلفی کے مجرم ہوتے ہیں۔

میرے پاس بیشمار خطوط طلب امداد کے سلسلہ میں وصول ہوتے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں بعض خطوط بالکل سچ اور صحیح ہونگے مگر اب میں کسی پر اعتنا نہیں کرتا ہوں۔ میں تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ جو خطوط سب سے زیادہ دردناک ہوتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ مصنوعی اور جعلی ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اس دنیا میں جن لوگوں نے میری طرح دل کھول کر لوگوں کی امداد کی ہے ان سب کے قلب کی وہی کیفیت ہوگی جو میرے قلب کی کیفیت ہے۔

اسی ذیل میں ایک لطیفہ بیان کرنے کے قابل ہے۔ میرے شباب کے زمانہ میں ایک نوجوان شاعر سے یاد اللہ تھی، وہ غریب تھا اور بمشکل اپنے اشعار اور گیت اخباروں کو فروخت کر کے زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ یہ میاں بیوی ایک پنج منزلہ بوسیدہ مکان کی پانچویں منزل میں ایک کوٹھری میں رہا کرتے تھے۔ قرضہ کی کھینچ تان میں اکثر پریشان رہتے تھے۔ مگر تھے دونوں محنتی اور ذہین۔ لیکن تقدیر کبھی ان کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ پھر بھی اُن کی خوش مزاجی کا یہ حال تھا کہ ہنس کر کہا کرتے تھے "ہم اس مکان کی پانچویں منزل پر اس لئے رہتے ہیں کہ چھٹی منزل نہیں ہے۔"

اس پریشانی کی زندگی میں ایک اور بلا نازل ہوئی اور غریب شوہر بیمار ہو گیا۔ بیماری بھی متی جھرا بخار کی! میرا خیال ہے کہ یہ بیماری امیر لوگوں کے لئے موزوں ہے کئی ہفتے تک مریض صاحب فراش رہتا ہے اور اس کے بعد کئی ہفتے آرام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں اس بدنصیب کے پاس کیا تھا جو کچھ جوڑ توڑ کر کے بیوی نے جمع کیا تھا وہ سب میاں کی علالت میں خرچ ہو گیا اور کامل نو ہفتوں تک وہ پلنگ پر پڑا رہا۔ نوبت بایں جا رسید کہ قرض ملنے کی بھی کوئی امید باقی نہ رہی اس میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ شاعری کی سوجھتی۔ مگر بیمار ہونے سے قبل اس نے اپنا ایک گیت کسی اخبار میں بھیجا تھا۔ خیال آیا کہ وہاں چل کر مالک اخبار کی منت و سماجت کروں اور اسے چند روپیوں پر خریدنے کے لئے آمادہ کروں۔ مکان کے ایک ملازم سے روپیہ قرض لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر بمشکل تمام اخبار کے دفتر تک پہنچا اور مالک اخبار سے استدعا کی کہ وہ اس گیت کو خریدے۔ مالک اخبار خاموش رہا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں واپس آکر اس نے جواب دیا۔

"تمہارا گیت اخبار میں شایع ہو گیا تھا۔ نہایت مقبول ہوا آج کل ہر شخص کی زبان پر وہی گیت ہے۔ ہم جس قدر اس کی اشاعت کرتے ہیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے۔ میں تم کو صحیح طور پر اس وقت نہیں بتا سکتا ہوں کہ ہمارے ذمہ تمہارا کس قدر روپیہ ہے؟ لیکن میں تم کو علی الحساب چار ہزار روپیہ دے سکتا ہوں اور صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آئندہ چھ ماہ تک تم اس گیت کو کسی دوسری جگہ شایع نہ کرو۔"

غریب شاعر کو وہیں غش آگیا اور بمشکل تمام ہوش آیا اس میں اس نوید کے سننے کی طاقت نہ تھی۔ بہر کیف ہوش میں آکر اس نے چک کے بجائے نقد لینے پر اصرار کیا اور چھوٹے نوٹوں کو اپنے جیبوں میں ٹھونس ٹھانس کر گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گیا، جب دروازے پر پہونچا تو اس خیال سے کہ یہ واقعہ بیوی کے لئے شادی مرگ نہ بن جائے اس نے اپنے چہرہ کو پژمردہ بنا لیا اور گردن ٹیڑھی کر کے کمر جھکا کر ٹانگ گھسیٹ کر چلنے لگا، مقصد یہ تھا کہ خوشخبری کو رفتہ رفتہ بیوی کے کان تک پہونچاؤں گا۔ مگر دل کی حالت آنکھوں اور چہرے سے نہ چھپ سکی اور کچھ کہنے سے پہلے ہی بیوی نے ایک تیز نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالی اور آنکھوں میں آنسو لا کر چیخ اٹھی —

"بالکل جھوٹ ہے —— تمہیں کچھ نہیں ملا ہے۔ میرے خوش کرنے کو خوش خوش آرہے ہو۔"

یہ واقعہ تیس برس کا ہے۔ اس کے بعد بھی اس غریب پر مالی مشکلات آئیں مگر وہ کبھی محتاج نہ ہوا۔ اس نے اپنے اچھے دنوں میں اپنے بُرے دن کبھی فراموش نہ کئے اور جب کبھی بے روزگاری نے ستایا تو جمع کیا ہوا روپیہ اس کے کام آیا۔ آخر میں اس شخص نے بہت شہرت حاصل کی اور بہت روپیہ کمایا مگر تمام عمر اس نے سلامت روی کی چال رکھی اس کی فضول خرچی صرف یہ ہوتی تھی کہ وہ حاجتمند لوگوں کی امداد سے کبھی گریز نہ کرتا تھا۔

اب برخلاف اس کے ایک اور قصہ سنئے۔ یہ حضرت بھی میرے ملاقاتی تھے۔ عنفوان شباب میں انھوں نے شادی کر لی تھی اور تقدیر کی گردشوں سے سخت عاجز تھے۔ ایک مرتبہ بیوی کی انگوٹھی بیچ کر چند روز کھانا نصیب ہوا مگر پھر اچھے دن آگئے، اور ان کو ایک معقول ملازمت مل گئی، مگر تنگی اور تلخی کی یاد نے ان کے قلب پر ایسا اثر کیا کہ انھوں نے باوجود معقول آمدنی ہونے کے چاروں طرف سے قرض لینا شروع کر دیا۔ اور اس طرح بنک میں کئی ہزار روپیہ جمع کر لیا۔ معمولی ملاقاتیوں تک کو نہ چھوڑا اور کبھی کسی کا قرضہ ادا نہ کیا۔ اتفاق سے ان کو ایک تدبیر ہاتھ آگئی جس کے ذریعے انھوں نے بہت زیادہ روپیہ کمایا مگر جال میں خود پھنس گئے اور فریب ظاہر ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ خود غائب ہو گئے اور بیوی بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ گئے۔ آج تک نہ معلوم ہوا کہ ان کا حشر کیا ہوا؟

ایک دن میرے اخبار کے دفتر میں ایک صاحب تشریف لائے یہ واقعہ بھی ۱۹۱۶ء کا ہے ان کے پاس متعدد مضامین تھے بظاہر مہذب طبقے کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چل گیا کہ ان کے کپڑے بہت بوسیدہ تھے کئی جگہ سے مرمت ہو رہی تھی مگر ان کا طرز ایسا آزادانہ تھا اور صورت سے ایسی فارغ البالی نمایاں تھی کہ ان کی اصلی حالت کا اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔ اخبار کے اڈیٹر سے ان کی جو باتیں ہوئیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔

"میں بالکل مفلس ہوں اس زمانے میں مجھے کوئی کام نہیں ملا کہ گذشتہ چھ ہفتوں سے میں صرف تین آنہ روز پر اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں مجھے اپنے کمرے کا کرایہ کچھ ادا نہیں کرنا پڑتا ہے کیونکہ میں اپنے ایک دوست کے کمرے میں مقیم ہوں اور وہ سیاحت کے لئے گئے ہوئے ہیں اور کئی ماہ کے بعد واپس آئیں گے۔ صرف یہ سوٹ جو میرے بدن پر ہے میری ملکیت ہے باقی جس قدر کپڑے تھے رہن پڑے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں تین آنے روز پر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اور میں فاقہ کشی کی اذیت سے اب تک محفوظ ہوں۔ میرے پاس اس وقت چھ مضامین ہیں جن میں میں نے دکھایا ہے کہ میں اپنی زندگی کس طرح بسر کر رہا ہوں اور تین آنہ یومیہ میں کس طرح ارزاں ترین اور بہترین غذائیں کھا رہا ہوں۔"

اڈیٹر نے وہ مضامین پڑھے اور تحقیقات کی تو اس شخص کے بیان کی پوری تصدیق ہوئی اس نے وہ مضامین خرید لئے جو نہایت مقبول ہوئے اور بعد کو اخبار سے اس کا تعلق کر دیا۔ تین سال کے بعد پھر اس شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ بظاہر بہت خوش اور فارغ البال تھا۔ کہنے لگا کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک اصول بنا لیا ہے یعنی آمدنی کا دو تہائی حصہ وہ ہمیشہ جمع کرتا ہے۔ مجھے تعجب ہوا تو اس نے بیان کیا۔

"یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے تین آنہ یومیہ پر زندگی بسر کر لینے کے

بھاری سے زیادہ صرف کرنا فضول خرچی ہے۔ اب کبھی ایسا نہ ہوگا کہ میں کسی کا دست نگر بنوں، اس مرتبہ اگر تقدیر نے دغا کی تو میرے پاس اس کے مقابلہ کے لئے کافی نقد سرمایہ محفوظ ہے۔ میں اور زیادہ جمع کر سکتا ہوں۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسا مل جاتا ہے جس کی مالی امداد کرنی پڑتی ہے کیونکہ بعض لوگ ایسے مل جاتے ہیں جن کو بہت سے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے"۔

سخت افلاس کے متعلق انجیل میں ایک نہایت دلچسپ قصہ ہے، وہ سخت افلاس کے بدترین نتائج کو ظاہر کرتا ہے اور حقیقت میں وہ ایک نہایت زبردست تنبیہ ہے جس سے ہر انسان کو سبق لینا چاہئے۔ میں صرف اس قصہ کا مطلب بیان کرتا ہوں۔ ایک ملازم تھا جو اپنے آقا کا قرضدار تھا قرضہ کی ادائگی ناممکن تھی اور اس کی مقدار بھی بہت تھی۔ اس نے اپنے آقا سے منت کی کہ وہ اس کو جیل خانہ نہ بھیجے بلکہ اتنی مہلت دے کہ وہ کما کر اپنے قرضہ کو ادا کر سکے۔ نوکر کی گریہ وزاری پر آقا کو رحم آگیا اور اس نے قرضہ معاف کر دیا اور نوکر کو چھوڑ دیا۔ نوکر نے کسی زمانے میں ایک شخص کو کچھ روپیہ قرض دیا تھا، آزاد ہو کر اپنے قرض دار کے پاس پہونچا اور روپیہ طلب کیا۔ اس کے پاس روپیہ موجود نہ تھا منت وسماجت کرنے لگا اور ادائگی کے لئے مہلت مانگی، مگر نوکر نے ایک نہ سنی اور اس کو قرضہ کی علت میں قید کرا دیا۔ جب آقا کو یہ معلوم ہوا تو اس نے نوکر کو پکڑ لیا اور کہنے لگا: کم بخت تیری غربت دیکھ کر تو میں نے اپنا زر کثیر معاف کر دیا، اور تجھ سے تھوڑی سی رقم نہ چھوڑی گئی۔ اور تو نے اس غریب کو قید خانہ میں پہنچا دیا"۔ اب تیرا علاج میں کروں گا۔

چنانچہ اپنے قرضہ کی علت میں اس کو قید کرا دیا۔ بے شک یہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص مصیبت کے ایام میں دوسروں کی مہربانی اور سخاوت سے فائدہ اٹھا کر اچھی حالت پر پہونچکر اگر وہ دوسرے بدقسمت لوگوں کے ساتھ رحم وکرم کا برتاؤ نہیں کرتا تو اس کو دنیا میں کبھی چین اور آرام نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے اس قسم کی مثالیں بکثرت دیکھی ہیں۔ اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس معاملہ میں شک نہیں کر سکتا ہوں۔

جوانی میں غربت میں بھی ایک لطف ہوا کرتا ہے اور ہمت اور حمیت برسر کار آتی رہتی ہیں لیکن انحطاط قویٰ کے ساتھ عسرت کی زیادتی حقیقت میں تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بوڑھوں کی ہڈیاں ٹوٹ کر نہیں جڑتی ہیں۔ اسی طرح غربت اور افلاس جب ضعیفی میں آ دبوچتا ہے تو عموماً لا علاج ثابت ہوتا ہے؛ اور میرے خیال کے مطابق ایسے ہی لوگ امداد کے مستحق ہیں کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ غریب نہ

تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ اپنی زندگی بدل سکتے ہیں ایسے ہی لوگوں کو آنکھ بند کرکے دینے کی ضرورت ہے اور یہ امتیاز ترک کر دینا چاہئے کہ یہ امداد خلاف عقل ہے یا نہیں۔

وہ مفلس جو افلاس کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے نہ صرف مستحق مفلسوں کی حق تلفی کرتا ہے بلکہ اس مرض کو وبا کی طرح پھیلاتا ہے اس کی زندگی کا اثر اس کے بیوی اور بچوں پر پڑتا ہے اور اس کی ایمانداری اور سچائی پر زنگ لگ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کا بیٹا یہی خیال دماغ میں لے کر جوان ہوتا ہے کہ محنت سے روٹی کمانے کے بجائے بھیک مانگ کر بسر اوقات کرنے میں زیادہ سہولت ہے۔ ایسا جوان آدمی اگر محنت بھی کریگا تو جی توڑ کر نہ کریگا۔ کیونکہ کم بخت باپ کی مثال اس کے پیش نظر رہے گی اور وہ سمجھتا رہے گا کہ اگر محنت سے کچھ وصول نہ ہوا تو ایسے لوگ تو موجود ہیں جو اس کی امداد کر دینگے۔

ایک بڑے کارخانے کے منیجر نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے یہاں کام کرنے والوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ بتا سکتا ہوں کہ فلاں کا باپ حریص تھا اور فلاں کا باپ مفلوک رہتا تھا۔ یہاں کام کرنے والوں کا کام دیکھ کر میں رائے قائم کر لیتا ہوں کہ ان کی زندگی گھر پر کیسی گذری ہے اور اس کا اثر ان کی موجودہ زندگی پر کیسا پڑ رہا ہے سخت محنت اور نازک موقع پر فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کام کرنے والے کا دل کتنا ہے۔

جو بچے ماں باپ کو بھیک مانگتے۔ قرض ادھار کرتے۔ دھوکہ دیکر روپیہ حاصل کرنے کے منصوبے گانٹھتے اور قرض خواہوں سے بچنے کے نئے نئے عذر گڑھتے دیکھتے ہیں وہ جوان ہو کر کیونکر سچائی۔ جفاکشی اور ایمانداری کے اصول پر کاربند ہو سکیں گے؟

ایسے بچے بھی دنیا میں ہیں جنھوں نے اپنے والدین کو افلاس، فاقہ کشی اور گردشوں کا سخت وشدید مقابلہ کرتے اور ثابت قدم رہتے ہوئے دیکھا ہے اور گری ہوئی حالت سے بتدریج ترقی کرنے کے تمام مراحل اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں برے وقت سے بچنے کی کیا تدابیر اختیار کی تھیں۔ ایسے بچے مبارک ہیں اور یہی دنیا کے دنگل میں اپنا نام اچھالتے ہیں! میرا عقیدہ ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر ترکہ نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔

ایک قدیم ضرب المثل ہے "اس نے مجھے ایک مرتبہ دھوکہ دیا، لعنت ہو خدا کی اس کے اوپر، اس نے مجھے دوسری مرتبہ دھوکہ دیا لعنت ہو خدا کی میرے

اور پھر عقلمند آدمی صرف ایک مرتبہ دھوکے میں آتا ہے، دوسری مرتبہ اگر دھوکہ میں آجائے تو وہ سخت بیوقوف ہے۔"

میرے ساتھ بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ میں نے بمشکل تین ہزار روپیہ جمع کئے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس رقم کو جمع کرنے میں مجھے کیسی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کو ڈاکخانہ میں جمع کر دوں، مگر ایک فیاض منش دوست نے صلاح دی کہ ڈاکخانے صرف چار روپیہ سیکڑہ منافع ملے گا۔ حالانکہ وہ ایک ایسی کمپنی میں میرا روپیہ لگوا سکتے تھے جہاں بھوکے ہیں روپیہ سیکڑہ کا منافع ہوتا۔ کمپنی کے تمام حصص فروخت ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنے حصوں میں سے تین ہزار روپیہ کے حصے میرے حق میں منتقل کرنے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے وہ حصے میرے حق میں منتقل کر دیئے۔ اب تک وہ حصے میرے پاس موجود ہیں اور میں ان کو فی حصہ دو آنے پر فروخت کرنے کے لئے آمادہ ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ جو کم عقل ان کو خریدیگا وہ دو آنے بھی اپنی گرہ سے کھو دیگا۔ اس تلخ تجربہ نے میری آنکھیں کھول دیں اور آئندہ میرے ہزاروں بچ گئے۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی لالچ کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤنگا۔ تھوڑا منافع مگر اعتبار کا بنک، میرے لئے ایک شاہراہ ہے جس سے میں نے بھول کر بھی اپنا قدم نہیں ڈگمایا ہے اس واقعہ کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ اکثر لوگوں کو بہت جلد امیر بن جانے کی تمنا ہوتی ہے اور اندھے بن کر اپنا روپیہ اور کبھی کبھی بیوی کا زیور فروخت کر کے کل اثاثہ کسی کام میں لگا بیٹھتے ہیں اور بعد کو جب آنکھ کھلتی ہے تو گھر کا ستھراؤ نظر آتا ہے۔ جو کھیل انسان خود نہ کھیل سکے یا جس کو خود نہ سمجھ سکے اس میں روپیہ لگا دینا بدترین حماقت ہے۔

غربت اور افلاس کا ایک اور پہلو بھی قابل قدر ہے۔ افلاس کا جب میاں بیوی مل کر مقابلہ کریں تو مقصود جدوجہد بھی دینی ہوتی ہے۔ دونوں کا دماغ ایک مرکز پر ہوتا ہے۔ دونوں کی کوششیں ایک جانب ہوتی ہیں اور دونوں پر یکساں اثر پڑتا ہے۔ اس مصیبت میں دونوں کے قلب محبت و وفاشعاری کے پاک جذبات سے لبریز ہوتے ہیں اور دونوں مل کر جو محبت اور باہمی اعتبار کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ حقیقت میں خدا کی بہترین نعمت ہے جو بندوں پر نازل ہو سکتی ہے۔ غربت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ دو ہستیوں کو ایک بنا دیتی ہے اور ایمانداری اور وفاداری کی مضبوط زنجیروں میں دونوں کو تمام عمر کے لئے جکڑ دیتی ہے۔

دولت، بیکاری اور فرصت وہ بلائیں ہیں جو میاں کو بیوی سے اور بیوی کو میاں سے دور کھینچتی ہیں۔ یگانگت میں خود غرضی اور محبت میں تحکم پیدا کرتی ہیں۔

بیشک میاں بیوی کی محبت کے لئے طلائی رکابیوں سے زیادہ ساگ بھوک کا مجیٹریا ہے جب زندگی گذارنے کے لالے پڑتے ہیں اسی وقت گھر کی قدر ہوتی ہے اور جب ہی اس گھر میں دونوں میاں اور بیوی بادشاہ اور ملکہ بن کر رہ سکتے ہیں۔

مبارک ہیں وہ میاں بیوی جو عسرت اور غربت کی زندگی سے ابھر کر فارغ البالی اور خوشحالی کے مرتبہ تک پہنچے اور محبت و ایثار کی ایسی گتھی میں گتھ گئے کہ لطف اور راحت کی زندگیاں ان کے حصول میں آئیں۔

کاش میرے ہم وطن اس مضمون کو پڑھیں ۔۔۔ اور اپنی زندگی سنواریں۔

(اقتباس)

جذباتِ فضاؔ

(از جناب سیّد دل محمدؐ صاحب فضاؔ جالندھری)

پیدا ہو اگر جوششِ تمنا میں اثر آج !
خود حسن اُٹھا دے گا حجاباتِ نظر آج

ہے منتظرِ دید کوئی خستہ جگر آج
ممکن بھی نہیں ہو شبِ وعدہ کی سحر آج

آہ دلِ پُرجوش ہے مانوسِ اثر آج
رگ رگ سے ٹپکتا ہے مری خونِ جگر آج

دیکھا کچھ اِس انداز سے ظالم نے اِدھر آج
محسوس یہ ہوتا تھا کہ کھنچتا ہے جگر آج

پہلو میں چھپائے ہوئے ہنگامۂ محشر
تھک کر کوئی بیٹھا ہے سرِ راہگذر آج

دُنیا نہ اُلٹ جائے کہیں صبر و سکوں کی
اے دل یہ سمجھ لے تو اُٹھا پردۂ در آج

خاموش فضا ہو گئی دنیائے دنا کی !
دم توڑ رہا ہے کوئی مجروحِ نظر آج

آجائے نہ ڈھل کر کوئی قطرہ سرِ مژگاں
کھُل جائے بھرم دل کا نہ اے دیدۂ تر آج

کیا دیکھئے انجامِ دلِ زارِ فضاؔ ہو
آتا ہے عیادت کو کوئی شوخ نظر آج

مریخ کی حسین دوشیزہ

جناب ذوالفقار الحق صاحب بی اے

بہار کا موسم تھا۔ صباغ فلک ہمہ باغ عالم کو محو حیرت کر رہا تھا۔ میں دو منزلہ کی چھت پر لیٹا ہوا اپنے عزیز دوست مسٹر نیوٹن سے سائنس کی جدید حیرت انگیز ترقیات پر گفتگو کر رہا تھا۔ میری نظر ماہ کامل پر تھی۔ میں کہہ رہا تھا۔

"ڈیر نیوٹن! قدرت نے کیسے کیسے دماغ بنائے ہیں۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ تھوڑے دنوں بعد چاند کا سفر ایک گھنٹہ میں طے کیا جا سکیگا۔"

مسٹر نیوٹن بولے۔ "بہت ممکن ہے۔" انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "وہ دیکھو مریخ بھی ہم کو بلا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پچاس برس بعد ہم لوگوں میں سے بہت سے مریخ میں ٹہلتے ہوئے نظر آئیں گے بھئی۔۔۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "اپنی شریک زندگی میں تو مریخ کی کسی حسین دوشیزہ کو بناؤں گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مریخ کی حسین دوشیزہ کو۔۔۔۔۔"

اتنے میں خادم تار لیکر آئی۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

"کل دو بجکر ۳ منٹ پر میں مریخ جا رہا ہوں اگر تم اور نیوٹن چلنا چاہو تو وقت مقررہ سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جاؤ اپنا ٹیلسکوپ لیتے آنا۔"

جی۔ ایم
(بیسویں صدی کا مشہور سائنسدان)

الغرض ہم دونوں دوست الیکٹرک ٹرین سے مسٹر جی۔ ایم کے بنگلہ پر پہنچے۔ مغرب کا جادوگر اپنے مخصوص ہوائی جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔ اگر ایک منٹ بھی ہم لیٹ ہو جاتے تو مسٹر جی۔ ایم کب کے زمین سے میلوں اونچے ہو گئے ہوتے۔

غرض ٹھیک دو بجکر ۳ منٹ پر ہمارا ہوائی جہاز مع تین مسافروں کے روانہ ہوا دو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے بادلوں کو چیرتا ہوا۔ ہوا سے لڑتا ہوا۔ خلا میں سے گذرتا ہوا ہمارا روکٹ ایروپلین چلا جا رہا تھا۔ مشہور سائنسدان کی نظر مریخ پر تھی جو قریب آتا جا رہا تھا۔ دفعتہً ایک خوفناک آواز ہوئی میں اور مسٹر نیوٹن چونک پڑے۔

"گھبراؤ نہیں!" مسٹر جی ایم نے کہا۔ "اب ہم لوگ مریخ کی ہواؤں سے گذر رہے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔"

غرض ٹھیک ساڑھے تین بجے ہم لوگ مریخ کے ایک باغ میں اترے۔ اس باغ کے درخت نہایت خوبصورت تھے۔ ہماری دنیا کے کسی حصہ میں ایسے خوبصورت درخت نہیں پائے جاتے۔ یہاں کی ہوا میں ایک خاص بات تھی وہ یہ کہ جب کبھی ہم اپنے جسم کا کوئی عضو ہلاتے تو ایک خاص قسم کا سُریلا راگ پیدا ہوتا۔ پہلے تو ہم نہ سمجھ سکے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے مگر جب ہمارے مشہور سائنسدان نے بتلایا کہ یہاں کی ہوا کی یہ خاص صفت ہے تو ہماری سمجھ میں آیا۔ یہاں کی مٹی کا رنگ سفید تھا۔

ہم تینوں باغ میں ٹہل رہے تھے اور یہاں کی ہر چیز کو تعجب کی نظر سے دیکھ رہے تھے کہ یکایک توپ کی سی آواز ہوئی اور ہمارے سامنے کوئی بارہ فٹ اونچا قوی ہیکل انسان کھڑا ہوا دانت پیس رہا تھا۔ اپنی زبان میں وہ کچھ بولا تو ایسا معلوم ہوا گویا توپیں چل رہی ہیں۔ ہم نے اشارے سے کہا کہ ہم نہیں سمجھتے تو وہ دانت پیستا ہوا آگے بڑھا اور ہم تینوں کو اس پھرتی سے اپنی پیٹھ پر لاد لیا کہ بیان سے باہر ہے۔ چشم زدن میں ہم لوگ شہنشاہ مریخ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ نہ ہوگا۔ بڑا

شکل سے مسٹر جی۔ ایم نے اس کو سمجھایا کہ ہم لوگ دوسری دنیا کے باشندے ہیں۔ اس نے ہم کو اپنے محل کی سیر کرائی۔ ایسا خوبصورت محل ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ایسی خوبصورت عورتیں اس سے پہلے ہماری نظر سے کبھی نہ گذری تھیں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا قریب قریب ناممکن تھا۔

جب مسٹر جی ایم نے اپنا روکٹ ایروپلین اس ذی علم بادشاہ کو دکھایا تو وہ بہت خوش ہوا اور اشارے سے ہم کو سمجھایا کہ وہ ہماری دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

ہم نے جب مریخ کی اچھی طرح سیر کی تو معلوم ہوا کہ مریخ کی سائنس ہماری سائنس سے کہیں زیادہ ترقی پر ہے۔

نئے نئے قسم کے کھانے ہم نے کھائے۔ عجیب قسم کا شیریں پانی ہم نے پیا۔ طرح طرح کے باجے ہم نے دیکھے اور سنے۔ ہزاروں قسم کے نئے میوے ہم نے چکھے۔ نئی طرح کا ناچ ہم نے دیکھا اور ان کے علاوہ بہت سی تفریحات ہم نے کیں اگر تفصیل کے ساتھ ہر ایک تفریح کو بیان کیا جائے تو شاید ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

شہنشاہ مریخ ہمارے مشہور سائنسداں کے ساتھ ہماری دنیا کی سیر کرنے روانہ ہوئے۔ مسٹر جی۔ ایم۔ ہم سے وعدہ کر گئے کہ جلد واپس آئینگے۔ ان کی واپسی تک ہم لوگ (یعنی میں اور مسٹر نیوٹن) شاہی مہمان تھے۔

اب ہم دونوں ملکہ مریخ کے باغ میں ٹہل رہے تھے کہ سامنے حوض پر پریوں کا مجمع نظر آیا۔ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا اور قریب آ کر ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ پھر ہنس ہنس کر اپنی زبان میں گفتگو شروع کی۔ ہم بیوقوفوں کی طرح کھڑے ہوئے انھیں دیکھ رہے تھے۔ میری نظر حسن کی ملکہ پر پڑی۔ یہ کمسن لڑکی ان تمام حسین عورتوں سے زیادہ حسین تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا ٹکٹکی بندھ گئی اور پھر نہیں معلوم کیوں میں گھبرا ہوا اور رہا تھا کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

پھر مسٹر نیوٹن کی طرف میں نے دیکھا تو وہ حضرت بھی کھڑے ہوئے اسی حسن کی دیوی کو گھور رہے تھے۔ اب جو میری نظر اس ماہرو پر پڑی تو جی جل بھن کر کباب ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے دوست مسٹر نیوٹن کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ غصے سے میں کانپنے لگا اور کر میں نے مسٹر نیوٹن سے کہا۔

"دیکھو جی اگر تم نے میرے دل کی مالکہ پر نظر ڈالی تو آج سے دوستی کا خاتمہ ہے۔ پھر یاد رکھو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"۔

حقارت کی ہنسی ہنستے ہوئے مسٹر نیوٹن بولے۔ "دوستی کا خاتمہ؟ تم جیسے لاکھوں دوست اس دوشیزہ پر سے نثار۔ اور اگر تم سے برا کوئی نہ ہوگا تو یاد رکھو مجھ سے برا بھی کوئی نہ ہوگا۔ مریخ کی اس حسین دوشیزہ کو میں اپنی شریک زندگی بناؤں گا اور ضرور بناؤں گا۔ کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی"۔

ابھی مسٹر نیوٹن کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ اس شوخ چشم نے قریب آ کر میرے رقیب کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں کا دریا بہا رہی تھیں مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ پستول جیب سے نکالتے ہوئے میں نے مسٹر نیوٹن سے کہا۔ "مریخ کی حسین دوشیزہ میری ہے"۔

"خاموش رہو" ڈپٹ کر میرے رقیب نے کہا۔ "خاموش رہو ورنہ زبان کاٹ لی جائیگی"۔

"زبان پھر کاٹنا" پستول کو جنبش دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "پہلے اپنی جان کی خیر مناؤ"۔ یہ کہہ کر میں نے لبلبی دبا دی۔

ایک سریلی آواز کے ساتھ مسٹر نیوٹن زمین پر آ رہے۔ گھور کر حسن کی دیوی نے مجھ کو دیکھا اور مسٹر نیوٹن سے چمٹ گئی۔ مسٹر نیوٹن پڑے دم توڑ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہوئے ہنس کر میں نے کہا۔

کہئے مسٹر نیوٹن مریخ کی حسین دوشیزہ کس کی ہے؟ میری یا آپ کی؟

میری طرف دیکھ کر روتے ہوئے مسٹر نیوٹن نے کہا۔ "دوست ایک لڑکی کے پیچھے تم نے میری جان لی۔ افسوس مجھے تم سے یہ امید تھی۔ خیر میں نے تمھیں معاف کیا۔ خدا بھی تمھیں معاف کرے۔ مریخ کی حسین دوشیزہ تم کو مبارک رہے اچھا پیارے دوست خدا حافظ"۔ ایک ہچکی آئی اور مسٹر نیوٹن کی روح پرواز کر گئی۔

"افسوس میں نے کیا کیا؟" میں اپنے دوست کی نعش سے چمٹا ہوا کہہ رہا تھا۔ پستول کو غصہ میں آ کر میں نے پھینک دیا۔ اس پری زاد نے اٹھا لیا اور مجھے گھورتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ پستول کی نال اپنی طرف دیکھ کر

میں کانپنے لگا تھا "اے مریخ کی حسین دوشیزہ کیا کرتی ہو؟" میرے منہ سے نکلا۔

میں اور کچھ کہتا مگر ایک خوفناک آواز کے ساتھ گولی میرے سینہ میں لگی۔ تڑپ کر میں نے کہا "آہ مار ڈالا۔ مریخ کی حسین دوشیزہ نے مار ڈالا"

آنکھ جو کھلی تو اپنے آپ کو منزلہ کی چھت پر لیٹا ہوا پایا۔ سیارہ مریخ کوسوں دور آسمان پر چمک رہا تھا۔ مسٹر نوٹن میرے قریب بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"ہیں تم چونک کیوں پڑے؟ کیا سو گئے تھے؟ اور یہ کیا کہہ رہے ہو مریخ کی حسین دوشیزہ نے مار ڈالا"

اب تک میری زبان پر یہی الفاظ تھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے کہا "دوست! تم تو مر گئے تھے۔ میں نے تمہیں مار ڈالا تھا"

"پاگل تو نہیں ہو۔" ہنستے ہوئے مسٹر نوٹن نے کہا —— "خواب دیکھا ہوگا —— !"

کلامِ نوابؔ!

مسٹر ایم۔ آر۔ نوابؔ دہلوی

آپ جب پہلو میں ہوں پھر درد کا کیا کام ہے — مضطرب دل کو بس اب آرام ہی آرام ہے

مرگِ عاشق کا قضا کے سر عبث الزام ہے — جو کہ ہے آرامِ جاں یہ بھی اُسی کا کام ہے

سینہ ہم تانے ہوئے ہیں تم لگاؤ تیغِ ناز — یہ ہمارا کام ہے اور وہ تمھارا کام ہے

میت اُٹھتی ہے یہ کس مقتولِ تیغِ ناز کی — چشمِ تر قاتل بھی ہے اور ہر طرف کہرام ہے

میرے اظہارِ تمنا پر نہیں ہے اور نہ ہاں — یہ پہیلی بوجھنا بھی ایک مشکل کام ہے

میکدے میں چشمِ ساقی کی کرامت دیکھئے — رقص میں ہر رند ہے گردش میں اک جام ہے

غیر سے جو مل چکی وہ آنکھ ہم سے کیوں ملے — ہم نہیں پینے کے اس سے یہ تو جوٹھا جام ہے

کھینچکر شوقِ شہادت لے تو آیا ہے ہمیں — دستِ نازک سے اٹھے تلوار مشکل کام ہے

آپ ہیں یا میں ہوں اس جا اور تو کوئی نہیں — دل چرایا کس نے پھر کہئے یہ کس کا کام ہے

رہ سکے تو یہ سلامت ساقیا! ممکن نہیں — ہر نشیلی آنکھ تیری غیرتِ صد جام ہے

خاک سے پیدا ہوئے اور خاک ہی میں مل گئے — خاک ہی آغاز تھا اور خاک ہی انجام ہے

آنکھ اس سے ملتے ہی نوآب یہ کیا ہو گیا؟ — ہوش کھو بیٹھے ابھی سے یہ تو پہلا جام ہے

عالمگیر بکڈپو کی چند قابل دید کتابیں!

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار۔ نہایت ہی پرمذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور منافقہ طرز بیان کے ساتھ لندن کے جگمگاتے گھروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک اور قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائیں گے بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت ایک روپیہ محصول ۵ر

خطوط کی ستم ظریفی مصنفہ معروف ظرافت مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ہنسانے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کی مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے فوراً طلب فرمائیے قیمت ۱۲ار

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب تھے آپ نے تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا۔ کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب بتقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوگئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس پانچسو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپئے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف عہ علاوہ محصول ڈاک میں ملے گی۔ (عہ)

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے معالی حالات خود ملا صاحب کے فاؤنٹن پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے حجم ۲۰۰ صفحے قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے عہ

صبح لطافت ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابل دید مجموعہ۔ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے عہ

نوٹ۔ ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنے (عہ) علاوہ محصول ڈاک میں ملیگی۔

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا تخت در ۲ ار حجم ۳۰۰ صفحات | **مجموعہ قیروان** ۱ار حجم ۲۰۰ صفحات

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے کتاب کی دلچسپی کے لئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے آج سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ

عالمگیر بکڈپو لاہور (بازار سید مٹھا)

"Alamgir Book Depot"
Bazar Said Mitha
Lahore

مقصوراتِ غربی

جناب مولنا وکیل احمد صاحب حافظ غازی پوری

فارگوسن جسے بجا طور پر مورخ تعمیرات ہونے کا مرتبہ حاصل ہے لکھتا ہے۔ کہ

"بادشاہوں کے محل زیادہ تر رجحان عامہ کا آئینہ ہوتے ہیں یعنی ان کی تعمیر ہمیشہ رائج الوقت ذوق تعمیر کی تحت میں ہوا کرتی ہے"

اس کا یہ خیال محض اضطراری ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ان حقائق ومشاہدات پر ہے جن کا تعلق تعمیری تجربات سے ہے لیکن یہ قول پوری طرح ان محلوں پر صادق نہیں آتا جو قدیم زمانوں میں تعمیر ہوئے تھے بلکہ ان کا تعلق صرف ان محلوں سے ہے جو ایسے زمانہ میں تعمیر ہوئے جب انسان میں "دفاع" کا خیال کم اور آرام وتعیش کا لحاظ زیادہ پیدا ہو چکا تھا ورنہ تاریخ تعمیر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صدیوں تک بادشاہوں کے قصر قلعوں کا کام دیا کرتے تھے اور آرام و آسائش کی بجائے ان کی تعمیر میں دفاع وحفاظت کا خیال زیادہ رکھا جاتا تھا یونان میں تیران اور مسینا کے تمام قصور اسی خیال کی تحت میں تعمیر کئے گئے تھے۔

عہد قدیم کے تمام محلوں میں کریٹ کا وہ محل جو تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح تعمیر ہوا تھا ایسا تھا جسے دفاعی قصر قلعہ کے بجائے آرام وآسائش کا قصر وقلعہ کہہ سکتے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کریٹ چونکہ ایک جزیرہ تھا اس لئے ان کی حفاظت کے لئے سمندر کا وسیع دامن کافی تھا۔ اور چونکہ اہل کریٹ کو یہ معلوم تھا کہ اگر وہ سمندر میں ناکام رہے تو پھر مضبوط سے مضبوط قلعہ ان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس واسطے ان کی توجہ کبھی "دفاعی تعمیرات" کی طرف نہ گئی۔ بلکہ انھوں نے آرام وآسائش نمائش وحسن کا خیال زیادہ رکھا اسی وجہ سے مورخوں کا خیال ہے کہ کریٹ کے حکمرانوں کے قصور کے مقابلہ میں مصری شاہوں کے محل تنگ وتاریک بھدے اور لچر تھے کیونکہ اہل کریٹ کے قصر کی وسعت موجودہ زمانے کے قصر بکنگھم سے کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے شاہان مصر کے قصر کم وسعت میں تعمیر ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ مصریوں کے محل میں صرف دفاعی یا دینی پہلو نمایاں ہوتا تھا اور اہل کریٹ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "دفاع" کا اتنا خیال نہ کرتے تھے دینی پہلو ان کے یہاں بھی نمایاں ہوتا تھا چنانچہ شاہ نوسس کے قصر کے چار حصے تھے۔ پہلے میں تخت شاہی رہتا تھا اور دیوان خاص کے وسیع کمرے تھے۔ دوسرے میں خاندان شاہی کے بود وباش کے لئے تمام آسائش وآرام کے کمرے باغ۔ چشمے۔ حوض۔ حمام وغیرہ تھے۔ کمروں کی دیواروں پر نقش ونگار رکھتے اور باغ وغیرہ اپنے تمام لوازم سے مکمل۔ تیسرا حصہ رسدخانہ کے لئے وقف ہوتا تھا۔ اور یہ اس قدر وسیع ہوتا تھا کہ اس میں بازار لگا کرتے تھے تاکہ قصر شاہی کے بسنے والے اپنی ضروریات کی چیزیں باآسانی خرید سکیں چوتھا حصہ ان مکانوں پر مشتمل ہوتا تھا جس میں مصور۔ نقاش۔ کمہار۔ روغن ساز وغیرہ رہتے تھے۔

ان چار حصوں کے علاوہ ایک وسیع جگہ ایسی بھی تھی جو تماشے کے لئے کام آتی تھی اس میں وہ اکھاڑہ بھی تھا جس میں بیلوں کی لڑائی اور پہلوانوں کی کشتی ہوا کرتی تھی۔ اہل کریٹ یوں تو مصوری ونقاشی میں طاق تھے مگر ان کا وہ علم جس کا تعلق چاہ وچشمہ، نہر وحوض سے تھا۔ کسی طرح کم نہ تھا۔ قصر مذکور میں چشمہ وحوض کے ساتھ ساتھ پوشیدہ نہریں بھی ہیں جن کو دیکھ کر چار ہزار برس کے بعد بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح دور موجودہ کی نہروں سے کم نہیں ہیں۔ برسات کے موسم میں اب بھی ان نہروں سے پانی بلا روک رواں رہتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت واقعات کے بعد یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آخر مصریوں کے قصر کیوں کریٹ والوں کے محلوں کے مقابلہ میں نہ تھے باوجود اس کے کہ اہل مصر فہم و فراست علم و ہنر میں بہت ترقی یافتہ تھے۔ اس کی وجہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ فراعنہ مصر کے قصر "قصر" ہونے کے بجائے "عبادت گاہ" کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ وہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ "خدا" بھی ہوتے تھے اس لئے ضروری اور لازمی تھا کہ قصر کی شان و شوکت باندازہ "معبد" ہو۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فراعنہ مصر کے رہنے سہنے کے محل زیادہ تر صدر دروازہ قصر کے بعد ہی ہوتے تھے۔ انکی صد معابد کے لئے وقف ہوتا تھا اس لئے قدرتی طور پر جگہ کی کمی کے ساتھ عمارت تنگ و تاریک ہوتی تھی۔

لیکن یہ صورت ہمیشہ نہ رہ سکی بلکہ مابعد زمانہ میں فراعنہ مصر نے دولت و حشمت کی نمائش میں قدیم طریقہ تعمیر کو بدل دیا تھا۔ محلوں میں دیوان خاص و عام تعمیر کئے گئے جن کے وسط میں تقریباً ۱۵ فٹ بلند کوشک کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ اس کوشک پر شاہ وقت بیٹھ کر مقدمات کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ احاطہ قصر میں شاہی بیگمات کے واسطے خوبصورت محل بنائے جانے لگے مصنوعی جھیل، پائیں باغ اور چشمہ و حوض کو بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔

ان کے علاوہ حدود محل میں خزانہ یا بیت المال کے لئے ایک جگہ الگ کر دی گئی اسلحے اور دیگر لوازمات کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ مکانات بنائے جانے لگے حتیٰ کہ امنوفس رابع کے زمانے میں (جو تیرھویں صدی قبل مسیح کا ایک مذہبی پیشوا مانا گیا ہے اور جس کو اخناطون بھی کہتے ہیں) دیوان خاص کی پشت پر ڈائننگ ہال (Dinning hall) بیت المطالعہ کے بنانے کا بھی رواج ہو گیا اور سب سے آخر میں رسد گاہ اور شاہی خلوت خانہ ہوتا تھا جس میں بادشاہ کا چپرکھٹ ہوتا تھا۔ خلوتخانہ زیادہ تر سادہ ہوتا تھا کیونکہ اس سادگی میں بادشاہ کا وہ کردار پوشیدہ رہتا تھا جس کا تعلق "خدائی" سے ہے۔

فراعنہ مصر ہی پر الزام نہیں ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں "دعویٰ کبریائی" کرتے تھے بلکہ قدیم زمانہ میں تقریباً ہر بادشاہ اگر خدا نہیں تو اپنے کو عام انسانوں سے بلند و برتر ضرور جانتا تھا اور مرتے ہی پرامڈ کے سلسلہ میں خدا مشہور ہو جاتا تھا چنانچہ بابل و نینوا کے شاہوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بادشاہ بھی تھے اور خدا بھی:-

بخت نصر سارگن (Saargan) وغیرہ کی بادشاہی اور خدائی مشہور ہے۔ آخرالذکر نے فرات کے کنارے پر خورساباد میں ایک بہت وسیع قصر بنوایا تھا جس میں ساٹھ کمرے تھے اور جس کی دیوار دور دور تک ہے۔ ہاتھی دانت پیتل اور سونے چاندی کے پتر چڑھے ہوئے تھے۔ طرز تعمیر بالکل اہل کریٹ کے محلوں کی سی تھی فرق صرف اس قدر تھا کہ کمروں کا رخ شمال کی طرف تھا تاکہ سورج کی شعاع سے پناہ رہے اس کے علاوہ علیٰحدہ تہ خانے بھی بنائے گئے تھے جس میں پہونچکر انسان گرم موسم کو بھول جاتا تھا۔ تمام عمارتوں میں روغن دار اینٹیں لگائی گئی تھیں تمام محل کے کمروں میں مصوری، نقاشی اور نفاست کی انتہا تھی۔ نشست و برخواست کی تمام اشیاء بے حد نفیس تھیں ان میں سے بعض اب تک عجائب خانہ برطانیہ میں موجود ہیں۔

اہل فارس میں دارا ایسا بادشاہ گذرا ہے جس کو تعمیرات کا سب سے زیادہ شوق تھا۔ اس نے کرناک کے معبد کے ساتھ ساتھ پرسی پولس نامی (Persepolis) مشہور زمانہ قصر بنوایا تھا اس کی لمبائی [illegible] گز تھی اور چوڑائی ۹۹ گز تھی۔ اس کے دیوان خاص میں ایک سو صفیں تھیں اور ہر صف میں سو ستون تھے جو اوپر کی چھت کو اٹھائے ہوئے تھے۔ مورخوں کی متفقہ رائے ہے کہ انفرادی حیثیت سے یہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت تھی سکندر اعظم نے اس کو جلا دیا تھا شی یرز (Xerxes) نے اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن وہ نقش و نگار کی قدیم خوبیاں کہاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

خسرو نے بھی (المتوفی [illegible] ب م) ایک زبردست محل بنوایا تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کہیں کھلنے اور بند ہونے کا دروازہ نہ تھا بایں ہمہ کمروں کی خصوصیت پردہ داری مکمل تھی۔

اہل روما کا تعمیری ذوق بہت بلند تھا۔ جولیس سیزر کے بھتیجے آگسٹس نے تعمیر کی ابتدا کی اور مابعد بادشاہوں نے اس کی تقلید کی۔ ان کے تمام محلوں میں سنگ مرمر کا استعمال زیادہ ہوا۔ تیاتر اور تمثیل خانے الگ کتب خانے۔ غلام گردشوں کو زیادہ جگہ ملنے لگی۔ صرف ہارڈین ویلا کے نام سے جو قصر مشہور ہے وہ سات میل تک پھیلا ہوا تھا۔ جس میں ایک بہت بڑا کمرہ سرود و نغمہ، رقص و مئے کشی کے لئے مخصوص تھا۔ دو تیاتر خانے تھے ایک گھوڑ دوڑ کا میدان تھا اور ایک وسیع جھیل تھی۔

اہل روما کے دور وسطیٰ میں محلوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی ڈاجز اور پوپ روما کے محل اب تک اس کے شاہد ہیں۔ آج بھی ان کو

سورج کی روشنی میں بغیر خیرگی دیکھنا دشوار ہے۔

انگلستان میں محلوں کی تعمیر کا شوق ٹیوڈر (Tudor) خاندان کو تھا ان کے بعد تو گویا یہ ذوق قالب بے جان ہو کر رہ گیا سینٹ جیمس کا محل حسن تعمیر کے لحاظ سے قابل وقعت ہے لیکن قصر بکنگھم کے متعلق اہل نظر کی رائے ہے کہ یہ یورپ بھر میں سب سے زیادہ بدصورت محل ہے۔

اہل فرانس کو بھی محلوں کا شوق تھا لیکن یہ شوق سولہویں اور سترہویں صدی میں پیدا ہوا اس سے پہلے کا کوئی محل قابل تذکرہ نہیں ہے۔ مابعد کے محلوں میں چیمبرڈ لوری اور فانٹین بلو خاص طور پر قابل وقعت ہیں لیکن ان میں نمائش کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم کمرے اپنے اختصار کے باوجود آرام دہ اور لطیف ہیں۔

حافظ غازی پوری

غزل

حضرت تمنائی!

۱
بحرِ الفت میں دل فنا ہو جا
یہ حقیقت میں زندگانی ہے

۲
جورِ گردوں سے تنگ آ کے مجھے
اپنی دنیا الگ بنانی ہے

۳
دل لگا کے ہو مفت کیوں حیراں
کہ سراسر جہان فانی ہے،

۴
اس سے ڈرتا ہے تو ارے ناداں
موت تمہیدِ زندگانی ہے،

۵
درد دل میں کسک ہے سینے میں
یہی الفت کی کیا نشانی ہے؟

۶
حالِ دل آہ کہہ نہیں سکتا!
ہائے کیسی یہ بے زبانی ہے

۷
کیا سنو گے مرا فسانۂ زیست
درد و غم سے بھری کہانی ہے

۸
آنکھوں آنکھوں میں لے لیا دل کو
ہائے کیسی یہ میہمانی ہے،

۹
آرزو نکلی اے تمنائی!
ان کی بزم اور مری کہانی ہے

سرابِ الفت

از جناب خورشید احمد صاحب جامی

مزارِ حسرت و ارماں ہیں کتنے ان فسانوں میں
بہت عبرت کی باتیں ہیں مری ان فسانوں میں

بمبئی - ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء

پیاری رشیدہ ....

آج دو سال کی طویل مدت کے بعد تم کو خط لکھ رہی ہوں خط کیا ہے؟ میری تلخ و ناکام آرزو زندگی کی ٹریجڈی ہے۔ حیات کی الناکیوں سے بھری ہوئی غمناک اور افسردہ، اسکول کی معصوم زندگی، شوخیوں، شرارتوں اور خوش فعلیوں کا مجموعہ۔ اب بھی یاد ہے۔ مگر ایک مٹے ہوئے خواب کی طرح خوشگوار، روشن اور تبسم کی کیف زائیوں سے معمور حیات کی دسترس سے باہر رشیدہ! تمہارے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کے بعد اطمینان کی زندگی گذار رہی ہو۔ بامحبت شوہر۔ اولاد۔ خانگی راحت اس کے سوا دنیا میں اور کون سی جنت ہے۔ غیر اپنا اپنا مقدر ہے۔ تم ہمیشہ سے خوش نصیب رہی ہو۔ کبھی اوقات بعید میں جب شوہر کی آغوشِ محبت اور زندگی کی مصروفیتوں سے فرصت ہو تو اس کم نصیب سہیلی کو بھی یاد کر لیا کرنا جو کبھی تم سے محبت کرتی تھی اور شاید اب بھی ...... میں آج تم سے اپنی داستانِ محبت بیان کرنا چاہتی ہوں۔ محض اس لئے کہ تم میری زندگی کے ہر راز سے آگاہ ہو.... سن لو میری اولیں داستانِ محبت اور آخری قصۂ الفت ...."

تاریخ یاد نہیں، ایک رات جب میں ساحل اپالو پر سیر کر رہی تھی چودھویں رات کا چاند اپنی تمام جلوہ سامانیوں سے خاکدانِ دہر کو بوسے دے رہا تھا۔ فضا کلیتہً چاندنی کے آغوش میں تھی۔ سمندر کی لامتناہی وسعتوں کا جاہ و جلال خداوندانہ تمکنت کے ساتھ غیض و غضب کے طوفان اٹھا رہا تھا۔ دور سمندر کے کلیجے پر تیرنے والے جہازوں کی مدھم روشنی اڑتے ہوئے جگنو کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ملاحوں کے درد میں ڈوبے ہوئے گیت دلوں کی رگوں کو چھیڑتے ہوئے جذبات والہانہ کی دنیا کو بیدار کر رہے تھے۔ فضا میں ایک اضمحلال تھا۔ مسرت بخش دماغ پر ایک خمار تھا حقیقت افروز۔ میں بنچ پر بیٹھی ہوئی نیم وا آنکھوں سے سمندر کی لامحدود پنہائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ زمین کا حقیر کرّہ قدرت کی لاانتہا وسعتوں میں ایک حقیر ترین ذرہ سے بھی زیادہ بے مقدار ہے۔ رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ مہتاب کی کرنیں تبسم کے تفریحی پھول سروں پر نثار کر رہی تھیں۔ بیشتر روحیں خواب کی سنہری دیوی کے آغوش راحت سے ہمکنار تھیں۔ میرا مکان چونکہ ساحل سے قریب ہی تھا اس لئے جانے کی چنداں عجلت نہ تھی۔ اس کے علاوہ بھی میرا دل اور اس کی رگ رگ فطرت کی حسن پاشیوں میں کھو جانے کے لئے بیتاب تھے۔ آنکھوں میں ایک پرکیف دھند چھانے لگی تھی کہ یکایک ترنم کی ایک لوچدار آواز سے کائنات کا ذرہ ذرہ رقص کرنے لگا۔

موسیقی کی دلدوز تانوں نے مجھے بے خود بنا دیا میری نگاہیں تھرتھرا کر اٹھیں۔ کوئی گا رہا تھا۔ دھیمے سُروں میں فردوسی چشموں سے پھوٹنے والے نغمے سماعت کو بوسے دے دیکر روح کی عمیق گہرائیوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ مجھ سے قریب بہت قریب ایک حسین چہرہ چاندنی کے تبسم سے زیادہ خوشگوار مردانہ شباب کی مکمل رنگینیوں کے ساتھ روشن تھا۔ کتنا لوچ تھا اس کے نغموں میں۔ کتنی قیامتیں تھیں اس کے مسکرانے میں۔ وہ جھک گیا۔ مجھ کو دیکھنے کے لئے۔ روح کو لرزا دینے والی نگاہوں سے۔ نغموں کا سیلاب تھم گیا میں نے شرمندگی سے آنکھیں جھکا لیں۔ میں جانا چاہتی تھی مگر نہ جا سکی۔ تھا اس نے برباد کر دینے والے لہجہ میں کہا۔

"فیروزہ" اس کا گلا رک گیا۔ ہجوم جذبات سے اس ایک لفظ میں

کتنے معنی پوشیدہ تھے۔ میری روح کا ہر ذرہ محبت کی خوشیں نظر پا کر گناہ پر جبین نیاز و بندگی جھکانے لگا۔ اس نے پھر کہا۔

"فیروزہ! تم جانا چاہتی ہو، کیا اس لئے کہ میری میت تمہیں گوارہ نہیں ضرور یہی بات ہے۔ مگر تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ دو لفظ کہہ دو نفرت ہی کے سہی تاکہ مجھے معلوم ہو جائے۔ سنتی ہو؟"

اس نے مجھے وحشیانہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں مجھے معلوم ہو جائے کہ دنیا کے اسٹیج پر میری زندگی کا المناک تماشہ ختم ہو چکا ہے۔ فیروزہ! میں تم کو پوجتا ہوں۔ محبت گناہ ہے۔ جرم ہے۔ تو مجھے اقرار ہے کہ میں مجرم ہوں مگر غیر ارادی طور پر میں نے تمہاری جھلک دیکھی۔ آج سے دو ہفتے پیشتر تمہارے اپنے مکان پر اور اسی وقت اپنا تمام متاع حیات تمہارے قدموں پر نثار کر چکا میری زندگی کا گوشہ گوشہ محبت کے انوار سے جگمگانے لگا اور میں لذت پرستاری میں محو ہو گیا۔ تمہارے حصول کی آرزو نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ میں مفلس ہوں قلاش ہوں اس سے بھی زیادہ بے کس و بے نوا ہوں اس وسیع دنیا میں ایک دل بھی ایسا نہیں ہے جسے میری حیات و موت سے دلچسپی ہو۔ یہ سب کچھ ہے مگر میں محبت کر سکتا ہوں اور اپنی جان کا آخری ذرہ تمہاری ایک ادائے تبسم پر نثار کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے میری آرزو غلط قدم اٹھا رہی ہو مگر ....." وہ رک گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کی سسکیوں کی آواز میرے سینے میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اتر رہی تھی۔

"سہراب!" میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "اٹھو اپنی حالت کو سنبھالو تم مجھے برباد کر دوگے۔ آہ! اپنی نگینیوں سے کس لئے میری تلخیوں کو بڑھا رہے ہو۔ تم حسین ہو، نوجوان ہو، دنیا میں اپنی جگہ آپ بنا لوگے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ سہراب! مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔؟"

اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں ایک خفیف مسکراہٹ اداس اور غمگین اس کے لبوں پر تھی۔ رشیدہ! تم نے دیکھا ہے تاریک رات میں بجلیوں کا چمکنا یا ابر آلود آسمان پر شفق کی رنگین ملاحتیں قوس قزح کی دلکشا لہروں میں ڈوبی ہوئی۔ یہی حال تھا سہراب کے تبسم کا اس محبت کے احمریں شراب میں ڈوبے ہوئے تبسم کا جس کا تصور آج بھی میری زندگی کی بہترین یادگار ہے وہ بے خود تھا نشۂ محبت سے۔ جذبات سے دیوانہ ہو کر اٹھا اور ایک غیر ارادی عاجزی سے میرے قدموں میں دوزانو ہو گیا۔

"آہ! فیروزہ تمہارے ہمدردی کے الفاظ نے پھر مجھے زندہ کر دیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اب مجھے مرتے ہوئے بھی یہ اطمینان حاصل رہیگا کہ کم از کم ایک دل ایسا ہے جو میری سوگواریوں کو یاد کر لیگا۔ میری محبت آخر بے اثر نہ تھی اس سے کوئی کچھ تم بھی متاثر ہو تمہاری آنکھیں بتلا رہی ہیں۔ فیروزہ یقین جانو اتنی بے پناہ محبت جتنی میں تم سے کرتا ہوں شاید ہی کسی نے پردہ کائنات پر کبھی کی ہو۔ فیروزہ تم میری معبود ہو۔"

اس کے پر جوش کلمات سن کر میرا ضبط جاتا رہا۔ میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے سہراب کو سہارا دیکر اٹھایا۔ میرا سر اس کے مضبوط شانوں پر جھک گیا۔ میرے تنفس سے اس کا تنفس آمیز ہو گیا۔ یہ محبت کی ایک جنت تھی۔ دنیائے دنی کی تلخ حقیقتوں سے دور دو روحوں کے اتصال باہمی کی نہائی ہوئی۔ مئے احمر کے چھلکتے ہوئے بلوریں ساغر سے دلکش۔ شمیم سحر کے جلوہ سے زیادہ حسین۔ جہاں شعریت تھی اور موسیقی۔ جہاں ترنم تھا اور کیف زائیاں ..... ایک طویل بوسے میں ہمارے لب پیوست ہو گئے آہ! یہ تھا محبتوں کا اقرار ادلیں ..... پیاری رشیدہ! تم نے عورت کے فلسفہ حیات اور اس کے دل کی گہرائیوں پر عمیق نظریں ڈالی ہوتیں تو سمجھ لیتیں کہ عورت کا خمیر سوز محبت سے ہوا ہے جس پر فطری شرم و حیا کا گہرا نقاب پڑا ہوا ہے۔ یہ نقاب اٹھ جانے کے بعد محبت کی کمزوریوں میں بہ جانا عورت کی عین فطرت ہے۔ آہ عورت جس کی تمام نسائی لطافتیں استعارہ ہیں کمزوریوں کا جس کی تمام حیات تعبیر ہے محبت سے۔ ایک دفعہ محبت سے واقف ہونے کے بعد عورت حجاب شرم کو دھجیاں کرکے یکسر محبت ہو جاتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ سہراب پندرہ روز پیشتر میرے والد کے پاس آیا تھا تلاش معاش میں۔ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ حسین تھا۔ پر شباب تھا۔ وہ ملازم ہو گیا میرے والد کے فرم میں کلرک کی حیثیت سے اس کے خاموش متین چہرہ میں ایک قسم کی کشش تھی۔ دلوں کو مسخر کرنے والی۔ میری پہلی ملاقات والد کے پرائیویٹ روم میں ہوئی تھی۔ جب خادمہ کے ذریعہ والد نے مجھے بلوایا تھا ایک نجی کام کے لئے۔ رات کے نو بجے ہونگے۔ میں نے رنگین ریشمی پردے کو اٹھایا جو دروازے پر پڑا ہوا تھا اور پہلی نظر سہراب پر پڑی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اور دعوت فدا کی دے رہا تھا ــــ آہ وہ کتنا حسین تھا اور پیار کرنے کے قابل .....

والدہ نے رسمی تشفی کے طور پر کہا۔ یہ میری لڑکی ہے۔ فیروزہ "
اس نے ایک مستانہ نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی میرے قرار و شکیب کو برباد کر گیا
آہ وہ نظریں کیا کبھی بھولی جا سکتی ہیں جنہوں نے مجھے پہلے پہل درس محبت
دیا تھا اور میرے دل کے تاریک مخفی گوشوں کو التہاب آرزو سے منور کر
دیا تھا۔ میں فراق کی تلخیاں اٹھاتی رہی تمناؤں کا لہو چکھتی رہی مگر چپ تھی
اظہار محبت سے قاصر، کمزور اور بے بس۔ چند رسمی ملاقاتیں ہوئیں مگر جب والد نے
میری شادی کا انتظام کیا اپنے بھتیجے جمشید کے ساتھ اور عنقریب میں زبردستی
قبر سے زیادہ تاریک اور بھیانک زندگی سے ہمکنار کر دی جانے والی تھی اور میری تمام
تمناؤں کو سوگوار جوانی میں دفن کر دیا جانے والا تھا میں بیتاب ہو گئی والد جیسے
بے حس ضدی کاروباری آدمی سے التجائیں لاحاصل تھیں۔ دنیا میرے لئے جہنم بنتی
جا رہی تھی اور میں محسوس کر رہی تھی کہ سہراب بھی کچھ کھویا ہوا سا رہتا ہے۔ اور
اس کے بعد جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے کہ ساحل بحر پر اتفاقی ملاقات ہوئی سہراب
نے اپنی پرجوش محبت کے نذرانے پیش کئے تو میں بھول گئی اپنی حیات کی
تمام جراحتوں کو اور ضبط کرنے کے ناقابل ہو گئی۔ محبت نام ہے بے خودی کا اور یہی

کمزور راز ہے عورت کی حیات معاشقہ کا ......،

(۲)

میری شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ میں نے کئی ایک لاحاصل کوششیں
کیں مگر والد سخت گیر اور مصر تھے۔ جمشید نے کئی ایک تحفے بھی بھجوائے تھے تحفے
مسموم میری زندگی کے خون سے سینچے ہوئے۔ میں راتوں میں پہروں پڑی
روتی تھی۔ آنسو امنڈ امنڈ کر بہتے اور تکیوں میں جذب ہو جاتے۔ میری مسرتوں
کی طرح بہتے اور جذب ہو جانے ہمیشہ کیلئے زندگی کا ہر گذرنے والا لمحہ مجھے مجروح
و دل شکستہ کر کے گذر جاتا۔ سہراب سے میں عمداً کترانے لگی جس قدر ممکن تھا اس
کے سامنے سے گریز کر جاتی۔ مگر میرا تصور ہر وقت اس کے نقش پا پر سجدہ ریز
رہتا۔ میں روتی اس کو یاد کر کے میں تڑپتی اس کی غمگینیوں کا خیال کر کے۔
مگر بے سود، حقیقت کی تلخیاں تخیل سے نہیں بھلائی جا سکتیں۔
شادی کو تین دن باقی تھے۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی خوشی
کے راگ گائے جا رہے تھے اور میری روح غم کی تاریک وادیوں میں دل شکستگی
کے کانٹوں سے الجھی ہوئی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ فضا مایوس اور گرم تھی

تمام دن اپنے کمرے میں پڑے رہنے سے دم گھٹتا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ شام کے وقت میں باغ میں چہل قدمی کرنے اور گریہ مسلسل کی وجہ سے جو دوران سر تھا اس کو سکون پذیر کرنے نکل آئی۔ شام کی تاریکیاں بڑھ رہی تھیں درختوں کے گھنے لمبے سایوں پر موت کا سناٹا چھا رہا تھا۔ چھوٹے نازک۔ سبک سیر طیور رنگین پروں کو پھیلائے ہوئے خلائے بسیط کو طے کر رہے تھے۔ ان کے میٹھے راگ فطرت کی حسین دیوی کو خواب کے نغمے سنا رہے تھے۔ شام افسردہ تھی سوگوار افسردہ۔ دور۔ سمندر کی لہروں کی آہنگ دار آواز میری حیات ناکام کا ماتم کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ افق کے نیلگوں کنارے پر چاند نکل رہا تھا غم میں ڈوبا ہوا۔ ابر کے ہلکے اڑتے ہوئے ٹکڑے فلک کی رنگین وسعت میں شکستہ کشتی کی طرح بہتے جا رہے تھے۔ میرے افسردہ خیالات کا سلسلہ بہت دور ماضی کی عشرت سے لبریز ساعتوں تک پہونچا ہوا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر بہت نرمی اور ملائمت سے ہاتھ رکھدیا۔ یہ سہراب تھا۔ میری آنکھوں سے سیلاب غم پھوٹ نکلا۔

"فیروزہ!" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "تم روتی ہو، خدا کے لئے دیکھو مجھے دیکھو! للہ میرے عزم کو کمزور نہ کرو۔ سنو آج میں نے تمھارے والد سے شادی کی درخواست کی تھی بہت التجا اور آہ وزاری کے ساتھ مگر انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ حقارت سے گستاخیوں کا الزام لگایا۔ اب ایک طریقہ ہے تم کو فتح کرنے کا صرف ایک فیروزہ تم میرے ساتھ چلو۔ ابھی اسی وقت جس طرح بھی ہو سکے ہم بہت دور چلے جائینگے۔ انسانیت کے مدعی درندوں سے دور آبادی سے باہر سنسان ویرانیوں میں جہاں تمھاری محبت میری دنیا ہوگی اور تمھارا تبسم میری جنت۔"

"بس بس سہراب!" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "تم کس لئے ہمت ہار رہے ہو؟ میں تمھاری ہوں، میری روح تک تمھاری ہے انتظار کرو سہراب میں والد کو چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟ سوچو وہ دل شکستہ ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے خودکشی بھی کرلیں۔ خدا کے لئے اتنے مایوس نہ ہو۔ مجھے دیکھو میں عورت ہوں ایک کمزور حوصلہ رکھنے والی۔ اب جاؤ۔ میں کل اسی وقت یہاں ملونگی۔"

"ٹھہرو ــــ تھوڑی دیر ــــ" سہراب نے مجھے ہلکے سے پکڑتے ہوئے کہا اور کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے گرم تشکریں ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملے ہوئے رگ ہستی میں لذت رنگین پیدا کر رہے تھے چاند مسکرا رہا تھا۔ گلاب کے نازک حسین پھول کھل رہے تھے۔ فضا کی رنگین وسعتوں میں ضیا بار کرنیں سیماب کی ندیاں بہا رہی تھیں کلی کلی عنبریں جھونکوں میں سانس لے رہی تھی۔ مرمریں حوض کے کنارے چاندنی رقص کرتی ہوئی نور کے دائرے بنا رہی تھی اور میری ناکام محبت آغوش طرب میں تھوڑی دیر کے لئے آسودہ ہو چکی تھی تھکے ہوئے ضدی بچے کی طرح نیم خوابی کے طلسمی حصار میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ــــ

آہستہ آہستہ قوت ادراک پیدا ہوئی اور ایک آخری الوداعی بوسے کے ساتھ سہراب رخصت ہوا اور میں دل شکستہ اس کے نقش قدم پر غم واندوہ سے لبریز آنسو بہا رہی تھی۔ میرے تصور نے دکھلایا کہ اب اس کے اور میرے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ ناقابل عبور۔ عدم اور ہستی کی ــ میں اسے روکنا چاہتی تھی مگر آواز حلق تک آکر رک گئی اور میں بیہوش تھی وفور غم والم سے۔

جب آنکھ کھلی تو میں بیمار اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ والد پریشان میرے سرہانے کھڑے تھے بخار سے تمام جسم لوہے کے توے کے مانند تپ رہا تھا ــ شادی ملتوی کردی گئی بحالی صحت تک مگر چوتھے روز مجھے خط ملا سہراب کا لکھا ہوا اسے میں بجنسہ درج کرتی ہوں اس کا ہر ہر لفظ یادگار ہے میری ناکامیوں کی۔ افسانہ ہے میری بربادیوں کا۔

"فیروزہ! . . . .

میں جا رہا ہوں۔ وہاں جہاں پناہ ہے شکستہ دلوں کے لئے۔ جہاں روح کی جراحتوں پر دائمی عشرتوں کا تریاق رکھا جاتا ہے۔ جہاں محبت کے آنسو بنفشی رنگ کی بجلیاں بنتے ہیں۔ دنیائے آب و گل سے بہت دور عدم کے زمردیں سبزہ زاروں میں۔ جہاں لعل و گوہر کی زمین پر محبت کے سورج کی شفاف کرنیں لوٹتی ہیں جنت ــــ محبت کا نام ہے اور محبت جنت کا ــــ محبت کا جذبہ عالی کوثر و سلسبیل کے چشموں سے زیادہ پاک ــــ موسیقی کی لطافتوں سے زیادہ نرم ــــ پھولوں کے تبسم اور چاندنی کی کرنوں سے بنا ہوا جذبہ مادی ــــ دنیا کی کثافتوں سے

آلودہ ہونے کے لئے نہیں ہے۔ جنت کے سنہرے بلور ہیرے کی جھلملاتی ہوئی روشن شاخوں پر بیٹھ کر جو نغمے گاتے ہیں ــــ وہ محبت ہے۔ معصوم فرشتے نازک حسین نقرئی پروں کو پھیلائے ہوئے معبود حقیقی کے حضور میں جو سب سے قیمتی نذریں پیش کرتے ہیں ــ وہ محبت ہے۔ میں پرستش کرونگا تمہارے ملکوتی حسن کی اس طرح کہ میری روح اپنی تمام نیاز مندیوں کے ساتھ تمہارے قدموں پر جھکی ہوگی اور محبت سے دلکش نغمے تمہارے حریم جمال پر نثار کر رہی ہوگی جب محبت کو محبت بن کر ہی پوجا جا سکتا ہے۔ دیکھوں نہ خود کو محبت کے قابل بنایا جائے۔ قید ہستی سے باہر ہو جانا ابتداء ہے محبت کی اور روح کا یکسر التہاب ہو کر فنا آمادہ ہو جانا انتہا ہے محبت کی۔ انسان کی ناکامیاں محبت کی کامگاریاں ہیں انتہائے محبت میں ہستی سے گذر جانا ــــ تکمیل ہے شوق و آرزو کی۔ فیروزہ! ــــ مجھے یاد نہ کرنا اس لئے کہ میری روح جو ہمیشہ تمہارے قدموں کے قریب ہوگی تڑپ جائیگی ــــ جامہ حیات میں آنے کے لئے ــــ میری زندگی روح کی عشرتوں میں جذب ہو جائیگی اور روح تمہاری روح سے پیوست ــــ تمہارے عنبریں تنفس میں میری محبت رقص کریگی۔ تمہارے تبسم کی موجوں پر میری عشرتوں کا سفینہ بہتا ہوگا ــــ اور یہی میری محبت کا حاصل اور میری عشرتوں کی معراج ہے۔ الوداع۔

ہمیشہ تمہارا .... سہراب۔"

دوسرے دن اخبار میں ایک مختصر خبر درج تھی سہراب کی المناک خودکشی کی۔ آہ یہ انجام تھا میری محبتوں کا یہ صلہ تھا میری آرزوؤں کا! رشیدہ یہ بربادیاں تھیں میری تمیزات کی۔ میرا حال مدتوں مجنونوں کا سا رہا والد نے طویل بحری سیاحت کے لئے مجھے ساتھ لیکر نہ معلوم دنیا کے کن کن بعید مقاموں کا پھیرا کیا مگر کیا حاصل میں زندہ بھی مردوں سے بدتر ہو کر محض والد کیلئے دعا کرو کہ میری افسردہ زندگی بھی جلد تر ختم ہو جائے اور میں فردوس کی وسعتوں میں اس سے مل جاؤں جس کی آرزو کا مدفن میرا سوگوار دل ہے اب ڈیڑھ دو سال بعد بمبئی واپس آئی ہوں۔ کل سہراب کی قبر پر گئی تھی جو سایہ دار درختوں کے نیچے میری تمام راحتوں کا مرکز ہے اس پر یہ شعر میں نے کندہ کرایا ہے ......

موت کا خواب!

میں نے خواب دیکھا کہ غیر ملک میں ایک اجنبی کی موت ہوئی ——— خلاف معمول ہاتھوں کے نزدیک!
اس جگہ کے غریب دہقانیوں نے مل کر اسے زمین کی آغوش میں چھپا دیا ——— اور اس کے ویرانے قبر پر ایک سدابہار سرو کا درخت لگا دیا ———
میں وہاں آیا اور قبر کے کتبہ پر لکھدیا ——— انسان اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے ——— "یہ سرو کے سایہ اور خاک کی آغوش میں سونے والی، دوشیزہ تمہاری پہلی معشوقہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔"
——— اور پھر میں نے گریاں آسمان اور سسکتے تاروں کو دیکھا ——— اور باد نسیم کی آہوں کو سنا۔

(ولیم ایٹس)

پیام!

اے دنیا کو الوداع کہنے والی لڑکی! بتا میں تیرے سچے عاشق کو کیا کہوں گا؟ اے لڑکی! جب تو زندگی کی قید سے آزاد ہو جائیگی ——— تو میں تیرے سچے عاشق کو کیا کہوں گا؟ ———
"اس سے کہنا کہ جب لڑکیاں زندہ رہتی ہیں انھیں نہیں معلوم ہوتا کہ زندگی کتنی تلخ ہے ——— لیکن وہ محسوس کرتی ہیں ——— مرنے کے وقت ——— اس سے قبل نہیں"
جب میں تیرے سچے عاشق سے ملوں گا تو کیا کہونگا؟ اے لڑکی کہ تیری آنکھ کی روشنی زائل ہو رہی ہے! بتا میں کیا کہوں گا؟ ———
"جب تم بے جان لڑکی سے جدا ہو جاؤ گے تو اس سے کہنا کہ گو میری آنکھیں بند ہیں۔ ان کی بینائی زائل ہو چکی ہے ——— لیکن میں اُسے دیکھتی ہوں اپنی روح کی آنکھوں سے ———"
اے لڑکی! وقت بہت کم ہے جلد بتا کہ میں تیرے سچے عاشق سے کیا کہونگا ——— اے موت کے ملک میں جانے والی تیار اور غمگین مسافر! ——— بتا میں کیا کہوں گا؟
"اس سے یہی دو لفظ جو میں مشکل سے کہہ رہی ہوں کہنا کہ جب میں زندہ تھی اس سے محبت کرتی رہی ——— اور مرنے کے بعد ——— مرنے کے بعد بھی محبت کرونگی ———"

(فرنیس تھومپسن)

اے کاش!

اے کاش! میرے پاس جنت کے طلائی اور نقرئی ریشمی کپڑے ہوتے ——— نیلے۔ دھندلے اور سیاہ کپڑے ——— رات اور روشنی کے کپڑے ہوتے ——— میں انھیں تیرے قدموں کے نیچے بچھاتا ——— تو اس پر خرام کرتی ———
لیکن آہ! میں غریب ہوں ——— غریب کے پاس سوائے خواب کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ——— میرے خواب ہیں ——— میں نے اپنے خواب کو تیرے قدموں کے نیچے ڈالتا ہوں ——— چل ——— آہستہ چل ——— سنبھل کے چل ——— میرے خواب ہیں ———،

(ولیم ایٹس)

از جناب ——— انعام الحق شیدائی،

غزل

حضرت زین الزاہدین صاحب زاہدؔ، اجمیری،

عکس ہے روئے یار کا جامِ شرابِ ناب میں
بند ہے گویا آفتاب چشمۂ آفتاب میں

اے تپشِ دل و جگر تو بھی کچھ اپنا کام کر
آگ لگا نقاب میں آگ لگا نقاب میں

پرتوِ رخ سے شامِ غم آج تو جگمگا بھی دے
کھول دے اب وہ آفتاب بند ہے جو نقاب میں

زلفِ سیاہ رخ پہ جب موج میں آکے کھل گئی
سینکڑوں بال پڑ گئے آئینۂ شباب میں

صفحۂ دل پہ نقش ہے صورت و شکل یار کی
عشق کی پوری داستاں درج ہے اس کتاب میں

حشر سے پہلے ہمنشیں منظرِ حشر دیکھ لے
حشر بھی گوشہ گیر ہے اٹھتے ہوئے شباب میں

زاہدِ خستہ ہاتھ اٹھا، مانگ خدا سے یہ دُعا
عشق کی ساری لذتیں بھر دے دلِ خراب میں

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی۔ باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے،

جلد ۲۲ — فہرست مضامین عالمگیر ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء — نمبر ۳

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

ملاحظات!

عالمگیر کا خاص نمبر ۳۶ء موجودہ سائز سے بھی بڑے سائز پر شائع ہوگا

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

عالمگیر کا پہلا پرچہ جون سنہ ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا تھا اس وقت اس کا سائز بہت چھوٹا یعنی ۲۰×۲۶/۸ تھا۔ جب جیسا کاغذ عالمگیر کے اشتہارات کیلئے استعمال ہوتا ہے اس وقت اسی کاغذ پر عالمگیر چھپتا تھا ایک سال تک یہی کاغذ استعمال ہوتا رہا جون ۱۹۲۵ء میں اس کا سائز ۲۰×۳۰/۸ کرکے کاغذ بھی نسبتاً بہتر لگانا شروع کر دیا لیکن بہت جلد بلند و بالا حوصلوں نے ہمارے دل میں اس سائز کی تنگ دامانی کا احساس پیدا کر دیا۔

ع کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

بالآخر پہلے پہل دسمبر ۲۶ء کا پرچہ ہم نے موجودہ سائز پر خاص نمبر ۲۷ء کے نام سے شایع کیا جسے قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی پبلک اور اخبارات نے نہایت گرمجوشی سے ہماری ناچیز مساعی پر اظہار استحسان کیا اس کے بعد دو تین سال تک عالمگیر کے خاص نمبر اسی سائز پر شایع ہوتے رہے جنوری سنہ ۱۹۳۱ء سے مستقل طور پر عالمگیر کے معمولی پرچوں کا بھی یہی سائز کر دیا گیا' جو بہت مقبول ہوا۔

عالمگیر کی اس تدریجی ترقی کی بید مختصر کیفیت کے اظہار کے بعد ہم نہایت مسرت کے ساتھ محبان عالمگیر کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے عالمگیر کا خاص نمبر ۳۶ء جو دسمبر سنہ ۳۵ء میں شایع ہوگا۔ اس کا سائز موجودہ سائز سے بھی بڑا ہوگا۔ اس سائز کا نام یار لوگوں نے

"جہازی سائز"

تجویز کر لیا ہے۔ اور ہم بھی عُرف عام کے تتبع پر مجبور ہو کر آئندہ اسے جہازی سائز ہی کے نام سے موسوم کرینگے۔

خاص نمبر سنہ ۱۹۳۶ء اعلان کے مطابق جہازی سائز پر شایع کرنے سے بلاشک وشبہ ہماری مشکلات اور اخراجات میں ایک حوصلہ شکن اور صبر آزما اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عالمگیر کو زیادہ سے زیادہ کامیاب اور بیش از بیش

جاذب نظر بنانے کے لئے ہم بمسرت ان تمام تکالیف و مشکلات اور مصارف کا خیر مقدم کرنے کے واسطے آمادہ ہیں جن کو برداشت کرنا ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ قدر افزایان عالمگیر عملی طور پر عالمگیر نوازی کا ثبوت دے کر ہماری مشکلات کا خاتمہ کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

اور اس عالمگیر نوازی کی عملی صورت یہ ہے کہ قارئین کرام جہاں خود اپنا سلسلۂ خریداری قائم رکھیں وہاں اپنے حلقۂ احباب میں بھی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں۔

خاص نمبر سنہ ۳۶ء کی مستقل خریدار حضرات سے کوئی علیٰحدہ قیمت نہ لی جائیگی بلکہ یہ حسب معمول سالانہ چندہ میں ہی ملیگا البتہ سالانہ چندہ کا وی پی للعہ کے بجائے للعہ مع محصول ڈاک میں ارسال ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ۴ر کا اضافہ محبان عالمگیر بخوشی منظور فرمالینگے اور یہ حقیقت ہے کہ اس بید معمولی اضافہ سے اس بہت بڑی رقم کا کچھ تھوڑا بہت حصہ عالمگیر کو وصول ہو جائیگا جو وہ اضافہ تقطیع کی صورت میں برداشت کر رہا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انفرادی کوششیں اسی وقت بارآور اور کامیاب ہو سکتی ہیں جب وقت انھیں اجتماعی کوششوں کا اشتراک اور ہمدردی حاصل ہو اس لئے میں تمام ناظرین عالمگیر کی خدمت میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے حتی الامکان کوشش فرمائیں۔ (باقی باقی)

حافظ محمد عالم عفی عنہ'

مدیر عالمگیر لاہور

احتساب

شمع حسن!

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک عالم انکشافات نے برسوں دنیائے تحقیق کی خاک چھاننے کے بعد ایک حیرت انگیز اور دلچسپ حقیقت کا انکشاف کیا ہے اس کا بیان ہے کہ حسین عورتوں کے رخساروں میں ایک خاص قسم کی برقی تپش موجود ہے یہ بجلی وجدانی طور پر ہی خرمن صبر و قرار کو راکھ نہیں کر سکتی بلکہ اس میں عالم بجلی کی قوت عمل بھی موجود ہے محقق مذکور "برق حسن" کے بنیادی اور عملی خصائص پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اگر دس عورتوں کے رخساروں سے بجلی اخذ کی جائے تو وہ ایک خاص قسم کے آلہ کے ذریعہ ایک شمع کا کام دے سکتی ہے۔ اس شمع کی روشنی دل و دماغ اور روح و وجدان کے لئے فرحت و مسرت کا موجب ہوگی۔ جس شخص کی آنکھیں اس کے حسین نظارہ سے محظوظ ہونگی وہ اپنے آپ کو مسرت و لطافت کی دنیا میں محسوس کریگا۔

یہ ہے وہ انکشاف جو ہمیں عربی۔ فارسی اور اردو کے شعرار کی "فطری سائنسدانی" پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ شعرا صدیوں سے چلا رہے ہیں کہ معشوق کے رخسار میں آتشیں خاصیت موجود ہے لیکن کسی محقق نے اس انکشاف کو تحقیق و تجربہ کے معیار پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس حقیقت کو شاعرانہ پریشان خیالی کا نتیجہ قرار دیا گیا لیکن امریکن محقق نے اپنی حکیمانہ تلاش و جستجو سے ثابت کر دیا ہے کہ شعرار کرام کے خیالات کیلئے بھی لباس عمل و حقیقت مہیا کیا جا سکتا ہے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کتنی حسین عورتیں اس تجربہ پر گرمی رخسار کی قربانی گوارہ کرینگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس انکشاف نے ایک بے معنی خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

آہ مرزا عزیز لکھنوی

حضرت مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی اردو شاعری کے ان ماہرین فن اور قادر الکلام اساتذہ میں سے تھے جن کی فنی قابلیت پر شعر و شاعری کا روشن ترین مستقبل تعمیر ہو رہا ہے۔ مرحوم مولنا شوق قدوائی کے بعد پہلے بزرگ تھے جن کی جدت پسند طبع نے لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید شاعری کو اس بلندی پر پہونچانے کی کوشش کی جہاں آزاد زبانوں کا آفتاب ترقی تجلیاں بکھیر رہا ہے۔ ہم جب عزیز کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت خود بخود زبان پر آجاتی ہے کہ عزیز کا طرز کلام اردو شاعری کی تاریک دنیا میں چراغ نور ہے جس کی ایک ایک شعاع میں علم و ادب کی ہزاروں تجلیاں تڑپ رہی ہیں۔

عزیز کا تغزل اس وجدانی طرز کا آئینہ ہے جو دل پر چوٹ لگنے کی صدا اور دماغ کے اعلیٰ خیالات کے امتزاج سے تخلیل پذیر ہوتی ہے۔ عزیز کی نظمیں جدید شاعری کا ارتقائی نمونہ کہلانے کی مستحق ہیں۔ عزیز کے قصیدے تو "انا و لا غیری" کی روشن ترین تصویریں ہیں۔ اگر ہماری رائے کو "خود بخود مقبرے پر پھول چڑھانے" کی ضرب المثل سے نہ جانچا جائے تو ہم یہ کہنے میں اپنے آپ کو حق بجانب پاتے ہیں کہ اگر ذوق مرحوم کے قصاید کو زیر بحث نہ لایا جائے تو عزیز کے قصیدے قدیم و جدید شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

ہمیں انتہائی ملال کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عزیز کی موت سے دنیائے ادب میں ایک ایسی نشست خالی ہو گئی ہے جس کا مستحق کوئی نظر نہیں آتا۔

آخر میں ہم مرحوم کے اقربا سے قلبی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس صدمہ کو اردو شاعری کی بدبختی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ خداوند کریم اپنی رحمت سے مرحوم کو جوار مغفرت میں جگہ دے۔ آمین۔

کیا یوپی کے علم دوست حضرات اتنے بڑے محسن زبان و ادب کی ایک بہترین یادگار قائم کرنے کا فرض انجام دینگے۔

اُردو کی حفاظت کا مسئلہ!

چند ماہ سے اسلامی ہند اور حامیان ہندی کی معاندانہ روش اور ان کی چھپی ہوئی سازشوں کے پیش نظر اُردو کی حفاظت پر زور دے رہے ہیں ملک کے ہر گوشہ سے آواز اٹھ رہی ہے کہ اُردو کی شمع حیات صرصر مخالف کے حلقے میں ٹمٹما رہی ہے اگر اس وقت غفلت و تساہل سے کام لیا گیا تو اُردو بھی قدیم زبانوں کی طرح آغوش عدم میں سو جائیگی۔

اس دعوت عمل کی معقولیت اور اہمیت پر کوئی صحیح الدماغ مہر تائید ثبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا الفاظ کی طلسمی تلوار سے کوئی مورچہ سر کیا جا سکتا ہے؟ کیا اخبارات میں اُردو کا رونا رونے سے ہندی کا بڑھتا ہوا سیلاب رک سکتا ہے؟ - اگر اس امر کا جواب نفی کے بغیر اور کچھ نہیں تو حامیان اُردو، ہندی اور اس کے شیدائیوں کو کوسنے کے بجائے کوئی معقول اور موثر تعمیری پروگرام عالم وجود میں لائیں جس پر عمل پیرا ہونے سے وہ تمام خطرات معدوم ہو جائیں جو اُردو کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔

ہم نے عالمگیر کی گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا کہ "اُردو" کی حفاظت و تبلیغ کے لئے ایک مرکزی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی شاخیں سارے ملک پر حاوی ہوں۔ یہ معقول تجویز جس پر جوش خیر مقدم کی مستحق تھی اس کا بوجوہ تمام اظہار نہیں کیا گیا حالانکہ تجویز کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ تساہل اس امر کا درخشاں ثبوت ہے کہ ملک میں تعمیری کام کرنے کی صلاحیت نہیں صرف تفکر و تدبر کے اظہار ہی کو اُردو کی ادبی و لسانی فلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر صرف باتوں سے کوئی بات بن سکتی تو حرکت و عمل کی طاقتیں آج سے صدیوں پہلے فنا ہو جاتیں۔

ہم ایک بار پھر حامیان اُردو کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ الفاظ کی طلسمی تلوار پر بھروسہ کرنے کے بجائے کوئی عملی حربہ مہیا کریں ورنہ ہندی کا بڑھتا ہوا سیلاب اُردو کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیگا۔ اس سلسلے میں جو ابتدائی اقدام عالم وجود میں لایا جا سکتا ہے وہ جماعتی تنظیم ہے تاکہ راس کماری سے لیکر خیبر کی چٹانوں تک ایک ہی مفہوم کی آوازوں کا ہنگامہ برپا ہو۔

اُردو رسائل کی قیمت!

پنجاب میں نئے اُردو رسائل کا اجرا روزانہ واقعات کی طرح لامحدود حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ ہر شہر میں سے رسالے جاری ہو رہے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب گلستان صحافت میں ایک گل نوبہار کا اضافہ نہ ہوتا ہو اس امر سے یہ حقیقت کسی توضیح کی محتاج نہیں رہتی کہ ادب اُردو کا حلقۂ مقبولیت وسیع ہو رہا ہے، لیکن ہمیں قلبی ملال کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نئے رسالوں میں سے بہت کم اپنی زندگی قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بعض تو عالم وجود میں آتے ہی گوشۂ عدم میں جائے پناہ ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں گویا جس قدر رسالہ نگاری کا ذوق ادبی ماحول کی امداد سے ترقی کر رہا ہے۔ اسی قدر "رسالہ خوانی" کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔ ہمارے خیال میں اس نقص کی سب سے بڑی وجہ رسالوں کی ارزانی ہے۔ پرانے رسالے تو اپنی کثیر اشاعت سے مصارف کا بار گراں برداشت کر سکتے ہیں لیکن نئے رسالوں کیلئے اول تو حلقۂ اشاعت ہی محال ہے۔ اگر دو چار سو خریدار مل بھی جائیں تو ان کی آمدن سے زیادہ دیر تک رسالہ چل نہیں سکتا کیونکہ مصارف کا خوفناک جہنم چند چھینٹوں سے بجھ نہیں سکتا۔ اب اگر وہ مصارف کم کرنے کی کوشش کریں تو پرانے رسائل کے مقابلے میں ان کو کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کریگا۔ اگر مصارف کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے قیمت میں اضافہ کر دیں تو یہ گراں فروشی ان کی ہستی فنا کر دیگی۔

ان حقائق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانے رسالوں کی حد سے بڑھی ہوئی ارزانی نئے رسائل کو زندہ نہیں رہنے دیتی ایک طرف تو ہم ملی ذہنیت کا ماتم کر رہے ہیں دوسری طرف دنیائے صحافت میں نئے دوستوں کو داخل نہیں ہونے دیتے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام رسالوں کے مالک رسائل کی موجودہ قیمتوں میں کم سے کم چالیس فیصدی اضافہ کرنے پر متفق ہو جائیں اگر اس گذارش پر غور نہ کیا گیا تو مستقبل قریب میں کئی پرانے رسالے بھی مسرفانہ مصارف کا ساتھ نہ دے سکینگے اور کئی نئے رسالوں کا خون بھی ان کی گردن پر ہوگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ احباب رسائل بہت جلد اس مشورہ کو شرف قبولیت بخشینگے اس سلسلے میں اگر بزم مشاورت کا انعقاد ضروری ہو تو ادارہ عالمگیر یہ خدمت اپنے ذمہ لینے کو تیار ہے۔

(ادارہ عالمگیر)

یہ کیا؟

لسان الوقت حضرت راز یزدانی رامپوری

تاج محل ہوٹل میں ــــ وہ بارہ بجے دوستوں سے بمشکل چھٹکارہ پاکے سویا تھا اور اب سامنے رکھا ہوا ٹائم پیس بتا رہا تھا کہ پونے تین بجے ہیں۔ اس کا دل دہڑکنا تو جانتا ہی نہ تھا لیکن ایک جگر دوز چیخ نے اسے اٹھا یا تھا میٹھی نیند سے ــ چیخ جو برابر کے کمرے سے آئی تھی۔ اس لیئے اس کی کشادہ اور مرمریں پیشانی پر خوف نہیں تو حیرت نے پسینے کے سرد قطرے پیدا کردیئے تھے۔

برابر کا کمرہ اسی کے پاس تھا یعنی اس نے دو کمرے لئے تھے۔ کنجی اس کے واسکوٹ کے جیب میں تھی۔ اس نے روشنی کرکے اول ٹائم پیس کو دیکھا اور پھر کنجی کو ــــ ایک صحیح وقت بتا رہا تھا اور ایک جیب میں محفوظ۔ اس نے اپنا کمرہ کھولنا چاہا۔ مگر وہ باہر کی جانب سے بند تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ــــ "اناڑی" اس نے زور دار لہجہ میں کہا اور بستر پر بیٹھ گیا۔

چند ثانیوں کے اندر اندر ہوٹل کے ملازمین اور گرد کے کمروں میں ٹھہرے ہوئے مسافر جمع ہوگئے۔ اس کے کمرے کا قفل توڑا گیا اور وہ باہر نکلا۔ حیرت زدہ اور ڈرے ہوئے مسافروں پر نظر ڈالے بغیر اس نے کنجی سے برابر کے کمرے کا قفل کھولا ــــ اور برقی روشنی کا بٹن دبایا۔

کمرے کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ الٹی ہوئی کرسیاں۔ گری ہوئی میز اور فرش پر خون کے تازہ داغ بتا رہے تھے کہ یہاں ابھی ابھی زندگی اور موت کے درمیان کشمکش ہوئی ہے لیکن نہ قاتل تھا نہ مقتول، نہ غالب تھا نہ مغلوب اور نہ زخمی تھا نہ زخمی کرنے والا۔

گو ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو جانے کے لئے کوئی اور راستہ نہ تھا اور خود اس کا کمرہ باہر سے بند تھا پھر بھی وہ بہ حالات موجودہ کسی طرح صبح کی گاڑی سے پوہا نہیں پہونچ سکتا ــــ کیسی کاری ضرب اس کے مقاصد پر لگائی گئی تھی۔ سوتے وقت اس کے چشم تصور نے دوپہر سے پہلے پہلے اپنی ذات کو آٹھ لاکھ کا واحد مالک ہوتے دیکھا تھا اور اب ــــ،

ہوٹل کا مینیجر تھانہ دار کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوا۔ گویا اس کے لئے تحقیقات اور بیان و جرح کی منزلیں شروع ہونے والی تھیں۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کے کاغذات میں ــــ لیکن اس کے سامان کی تلاشی کا کوئی سبب ہی نہ تھا۔ تھانہ دار حد سے زیادہ محتاط ثابت ہوا تو ــــ "آٹھ لاکھ" اس نے دل ہی دل میں یہ لفظ دہرائے اور ایک سمت کھڑے ہو کر خاموشی سے حالات کی رفتار کا مطالعہ کرنے لگا۔

پولیس کے پاس اس کے خلاف تھا ہی کیا؟۔ دس سے زیادہ مسافر گواہ تھے کہ اس کا کمرہ باہر سے بند تھا اور وہ قفل توڑنے کے بعد باہر نکل سکا ہے۔ پھر بھی تازہ انسانی خون کے داغوں کی موجودگی تھانہ دار کو اس کی طرف گھور گھور کر دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی کہ یکایک گری ہوئی میز کے دو تختوں کے درمیان جھری میں ٹھونسا ہوا ملاقاتی کارڈ تھانہ دار کو مل گیا ــــ پولیس والوں کی نظر کس قدر تیز ہوتی ہے عام حالات میں شاید اس کارڈ کا کچھ اثر نہ ہوتا لیکن اب ــــ تھانہ دار نے منہ بسور لیا ــــ کیونکہ یہ کارڈ تھا مظفر کا ــــ وہی مظفر جسے ہندوستان میں فرانس کے ارسین لوپین کے برابر کی شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے اور جو کہیں ہاتھ آجائے تو پولیس والے شاید چوبیس گھنٹے کو اپنے گھروں کی لوٹ معاف کردیں۔

"یہ مظفر آپ سے کس مطلب کے لئے ملا تھا؟" تھانہ دار نے کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"مظفر؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "مظفر؟" اس نے بڑھ کر کارڈ پر نظر ڈالی کارڈ واقعی مظفر کا تھا بالکل ویسا ہی جو ان معاملات میں کہیں نہ کہیں دستیاب ہوتے

تھے جن میں مظفر کا بلاواسطہ یا براہِ راست تعلق ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مظفر کا نام سن کر اُس کے احساسات کو بہت صدمہ پہنچا ہے اس نے ایک گھورتی ہوئی نظر کمرے پر ڈالی تھانہ دار کی نگاہیں جواب طلب تھیں۔ "میں اس کارڈ کی موجودگی سے لاعلم ہوں" اس نے جواب دیا۔

تمام کمرے کی تلاشی ہو چکی تھی۔ تازہ خون کے داغوں کا سرچشمہ عوام کیلئے لاینحل تھا مگر اس کے دماغ میں روشنی کی ایک باریک شعاع پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اپنے مفروضات پر عمل کرنے کیلئے آزاد نہ تھا اس لئے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

تھانہ دار کمرے کو مقفل کر کے باہر نکلا اور کنجی اس نے اپنی جیب میں ڈال لی، جو اس بات کی دلیل تھی کہ اب تک کے انکشافات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی دوسرے لمحہ میں اس کے اس بدترین اندیشے کی تصدیق اس طرح ہو گئی کہ تھانہ دار کے قدم اس کے کمرے کی طرف اٹھے اور اب اس کا سامان دیکھا جانے لگا۔ ٹھیک۔ اسی وقت ہوٹل کے صحن سے کسی موٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ کمرے میں ہوٹل کا کلرک داخل ہوا اور اس نے منیجر سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ منیجر کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے مگر فوراً ہی مٹ گئے تھانہ دار اور وہ سامان دیکھنے اور دکھانے میں مشغول تھے اس لئے یہ بات دونوں سے چھپی رہی۔ کاش اسے معلوم ہو جاتا کہ بالائی منزل کے ان کمروں میں رہنے والے میاں بیوی جو اس کے کمرے کے عین اوپر واقع تھے اس پیچیش کو نامبارک تصور کر کے ہوٹل سے رخصت ہو گئے یا تھانہ دار مسافروں کے آنے جانے کو کچھ دیر کے لئے روک دیتا۔ بہرحال یہ ایک فروگذاشت تھی جو ہوئی اور اب منیجر اپنی ذمہ داری کے خیال سے اس واقعہ کو زبان پر لانے کیلئے تیار نہ تھا۔

اس کے سامان میں کچھ بھی تو قابلِ اعتراض نہ تھا۔ دو سوٹ کیس اور ایک بستر، چند اخبار اور تین ناول۔ لیکن اس کی واسکوٹ سے کاغذات کا ایک سربمہر پلندہ ضرور نکلا جس کی مہریں تھانہ دار نے بڑی اشتیاق سے کھولیں اور قریب تھا کہ وہ کاغذات کو پڑھنے لگے کہ ——— وہ آگے بڑھ آیا۔

"مہربانی کر کے حاضرین کو ذرا پیچھے ہٹ جانے کیلئے کہہ دیجئے۔" اس نے تھانہ دار سے کہا۔ "یہ کاغذات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔"

لوگ یہ الفاظ سن کر خود بخود ہٹ گئے مگر اس عرصہ میں تھانہ دار پہلے کاغذ کے دو اندراج پڑھ چکا تھا۔ یہ کاغذات کی فہرست تھی جس کے اندراجات کس کچھ اس طرح کے تھے۔

(۱) نقل شرائط نامہ زیرِ تجویز حکومت ہائے افغانستان و ....

(۲) شرح خفیہ کوڈ زیرِ استعمال حکومتہائے بالشویک روس و ....

....

....

تھانہ دار نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ جس کے اس کے دماغ میں روشنی کی ایک زبردست شعاع پیدا ہوئی اور وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا۔ کیا۔ میں۔ میں۔ آپ کا کارڈ کیس دیکھ سکتا ہوں؟" تھانہ دار نے ہکلا ہکلا کر اس سے کہا۔

"آپ اپنے سوال کی جامعیت پر غور کریں۔ کیا فی الحقیقت موجودہ میرے پاس قطعی میرا ہی کارڈ کیس ہو سکتا ہے؟" اس نے غرا کے جواب دیا۔ "بہرحال اب اس تماشے کو ختم کر دینا مناسب ہے۔ میری طرف کسی دعوی یا دادرسی کا امکان نہیں ہے کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو کچھ میرے پاس تھا یا جانا تھا وہ میرے پاس صحیح و سالم موجود ہے۔ رہے خون کے تازہ داغ انھیں آپ انسان کے سمجھیں یا حیوان کے مجھے نہ کوئی اعتراض ہے نہ اغماض۔ لائیے کاغذات ادھر عنایت کیجئے۔"

یا تو تھانہ دار اس کے الفاظ سے چڑ گیا یا وہ مجبوری تھا یا اس کا مقصد کچھ اور ہو گا بہرحال اس نے مسکرانے کی کوشش تو کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ "میں کاغذات کی واپسی سے قطعی مجبور ہوں۔" بالآخر تھانہ دار بولا۔ "جو میں انتہائی رعایت کو ملحوظ رکھ کے کر سکتا ہوں وہ اس قدر ہے کہ ان کاغذات کی نقل فہرست تیار کر کے اس پر آپ کی رسید حوالگی دیدوں اور اطمینان کا پتہ آپ دیدیں افسرانِ بالا کے ملاحظہ کے بعد یہ کاغذات وہاں بھجوا دیئے جائیں۔ کاغذات آپ کی موجودگی میں سربمہر ہو جائیں گے اور انسپکٹر جنرل کے علاوہ کسی کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ میرے ہمراہ صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بنگلہ تک چلیں ان کے فیصلہ پر کوئی اعتراض مجھے نہ ہو گا۔"

"نہ۔ نہ۔ بس کہیں آنے جانے سے تو آپ مجھے معاف رکھیں، تین گھنٹہ اس بے فائدہ تلاش و جستجو کی نذر ہو چکے گاڑی کو چھوٹنے ہوئے ایک گھنٹہ گذر گیا اس وقت تک مجھے اپنی منزل نصف کا ایک تہائی حصہ طے کر لینا چاہیئے تھا اس لئے میری رائے میں آپ کاغذات "ایجنٹ گورنمنٹ ہاؤس پونا" کے پتہ سے جلد از جلد بھجوا دیں البتہ میں آپ کا نمبر نوٹ لوں۔"

"بسر و چشم!" تھانہ دار نے کہا۔ اس نے تھانہ دار کا نمبر نوٹ کیا اور تھانہ دار نے نقل فہرست تیار کر کے رسید مانگی۔ تحریر کی ——— اسباب بندھ چکے تھے اور تھانہ دار اپنے عملے سمیت رخصت ہو چکا تھا اس نے منیجر کو پونا تک کے لئے ایک ٹیکسی کرایہ کرنے کا حکم دیکر غسل کیا اور چاء پی۔ اتنے عرصہ میں موٹر آ موجود ہوئی اور اسباب رکھا جانے لگا جس کے پانچ منٹ بعد یعنی پورے آٹھ بجے وہ سوار ہو گیا۔

پونا کی آبادی سے باہر ایک شاندار کوٹھی کے برآمدے میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اس کی موٹر رکی اور وہ بیتابی کے ساتھ اتر پڑا۔ بیرے کو کارڈ دیکر وہ ٹہلنے لگا مگر جلد ہی اندر بلا لیا گیا۔ ملاقات کے کمرہ میں جس نے اس کا استقبال کیا وہ اس کا پرانا کرم فرما چیف انسپکٹر محکمہ تفتیش جرائم یعنی حامد تھا۔ وہ ایک انداز کسل سے کچھ پڑا رہتا مگر اس کے داخل ہوتے ہی بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑی پھرتی سے پیش کر دیا۔

"آیئے مسٹر مظفر! کہئے آپ کا یہ استقبال آپ کے نزدیک غیر متوقع تو نہیں ہے کوئی جلدی تو نہیں ہے؟"

(حاشیہ)

منجری میں ہوٹ کی اور ضمنیت کا مال جیب میں ڈالکر چلدیا جس کے نتائج تمہارے لئے خوشگوار نہیں ثابت ہونگے۔" (صفحہ ملاحظہ فرمائیے)

"خیر یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ اگلے لمحے میں کیا ہو؟ اس کے متعلق آپ اپنے نظریات کا اظہار نہ فرمائیں تو مناسب ہے لیکن آرسین لوپن کے متعلق کچھ کہئے۔ اناڑی کہیں کا"۔

"لوپن کو تم سے اس لفظ کی بڑی شکایت ہے۔ تاج محل ہوٹل میں بھی یہی لفظ تم نے اس کے لئے استعمال کیا تھا لو اس خط کو پڑھو" حامد نے کوٹ کی جیب سے ایک خط نکال کر مظفر کو دیا جو انگریزی زبان میں تحریر تھا اور جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

بخدمت شریف جناب کمشنر صاحب پولیس احاطہ بمبئی۔

جنابمن! ۲۹۔ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء کو یعنی پرسوں امشب دس بجے سے گیارہ بجے صبح تک ہندوستان کا نامی گرامی چور مظفر گولڈن ہاؤس پونا میں موجود ہوگا جس شخص سے آٹھ لاکھ روپئے کے بالعوض چند کاغذات کی بازیابی ہوئی ہے وہ درحقیقت مظفر ہے یہ کاغذات چونکہ مغرب کی ہر حکومت کیلئے مفید اور کارآمد ہیں اس لئے میں انھیں اپنی حکومت کے واسطے حاصل کر رہا ہوں۔ مظفر پر افسوس ہے جس نے آٹھ لاکھ کی بے حقیقت رقم کا خیال کیا اور شرق کے چند در چند زریں راز فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسے شرق اور مغرب کا فرق کہتے ہیں کیونکہ میں کاغذات اپنی حکومت کو بے معاوضہ پیش کرنے کا عزم کر چکا ہوں۔ میں ہم پیشہ ہونے کے لحاظ سے مظفر کا راز کبھی ارباب اختیار پر ظاہر نہ کرتا مگر جس ذہنیت کا مظاہرہ مظفر کی طرف سے ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ایسے لوگ ہستی اور ناموری کے صفحہ سے حرف غلط کی طرح محو کر دیئے جائیں اگر اب بھی حکومت اس کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہی تو اس کا اپنا قصور ہوگا۔

مظفر نے تاج محل ہوٹل میں اپنے کمرہ کا دروازہ باہر کی طرف سے بند دیکھکر مجھے اناڑی کہا تھا کیونکہ وہ بیخبر تھا کہ میں اسی کو بچانا چاہتا ہوں اب مظفر کو اسی اناڑی کا سلام اس تھانہ دار کی وساطت سے جس کے ہاتھ کی تحریر کی ہوئی رسید جو الگی اس کے جیب میں موجود ہے ——— آرسین لوپن"۔

جوں جوں مظفر خط پڑھتا جاتا تھا اس کا چہرہ سرخ ہوتا جاتا تھا آنکھیں ملتی جاتی تھیں اور آرسین لوپن کے نام پر پہنچکر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کی جلد جوش خون سے پھٹ جائیگی اور اس کی آنکھیں حلقہ ہائے چشم سے باہر نکل پڑینگی۔ خط پڑھتے میں وہ کئی بار اپنی کرسی پر سے اٹھا اور بیٹھا کچھ تعجب نہیں اگر حامد کو اسے ذہنی کلفت میں دیکھکر مسرت ہو رہی تھی کیونکہ پولیس کا تعصب اور اس کے خلاف اس سے بھی زیادہ کا مستحق تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور اس نے مظفر کے اٹھنے بیٹھنے پر خیال نہیں کیا حالانکہ یہ اس کی غلطی تھی کیونکہ مظفر نے خط کو ختم کرکے نفرت سے اس کی طرف دیکھا تو خود کھڑا ہوا تھا فطرت انسانی بے اختیار کار فرما ہوئی حامد کا ہاتھ خط اٹھانے کیلئے بڑھا اور اس کی نظر مظفر کے چہرے سے ہٹ کے اس جگہ جمی جہاں خط گرا تھا اس ایک لمحے نے بساط کا رنگ پلٹ دیا۔ مظفر بجلی کی طرح تڑپا اور قبل اس کے کہ حامد کو اپنی غلطی کا احساس ہو ——— اس سے قبل کہ کمرے کے باہر کھڑے ہوئے نصف درجن سپاہی اندر آئیں ——— حامد کا پستول مظفر کے ہاتھ میں تھا اور کمرے کا دروازہ بند ———

حامد نے شاید اس اطمینان پر کہ مظفر قتل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا ارادہ کیا اور اُدھر سپاہیوں نے بندوقوں کے کندوں اور لاتوں سے دروازہ توڑنا شروع کیا ———

مگر جب دروازہ ٹوٹتا ہے تو ——— کمرے میں حامد بیہوش پڑا تھا اور دوسرے کمرہ میں جانے کیلئے جو دروازہ تھا وہ کھلا ہوا تھا۔ دو سپاہی حامد کو اٹھانے لگے اور چار بے تحاشہ بھاگے۔ جب تمنتف کر کے کرکے کوٹھی کے دوسری جانب پہونچے تو دور ——— سامنے کی سڑک پر وہی موٹر جا رہی تھی جس کو مظفر نے کوٹھی میں آتے وقت ایک ہوٹل کا پتہ دیکر معہ سامان رخصت کر دیا تھا ——— ہاں کوئی اس موٹر سے ریشمی رومال ہلا ہلا کر وداعی اشارے کر رہا تھا۔

حامد بھی ہوشیار ہو گیا اور چاروں سپاہی بھی اپنے ناکام تعقب سے واپس آگئے پولیس نے بہت کچھ مظفر کو پونا میں ڈھونڈھا بھی مگر دوسرے دن بمبئی کے تمام اُردو اور انگریزی اخبارات میں حسب ذیل خط شائع ہوا ——— اور بس ———

"جناب ایڈیٹر صاحب! مجھے مسٹر حامد کی قسمت پر رونے کے افسوس ہوتا ہے کہ کئی موقعے مجھے گرفتار کرنے کے ان کے ہاتھ سے نکل گئے درحقیقت وہ دوسروں کا پیٹ خود بھرنے کی کوشش کرتا ہے دوسرا اس کے ہاتھ سے اسی طرح لقمہ اڑا لیجاتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ ہندوستان میں ایک جگہ چند بیش قیمتی دستاویزات تھے جن کو حاصل کرنے کیلئے دنیا کی ہر حکومت کوشاں تھی مجھے بھی یہ خبر معلوم ہوئی اور میں نے بھی ان کو حاصل کرنا چاہا جیسا کہ مجھے لوپن نے طعنہ دیا ہے یہ غلط ہے میں کاغذات کو ان کی اصل مالیت میں فروخت کر دیتا ہاں آٹھ لاکھ روپئے مجھے مل جاتے اور خریدار کو یقیناً نقصان رہتا بہرحال ——— یہ کاغذات میں نے تین ماہ کی متواتر کوششوں کے بعد حاصل کئے اور انھیں لوپن لے اڑا ——— مجھ سے لے اڑا۔ درحقیقت وہ نقلی تھانہ دار کسی ہندوستانی ایجنٹ تھا اور جن کمروں میں میرا قیام تھا ان سے اوپر والے کمروں میں رہنے والے مغربی سیاح میری لوپن اور اس کی محبوبہ ..... تھے۔ یہ حال مجھ پر بیخبری میں ایسے قطعی معلوم تھا کہ سلطنتوں کے خفیہ ایجنٹوں کے علاوہ مجھے مغرب کے شاطر چور سیاح لوپن سے بھی کاغذات بچانے ہونگے۔ لوپن کا یہ کہنا کہ وہ مجھے بچانا چاہتا تھا قطعی غلط ہے اور اس کے دماغ کی وہ اپج ہے جو کامیابی کے مفروضہ نشے میں چور ہو کر ہمیشہ اس سے ظاہر ہوتی ہے اور جس کو ہم اس کی ناقابل علاج کمزوری کہتا ہے کیونکہ بقول اس کے میری گرفتاری کا فیصلہ اس نے میری ذہنیت کو دیکھکر کیا اور میری ذہنیت بظاہر اس وقت سے بہت پہلے نمایاں تھی جب میں نے کمرہ باہر سے بند پاکے اسے اناڑی کہا ہے جس کو وہ میرے بچاؤ کی کوشش سے تعبیر کرتا ہے۔ درحقیقت میرے منہ سے اپنی صحیح تعریف سن کر وہ اس کلیہ کے ماتحت کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے غصہ میں بھر گیا اور اس نے مجھے گرفتار کرا دینے کا فیصلہ کر لیا جو کچھ اس نے کیا اس کا نتیجہ یقیناً حسب منشا نکلتا اگر کوٹھی کے دوسری طرف بھی کچھ سپاہی احتیاطاً لگا دیئے جاتے امید کہ آئندہ مسٹر حامد میری ملاقات کیلئے گذشتہ سے زیادہ اور میرے شایان شان انتظام کرینگے۔ رہے کاغذات تو ان کے متعلق میں اعلان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ میری ملکیت ہیں دنیا کی کوئی طاقت اور دنیا کی کوئی شخصیت انھیں میری مرضی کے خلاف اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتی۔ میں انھیں واپس لانے کے لئے لوپن کے ساتھ ساتھ فرانس کا سفر کر رہا ہوں اور فرانس پہونچکر ہی ان کے حصول کی سعی کروں گا اس خط کی نقل میں انگریزی اخبارات اور فرانس کے اخبارات کو بھیج رہا ہوں تاکہ لوپن ہوشیار ہو جائے اور میری طرح بے خبری کا طعنہ نہ دے سکے۔ فرانس پہونچنے سے پہلے میری طرف سے کوئی حملہ نہ ہوگا۔ لوپن مطمئن رہے۔ والسلام ناز۔ رامپوری۔"

آئینۂ خیال!

کتنا فریب زا چمنِ روزگار ہے — روئے خزاں بھی زیرِ نقابِ بہار ہے

میں ہنس رہا ہوں تجھکو ہنسانے کے واسطے — ورنہ مری ہنسی بھی فغاں کا مزار ہے

جو آسکی نہ دامنِ الفاظ و نطق میں — وہ داستاں چند آنسوؤں سے آشکار ہے

گلزارِ ہست و بود کی موجِ ہوا ہے رُوح، — جسم اس ہوا کے رخ پہ نقابِ بہار ہے

دیتے ہو مجھ کو کیوں نگہِ لطف کا فریب — جب خود ہی کہہ رہا ہوں مجھے تم سے پیار ہے

حیراں ہوں ہو رہی ہیں کیوں رسوائیاں وداع — سر پر ابھی جنونِ محبّت سوار ہے

آنکھیں ہنسی میں غرق، زباں پر ہزار حیف — کتنا ستم ظریف مرا غمگسار ہے

سمٹی ہوئی ہے اس میں محبت کی داستاں — وہ آہ جس کا آخری ہچکی مزار ہے

دل بجھ گیا کہ ذوقِ تمنّا ہی مٹ گیا — ان کی بجائے موت کا اب انتظار ہے

روشن ہی جتنا نام ہوں پُردرد اس قدر — کیا میرا نورِ علم بھی شمعِ مزار ہے

اظہر ہے بعدِ عیش کیوں حرماں پہ مضطرب
جس مے کا وہ نشہ تھا یہ اُس کا خمار ہے

اظہر، تلسری

لسان الغیب مغربی لباس میں!

ظفر الملۃ حضرت مولانا ظفر علی خاں قبلہ مدظلہ

بیا حافظ کہ ما خود را بملک دیگر اندازیم

فٹز جیرلڈ کے فصیح و بلیغ ترجمے نے عمر خیام کو یورپ کا مقبول ترین مشرقی شاعر بنا دیا ہے۔ کاش خواجہ حافظؔ کو بھی کوئی فٹز جیرلڈ مل جاتا تاکہ وہ شہرت جو خیام کی رباعیات کو میسر ہوئی ہے حافظ کی بے مثل غزلوں کو بھی حاصل ہو جاتی جن سے زیادہ استحقاق اس شہرت کا شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے کلام کو ہو۔

لیکن ہماری یہ آرزو عبث ہے اول تو وہ تخیل جو مشرقی تغزل کی روح ہے مذاق کے تباین کے باعث مغربیوں کے ادراک ہی سے بالاتر ہے۔ چاکلیٹ کے کھانے والے ریوڑیوں کو پسند نہیں کر سکتے۔ پڈنگ کے شوقین نہیں سمجھ سکتے کہ مزعفر میں کیا مزہ ہے لیکن اگر مذاق مختلف نہ بھی ہوں تاہم ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل کی لفظی و معنوی خوبیاں بدستور قائم رہیں بہت ہی مشکل بلکہ اکثر صورتوں میں محال ہے۔

یہ قول خواجہ حافظ کی شاعری پر بدرجہ اولیٰ صادق آتا ہے کسی مغربی زباندان میں یہ قدرت نہیں کہ حافظ کی غزلوں کو اپنی زبان میں نظم کرے اور اس نظم کے آئینہ میں اپنے ناظرین کو حافظ کے خیال کی اصلی تصویر دکھا سکے۔

بہت سے مغربیوں نے جن کی ایک عمر فارسی کی تحصیل میں صرف ہوئی ہے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے لیکن قدم قدم پر ٹھوکر کھائی ہے مجاز و حقیقت فارسی شاعری میں دست و گریبان ہیں۔ مے باقی سے اسکاچ وسکی کا بچا کھچا پگ ہی مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی شراب معرفت کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ یوسف و زلیخا اس شاعری کی ذو معنی مصطلحات میں عاشقی اور معشوقی ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ وجود مطلق و وجود مقید کے باہمی تعلقات کے اسرار بھی اس میں مضمر ہیں۔ سمرقند و بخارا نام کو ترکستان کے دو معروف شہر ہیں لیکن شاعر کا تخیل ان سے دو دنیائیں مراد لے سکتا ہے۔ غزل ہجر و وصل، سوز و گداز اور ناز و نیاز کے مضامین بیان کا نام ہے لیکن ایشیا کی متصوفانہ صنعت گری نے انہیں مضامین کو روحانیت، یزداں شناسی اور اخلاق کے لطیف ترین نکات کی تفہیم و تلقین کا ذریعہ بنا لیا ہے اس قسم کی ذو معنی شاعری جو قرآن و حدیث اسلامی روایات کے استعاروں اور اشارات و کنایوں سے بھری پڑی ہو کسی طرح انگریزی یا اور کسی مغربی زبان میں اس شان کے ساتھ منتقل نہیں کی جا سکتی ہے کہ اصلی لطف سخن بدستور قائم رہے۔

دیوان حافظ کے یورپ میں متعدد تراجم ہوئے ہیں۔ ہم یہاں ان تراجم کا ایک نمونہ پیش کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ ترجمہ کا کام کیسا کٹھن ہے اور خواجہ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ تو موم کے دانتوں سے کو ہالوہے کے چنے چبانا ہے۔

لفٹنٹ کرنل ولبرفورس کلارک کا ترجمہ

لفٹنٹ کرنل ایچ ولبرفورس کلارک نے حافظ کے کلام کا نثر میں ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ بمقام کلکتہ سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔ کرنل صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ نے بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے۔ ہمارے ناظرین کرام میں سے جو انگریزی سے آشنا ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس لفظی ترجمہ کی شان کیسی ہے؟ کرنل صاحب کے نزدیک غالباً لفظی ترجمہ کا مفہوم یہ ہے کہ مکھی پر مکھی ماری جائے۔ مترادفات اکٹھے کر دیئے جائیں۔ صرف و نحو کے اس فرق کو جو انگریزی و فارسی میں پایا جاتا ہے مطلق ملحوظ نہ رکھا جائے اور لطافت زبان و شستگی بیان تو خیر ایک بالکل ہی جداگانہ امر ہے۔

حافظ کی غزل ہے ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

کرنل ولبرفورس کلارک نے نثر انگریزی میں اس کا نیا پاپچ یوں کیا ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

If that bold one of Shiraz gain
our heart
For his dark mole I will give
Samarkand and Bukhara

جنہیں انگریزی آتی ہے وہ تو ایک نظر میں دیکھ لیں کہ آیا اس لفظی ترجمہ سے مترجم یورپین تصور تک اس حسن بیشال کی ایک جھلک بھی پہنچا سکا ہے جو اس دلربا مطلع کو مطلع انوار بنائے ہوئے ہے جو صرف اردو ہی جانتے ہیں ان کیلئے ہم ذیل میں کرنل صاحب کے انگریزی ترجمہ کا لفظی ترجمہ کئے دیتے ہیں۔

"اگر وہ شیراز کا بہادر ہمارا دل حاصل کرے تو اس کے سیاہ تل کے لئے میں سمرقند و بخارا دوں گا"

"ترک شیرازی" کا ترجمہ آپ نے "شیراز کا بہادر" کیا ہے۔ عبارت کی علم بندش اور طرز ادا ایسی انوکھی ہے کہ کرنل صاحب نے وہی مثل سچ کر دکھائی کہ "نظم خود گفتی حالا نثر من بشنو"

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

Saki give the wine remaining
For in paradise thou wilt not have
The bank of the water of Rukn-
abad nor the rose of the gar-
den of musalla.

"ساقی ادھے شراب بچی ہوئی کیونکہ جنت میں نہ تجھے رکن آباد کے پانی کا کنارہ ملے گا نہ مصلے کے باغ کا گلاب کا پھول"

گلاب کا پھول گلگشت کا ترجمہ ہے جس کے معنی سیر گل یا سیر چمن کے ہیں۔

فغاں کیں لولیاں شوخ و شیریں کار و شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

Alas! these saucy dainty ones
sweet of work, the torment of the city
Take patience from the heart
even as the men of Turkistan
take the tray of plunder.

"افسوس یہ نازنینان شوخ میٹھے کام والیاں شہر کو ستانے والیاں دل سے صبر اسی طرح لیتی ہیں جس طرح ترکستان کے مرد لوٹ کا خوان لیتے ہیں"

"فغاں" کا ترجمہ بیان کرنل صاحب نے "افسوس" کیا ہے لیکن ہم کیا کیا ستم نکالیں یہاں تو مذاق سلیم کا ناطقہ ہی بند ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

The tale of minstrel & of wine utter
little seek of the mystery of time
For this mystery none solved
by skill and shall not solve.

یہاں آپ نے "مے" کا ترجمہ "لو" یعنی عشق کیا ہے لیکن یہ غلطی غالباً سہواً ہوگئی ہے اس لئے کہ گو کرنل صاحب کے ترجمہ میں جابجا خامیاں اور لغزشیں پائی جاتی ہیں پھر بھی یہ بات بعید از فہم ہے کہ آپ جذبہ عشق کو جرعہ شراب کا مترادف سمجھتے ہوں۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

O souls! hear the counsel of
the murshed (or pious wise man)
For dearer than the soul hold
happy youths the counsel of
the wise old man

"اے روح! مرشد (یا پرہیزگار دانشمند شخص) کی نصیحت سن۔ کیونکہ خوش نصیب نوجوان دانشمند پیر مرد کی نصیحت کو روح سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں"

عشق و عاشقی کی گھاٹی سے اتر کر کرنل صاحب دفعتہً تصوف کے کوچہ میں داخل ہوگئے ہیں اور باوجودیکہ لفظی ترجمہ کرنے کے مدعی ہیں پھر بھی آپ نے بجائے ترجمہ کے شعر کی شرح لکھنی شروع کردی اور جاناں "سے معشوق یا عزیز من مراد لینے کے بجائے اس کے معنی "اے روح" لئے ہیں۔ مرشد کی توضیح قوسین میں آپ نے "پرہیزگار دانشمند شخص" کہہ کر کی ہے۔ اس پر عجب نہیں کہ اہل حال کو وجد آجائے۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ سے زیبد لب لعل شکر خارا

O murshid! thou speakest ill -
of me; and now I am happy,
God most high forgive thee
thou speakest well.
The bitter reply suiteth the
ruddy lip sugar eating,

"اے مرشد! تو نے میرا ذکر برائی سے کیا اور اب میں خوش ہوں خداوند تعالیٰ تجھے بخشے تو نے بہت اچھی بات کہی۔ تلخ جواب لال لال شکر کھانے والے ہونٹوں کو زیب دیتا ہے"۔

یہ بھی لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ شرح ہے اور چونکہ حافظ کے شعر کے ظاہری معنی کے علی زعم کرنل کلارک کو معشوق سرخ لب پر کسی شیخ دراز ریش کا دھوکہ نہ ہوسکتا لہذا انہوں نے ضرور اس شعر کے ترجمہ میں کسی ایسے مشرقی ادیب سے مشورہ لیا ہے جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے بجائے زیادہ تر مولانا خواجہ حسن نظامی سے ملتے جلتے ہونگے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ جناب کرنل صاحب "ترک شیرازی" کا ترجمہ "شیراز کا بہادر" کے بجائے "اے مرشد" یا "اے روح" نہ کرتے۔

سر ولیم جونز کا ترجمہ

اسی غزل کا ترجمہ سر ولیم جونز نے نظم میں کیا ہے۔ جو ایک بہت بڑے قادر الکلام ادیب ہیں اور مشرقیات سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ لیکن اس ترجمہ کو تصنیف کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ سر ولیم نے حافظ کا خیال لے لیا ہے۔ اور اس کو انگریزی آب و رنگ دے کر ایک دلکش نظم لکھ ڈالی ہے جسے خاص انگلش مذاق کے مزے لے لے کر پڑھ سکتے ہیں اگرچہ اس میں نہ حافظ کا نمک ہے نہ شیرینی۔ بہرحال ذیل میں حافظ کی پوری غزل، ہر شعر کے نیچے سر ولیم جونز کا ترجمہ اور اس ترجمہ کا اردو ترجمہ ارباب ذوق سلیم کی نذر ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

Sweet maid if thou would charm my sight
And bid these arms thy neck enfold.
That rosy cheek, that lily hand
Would give thy poet more delight
Than all Bocaras vaunted gold
Than all the gems of Samarkand

اے محبوب شیریں حرکات اگر تو مجھے اپنا نظر فریب جلوہ دکھائے۔
اور میرے بازوؤں کو اجازت دے کہ تیری گردن میں حائل ہوجائیں۔
تو تیرا عارض گلگوں اور تیرا کیف نیلوفری
تیرے غزل سرا کو بخارا اور سمرقند کے اس تمام زر و جواہر سے
جس کے افسانے لے منائے جاتے ہیں زیادہ لذت بخش سکتا ہے۔

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلی را

Boy! let yon liquid ruby flow,
And bid thy pensive heart be glad
Whate'er the frowning zealots say:
Tell them their Eden cannot show
A stream so clear as Ruknabad
A bower so sweet as mosellay.

اے طفل (خوش جمال) لالی شراب کا دور چلنے دے۔
اور اپنے مغموم دل کی گھنڈی کھول ڈال۔
کٹر ملا منہ پر بل ڈال کر خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔
ان سے کہدے کہ ان کے باغ عدن میں۔

کوئی ندی ایسی صفا نہیں ہے جیسی کہ نہر رکن آباد ہے۔
اور کوئی چمن ایسا دلفریب نہیں ہے جیسا کہ مصلّےٰ ہے۔

فغاں کیں لولیانِ شوخ و شیریں کار و شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

Oh! when these fair perfidious maids
Whose eyes our dearest haunts infest
Their dear destructive charms display
Each glance my tender heart invades
And robs my wounded soul of rest
As tartars seize their destined prey.

آہ! جب یہ حسین و جمیل مگر پرفریب نازنینیں۔
جن کی آنکھیں ہماری روح کے محبوب ترین گوشوں میں گھسی جاتی ہیں۔
جلوہ فروشی کے وقت اپنی تباہ کن ادائیں دکھاتی ہیں۔
تو ان کی ہر نگاہ (برچھی بن کر) میرے نازک دل میں آ لگتی ہے۔
اور میرے زخمی دل سے صبر و قرار اسی طرح چھین لیتی ہے۔
جس طرح تاتاری لٹیرے اپنے تلکے ہوئے مالِ غنیمت کو اچک لیجاتے ہیں۔

ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

In vain with love our bosoms glow,
Can all our tears, can all our sighs
New lustre to those charms impart
Can cheeks where living roses blow
Where Nature spreads her richest dyes
Require the borrowed gloss of art.

ہمارے سینے میں عشق کا شعلہ بے فائدہ روشن ہے۔
کیا یہ ممکن ہے کہ تمام ہمارے آنسو اور تمام ہماری آہیں۔
اس نورِ حسن میں کسی نئی شعاع کا اضافہ کرسکیں۔
کیا وہ رخسار جن میں گلاب کی نئی پتیاں اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔
اور جن پر مشاطۂ قدرت نے اپنا نفیس ترین غازہ مل رکھا ہے۔
بناوٹ کی مانگی ہوئی آب و تاب کے محتاج ہیں۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

Speak not of fate! ah! change the theme
And talk of odours talk of wine,
Talk of the flowers that round us bloom.
Tis all a cloud. tis all a dream,
To love and joy thy thoughts confine
Nor hope to pierce the sacred gloom.

قضا و قدر کا تو نام ہی نہ لو۔ بلکہ اس مضمون کو بدلو۔
اور بوئے خوش کا یا شراب ناب کا ذکر چھیڑو۔
یا ان پھولوں کی کہانی سناؤ جو چمن میں کھلے ہیں۔
یہ جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے ایک لکۂ ابر ہے یا نقش بر آب ہے!
پس اپنے خیالات عشق و عاشقی اور عیش و راحت تک محدود رکھو۔
اور اس خیال کو دل سے نکالدو کہ اس ظلمات قدس کا سیاہ پردہ
تم سے چاک ہوسکے گا۔

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

Beauty hath such resistless power
That even the chaste Egyptian dame
Sighed for the blooming Hebrew boy
For her how fatal was the hour
When to the banks of Nilus came
A youth so lovely and so coy,

حسن میں اس بلا کی طاقت ہے۔
کہ مصر کی عفت انتساب خاتون کو بھی۔
مہ جمال عبرانی نوجوان کو دل دینا ہی پڑا۔

اس خاتون کے لئے وہ بھی کس قیامت کی گھڑی تھی۔
جب رود نیل کے کنارے پر۔
ایک ایسا دلربا اور شرمیلا نوجوان وارد ہوا۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

But, ah! Sweet maid! my Counsel hear
(Youth should attend when those advise
whom long experience renders sage)
While music charms the ravished ear
While sparkling cups delight our eyes
Be gay and scorn the frowns of age

اے محبوبۂ دلنواز میری نصیحت سن رکھ۔
(اس لئے کہ جوانوں کے لئے بڑے بوڑھوں کی نصیحت سننا۔
جن کو ایک عمر کے تجربے نے دانائی بخشی ہو ازبس مناسب ہے)۔
(یعنی) جب کانوں میں میٹھے راگ اپنا جادو بھر رہے ہوں۔
اور جب جام شراب کے فروغ سے آنکھوں میں سرور کے ڈورے دوڑ رہے ہوں۔
تو شادماں اور خوش وقت ہو اور پیرانہ سری کی تیوری کو ذرا بھی خاطر میں نہ لا

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

What cruel answer have I heard!
And yet by heaven I love thee still
Can aught be cruel from thy lip!
yet say how fell that bitter word
From lips which streams of sweetness fill
Which naught but drops of honey sip

یہ کیا تلخ جواب ہے جو میں نے تیرے منہ سے سنا ہے۔
لیکن خدا کی قسم تیرا عشق ابھی تک میرے دل میں ہے۔
یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جو چیز تیرے لبوں سے نسبت رکھتی ہو اس میں کڑواہٹ ہو۔
پھر بھی مجھے یہ تو بتا کہ یہ تلخ الفاظ کس طرح تیرے لبوں سے نکلے۔
جن میں شیرینی کی نہریں بہ رہی ہیں۔
اور جن کا قوت بجز شہد کی قطروں کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخوان حافظ
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

Go boldly forth my simple lay
Whose accents flow with artless ease
Like orient pearls at random strung
Thy notes are sweet the damsels say
But ah! far sweeter if they please
The nymph for whom these notes are sung

اے میری سادہ غزل جس کے اوزان و قوافی کی روانی میں۔
مشرق کے ان موتیوں کی طرح جو بلا قصد پروئے گئے ہیں۔
بیساختہ پن پایا جاتا ہے جا اور دنیا میں نام کر۔
شاہدان نوخیز کا بیان ہے کہ تیرے نغمے شکریں ہیں۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اور بھی زیادہ شکریں ہوں۔
اگر اس پری کے پسند آجائیں جن کے لئے یہ غزل کہی گئی ہے۔

ارباب وجدان صحیح نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ سر ولیم جونز کا پایہ ادب کرنل ولبر فورس کلارک سے کس قدر اونچا ہے اور حافظ کے خیالات کی ترجمانی کا حق سر ولیم نے بمقابلہ کرنل کلارک زیادہ صحت اور زیادہ خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے پھر بھی آپ ہم ترجمہ نہیں کہہ سکتے اور ہمیں ڈر ہے کہ اگر اسے لسان الغیب رح کے ملاحظہ میں استصوابًا گذرانا جائیگا تو وہ چیں بہ جبیں ہو کر ارشاد فرمائینگے کہ

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کیفیات!

حضرت سحبان الہند علامہ کیفی چریاکوٹی

اُدھر دلبری اور عیاریاں ہیں — اِدھر دلدہی اور ناچپالیاں ہیں!
کہیں حوصلہ ہے کہیں بیدلی ہے — نہ آسانیاں ہیں نہ دشواریاں ہیں!
اِدھر لالہ و گل اُدھر ماہ و انجم! — یہ حسنِ نظر کی طرحداریاں ہیں!
کہیں جوشِ مستی کہیں ہوشِ مستی — کسی کی نظر کی فسوں کاریاں ہیں!
تمنا، تقاضا، امید اور حرماں — دلِ مضطرب کی یہ بیماریاں ہیں!
تجھے دیکھتا ہوں، تجھے پوجتا ہوں — نہ خودبینیاں ہیں۔ نہ خودداریاں ہیں!
چھلکتے دامن و آستین تسلّی!!! — مرے اشکِ غم کی شرریاریاں ہیں!
نہ ہمت نہ طاقت، نہ تسکیں نہ راحت — ستم کی مرے دل میں ناداریاں ہیں!
بہ اندازۂ دل ہیں مینا و ساغر!!! — مری مستیوں میں بھی ہشیاریاں ہیں!
طلبگارِ جاں پھر خریدار دل ہے — قیامت کی یہ گرم بازاریاں ہیں!
قفس آج رشکِ چمن بن گیا ہے — تصور کے ہاتھوں کی گلکاریاں ہیں!
نظر میں ہے جس روز سے تیری ہستی — مجھے اپنی ہستی سے بیزاریاں ہیں!
مرے جرم بخشے گناہوں کو ڈھانکا — یہ غفاریاں اور ستاریاں ہیں!
میں سوتا تھا مجھ کو گلے سے لگایا!! — یہ میرے مقدر کی بیداریاں ہیں!
تسلی کی تلقین بے تابیوں میں، — یہ دلداریاں بھی، دل آزاریاں ہیں!
ترا نام لے لے کے دیتے ہیں تسکیں، — مرا غم بڑھانے کو غمخواریاں ہیں!
چمن میں جو فصلِ بہار آ رہی ہے، — مرے جوشِ وحشت کی تیاریاں ہیں!

سیاہی شبِ غم کی جاتی نہیں ہے
یہ میری ہی کیفی سیہ کاریاں ہیں!!

پیر جی

متانت آمیز ظرافت کا دلچسپ مُرقع

حضرت کوثر چاندپوری

فردوس بریں کا حقدار سب سے زیادہ پیر جی۔ ملا جی، نیز اسی ردیف و قافیہ کے دوسرے لوگوں کو خیال کیا جاتا ہے۔ اس مذہبی استدلال کی رو سے گویا ہمارے "پیر جی" اپنی سادگی اور سادہ لوحی کے اعتبار سے بہشت کے صدر اعلیٰ تھے۔ ان کی سرخ رنگ کی "ذنب الفاری"[1] ڈاڑھی جس کا طول باوجود کم ہونے کے ایک فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا، تنگ پیشانی اور سیاہ آبنوسی چہرہ، لمبا قد۔ نیز اسی قسم کی دوسری خصوصیات ان کے جنتی ہونے کی شاہد عادل تھیں۔

اگرچہ پیر جی بننے کے لئے موٹے دانوں کی ایک لمبی تسبیح، نیچا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ کافی ہے اور یہ اتنی بڑی سند ہے جو ہر جگہ مانی جاتی ہے مگر خاندانی اور اونچے درجہ کے پیر جی کو اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں درکار ہوتی ہیں مثلاً جن پری، آسیب کو دفع کرنے والا تعویذ یا عمل۔ ولادت کو آسان کرنے کی غرض سے کوئی ایسا منتر جو "گڑ" پر دم کرکے کھلا دیا جائے تو نو مہینے سے قبل ہی ولادت کا مرحلہ بہ آسانی طے ہو جائے۔ خوش گلو قوالوں کی ایک ٹولی، حال آنے کی صلاحیت، چور کو پکڑنے کا استخارہ۔

جس طرح کوئی طبیب صدری اور خاندانی تجربات کے بغیر مسند طبابت پر بیٹھ کر قبول عام حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح پیری و بزرگی کے روحانی تصرفات اور کشف و کرامات میں اس وقت تک جذب و کشش پیدا نہیں ہوتی جب تک وہ ان اعمال میں اتنی مہارت پیدا نہ کرلے جتنی ڈاکٹر دار نوف کو غدۂ تعلیم میں یا مہاتما گاندھی کو فاقہ کرنے میں حاصل ہے۔

بہرحال پیر جی آسیب زدہ کو تندرست کرنے میں بہت مشہور تھے۔ ان کا پڑھا ہوا "گڑ" تسہیل ولادت میں اپریشن سے زیادہ موثر تھا۔ قوالوں کا ایک طائفہ بھی ان کا مرید تھا اور قوالی کے جلسوں میں "اللہ ہو" کی تانوں پر ان پر کیفیت بھی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ گھنٹوں حق حق کے نعرے لگاتے رہتے تھے اور چور کا نام معلوم کرنے میں تو بلا شبہ وہ "معتور سراغرسانی" تھے۔

ہمیں تو دہلی کے اسٹیشن پر ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا جب کہ وہ ملاگیری کے لباس میں ملبوس تھے اور اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب کمر پر باندھے ہوئے پلیٹ فارم پر ننگے سر ٹہل رہے تھے۔ ان کی سیاہ اور لمبی زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ سیاہ اور موٹے دانوں کی تسبیح گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ زکوٰۃ کا روپیہ وصول کرنے کی غرض سے بمبئی، سورت، وغیرہ کی طرف جا رہے تھے کیونکہ گذشتہ سال ان اطراف میں ایسی ایسی فتوحات ہوئی تھیں کہ وہ آسانی سے اپنی پختہ خانقاہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پیر جی کے ایک عقیدتمند مرید نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔

"آپ پیر . . . . صاحب ہیں! آپ مسٹر مولانا حضرت . . . . . وغیرہ ہیں . . . . . ."

"خوب!"

"ماشاء اللہ!"

"دولت خانہ؟ پیر جی!"

"عدم آباد، پیر جی نے مدارج سلوک سے صعود کرتے ہوئے کہا جناب کا مشکدہ؟"

---

[1] ڈاڑھی کی بہت سی قسمیں ہیں، ذنب الفاری اس ڈاڑھی کو کہتے ہیں جو چوہے کی دم کی طرح اوپر سے موٹی اور نیچے سے بتدریج پتلی ہو۔ کوثر

"امپیریل ہوٹل، ضلع چاندنی چوک"۔

"ہوں" پیر جی نے اپنی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے عارفانہ انداز میں فرمایا۔

"کہاں کا قصد ہے؟" ہم نے دریافت کیا۔

"آدمی ہستی سے نیستی کی طرف جایا کرتا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا۔

"مگر اس کے لئے ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ کسی حکیم حاذق کا نسخہ یا، ماہر ڈاکٹر کا اپریشن کافی ہوتا ہے اور آپ نے لیا ہے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ"۔

ہماری تقریر کے جواب میں پیر جی صرف مسکرا دیئے اور تھوڑی دیر خاموش رہکر پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے؟"

"ٹکٹ تو بمبئی کا ہے۔ مگر جاؤں گا آگے!"

"یعنی؟"

"یعنی جدہ یا کم از کم بصرہ"۔ ہم آہستہ آہستہ پیر جی سے بے تکلف ہو رہے تھے کیونکہ ایسے مقدس حضرات کی صحبت بے تکلفی ہی کے عالم میں کچھ مزہ دیتی ہے۔

"ہمارا آپ کا دور تک ساتھ رہیگا"۔ پیر جی نے کہا۔

"کیا معنی؟" پیر جی میں تو فی الحال نیستی کی جانب جانے کو تیار نہیں ہوں اور آپ جا رہے ہیں بقول اپنے سیدھے قبرستان! میں کہاں تک آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں، کسی ہم عمر کو لیجیئے بندہ نواز!"

"فی الحال تو آپ ہی ہاتھ لگے ہیں"۔ پیر جی نے بہت برجستگی سے کہا۔

"پیر جی! آپ کے ساتھ میں زندہ درگور ہونے کے لئے تو تیار ہوں۔ مگر حوروں کا حشر تک انتظار کرنا پڑیگا۔ اور دنیا میں اگر آپ مجھے چھوڑ دیںگے تو غالبا آئندہ مہینہ میں شادی ہو جائیگی"۔

پیر جی ٹہلتے ٹہلتے تھک گئے تو اپنے سامان کے ڈھیر پر بیٹھ گئے اور پھر دری بچھا کر ناشتہ دان کھولنے کا قصد کیا۔ ہمیں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یقینا وہ ہمیں بھی اس "خوان یغما" پر مدعو کرینگے۔ ہم نے کہا۔

"کیا کھانے کا وقت آگیا پیر جی؟"

"ہو تو گیا۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہے"۔

"چلئے ہوٹل میں تازہ کھانا مل جائے گا"۔

"میں اس کھانے کو ناپسند کرتا ہوں"۔

"مگر اسٹیشن کے ہوٹل میں نہایت عمدہ کھانا تیار ہوتا ہے۔ میں کھا چکا ہوں۔ بہت لذیذ ہوتا ہے پیر جی!"

"تاہم کراہت سے خالی نہیں"۔

"ممکن ہے۔ مگر ہوٹل میں ہندوستانی ملازم ہیں۔ کوئی ناجائز چیز نہیں آتی۔ مجھے خوب معلوم ہے۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں"۔

ہم پیر جی کو لے کر اسٹیشن کے ہوٹل میں پہنچے اور کھانا طلب کیا۔ ان کے مرید بھی ساتھ تھے مگر وہ ہمارا تعارف کرانے کے بعد بالکل گونگے ہو گئے تھے، تھوڑی دیر میں کھانے کی فہرست آگئی۔ ہم نے بریانی، قورمہ، کباب۔ اور اسی قسم کے "پیر پسند" کھانے منگائے۔ کھانا میز پر چنا گیا تو پیر جی نے آنکھیں بند کر کے دو تین منٹ تک کچھ پڑھا۔ پھر چھو چھو کی آواز کے ساتھ انھوں نے کھانے کو اپنے سانس کے جراثیم سے مسموم کیا۔ پیر جی نے آنکھیں جو کھولیں تو اپنی بحر کا ایک آدمی سفید لباس پہنے ہوئے ہماری کرسی کے پیچھے کھڑا پایا۔ پیر جی نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ بھائی کھانا کھا لو"۔

ملازم اگرچہ ہمارے احکام کا منتظر تھا اور اسی لئے کمربستہ کھڑا ہوا تھا مگر پیر جی کا یہ حکم اسے کچھ عجیب سا معلوم ہوا وہ ان سنی کر گیا۔ پیر جی نے پھر ذرا زور سے کہا۔ "بڑے میاں آؤ! کھانا کھا لو"۔ بڑے میاں نے حیرت سے پیر جی کو دیکھ کر کہا۔ "بسم اللہ کیجیئے!" غالبا وہ سمجھ گیا کہ پیر جی ہوٹل کی دنیا میں بالکل ہی نو وارد ہیں۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ پیر جی اللہ والے آدمی ہیں برائے نام ہی کھائیںگے مگر وہ تو بات یہ ہے کہ پیر اور ملا کے پیٹ کی گہرائی خدا ہی کو معلوم ہو تو ہو۔ آپ کے غلام نے پورے دو روپیہ کا کھانا کھا کر بھی ڈکار نہ لی۔ بل جو آیا تو فقط بریانی کی سات پلیٹیں حساب میں درج تھیں۔ حالانکہ ہم دونوں کے حصے میں ایک ایک پلیٹ آئی تھی گویا پوری پانچ پلیٹیں پیر جی نے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صاف کر دی تھیں ہم نے اپنی اس باقاعدہ "حجامت" کی اجرت میں مبلغ چار روپیے

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب

پیر و ملا وظیفہ خود داری

پڑھتے ہوئے میز پر ڈالدیئے۔ اور چلنے کیلئے کھڑے ہو گئے،

چائے بھی پی لینی چاہئے، پیر جی نے مصری لہجہ میں فرمایا،

ضرور یہ تشنگی جہاد ظہر مکمل نہ ہونا چاہئے،

چاو چکر پیر جی نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی فرمائی گر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے اس کار خیر کا ثواب اپنے پیر و مرشد کی روح پر فتوح کو پہنچایا یا ہمارے بزرگوں کی ارواح کو۔ پھر ڈاڑھی پر اوپر سے نیچے کو ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔

"جزاک اللہ! خوب سیر ہو کر کھایا۔"

"جی ہاں! الحمد للہ بمبئی تک کو فارغ ہو گئے۔"

پیر جی کی دو تین گھنٹہ کی معیت سے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آدمی ہیں عقل سے پیدل اور اگر بے تکلف احباب ساتھ ہوں تو ان سے خوب لطف اٹھایا جا سکتا ہے معلوم ہوا کہ وہ چشتیہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوالی سے بہت ذوق ہے، اور حالت کیفیت میں جس پر نظر ڈال دیتے ہیں وہ بیخود ہو جاتا ہے۔ اتنے احوال و کوائف کا علم ہو جانے پر ہم نے ڈاکٹر ذوقی کو گوالیار تار دیدیا کہ میل سے پہنچوں گا! دس بجے کے قریب پنجاب میل گوالیار پہونچا ذوقی مع اپنے موٹر کے موجود تھے ہم نے پیر جی سے کہا ایک دن آرام کر لیجئے۔ کل بمبئی چلیں گے۔ پیر جی نے بہت معذرت کی۔ لیکن ذوقی بھی ایک بلائے بے درماں تھے ہمارا اشارہ پاتے ہی پیر جی کو لپٹ گئے۔ "ابھی قبلہ! کہاں جائیگا تنہا! سفر میں جان و مال دین و ایمان سب ہی کا خطرہ ہوتا ہے اور پھر بمبئی کا سفر! قدم قدم پر دل چھینے جاتے ہیں آپ تو ہیں خدا کے فضل و کرم سے صوفی۔ کہاں کہاں بچے گا۔"

یہ سب باتیں ذوقی نے ایک ہی سانس میں نہایت روانی اور بے تکلفی سے کہہ ڈالیں۔ ہم نے سامان اتارنا شروع کر دیا۔ اور سب سے پہلے پیر جی کے کیش بکس پر ہاتھ صاف کیا۔ پیر جی سٹ پٹا سے گئے اور انکار کرنے کی ہمت باقی نہ رہ گئی مجبوراً اتر پڑے۔

رات کو ہماری تحریک اور پیر جی کی تائید سے قوالی کا جلسہ منعقد کیا گیا۔ شہر کے چیدہ چیدہ قوال بلائے گئے۔ پیر جی کو مسند صدارت پر بٹھایا گیا۔ قوالی شروع ہوئی اور دو گھنٹہ تک پیر جی آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ بالکل بت بنے رہے ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ قوالوں نے بے انتہا کوشش کی کہ پیر جی ذرا تو اپنی جگہ سے ہلیں مگر کچھ اثر نہ ہوا ذوقی نے ہمارے کان میں کہا۔ "میاں یہ جنت کا الو تو ہلتا بھی نہیں۔ ہم نے کہا گھبراؤ نہیں بس اب ناچتا ہے۔"

آخر ایک بڈھے تجربہ کار قوال نے ع

از حسن ملیح تو شورے بجہاں کردی

ہاں ہاں بجہاں کردی ــــ اے ہاں بجہاں کردی۔ کی رٹ لگانا شروع کی۔ اس کے دو تین تانوں ہی میں پیر جی اکھڑ گئے۔ پہلے پیر جی نے بیٹھے بیٹھے رومال کمر سے کسا اور پھر دو تین بار حق حق کا نعرہ لگانے کے بعد کھڑے ہو گئے پھر دفعتہً ایک مرتبہ اچھلے۔ اس کے بعد پھر کیا تھا۔ پیر جی کبھی قوال کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے تھے کبھی طبلہ والے کا منہ چوم لیتے تھے اور کبھی ہارمونیم بجانے والے کو لپٹ جاتے تھے۔ دو ایک دفعہ ہماری جانب بھی وہ ہاتھ اٹھا کر "بھورے ریچھ" کی طرح دوڑے لیکن ہم اس کام کے بالکل اہل نہ تھے اس لئے سب سے پچھلی صف میں جا بیٹھے۔

جب بہت دیر ہو گئی اور پیر جی ہوش میں نہ آئے تو ذوقی کا خانساماں جو سر گھٹنے ہوئے قریب ہی بیٹھا تھا بگڑ گیا اور اللہ ہو ــــ حک۔ حک (حق حق) کہہ کر صف سے نکل آیا۔ پیر جی نے جو دیکھا کہ حریف آ گیا تو یہ بھی اللہ ہو اللہ ہو پکارتے ہوئے لپکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں صوفی تنا پہلوان یا پہلوان نما صوفی گتھ گئے۔ خانساماں موٹا تازہ، طاقتور آدمی تھا۔ دونوں وقت یخنی پینے والا ہٹا کٹا جوان۔ پیر جی کو دبا کر بیٹھ رہا۔ جیسے شکاری چیتا ہرن کو دبوچ لیتا ہے اور ہر اللہ ہو کی ضرب کے ساتھ اس نے پیر جی کی گدی پر کہنیوں سے گھٹ لگانا شروع کر دیئے۔ پیر جی خانساماں کی اس حقانیت کو تو سہ گئے لیکن اس ظالم نے اندر ہی اندر نہ معلوم کیا پیچ کھایا تھا کہ پیر جی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ــــ "ہائے رے مرگیا، بچاؤ ــــ دوڑو ــــ جلدی ــــ دم گھٹا سانس رکی ــــ ارے میں مرا۔"

قوال کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سازندے پریشان ہو گئے، ہم بھی گھبرا گئے سب کے سب یک وقت خانساماں پر حملہ آور ہوئے خدا جانے شربت فولاد کا اثر تھا یا کچلہ کی گولیوں کا اس میں اتنی طاقت تھی کہ بڑی مشکل سے اس کمبخت نے پیر جی کا گلا چھوڑا۔ پیر جی گوالیار کے زلزلہ سے چھوٹ کر دھم سے گدے پر گر گئے تھوڑی دیر کے بعد بولے "ہماری ہی حماقت تھی۔ کیوں اتنی سخت توجہ ڈالی کہ وہ برداشت نہ کر سکا اور آپے سے باہر ہو گیا ــــ دیکھا۔ آپ نے کیا اثر ہوا؟"

"ہم نے تو صرف دیکھا آپ نے آزمایا بھی۔" ذوقی نے کہا۔

جلسہ ختم ہونے پر ہم نے خانساماں سے دریافت کیا تو اس نے کہا شیطان نے سلام نہ کر کے رکھدیا گلے کا۔ سب روپ لطفی ہو رہی تھی۔ میں نے کہا

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ یہی کیا یاد کرے گا کسی سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے تعویذ کے بہانے تمہاری کرامات کا مزہ دیا بلکہ ایسا ہی تھا کہ چاہیں بول گیا۔ بھاڑے کا ٹٹو تھا ہم نے پوچھا کیا واقعی تمہیں حال آگیا تھا؟" کہنے لگا جی حال وال کیا میاں میں نے تو اسے خاموش کرنے کی ترکیب کی تھی "

ذوقی کے کہنے سے خانساماں اور تین چار دوسرے آدمیوں نے پیر جی سے بیعت کر لی۔ وہ اپنی اس تازہ کرامت سے بہت مسرور ہوئے ہر جگہ انھوں نے بار بار اپنے اس روحانی تصرف کا تذکرہ کرکے ہم سے حلفیہ شہادت دلائی لگے دن ہم پیر جی کے بمبئی روانہ ہو گئے۔ خانساماں کو پیر جی نے اپنا خلیفہ بنا کر دوسرے مریدوں کو اس کے احکام کی تعمیل کا پابند کیا۔ خانساماں کو دو تین تعویذ لکھ کر دیئے۔ کچھ وظیفے بتائے۔ قوالی کے جلسوں میں شریک ہونے اور کیفیت طاری کرنے کے آداب و قواعد تعلیم کئے۔ اور واپسی میں گوالیار قیام کرنے کا مستقل وعدہ کیا۔

دو مہینے کے بعد پیر جی بمبئی سے گوالیار واپس آئے اور خانساماں کے مکان پر فروکش ہوئے۔ روزانہ ان کی قیام گاہ پر قوالی ہوتی تھی اور کبھی پیر جی کو کبھی خانساماں کو اور کبھی دوسرے برادران سلسلہ کو حال آتا تھا۔ پیر جی نے مسلسل تین ماہ تک گوالیار میں قیام کیا۔ اس طویل وقفہ کی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں اپنے ایک مرید کی بہن سے پاک محبت ہو گئی اور انھوں نے اس خاندان کی روحانی بلندی اور نجات اخروی کا وعدہ کرکے اس سے شادی کا پیام دیدیا۔

ذوقی کو معلوم ہوا کہ پیر جی عشق حقیقی کے بام بلند سے حسن مجازی کی پستی میں گر گئے ہیں تو انھوں نے خانساماں کو بلا کر ضروری ہدایات کر دیں۔ تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ پیر جی ضروری انتظامات میں مصروف تھے۔ وہ بمبئی سے دو تین ہزار روپیہ لائے تھے اس لئے خوب دل کھول کر صرف کر رہے تھے۔

خانساماں نے عرض کیا۔ "پیر و مرشد! وسمہ اور مہندی کے خضاب سے آپ بوڑھے معلوم ہوتے ہیں کوئی انگریزی خضاب لگائیے جو بالوں پر شباب کی سیاہی پیدا کر دے" ———— ارشاد ہوا ———— "لاؤ بازار سے کوئی اچھا سا خضاب!"

خانساماں دوپہر کو بازار سے خضاب کی شیشی لے کر پہونچا اور سفوف پانی میں گھول کر اچھی طرح پیر جی کی داڑھی میں اور حسب موقع ان کی زلفوں میں لگا دیا۔ خانساماں اس کام سے فارغ ہو کر لاہور چلا گیا۔ پیر جی منہ دھو کر بیٹھے تو ان کی ڈاڑھی میں "تپ چڑھ" ہونے لگا۔ خارش ہی نہ کرب حالات پر اور پھر گھبرائے۔ بہت گھبرائے آئینہ دیکھا تو اپنے خلاف قلندر معلوم ہو رہے تھے۔ آخر گھر بند کرکے مراقبہ میں مصروف ہو گئے اور دو دن تک باہر نہ نکلے۔ پھر صبح تک ہی بات کو فرار ہو گئے۔

خانساماں نے لاہور سے لکھا۔ "امید ہے پرانے بالی گر کر نئے سیاہ بال نکل آئے ہونگے۔ یہ خضاب بہت عمدہ ایجاد ہوا ہے لیکن اشتہاری چیز ہے۔ صحیح حال تجربہ کے بعد معلوم ہوگا"

پیر جی "سنبل الطیب" سے "ریشہ خطمی" ہونے کے بعد اس قابل نہ رہے کہ گوالیار میں رہتے کلکتہ چلے گئے۔ سنا ہے آج کل بھی وہ خانساماں کا "بد رنگ خضاب" استعمال کر رہے ہیں۔

دنیا میں سب سے بڑا پیر جی وہ ہے جس کے پاس "حب" کا کوئی زبردست تعویذ یا عمل ہو چنانچہ ہمارے پیر جی نے جب سے پیری مریدی کا مطلب شروع کیا تھا ان کے پاس عشق کے ہزاروں مریض آئے تھے اور انہیں اس سلسلہ میں آمدنی بھی کافی ہوتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ جو حاجتمند آجاتا تھا وہ ایک مرتبہ کے بعد دوبارہ نہ آتا تھا وجہ یہ تھی کہ پیر جی نذرانہ یا ہدیہ لیکر تعویذ دے دیا کرتے تھے یا خود ہی عمل پڑھ دیتے تھے مگر ضرورتمندوں کا کام نہ ہوتا تھا دو چار ایسے "عاشق جانباز" بھی ان کے یہاں آئے جو ناکامی کے بعد پیر جی سے "ڈوئل" لڑنے پر تیار ہو گئے چنانچہ جس طرح طبیب بغیر دست شفا کے بیکار ہے اسی طرح پیر جی بھی بغیر عمل حب۔ البتہ صرف فرق یہ ہے کہ مرد طبیب سے لڑنے نہیں آتا اور ناکام و مایوس عاشق پیر جی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ پیر جی بدنام ہونے لگے اور ان کے عقیدتمندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں کمی ہونے لگی۔ یہ اتنا بڑا نقصان تھا جو کسی طرح بھی پیر جی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

انھیں معلوم تھا کہ ہمزاد تابع کر لینے سے اس قسم کے کاموں میں بہت سہولت ہو جاتی ہے انھوں نے طے کر لیا خواہ کتنی ہی محنت کرنی پڑے ہمزاد کو فوراً مطیع کر لینا چاہیے۔ پیر جی نے پانچ چھ روپے کی کتابیں منگائیں اور ہمزاد کو قابو میں کرنے کے اوراد و وظائف پڑھنا شروع کر دیے کبھی قبرستان میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھتے کبھی آدھی رات کے وقت قبرستان میں جا کر مردے

کی کھوپڑی سامنے رکھ کر منتر پڑھتے۔ دو تین مہینہ اسی تگ و دو میں گذر گئے لیکن مقصود حاصل نہ ہوا۔ آخر یار لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ پیر جی ہمزاد تابع کرنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے شہر کے ایک نیم پاگل فقیر کی نسبت مشہور کر دیا کہ اس کے پاس بہترین عمل ہے پیر جی وقت بے وقت درویش کے یہاں حاضری دینے لگے اور جب موقع ملتا اپنا مقصد بھی کہہ دیتے۔ مجذوب اپنے ہوش و حواس ہی کو خیرباد کہہ چکے تھے انھیں ہمزاد سے کیا بحث۔ ایک دن پیر جی کے جانے سے پہلے کاغذ کے پرزے پر ٹائپ میں یہ عبارت لکھ کر مجذوب کو دیدی گئی۔

" یا مردائیل یا عزرائیل دو ہزار مرتبہ ویران اور سنسان مقام پر چالیس روز تک آنکھیں بند کر کے رات کے وقت پڑھو ۔
ترک حیوانات کرو، دل مضبوط رکھو، خبردار خوف مت کھانا
آئندہ ہرگز ہمارے پاس نہ آنا ورنہ نقصان ہوگا ——— "

جس وقت پیر جی آئے مجذوب نے پرچہ ان کو دیدیا کیونکہ ان کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا۔ پیر جی کو معلوم تھا کہ مجذوب قطعاً جاہل ہے اور لکھنے پڑھنے سے عاری۔ ان کو خیال ہوا کہ یقیناً یہ مجذوب کی روحانی کرامت ہے اور اس کے "تیر بہدف" ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اسی دن سے انڈے۔ گوشت۔ مچھلی کو ترک کر کے پیر جی نے عمل شروع کر دیا۔ شہر کے باہر ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا مزار تھا۔ نہایت تاریک اور آبادی سے دور اسی کو منتخب کیا گیا۔ رات کو گیارہ بجے پیر جی ہمت کر کے وہاں گئے۔ اگرچہ پیر جی اس سے پہلے بھی یہ کام کر چکے تھے۔ تاہم مزار میں داخل ہوتے وقت وہاں کے بھیانک منظر کو دیکھ کر ان کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اور بدن میں ایک کپکپی پیدا ہو گئی۔ پیر جی تھے مستقل مزاج۔ پھر اس امتحان میں کامیاب ہو جانے پر ان کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں وہ آنکھیں بند کر کے مزار کے اندر گھس گئے اور جلدی جلدی یا مردائیل یا عزرائیل پڑھنے لگے۔ سانس پھولی ہوئی تھی ڈر کے مارے ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے۔ آنکھیں بند کرتے ہی محسوس ہونے لگا کہ ہمزاد آگیا۔ بدحواسی میں بار بار گنتی بھول جاتے تھے۔ بہت چاہتے تھے کہ آنکھیں بند رہیں لیکن ذرا سی آہٹ پر خود بخود آنکھیں کھل جاتی تھیں پہلے دن تقریباً تین گھنٹے صرف ہو گئے عمل ختم کرتے ہی پیر جی لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے مزار سے چلے نہیں بلکہ بھاگے۔

رفتہ رفتہ پیر جی کی دہشت کم ہو گئی۔ سات آٹھ روز کے بعد صرف معمولی الجھن باقی رہ گئی۔ بعض تجربہ کار لوگوں نے ان کو بتایا تھا کہ جلالی وظائف کا اثر ساتویں روز سے شروع ہو جاتا ہے ذرا ہوشیار رہنا۔ آٹھویں دن ایک صاحب ہمزاد بنے۔ اور پتلا سا مضبوط بید لیکر مزار میں پہنچ گئے۔ پہلے ادھر ادھر ٹہلتے رہے تاکہ پیر جی کو گمان ہو کہ ہمزاد کی آمد و رفت ہونے لگی۔ پیر جی پیروں کی آہٹ پر کان لگائے احتیاط سے عمل پڑھنے میں مصروف رہے بار بار جی چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کر ہمزاد کو دیکھیں مگر رجعت کے خوف سے ایسا نہ کر سکتے تھے ایک مرتبہ ہمزاد نے پیر جی کے قریب پہنچ کر ان کی کمر پر زور سے بید رسید کیا۔ پیر جی بلبلا اٹھے تاہم انھیں یقین ہو گیا کہ ہمزاد اطاعت سے بچنے کی تدبیر کر رہا ہے اس وقت ذرا سی کمزوری میں کام بگڑ جائیگا۔ بید لگنے کی تکلیف معمولی تو نہ تھی مگر پیر جی پی گئے۔ اور پھر دل ہی دل میں وظیفہ پڑھنے لگے۔

ہمزاد نے ایک ——— دو ——— تین ——— پے در پے چار بیتیں رسید کیں پیر جی کی کھال ادھڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوا کسی نے سرخ مرچیں پیس کر زخم میں بھر دیں بہت ضبط کیا لیکن "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکل ہی گئی۔ بڑی مشکل سے پیر جی نے عمل جاری رکھا۔ اب یہ کیفیت ہو گئی کہ ادھر ہمزاد بید رسید کرتا ہے۔ ادھر پیر جی چیخ اٹھتے ہیں یا مردائیل یا عزرائیل۔ خدا خدا کر کے وظیفہ ختم ہوا اور گھر آ کر پیر جی نے چوٹوں پر ہلدی اور چونے کا لیپ کیا۔ دوسرے دن پھر وہی مصیبت نازل ہوئی۔ مختصر یہ کہ انتیس دن تک پیر جی کبھی روزانہ اور کبھی دو تین کا وقفہ دیکر پٹتے رہے۔ انتالیسویں دن پیر جی کو بری طرح زدوکوب کیا گیا اب نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ بید سے گذر کر ہمزاد نے ان سے کشتی بھی لڑی اور مزار کے فرش پر پیر جی کو زور سے پٹک دیا۔ چالیسویں دن کا پیر جی کو سخت انتظار تھا یہی فیصلہ کی تاریخ تھی۔ وہ یقین کر چکے تھے کہ بازی جیت لی۔ چالیسویں دن بھی پیر جی کی خوب مرمت ہوئی پٹتے پٹتے سارا بدن متورم ہو گیا مگر پیر جی اپنی دھن سے باز نہ آئے آخر ہمزاد ہی کو ان کی سخت جانی پر رحم آ گیا۔

پیر جی عمل پورا کر کے منتظر تھے کہ ہمزاد آ کر سوال کریگا "بتاؤ کیا کام ہے؟" میں کہونگا فلاں شخص کی آرزو پوری ہو جائے اس کی حسب منشا شادی کرا دو۔ انھوں نے مزار میں ٹھہر کر بہت انتظار کیا۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو وہ گھر چلے آئے اور سمجھے کہ عمل میں کوئی حسرت باقی رہ گئی۔ شاید بدپرہیزی ہو گئی ہو۔ ممکن ہے بیوی نے گوشت کا چمچہ دال میں ڈال دیا ہو۔ گھر آ کر انھوں نے بیوی سے کہا ——— !

"کمبخت! تم نے ہماری ساری محنت اکارت کر دی۔"
"کیوں کیا ہوا؟ تمہیں میری جان کی قسم۔"
"ہوتا کیا! مل بگڑ گیا!"
"کیوں؟ تمہیں اپنے بچّہ کی قسم۔"
"تم نے گوشت کا چمچہ شاید ہماری ترکاری میں ڈال دیا کبھی بھول کر۔"
"تمہارے سر کی قسم۔ کبھی نہیں۔"
"کبھی تو؟"
"مجھے یاد نہیں پڑتا۔ اپنے ابا کی قسم!"
بیوی نے اتنی قسمیں کھائیں کہ پیرجی کو مجبوراً یقین آگیا۔ اور اس طرف سے وہ مطمئن ہوگئے۔

کوثر چاندپوری۔

غزل

از جناب محمد عبدالحمید خاں صاحب خیالی

اثر میں ہیں لبِ جاں بخش کے چشمِ فسونگر کے
ہماری زندگی کیا ہے کہ ہم جیتے ہیں مر مر کے

ملے ہیں خاک میں منصوبے آذر جیسے بُت گر کے
خبر کیا تھی۔ خدا بن جائینگے پتلے یہ پتھر کے

محبت کی خطا سو بار ہوگی حضرتِ ناصح!
نہیں کرکے نہیں پچھتاتے ہیں پچھتاتے ہیں کرکے

پتہ عقبیٰ کا دیدیتی ہے دنیا اہلِ بینش کو
کہ آنگن سے نظر آجاتے ہیں پچھن جو ہیں گھر کے

کھلیں گی حشر میں خود بینیاں ان حُسن والوں کی
تعجب کیا اگر شاکی ہوں آئینے سکندر کے

ہمیشہ کے لئے اپنا مجھے مقروض رکھ ساقی
پلا ایسی کہ بس چک جائیں جھگڑے زندگی بھر کے

نہ جا دیوانگانِ عشق کی بے جوڑ باتوں پر
یہ سب جادو جگاتے ہیں تری چشمِ فسونگر کے

کہو ایسے کا آنا اور وعدہ پر نہ آنا کیا!!!
بگڑ بیٹھے جو مجھ سے ہائے، اپنی چھاؤں سے ڈر کے

کیا ہے آپ ہی کے دوستوں نے آپ کو رسوا
یہی ڈھاتے ہیں لنکا، اور بھیدی ہیں یہی گھر کے

نہ موتی ہیں، نہ یہ ہیرے کی کنیاں ہیں، نہ تارے ہیں
تو پھر کیوں آپ آنسو گن رہے ہیں دیدۂ تر کے

خدا داد و میں کی اے خیالی یاد کیا بھولوں
اگر ہوتے تو ہوتے آج وہ میرے برابر کے

نذرِ تبانِ حرم

ابوالاقبال حضرت علامہ عیش فیروزپوری

سب تیری مُرادیں بر آئیں تو پوری مرادِ دل کر دے
آسانیوں میں رہنے والے آسان مری مشکل کر دے

میری ہی طرح یہ کہتا ہوا نکلا ہے مہِ نو گردوں پر
او نور کے پتلے بام پہ آ۔ ناقص ہوں مجھے کامل کر دے

وہ اٹھی گھٹا مستانہ گھٹا مستی برسانے والی گھٹا
اک جام مجھے دیکر ساقی بیخود کر دے غافل کر دے

ہر وقت شکن ہے ماتھے پر ہر وقت کشیدہ ہیں ابرو
ایسا تو نہ ہو یہ تیری ادا برباد سکونِ دل کر دے

پروانوں کے یوں جل جانے سے اے شوخ مزاجی جلتا ہے
دکھلا کے رخِ انور کی جھلک گل شمعِ سرِ محفل کر دے

دیدار طلب آنکھیں اپنی پھر خون کے آنسو کیوں روئیں
وعدوں میں اگر وہ وعدہ شکن کچھ رنگِ وفا شامل کر دے

پھر ڈھونڈنے اس بُت کو جائیں پھر ٹھوکریں در در کی کھائیں
مجبور ہیں ہم اے عیش حزیں جو فیصلہ اپنا دل کر دے

گلہائے پریشان

جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدرآباد

انتقام! انتقام!! کس سے؟ قدرت سے، کس کا؟ بربادیٔ محبت کا، شکست تمنا کا، خون آرزو کا، ——— اقدام محبت کا واقعی میں ہی مجرم ہوں لیکن میرا اقدام بالکل اضطراری تھا، ایک غیر محسوس طاقت نے میرے دل میں چٹکی لی، اور میں محبت کی خوشگوار کسک محسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل بیکار ہے، اب میں وہاں ہوں، جہاں تباہیوں کے مہیب آتش فشاں پہاڑ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ بربادی کے خوفناک اژدھوں کی پھنکاریں میرے جسم کو کپکپا رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے سوال کے جواب میں دنیا والے "جبر و اختیار" کے ژولیدہ مسئلہ پر بحث شروع کر دینگے اور میرا مفہوم خبط ہو کر رہ جائیگا۔ لیکن میں اس نوع کی موشگافی کی حقیقت اچھی طرح جانتا ہوں۔ دنیا مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی، دلائل و براہین میرے درد دل کا مداوا نہیں کرسکتے۔ ٹوٹے ہوئے دل اور پھٹے ہوئے جگر کا منطقی دلائل سے اندمال کس طرح ممکن ہے؟ شکستہ آئینہ کو نسیم صبح کس طرح جوڑ سکتی ہے؟ بہتا ہوا خون سورج کی کرنوں سے کس طرح تھم سکتا ہے؟

سپید ہنس ہوں یا کالے کوتے۔ مجھے سب بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ گورے گالے میں امتیاز تو وہ کرے جو توحید پر ایمان نہ رکھتا ہو ——— میری میز پر جاپان کا بنا ہوا بہترین کھلونا بھی رکھا ہے اور اس کے قریب ہندوستان کی بنی ہوئی بدنوا بد صورت۔ مگر قسم لے لو جو میں نے ان دونوں میں سے کبھی ایک کو گھٹیا ہو۔ اور دوسرے کو بڑھایا ہو ——— میرے پاس پیرس کا سلا ہوا ایک سوٹ ہے اور اسی سوٹ کیس میں قصبہ کے درزی کا تیار کیا ہوا سوٹ بھی محو راحت ہے ——— لیکن میری نگاہ میں دونوں برابر ہیں ——— نینی تال سے آتے ہوئے میں نے تھوڑی دیر سکنڈ کلاس میں سفر کیا اور اس کے بعد تیسرے درجہ میں آبیٹھا۔ مگر میرے جسم نے کوئی تغیر محسوس نہ کیا ——— نرم و ملائم قالین اور سخت و کھردرے تخت میرے لئے یکساں ہیں ——— میری اس حالت کو شاید دنیا کا متمدن طبقہ "جنون خام" سے تعبیر کرے گا۔ یا کم سے کم مجھے "بے حس" بتلائے گا۔ لیکن نہ میں مجنون ہوں اور نہ بے حس ——— مجھے تو ان لوگوں کی حالت پر رونا آتا ہے جو "جسم" کی راحت کے لئے "روح" کو مجروح کر ڈالتے ہیں۔ جو نیکی اور برائی میں کوئی تمیز نہیں کرتے لیکن گورے کالے، کڑوے میٹھے اور نرم و سخت کو بہت جلد محسوس کر لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں انصاف سے بتاؤ کہ میں "مجنون" ہوں یا "دنیا" لیکن مجھے خوب معلوم ہے کہ میرے طعنوں سے تہذیب و تمدن کی بے حیا دیوی کی پیشانی پر غیرت و ندامت کا ایک آدھ قطرہ بھی نمودار نہیں ہوسکتا۔

سورج کی کرنوں کو سرمہ بنا دو، گلاب کی خوشبو کو پیس ڈالو۔ بلبل کی "تانتا" کو کچل دو۔ بلبل کے نغمہ کو پارہ پارہ کر دو۔ کہ یہ سب چیزیں میری توجہ کی راہ میں "سنگ گراں" بنی ہوئی ہیں ——— میں نے صبح آنکھ کھولی ہی تھی کہ سورج کی کرن نے میری ان آنکھوں کے اطمینان کو ڈانواڈول کر دیا۔ جو شب میں "بزم قدس" کے نظاروں سے لطف اندوز ہو چکی تھیں ——— میں باغ میں نہ معلوم کس لئے گیا تھا؟ لیکن گلاب کی مست خوشبو اور بلبل کے دلکش نغموں نے میرے خیال کو تھوڑی دیر کے لئے مرکز سے ہٹا دیا۔ مسجد میں مجھ پر استغراق طاری تھا۔ ذرا نظر اٹھائی کہ دیوار پر جلد کے نکتے جگمگا رہے تھے، میری توجہ میں انتشار پیدا ہو گیا ——— اگر ان چیزوں کو فنا نہیں کیا جا سکتا، تو پھر مجھ میں اتنی طاقت پیدا کر دی جائے کہ کوئی "دلکشی" مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکے اور دنیا کی بوقلمونیوں کا جادو مجھ پر نہ چل سکے۔

مسکراتی ہوئی کلیوں کی قسم! جو تم کو متبسم دیکھ کر ذرا بھی مسکرایا ہوں یہ تم سے کس نے کہدیا کہ تمہاری مسکراہٹ پر میں ہنسا تھا۔؟ ہائے! تم نے

سوچے سمجھے بغیر اس کا یقین بھی کر لیا ——— انصاف سے بتاؤ کہ وہ شخص جس پر بجلیاں لوٹ رہی ہوں مسکرا سکتا ہے؟ ان نظارہ کا میں مشکور گنہگار ہوں لیکن اس گناہ کا مجرم میں تنہا ہی نہیں۔ آسمان کے تارے۔ باغوں کے پھول۔ شبنم کے قطرے۔ دریا کی موجیں سب کے سب مجرم ہیں کہ یہ تمہارے "تبسم" کا نظارہ کر رہے تھے۔ اگر مجھے سزا دینا چاہتے ہو تو سب سے پہلے آسمان کو جلا کر خاک کر دو۔ باغوں کو اجاڑ دو۔ دریاؤں کو خشک بنا دو ——— میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کسی سے بھی باز پرس نہیں کی جاتی اور اس کا سبب شاید یہی ہے کہ میں کمزور ہوں اور مجرم نا کردہ گناہ؟

مسہری پر پھولوں کے باسی ہار دیکھ کر بدگمان ہو جانے والے! تجھے غیرت محبت کی قسم! سچ سچ بتا کہ واقعی تو مجھ سے بدگمان ہے؟ یا یہ صرف مزاح لطیف ہے یا خوشگوار چھیڑ چھاڑ ——— ؟ اگر تو بدگمان ہے تو مجھے ماتم کرنا چاہیے، اپنی ناکام محبت اور خام جذبہ شوق پر! ہیں اور فریب محبت! ہمالیہ کی چوٹیں آگ بن کر مجھ پر برسیں۔ سمندر کی لہریں شعلہ جوالہ کی صورت میں مجھ کو گھیر لیں محبت ایک جذبہ بسیط ہے جس کا کسی صورت میں مختلف الکیف ماہیتوں میں تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ میرے کاشانۂ دل میں جو تیری یاد سے معمور ہو چکا ہے کسی دوسرے کی یاد گھر کر سکے۔ اس کے جواب میں تم مسکراتے ہوئے کہہ دوگے کہ "عشق است و ہزار بدگمانی"، مگر خطا معاف! میں محبت کے مذہب میں بدگمانی کو کفر سمجھتا ہوں۔

گذشتہ زلزلہ پر ہندوستان کے اخبارات نے بڑے دردناک مقالے لکھے، کوئی شک نہیں کہ حادثہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا ہی دردناک ہے اگرچہ بدقسمتی سے بعض پابندیوں کی بنا پر صحیح اطلاعات نہیں مل سکیں مگر یتیموں کی فریادوں اور بیواؤں کی آہوں کو سننے والوں نے کانوں سے سنا اور دیکھنے والوں نے آنکھوں سے دیکھا ——— تم نے ہمیشہ "شعر" کا مضحکہ اڑایا ہے۔ لیکن تمہارے سامنے عمر خیام کی ایک رباعی پیش کرتا ہوں۔ ان اخبارات کے جن پر تم مٹے ہوئے ہو تمام فائلوں کو تلاش کرو اور پھر انصاف سے کہو کہ شاعر نے جس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کسی ایڈیٹر کی نظر اس طرف پہنچ سکی؟ اگر میرا دعویٰ صحیح ہے تو پھر آج سے توبہ کرو اور پھر کبھی شعر کے خلاف ایک حرف زبان سے نہ نکالو، سنو، سنو، صحیفۂ فطرت کا پیام سنو"

آنانکہ کہن شدند و آنانکہ نوند،
ہر یک بمراد خویش لختی بدوند،
ایں ملک جہاں بکس نماند جاوید،
رفتند و رویم و دیگر آیند و روند،

کتاب یادگار رضائی

جو ملکی ادویہ اور ہند کی جڑی بوٹیوں کی مشہور و نایاب کتاب جس کا عرصہ دراز سے انتظار تھا اور ملک میں بکثرت اس کی مانگ تھی اس کی جلد اول

انجمن اطبائے یونانی حیدرآباد دکن کے

اہتمام سے طبع ہو چکی ہے۔ انجمن کے قابل اطبا نے اس نادرالوجود کتاب کو مختلف زبانوں کے نام اور قابل قدر اضافوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے میں کامیاب کوشش کی ہے اور ادویہ کے مختلف زبانوں کے ناموں کی مکمل فہرست کا بھی اضافہ کیا ہے۔

جلد اول ۶۰۰ صفحات طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت مبلغ پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ غیر ممالک کو پانچ روپیہ کلدار میں بشمول مصارف پارسل وغیرہ میں دی جاویگی۔ جلد ثانی زیر طبع ہے۔ ذیل کے پتوں سے طلب فرمائیں،

(۱) یونانی طبی بورڈ۔ واقع روبروئے ڈیوڑھی نواب سالار جنگ بہادر (۲) شفا خانہ محمودیہ واقع جلال کوچہ،

حکیم ابوالفدا محمود احمد معتمد انجمن اطبائے یونانی
ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

گیارہ نشتر

جناب مولانا ماہر القادری صاحب

ہو چکی بیمارِ الفت کو تسلی ہو چکی ایک دزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے

کر رہی ہے درحقیقت کام ساقی کی نظر میکدے میں گردشِ ساغر برائے نام ہے

کچھ نہ پاکر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پا لیا زندگی سب سے بڑا دھوکہ ہے انساں کیلئے

جانے کب ہو جائیں سازِ دل کے پردے نغمہ ریز ہر نفس کو گوش بر آواز ہونا چاہیئے!

ساقی کی نگاہوں کا پرستار نہ چونکا دیں قلقلِ مینا نے صداؤں پہ صدائیں

تھا دل کو تری برق نگاہی سے تعلق شیرازۂ ہستی ابھی برہم نہ ہوا تھا

آشوبِ دہر نے ترے دامن میں لی پناہ تو نے پناہ لی مرے بزمِ خیال میں

رحمت کی شانِ شکر کے آنسو بہا کے دیکھ یعنی ہجومِ غم میں کبھی مسکرا کے دیکھ

چمن میں سوگ ہے اس بدنصیب غنچے کا جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

دنیا ہے بس اک گردشِ ساغر مرے نزدیک عقبیٰ ہے فقط جنبشِ مینا مرے آگے

بھید کھل جائے بقا کا جو کہیں اے ماہر آدمی موت پہ سو جان سے قرباں ہو جائے

نجّو!

بازار والوں کی گفتگو کا ایک سچا اور پیارا خاکہ

از قلم صاحبزادہ قیصر واجدی

"آج ہرگز نہیں چھوڑوں گا اسے۔ مجھے مہینہ بھر سے پریشان کر رکھا ہے"۔ رمضانی کنجڑا نجو کا ہاتھ پکڑے ہوئے چیخ رہا تھا "بھلا دیکھو تو سہی ذرا میری آنکھ بچی اور ایک بڑا سا تربوز لے کے بھاگا اور پھر کمبخت نے چھلکے بھی میرے ٹوکرے میں لا ڈالے"۔ لوگ ہنسنے لگے۔ "بڑا شریر ہے بھئی"۔ تھوڑے سے لوگ اور جمع ہو گئے اتنے میں بدّھو نانبائی اپنی دوکان سے کودتا ہوا آیا۔ "کون ہے! وہی خیراتی کا بیٹا نجو، مت چھوڑیو رمضانی۔ کل میرے تنور میں پیشاب کر گیا تھا۔ بھلا بتایئے اس میں اس کا کیا دھرا تھا۔ شربت والے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "میاں بس کیا پوچھتے ہو۔ اک ذرا بیڑی لینے سامنے تک گیا تھا کہ شربت کے بھرے ہوئے مٹکے میں کیل سے چھید کر دیا۔ اتنے میں واپس آؤں سارا شربت بہ گیا"۔ ساتھ ہی نبو اڑی بولا۔ "میری دکان کی الائچیاں کبھی چھوڑتا ہی نہیں پکا چور ہے"۔ اور میری شکر تو ساری اسی کے پیٹ میں جاتی ہے بدھو نے ایک جرم اور بڑھا دیا۔ سامنے حلوائی بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا وہ بھلا کیوں خاموش رہتا۔ وہیں سے چیخ کر بولا۔ "ابھی اس کا کیا ہے میری مٹھائی کے تھال کئی دفعہ اٹھاکے لیجا چکا ہے۔ خدا بچائے ایسے لونڈے سے۔

مجمع کے ساتھ جرائم کی فہرست میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور ابھی نہ معلوم کتنے دعوی اور تھے اگر کوئی جاکر اس کے باپ خیراتی کو خبر نہ کرا تا۔ خیراتی اس بازار کا مشہور آدمی تھا سارے دکانداروں پر اس کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ بتاشوں پر کھانڈ کی بنی سوغات و گٹا کر میٹھے والے کی سیاسی ہی کیا لیکن خیراتی کو بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار تک "خیراتی میاں" کہہ کر پکارتے تھے۔ اسے جو خبر ملی تو جلتا بھنتا آیا۔ سارا قصہ پہلے ہی سن چکا تھا آتے ہی ایک دھپ رسید کیا۔ "کیوں بے۔ باز نہیں آئیگا ؟" تو اپنی حرکتوں سے ابے؟ ساتھ ہی ایک لات بھی دی اور ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچا "چل ادھر کو" ایک ہی دم کر دیا اس سے تو مر جاتے تو اچھا"۔ اب اس سے بھی نہ رہا گیا طفلانہ وقار سے گردن بلند کی اور بولا "اچھا مر جائینگے"۔ پھر کچھ خیال آیا مڑ کر کہنے لگا "میں مر جاؤں تو بہت رونا آتا ہے گھر کے پھر تپاؤں۔ ابے تو مر جائے تو مجھے چین پڑ جائے"۔ باپ کے ان الفاظ نے اس پر بہت اثر کیا۔ مجبوراً آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ چوٹ کی تو اسے پرواہ بھی نہ تھی لیکن بازار میں پٹنے کا یہ پہلا موقع تھا اسے بڑی شرم آ رہی تھی۔

گھر آ کر پلنگ پر لیٹ رہا۔ کچھ دیر سوچتا رہا لیکن قرار کہاں شرارت کے بغیر تو ایک لمحہ بھی جینا مشکل تھا۔ کچھ سوچتا ہوا اندر کوٹھری میں گیا۔ ماں کا پرانا ڈوپٹہ پڑا ہوا تھا اس کا گوٹہ پھاڑا اور ایک کنکر باندھ کر پھیرانے لگا آج اس کے پاس پتنگ تھا نہ ڈور سوچا تھوڑی دیر کوٹھے پر چڑھ کر پتنگ بازی کا لطف دیکھوں ذرا شام ہو جائے اور بابا گھر آ جائے تو ان سب بازار والوں کی خبر لونگا جو مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے ایک دفعہ ہی مٹھیاں بھینچیں اور بندر کی طرح جست کر کے دیوار پر سے کودتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا آج یہ محلے کے لونڈے کہاں مر گئے ذرا لنگر ہی لڑاتے۔ چھت کے برابر ہی بجلی کا کھمبا کھڑا تھا۔ دور تک اس کے تار پھیلے ہوئے تھے شرارت جو سوجھی تو اسی میں لنگر ڈال دیا۔ گوٹہ پیتل کے تاروں کا بنا ہوا تھا آناً فاناً میں بجلی سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ایک جھٹکا سا لگا اور وہ نیچے آ پڑا۔ گرنے کی آواز سن کر لوگ بھاگتے ہوئے آئے تو دیکھا کہ شرارت کا پتلا نجو خاک پر بیجان پڑا ہے۔

کسی نے جاکر اس کے باپ خیراتی کو خبر کی اس نے سر پیٹ لیا اور گھر کی طرف دوڑا ذرا سی دیر میں بجلی کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ بازار بھر میں تہلکہ مچ گیا جدھر دیکھو اسی کا ذکر جہاں سنو اسی کا چرچا۔ سب افسوس کرنے لگے۔ آہ بازار کی رونق چلی گئی۔ اب کس کے قہقہے بازار میں گونجیں گے۔ راہ چلتے دیہاتیوں کی دھوتیاں

تک اب کون بیٹھ ہانکے گا ہائے نجو اب تو نہ ہوگا نہ تیری فوج نہ وہ دھوم دھام۔
کھڑا رمضانی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "بازار کا تو وہ راجہ تھا راجہ"
جھونا نبائی نے افسوسناک لہجے میں اس کی تائید کی۔ ہاں جی بازار بھر
میں اس کا حکم چلتا تھا۔ شربت والا بھی منہ بسور کر بولا۔ "بس جی اپنے ساتھ
بازار کی رونق بھی لے گیا۔" پنواڑی کو بھی افسوس ہوا کہنے لگا "اس کا
غم ہم سے بھلایا نہ جائیگا۔" پھر چوڑیے ٹھنڈی ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "ہرگز
بھی نہیں۔ جب دن بھر بازار سونا پڑا رہے گا تو اس کی یاد آکے ستائیگی"

حلوائی سے بھی چپکا بیٹھا نہ گیا گلوگیر آواز سے بولا۔ "وہی کو کرتا
ہی تھا لیکن بازار والوں کے کام بھی بہت آتا تھا۔ ہم لوگوں سے اسے
اتنی محبت تھی جتنی اپنی اولاد کو ہاکے پر ماتما۔"

یہ وہی بازار والے تھے جو کچھ دیر پہلے اسے زندہ چبا جانے کو تیار تھے
خیراتی دو مہینے تک گھر سے نہیں نکلا۔ شاید اسے
"چین پڑ گیا ہو۔"

قیصر

راحؔ ریحانی!

ناوکِ بے پناہ نے مارا — ان کی چلتی نگاہ نے مارا
مفت میں عشق ہو گیا بدنام — حُسن کی رسم و راہ نے مارا
کچھ توجہ بھی، کچھ تغافل بھی — پرسشِ گاہ گاہ نے مارا
شکوۂ جور ہم کریں کس سے؟ — سخنِ عذر خواہ نے مارا
داغ دل اور ہو گئے روشن، — جلوۂ رشکِ ماہ نے مارا
حشر میں مجھ سے جانچ ہوتی ہے — اُف، حسابِ گناہ نے مارا
کیا اثر کا گلہ ہو ریحانی؟ — نارسائی آہ نے مارا

ریحانی حیدر آباد۔ دکن

رُباعیات

کس درجہ ہوا اوجِ کمالِ ہستی — اک اک نے کیا دل سے خیالِ ہستی
انجام فنا کچھ نہ تھا مٹنے کے سوا — ہم کو نظر آیا یہ مآلِ ہستی

ہے غل ہوا دار و مدارِ ہستی — اڑنے کو ہے آمادہ غبارِ ہستی
اک روز فنا ہو گی فنا نذرِ خزاں — مٹ جائیگی دنیا سے بہارِ ہستی

ہے پیشِ نظر روز کتابِ ہستی — کھلتا ہے نئے طور سے بابِ ہستی
ہونا بھی ہمارا ہے مصیبت یعنی — ہستی بھی ہے دنیا میں عذابِ ہستی

دیکھی بھی نہ تھی ہم نے بہارِ ہستی — اڑنے لگا دنیا سے غبارِ ہستی
کیا کہئے فنا ہستی موہوم کا حال — مفقود ہوئے نقش و نگارِ ہستی

[illegible]

سرگذشت حیات

شباب اور ضعیفی میں کبھی اتحاد نہیں ہوا ـــــ جوانی اور بڑھاپے میں اتفاق ناممکن ہے ـــــ پیری و بچپن میں بعد المشرقین ہے۔

شباب مسرتوں اور دلچسپیوں کا گنجینہ ہے۔

ضعیفی افکار و آلام کا خزانہ ہے۔

جوانی موسم گرما کے خوشگوار صبح کے مانند ہے۔

بڑھاپا خزاں کا خشک اور ناگوار موسم ہے۔

شباب موسم گرما کی طرح گرم اور تند خو ہے۔

پیری موسم سرما کے مانند سرد و ساکت ہے۔

شباب دلعزیزیوں اور سحر طرازیوں کا نام ہے۔

ضعیفی سفر حیات کے خاتمہ کا پیغام ہے۔

شباب نازک مزاج ہے اور ضعیفی دائم المریض ہے۔ شباب پرشور و قیامت خیز ہے لیکن ضعیفی خموش و صلح پسند ہے۔ جوانی وحشی ہے اور ضعیفی مہذب ـــ لیکن اے مہذب پیری مجھکو تیری سنجیدگی سے نفرت ہے۔ اے غیر مہذب جوانی دیوانی مجھ کو تجھ سے عشق و الفت ہے۔

اے ضعیفی تف ہے تجھ پر کہ اس قدر متانت اور دیانت کے باوجود سفر حیات میں میری رفیق مسرت جوانی کی حق تلفی کر کے جام حیات کے شیریں قطروں کو اپنی آمیزش سے تلخ و بدمزہ کر رہی ہے۔

شکسپیر ـــ مترجمہ ⟵ قادری احمد محسن صاحب کاکوروی

فلسفۂ محبّت

از جناب محمد جلال الدین احمد صاحب ایڈوکیٹ الٰہ آباد

ایک گھنے جنگل سے گھری ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر لمبے درختوں کی سبزی سے محصور ایک پرانا محل ہے۔ اس باغ کا منظر جو اس محل کے چاروں طرف ہے کبھی گھنے جنگلوں کے اندر سے اور کبھی پڑوس کے گاؤں سے دکھائی دیتا ہے۔ محل کے سامنے چند قدم پر ایک پتھر کا مصنوعی طشت ہے جس میں سنگ مرمر کی نسوانی مورتیں غسل کرتی نظر آتی تھیں اور اس قسم کے طشت یکے بعد دیگرے پہاڑ کے ڈھال میں اخیر تک نصب ہیں اور ایک چشمے کا پانی بصورت آبشار دوسرے میں سے گذر کر تیسرے میں گرتا ہے۔ اس دیہاتی محل سے لیکر جس میں اس نازآفریں مہ جبین کی جس کا شباب گذر چکا ہو شان تھی۔ ان پتلے راستوں تک جن پر خلقت ارضی کی نبضیں جم گئیں تھیں اور جو گذشتہ نسلوں کی یاد تازہ کر رہے تھے ہر چند اپنے قدیم انداز میں وہ نما تھی اور ہر شے پرانی رسم و رواج، عشق و محبت کی باتیں اور حسین عورتوں کے خوشنما سامان و آرائش کی یاد تازہ کر رہی تھی۔

لوئی کو ئنز کے چھوٹے ملاقات کے کمرے میں جس کی دیواریں گڈریوں اور خوبصورت دیہاتی عورتوں اور گھونگھر والے بالوں کے بہادر دیہاتیوں کے جذبات کی مصوری کر رہی تھیں ایک نہایت سن رسیدہ عورت ایک وسیع آرام کرسی پر لا یعنی اس طرح لیٹی ہوئی ہے کہ اگر وہ حرکت نہ کرے تو لوگ اسے مردہ تصور کریں۔ اس کے دبلے پتلے ہاتھ بلا حس و حرکت لٹک رہے ہیں۔ وہ ٹکٹکی لگائے فاصلے کے منظر کو اس طرح دیکھ رہی ہے گویا اس کی آنکھیں باغ میں اُس کی جوانی کی خیالی تصویروں کی متلاشی ہیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے وقتاً فوقتاً جڑی بوٹی اور پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوائیں آ آ کر اُس کے سفید بالوں کو اس کے پرشکن پیشانی پر بکھیرتی اور اس کے خیالات کو قدیم واقعات کی یاد سے بھر دیتی ہیں۔ اس کے پاس ہی نیچی گدے دار چوکی پر ایک لڑکی جس کے لمبے خوبصورت بالوں کی چوٹیاں گندھی ہوئی ہیں، بیٹھی بیز کوشش کا رہنے میں معروف ہے۔ اُس کی آنکھیں خمار آلود ہیں اور گو بظاہر اس کی نازک انگلیاں سوئی کے کاموں میں معروف معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے خیالات کہیں اور چکر لگا رہے ہیں۔

ضعیفہ (اس سے مخاطب ہو کر) برتھا! اخبار پڑھ کر مجھے سناؤ۔ بعض وقت یہ معلوم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟"

لڑکی (اخبار پر نظر ڈال کر) اس میں جو حصہ سیاسیات کا ہے اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں؟'

ضعیفہ۔ نہیں پیاری نہیں!— کیا اس میں محبت کے افسانے نہیں ہیں اگر پرانے زمانہ کی طرح بہادری کے ساتھ عورتوں کے بھگا لیجانے کی باتیں نہ ہوں تو یہ سمجھو فرانس میں مردانگی کا خاتمہ ہو چکا۔

لڑکی (کچھ دیر ادھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد) لو، ایک واقعہ افسانہ "...ت" کے عنوان سے درج تو ہے۔

ضعیفہ (اپنے پرشکن چہرہ پر ایک متبسمانہ انداز کے ساتھ) بہتر ہے۔ مجھے پڑھکر سناؤ۔

برتھا نے پڑھنا شروع کیا۔ "ایک تیزاب کے استعمال کرنے کا مقدمہ۔ ایک زوجہ نے اپنے شوہر کی محبوبہ سے انتقام لینے کے لئے اس کے چہرے اور ناک کو گندھک کے تیزاب سے جلا دیا تھا۔ مقدمہ میں وہ بری ہو گئی اور بلا اس بات کے کہ اس کے اخلاق پر کسی قسم کا دھبہ آئے وہ عوام کی ہمدردی کے ساتھ واپس آئی۔

ضعیفہ (اپنی کرسی پر بے چینی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے) خوفناک!

نہایت خوفناک، پیاری اس قصہ کو چھوڑ کر کچھ اور پڑھو۔

برتھا کو ڈھونڈنے سے قانونی خبروں کے تحت میں ایک مضمون تاریک ڈرامہ کے عنوان سے ملا۔ ایک دوکاندار کی لڑکی ایک نوجوان کے حسن کا شکار ہو گئی تھی جس نے اپنے عاشق کی تلون مزاجی کا اس کو پستول مار کر انتقام لیا۔ نوجوان ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا۔ صاحبان جوری نے جو عمدہ اخلاق رکھتے تھے اس عورت کے بے ضابطہ معاملات عشق سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے اس کو عزت کے ساتھ بری کر دیا۔

اس خبر سے ضعیفہ سخت متنفر ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں اس طرح بولی۔ "کیا آج کل تم سب پاگل ہو گئے ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ آسمانی خدا نے تم کو محبت عطا کی اور صرف یہی ایک چیز ہے جو زندگی کو قابل قدر بنا سکتی ہے۔ اس میں انسان بہادری کا اضافہ کرتا ہے جس سے ہماری زندگی کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ لیکن کس قدر اندھیر کی بات ہے کہ تم لوگ اس میں تیزاب اور پستول شامل کرتے ہو جس کی مثال ایسی ہے جس طرح نفیس شراب میں کثافت ملا دی جائے"۔

برتھا (اس غصہ کا سبب نہ سمجھ کر) دادی! کیا تم نہیں دیکھتی کہ اس عورت نے جائز انتقام لیا۔ ذرا یہ تو سوچو کہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے شوہر نے اس کے ساتھ بیوفائی کی تھی۔

اس پر ضعیفہ قریب قریب کرسی سے اچھل پڑی اور کہنے لگی۔ "لڑکیو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل تم لوگوں کی کیسی عقلیں ہو گئی ہیں؟"

لڑکی۔ دادی جان! شادی ایک پاک تعلق ہے۔

ضعیفہ کے دل میں نفرت کی لہر پیدا ہوئی کیونکہ اس کا دل اب تک اس بہادرانہ عاشقی کا قائل تھا جس میں اس نے نشو و نما پائی تھی اور اس طرح گویا ہوئی "میری پیاری بچی سن! محبت ہی وہ چیز ہے جو پاک ہے۔ میں بڈھی ہو گئی ہوں اور میں نے تین پشتیں دیکھی ہیں۔ میں مردوں اور عورتوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شادی اور محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ شادی صرف گھر آباد کرنے کے لئے ہے [illegible] گھر کی آبادی سوسائٹی کے لئے ضروری ہے اس لئے سوسائٹی شادی کو متروک نہیں کر سکتی۔ اگر سوسائٹی ایک زنجیر ہے تو شادی اس کی کڑیاں۔ اور ان کڑیوں کو اس قسم کی دھات سے جوڑنا ضروری ہے۔ معاشرتی اصول۔ معاشرتی ذرائع اور تربیت تینوں مساوی درجہ پر ہونا چاہئیں تاکہ ان کے امتزاج باہمی سے وہ باتیں حاصل ہوں جن کو دولت اور اولاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ شادی صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے اور اس لئے کہ لازمی ہے لیکن محبت زندگی میں ہزار مرتبہ ہو سکتی ہے کیونکہ یہ فطرت کا اقتضا ہے۔ شادی ایک قانون ہے لیکن محبت ایک ایسی طبعی خواہش ہے جو ہم کو کسی جانب متوجہ کر سکتی ہے، ہم لوگ اپنے خواہشات فطری کو روکنے کے لئے مجبوراً قانون بناتے ہیں لیکن پھر بھی خواہشات فطری اس قدر قوی ہیں جن کا زیادہ روکنا غلطی ہے کیونکہ وہ خداداد ہیں اور قانون انسان کا بنایا ہوا ہے میری پیاری! اگر زندگی میں کچھ محبت نہ ہوتی جس طرح بچوں کی دوا میں شیرینی ملائی جاتی ہے تو کوئی زندگی کی پروا نہ کرتا۔

برتھا (حیرت سے آنکھیں کھول کر) دادی جان عشق صرف ایک مرتبہ ہوتا ہے۔

ضعیفہ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے گویا کہ بہادری کے بیجان خدا کو زندہ کرنا چاہتی ہے۔ "تم لوگ ایک ذلیل دنا تربیت یافتہ جماعت ہو گئے ہو (غصہ سے) آج کل کے لوگ ایسے ہی ہیں —— انقلاب زمانہ سے دنیا ویسی نہیں رہ گئی ہے۔ تم لوگ معمولی افعال کو با اثر الفاظ کے ساتھ وقیع بنانے کی کوشش کرتے ہو۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کو تم لوگ اپنے فرائض کی تکلیف دہ اصولوں سے خراب نہ کرتے ہو۔ تم لوگ مساوات باہمی اور ایسی محبت پر اعتقاد رکھتے ہو جو ہمیشہ قائم رہے۔ آج کل کے شعراء کا قول ہے کہ لوگ محبت میں جان قربان کر سکتے ہیں ہمارے زمانہ میں ایسے اشعار کہے جاتے تھے جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مرد عورتوں کے ساتھ محبت کریں۔ جب کوئی شہسوار ہماری آنکھوں کو بھا لیجاتا تھا تو ہم لوگ اپنا پیغام اس کے پاس بھیجتے تھے۔ اور جب ہمارا دل کسی نئے شخص کی طرف راغب ہوتا تھا تو پرانے کو خیرباد کہتے یا دونوں سے تعلقات قائم کر لیتے تھے"۔

ضعیفہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم نمایاں ہوا۔ اس کی بھوری آنکھیں اس نسل کی جس کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ تمام دنیا سے علیحدہ مختلف ضمیر سے بنائی گئی ہے اور ایسی فضا میں رہنے کی عادی ہے جو طبقہ عام سے بالا تر ہے مخصوص و غیر عادی حسیات سے چمکنے لگیں۔

برتھا (جذبات سے زرد ہو کر) اگر یہی حالت تھی تو عورتوں کی عزت و آبرو بھی کوئی چیز نہ تھی۔

ضعیفہ (مسکراہٹ روک کر۔ اس میں اگر والٹیر کی طنز آمیز باتیں تھیں تو روسو کے فلسفہ کا بھی تھوڑا اثر تھا)۔ عزت کا کیا سوال ہے کیونکہ ایک شخص جب محبت کرتا تو بجائے شرم کے اس پر فخر کرتا۔ پیاری ہمارا کیا ذکر ہے فرانس کی بڑی سے بڑی خاتون اگر بلا عشق کے ہوتی تو تمام دربار اس کا مذاق اڑاتا تھا

اور ان لوگوں کے لئے جو متضاد زندگی بسر کرنا چاہتے تھے ہمیشہ گرجے کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ خدید تمہارا یہ خیال ہے کہ شوہر سوائے اپنی بیوی کے اور کسی سے محبت نہیں کرتے۔ کاش ایسا ہی ہوتا! میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ شادی صرف سوسائٹی کے تحفظ اور اس کے قیام کے لئے ضروری ہے لیکن شادی یقین مانو ہماری فطرت کے خلاف ہے۔ زندگی میں جو سب سے بہتر چیز ہے وہ محبت ہے اور تم لوگ محبت کے متعلق غلط فہمی کے مرتکب ہو کر اس کو برباد کر دیتے ہو۔ یا تو تم اس کو ایک سنجیدہ اور مقدس چیز بنا دیتے ہو یا اس کا سودا اس طرح کرتے ہو کہ گویا ایک لباس خرید رہے ہو۔

بڑھیا (ضعیفہ کے پرشکن ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر) دادی جان اب زیادہ نہ لکھئے۔

اس کے بعد آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ دوزانو ہو کر اس نے خدا سے عمر اس بڑے جذبے کے لئے دعا کی جس کا نام محبت ہے اور جو ہمیشہ قائم رہے یعنی وہ محبت جس کا کہ آج کل کے شعرا صرف خواب دیکھتے ہیں۔

اس پر ضعیفہ نے جو اس وقت تک اس معقول اور سادہ سپیری سے متعلق متاثر تھی جس میں اٹھارویں صدی کے فلسفیوں کی نشو و نما ہوئی تھی اپنی پوتی کی پیشانی پر بوسہ دیکر بولی "میری پیاری ہوش میں آ کہیں تیرے لغو خیالات تجھے متاسف نہ کریں۔

(ترجمہ) محمد جلال الدین احمد،

تبصرہ!

اَل ـ بَیّنات،

مرتب :- جناب محمد سلیم صاحب،

ملنے کا پتہ :- ناظم دفتر ال ـ بینات ـ امراوتی ـ (برار)

قیمت :- فی جلد مجلد دو روپے ـ عہ/

مقام مسرت ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات سے تعلق روز بروز ملک میں میلان بڑھتا جا رہا ہے اور ضروریات زمانہ کے مطابق مطالب وحقائق قرآنی پر مفید کتابیں اردو زبان میں شایع ہوتی جا رہی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے چھ ابواب رکھے ہیں (۱) مذہبیات (۲) جسمانیات (۳) اخلاقیات (۴) معاشرت (۵) معاشیات اور (۶) اجتماعیات۔ پھر ہر باب کے تحت میں کئی عنوانات ترتیب دیکر ہر عنوان کے ذیل میں آیات قرآنیہ جمع کر دی ہیں اور ان کے بالمقابل بامحاورہ اور مطلب خیز اردو ترجمہ دیدیا ہے اور جہاں ضرورت سمجھی ہے مزید وضاحت اور تشریح کے لئے اشارات کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ پوری کتاب ۲۳۰ صفحات میں ڈیڑھ سو عنوانوں پر مشتمل ہے۔

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ "الاصباح" کے عنوان سے ہے جس میں تعلیمات قرآنیہ سے مسلمانوں کی غفلت اور اس کے نتائج۔ قرآن کے درس و تدریس اور طریقہ تعلیم کی نوعیت و اہمیت پر بہت پر زور موثر اور بلیغ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان معنوی محاسن کے علاوہ کتاب صوری اعتبار سے بھی اوصاف حسنہ سے مزین اور دلکش ہے۔ کتابت روشن طباعت اعلیٰ کاغذ سفید چکنا۔ تقطیع اور جلد خوشنما ہے جلد کے اوپر سنہرے حروف میں کتاب کا نام کندہ ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب ہر شخص کے پاس ہونا چاہئے اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور پڑھانا چاہئے۔ تاکہ احکام الٰہی اور کتاب مقدس کی روشن تعلیمات کا ضروری علم انہیں ہو جائے۔ مذہبی درسگاہوں اور ہائی اسکولوں اور کالجوں میں جہاں دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلی جگہ دینی چاہئے۔"

آنے والا لمحہ!

اے آنے والے لمحے! — تو ایک لطیف خواہش — اور ایک سکون پرور احساس ہے — مگر — خاص صورتوں میں — تو ایک بھیانک سانحہ — اور کاروان غم کا علمبردار ہے۔

اے آنے والے لمحے! سچ بتا — کیا تو شاہ خاور کے دوش بدوش طلوع ہوتا ہے — یا — زمین کے ساتھ تو بھی محو رقص ہے۔؟

ماضی — چرخ دوار — یعنی نیلے رنگ کے حباب میں — موج ہوا کی طرح رقص کر کے فنا و بقا کا اہم مسئلہ سمجھا گیا۔

حال — واقعات کی شکل میں — خواب گذشتہ کی تعبیر بتلا رہا ہے۔

مستقبل — یعنی تو — نہ جانے اپنے وجود میں کیا کیا گتھیاں لئے ہوئے ہے!

معصومیت کا دور — اس لئے تیرا منتظر ہے کہ تو ناگاہ ان کی دنیا کو شباب کی منزل تک پہونچا دیگا۔

شباب — اس لئے تجھ سے گریزاں ہے کہ تو اس کی مسرتوں بلکہ روحانی مسرتوں کو اپنے میں جذب کر لیگا

عہد پیری — اس لئے تیرا استقبال کرنے کھڑا ہے کہ تو اسے اس کشمکش سے نجات دلادیگا۔

مگر — میں جو ان تینوں دوروں سے ہمکنار ہونا چاہتا ہوں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں نہایت شدت سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔؟

ہاں — جلد آ — گذر جا — تاکہ مجھے — دوسری — زندگی — نصیب — ہو سکے۔

اے آنے والے لمحے! — سنا ہے — کہ — تو — تبسم بدوش ہے، اگر حقیقۃً تو تبسم بدوش ہے — تو یاد رکھ — بہت جلد — تو اشک در آغوش بھی — ہوگا — کیونکہ — جس طرح تو مستقبل سے حال ہوگا — اسی طرح — فوراً — حال سے ماضی ہو جائیگا — اور — یہ فطری عقیدہ ہے کہ عموماً ماضی ماتم اثر — اور — اشک در آغوش ہوتا ہے۔

اے آنے والے لمحے! — کروٹ بدل کر اٹھ — آنکھیں مل کر دیکھ — انگڑائی لے — اور حال کے دریچوں سے ماضی کے، خزاں رسیدہ چمن میں اپنے لئے جگہ تلاش کر — اور ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو جا —،

لوگ کہتے ہیں! — تیرا وجود ایک منصف کی طرح اپنے میں تمام کائنات کے حقوق کا فیصلہ کرنے کی طاقت لئے ہوئے ہے —

کیا یہ سچ ہے کہ — تو سراپا تقدیر ہے — ؟ — اگر حقیقۃً تو تقدیر ہے — تو کیا یہ غلط ہے — کہ — لمحات گذشتہ کی تدابیر کا نتیجہ۔ اگر واقعی تو تدابیر کا نتیجہ — اور تقدیر کا حامل ہے — تو — تیرا انتظار موت سے زیادہ کرنا چاہیئے۔

آنے والے لمحے! — تو — اس قدر — امید افزا کیوں ہے — ؟ نہیں معلوم تیرا قافلہ اتنی سرعت سے کس طرف گامزن ہے پس — کارواں چھٹنے ہوئے غبار میں — حال کا مسافر کیوں نقش پا کا بغور مطالعہ کر رہا ہے ؟

اے آنے والے لمحے! — تو حال کی منزل پر سستا کر جب آگے قدم بڑھائیگا — تو ماضی کی لامتناہی سرحد میں داخل ہو کر —

ایک سبق آموز — شاہکار
ایک تجربہ کار ہستی — ہستی — ہوگا
ایک خاموش — گھڑی

اس وقت تو — لاقیمت ہوگا — یعنی جس کی ادائیگی — انسانی ہستی کے اقتدار سے باہر ہوگی — ؟

کاش ہم سے تیرا تعلق — تعزیتی ہوتا — مگر — تو تو — ہماری زندگی کا نہ ٹوٹنے والا جزو ہے۔"

صبر اشتھانوی

غزل

از جناب سید ارشاد حسین صاحب ازہر دکبلی آگرہ

وفورِ غم سے ہے دل سوگوار کی صُورت — بُجھا سا رہتا ہے شمعِ مزار کی صورت

نظر نہ آئی جہاں میں قرار کی صورت — تڑپ تڑپ کے بسر کی شرار کی صورت

جبین و دامن و دل پر ہیں خوں سے نقش و نگار — بنا ہوا ہوں سراپا بہار کی صورت

تری گلی ہے عروسِ وفا کا آئینہ — ہر ایک ذرہ ہے اک جاں نثار کی صورت

ابھی تو بیٹھنے پایا بھی تھا نہ کوچہ میں — کہ دل کو تھام کے اٹھا غبار کی صورت

یہ راہِ عشق ہے منصور شمع ساں خاموش — قدم قدم پہ نمایاں ہے دار کی صورت

کھلے ہوئے ہیں ہر اک جا گلِ جراحتِ عشق — جنوں نے کھینچی ہے دل میں بہار کی صورت

نظر اٹھاؤ کہ جاتا ہے بزم سے ازہر
کلیجہ تھامے ہوئے دلفگار کی صورت

محبّت!

ازحضرت امین حسنین (بہاولپور)

نوجوان مصور اپنے بوسیدہ جھونپڑے کے نزدیک ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ کس کا عکس لطیف تیار کرے......

ایک دم اس نے موقلم ہاتھ میں لیا اور اپنی تمام باطنی دلچسپیوں کے ساتھ خود کو مخاطب کر کے کہنے لگا...... "اگر آج میں اس بوڑھی بھکارن کی تصویر جو آج صبح مجھے دریا کے نزدیک ملی تھی، جوانی کی تمام رعنائیوں کے ساتھ تیار کروں تو میرا مالک یقیناً مجھے بہت انعام دیگا۔ کیونکہ اس کے چہرہ پر اگرچہ بڑھاپے اور مصائب نے جھریاں ڈال دی تھیں.... لیکن پھر بھی....

اس نے مخصوص انداز میں سر کو جنبش دی اور کاغذ پر ہاتھ پھیر کر تصویر بنانے میں محو ہو گیا.... درخت کی ٹہنیوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی مدھم پڑ گئی۔ سورج اپنی آخری رنگین کرنوں سے کائنات پر مسکرانے لگا۔

نوجوان مصور نے عکس لطیف تیار کر لیا......

وہ ایک دوشیزہ کی تصویر تھی.... اس کے چہرہ پر کوئی جھری نہ تھی... بلکہ عین عالم شباب، نوجوان مصور اپنی کامیابی پر خوش تھا۔

وہ بھاگا ہوا اپنے پڑوسی ابراہیم کے پاس گیا جو اپنے بوسیدہ جھونپڑے کی تنہائی میں زندگی کے آخری ایام بسر کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑھاپے اور مصیبتوں کے بے پناہ حملوں نے بدنما کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لگاتار پانی بہنے سے بینائی کم ہو گئی تھی اس کے رخسار اندر پچک گئے تھے۔ چہرے اور سر کے بال بے تحاشا اگے ہوئے تھے۔

وہ اپنی ایسی زندگی سے تنگ آچکا تھا ـــــ اسے دنیا کی کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی ـــ وہ ہمیشہ دنیا کی ہر چیز سے بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ دنیا کی لطیف ترین شے میں بھی کوئی ایسی خوبی نہیں ہوتی تھی جو اُسے راغب کر سکے۔

نوجوان مصور اگرچہ اس کی طبیعت سے واقف تھا لیکن چونکہ اس وقت فطرت کی دیوی اس کی ایسی عظیم الشان کامیابی پر خاموش تھی اس لئے وہ دیوانہ وار اس کے جھونپڑے میں پہنچا اور اپنی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے لا کر خوشی سے کہنے لگا۔

"بڑے میاں! دیکھو.... میں نے کیسی تصویر بنائی ہے؟"

بڑے ابراہیم نے بے اعتنائی سے کہا.... "ہاں بیٹا! جیتے رہو.. خوب ہے"

پھر وہ تصویر پر نظر ثانی کرتے وقت اچھل پڑا.....

اس کی تمام حسیات، خیالات اور فطرت میں طوفان آگیا۔ اس طوفان نے اس کی ظاہری حیثیت کو تبدیل کر دیا..... وہ قطعاً بے خبر تھا کہ لڑکا اس کی طفلانہ حرکات سے کیا نتیجہ اخذ کریگا۔

وہ بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا... اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ ایک دم اس کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

"رحیمہ!"

اور پھر تصویر کو مخاطب کر کے خود بخود بڑبڑانے لگا۔

"رحیمہ! تجھے وہ دن یاد ہیں جب ہم دونوں دریا کی ساحلی ریت سے کھیلا کرتے تھے......"

"رحیمہ! تجھے وہ دن یاد ہیں جب میں سڑک کے کنارے اپنے کھیتوں کی منڈیروں پر تیرا انتظار کیا کرتا تھا..... جب تو اکیلی اپنے بھیڑوں کے گلوں کے ساتھ گھر کو لوٹ رہی ہوتی۔"

"رحیمہ! تجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے اپنی تمام کائنات تجھ پر نثار کر دی تھی اور فقط تجھے اپنا معبود سمجھا تھا"

"رحیمہ! تجھے وہ دن یاد ہے جبکہ میں نے تیرے لئے جنگ آزمائی کی تھی.... اور... پھر تو.... ہاں تو.... آہ بیوفا رحیمہ.... تو نے پھر کیا

کیا...... ہیں؟... تم نے ایک ہی لغزش سے میرے تمام نظام محبت کو درہم برہم کر دیا...... مجھے دکھوں کے جہنم میں داخل کر کے خود میرے تڑپنے کا ہنستے ہوئے نظارہ کرنے لگی...... اور پھر میری تمام امیدوں کے رنگین گلشن پر خزاں مسلط کر کے غائب ہو گئی...... رحیما...... اب تجھے میں بھی جہنم واصل کرتا ہوں......"

یہ کہہ کر اس نے اپنے حقے کی دہکتی ہوئی چلم سے دیا سلائی روشن کی.. نوجوان مصور تاڑ گیا اور اپنی تصویر کو بچانے کے لئے اس کے ہاتھ سے چھیننے لگا۔ بڈھا ابراہیم بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا، گویا وہ اس سے اس کی آخری مسرت لے لینا چاہتا ہے۔ وہ اپنی تمام گمشدہ طاقتوں کو مجتمع کر کے لوہے کی طرح زور آزما تھا......

اچانک باہر سے آواز آئی،

یہ ایک سحر آلود صدا تھی جو کمال مسرت کیوپڈ کو فطرت اور حسن کی دیوی کے سامنے نغمہ سرا کرتے ہوئے فضا پر مسلط ہو رہی تھی۔

دونوں نے اپنی کشمکش بند کر دی۔ نوجوان مصور فوراً تصویر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ بڈھا ابراہیم تصویر کو گود میں لے کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا... اس کی آنکھ سے بہنے والے گرم پانی کے قطرے لگاتار تصویر پر گر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد نوجوان مصور ایک بوڑھی بھکارن کو جھونپڑے کے اندر لے آیا اور تصویر کی طرف ہاتھ بڑھاتے کہنے لگا۔ "لو بابا جی! یہ عورت ہے!..... تصویر کے بجائے اس کو سزا دو۔"

"یہ کون ہے؟" بڈھے ابراہیم نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جس کی یہ تصویر ہے۔" نوجوان مصور نے تصویر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں، مجھے یہی تصویر دیدو۔" بڈھے نے تصویر کی طرف خفگی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بڈھی بھکارن بڈھے ابراہیم کے چہرہ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ شاید وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی......

اچانک بڈھی بھکارن کا چہرہ زرد ہونا شروع ہوا، جیسا کہ اس کے جسم سے روح آزاد ہو رہی ہے۔

"تم وہی ابراہیم نہیں ہو۔" بڈھی بھکارن نے مہین شرمائی ہوئی آواز میں لکڑی کے سہارے بڈھے کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں، یہاں ابراہیم وغیرہ کوئی نہیں......" بڈھے نے خفگی سے اس کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ بھکارن کی آنکھوں میں آنسو آگئے... "دیکھو میں وہی تمہاری پیاری رحیما ہوں۔" اس نے لکڑی کو فضا اپنے نحیف کندھے سے لگا... بڈھا ابراہیم ہنسنے لگا گویا وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔

"کیا تم وہی ابراہیم نہیں جس کے ساتھ میں اپنی بستی کے نزدیک سرسبز پہاڑی پر اپنی بھیڑیں چرایا کرتی...... جب تمہارا اور میرا عین شباب تھا؟"

ماضی کے تمام نظارے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے آرہے تھے۔ "کیا تم بھول گئے جب تم نے میرے ایک حرف آرزو پر اپنی تمام کائنات نثار کر دی تھی۔ کیا تم وہی ابراہیم نہیں جو گھنٹوں میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھے محبت بھرے گیت سنایا کرتے تھے؟ آہ وہ وقت جب ہم بھیڑوں کے گلوں کو چراگاہوں میں چھوڑ کر بہتے ہوئے دریا اور گرتی ہوئی آبشاروں کا نظارہ کیا کرتے تھے...؟"

بڈھے ابراہیم نے یکدم اپنی نگاہیں پلٹیں اور بھکارن کے چہرہ پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ "نہیں... نہیں... یاد نہیں... جاؤ... اپنا کام کرو..."

"دیکھو! ایسا نہ کہو... یاد کرو... آہ! وہ تاروں بھری راتیں جب ہماری محبت ہمیں بہشت میں پہنچا دیتی تھی... یاد کرو جب تم میرے سوا غیر کو معبود سمجھنا گناہ سمجھتے تھے۔ یاد کرو وہ چاندنی رات جب تم نے اپنی محبت کے ثبوت میں اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے ہاتھ میں تلوار دی تھی کہ میں تمہاری سچی محبت کا امتحان لوں... یاد کرو کہ وہ منقش تلوار میں نے تمہاری گردن پر رکھ دی تھی... یاد کرو کہ اسے پھینک کر میں تمہاری گود میں آپڑی تھی... یاد کرو پھر تم اپنی محبت پر مغرور ہو گئے"

"کیوں خواہ مخواہ کان کھا رہی ہو؟" بڈھے نے چلم کو حقے پر سے اتارتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اپنا کام کرو...... میں کچھ بھی یاد نہیں کر سکتا..." اور وہ سلفہ جلانے میں مشغول ہو گیا۔

بھکارن خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بڈھے کے مظلوم چہرے پر ٹکٹکی لگائے دیکھتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور وہ سحر انگیز گیت گاتی ہوئی چل دی۔

یہ دنیا ہے آنی جانی　　کل نئی تھی آج پرانی

اس پہ من نہ رکھو سجنوا

پریت کا نیج نہ پڑھنوا

تازہ کار

جناب مولٰنا حافظ صاحب غازی پوری

ہر گھڑی ذوقِ ستم پر ناز ہونا چاہیئے
سوز میں بھی ساز کا انداز ہونا چاہیئے،

نبضِ فطرت کا ذرا انداز ہونا چاہیئے
سینکڑوں نغمے اٹھیں گے ساز ہونا چاہیئے،

چاہتے ہیں وہ اگر اندازۂ ذوقِ نیاز
ناز کو بھی تا بحدِ ناز ہونا چاہیئے،

کہہ رہے ہیں کچھ بگڑ کر سب نقوشِ حسن و رنگ
ہر نفس کو گوش بر آواز ہونا چاہیئے،

کس لئے قربِ تجلّی میں ہے احساسِ فنا
جستجو کا اب نیا انداز ہونا چاہیئے،

دور کی راہیں غلط نزدیک کے رستے عبث
ہر قدم منزل میں ہو جانباز ہونا چاہیئے،

جب نمایاں ہو چلے احساسِ منزل کا فریب
پھر وہیں سے مائلِ پرواز ہونا چاہیئے،

لغزشِ پا ترجمانِ بادہ و ساغر سہی،
راز افشا تا بہ حسنِ راز ہونا چاہیئے،

جذب کر لے یا نہ کر لے مہرِ تاباں کی کرن
قطرۂ شبنم کو تو جانباز ہونا چاہیئے،

ضعفِ بازو سے کہیں احساس بھی زائل نہ ہو
ہر نفس آمادۂ پرواز ہونا چاہیئے،

عشق تو ہر حال میں حافظ ہے پابندِ نظر
حسن کو بھی احتیاطِ راز ہونا چاہیئے

مشاہیر کے آخری کلمات!

جناب مولانا محمد شمس الدین صاحب شمس حیدرآبادی

موت سے ہر انسان گھبراتا ہے اور مرنے کے وقت انسان کی زبان سے وہی الفاظ نکلتے ہیں جو اس کے دل میں ہوتے ہیں۔ چند جلیل القدر ہستیوں کے "زندگی کے آخری کلمات" درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کے کردار پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ان ہستیوں نے موت کے تلخ جام کو نہایت استقلال کے ساتھ شربت کے شیریں گھونٹ کی طرح پیا اور ابدی نیند سو گئے۔ وہ تو دنیا سے گذر گئے لیکن آج ان کے مرنے کے وقت کے آخری فقرات صفحات تاریخ میں درخشاں و تاباں ہیں جو اس قابل ہیں کہ آب زر سے لکھے جاویں۔ یہ انمول گوہر صرف زینت ہی کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس قابل ہیں کہ ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے اور اس سے درس حاصل کیا جائے۔

(۱) حضور سرور کائنات مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس جہاں سے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ م ۸ جون سنہ ۶۳۲ء کو تشریف لے گئے تو آپ کی زبان مبارک سے آخری وقت یہ الفاظ نکلے۔

"نماز۔ نماز۔ لونڈی و غلام، یتیم کے حقوق۔ اے خدا تو بہترین رفیق ہے"۔

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ بعمر ۶۳ سال سنہ ۴۰ھ م سنہ ۶۶۱ء میں ابن ملجم کی تلوار زہر آلود سے زخمی ہوئے اس وقت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صاحبزادہ کو چند نصائح فرمائے۔

"اے میرے فرزند! چار باتیں یاد رکھ اور سوائے اس کے اور چار باتیں ہیں"۔ حضرت امام حسن نے عرض کیا "اے پدر بزرگوار وہ کیا ہیں؟" فرمایا "بہت بڑی غنا عقل ہے اور بہت بڑا افلاس حمق ہے اور بہت بڑی وحشت غرور ہے اور بہت بڑی بخشش حسن خلق ہے"۔

پھر امام حسنؓ نے کہا وہ دوسری چار باتیں کیا ہیں؟" فرمایا حضرت علیؓ نے "احمق کی صحبت سے پرہیز کر کیونکہ وہ تیرے نفع کا قصد کرتا ہے پس ضرر پہنچاتا ہے (بوجہ اس کے بے عقل ہونے کے) اور جھوٹے کی صحبت سے بچ کیونکہ وہ دور کو تجھ سے نزدیک اور نزدیک کو قریب کر لیگا۔ اور بخیل کی صحبت سے احتراز کر اس لئے کہ وہ تیرے پاس زیادہ مدت تک بیٹھیگا اس چیز کی طرف جس کی تجھ کو حاجت ہے"۔

(۳) حضرت حبیب بن عدی رضی اللہ عنہ نے غزوہ رجیع میں حارث کو قتل کیا تھا کفار آپ کو گرفتار کر کے لے گئے حارث کے لڑکوں نے آپ کو خرید لیا اس کے بعد جب آپ کو سولی دینے لگے تو آپ نے فرمایا دو رکعت نماز پڑھنے دو۔ نماز پڑھی اور فرمایا۔

"جب میں اللہ کی راہ میں اسلام پر قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کچھ پرواہ نہیں کس پہلو لیٹنا ہوگا اور یہ اللہ کے لئے ہے اور اگر وہ چاہے تو ٹکڑے کئے ہوئے اعضا کو مبارک بنائے"۔

(۴) ام الخیر رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہا کا سنہ ۱۸۵ھ میں جب وصال کا وقت آ گیا مرض موت میں مبتلا ہوئیں اور اگرچہ بیماری نے بہت کچھ ستایا مگر کسی کو بلا کر پریشان کرنا گوارہ نہ کیا۔ عبدہ جو مدت دراز سے خدمت کرتی رہی تھیں انہیں کی طرف متوجہ ہو کے بستر مرگ پر پڑے پڑے یہ وصیت کی کہ "عبدہ! میری موت سے کسی کو تکلیف نہ دینا" یہ سچی اور کامل شان بے ریائی تھی کہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ جنازہ دھوم دھام سے اٹھے۔ اس کے بعد فرمایا "اور سنو عبدہ! یہی کرتا جو میں پہنے ہوئے ہوں بس یہی میرا کفن ہے نہلا کے اسی کو پہنانا اور لپیٹ کے دفن کر دینا"۔

(۵) ابو الاسود دولی رحمۃ اللہ کی قابلیت اور نیک نفسی و اتقا کا اثر خلفائے راشدین کے مبارک دلوں پر اس قدر تھا کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ تینوں خلفا نے ان کو بعض ملکوں کا والی مقرر کیا۔

آپ ۸۵ برس کی عمر میں سنہ ۶۹ھ میں مرض ہوشہ میں مبتلا ہوئے مرتے وقت

لوگوں نے کہا: "ہم آپ کو مغفرت اور نجات کی خوشخبری دیتے ہیں۔" ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا: "افسوس اتنی زندگی کہاں سے لاؤں جس سے نجات کی امید ہو۔"

(۱۳) ابو الصلت امیہ بن عبدالعزیز اسلام کے عہد اولیں میں اسپین کے ایک بہت بڑے زبردست اور نامی گرامی طبیب، حقیقت شناس فلسفی، جادو نگار ادیب اور شاعر اور مرج انبیائی پر اپنی ساحرانہ حکومت قائم کرنے والے موسیقی داں گذرے ہیں۔ آپ کا انتقال شہر مہدیہ میں غرہ محرم ۵۲۹ھ بروز دوشنبہ ہوا جب آپ مرض موت میں مبتلا ہوگئے اور یقین ہو گیا کہ سفر آخرت کا وقت آگیا ہے تو یہ چند شعر کہے جن کا ترجمہ درج ذیل ہے اور وصیت کر دی کہ قبر پر کندہ کر دیئے جائیں۔

(۱) اس دار فنا میں گو میں مقیم تھا مگر یقین تھا کہ دار بقا کی طرف کوچ کروں گا۔

(۲) اور اس معاملے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس عادل حکمراں کے پاس جاتا ہوں جو کبھی ظلم نہیں کرتا۔

(۳) مگر افسوس وہاں جا کے کیونکر لوٹوں گا (کیا یہ منہ دکھاؤں گا) اس لئے کہ زاد راہ کم ہے اور گناہ بہت ہیں۔

(۴) اگر اپنے گناہوں کی سزا پاؤں تو گنہگاروں کیلئے جو سخت سے سخت سزا ہو اس کا سزاوار ہوں۔

(۵) لیکن اگر وہ رحم کرے اور مجھے معاف کر دے تو (پھر کیا ہے) سرمدی نعمتیں اور مسرتیں حاصل ہونگی۔

(۷) حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ کو عریانی کی وجہ سے ۱۰۷۰ھ میں شہنشاہ اورنگ زیبؒ نے علمائے کرام کے فتاویٰ کے بموجب قتل کا حکم دیا۔ جب جلاد قتل کرنے لگا تو آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

عریانی تو بود غبار رہ دوست   آں تیز بہ تیغ از سرِ ما وا کردند

(۸) حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد طوطی ہند حضرت خواجہ امیر خسروؒ دیوانے ہوگئے گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے ۲۱ روز تک اسی طرح بدحواس رہے بائیسویں روز ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں حضرت سلطان نظام الدینؒ کے مزار پر تشریف لائے اور یہ دوہا پڑھا پھر بیہوش ہو کر زمین پر گرے اور جان بحق تسلیم ہوگئے۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چلا خسرو گھر آپنے کہ سانجھ بھئی چوں دیس

(۹) لیلیٰ عارفہ جس کو ہندو لیلیٰ شوری یا لیلیٰ ویدی کے نام سے پکارتے ہیں جو کشمیر جنت نظیر کی نغمہ سنج عندلیب تھی۔ معرفت کے گیت گائے اور حقانیت پر جان دی سنہ [illegible]ء میں جب لیلیٰ مر رہی تھی تو اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

"پاگل عقلمند ہوتا ہے لیکن عقلمند ناسمجھ ہوتا ہے۔"

(۱۰) عصمت مآب خاتون شہزادی زیب النساء نے ۱۱۱۳ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار کس مپرسی کی حالت میں موجود ہے اور تاریخ وفات یہ ہے۔ "وادخلی جنتی"۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب زیب النساء کے انتقال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے عزیزوں کو بلا کر وصیت کی کہ "دیکھو! میری قبر کو پختہ نہ بنانا ایک کچا سا ڈھیر بنا کر یونہیں چھوڑ دینا اور زمین سے زیادہ اونچا بھی نہ کرنا۔" یہ شعر بھی شہزادی کا بیان کیا جاتا ہے

اغنیا سازند گنبد از طلا و نقرہ زر
بر سر گور غریباں گنبد گردوں بس است

(۱۱) شیر شاہ سوریؒ جس کا اصلی نام فرید خاں تھا قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تھا۔ دوران محاصرہ میں ایک دن وہ خود ایک مورچہ پر کھڑا تھا۔ ایک بارود کا گولہ دیوار قلعہ پر لگا اور ٹکرا کر مورچہ پر آیا پاس ہی اور گولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا دفعتہً سب بھڑک اٹھے سیکڑوں سپاہی اور سردار کباب ہوگئے۔ شیر شاہ بھی جھلس گیا۔ بار بار اس پر غشی کا عالم طاری ہو جاتا تھا لیکن جب ہوش آتا جو کوئی سردار اسے دیکھنے آتا اس سے کہتا یہاں کیوں آئے ہو؟ قلعہ میں جاؤ اور بار بار فتح کی خبر پوچھتا۔ ادھر کسی نے فتح کی خبر سنائی اس نے "الحمد للہ" کہا اور فوراً طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا

(۱۲) محمد شاہ بادشاہ کی منظور نظر "گل خانم" ایک رات میں بادشاہ کے پاس تھی کروٹ لی تو بچھونے میں پسلی کے پاس کوئی چیز چبھی۔ چبھتے ہی شدت کی جلن ہونے لگی بہت ضبط کیا لیکن بیساختہ منہ سے "اُف" نکل گیا بادشاہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "خانم کیا ہوا؟" خانم نے کہا: "جہاں پناہ مطمئن رہیں کوئی تردد کی بات نہیں۔ دل کے پاس کوئی چیز خلش کرتی ہے۔" محمد شاہ نے پہرے والے کو آواز دی لونڈیاں حاضر ہوئیں شمع لا کر بچھونے کو دیکھا تو ایک چھوٹا سا نشتر پلنگ پر اس طرح رکھا تھا کہ اس کی نوک کروٹ لینے والے کو چبھے فوراً گل خانم کی صدری اتاری گئی۔ دیکھا تو دل کے پاس ہلکا زخم آچکا تھا۔ جراحوں کی طلبی ہوئی سب حاضر ہوئے تفتیش سے معلوم ہوا کہ کسی بیگم نے رشک و حسد سے زہر کا بجھا ہوا نشتر رکھوا دیا ہے وہی چبھا ہے۔ زندگی کا بھروسہ نہیں۔

گل خانم استقلال سے گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی اور اپنے تمام زیورات

طلب کئے یہی پوتی مینا کا پنجرہ منگوایا اور سب کو نگاہ یاس سے حسرت سے دیکھا۔ مینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ تو پیاری تھادی چاہنے والی اب رخصت ہوتی ہے اب خدا کے حوالے خبر نہیں میرے بعد تم پر کیا گذرے؟

زہر کا اثر بدن میں سرایت کر گیا۔ مُنہ سے کف آنے لگا۔ بادشاہ رنج و الم بیہوش تھا خوشبوئیں وغیرہ سنگھا کر ہوشیار کیا گیا۔ بادشاہ نے انکرگل خانم کا سر اپنے زانو پر رکھا اور دو آنسو اس کے زردی مائل چہرے پر ٹپکائے خانم نے ذرا آنکھ کھولی اور کہا "میرے آقا! میرے سلطان!! انتقام نہ لیا جائے۔ میں نامراد جاتی ہوں اب اس زانو پر اور سر ہوگا۔ یہ شمعیں ساتھ ہیں بعد و قبر میں اندھیرا ہوگا قاتل کو سہاگ مبارک"۔

(۱۳) خواجہ عمادالدین محمود گاوان کو جبکہ اس کی عمر ۷۶ برس کی تھی کندپور ملی میں ۵ صفر ۸۸۶ھ م ۱۴ اپریل ۱۴۸۱ء کو دغابازی کی بدگمانی پر سلطان محمد شاہ نے اپنے غلام جوہر کے ذریعہ قتل کا حکم دیا اور اٹھ کر محل سرا کی طرف چلا تو خواجہ جہاں نے سلطان سے مخاطب ہو کر کہا "میں تو عمر طبعی کو پہنچ چکا ہوں اگر آج قتل ہوا تو کل اپنی موت سے مر جاؤنگا۔ مگر میرا قتل ملک کی خرابی اور حضور کی بدنامی کا موجب ہوگا"۔ محمد شاہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا اور محل میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی خواجہ جہاں نے دوزانو روبقبلہ بیٹھکر کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا۔ جوہر غلام نے غلاف سے تلوار نکال کر بلند کی اس کے خون کی پیاسی چمک خواجہ جہاں کو محسوس ہوئی تو "الحمد للہ علی نعمتہ الشہادۃ" زبان سے بے اختیار نکلا ابھی یہ کلمہ ختم نہ ہوا تھا کہ وار اپنا کام کر گیا۔

(۱۴) ظہیر الدین بابر بادشاہ نے دسمبر ۱۵۳۰ء میں پچاس برس کی عمر پاکر انتقال کیا اس کی وفات کا یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہمایوں بہت زیادہ بیمار تھا، اور جب اس کی زندگی کی امید نہیں رہی تو بابر نے اس کے گرد پھر کر اپنے آپ کو بیٹے پر سے تصدق کیا اور دعا مانگی کہ "اس کی موت مجھے آجائے"۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہمایوں اچھا ہونے لگا اور بابر کا مرض بڑھتا گیا۔

بابر نے مرتے وقت ہمایوں کو وصیت کی کہ اپنے بھائیوں کو قتل نہ کرنا مگر ان کی طرف سے ہوشیار رہنا اور میری لاش کو کابل میں دفن کرنا۔

(۱۵) سلطان الپ ارسلان نے ۱۰۷۲ء میں ترکستان کے تسخیر کا عزم بالجزم کیا تو یوسف ترکستان کے ایک شہر کے گورنر نے سختی سے الپ ارسلان کا مقابلہ کیا لیکن مفتوح ہوا اور جب یوسف مع اسیران جنگ دربار سلطانی میں لایا گیا تو سلطان الپ ارسلان یوسف پر غصہ ہوا۔ یوسف خنجر لے کر جھپٹا لیکن بہادر

افسران فوج کے تلوار یں اور نیزے سلطان کے درمیان حائل ہو گئے لیکن سلطان نے انہیں منع کر دیا اور تیر کمان میں رکھ کر چلہ پر چڑھایا کہ اتنے میں سلطان کا پاؤں جو تخت کے ایک پائے پر رکھا ہوا تھا پھسل گیا اس وقت یوسف نے فوراً سینہ میں خنجر بھونک دیا۔ جب سلطان نے دیکھا کہ آخری وقت ہے تو اس نے اپنے وزیر نظام الملک اور بیٹے ملک شاہ کو بلوایا اور ملک شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"بیٹا! میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ تاج و تخت کے تمہیں وارث ہو تمہیں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن میری ایک آخری وصیت یاد رکھو۔ بیٹا میں تمہاری طرح نوجوان تھا جب دجلہ پر شیخ نے یہ نصیحت کی تھی: "زور بازو پر کبھی ناز نہ کرنا اور دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھنا۔ خود بینی اور بدبینی دو بہت بڑے عیب ہیں" اور مجھے اسلام کی حمایت کا وعظ سنایا۔ الحمد للہ کہ جس قدر مجھ سے ہو سکا میں نے اعلائے کلمۃ الحق میں کوشش کی لیکن افسوس خود پسندی کے متعلق جو کچھ کہا تھا بھول گیا اور آج اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بیٹا! شیخ نے جو کچھ مجھے نصیحت کی تھی وہی تمہیں وصیت کرتا ہوں"۔

(۱۶) سلطان فیروز کے بیٹے شہزادہ حسن خاں کو کاروبار سلطنت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور نہ اس میں حکمرانی کی لیاقت ہے اس کی محبوبہ پارتمال کی محبت اور آغوش نے اسے دنیا و مافیہا سے بےخبر کر دیا اور سلطان فیروز علیل ہے جس کے سبب سلطان فیروز کا بھائی احمد خانخاناں سلطان سے جنگ چھیڑتا ہے۔ آخر ایک روز سلطان کی طبیعت سخت ناساز ہو جاتی ہے۔ احمد قلعہ کا محاصرہ کر لیتا ہے اس وقت سلطان قلعہ کا پھاٹک کھولنے کا حکم دیتا ہے۔ احمد خانخاناں قلعہ میں داخل ہوتا ہے بیمار سلطان بھائی کو دیکھتے ہی زار و قطار روتا ہے اور بھائی سے مخاطب ہو کر یہ کہتا ہے۔ "بھائی۔ تاج و تخت تم کو مبارک۔ محبت پدری کے تقاضے سے حسن کے لئے ولیعہدی کی کوشش کی گر مشیت ایزدی اس کے خلاف تھی۔ آج سے تم صاحب تخت و تاج ہو اور میں اپنے فرزند اور ساری رعایا کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ احمد، دنیا چند روزہ ہے۔ خدا کو نہ بھولنا۔ بیواؤں اور یتیموں کا خیال رکھنا۔ دوسرے کی دل آزاری نہ کرنا میرا کہا سنا معاف کرنا آج تک میں شہنشاہ تھا لیکن آج ۸۲۵ھ سے تم بادشاہ ہو"۔

فضل اللہ وزیر سے اپنا تاج منگوا کر احمد کو پہنا کر یہ کہتا ہے۔ "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کو یہ تاج خسروی پہناتا ہوں۔ اچھا بھائی اب تم بھی میرا قصور معاف کرنا۔ انسان سے خطائیں ہوتی ہیں لیکن درگذر کرنا

انسان کی دلیل اکملیت ہے۔ رعایا سے بھی میرا قصور معاف کرا دینا۔ میں بہت گناہگار ہوں، بامراد آیا اور نامراد و شرمسار جاتا ہوں۔ اب عالمگیر ہو جانے ہی بہت ہے احمد دیکھنا خدا کے نام کے سوا تلوار نہ اٹھانا۔"

(۱۷) ۴ مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے ۔

رئیس الاحرار شہید ملت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ آٹھ گھنٹہ پہلے ہندو مسلم اتحاد کی سکیم تیار کرتے ہوئے ترپن برس کی عمر میں ۴ شعبان ۱۳۴۹ھ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء لندن میں بقول شہید ملت ؎ مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور ؛ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور فلسطین مسجد اقصیٰ میں سپرد خاک ہوئے

رہرو تمہارا عشق کا منزل کو پالیا ۔ اب کیا نشاں ہری لوح مزار دے
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر ۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مشرق و مغرب میں آپکے انتقال پر ملال نے ماتم بپا کیا مولانا نے اپنی زندگی ہی میں کہا ہے ؎

ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

مولانا نے مرنے کے قبل گول میز کانفرنس میں مسلم نمائندگی فرماتے ہوئے معرکۃ الآرا تقریر کی جس میں آپنے فرمایا۔"آج جس مقصد وحید کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے وطن کو صرف اسی صورت میں واپس جانا چاہتا ہوں کہ ارمغان آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس جاؤنگا اور اس کے بجائے ایک غیر ملک میں مرنا پسند کرونگا بشرطیکہ وہ ملک آزاد ہو۔ پس اگر ہندوستان میں تم ہمیں آزادی نہ دوگے تو یہاں میرے لئے ایک قبر تو تمہیں دینی ہی پڑیگی۔"

(۱۸) ۲۷ مارچ ۱۹۳۴ء کو فلسطین کے قائد اکبر مجاہد اعظم موسیٰ کاظم پاشا کا انتقال ہوا۔ جو فلسطین میں سب سے زیادہ باثر۔ مقتدر اور بڑے رہنما تھے۔ مرنے سے قبل آپ کی زبان سے جو جملے نکلے وہ یہ ہیں۔"اے فلسطین تیری تیری آرزوئیں میرا دین ہیں! اے افراد قوم میں مرتے ہوئے ایک امانت تمہارے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ اس امانت کیلئے جہاد کو جاری رکھو اگر تم میری روح کیلئے قبر میں سکون اور خوشی چاہتے ہو۔"

برطانوی ہائی کمشنر نے ایک پیغام کے ذریعہ قائد اعظم کی صحت کے متعلق پوچھا اپنے زندگی کے آخری لمحوں میں اس کا یہ جواب لکھوایا۔" اگر پوچھنا چاہتے ہو تو قوم کی حالت پوچھو ... میری صحت کو کیا پوچھتے ہو۔"

(۱۹) یونان کے شہرہ آفاق حکیم سقراط پر الحاد کا الزام لگایا گیا حکومت نے اسے زہر سے مارنے کی تجویز کی۔ جس وقت وہ زہر کا پیالہ لیکر پینے لگا اس نے یہ کہا تیری رخصت کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں موت کے راستے پر گامزن ہوتا ہوں تم زندگی کی راہ لو۔ ان دونوں راہوں میں سے کون سی راہ بہتر ہے یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔

(۲۰) لیڈی جین گرے بادشاہ ہنری ہفتم کی سب سے چھوٹی بہن کی پوتی اور مارکوئس آف ڈارسٹ (جو بعد میں ڈیوک آف یارک ہوا) کی بڑی بیٹی تھی۔ جین گرے کا باپ جلیل القدر عہدے پر تھا دو بڑے بھائیوں کی وفات پر وہ ڈیوک آف سفوک مقرر ہوا۔

شاہ ایڈورڈ ششم ہمیشہ مریض رہتا تھا گلیڈ فورڈ کے بیٹے نارتھمبرلینڈ اور جین گرے کی نامبارک شادی ۱۵۵۳ء میں ہوئی اور انھوں نے ایڈورڈ ششم کو ترغیب دی کہ وہ اپنے حقیقی بہنوں میری اور الزبتھ کے بجائے جین گرے کو اپنا جانشین مقرر کرے جین نیک طینت اور شریف تھی اس کی خودداری نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ وہ اصلی حقدار کے بجائے غاصبانہ طور پر ملکہ بنے لوجوان ایڈورڈ کے انتقال کے بعد جین بادل ناخواستہ ملکہ انگلستان ہوئی اور اس رنج نے اس کو بیمار کر دیا۔ رعایا کو ڈیوک آف نارتھمبرلینڈ سے نفرت تھی۔ لندن کے سوا تمام مقامات پر میری کو ملکہ تسلیم کیا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد لندن میں بھی میری ملکہ تسلیم کی گئی۔ جین اور اس کا شوہر شاہی حراست میں لے گئے دونوں پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ میری جواب ملکہ تھی متعصب رومن کیتھولک تھی اس نے وعدہ کیا کہ وہ پروٹسٹنٹ طریق مذہب کو چھوڑ دے تو معافی دی جا سکتی ہے لیکن وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہی۔

موت سے تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے باپ کو ایک چٹھی لکھی۔" اگرچہ خدا کو یہ منظور ہوا کہ آپکے وسیلہ سے میری زندگی کا خاتمہ ہو جس کو میں صبر کے ساتھ برداشت کرتی ہوں اور خدا کا شکر کرتی ہوں کہ بجائے اسکے کہ ساری دنیا میرے قبضہ میں ہوتی اور میری مرضی کے مطابق میری عمر زیادہ ہوتی اس نے میری زندگی کو چھوٹا کیا۔"

ملکہ میری کو اس نے لکھا۔" میری سزا کا حکم جائز اور درست ہے لیکن خدا کی طرف سے میرے قصور پر کم ہوا کیونکہ شاہی حالت میں ہو کر بھی ان عزتوں نے جو زبردستی مجھے دی گئیں میرے معصوم دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ اگر میری کارروائی ناجائز ہے تو یہ میں نے ارادۃً نہیں کی۔ اس کے جرم کی وجہ حرص سلطنت نہ تھی بلکہ ان لوگوں کی تعمیل حکم تھی جن کی عزت اور تعظیم کرنا میرا فرض تھا۔"

۱۲ فروری ۱۵۵۴ء کو گلیڈ فورڈ قتل کر دیا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد ۱۸ برس کی نیک نہاد جین نے مستقل مزاجی سے یہ کہتے ہوئے" خداوندا! میں اپنی روح تیرے سپرد کرتی ہوں۔" دنیا سے کوچ کیا۔

جوئے آب

از جناب آزاد انصاری، مالیگانوی

تو فرازِ کوہ سے آتی ہے بل کھاتی ہوئی
آئینہ ناظرۂ فطرت کو دکھلاتی ہوئی

کیف پرور کس قدر ہے تیرا مستانہ خرام،
ہے روانی میں ترے جہدِ مسلسل کا پیام

وادی و صحرا میں تو مجنوں صفت آوارہ ہے
تنگ اور سبز گھاٹوں میں ترا گہوارہ ہے

تیری بے پروا خرامی میں نہاں سوز و گداز
ہے ہم آہنگِ نوائے سازِ فطرت تیرا ساز

تیری موسیقی ہے رازِ کامیابی کی دلیل،
قصدِ منزل میں ہے تیرے لب پہ اک بانگِ الرحیل

کیف سے معمور ہے تیری صدائے خوشگوار
ہر بلند و پست سے رکھتی ہے عزم گیرودار

آبیاری سے تری دشت و چمن شاداب ہے
نرگس و ریحان و سرو و یاسمن شاداب ہے

لہلہاتے ہیں ترے فیضِ رواں سے مرغزار
جھاڑیاں جنگل کی رہتی ہیں تری امیدوار

مہر و مہ کے واسطے ہستی تری آئینہ ہے
تیرا سینہ گوہر و یاقوت کا گنجینہ ہے

ہاں بجھاتے ہیں ترے پانی سے پیاسے اپنی پیاس
تو رواں ہے منزلِ مقصد کی جانب بے ہراس

میں نہیں کہتا بناتی ہے تو پانی میں حباب
بیکسوں کو آنکھ دکھلاتی ہے کھا کر پیچ و تاب

تیرے نظارے سے عزمِ مستقل پاتا ہوں میں!
حیف ہے گر سختیِ منزل سے گھبراتا ہوں میں!!

ادیب کا سفر

جناب احمد الدین صاحب شاکر کانپوری

ادیب تو مابدولت کو فرض کرلیں۔ باقی رہا سفر سو اس کی کیفیت ناظرین کی سمع خراشی کا خیال بالائے طاق رکھتے ہوئے حتی المقدور فصاحت و بلاغت سے بیان کرینگے۔ پچھلی گرمیوں میں ہمیں ایک عزیز کی شادی میں شرکت کیلئے سیالکوٹ جانا پڑا گھر والوں کی رائے پر آمنا و صدقنا کہتے ہوئے قرار پایا کہ رات کی گاڑی سے سفر کرنا بہتر ہے۔ بارہ بجکر تیس منٹ یا بقول بعضے ساڑھے بارہ بجے گاڑی چھوٹتی تھی یا چھوڑ دی جاتی تھی۔ ہم دس بجے لوہاری دروازہ سے پیدل روانہ ہوئے کیونکہ تانگہ ڈرائیوروں نے معہ تانگوں اور گھوڑوں کے ہڑتال کررکھی تھی۔ گاندھی جی کی برکت سے سوراج تو ملتے ہی ملیگا مگر ہڑتالوں کی کمی نہیں رہی۔ ہڑتال وہ نہیں جسے گو گر دیسی کہا جاتا ہے بلکہ دکانداروں کی ہڑتال تانگہ ڈرائیوروں کی ہڑتال۔ مزدوروں کی ہڑتال اور بھوک ہڑتال وغیرہ وغیرہ

چونکہ چلنا ضروری تھا لہذا ہم چلے اور اس شان سے کہ چار عدد ایک پانچ بچوں اور ایک شریک حیات کل میزان چھ عدد نفوس کے واحد انچارج ہم تھے۔ چھوٹا بچہ بیوی نے اٹھا رکھا تھا اور اس سے بڑے دو ہم پر شہسواری کے کرتب سیکھتے تھے۔ باقی دو ماشاء اللہ خدا کی عنایت کردہ ٹانگوں سے زاید از ضرورت کام لیتے یعنی اچھلتے۔ کودتے۔ پھاندتے اور ہم سے ذرا فاصلہ پر جاکر گاماں اور زبسکو کے کرتب دکھانے لگ جاتے۔

اولاد کے بارے میں ہم بہت تیز رفتار واقع ہوئے ہیں اور اس سے فائدے بھی لاتعداد ہیں ایک تو بقائے نسل دوسرے دنیا کی مردم شماری میں معقول اضافہ اور مزید برآں ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بھی لاہور میونسپلٹی میں میونسپل کمشنر بن جائیں اور نہیں بھی محتاجی کے بغیر کیونکہ دوسروں کے سہارے میونسپل کمشنر تو بنتے ہی بنینگے۔ ہاں مقدمہ بازی میں عدالتوں کے چپراسیوں کے دھکے بکثرت کھانے پڑینگے اور اگر سر پھٹول کی نوبت آگئی پھر تو ہاضمہ ایسا درست ہوگا کہ الحفیظ،

تو گویا ہم اپنے گھر کے ووٹ اتنے بنانا چاہتے ہیں کہ میونسپل کمشنری چھوڑ اگر ہم پریذیڈنٹی بھی چاہیں تو مل سکے اور یہ ضرور ہوگا کیونکہ

"خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

چند منٹ تو ہم بخیریت چلتے رہے یکایک پیچھے سے آواز آئی ــ "کیا آپ ابھی سے ریل پر سوار ہوگئے؟ ذرا ٹھہریئے؟"

"بہت بہتر!" ہم نے آگے دوڑنے والے بچوں کو بھی لال جھنڈی دکھائی اور اپنے آپ کو بھی بریک لگائی اور بیگم کا انتظار کرنے لگے۔ وہ آملیں تو پھر روانگی شروع ہوئی۔ ہم قدم پھونک پھونک کر رکھتے تھے تاکہ بیگم زیادہ پیچھے نہ رہ جائیں مگر تابکے۔ ہم بمشکل بیس پچیس قدم ہی چلے ہونگے کہ بیگم نے پھر ڈانٹا ــ "پھر وہی حرکت ــــ"

"تو کیا ساکن رہ کر بھی ہم اسٹیشن پہونچ سکتے ہیں۔؟" ہم نے متانت سے کہا۔

چاہیئے تو تھا کہ اس معقول حاضر جوابی پر بیگم داد دیتیں مگر وہ چپ رہیں۔ اصل میں ان ہندوستانی عورتوں نے شاید کچھوے اور خرگوش کی کہانی کہاں سے پڑھ رکھی ہے کہ یہ اتنی آہستہ روی کی پابند ہیں۔ چلنے میں مجال نہیں کہ پائے آہستہ روی کو ذرا بھی لغزش پیدا ہو۔ ہماری تو بیگم صاحبہ سے کئی دفعہ اس مسئلہ پر بحث ہوئی مگر وہ ہر موقعہ سند کے طور پر یہی سنا دیتی ہیں ؎

تیزی نہیں منجملہ اوصاف کمال　　کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی　　ہاں چلنے میں اک شرط ہے استقلال

کچھ عرصہ تو ہماری بیگم مستقل مزاجی سے چلتی رہیں۔ ابھی آدھا چوتھائی فاصلہ بھی طے نہ ہوا تھا کہ کہنے لگیں۔ "میں تو تھک گئی"

"افسوس ہے اس کا کوئی علاج میرے پاس نہیں" میں نے تبسم کہا۔

"جی ہاں اگر منے کو اٹھانا پڑے تو پتہ لگے۔ میں اسے سنبھالوں یا چلوں؟

بیگم نے ضد اچھوڑکر کہا۔

"لاؤ میں اٹھالیتا ہوں۔" میں نے ذرا چھیڑنے کے لئے کہا۔

"تو یہئے مجھ سے یہ نہیں سنبھالا جاتا۔" بیگم نے کہا۔

اب یہ نئی مصیبت آپڑی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ بیگم کو ہماری دو بچوں کی باربرداری کا علم ہے اور اب وہ کہینگی کہ نہیں آپ کیسے اٹھا سکتے ہیں ہمگر، انھوں نے کہہ یا لو۔ ہم نے فوراً ایک کو کندھے سے اتارا اور ننھے کو بغل میں دبایا۔ عجب مصیبت تھی ؎

کسے لیں گود میں بہلائیں کس کو، کس کو بہلائیں

غضب میں پڑ گئے ہم چند بچوں کے پدر ہو کر

مگر ہمارے دماغ نے یہ مشکل حل کردی۔ ہم سڑک پر دوڑ پڑے۔ بیگم نے پوچھا اور سلیم ——؟"

"اُسے بھی سنبھال لیتے ہیں!"

بیس پچیس گز کے فاصلہ پر جاکر ہم رُکے۔ کندھے والے بوجھ سے سبکدوش ہوئے یعنی نعیم کو سڑک پہ اتارا اور آپ پھر رجعت قہقری شروع کی۔ واپس جاکر سلیم کو اٹھالائے اور نعیم کے پاس سے آگے دوڑ گئے۔ اسے کوئی تیس گز آگے جا اتارا اور ننھے کو اٹھانے پھر نعیم کے پاس آئے۔ اب نعیم کو اٹھایا تو بیگم نے ہنسکر کہا۔

"یہ طریقہ خوب رہا، اب میں بھی ساتھ پہونچتی رہونگی۔"

ہم نے جواب دیا۔ "تم اب بھی نہیں پہونچ سکتیں۔"

کہتے ہی ہم نے یہ آمد رفت کا عمل ذرا تیزی سے شروع کردیا۔ اب آگے دوڑنے والے بچوں کو جو شرارت سوجھی تو انھوں نے یہ کام شروع کردیا کہ جب بچے کو میں آگے چھوڑ آتا جب واپس آنے لگتا تو وہ اسے اٹھاکر دبے پاؤں پھر میرے پیچھے پیچھے لے آتے اور جب میں پچھلے کے قریب پہونچتا تو وہ اُسے کھڑا کر اسٹیشن کی طرف بھاگ جاتے۔ بیگم ان کی یہ کارروائی دیکھ کر ہنستیں اور ہم سمجھتے کہ ہم پر ہنس رہی ہیں۔ دو تین دفعہ تو ہمیں اس شرارت کا علم نہ ہوا مگر ایک دفعہ بچے بھی ماں کے ساتھ ہنس پڑے میں نے پھر کر جو دیکھا کہ وہ سلیم کو اٹھائے واپس لا رہے ہیں تو ان کو ڈانٹا اب بیگم نے بھی ہمدردی کا ثبوت دیا یعنی ننھے کو اٹھالیا اور ٹھیک بارہ بجے ہم مسافر خانے یا مسافروں کے گودام میں پہونچ گئے۔

گاڑی پر چڑھنے سے پہلے سب سے بڑا مرحلہ جو سوائے چند زندہ دلوں کے باقی سب مسافروں کو طے کرنا پڑتا ہے وہ پروانہ راہداری یعنی ٹکٹ کا خریدنا ہے مسافر ٹکٹوں والی کھڑکی کھلتے ہی اس بے جگری سے حملہ کرتے ہیں جیسے سکندر نے پورس پر کیا تھا اور ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ گویا وہ ٹکٹ خریدتے ہی منزل مقصود پر پہونچ جائیگا۔ سردیوں میں تو خیر یہ ایک قابل تعریف عمل ہے کیونکہ ہر ایک مسافر دو چار چند مسافروں کے ساتھ بغلگیر ہونے کے باعث چند منٹ کے لئے سردی سے بچا رہتا ہے مگر گرمیوں میں ایسا کرنے سے کیا فائدہ؟ پھر ٹکٹ کلرکوں کا کیا کہنا۔ وہ بند کمرے میں کھڑے سینوں کے راستے دیکھتے رہتے ہیں کہ مسافر پر مسافر گر رہا ہے مگر ٹکٹیں دینے میں حسب سابق جلدی نہیں کرتے۔ خیر تو ہم نے بھی کوٹ پگڑی اتار کر بیگم کے چارج میں کردی اور کرایہ کے پیسے مٹھی میں دبائے کھڑکی کے پاس پہونچے اور دم سے مسافروں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں کود پڑے۔ ادھر سے دھکا ادھر سے زور پسلی میں کسی کی کہنی، گردن پر کسی کا ہاتھ۔

سر بدست دگرے کان بدست دگرے

جوں توں کرکے بایاں ہاتھ بڑھایا اور کھڑکی کی سیخ پکڑلی۔ اور روپئے ٹکٹ فروش کو دیکر کہا۔ "سپردم بتو مایہ خویش را"

"یہ روپیہ کھوٹا ہے، تبدیل کردو۔" ٹکٹ فروش نے دھکا کر کہا۔

"لو جناب۔" ہم نے مُنہ سے دوسرا روپیہ نکال کر ہاتھ سے صاف کیا اور ان کی نذر کردیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اچھے بھلے روپے کو بھی یہ لوگ واپس کردیتے ہیں اور اگر مسافر کی ذرا بھی آنکھ چوک جائے تو اپنے کھوٹے اسٹاک میں سے کوئی نہ کوئی روپیہ اٹھاکر یہ لوگ چلا لیتے ہیں خیر تو ہم نے مشتبہ روپیہ سنبھالا اور ٹکٹ لیکر واپس جو ہوئے تو معلوم ہوا کہ "آمدن بہ ارادت و رفتن بہ اجازت" والا معاملہ درپیش ہے سارے جسم پر گویا پھانسی لگ رہی تھی خدا خدا کرکے باہر نکلے گویا کاربانک کے بند سلنڈر میں سے آکسیجن کی کھلی فضا میں داخل ہوئے عیال و اطفال کے پاس پہنچے پسینے میں شرابور۔ بیوی نے دیکھتے ہی کہا۔

"اوئی۔ قمیص ——؟"

ہم نے پوچھا۔ "کیا وحشت ہے؟ کس کی قمیص، کیا کسی کی قمیص گم ہوگئی ہے؟"

"اپنی قمیص کو پیچھے سے دیکھیں۔"

ہم نے کندھے کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو قمیص پیچھے سے عاشق کا گریبان بنی ہوئی نظر پڑی۔ ریل گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی اس واسطے قمیص پر کوٹ پہن کر اس کی پردہ پوشی کی گئی اور جو کام جس کے ذمہ تھا اسے سرانجام دیتے ہم پلیٹ فارم پر پہونچے۔ بیگم کو مع بچوں کے زنانہ ڈبہ میں بک کیا اور آپ پلیٹ فارم

کو نلنے کے لئے ہوا خوری کرنے گئے۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ نے پرا من خضر جھنڈی لہرایا انجن نے سیٹی بجائی اور ہم ایک جھونکے سے ڈبہ میں گھس گئے۔

ڈبہ میں چار آدمی تو بقید حیات مقید تھے اور ایک لالہ صاحب موت کی بہن سے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ موخر الذکر کی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے کسی تازہ قبر کا نقشہ ذہن میں کھینچ لیں۔ وجہ یہ کہ سر اور پاؤں کے درمیان توند سونٹ ایورسٹ کی طرح ابھری ہوئی تھی جس میں ہر تنفس کی آمد و رفت سمندر کے مدوجزر کا حکم رکھتی تھی ہم سوچنے لگے کہ اگر یہ حضرت لیٹے لیٹے اپنے پاؤں کو دیکھنا چاہیں تو یقیناً ان کا نیر نگاہ تبت سے آنے والی سرد ہواؤں کی طرح اس ابھار کو برداشت نہیں کر سکتا خراٹے اتنے زور سے لے رہے تھے گویا گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کو دعوت مقابلہ دے رہے ہیں۔ اتنے میں آپ نے کروٹ بدلی اور ہم نے ان کی توند مبارک سے توجہ ہٹا کر رسالہ "عالمگیر" کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ تاکہ پہلے جاذب نظر تصویروں سے دل بہلائیں۔

"کون سا اسٹیشن ہے؟" لالہ صاحب نے فوراً بیٹھتے ہی گرج کر پوچھا۔

"شاہدرہ گذر چکا ہے۔" ہم نے مرعوب ہوکر کہا۔

اس کے بعد آپ نے سارے اسم استفہام استعمال کرتے ہوئے ہم پر سوالات کا دھاوا بول دیا جن کا ذکر لاحاصل ہے۔ "یہ آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

ہم نے توجہ ہٹائے بغیر پڑھتے ہی پڑھتے زیر لب کہا "عالمگیر"

"عالمگیر" کون سی کتاب ہے؟ ہم نے تو آج تک یہ نام نہیں سنا۔ ویسے تمام مشہور کتابیں ہمارے اپنے کتب خانے میں موجود ہیں" لالہ صاحب کہتے گئے "تو کس کی لکھی ہوئی ہے جی یہ کتاب؟"

"رسالہ ہے!" ہم نے آہستہ سے کہا۔

"تو لائیے نا۔ ہم بھی دیکھیں، ہمارا بھی ایک رشتہ دار رسالہ میں نوکر ہے"۔

ہماری ہاں نہ سنے بغیر لالہ صاحب نے ہمارے ہاتھ سے رسالہ لیا نہیں بلکہ چھین لیا اور ہم ان کی بے تکلفی کا نوحہ پڑھتے رہ گئے۔ ہم حیران تھے کہ آخر اس ذات شریف نے یہ کیا حرکت کی نہ جان نہ پہچان اور اس طرح ہمارے ادبیانہ جذبات مجروح کر دیئے لالہ صاحب منہ کھولکر ورقوں کو تک رہے تھے۔ پڑھ نہیں گویا کھا رہے تھے اور ہم لالہ صاحب سے رسالہ واپس لینے کیلئے تجاویز کی فوجوں کی تیاری کر رہے تھے۔ چھیننا ہمارے لئے ناممکن تھا کیونکہ جسمانی طاقت میں ہم ان کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔ اور اس لحاظ سے ہماری طاقت سے یقیناً ان کی گرفت بے نیاز تھی۔ قدرت نے یہ مشکل آسان کر دی یعنی لالہ جی مہاراج اونگھنے لگے اور ہم نے شبخون مارنے کا ارادہ کر لیا۔ جونہی ہم نے "عالمگیر" کو ہاتھ لگایا۔ لالہ جی جاگ اٹھے اور رسالہ سنبھالتے ہوئے کہنے لگے: "اوہو، ہم سو گئے تھے۔ ٹھہریئے صاحب ابھی ہمیں دیکھنے دیں۔ اچھی کتاب ہے"۔

وہ اپنے آپ کو اس کا بلا شرکت غیرے بمعہ جملہ حقوق محفوظ واحد مالک سمجھتے تھے کافی عرصہ تو ہم نے ضبط و تحمل کو ہاتھ سے نہ دیا مگر اپنے جذبات اور وقت فرصت کا خون ہی ہوتا دیکھکر ہم نے غیر مبہم الفاظ میں صاف طور پر کہدیا: "لالہ جی! اب ہم پر بھی نظر کرم فرمائیں یعنی براہ نوازش عالمگیر واپس دیدیں۔" مگر لالہ صاحب مطلبی بہرے کی طرح سنی ان سنی کر گئے۔ ہم نے لجاجت سے کئی مرتبہ اپنا بجا مطالبہ پیش کیا مگر لالہ جی نے شرف قبولیت بخشنا مناسب سمجھا اور گول ہو گئے۔ ذہنی کوفت کافی تھی ہم ذرا اونگھ گئے۔۔۔۔۔۔

"لیجئے صاحب! اپنی جائداد۔" ہم چونک پڑے۔ "وزیر آباد اسٹیشن آگیا ہے" لالہ جی نے فرمایا۔

دل تو چاہا کہ ایسے گھونسوں کے لالہ جی کا پیٹ پنکچر کر دیا جائے مگر۔۔۔۔۔۔

ہم صرف سبحان اللہ کہہ کر رہ گئے اور گاڑی تبدیل کرلی گئی۔

زنانہ ڈبہ میں تو کافی گنجائش تھی کیونکہ مسافر ماسوائے چند ایک اپنی اپنی بہتر دل (عورتوں) کو عام طور پہ مردانہ ڈبوں ہی میں ٹھونس لیتے ہیں لہذا بیگم اور بچے تو بغیر استقبال کے ہی بیٹھ گئے مگر ہمارا ضرورت سے زیادہ استقبال کیا گیا اور مسافروں نے ہمیں اتنا ہاتھوں ہاتھ لیا کہ ہمارے قدم نیچے نہ لگنے دیئے۔ چند اسٹیشنوں تک تو ہم معلق ہی سفر کرتے گئے سواریوں کے اترنے پر ہم بھی ایک بنچ پر اڑ گئے تو دیکھا بہت سے پائدانوں پر کھڑے ہیں اور بہت سے ۶ نمبر دردوں تلے بڑوں۔

اب ہم نے عالمگیر جو دیکھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے وہ ۱۹۳۵ء کا نہیں بلکہ ۱۹۳۵ ق م کا سالنامہ معلوم ہوتا تھا۔ اور تمام تصویریں جو رسالہ کی جان تھیں اور جو ہمیں بلا شک و شبہ لالہ صاحب کی جان یا ان جیسے تشنگان مطالعہ کی ہزار ہا جانوں سے زیادہ عزیز تھیں ندارد تھیں۔ باقی ہم سیالکوٹ پہونچے یا نہ پہونچے اور شادی میں کھانا بھی ملا یا نہیں ملا یہ باتیں پرائیوٹ سی ہیں۔ نہ ہم بتائینگے اور نہ ناظرین کو ہم سے پوچھنے کا حق ہے۔ والسلام۔

احمد الدین شاکر

طرزِ قدیم

مولٰنا مظہر الحق صاحب مظہر سلطانپوری

دل کو عشقِ ابروئے خمدار ہے
اب ہمارا سر ہے اور تلوار ہے

آج جنبش میں لبِ سوفار ہے
پرسشِ حالِ دلِ بیمار ہے

سہل مرنے کی ہی مشکل ہو کہیں
اُن سے گر ملنا بہت دشوار ہے

میکدے میں شیخ جی آتے بھلا
اس میں بھی کیا جانے کیا اسرار ہے

پھر ہوئی دل کی طرف اُن کی نظر
پھر تلاشِ مرہمِ زنگار ہے

پھول داغوں کے کھِلے ہیں اس قدر
دل حسینوں کے گلے کا ہار ہے

بے نقاب آتے ہیں اب وہ خواب میں
دل میں جب سے زخمِ دامن دار ہے

آج توبہ تم بھی توڑو شیخ جی
ابر ہے، مے ہے، ہوا ہے، یار ہے

مُردے جی اٹھتے ہیں تیری چال سے
واہ کیا معجز نما رفتار ہے

پی کے زاہد ہو گیا کایا پلٹ
سر پہ جوتا پاؤں میں دستار ہے

کام سے چھوٹے تو فکرِ شعر ہے
یہ بھی مظہر مفت کی بیگار ہے

"مامتا"

از (اے) سہاوری

بیسویں صدی کی عمر پینتیس برس کی ہو چکی تھی۔ زمانہ کا رنگ معصیت شباب پر تھا اور بچپن میں معصومیت، جوانی میں غرور طبعی۔ موسم گرما ایسا جوش، اور ضعیفی میں سنجیدگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بدی کا بازار گرم تھا۔ اخوت و حمیت لایعنی سمجھی جاتی تھی، اور مذہب و الہیات کو ایک ڈھونگ ہونے پر محمول کیا جا رہا تھا۔ غرضیکہ الحاد اور بہیمیت کا دور دورہ تھا۔

آئے دن کی ان انسانی حرکتوں پر قدرت کو سوچ آیا تھا اس نے ہندوستانیوں کے کردار کو کنکھیوں سے دیکھا۔ چیں بجبیں ہو جانا لابدی تھا۔

دفعتہً زمین پانی اگلنے لگی۔ گنگا باڑھ پر آ گئی۔ جمنا ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ ان کی ہر موج پیشانی کی شکن اور ہر بلبلہ کف عفریت معلوم ہوتا تھا۔ سیلاب بھی کیسا عالمگیر سیلاب آیا۔ جل تھل ایک ہو گئے۔ ہزاروں بستیوں اور خاندانوں کا عدم و وجود برابر ہو گیا ـــــ کہیں کہیں تو ندیاں جھیلوں اور سانپوں کے بہتے ہوئے دریاؤں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

آگرہ کا جمنا پل معرض خطر میں تھا۔ اعتماد الدولہ پر ریل گاڑی پار ہونے کے لئے کھڑی تھی۔ دو سرکاری فرنگی انجینیر کاوش کے مجسمے، اضطراب کی تصویریں، اعتماد کے پیکر اور سرد دی کے تپلے بنے ہوئے پل کی رہی سہی قوت برداشت کا اندازہ لگا رہے تھے کہ آیا اس کا سینہ گاڑی کے وزن کا متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں ـــــ؟

پولیس کے سپاہی ہر بیس قدم پر کمربستہ تعینات تھے تاکہ کوئی راہگیر رک نہ سکے۔

راہ رووں کی اس روا روی میں رام کلی بھی اپنے شیر خوار بچہ کو گود میں لئے ہوئے گذر رہی تھی وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ اے پریتم! ایک برس کی برہا بہت ہوتی ہے۔ ایک پریت کی ماری کی نمبرلی ہوتی۔ اب تو اسے جینا بھی اجیرن ہو گیا ہے۔ تمہاری یہ فوجی چاکری اسے راس نہیں آئی۔ تمہاری سوتیلی ماں نے دن رین مصیبتیں ڈھا ڈھا کر اس کی جان پر بنا دی ہے مگر آہ! ـــ تمہیں کیا غم؟ اب اس کی جان جوکھوں پر ہے ـــــ آج وہ بے بات گھر سے بھی نکال دی گئی ہے۔"

"میری یہ کالی ناگنیں۔ یہ گھونگھر والے بال جنھیں تم چوما کرتے تھے آج تمہارے سوگ میں جٹا ہو گئی ہیں اور ہاتھوں کی چوڑیاں جو تم نے ساون میں لا کر دی تھیں اب جوگنوں اور سادھوؤں کے کڑے بن گئی ہیں۔

میرے سوامی! تم بن سانسیں لینا دوبھر ہیں۔ یہ میرا روپ اور جوانی اور سندر سا مکھڑا تمہارا دھیرج ہیں اب ان میں بھی پاؤں اور پر لگ چلے ہیں"

رام کلی انھیں خیالوں میں محو چلی جا رہی تھی۔ احساس سے بے نیاز اور انقلابات روزگار سے بےخبر ـــــ بچہ اس دارو گیر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور ہمک ہمک کر گود سے نکل پڑنے کی بار بار کوشش کرتا تھا۔

یکایک ایک سپاہی نے کثیف۔ بھدی اور بے رنگ ساڑھی پہنے ہوئے رام کلی کو بیکس اور بےبس جان کر کرخت لہجہ میں کہا او بدنصیب! چل ہٹ، جلد دور ہو جا کیوں جان سے بیزار ہے۔" اتنا کہا اور اس کے بازوؤں کو ہلکی سی ایک جنبش دی۔ دکھ کی ماری اور غم سے نڈھال رام کلی میں اتنا دم کہاں تھا، کہ اس کی تاب لا سکتی۔ بیچاری اپنے آگے چلنے والے ایک فوجی راہگیر سے

ٹکرا گئی۔ نوجی جانمانے سر اٹھا کر دیکھا تو فلک زدہ گر چکی تھی اس کا بچہ دفعتہً ہمک کر گود سے نکلا اور طوفان خیز دریا کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے چل دیا۔

پھر کیا تھا۔ نوجوان کی جرات اور انسانی حمیت کو ایک تازیانہ لگا اور آ رعنا نے ایک پل ضائع کئے بغیر اپنی نوجی وردی سمیت بے دھیان ہو کر دریا میں ایک زقند ماری۔ چشم زدن میں تماشائیوں کے قلب امید و بیم کا شکار ہو گئے۔ بہادر نے بچہ کو ایک ہاتھ میں اٹھا لیا اور کہنہ مشق تیراک کی طرح شناوری کرنے لگا۔

بیخود رام کلی پل کے پار چاروں شانے چت زمین پر پڑی تھی۔ جم غفیر مخلوق ہر طرف کھڑی ہوئی جوان کو استعجاب کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی وہ گود میں بچہ لئے ہوئے رام کلی کو ہوش میں لانے کی سعی کر رہا تھا۔ رام کلی سکون پا کر ہوش بجا ہوئی اور آنکھیں کھول دیں اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے بچے کو دیکھا مگر اس سے زیادہ دلکش اور دیدنی نظارہ وہ تھا جب اس نے نوجوان کو غائر نگاہ سے دیکھ کر انتہائی مسرت سے بے محابا پکارا ـــــ ہے بالم تم آگئے؟"

تماشائی ایک دوسرے کا حیرت سے منہ تکتے ہوئے سرگوشی کرنے لگے ـــ

"اُف! یہ باپ کی مامتا تھی"

گلدستہ

جناب مولٰنا مظہر صاحب سلطانپوری

خاکِ پا اس کی مجھے درکار ہے … بہر جس کا آئینہ بردار ہے
ذکرِ روئے احمدِ مختار ہے … حُسنِ مطلع، مطلعِ انوار ہے
خواب میں دیکھا ہے جب سے روئے پاک … طالعِ خفتہ مرا بیدار ہے
کر دیا جس نے ہما کو بادشاہ … آپ ہی کا سایۂ دیوار ہے
یا محمد آسرا ہے آپ کا … کوئی مونس ہے نہ اب غمخوار ہے
ہے ترے طوقِ غلامی کا اثر! … گلشنِ جنت گلے کا ہار ہے
جلد بلوا لو مدینے میں شہا! … ہند میں مظہر ذلیل و خوار ہے

حضرت نفیس سندیلوی از جے پور

تری تیغِ ادا ہے اور میں ہوں … قضا کا سامنا ہے اور میں ہوں
زمیں پر بیٹھ کر جو پھر نہ اُٹھے … ترا وہ نقشِ پا ہے اور میں ہوں
پریشاں حال اور آشفتہ خاطر … تری زلفِ دوتا ہے اور میں ہوں
جھکا ہے سر تہِ شمشیرِ قاتل … یہ محرابِ دعا ہے اور میں ہوں
بتوں کے سامنے کرتا ہوں سجدہ … نمازِ بے ریا ہے اور میں ہوں
خدائی سے نہیں کچھ کام مجھ کو … بُتِ ناآشنا ہے اور میں ہوں
یہ کہنا ناز سے اُس بیوفا کا … نفیسِ بے وفا ہے اور میں ہوں

حضرت قیصر۔ بہ غزل حضرت میر امانت علی صاحب رئیس کشن گڈھ!

آسماں سے چاند تارے بے خطر دیکھا کئے
اور گر گر کر پتنگے شمع پر دیکھا کئے
دیکھنے والے خوشی سے تا سحر دیکھا کئے
غیر ان کو انجمن میں رات بھر دیکھا کئے ….. ہم الگ بیٹھے ہوئے سب کی نظر دیکھا کئے

اپنے مرنے کی گھڑی بھی دیکھنے کی چیز تھی
ایک ساعت آخری بھی دیکھنے کی چیز تھی
رخصتِ بیمارگی بھی دیکھنے کی چیز تھی
صبحِ غم کی بیکسی بھی دیکھنے کی چیز تھی….. سانس ہم نے توڑ دی اور چارہ گر دیکھا کئے

اک نئی ہر وقت کیفیت نظر آتی رہی
ہر طرف چھائی ہوئی حیرت نظر آتی رہی
تھی جو دل کی روح وہ طلعت نظر آتی رہی
اپنے دل میں یار کی صورت نظر آتی رہی….. ایک آئینہ تھا جس کو عمر بھر دیکھا کئے

تھا مرقع یہ جہاں تیری تجلیات کا
دہر کے ہر دلربا منظر میں تو ہی تھا چھپا
رات میں اور دن میں کی محسوس تیری ہی فضا
چاند بن کر تو کبھی نکلا کبھی سورج بنا….. ہم تجھے ہر رنگ میں شام و سحر دیکھا کئے

عاشقی میں عجز تھا اور حسن تھا ناز آفریں … دل نیاز افروز تھا قیصر نگاہیں نازنیں
مختلف تھیں نازشیں گو نازشیں دونوں کو تھیں … ان کی اپنے آستانِ ناز پر نظریں رہیں
داغِ سجدہ ہم جبیں پر اے اثر دیکھا کئے

فلسفی کی ڈائری کا ایک ورق

جناب مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدرآباد دکن

احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر مجھے گنگا اشنان دیکھنے کیلئے جانا پڑا - اُس روز مجھ پر فلسفہ کی وہ لطیف کیفیات طاری تھیں جن سے افلاطون اور ارسطو کے قلب و ضمیر بھی شاذ و نادر ہی آشنا ہوئے ہونگے میں بالکل تنہائی چاہتا تھا، مگر میرے شفیق احباب نہیں نہیں ظالم و جابر احباب کے اصرار نے مجھے ایک ایسے مقام پر لیجا کر کھڑا کر دیا جہاں انسانی سروں کا سمندر موجیں مار رہا تھا - اور چیخ و پکار کے بیشمار غیر مرتب ساز چھڑے ہوئے تھے -

ہم سب پہلے بازار میں ہو کر گذرے، دوستوں نے دوکانوں پر خرید و فروخت شروع کر دی - کپڑے کی دوکانوں سے گذر کر کھلونے والوں کے یہاں پہونچے - احباب نے کھلونوں کی دیکھ بھال شروع کی - لیکن میرے لئے ہر کھلونا فلسفہ کا ایک پیکر ناطق تھا - کھلونے حسین تھے - اور جاذب نظر بھی - مگر میرے لئے جاذب قلب و دماغ اور داعی غور و فکر -

ایک کھلونا پرندکی شکل کا تھا جو بڑے زور سے سیٹی بجاتا تھا - لیکن سیٹی بجاتے ہوئے اس کے چونچ کو نہ تو جنبش ہوتی تھی - اور نہ اس کا کوئی حصہ جسم ہلتا تھا - سننے والوں کے لئے سیٹی کی آواز ایک لطیف تفریح تھی - مگر میرے واسطے "صدائے حقیقت" اور "پیغام فطرت" - کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا نے کلام فرمایا تھا - معراج میں حضرت سرکار دو عالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے باری تعالیٰ نے گفتگو کی تھی - اس قسم کی باتوں کو اگرچہ میں اعتقادی طور پر تسلیم کرتا تھا مگر کبھی کبھی تشکیک و ارتیاب کا غیر محسوس حملہ میرے دل پر چٹکی لیتا تھا اور میں بدحواس ہو جاتا تھا - آج بے پردہ حقیقت پنہاں منکشف ہو گئی جو ایک تیز پھانس کی طرح میرے دل میں نہ معلوم کب سے کھٹک رہی تھی -

عام طور پر جب کوئی جاندار سیٹی بجاتا یا بولتا ہے تو اس کے لبوں کو ہیچ گویا سر کو ضرور جنبش ہوتی ہے مگر کاریگر یا کھلونے بنانے والے کی ادنیٰ کوشش نے کھلونے کے فعل تصفیر (سیٹی بجانا) کو اس عام قاعدہ اور ناگزیر اصول سے مستثنیٰ کر دیا - جب ایک معمولی سمجھ کے صناع کی کوشش بولنے کے اصول میں ردو بدل کر سکتی ہے تو وہ قادر مطلق' اور صناع حقیقی جس نے انسان کو نطق بخشا کیا اس چیز پر قادر نہیں ہے کہ الفاظ و حرکات، زبان و حلق، لب و دنداں کی امداد کے بغیر کلام فرما سکے - پس صوت ربانی اور کلام باری - الفاظ و زبان اور حروف و دہن کے واسطہ اور امداد کی رہین منت نہیں ہوئی - ہر چند کہ خدائے تعالےٰ تجسم و تشکل سے بے نیاز ہے - مگر وہ کلام فرماتا ہے اور سننے والے اس کو سنتے ہیں -

اس کھلونے کے بعد میری نظر دوسرے کھلونے پر پڑی جو نٹ کی صورت کا تھا - اس میں کنجی دی جاتی تھی اور نٹ قلابازیاں کھاتا تھا - لوگ کھلونے کو دیکھ کر بے اختیار ہنستے تھے لیکن قسم لے لو کہ کھلونے کی ایک قلابازی پر بھی میرے لبوں پر تبسم کی کوئی جھلک بھی نمودار ہوئی ہو - میرا ذہن تو اس مسئلہ کی کرید اور اس حقیقت کی دریافت میں مشغول تھا کہ کھلونا بالکل مجبور و محتاج ہے - جب تک کنجی نہیں دی جاتی وہ حرکت نہیں کر سکتا اس کی قلابازیاں کسی دوسری حرکت کی تابع ہیں بالکل اسی طرح کائنات کا سارا ہنگامہ بھی فاعل حقیقی کے فعل و ارادہ کا محتاج ہے ایک ذرہ بھی اپنی مرضی سے جنبش نہیں کر سکتا اور گھانس کی ایک پتی بھی اپنے ذاتی ارادے سے مرتعش نہیں ہو سکتی -

دنیا کی مشین خدائے مطلق کے ارادہ کی بھاپ سے چل رہی ہے - جب وہ چاہیگا مشین رک جائیگی -

میں اس سلسلہ میں مزید غور و فکر کر رہا تھا کہ میرے ایک من چلے دوست نے

میرے شانوں کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا ۔

"عجیب مرد معقول ہو، نہ کوئی کھلونا خریدتے ہو۔ نہ کسی چیز کو دیکھتے ہو۔ بس نٹ کی قلابازیوں پر نظریں جمی ہوئی ہیں ۔ چلو! گنگا کے کنارے اشنان کا منظر دیکھیں گے۔"

مجھے اپنے افسانہ خیال کو ناکمل چھوڑ کر طوعاً و کرہاً دوستوں کی ٹولی کے ساتھ گنگا کے کنارے جانا پڑا۔ میں احباب کے خلوص و محبت کی بڑی قدر کرتا ہوں لیکن ایسے موقعوں پر احباب کی محبت ایک ایسی کفر انگیز عداوت ہوتی ہے جو چند لمحوں کیلئے نفرت کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ میں دوستوں سے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے جھجکتا ہوں اور وہ ظالم میرے تیوروں سے میرے دل کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ اس درد کا مداوا صرف اس طرح ممکن ہے کہ یا تو مجھ میں ترجمانی جذبات کی جرات پیدا ہو جائے یا وہ "چین جبیں" سے غم پنہاں سمجھ سکیں۔

گنگا کے کنارے عجیب منظر تھا۔ سادھوؤں کی ٹولیوں کی ٹولیاں ننگے جسموں سے بھبوت ملے ہوئے بھجن گا رہی تھیں۔ کوئی سیتل پاٹی بچھائے مراقبہ کر رہا تھا۔ کسی کا سر ریت میں دفن تھا اور تماشائی اس کے پیٹ پر پیسے چڑھاتے تھے۔ تماشائیوں کے لئے یہ منظر بڑا ہی تفریح بخش تھا مگر میں تو اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ ان سیانے سادھوؤں۔ گانے والوں اور آسن جمانے والوں کے افعال و حرکات کی علت غائی اور مقصد پیسہ ہے اور اسی محور پر ان کی تمناؤں کی دنیا گردش کر رہی ہے اسی طرح تمام عالم جنس و رنگ کے اختلاف کے باوجود ایک مقام پر جا کر متحد المقصد اور مشترک الخیال ہو جاتا ہے اور وہ مقام تصور باری ہے" کاش اس اشتراک کی اہمیت کو دنیا سمجھ سکے تاکہ باہمی اختلافات کا قلع قمع ہو جائے۔

خیال کا دریا میرے دماغ میں امنڈ رہا تھا کہ ایک دوست نے میرے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"اقدس تم ٹھیٹ ہی بدمذاق ہو۔ ان لنگے فقیروں کے پاس کیا دیکھ رہے ہو ادھر گنگا کے کنارے چلو، جہاں حسن و جمال کی نمائش ہو رہی ہے"۔

مجھے وہاں جانا پڑا جہاں واقعی حسن و جمال کا آتشکدہ بھڑک رہا تھا۔ لاغواتی جسم، ہلکی ساڑھیاں، زعفرانی، اودی اور پیازی رنگ برنگ کی اس پر پانی میں ڈبکی لگا لگا کر خوش فعلیاں! واقعی ضبط مشکل تھا۔ زہد و تقویٰ پر کپکپی طاری تھی اور ہوس رندی کا بازار گرم تھا۔ ایک چنچل اشنان کرنے والی نے غوطہ لگا کر انگڑائی لی اور انگڑائی لیکر غارتگر ایمان بال نچوڑنے لگی۔ میرے دوست اعظم سے نہ رہا گیا میرے ہاتھ کو بے اختیار دبوچ کر بولا۔

"اقدس! میرے دل کی دھڑکن کو دیکھو، میرے زور تنفس کا اندازہ لگاؤ۔ میری نبض کے اہتزاز کا جائزہ لو لیکن ہائے تم تو پتھر کا دل رکھتے ہو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔"

میں نے اعظم کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھائی حسن و جمال کا نظارہ واقعی اپنے اندر دلکشی رکھتا ہے اور میں ان لطیف و جمیل کافرادائیوں سے غافل نہیں ہوں لیکن تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تمہاری نظر میں حال ہے اور میری نگاہوں کے سامنے مستقبل ۔ تمہاری عقل جذبات سے مغلوب ہے اور میرے جذبات پر عقل کا غلبہ ہے ۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ نظارہ بالکل عارضی اور آنی ہے ۔ چند لمحوں کے بعد ہم یہاں سے جدا ہو جائینگے"۔

اعظم نے تلملا کر کہا۔ "اقدس! تمہارا فلسفہ مجھے ہلاک کر کے چھوڑیگا۔ اچھا چلو! لیکن ایک بار مجھے جی بھر کے نظارہ تو کر لینے دو۔"

اعظم نے کئی بار گھور گھور کر دیکھا اس کے بعد ہم وہاں سے مکان چلے آئے۔

ماہر القادری

"ندامت"

از جناب مولٰنا ابوطاہر صاحب داؤد بی۔ ایس سی

"کبوتر کیسے اُڑا؟" ـــ "اس طرح!" اور یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے دوسرا بھی اُڑا دیا۔ یہ بحث نہیں کہ یہ واقعہ نورجہاں اور جہانگیر کی درس محبت کا پہلا سبق تھا مگر اس سے انکار نہیں کہ سادگی کا بہترین مرقع ہے یہ مسلّم امر ہے کہ تہذیب تصنع ہوشیاری اور طباعی کا نقش دیرین مٹھتا ہے لیکن سادگی کافی الفور بے ساختہ اور بھرپور ـــ آخر الذکر ایک ایسی تلوار ہے جس کی دھار بیحد تیز اور جو حیثیت خود غربیلی اور اول الذکر مثل میں لپٹی ہوئی جو کاٹتی ضرور ہے لیکن کند۔

یہی سادگی تھی جو ہماری نگاہوں کو یکبارگی اس طرف لے جاتی تھی؛ ہم کیا کالج کے تمام لڑکے اپنے اپنے ہوسٹل چھوڑ کر اس دور افتادہ مقام پر محض اس لئے آتے تھے کہ اپنی قوت مشاہدہ کو تیز کریں اور اپنی آنکھوں کی مقناطیسی قوت کا امتحان لیں۔ ہم نے سولھویں سال انٹرنس پاس کیا۔ کالج میں داخل ہوگئے ہم جب تک اسکول میں رہے ایسا موقع کبھی نہ ملا کہ تعلیم کے اس اہم جزو کی تیاری کریں اور نہ کبھی خیال تھا کہ ہم کو اس امتحان کی تیاری بھی کرنی پڑیگی۔ اس لئے نہ ہم نے اس کے کورس کی کتب خریدیں اور نہ اس کے پروفیسروں سے ملاقات۔ کالج میں ہم خود نئے انڈر گریجوئٹ تھے اور اس لئے عجائب روزگار سمجھے جاتے تھے۔ کوئی بتانے والا بھی نہ تھا۔ دوسرے یہ تحریری امتحان ہوتا تو ہم کسی سے پیچھے بھی نہ رہتے لیکن دقت یہ تھی کہ یہ زبانی تھا اور اسی لئے ہم کو خود تن تنہا اس ڈگری کو حاصل کرنا تھا۔

ایک مقام ہے جہاں بالکل نینی تال کا سا منظر ہے ایک لمبا چڑھاؤ اور اس کے بعد ایک لمبا اتار دونوں طرف لکڑی کا کٹہرہ اس کے بعد ڈھلوان زمین جس کے انتہائی نقطۂ پستی پر دوسری سڑک اور اس کے سامنے چند خس پوش مکان۔ یہ تھی وہاں کی جغرافیہ۔

ہم اس سڑک پہ روز آتے جاتے تھے لیکن اس طرح کہ دیکھنے والے ہمارے چہرے اور حرکات و سکنات سے کسی طرح تمیز نہ کر سکتے تھے کہ ہم یہاں کس غرض سے آئے ہیں؟ ہم ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے اس کو ہلاتے ہوئے نظر کو چاروں طرف پھراتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم ڈالتے ہوئے چلتے تھے۔ جس وقت دیکھتے تھے کہ آئیندو رَوند میں ہماری حرکات کا مشاہدہ کرنے والا کوئی نہیں ہے تو ہم بہت خوبصورتی سے اپنی گردن کو اس طرف موڑتے تھے۔ اگر ہمارا مطلوب نظر کسی کام میں مشغول ہوتا تھا تو ہم اس طرح کھانستے تھے جس طرح ایک کالی کھانسی کا بیمار یا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اچھو لگ گیا ہے لیکن اس کی آنکھیں نیچی ہی رہتی تھیں۔

بعض اوقات ہم چلتے چلتے اپنا رومال یا چھڑی وہاں گرا دیتے تھے اور اس کے اٹھانے کے لئے جھکتے تھے اگر اس وقت کوئی شخص آتا دکھائی دیتا تھا تو ہم اس تیزی سے دوسری طرف دیکھنے لگتے تھے کہ جیسے ہم نے اس طرف کبھی دیکھا ہی نہیں اور جانتے ہی نہیں کہ اُدھر کیا ہے؟۔ اگر اسی اثنا میں وہ شخص ہماری آنکھ سے اوجھل ہو جاتا تھا تو ہم اسی جگہ پھر اپنی چھڑی پھینک دیتے تھے بالکل اسی جھٹکے کے ساتھ جس طرح فطرتی طور سے گرتی ہے۔ اس کو اٹھانے کے لئے ہاتھ ایک طرف موڑتے تھے اور اس کی آنکھیں نیچی ہی رہتی تھیں۔

اسی دوران میں جبکہ ہم اپنی چھڑی گرا کر اس کو گھورنے کی کوشش کر رہے تھے اگر کوئی ایسا شخص آگیا جس کا مطلوب بھی وہی ہوتا تھا تو عجیب لطف آتا تھا۔ لامحالہ ہم اپنے کو بیگناہ ثابت کرنے کے لئے اس کی طرف سے نظر پھیر کر ان کی طرف دیکھتے تھے اور وہ اس کی طرف سے نظر ہٹا کر ہماری طرف دیکھتے تھے بیچ میں ہم دونوں کی نگاہیں ملتی تھیں تو ہر ایک اپنے دل میں چور پاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دونوں منفعل ہو کر اپنے قدم تیز کر دیتے تھے اور اس طرح ایک

اپنے دل میں چور پاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دونوں منفعل ہو کر اپنے اپنے قدم تیز کر دیتے تھے اور اس طرح تنے ہوئے جاتے تھے جس طرح ہم بہت بڑے شاہ ہیں۔ آگے چل کر ہم صرف اس خیال سے پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے کہ اگر یہ صاحب جو فطرت میں بلا رنا گھانی تھے بہت دور نکل گئے ہوں تو لاؤ ہم پھر اسی جگہ پلٹ چلیں مگر ہماری پشیمانی ہمارے سر آنکھوں پر ہم بھی ان کو دیکھتے تھے کہ ٹھیک اسی وقت وہ بھی مڑ کر دیکھ رہے ہیں نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو اطمینان دلانے کے لئے اپنا اپنا راستہ ایمانداری سے طے کر دیتے تھے۔

ایک روز ایسا ہی واقعہ ہوا خستہ بھی تھے اور گرسنہ بھی۔ پیہم ناکامیوں کی وجہ سے ہماری حالت ایسی ہو گئی تھی جیسی سنہ ۳۲ء کے بی۔ اے پاس کی۔ اب بتلیئے ایسی حالت میں جبکہ ہم اتنے قریب پہنچ گئے ہوں جتنا جرمن انگریزوں کے قریب جنگ عظیم کے زمانہ میں اور خوش قسمتی سے مطلع بھی اتنا ہی صاف ہو جتنا کہ اس زمانہ کا سمندر جنگی جہازوں سے مزید برآں ہم اپنی ایک سیکنڈ میں سو مرتبہ جھپکنے والی شبین گن صفت آنکھوں کا رخ بھی اسی نشانہ کی طرف کر چکے ہوں کس قدر تم انگیز واقعہ ہے کہ اسی وقت اور اسی گھڑی قریب کے ریسٹورنٹ سے ایک صاحب زنبیل کے پھینکے ہوئے گولے کی طرح ہمارے سامنے آ کر گرتے ہیں۔ ایسے نازک وقت اگر ہم منہ پھیر کر چلے جاتے تو مورچہ قبضہ سے جاتا رہتا اگر آگے بڑھ جاتے تو کہاں جاتے اور کس طرف جاتے اس لئے ہم اپنے ڈانواڈول دل کو اصلی حرکت پر لا کر اور اپنے کانپتے ہوئے پیروں کو روک کر وہیں جم گئے اور سامنے آنے والے صاحب کو دھوکہ دینے کے لئے ایک پیر جنگلہ پر رکھ کر جلد جلد جوتے کے تسمے کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ بالکل ہمارے قریب آ گئے تو ہم تسموں کو آہستہ آہستہ باندھ رہے تھے اور کبھی کبھی ان کی طرف بھی نظر کر لیتے تھے۔ ان کے حلیہ مبارک سے پتہ چلتا تھا کہ بہت کمزور ہیں اور چال سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کر رہے ہیں کیونکہ ہم سے اکثر ان کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ مجھ سے دس قدم آگے نکل گئے تو یکایک مجھ کو کسی کے دھڑام سے گرنے کی آواز آئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے پلٹ کر دیکھا کہ وہی صاحب زمین دراز کی حالت میں پڑے ہیں یہ خوش قسمتی تھی کہ ایسے حادثہ کے وقت اس پتھر کی مورت پر بھی جو اتنی دیر سے سر جھکائے اپنے روزانہ کے کام میں مشغول تھی اثر ہوا اور وہ بھی اس طرف دیکھنے لگی۔ میں چونکہ جانتا تھا کہ سڑک صاف ہے کوئی حادثہ شدید نہیں ہو سکتا

ان کی مدد کو اس طرح چلا کر قدم آگے اور نظر پیچھے۔ غیر جب میں وہاں پہونچا تو وہ اپنے کپڑے جھاڑ رہے تھے۔

"چوٹ تو نہیں آئی آپ کے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"چکر آگیا۔ ہاں میں تیا کو بہٹ تھی۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

مگر ان کے ہونٹ اور دانتوں پر پان کا نشان تک نہ تھا۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ شاید انھوں نے اپنی عمر میں کبھی نہ کھایا ہوگا۔"

"اس پیڑ کے نیچے آرام لے لیجئے۔" میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! میرے گٹے میں موچ آگئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ لنگڑاتے ہوئے چلے اور جنگلہ پر پھدک کر بیٹھ گئے۔

"تانگہ مل جاتا تو اچھا تھا، آپ کو شاید دور جانا ہے۔" میں نے مصلحتاً کہا۔

"مگر اس وقت کیوں ملنے لگا۔ ضرورت کے وقت ہر چیز عنقا ہو جاتی ہے" انھوں نے جواب دیا۔

میں خاموش ہو کر ان کے گرنے پر غور کرنے لگا اور ان کی طرف انکھیوں سے دیکھتا بھی رہا۔ ان کا گوشۂ چشم اتفاق سے ادھر ہی تھا جدھر مجھے شک تھا اس لئے میں نے قیاس کیا کہ یہ بھی اسی شمع کے پروانے معلوم ہوتے ہیں اور انھوں نے اسی جگہ استحسان جانے کیلئے گرنے کی ارادۃً کوشش بھی کی ہو تو تعجب نہیں۔

"آپ میرے لئے کیوں حرج کرتے ہیں؟" انھوں نے اس لہجہ میں کہا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری موجودگی ان کو ناگوار ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت ایک تانگہ بھی آتے دکھائی دیا۔

"آہا! تانگہ آگیا، خدا نے آپ کی سن لی"۔ میں نے ان کی بات کو اس طرح اڑایا گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ تانگہ کیا آیا گویا ملک الموت آگیا۔ ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔

"ہاں آ تو گیا۔" انھوں نے سوکھے منہ سے کہا۔

میں نے بلا ان کے کہے ہوئے تانگہ روکا اور فوراً ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے میں مشغول ہو گیا۔ اور لطف یہ کہ تانگہ والے کو بھی مدد کیلئے بلا لیا۔

"میں ٹھہر تا ذرا، دم لونگا، پھر جاؤں گا۔ وہ رک رک کر گھبرا گھبرا کر کہتے رہے۔ مگر میں نے ان کو تانگہ میں ڈال ہی دیا۔

"میری دعا ہے کہ آپ کا پاؤں جلد اچھا ہو جائے۔" میں نے رخصتی طریقے سے کہا اور تھوڑی دیر تک ان کی عرق آلود پیشانی کو بھی دیکھتا رہا۔ ادھر تانگہ رخصت ہوا

ادھر میں اپنی جائے مطلوب کی طرف روانہ ہوا مگر افسوس کہ میدان خالی تھا ہم نے خیال کیا کہ بہادر انسان کو ناامید نہ ہونا چاہئے انتظار ہی میں بھلائی ہے اس لئے ہم نے اپنا رخ قریب کے ایک پارک کی طرف پھیر دیا۔ ہم نزدیک کی پگڈنڈی کو طے کرتے ہوئے خاص سڑک کے ایک بازو پر ہو کر دوسرے بازو کی طرف جا ہی رہے تھے کہ یکایک سامنے سے وہی صاحب آندھی اور بگولے کی چال سے لپکتے جھپکتے ہماری ہی طرف آتے دکھائی دیئے مگر اس قدر مستغرق تھے کہ انھوں نے ہم کو مطلق نہ دیکھا ہم کو تعجب تو اس بات پر تھا کہ ان کا درد اس قدر جلد کیسے اچھا ہو گیا اور یہ تانگہ کہاں چھوڑ آئے۔؟

"ارے، آپ کا درد اچھا ہو گیا؟" ہمارا کنکھار کر کہنا تھا۔ ان کا ہماری طرف دیکھنا تھا۔ ٹھٹک کر رہ جانا تھا۔ بدحواس سا ہو جانا تھا۔ بیان نہیں کر سکتے کہ ان کی کیا حالت ہوئی۔ ابھی تک تو ان کا رخ خاص اسی سڑک کی طرف تھا مگر وہ بلا ہم سے کچھ کہے ہوئے اور بغیر ہمارے سوال کا جواب دیئے ہوئے نزدیک ترین جھاڑی کو پھاند کر پارک میں جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس اضطراب کا برا ہو کہ ان کا پیر جھاڑیوں میں اٹکا۔ اچکن حد بندی کے خاردار تاروں میں الجھی اور وہ خود لوٹ پوٹ ہو کر چاروں شانے چت گر پڑے۔ ابکی واقعی ان کو چوٹ لگی تھی۔ مگر وہ بغیر کسی کمزوری کا احساس کئے کھڑے ہو گئے اور جب تک ہم وہاں تماشہ دیکھنے کو پہونچیں وہ خاردار تاروں کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر جست کر چکے تھے مگر اتنا ہم نے ضرور دیکھ لیا کہ ان کی ایک ہتیلی لہولہان تھی۔ شاید دوسری ہتیلی کی بھی یہی حالت ہو گی۔

پھاٹک کو طے کر کے ہم اس پارک کے اندر پہونچے اور اپنے نئے دوست کی تلاش میں کونے کونے پھرے مگر ان کا کہیں نشان تک نہ تھا شاید اسپرٹ بن کر اڑ گئے۔ فوارہ کے قریب بنچ پر بیٹھ کر ہم نے اپنے دکھتے ہوئے پیروں کو ملنا شروع کیا۔ اور اپنی آج کی حالت پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔

"تم بھی تو اسی ٹرین کے ڈبہ میں ہو جس میں یہ حضرت ہیں۔" ہم نے اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ان پر ہنسی آتی ہے خود پر نہیں آتی۔ صبح سے اسی گردش میں ہو۔ کیا اسی تعلیم کیلئے گھر سے نکلے ہو؟" ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ مگر ہم ہی قصوروار نہیں ہیں۔ دوسرا خیال آیا، کالج کے دوسرے لڑکے سڑک کے دوسرے چلنے والے، نہ صرف یہی بلکہ دنیا کے نوجوان، دنیا کے شاعر، دنیا کے افسانہ نگار بھی کسی نہ کسی جگہ مبتلا ضرور ہیں۔ آخر دل ہی تو ہے۔

نہ معلوم کتنی دیر ہم ان خیالات میں محو رہے دفعتہً خیال آیا کہ لاؤ آج ہی اعلان کردیں تاکہ اُسے معلوم تو ہوجائے کہ ہم اس جگہ کے کیوں طواف کرتے ہیں؟ اگر موقع ملے تو محبت پر لیکچر پلائیں۔ مگر اس کی کیا ضمانت کہ ہم کچھ کہہ بھی سکیں گے ایسے ارادے تو اس سے پیشتر بھی کرچکے ہیں مگر ہر موقع پر ہم فرانسس بیکن کی طرح

Jconceine . J. conceine

اسی کم کرجاتے ہیں تو وہ بھی دل ہی میں۔ ایک ترکیب اور ذہن میں آئی۔ میں نے سینما میں ایک روز دیکھا تھا کہ ایک شخص نے اپنا تعارف پھول پیش کرکے کرایا تھا۔ میں بھی کیوں نہ کروں؟ ہم کھڑے ہوگئے اور سارے پارک میں پھول کی تلاش کرنے لگے۔ آخر بڑی دقت کے بعد ایک سُرخ تازہ گلاب کا نوشگفتہ پھول پسند آیا۔ اس کو توڑ کر رومال میں احتیاط سے باندھ کر اسی جلتی ہوئی دوپہر میں ہم پھر اسی طرف چلے۔ مگر پھر ناامیدی ہوئی جگہ خالی تھی۔ نزدیک کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر لامی لہ شربت پینا شروع کردیا۔ گھڑی گھڑی باہر تھوکنے کے بہانے آتے تھے۔ رومال سے مُنہ صاف کرتے تھے۔ آنکھوں سے اس کی تلاش کرتے تھے اور پھر واپس جاتے تھے۔

تہذیب کے خلاف ہے کہ ایک گلاس پی کر بجلی کے پنکھے کے نیچے گھنٹوں بیٹھے رہیں۔ ایک گھنٹہ میں چھ سات گلاس پی گیا ——— آخر دعا قبول ہوئی۔ ہم گلاس کے باقی شربت کو یونہی چھوڑ کر بل جلدی سے چکا کر باہر نکلے۔ مگر اکی ایک تانگہ بیچ میں حائل ہوگیا۔ آخر تانگہ میں سواریاں پیچھے کیوں بٹھائی جاتی ہیں؟ یہ عجیب بیہودہ رسم ہے۔ سخت غصہ آیا۔ اب جب تک تانگہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہولیا۔ تاہم اس کی سواریوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئے۔ سڑک کی پیمائش کرتے رہے۔ ایک دم پلٹنا بھی ٹھیک نہ تھا۔ کچھ اور آدمی آرہے تھے اس لئے ایک فرلانگ اور آگے گئے اس کے بعد ہوشیاری یہ کی کہ سڑک کے اسی کنارے کی طرف چلے جس طرف ہم کو چلنا چاہئے تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ مگر ارادہ کرچکے ہیں۔ بہرحال ہم نہ معلوم وہاں تک کس طرح پہونچ گئے لیکن اتنا یاد ہے کہ ہم نے آنکھیں بند کرکے وہ پھول اس کی گود میں تو نہیں بلکہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ اور ہم نہ معلوم وہاں کیوں نہ ٹھہرے۔ کوئی آمنے سامنے بھی نہ تھا جب ہم دو فرلانگ کے قریب آگے بڑھ گئے تو ہم نے خیال کیا کہ چلو لوٹ چلیں۔ دیکھیں ہمارے پھول کا کیا حشر ہوا؟ درگاہ قبولیت میں پہونچا یا نہیں۔ ہمیں پھول نذر کرتے وقت کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہئے تھا۔ عجب حماقت ہوئی۔ خیر اب دیکھا جائیگا ——— کسی نہ کسی طرح پھر وہیں پہونچے۔ کیا بیان کریں۔ سامنے کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا وہی تمنّاؤں اور مرادوں والا پھول مسلا ہوا بیچ سڑک پر پڑا ہے۔ ہائے ناامیدی۔ ہم اسے اٹھانے کے لئے بے ساختہ جھکے۔ ادھر ہاتھ میں پھول لیا۔ ابھی سیدھے کھڑے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہ ایک خوفناک شیرنی کی طرح اپنی کچھار سے نکلی اور بنگلے کے پاس کھڑے ہوکر اپنی زبان میں ہم کو کیا کچھ نہ سنا دیا۔ داری جار . . . وغیرہ وغیرہ سر گھوم رہا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ چکر آرہا تھا۔ پیر کانپ رہا تھا۔ بدن میں رعشہ تھا ہونٹوں پر دعا تھی ——— بارالہا! مجھکو اس بلا سے نجات دے خداوند کریم واسطہ دیتا ہوں تجھ کو بزرگ لوگوں کا کہ اس وقت میری عزت تو ہی بچا۔ اب کبھی ایسی حرکت نہ کرونگا۔ خطا ہوئی۔ آبرو تیرے ہاتھ ہے۔ آگے بڑھتا جاتا ہوں اور مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ہوں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ سن تو نہیں رہا ہے۔ یا اس کے عزیزوں میں سے کوئی ڈنڈا لئے تو نہیں آرہا ہے جب میں وہاں سے دو فرلانگ پر پہونچ گیا ہوں تو میری جان میں جان آئی میں نے ادھر سے نکلنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔

ابوطاہر دآگرد۔ بی۔ ایس۔ سی

تخمیس بر غزل غالب مغفور

از جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی ثم بسمل ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈوکیٹ

کسی کے سامنے رودادِ الفت کا بیاں کیوں ہو نہیں کہنے کی ہو جو بات وہ سب پر عیاں کیوں ہو
مرا شیوہ گِلا شکوہ نصیبِ دشمناں کیوں ہو کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

تقاضائے محبت ہے وفا سے ہم نہ مُنہ موڑیں مگر ان کی خوشامد کیوں کریں ہم ہاتھ کیوں جوڑیں
ستم بھی تو کرم ہے شوق سے ہم پر ستم توڑیں وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ہوا رازِ نہاں افشا لگے آگ اس محبت کو یہ تھا تقدیر کا لکھا لگے آگ اس محبت کو
جو شکوہ ہے تو ہے اس کا لگے آگ اس محبت کو کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

خبر اس کی نہ تھی ہوگا نتیجہ یہ محبت کا مرے ہوتے ہوئے دشمن کو ظالم سر چڑھائیگا
تجھے نفرت ہوئی مجھ سے تو مجھکو بھی نہیں پروا وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

محبت کیسی، کیسا رشک جب تو بیوفا نِکلا فغاں کیسی گلہ کیسا کہ ہے قابو میں دل اپنا
نہیں ہے خوف رسوائی کا پاسِ وضع اب کیسا، وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

مجھے پہونچے گا صدمہ تو خیال اس کا نہ کر ہمدم — مرا دل کہہ رہا ہے یہ کہ ہے جھوٹی خبر ہمدم
جو کہنا چاہتا ہے کہہ وہ بے خوف و خطر ہمدم — قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

رگ گردن سے بھی نزدیک ہو تم سامنے آؤ — چھپے ہو سات پردوں میں عبث اتنا نہ تڑپاؤ
نہیں ناداں مجھے فقرے نہ دو کچھ دل میں شرماؤ — یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں نہیں ہو تم تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

جبیں پر بل ہے منہ پھیرے ہوئے ہو سرخ چہرہ ہے — خفا ناحق ہو تم مجھ سے بتاؤ تو خطا کیا ہے
قصور اس میں کہاں میرا ہے یہ الزام بے جا ہے — غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

تمہاری یہ عنایت میری حیرانی کو کیا کم ہے — تمہارا عشق میری چاک دامانی کو کیا کم ہے
تمہاری دوستی میری پریشانی کو کیا کم ہے — یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

ذرا آنکھیں ملاؤ ظلم ڈھانا کس کو کہتے ہیں؟ — نہیں فقرہ جو یہ باتیں بنانا کس کو کہتے ہیں؟
ارے شرماؤ دل میں دل دکھانا کس کو کہتے ہیں؟ — یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لئے جب تم۔ تو میرا امتحاں کیوں ہو

ذرا سچ تو کہو مجھ سے تمہارے جی میں کیا آئی — عدو کو سر چڑھا کر کون سی دولت نئی پائی
سمجھتا ہوں میں سب باتیں نہ ناداں ہوں نہ سودائی — کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی،
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

یہ مانا تو نے بدلی اپنی طرز گفتگو غالب — مگر اس تند خو کی اس سے بدلے گی نہ خو غالب
رسا کہتا نہ تھا یوں کر نہ شرح آرزو غالب — نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

عالمگیر بکڈپو کی چند قابل دید کتابیں!

گھر یا بہادر مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ لنگران اعظم کے جھگڑے کرنے میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک و حقہ خیز سین دکھائے گئے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور انچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور ظرافت میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے گھر یا بہادر کو پڑھ کر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائیں گے بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت ایک روپیہ محصول ۵

خطوط کی ستم ظریفی مصنفہ معتمد ظرافت مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نہ ہنسانے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کی مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر۔ بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے فوراً طلب فرمائیے قیمت ۱۲؍

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین ادب اور مرتبہ دانان عبدالقیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی۔ افسوس کہ مولوی صاحب بقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا۔ اب ہمارے پاس پانچسو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف ۱؍ علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔ (ایک روپیہ آٹھ آنہ) حجم ۸۰۰ صفحات

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے رومانی حالات خود ملا صاحب کے قادر قلم سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے حجم ۲۵۰ صفحے قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے۔

صبح لطافت ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب قابل دید مجموعہ۔ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں۔ پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے، حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے عہ

نوٹ:۔ ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنے (عہ) علاوہ محصولڈاک میں ملے گی۔

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا درخت ۱۲؍ حجم ۲۰۰ صفحے } حجم ۲۷۵ صفحے **محبوبہ قیروان** ۱۲؍

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے کتاب کی دلچسپی کیلئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے آج ہی سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ

عالمگیر بکڈپو لاہور بازار سید مٹھا

"Alamgir Book Depot"
Bazar Said Mitha
Lahore

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۳

فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۵ء

نمبر ۸

عالمگیر کا معرکہ آرا خاص نمبر ۱۹۳۶ء سالانہ خریداروں کو بالکل مفت ملیگا!

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

ملاحظات

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کے مندرجات اور خصوصیات پر ایک مختصر تبصرہ

عالمگیر کے خاص نمبر ۳۶ء کے مندرجات اور خصوصیات پر ایک اجمالی آمیز تبصرہ سے پیشتر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالمگیر اور اس کے خاص نمبروں نے اپنے دوازدہ سالہ دور حیات میں جو قبول عام حاصل کیا ہے وہ اظہرمن الشمس ہے۔ میں اس حقیقت کے اظہار میں مسرت محسوس کرتا ہوں کہ خاص نمبروں سے تعلق میں نے اپنے اعلانات میں سلامت روی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ میرے اعلانات حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں باوجود عالمگیر کی قابل رشک کامیابی اور قبولیت کے میں دوسرے رسائل کو ہدف طعن و تشنیع بنانے سے محترز رہتا ہوں۔ بلکہ بارہا اس پالیسی کو اُردو رسائل کے لئے نقصان دہ سمجھ کر اس کی مذمت کر چکا ہوں۔ عالمگیر کے مستقل ناظرین کرام جو عالمگیر کی تدریجی ترقیوں اور کامیابیوں سے کماحقہ واقف ہیں اور جنھوں نے اس کی اولوالعزمانہ روش کا بنظر امعان مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کی تائید میں ہمیشہ آمادہ نظر آئینگے کہ عالمگیر نے ترقی کی جانب جو قدم بڑھایا اسے اپنے ضروریات اور مصلحتوں کے باوجود پیچھے ہٹانا مناسب نہیں خیال کیا۔ $\frac{20 \times 26}{8}$ کے ایک معمولی چھوٹے سائز سے ابتدا ہوئی۔ ایک سال بعد اس کا سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ کر دیا گیا کئی سال یہی سائز رہا اس کے بعد موجودہ سائز اختیار کیا گیا۔ اب اس کا خاص نمبر ۳۶ء موجودہ سائز سے بھی بڑے سائز پر شائع ہو رہا ہے۔ یہ امر حاصل رہتی۔ میرا ارادہ ہے۔ اگر رحمت خداوندی اس میرے ارادہ کو جامۂ عمل مرحمت فرمائے کہ میں عالمگیر کو زیادہ سے زیادہ کامیاب شکل و صورت میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ایک ناچیز بندہ کے ارادوں میں۔ جوش عمل۔ ثبات، اور کامیابی عطا فرمائیے۔ آمین!

~~~

مندرجہ بالا تمہیدی سطور کے بعد میں آپ کی خدمت میں خاص نمبر ۳۶ء کے مندرجات نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کی نہ یہاں گنجائش ہے نہ اس کی ضرورت۔ عالمگیر کے خاص نمبر جو اعتماد حاصل کر چکے ہیں وہ تعریف و تعارف سے مستغنی ہے۔

تصاویر عالمگیر کے خاص نمبر ۳۶ء میں جو عدیم النظیر تصاویر اشاعت پذیر ہو رہی ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی خصوصیات کی بنا پر ہر حیثیت سے کامیاب و لاجواب ہے۔ لیکن ان میں سے بوجوہ صرف چند تصاویر کے نام لکھونگا۔

حسن فاتح ۔ حیدرآباد دکن کے مشہور مصور مولوی عبدالقیوم صاحب کی سحر آفرین مو کاریوں کا ایسا شاہکار آفریں نمونہ ہے جو آپ سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہ رہیگا۔

دامن ماہوش ۔ اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے ایک شعر کو اس بیش تصویر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسی لاجواب تصویر آج تک آپ کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

ساقی ۔ عمر خیام کی ایک رباعی کو سحر کار مصور نے اس کمال کے ساتھ بہ شکل تصویر پیش کیا ہے کہ اس کے کمال فن کی داد دینا مشکل ہے۔

قیدی ۔ ایک سہ رنگ تصویر ہے۔ ایسی تصویر جسے آپ دیکھ کر عش عش کر اٹھیں۔

مراکش کا ایک خطاط ۔ فرانس کا ایک شہرۂ آفاق مصور نے اس تصویر میں اپنے کمال کو اس خوبی سے پیش کیا ہے۔ کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

قلوپطرہ (کلوپیٹرہ) مصر کی اس قتالۂ عالم حسینہ کی متعدد تاریخی تصویریں آپ نے ملاحظہ فرمائی ہونگی لیکن یہ تصویر آپ کے لئے اور اردو رسائل کیلئے
~~~

بالکل نئی ہے وہ سیزر اپنے ظالم بھائی کے سامنے (جو وارث تخت و تاج تھا اور جس نے قلوپطرہ کا حصہ بھی چھین لیا تھا -) اس کی شکایت کرنے کے لئے حاضر ہونا چاہتی ہے - لیکن باریابی کی صورت نہ دیکھ کر سوداگروں کی پیٹھ پر کپڑوں کی بہت بڑی گانٹھ میں دربار میں پہنچ جاتی ہے - سوداگر سیزر کو کپڑے دکھارہا ہے کہ اچانک قلوپطرہ نمودار ہوتی ہے جسے دیکھ کر جابر بادشاہ محو حیرت ہوجاتا ہے - یہ تصویر اس واقعہ سے تعلق رکھتی ہے -

ان تصاویر کے علاوہ متعدد یک رنگ و سہ رنگ تصاویر خاص نمبر کی زینت ہیں - ان سب کے متعلق بالاختصار کچھ عرض کرنا بھی ناممکن ہے -

مضامین

خاص نمبر ۱۹۳۶ء ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے بہترین مضامین سے مزین ہے - مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خاص نمبر کے بلند پایہ مضامین کی کامیابی کے ضامن ہیں -

مولانا سید حسن برنی بی - اے - ایل ایل - بی - ایڈووکیٹ، حضرت مولانا محمد احسن صاحب سخن بہاری - ڈاکٹر علی کوثر صاحب چاندپوری - مولانا حاجی حامد حسن صاحب قادری لیکچرار - مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم - اے - پروفیسر - مولانا خدا بخش صاحب اظہر امرتسری سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی - حضرت شاہ عطاء الحق صاحب بہاری - مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری - خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی وغیرہ وغیرہ،

افسانے

مندرجہ ذیل حضرات کے بہترین افسانے شریک اشاعت ہیں

مولانا احمد ایم - اے - مسٹر حسن عزیز صاحب جاوید ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی - ایم ایم - اسلم صاحب - مولانا عبدالقدوس صاحب صہبائی - بی - اے (آنرز) سید طالب علی صاحب عابد ایم - اے - مولانا مظفر توفیق صاحب بی - اے دہلوی - مولانا صادق الخیری صاحب بی - اے دہلوی حضرت قیسی رامپوری وغیرہ وغیرہ

ان کے علاوہ کئی بہترین مزاحیہ افسانے بھی شائع ہوئے ہیں -

حصہ نظم

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کا حصہ نظم بھی بہت بلند ہے مندرجہ ذیل اساتذہ کرام کا کلام زینت اشاعت ہے -

نواب فصاحت جنگ بہادر استاد حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ - افتخار الملک حضرت دل شاہجہانپوری - مولانا حسرت موہانی بی - اے - مولانا امجد حیدرآبادی مولانا ماہر القادری - حضرت جگر مرادآبادی - سحبان الہند علامہ کیفی - مولانا سخن بہاری حضرت عابد شاہجہانپوری - حضرت باسط بسوانی - علامہ محوی لکھنوی - جناب حکیم اورنگ آبادی - حضرت نوح ناروی وغیرہ وغیرہ -

حضرت علامہ شاد علیہ الرحمۃ - حضرت مضطر مرحوم - حضرت دلگیر مرحوم مولانا سخی بہاری کا غیر مطبوعہ کلام بھی خوش قسمتی سے حاصل ہوگیا ہے جسے خاص نمبر ۱۹۳۶ء میں شائع کیا جارہا ہے -

مندرجہ بالا سطور خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی کامیاب خصوصیات کا ایک نامکمل سا خاکہ ہیں - یہ حقیقت ہے کہ خاص نمبر ۱۹۳۶ء کا ہر صفحہ دامن گل کا جواب ہے - اس کی رنگینیوں کو مفصل طور پر معرض تحریر میں لانا قطعی ناممکن ہے -

مختصر یہ کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۶ء پچھلے اعلانات اور تحریرات کے مقابلے میں بہمہ وجوہ شاندار ہوگا -

حافظ محمد عالم عفی عنہ (مدیر)

روپ متی!

عہد ماضی کے ایک سچے رومانی ڈرامہ کا غیر مطبوعہ سین

از حضرت محشر عابدی بی۔ اے

(ایک دلکش منظر)

[مانڈوگڑھ کا قلعہ۔ قصر شاہی کا ایک خوبصورت دالان ایک زریں مسند پر باز بہادر ایک تکیہ سے لگا ہوا بیٹھا ہے اس کے قریب ہی روپ متی سرنگوں بیٹھی ہے۔ باز بہادر روپ متی کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔]

باز بہادر (سرور ونشاط آگیں انداز سے) رانی ——— ؟

روپ متی (آنکھیں باز بہادر کی طرف اٹھاکر) سرتاج ——— !

باز بہادر ہماری تمناؤں کی بھینیاں سکون پزیر ہو چکی ہیں۔ ہمارے حشر خیز جذبات کے طوفان اتر چکے ہیں۔ ہمارے ارمانوں کی ویران دنیائیں ایک دوسرے کی موجودگی سے آباد و پرشور ہو گئی ہیں کوئی پرکیف نغمہ چھیڑ دو ——— اور راگوں کی فرحت باریاں ہیں اپنے اندر کھو جانے دیں۔ سنتی ہو رانی ——— ؟

روپ متی۔ (شرمیلی نگاہوں سے) میرا نغمہ ——— میرا راگ! میرے راگوں میں کیا تاثیر ہے۔ سرتاج! ؟

باز بہادر۔ نہ پوچھو رانی ——— آہ تمہارا راگ۔ تمہارے پریم بھرے راگوں میں زندگی کی حقیقی اور غیر فانی روح پنہاں ہے۔ تمہارے نغموں میں مدہوش کر دینے والا جادو ہے اور کیا چاہئے رانی ہمیں؟

روپ متی مگر سرتاج! میرے نغموں کو سن کر آپ کیا کرینگے؟

باز بہادر اپنے راگوں کا اثر پوچھتی ہو رانی ——— ؟ پوچھنے سے کیا فائدہ؟ خود ابھی دیکھ لینا ———

روپ متی۔ عذر ہے آپ کو تبلانے میں؟

باز بہادر۔ نہیں رانی سنو! سلطنت کے کاروبار اور انتظام کی فکریں اور پریشانیاں مجھ سے دور بھاگ جائینگی۔ میں خود کو ان سے آزاد کر لوں گا ——— رانی، میں یہی چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے نغمے میرے تھکے ہوئے دماغ اور پریشان خیالات کو مرکز سکون و اطمینان پر لا سکتے ہیں۔ بس اب کوئی راگ دلکش۔ رنگین اور رسیلا چھیڑ دو ——— انتظار نہ کراؤ زیادہ ———

روپ متی میں یہ سب کچھ کر سکتی ہوں ——— ؟ میرے سرتاج کاش میں یہ سب کچھ کر سکوں آپ کے لئے ——— ؟

باز بہادر۔ کر سکتی ہو رانی تم!

روپ متی (نیاز مندی سے) مگر خود کو اس قابل نہیں پاتی۔

باز بہادر یہ سب اس سے کہو رانی۔ جو تمہارے نغموں کی لطافت سے سیراب نہ ہوا ہو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ایک ترنم نواز سے ——— ایک نغمہ پرست سے۔ رانی ایک ایسے موسیقار سے جس نے اپنی زندگی راگوں کے طوفانی سمندروں میں تیر کر گزار دی ہو۔

روپ متی۔ انکار کیسے کر سکتی ہوں سرتاج!

باز بہادر۔ پھر اصرار بے جا ہے رانی۔

روپ متی۔ آپ گانا سنینگے؟

باز بہادر۔ بس اور کچھ نہیں!

روپ متی۔ ملہار کو بلاؤں؟

باز بہادر۔ اس سے تمہارا منشا۔

روپ متی۔ اس کے رقص کی فراموش کن ادائیں شاید آپ کی تھکن دور کردیں اور ــــ اس کے دلکش نغمے بھی!

باز بہادر۔ تمہارے نغمے سامعہ نوازی سے کیوں قاصر ہیں؟

روپ متی۔ دل نہ چاہتا تھا۔ اس وقت!

باز بہادر۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا ــــ میں نے جان کر نہیں کہا تھا۔ مگر ــــ طبیعت یونہی چاہتی تھی۔ پھر اس وقت۔ گر تم رہنے دو۔ میں خود۔ اب یہ خدمت تمہارے لئے انجام دونگا۔

روپ متی۔ مگر ــــ سرتاج۔ یہ نا ممکن ہے۔

باز بہادر۔ اس میں نقصان کیا ہے۔ رانی؟

روپ متی۔ توہین کررہی ہوں اس طرح میں آپ کی!

باز بہادر۔ ایسا نہ خیال کرو رانی ــــ تم مجھے منع کرتی ہو۔ نہیں منع نہ کرو۔ مجھے چھیڑنے دو کوئی راگ اور کوئی تمنا نہیں میری۔

روپ متی۔ نہیں ــــ سرتاج! میں خود سناؤنگی۔

باز بہادر۔ طبیعت کے خلاف کرنے کی وجہ؟

روپ متی۔ کوئی وجہ نہیں مگر اب میں ضرور اس کے لئے تیار ہوں۔

باز بہادر۔ تمہاری اس خلاف طبیعت حرکت سے مجھے تکلیف ہوگی میرا کہنا مان لو ــــ رانی۔

روپ متی۔ میری التجا سرتاج!

باز بہادر۔ تو میں منع نہیں کرتا تمہیں۔

(روپ متی تالی بجاتی ہے زمرد داخل ہوتی ہے)

روپ متی۔ دیکھ زمرد۔ میرا ستار اٹھالا ــــ ستار اور بربط بھی۔ اور بانسری بھی۔ مگر نہیں بانسری نہیں۔ صرف ستار اور بربط۔ جا جلد لا۔

(زمرد جاتی ہے)

باز بہادر (محویت کے عالم میں) اب آسمان کے ستارے اپنی حرکت بند کرکے ریت کے ذروں کی طرح ساکت ہو جائینگے ــــ سمندر کی موجیں تھم جائیں ــــ دریا اپنی روانی بھول جائیں گے ــــ چاند کی کرنیں سربسجود ہو جائینگی۔ پرندے اپنا چہچہانا بند کردینگے۔ ساری دنیا، رانی، ساری دنیا اور سارے آسمان ــــ تم جھوٹ سمجھتی ہو؟ ــــ تمہارے نغموں کی وسعت میں بالکل جذب ہو جائیں گے اور تمہارے راگوں کی گہرائیوں میں سمٹ کر اتر جائیں گے۔

روپ متی۔ پھر کیا ہوگا اس وقت سرتاج؟

باز بہادر۔ اضطراب بخارات بن کر اڑ جائیگا۔

روپ متی۔ اور ــــ؟

باز بہادر۔ پریشانیاں غرق آب ہو جائینگی۔

روپ متی۔ اور ــــ؟

باز بہادر۔ ہم آسمان کی نامعلوم فضاؤں میں طیران کرنے لگ جائینگے

روپ متی۔ ــــ سرتاج!

(زمرد ستار اور بربط لیکر داخل ہوتی ہے)

روپ متی لے آئی ہے تو یہاں رکھدے سب۔ بس اب جا۔

(چلی جاتی ہے)

باز بہادر۔ ہاں رانی اب کوئی راگ۔ جلد ــــ کوئی سکون بخش میٹھا سا ــــ دل بھانے والا ــــ بہت باریک۔ بہت درد آگیں ــــ سنا رانی۔ بس اب میں کچھ نہ کہونگا۔

(روپ متی ستار پر گانے لگتی ہے باز بہادر ہمہ تن محو ہو کر سنتا ہے)

باز بہادر (تھوڑی دیر بعد چونک کر) یہ راگ ختم ہوگیا؟

روپ متی۔ سرتاج! ــــ کوئی اور چھیڑوں؟

باز بہادر۔ نہیں رانی بس کرو اب ــــ تم زیادہ تھک جاؤگی۔

روپ متی۔ مجھے کوئی تھکن محسوس نہ ہوگی۔

باز بہادر۔ میری خاطر تم سب کچھ برداشت کرلوگی رانی ــــ نہیں گر تم ٹھہر جاؤ۔ کچھ دیر رقص سے طبیعت بہلاؤ۔

روپ متی۔ مجھے آپ کی مسرت درکار ہے۔

باز بہادر۔ بس اسی میں میری مسرت ہے۔

(تالی بجاتا ہے ایک کنیز آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

جا زمرد کو بھیج! رقص کے لباس میں آئے۔ دیر نہ ہو زیادہ

(کنیز جاتی ہے)

روپ متی۔ زمرد کو یاد کیا سرتاج نے؟

باز بہادر۔ کیوں کیا وہ رقص کرنا نہیں جانتی؟

روپ متی۔ نگار سے اچھا نہیں سرتاج!

باز بہادر - ہاں نگار! میں جانتا ہوں نگار کو، میری ساری دلچسپیاں اسی کے رقص سے وابستہ تھیں - میری تمام بیقراریوں کو وہ صرف اپنے رقص کی ہلکی سی دلربائیوں میں محو ہو جانے دیتی تھی - اپنے راگ کی ساحرانہ کیفیتوں سے مجھے بیخود بنا دیتی تھی ---- مگر ایک مرتبہ رانی . . . . . .

(باز بہادر چپ ہو جاتا ہے - اسے اپنی زندگی کی ابتدائی باتیں یاد آنے لگتی ہیں - جب اس کے دل میں محبت نے یکایک اپنا گھر بنا لیا -)

روپ متی - ایک مرتبہ کیا ہوا سرتاج!

باز بہادر - ہاں ایک مرتبہ رانی - میں اس کے رقص سے نگاہوں کو مخمور کر رہا تھا - بس یکایک طبیعت اچاٹ گئی - اس دن سے آج تک اس کا رقص نہیں دیکھا ----"

روپ متی - (کچھ سوچتے ہوئے) کوئی سبب تھا سرتاج اس کا؟

باز بہادر - ہاں رانی! سبب کیوں نہیں تھا ---- بس ایک بیخودی سی طاری ہو گئی اور کسی حسین صورت کا خیال دماغ سے ٹکرانے لگا - بس اس گھڑی سے اور آج تک، سمجھیں رانی ----!

روپ متی - مگر اب وہ بات باقی نہ رہ گئی ہوگی اس لئے اس کا رقص دیکھنے سے شاید کچھ سرور حاصل ہو سکے -

باز بہادر - زمرد کو نہ بلاؤں -

روپ متی - نگار کو خود خواہش ہے رقص کرنے کی -

باز بہادر - اچھا تو نگار کو بلاتا ہوں -

روپ متی - اس سے زمرد کی دلشکنی ہوگی -

باز بہادر - تو کسی کو نہ بلاؤں؟

روپ متی - زمرد کو گا لینے دیجئے - پھر نگار کو بلایئے -

باز بہادر - ہاں یہ ٹھیک ہے رانی ایسا ہی کروں گا -

(زمرد رقص کے لباس میں داخل ہوتی ہے)

روپ متی - دیکھئے وہ آ رہی ہے - یہ لباس اس وقت اس پر کیسا زیب دے رہا ہے -؟

باز بہادر - پتلی معلوم ہوتی ہے رانی -

روپ متی - بلکہ سمندر کی پری -

باز بہادر - کاش اس کے نغمے بھی اسی قدر فرحت بخش ہوں -

(زمرد کورنش کے بعد رقص میں مصروف ہو جاتی ہے)

آج خوب رقص کر رہی ہے رانی -

روپ متی - ہاں کچھ نئے نئے انداز سیکھ لئے ہیں -

(کچھ دیر کے بعد زمرد اپنا رقص اور گانا ختم کرتی ہے)

باز بہادر - بس زمرد تو جا - اور نگار کو رقص کرنے کے لئے بھیج دے

(زمرد جاتی ہے)

رانی ---- ایک بات کہنی ہے تم سے -

روپ متی - فرمایئے!

باز بہادر - فرخ کو جانتی ہو؟

روپ متی - وہی آپ کا وفادار مصاحب!

باز بہادر - مجھے اس کی خدمت کا صلہ دینا ہے ابھی -

روپ متی - کون سی خدمت؟

باز بہادر - سب سے بڑی خدمت جو اس نے میری کی ہے -

روپ متی - کیسی خدمت؟

باز بہادر - عالم دیوانگی میں جب میں کسی نادیدہ حسینہ کا شیدائی بن گیا تھا تو اس نے میری بہت تسلی کی اور اپنی ساری راحتیں میرے لئے وقف کر دیں -

روپ متی - فرخ درحقیقت بہت شریف معلوم ہوتا ہے -

باز بہادر - اس میں کیا شک ہے اور اگر سچ پوچھو تو اس کی وجہ سے ہماری شادی کا مسئلہ بھی نہایت آسانی سے حل ہو گیا -

روپ متی - ورنہ کیا کرتے سرتاج!؟

باز بہادر - اپنی محبت کی تکمیل کے لئے سب کچھ کر ڈالتا سب کچھ رانی -

روپ متی - پھر فرخ نے کیا مشورہ دیا تھا آپ کو؟

باز بہادر - وہی پیغام کا مشورہ جو تم جانتی ہو گی شاید -

روپ متی - فرخ کی یہ خدمت یقیناً قابل قدر ہے - مگر آپ نے ان زریں خدمات کا کیا صلہ مقرر کیا ہے؟

باز بہادر - نگار سے اسے محبت ہے! نگار اسے بخش دوں گا -

روپ متی - بس ----؟

باز بہادر - اور اپنی ریاست کا دیوان مقرر کروں گا -

روپ متی۔ بہت مناسب ہے سرتاج!

(نگار ایک نہایت دلکش لباس میں آتی ہے)

باز بہادر۔ نگار آرہی ہے یہ؟

روپ متی۔ اور آپ نے کیا سمجھا تھا؟

باز بہادر۔ کوئی اور سچ جانو بالکل پہچانی نہیں جاتی۔

روپ متی۔ یہ لباس کس قدر خوشنما ہے اس کا؟

باز بہادر۔ اس وقت سراپا نگار بنی ہوئی ہے۔

(نگار کورنش کے بعد رقص شروع کرتی ہے)

روپ متی۔ تانیں کس قدر دلکش ہیں؟

باز بہادر۔ رانی! سانس کے ساتھ سینے میں اترتی جاتی ہیں۔

روپ متی۔ قدم کس نزاکت سے اٹھ رہے ہیں؟

باز بہادر۔ جیسے کوئی ہوا میں تیر رہا ہو۔

روپ متی۔ فرخ اس صلہ سے بہت خوش ہوگا؟

باز بہادر۔ کیوں نہیں رانی! اس کی مسرتیں لا محدود ہو جائیں گی اس کے انبساط کا اندازہ ناممکن ہو جائیگا۔

روپ متی۔ پھر اسی وقت فرخ کو بلا کر عطیہ مرحمت فرما دیجئے نا!

باز بہادر۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ یہ رقص ختم ہو جانے دو۔

(تھوڑی دیر بعد نگار رقص ختم کرتی ہے)

روپ متی۔ نگار! شہریار تجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

باز بہادر۔ نگار! کسی کنیز کو بھیجکر فرخ کو بلا۔

(نگار جاکر واپس آتی ہے)

روپ متی۔ نگار کوئی اور نغمہ ---؟ فرخ کو آنے میں دیر ہوگی۔

(نگار پھر گانا شروع کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد فرخ آتا ہے بادشاہ اور ملکہ کو آداب بجا لاکر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ نگار اپنا گانا اور ناچ ختم کرتی ہے)

باز بہادر۔ جانتے ہو فرخ! میں نے تمہیں کس لئے بلایا ہے؟

فرخ۔ شہریار مجھے اس کا علم نہیں!

باز بہادر۔ آج تمہاری خدمتوں کا صلہ تمہیں دیا جائیگا۔

فرخ۔ کن خدمتوں کا؟۔ شہریار! میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو صلہ اور انعام کے قابل ہو۔

باز بہادر۔ یہ نہ کہو فرخ! تمہاری کوششوں سے خدا نے مجھے یہ دن نصیب کیا۔ تم بہت زیادہ انعام کے مستحق ہو۔ آہ! تمہاری ان خدمات کا صلہ ---- مگر درحقیقت کچھ نہیں ہو سکتا۔

فرخ۔ ذرہ نوازی ہے شہریار کی۔

باز بہادر۔ فرخ! ---- میں تمہاری خدمات کے صلہ میں اپنے محل کی حسین مغنیہ اور بہترین رقاصہ اور عزیز کنیز نگار تمہیں بخشتا ہوں اور آج سے تمہیں اپنی سلطنت کا دیوان اور اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ کل اہل دربار کو بھی یہ حکم سنا دیا جائے گا۔

فرخ (مسرت کے احساس کے ساتھ) شہریار آپ کی ان بخششوں عزت افزائیوں اور قدردانیوں کا شکریہ زبان سے ادا نہیں ہو سکتا۔ خدا آپ کو دائم ہمارے سر پر سلامت رکھے۔

(روپ متی اور نگار ایک ساتھ آمین کہتی ہیں)

باز بہادر۔ جاؤ تم دونوں! ---- اور بارگاہ ایزدی میں سجدہ شکر بجا لاؤ ---- "

(نگار اور فرخ کورنش بجا لاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں)

باز بہادر۔ (لمبی سانس بھر کر) اب مجھے کامل اطمینان ہوا رانی۔

روپ متی۔ اور مجھے بھی سرتاج ایک دلی مسرت محسوس ہو رہی ہے۔

(ایک کنیز آتی ہے)

کنیز۔ جہاں پناہ خاصہ تیار ہے۔

باز بہادر (نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ کنیز جاتی ہے) ہاں رانی چلو اب"

(پردہ) قمر عابدی بی۔ اے۔

جذباتِ عالیہ

افتخار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری

تقاضائے وفا ہے پیکرِ ہستی مٹا دینا / مجھے درسِ فنا یا رب مثالِ نقشِ پا دینا

ستم تھا لطف کے پردے میں دردِ لا دوا دینا / ہماری اشکباری پر کسی کا مسکرا دینا

وفا کا عہد کر لینا یہ امرِ اختیاری ہے / مری تقدیر کا لکھا مگر پہلے مٹا دینا

کھنچیں سینہ سے یوں ناوک کہ دل بھی ساتھ کھنچ جائے / کسی بیکس کی اے قاتل یہ حسرت بھی مٹا دینا

تم اپنے بیقراروں کو بحالِ زار رہنے دو / یہ نالے کرتے کرتے سیکھ جائینگے دعا دینا

صدائے لن ترانی شوقِ نظارہ بڑھاتی ہے / وہی آواز پھر اکبار پردے سے سنا دینا

ادھر سے آنے والو میں بھی مشتاقِ زیارت ہوں / ذرا تم پائے خاک آلود آنکھوں سے لگا دینا

یہی ہے عشق کی منزل یہی مقصود ہے یا رب / اسی کوچہ میں چکر دے مجھے وہ رہنما دینا

مدد اے جوشِ وحشت ایک ہی عالم نظر آئے / مرا چاکِ جگر چاکِ گریباں سے ملا دینا

مری نظروں میں ہیں وہ شوخیاں برقِ تجلی کی / کبھی پردے میں چھپ جانا کبھی پردہ اٹھا دینا

ابھی اے چارہ گر باقی ہے ذوقِ خنجرِ قاتل / کسی تدبیر سے پھر پارہ ہائے دل ملا دینا

جنابِ دلؔ یہی ہے حاصلِ ذوقِ سخن گوئی
جو اہلِ درد ہیں ان کو غزل کہہ کر سنا دینا

اسلامی حکومت میں ہندو مسلم اتحاد

جناب مولنٰنا احمد ایم۔ اے فاضل دیوبند

(یہ ترجمہ ہے سر پی۔ سی۔ رائے کے ایک انگریزی مقالہ کا۔ جو کلکتہ کے رسالہ "موڈرن ریویو" میں شایع ہوا ہے اس کا عنوان ہے

"Communalism practically unknown in India before the Twentieth century:—

یعنی "بیسویں صدی سے قبل ہندوستان میں فرقہ پرستی کا وجود نہ تھا۔" اگرچہ اس سے پہلے اُردو اور انگریزی میں اس سے زیادہ بسیط اور محققانہ مضامین شایع ہو چکے ہیں لیکن اس مقالہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک بنگالی ہندو کی قلم سے نکلا ہے مقالہ نگار نے اس میں چند کام کی باتیں لکھی ہیں اور بعض ایسے امور کا اعتراف کیا ہے جو برادران وطن کی توجہ کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ برادران وطن اس سے سبق حاصل کریں گے۔ .... احمد۔ ...)

"مذہب صرف ایک خانگی مشغلہ ہے جسے امور سلطنت سے کوئی تعلق نہیں" مقولہ علاءالدین[1] خلجی شہنشاہ دہلی (ہسٹری اوف انڈیا از الفنسٹن)۔

"شیر شاہ (۱۵۴۰ء۔۱۵۴۵ء) کا مقصد سلطنت کو مذہب سے علٰحدہ کرنا تھا کیونکہ اس کے نزدیک مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ تھا اور اجتماعی زندگی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا"

(شیر شاہ۔ از پروفیسر کالی بیرن قانونگو)

"۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو پیشوا باجی راؤ نے ملک گیری کے تمام منصوبے ترک کر دیئے اور کہا اب ہماری خانہ جنگی بیسود ہے اب ہندوستان میں صرف ایک مشترک دشمن ہے۔ ہندو مسلمانوں اور اہل دکن کو اس کے مقابلہ میں متحد ہو جانا چاہیے۔"

(ہسٹری اوف دی مرہٹاز از گرانٹ ڈف)

---

[1] یہ علاءالدین خلجی کی ذاتی رائے ہے ورنہ اسلام میں مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہیں علاءالدین جیسا کہ اس نے قاضی مغیث الدین کے سامنے اعتراف کیا مذہب سے نابلد بلکہ محض ناخواندہ تھا اس کا طرز عمل یہ تھا کہ "میں جائز و ناجائز سے واقف نہیں ہوں۔ سلطنت کے لئے جو کچھ مناسب سمجھتا ہوں کرتا ہوں" (تاریخ فیروز شاہی از ضیاءالدین برنی) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاءالدین بالکل غیر جانبدار آدمی تھا۔ اسے ہندو قوم یا ہندو مذہب سے کوئی عداوت نہ تھی اگر اس نے ہندوؤں پر کوئی سختی کی تو اس کی وجہ سیاسی مصلحت تھی جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کو بھی قتل کرنے میں تامل نہ کرتا تھا جیسا کہ تاریخ علائی امیر خسرو اور تاریخ فیروز شاہی برنی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اس کے کسی فعل کو مذہبی تعصب پر محمول کرنا غلطی ہے۔ ونسنٹ اے اسمتھ نے نہایت عیاری سے اس کے طرز عمل کو ہندوؤں سے دشمنی" قرار دیکر ہندو قارئین کو مشتعل کرنے کی کوشش کی ہے اسلام میں مذہب و سیاست کا ایک ہونا رواداری کے منافی نہیں ہے کیونکہ اسلام نے رواداری کی تعلیم دی ہے۔ احمد

"چودہویں صدی عیسوی سے جب نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن میں بھی اسلامی اقتدار بڑی حد تک قائم ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک کی تاریخ ہند سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چھ صدیوں میں فرقہ پسندی قطعاً معدوم تھی۔ یہ مرض زمانہ حال میں پیدا ہوا ہے اور سیاسی مصالح کی بناء پر اس کو ترقی دی جا رہی ہے۔ الفنسٹن کی تاریخ ہند (ترجمہ کاول مطبوعہ ۱۸۸۹ء) سے چند اقتباسات اس جگہ پیش کئے جاتے ہیں۔

"ہندوؤں کو قدرے کم سمجھا جاتا تھا لیکن ان کے ساتھ معاندانہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کو جزیہ ادا کرنے کے علاوہ کچھ ناگوار امتیازات بھی برداشت کرنے پڑتے تھے مگر اپنے مذہبی فرائض کی ادائگی میں آزادی حاصل تھی سپہ سالاروں کی فہرست میں جن ہندوؤں کے نام پائے جاتے ہیں وہ غالباً حکومت کے مقرر کردہ حکام نہیں بلکہ زمیندار ہونگے اور اپنی اپنی جماعتوں کی قیادت کرتے ہونگے تاہم اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ بہت سے ہندو حساب اور مالگذاری وغیرہ ملکی عہدوں پر مامور تھے مبارک خلجی (۱۳۱۷ء-۱۳۲۱ء) کے عہد میں تمام نظام سلطنت ہندوؤں کے زیر اثر تھا۔"

"شیر شاہ کی فوج میں ہندوؤں کو بڑے بڑے منصب دیئے جاتے تھے ابتداء سے اس کا طرز عمل یہی تھا اس کا ایک نامی سپہ سالار برہما جیت گور تھا..... جو چونسہ اور بلگرام کی لڑائیوں کے بعد ہمایوں کے تعاقب میں روانہ کیا گیا تھا..... ہم کو معلوم ہے کہ محمود غزنوی جیسے متقدم کے زمانہ میں اسلامی فوج میں ہندوؤں کیلئے راستے کھلے ہوئے تھے۔[۲]

"شیر شاہ پہلا حکمران تھا جس نے عام رعایا کی خوشنودی پر ایک ہندوستانی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی مسٹر کین کا قول ہے کہ کوئی سلطنت یہاں تک کہ سلطنت برطانیہ بھی اس پٹھان کی سی قابلیت کا ثبوت نہ دے سکی۔"

"محمد عادل شاہ سور (۱۳۵۲ء) نے اپنی سلطنت کے تمام انتظامات ایک ہندو ہیمو کے سپرد کر دیئے جو کسی زمانے میں ایک معمولی دکاندار تھا اور جس کی شکل اس کی ابتدائی حیثیت سے بھی زیادہ قبیح تھی تاہم ان ظاہری عیوب کے باوجود اس نے اپنی لیاقت اور ذہانت کی بدولت متکبر اور جری امراء کے درمیان اپنی بلند شخصیت قائم رکھی اور اس سلطنت کو تباہی سے بچا لیا جو بادشاہ کی بیوقوفی اور بے اعتدالی کی وجہ سے رو بہ تنزل تھی۔"

اورنگ زیب کے عہد میں (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء) بھی ہندوؤں کو بہت ذمہ دار عہدے ملتے تھے۔ مرشد قلی خاں کے زمانہ میں جو اورنگ زیب کی طرف سے بنگال کا صوبہ دار تھا۔ ملکی نظم و نسق کے متعلق تمام ملازمتیں ہندوؤں سے مخصوص تھیں۔ اس کے علاوہ فوج میں بھی ان کو بلند منصب حاصل تھے اگر اورنگزیب کو ہندوؤں سے کچھ بھی ذاتی عناد ہوتا تو وہ مرشد قلی خاں کو اس رویہ پر نہ صرف تنبیہ کرتا بلکہ سخت سزا دیتا۔ دہلی میں بھی صیغہ مالگذاری کا صدر ایک ہندو ہی تھا۔

"جب جعفر خاں وزیر مقرر کیا گیا اور وہ شاہجہاں کے بیٹوں کی خانہ جنگی کے ایام میں اس منصب پر بحال رہا تو صیغہ مالگزاری کا اصلی نظم و نسق قدیم و تجربہ کار معاون دیوان رگھوناتھ کھتری الملقب بہ رائے رایان کے ہاتھ سے انجام پاتا رہا۔ جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس نے دیوانی کا یہ عارضی نظام قائم رکھا اور رگھوناتھ کو راجہ کا خطاب دیا (۱۵ ارجون ۱۶۵۸ء) وہ محنتی، دیانت دار، کارگزار اور انتظامی قابلیت میں یکتائے روزگار تھا۔[۳]
(ہسٹری آف اورنگزیب از سر جدو ناتھ سرکار جلد ۳ صفحہ ۶۲)

---

[۱] محمود غزنوی کے متعلق اب ہندو مورخین کے نظریات بھی بدل گئے ہیں۔ پروفیسر ایل۔ مکرجی۔ ایم۔ اے انڈین ہسٹری میں لکھتے ہیں کہ "محمود غزنوی پکا مسلمان تھا لیکن متعصب نہ تھا اس کی لڑائیاں سیاسی تھیں نہ کہ مذہبی۔ اس نے کسی ہندو کو جنگ کے علاوہ قتل نہیں کیا اس نے ایران میں اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو بھی اسی طرح قتل کیا اس طرح ہندوستان کے کافروں کو۔" احمد

[۳] نوٹ کیلئے صفحہ ۱۱ ملاحظہ فرمایئے۔

اورنگ زیب پر بالعموم یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے تعصب
اور تنگ نظری سے ہندو رعایا کو ناراض کر دیا لیکن اس کے عہد میں بھی۔
"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی ہندو کو اس کے مذہب کے سبب
سے قتل، قید یا جرمانہ کی سزا دی گئی ہو۔ یا کسی شخص پر علانیہ
اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا گیا
ہو" (ہسٹری اوف انڈیا از الفنسٹن) ۵۴

۵۳ سر جدوناتھ سرکار نے اپنی "ہسٹری اوف اورنگزیب" جلد سوم میں ایک
پورا باب Islamic State church
اس بحث کے لئے وقف کیا ہے کہ اسلام میں سیاست اور مذہب ایک ہی
ہیں لہذا مذہبی رواداری غیر ممکن ہے۔ عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا نہ
کہ اورنگ زیب کیونکہ اورنگ زیب تو شجر اسلام کا ایک پھل تھا۔ جب شجر ہی کڑوا
ہے تو پھل لازماً کڑوا ہوگا" سرکار کا یہ بیان اسلامی تعلیم سے ناواقفیت اور متعصب
مورخین کی تحریروں کو بلا انتقاد تسلیم کر لینے کا نتیجہ ہے۔ جب اسلام کی تعلیم رواداری
پر مبنی ہے تو مذہب و سیاست کا ایک ہونا اس رواداری میں کیونکر مخل ہو سکتا ہے
اگر سرکار صاحب اپنی شایع کردہ "احکام عالمگیری" ہی کو مدنظر رکھتے تو اورنگزیب
کو متعصب نہ بتلاتے ("عالمگیر احکام عالمگیری میں" کے موضوع پر میرا ایک مضمون
"رسالہ عالمگیر" لاہور کے کسی گذشتہ عید نمبر میں شائع ہو چکا ہے) ڈاکٹر ایشوری
پرشاد نے "مڈیول انڈیا" میں سرکار کے بیان سے اختلاف کیا ہے۔ پروفیسر جی
این بوس ملک (بنگالی) میرٹھ کالج بھی سرکار سے سخت اختلاف کرتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ اسلام نے بزور شمشیر مذہب کی اشاعت کرنے کی کہیں اجازت
نہیں دی۔ محمد صاحب اور ان کے خلفاء کے غزوات مدافعانہ تھے۔ تاریخ اسلام
میں عدم رواداری کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہندوستان کے
مسلمان بادشاہ چاہتے تو تمام ہندوؤں کو بزور مسلمان کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے
کبھی ایسی کوشش نہیں کی۔ احمد

۵۴ غالباً الفنسٹن کی تاریخ ہند کے ایسے ہی بیانات کی وجہ سے ونسنٹ
اے سمتھ نے اسے غیر معتبر اور منسوخ قرار دیا ہے اور اپنی کتاب اوکسفورڈ
ہسٹری اوف انڈیا میں اس قسم کے حالات حذف کر کے اور اکثر واقعات
کو نہایت چالاکی سے ہندو مسلم تنازع کا رنگ دیکر دونوں قوموں کے

جب اورنگ زیب کو ہندو راجہ سیواجی مرہٹہ سے لڑنا پڑا تو اس نے
راجپوت سرداروں جسونت سنگھ اور جے سنگھ کی خدمات حاصل کرنے میں تامل نہ
کیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ گاہ گاہ دلیر خاں کو ان کی نگرانی کیلئے بھیجتا تھا لیکن
اس کا سبب اس کا فطری سوء ظن تھا نہ کہ مذہبی تعصب۔ وہ جے سنگھ سے
زیادہ اپنے بیٹوں (معظم و اکبر وغیرہما) سے بدگمان تھا کیونکہ اس کو یہ خوف
دامنگیر رہتا تھا کہ مبادا اس کے بیٹے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو اس نے
اپنے والد شاہجہاں کے ساتھ کیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ بہت
جلد پارہ پارہ ہو گئی اور ہندوؤں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر کے یا مسلمان
حکمرانوں کے سپہ سالار بن کر ملک کے سیاسی اداروں پر قبضہ کر لیا۔
ہندوؤں کی رواداری کی ایک مثال یہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں
جب اہل عرب نے ایران فتح کیا تو بہت سے پارسی اپنا وطن چھوڑ کر ساحل گجرات
پر سنجن میں آباد ہو گئے جہاں کے ہندو راجہ نے ان کا خیر مقدم کیا ۵۵

۴ در میان مخالفت و منافرت پھیلانے کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو"
کا اصول اسمتھ سے زیادہ کسی انگریز مورخ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ دراصل موجودہ زمانہ
میں اس نے صرف اس ایک کتاب کے ذریعہ سے سلطنت برطانیہ کی زبردست
خدمت انجام دی ہے۔ راقم الحروف جب اسکول اور کالج میں پڑھتا تھا تو اسی
زہریلی کتاب کی وجہ سے ہندو مسلمان طلبہ میں ایک دوسرے کی طرف سے رنجش
پیدا ہو جاتی تھی اور بعض اوقات سخت الفاظ کی نوبت آ جاتی تھی۔ خدا کا شکر ہے
کہ اب برادران وطن اس کی چالاکی کو سمجھنے لگے ہیں نوجوانوں پر اس قسم کی
کتابوں کا جو اثر ہوتا ہے وہ لالہ لاجپت رائے آنجہانی کی خودنوشت سوانح
عمری سے معلوم ہو سکتا ہے۔ احمد

۵۵ اہل عرب نے پارسیوں کو وطن چھوڑنے یا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا
تھا ان لوگوں نے حکومت وقت کی اطاعت اور اس کے قوانین کی پابندی
نہ کرنی چاہی اس لئے اپنے ملک کو خیرباد کہا۔ اگر اہل عرب کو ان سے عداوت
ہوتی تو ان کا تعاقب کر سکتے تھے۔ ہندوستان کی کسی اسلامی سلطنت نے بھی ان
سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سلطنت ایران اب بھی ان کا خیر مقدم کرنے کے
لئے تیار ہے۔ احمد

حسب ذیل واقعہ بھی ان کی فراخدلی کی دلیل ہے۔

"اورنگ زیب کے بیٹے محمد اکبر نے اپنے باپ سے بغاوت کرکے راجپوتوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس میں اس کو ناکامیابی ہوئی۔ لیکن راجپوت سردار درگا داس ہر قسم کے خطرات برداشت کرکے اس کو مرہٹہ راجہ سمبھاجی کے پاس لے گیا۔ اورنگ زیب اپنے پوتے اور پوتی کو اپنے پاس بلانا چاہتا تھا لہذا اس نے درگا داس سے صلح کرلی۔ اس کے متعلق میں ذیل کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"شہزادہ اکبر کا خورد سال لڑکا بلند اختر اور لڑکی صفیۃ النساء سفر کی تکالیف کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے اس لئے وہ ۱۶۸۱ء میں وہاں سے بھاگتے وقت دونوں بچوں کو مارواڑ ہی میں اپنے راٹھور دوستوں کی حفاظت میں چھوڑ گیا تھا۔ درگا داس نے ان کو گردہار جوشی کے حوالہ کرکے ایک محفوظ مقام پر پہونچا دیا جہاں ۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک بہت اہتمام سے ان کی پرورش ہوئی اور جسمانی و اخلاقی تربیت کے علاوہ ان کو اسلامی مذہبی تعلیم بھی دی گئی" [۶]

(ہسٹری اوف اورنگ زیب از سرکار جلد ۵ صفحہ ۲۸۱-۲۸۲)

بنگال میں فرقہ پرستی کا نام تک نہ تھا۔ بنگال کے خود مختار سلاطین افاغنہ بنگالی زبان کے بڑے مربی تھے۔ بنگالی شاعر ودیا پتی نے اپنی غیرفانی نظم میں ان میں سے ایک کی مدح کی ہے۔ بنگال میں زمینداروں کی تقریباً وہی حیثیت تھی جو قرون وسطی میں یورپ کے مشروط جاگیرداروں کی۔ بارہ نیم خود مختار جاگیردار شاہی خزانہ میں ایک مقررہ رقم بطور خراج داخل کرنے کے بعد قطعی مطلق العنان تھے۔ جب مرکزی حکومت میں ضعف آتا تھا تو وہ خراج بھی ادا نہیں کرتے تھے۔ شاہان مغلیہ و افاغنہ ان کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ اکثر مقدمات کا فیصلہ طرفین کے مقرر کردہ ثالثوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ چھوٹے مقدمے پنچایتوں کے سپرد کئے جاتے تھے جن کا فیصلہ قاطع سمجھا جاتا تھا۔

ان بارہ جاگیرداروں میں سے اکثر ہندو تھے۔ اس ترجیح کا باعث "سوانح لارڈ کلائیو" مولفہ میجر جنرل سرجان مالکم جلد اول مطبوعہ ۱۸۳۶ء کے حسب ذیل اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے۔

"اگرچہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سلطنتوں پر قبضہ کرلیا تھا لیکن مالیات اور اندرونی نظم و نسق کے تمام شعبے جن پر سلطنت کے استحکام کا مدار ہے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے ایک ہندو "وزیر" یا "نایب" کے لقب سے بدستور شعبہ مالیات کی صدارت پر قائم رہا اور اس حیثیت سے اس کا تعلق دولتمند تاجروں اور رئیسوں سے تھا۔

جب ایک لائق مسلمان فرمانروا سے سوال کیا گیا کہ آپ اپنے ہم مذہب مسلمانوں پر ہندو منتظمین اور محصلین کو کیوں اس قدر ترجیح دیتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ مسلمان کی مثال چھلنی کی سی ہے جس میں جو کچھ ڈالا جاتا ہے نکل جاتا ہے۔ بخلاف اس کے ایک ہندو اسفنج کے مانند ہے جو ہر چیز کو جذب کرلیتا ہے لیکن بوقت ضرورت نچوڑنے سے واپس کردیتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی اسباب تھے جنہوں نے مسلمان بادشاہوں کو ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کو دربار و لشکر میں عہدے دینے پر آمادہ کیا۔ وہ شاہی خاندان کے افراد اور مسلمان امراء کی بغاوت و رقابت کیلئے توازن کا کام دیتے تھے۔ یہ جذبہ سلطنت دہلی کے انتہائی عروج کے زمانہ میں شہنشاہ سے لیکر ادنی سردار تک میں سرایت کرگیا تھا ہندوؤں کو اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے رسوخ حاصل تھا ہی۔ مسلمان اپنے مذکورہ طرز عمل اور ہندوؤں کے رسوخ ہی سے فائدہ اٹھاکر اتنے عرصہ تک آسانی سے ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم رکھ سکے۔ اسلامی فتوحات سے ہندو راجاؤں اور ان کے خاص مقربین کے سوا کسی کی حالت

---

[۶] اسی طرح سمبھاجی کے قتل کے بعد جب اس کا کمسن لڑکا اورنگ زیب کے پاس لایا گیا تو اس نے اس کی پرورش اپنے ذمہ لی اور اسے مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ وہ بہت آسانی سے ایسا کرسکتا تھا۔ اورنگزیب کے انتقال کے بعد اس کے جانشین بہادر شاہ اول نے اس لڑکے کو رخصت کرکے مرہٹوں کا راجہ بنادیا۔ احمد

چنداں تغیر نہیں واقع ہوا۔ چھوٹے ہندو راجہ اور رؤسا جو پہلے ہندو مہاراجہ کو خراج دیتے تھے اب مسلمان بادشاہوں کو دینے لگے اور ان کی مقامی حالت وحکومت میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

"ہندو وزراء اور رؤسا اپنے ہم قوم آقاؤں کی بہ نسبت شاہان مغلیہ کی ماتحتی میں زیادہ خوش تھے چونکہ ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی اور ان کے قدیم ومقدس رسم و رواج سے مطلق تعرض نہیں کیا جاتا تھا اور دیگر امور میں وہ متفق الرائے تھے۔ اس لئے متحد ہو کر فاتحین کو ملک سے نکالنے کی کوشش کبھی نہ کرسکے فاتحین نے متعدد مصالح کی بنا پر نام کے سوا تمام اختیارات ہندوؤں کے سپرد کردیئے"

مرشد قلی خاں نے اپنی نظامت کے زمانہ میں معتبر ہندوؤں کو وزیر مالیات اور مشیر بنایا اور ہر کام انھیں کے مشورہ سے انجام دیا۔ ان میں درپ نرائن۔ بھوپتی رائے۔ کشور رائے۔ جسونت رائے۔ اور رگھو نندن قابل ذکر ہیں بڑے بڑے فوجی عہدے بھی ہندوؤں کو دیئے جاتے تھے۔ لاہوری مل اور دلیپ سنگھ ہندو ہونے کے باوجود باغی ہندوؤں کی سرکوبی کے لئے روانہ کئے گئے۔ زمینداروں میں سے رام جیون، دیارام اور راگھو رام کئی بار سپہ سالار بنائے گئے۔

علی وردی خاں کی نوابی کے ابتدائی ایام میں ایک ہندو نند لال سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ راجہ جنکی رام اس کا سب سے معتبر مشیر تھا اور اس کے دو بیٹے راجہ درلبھ رام اور راجہ رام نرائن بڑے منصب دار تھے۔ چنمو رائے۔ ویردت کیرتی چند۔ امرت رائے۔ چنتامنی داس اور گوکل چند شعبہ مالیات کے ممتاز اراکین تھے۔ بعد ازاں راجہ راج بلبھ ڈھاکو ی بہت معمولی حیثیت سے ترقی کرکے نائب صوبہ دار ہوگیا راجہ رام سیاسی گفت وشنید میں اس کا وکیل مطلق تھا۔ دیوان مانک چند اور امید رام بھی بلند پایہ عہدہ دار تھے۔ ہندو نہ صرف انتظامی معاملات میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے بلکہ جنگی امور میں بھی ان پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ درلبھ رام۔ مانک چند اور بعد ازاں موہن لال اور شیام سندر نے میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ ؎

نواب علی وردی خاں کے مصائب کی اصلی وجہ اس کے مسلمان عہدہ داروں کی سرکشی اور نافرمانی تھی جو اپنے آقا سے منحرف ہوکر مرہٹوں سے جاملے ان تمام حالات وواقعات میں مذہبی تعصب یا فرقہ پرستی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ جو کچھ کیا گیا ذاتی اغراض کی ماتحت کیا گیا۔

مسلمانوں کی عملداری میں یعنی تیرہویں صدی سے جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) تک بنگال کے ہندوؤں کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک غیر ملکی حکومت میں ہیں۔ وہ بلند سے بلند ملکی اور جنگی عہدوں کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بیربھوم کے راجہ کے سوا تمام بڑے زمیندار ہندو تھے۔ کالی پرسن بنرجی جس نے بنگالی زبان میں "نوابی عمل" نام کتاب لکھی ہے بیان کرتا ہے کہ "بنگال کی زمینداری کا صرف سولھواں حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا۔" ؎

بہت ممکن ہے کہ تاریخ ہند کا ایک ظاہر بین طالب علم سرسری مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرے کہ صرف اکبر نے مذہبی رواداری اختیار کی اور انتظام سلطنت میں ہندوؤں کو شریک کیا۔ یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے کسی ہندو کو ہندو ہونے کی بنا پر کبھی کسی حق سے محروم نہیں کیا گیا۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ "وحدت اسلامیہ" کا کوئی وجود نہ تھا۔ مسلمان حکمراں بسا اوقات اپنے ہم مذہب حکمراں کے مقابلے میں ہندو راجاؤں سے جارحانہ اور مدافعانہ عہدوپیمان کرتے تھے اور ہندو راجاؤں کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ کوئی مسلمان مسلمان ہونے کی حیثیت سے مطلق فرقہ پرست نہ تھا۔

بہت قدیم زمانہ سے ہندوؤں پر بیرونی اقوام کے حملے ہوتے رہے لیکن اکثر ایسا ہی اتفاق ہوتا تھا کہ حملہ آور کاملاً ہندو قوم میں جذب ہوجاتے تھے مثلاً ستھین۔ مسلمان حملہ آوروں کیلئے یہ جاذبیت ناممکن تھی۔

؎ "ہندوی زند شمشیر اسلام" ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا گیا تھا۔ صرف اکبر کو اس شرف سے مخصوص سمجھنا غلطی ہے۔ احمد

؎ کس قدر ظلم ہے کہ اسمتھ نے بنگال کی تاریخ لکھتے ہوئے اپنی عادت کے موافق اس قسم کے حالات پر عمداً نہ صرف پردہ ڈال دیا ہے بلکہ یہ ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں بنگالی ہندو کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ (احمد)

"مسلمان ایک مختلف اور ذاتی تہذیب کے مالک تھے اس لئے ان کی تہذیب ہندو تہذیب میں مدغم نہ ہوئی مسلمان بادشاہوں نے اپنی لڑائیوں کو مقدس جہاد کر کے مندروں کو مسمار کیا۔ ہندؤں کو مسلمان بنایا اور ان پر سختی کی[9] لیکن رفتہ رفتہ دونوں قوموں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندؤں کو وزیر بنایا۔ ہندو رئیسوں سے تعاون کیا۔ ہندو عورتوں سے شادی کی اور ہندو ادبیات خصوصاً دیسی زبانوں کو ترقی دی۔ بعض اگرچہ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا ان کو زمینیں دیں۔ ان کے لئے مسجدیں تعمیر کیں اور ان کے مذہب کا احترام کیا۔ اسی طرح مسلمان بادشاہوں نے بھی ہندؤں کو اپنی سپاہ میں بھرتی کیا۔ لشکر میں ہندو مسلمانوں کے اجتماع سے ان کی زبان مخلوط ہوگئی اور اردو زبان کا آغاز ہوا[10]

کشمیر کے مسلمان بادشاہ زین العابدین نے ہندؤں کو سیاسی منصب عطا کئے اور ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا بنگال کا بادشاہ حسین شاہ بھی ایسا ہی بے تعصب تھا۔ مسلمانوں نے دیسی زبان کی خدمت کی۔ بنگالی زبان سنسکرت کے مقابلہ میں ایسی بے پناہ ترقی کے لئے حسین شاہ اور نصرت شاہ کی بہت زیادہ ممنون احسان ہے۔ کرتی داس کی بنگالی رامائن اور کاسی داس کی بنگالی مہابھارت بنگالیوں کے گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ودیاپتی اور چندی داس اعلیٰ درجہ کے غزلگو شاعر تھے۔"

"آزاد خیال مصلحین نے مذاہب کے اصول کی اشاعت کی اور مذہب کی ظاہری رسوم اور ذات پات کی دشوار قیود سے بالاتر ہو کر مساوات کی تلقین کی اور اس بزرگی پر زور دیا جو انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

رامانج آچاریہ[11] کے چیلے رامانند اونچی ذات کے برہمن تھے اور ہندی زبان میں تمام قوموں حتیٰ کہ چماروں میں بھی رام و سیتا کی تعلیمات کی اشاعت کرتے تھے رامانند کے مشہور چیلے رائے داس اور کبیر[12] تھے۔ کبیر صاف قوم کے نورباف تھے ان کی تعلیم یہ تھی کہ ہندؤں اور مسلمانوں کا خدا ایک ہے۔ رام اور رحیم میں کوئی فرق نہیں ہے اور تمام مذاہب برابر ہیں مہاراشٹر میں نامدیو مرہٹی زبان میں یہ تعلیم دیتا تھا کہ مسلمانوں کا اللہ اور ہندؤں کا رام ایک ہی معبود ہے نامدیو اور برہمن رشی ایکناتھ علانیہ اچھوتوں سے ملتے تھے اور آدمی کو بحیثیت آدمی کے بہت بلند مرتبہ بتاتے تھے۔ بنگال کے باؤل بھی یہی کہتے تھے

---

[9] جدید مورخین تسلیم کر چکے ہیں اور اس مقالہ سے بھی ثابت ہوگیا ہے کہ ہندؤں پر ان کے ہندو ہونے کی بنا پر کبھی سختی نہیں کی گئی اور نہ تعصب کی وجہ سے انکے مندر گرائے گئے۔

[10] فاضل مورخ جو ہندو ہیں کیسی صفائی اور بے تعصبی سے اقرار کرتے ہیں کہ اردو زبان ہندؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے بالفاظ دیگر اردو ہندؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان اور اہل ہند کی متحدہ قومیت کا نشان ہے لہذا ہر قوم پرست کا قومی فرض ہے کہ تابحد امکان اس قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کوشش کرے اس کو مٹانے کیلئے سعی کرنا قومیت سے دشمنی اور فرقہ پرستی کی دلیل ہے کاش وہ مدعیان قوم پرستی جو اردو زبان کو بدیشی زبان قرار دیتے ہیں اور اس کی تخریب میں دن رات کوشاں ہیں اپنے رویہ پر غور کریں کہ ان کا عمل ان کے دعوی کے کس قدر منافی ہے اردو زبان کا کوئی مخالف قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ (احمد)

[11] رامانج آچاریہ۔ رامانند۔ چیتنیہ۔ نامدیو اور ایکناتھ وغیرہم اگرچہ ہندو قوم میں پیدا ہوئے تھے مگر اسلام سے متاثر ہو کر برائے نام ہندو رہ گئے تھے ان کا مسلک خالص توحید اور مساوات کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے ان کے معتقدین میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے جن کو یہ تبدیل مذہب کی دعوت نہیں دیتے تھے۔ (احمد)

[12] کبیر صاحب کے مسلمان ہونے کے ثبوت میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید تبصرہ لاحاصل ہے۔ چونکہ کبیر صاحب مذہب کی فروعات کو چھوڑ کر صرف توحید و مساوات کا وعظ کہتے تھے اور ان کے معتقدین میں بیشمار ہندو بھی شامل تھے اور وہ خود رامانند کے معتقد تھے اس لئے بعض حضرات کو ان کے اسلام میں شبہ ہوگیا۔ (احمد)

۱۹۳۵ء

کہ انسان انسان ہے اور ذات اور مذہب سے بالاتر ہے چیتنیہ نے ندیا اور بنگال میں بھگتی کا عقیدہ پھیلایا اور مساوات کی تعلیم دی۔ ان کے معتقدین میں بعض مسلمان بھی تھے بلبھ آچاریہ نے شمالی ہند میں وشنو مت قائم کیا نانک نے ذات پات کے امتیازات توڑ کر عالمگیر اخوت کا وعظ کہا اور اسلام و ہندو مذہب کو یکساں بتایا۔ بہت سے مسلمان بھی ان کے مرید تھے [13]

(انڈین ہسٹری از کے۔ پی۔ مترا۔ صفحہ ۱۱۲۔ ۱۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی زمانہ حال کی پیدا کردہ ہے اب سے قلیل مدت پہلے اس کا تصور بھی نہ تھا۔ میرے لڑکپن کے ایام میں میرے باپ دادا اور پردادا گادی پور (جو ہمارے گاؤں کے قریب ہے) کے قاضیوں کو جاترا میں شرکت کی دعوت دیتے تھے جسے وہ ہمیشہ قبول کر لیتے تھے بنگال میں ہر جگہ یہی حالت تھی۔ دونوں قوموں کے تعلقات مخلصانہ اور دوستانہ تھے [14]

بریلے برٹ نے سنہ ۱۹۰۶ء میں ہندو مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے۔

"ہندو بھی شیخ محمد یوسف کی درگاہ کا احترام کرتے ہیں

---

[13] اس کے بجائے یہ لکھنا چاہئے تھا کہ بہت سے ہندو بھی ان کے مرید تھے کیونکہ نانک صاحب مسلمان تھے جس کا ثبوت ان کا نعتیہ کلام ہے۔ ایک شعر میں وہ چاروں ویدوں کو کہانی بتاتے ہیں۔ ان کے چولے پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ راما نند کبیر اور چیتنیہ کی طرح وہ بھی صرف توحید و مساوات پر زور دیتے تھے اور ان کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ ان کو تبدیل مذہب کی تلقین نہیں کرتے تھے اس لئے ان کے اپنے مذہب کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہوئی موجودہ سکھ مذہب اور خالصہ کے بانی نانک نہیں بلکہ آخری گرو گوبند سنگھ تھے۔ (احمد)

---

[14] ہندو مسلمانوں کا تو کیا ذکر ہے آج کل مسلمانوں کی موجودہ مختلف جماعتیں بھی مثلاً حنفی۔ وہابی۔ دیوبندی۔ بریلوی۔ چکڑالوی۔ نیچری وغیرہ باہم متحد نہیں ہیں۔ یہ نا اتفاقی بھی موجودہ زمانہ ہی کی خصوصیت ہے۔ قرون وسطی میں مختلف الخیال مسلمانوں کے باہمی عناد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

(احمد)

جب کسان کو اپنی کھیتی کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ مٹھی بھر چاول لے آتا ہے۔ اگر اس کا بچہ بیمار ہوتا ہے یا اس کے مویشیوں میں وبا پھیلتی ہے تو وہ مزار پر آ کر دعائیہ کلمات کہتا ہے۔ اگر فصل اچھی ہوتی ہے تو چاول کا ایک ڈھیر بطور شکریہ کے پیش کرتا ہے۔ غرض شادی ہو یا غمی لوگوں کی خانگی زندگی میں اس بزرگ کے مزار کا دخل ضرور ہوتا ہے۔"

"کچھ فاصلہ پر کھیتوں کی دوسری طرف پگلا صاحب کا مزار ہے جس کا احترام ہندو مسلمان اس قدر کرتے ہیں کہ جب بچہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے والدین اس کے سر کے بال مزار پر چڑھاتے ہیں۔"

(رومانس اوف این ایسٹرن کیپٹل)

"ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑے بہت شاذ و نادر ہیں، دونوں قوموں میں باہم کامل ربط و اتحاد ہے اور ان کے اکثر افراد اس درجہ بے تعصب ہیں کہ ایک ہی حقہ پیتے ہیں۔"

(ٹوپوگریفی اوف ڈھاکہ۔ از ٹیلر سنہ ۱۸۴۰ء صفحہ ۲۵۰)

مذہبی رواداری کے معاملہ میں یورپ اور ہندوستان کا فرق اظہر من الشمس ہے۔

یورپ کی تاریخ زمانہ قریب تک مذہبی تعصب کی نہایت نفرت انگیز اور المناک داستان ہے۔ نہ صرف صلیبیوں نے پیٹر ہرمٹ اور اسی قماش کے دوسرے پادریوں کے آتشیں وعظوں اور اشتعال انگیز و ملامت آمیز خطبوں سے متاثر ہو کر کافروں سے مقدس مقامات چھیننے کی کوشش میں ہولناک مظالم برپا کئے بلکہ مذہبی عقاید کے اختلاف کی بنا پر اہل یورپ نے صدیوں تک وحشیانہ اور خونریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

اب یورپ کے تاجداروں اور ان کے ہمعصر اہل ہند کا فرق دیکھنا چاہئے۔

"چنانچہ چارلس پنجم نے اپنے عہد حکومت کے اختتام کے قریب بجا طور پر فخریہ دعویٰ کیا کہ اس نے ہمیشہ اپنے مذہبی عقاید کو اپنے ملک پر ترجیح دی اور عیسائی مذہب کے مفاد کو

سب پر مقدم رکھا۔ اس نے ہالینڈ میں الحاد کے خلاف جو جد و جہد جاری رکھی وہ اس کے مذہبی جوش کا کافی ثبوت ہے۔ ہمعصر اور مستند مورخین کے بیان کے مطابق اس کے زمانہ میں ہالینڈ میں صرف اختلاف عقاید کی وجہ سے پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان آدمی ہلاک کئے گئے.....

لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ۱۵۲۰ء اور ۱۵۵۰ء کے درمیان اس نے چند قوانین نافذ کئے جن کا مدعا یہ تھا کہ ملحدین قتل کئے جائیں یا زندہ جلائے جائیں یا زندہ دفن کئے جائیں۔"

(ہسٹری اوف سولزیشن از بکل)

"ڈچ (اہل ہالینڈ) اصلاح شدہ عقاید اختیار کرنا چاہتے تھے اور اکثر نے ان کو اختیار کر بھی لیا تھا اس لئے فلپ (۱۵۵۵ء سے ۱۵۹۸ء) نے ان سے ظالمانہ جنگ جدال کی جو تیس سال یعنی اس کی موت تک جاری رہی کیونکہ وہ اس نے فرقہ (پروٹسٹنٹ) کے استیصال کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ جو پروٹسٹنٹ اپنے عقاید سے بیزار نہ ہو جلا دیا جائے

.... ہالینڈ کے سزا یافتہ لوگوں کی صحیح تعداد ہم کو معلوم نہیں لیکن آلوا نے فخریہ کہا کہ میں نے اپنی نظامت کے پانچ چھ سال میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ آدمیوں کو جبرا ہلاک کیا ہے۔" (ایضاً)

اس دردناک کیفیت کے مقابلہ میں ہندوستان کی حالت کس قدر حوصلہ افزا اور دل خوش کن ہے۔ ساحل ملابار میں مسلمانوں کے قدم نہیں پہونچ سکے اس لئے وہاں کے ہندو راجہ کا ملا خود مختار رہے۔ ان کی رواداری قابل تحسین ہے۔ شام کے عیسائی پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں ٹراونکور اور کوچین میں وارد ہوئے۔ جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور ان کو پوری مذہبی آزادی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ٹراونکور کی آبادی کا ایک ثلث عیسائی مذہب کا پیرو ہے۔

جب پارسی اپنے وطن سے بھاگ کر ساحل بمبئی پر آئے تو ہندو راجہ نے ان کو پناہ دی۔

اوپر کے بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں چودھویں صدی سے آخر وقت تک مذہبی اختلاف کی بنا پر کبھی ہندوؤں کی حق تلفی نہیں کی گئی اور مسلمان بادشاہ آزاد خیالی اور رواداری کے اصول پر قائم رہے۔ بخلاف اس کے انگلستان میں زمانہ قریب میں نہ صرف رومن کیتھلک بلکہ مختلف الخیال پروٹسٹنٹ بھی اپنے حقوق سے محروم تھے۔

برطانوی نظام حکومت کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ۔

"چارلس دوم کے عہد میں کیتھلکوں کو ملازمتوں سے خارج کرنے کے لئے ٹیسٹ ایکٹ (قانون آزمائش) نافذ کیا گیا۔ یہ آزمائش ایسی بے پناہ تھی کہ اس سے ہر ملازم جو خفیہ طور پر کیتھلک ہوتا تھا۔ اپنے عقاید ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔"

"مذہبی رواداری کی طرف جو اقدام کیا گیا وہ رعایا کی نظروں میں زیادہ اہم اور آئندہ ترقی کے لئے ناگزیر تھا۔"

بالآخر ۱۸۲۸ء میں ٹیسٹ ایکٹ منسوخ کیا گیا۔ ایک سال بعد کیتھلک امنسی پیشن ایکٹ (قانون غلامی کیتھلک) منظور کیا گیا —— جس کی رو سے کیتھلک پارلمنٹ کے دونوں دیوانوں میں داخل کرلئے گئے اور معدودے چند عہدوں کے سوا تمام سرکاری مقامی اور قومی ملازمتوں کے مستحق قرار دیئے گئے۔ ان کی آزادی میں اب بہت تھوڑی کسر باقی تھی۔ لیکن یہودی ۱۸۵۸ء تک پارلمنٹ میں داخل نہیں کئے جاتے تھے اور فرقہ نان کنفارمسٹ کو ۱۸۷۱ء تک یونیورسٹیوں میں مساوی حقوق حاصل نہیں تھے۔"

(کنسٹی ٹیوشنل ہسٹری اوف انگلینڈ از جارج برٹن آڈمز مطبوعہ ۱۹۳۳ء)

احمد۔ ایم۔ اے،

حقائق!

از حضرت شفق رضوی عماد پوری

ہوا الٹی چلی بدلا خزاں نے رخ زمانے کا
قفس تک اڑ کے اک تنکا نہ آیا آشیانے کا

نشیمن سے قفس تک شور تھا جس کے ترانے کا
وہی مرغ خوش الحاں نوحہ خواں ہے آشیانے کا

کہیں کمبخت کو کیا امن کا گوشہ نہیں ملتا
ٹھکانا ڈھونڈھتی ہے برق میرے آشیانے کا

اسی پر باغباں صیاد دونوں ٹوٹ پڑتے ہیں
نہ ٹوٹا ایک تنکا آج تک جس آشیانے کا

کبھی ہر نخل گل اپنا تھا سارا گلستاں اپنا
ٹھکانا اب نہیں اک شاخ گل پر آشیانے کا

چمن سے تاک میں جس کے قفس تک برق آئی ہے
فقط ہے تیلیوں میں ایک تنکا آشیانے کا

جلا کر برق ٹھنڈا کر چکی ہو جس کو گلشن میں
قیامت تک سمجھ لو گل چراغ اس آشیانے کا

ڈراتی ہے نگاہ گرم سے اے برق کیا مجھ کو
یہاں ہے آپ دشمن تنکا تنکا آشیانے کا

صبا دو چار کلیاں رکھ گئی ہے لا کے گلشن سے
قفس میرا شفق ہمرنگ ہے اب آشیانے کا

مرسلہ ــــ قمر شفقی!

چار چاند

از مولٰنا صادق الخیری بی۔ اے

ایک شام کو ــــــــ

امیر سمرقند کے شاہی محل کے پائیں باغ میں کوئی کہہ رہا تھا۔ "پیاری یاسمین تمہاری نشیلی آنکھوں میں وہ کشش ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت ان کو دیکھا کروں۔"

اس نے کسی قدر بگڑ کر اور اپنا پاؤں فرش پر مار کر کہا۔ "بس تمہیں تو یہی خالی خولی باتیں بنانی آتی ہیں۔"

"یہ تو اظہار عشق کے رنگین الفاظ ہیں پیاری ـــ اے سلطنت قلب کی ملکہ۔"

"پھر وہی منہ دیکھے کی باتیں؟ کیوں محمود اگر تم کو مجھ سے اتنی ہی محبت ہوتی جتنی مجھے تم سے ہے تو تم شادی ہی نہ کر لیتے ــــ اللہ! مجھے ایسے الفاظ کہتے بھی تو شرم آتی ہے۔"

"شادی؟ .... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں؟ .... ممکن کیوں نہیں؟"

"ہمارے والدین، ہمارے قبیلے والے .... ایک دوسرے کے دشمن ہیں .... سینکڑوں برس سے ہوتے آئے ہیں، اور تم ہمارے محل میں یرغمال کی حیثیت سے آئی ہوئی ہو ....."

"اور بھی بے معنی باتیں!"

"نہیں یہ تو حقیقت ہے .... مجبوری! میرا باپ ... !"

"ہشت! مردوں میں عقل نہیں ہوتی ..... اگر میں مرد ہوتی؟"

"تو تم کیا کرتیں یاسمین؟"

"کچھ نہ کچھ کرتی" .... اور جونہی محمود قریب آیا وہ تنک کر بولی "نہیں نہیں، تم مجھے اپنے سینے سے مت لگاؤ۔ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں نا ....."

اور یہ کہہ کر وہ پھرتی سے قصر شاہی میں داخل ہو گئی۔

۲

شام کا گجر بجنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کسی نے مغربی دروازے پر دستک دی اور محافظ اپنی پگڑیاں سنبھال کر اس طرف چلے ایک بولا ــــ "شاید کوئی آیا ہو؟"

دوسرا ہنس کر بولا۔ "کوئی کیا یہ دروازہ عام تھوڑی ہے۔ یہاں سے بیرونجات کے لوگ ہی آسکتے ہیں۔"

"شاید کوئی خراج لایا ہو۔" تیسرے نے کہا۔

"کہیں نواب ابا کان نے تو جنگ کی نہیں ٹھان لی۔" ان میں سے ایک بولا۔

"نہیں نہیں" دوسرا فوراً ہی بات کاٹ کر بولا۔ "پچھلے سال تو ہم اس کے دانت کھٹے کر چکے ہیں اور یہاں اس کی اکلوتی لڑکی جو ہمارے یہاں یرغمال کی حیثیت سے ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے کوئی نہیں آسکتا۔"

دروازے پر کسی نے پھر دستک دی اور بہت زور سے چیخ کر کہا جلدی کھولو ــــ اے افیمچیوں!"

دروازہ بڑی جدوجہد کے بعد کھولا گیا لیکن ــــ وہ لوگ مایوس ہو گئے۔ متعجب بلکہ خفا بھی کیونکہ ــــ نہ تو کوئی وہاں قافلہ تھا نہ کوئی اور شان و شوکت، بلکہ ایک تنہا شخص، ایک لنگولی ٹٹو پر، وہ پورا مرد بھی نہیں تھا بلکہ بالکل نوجوان جس کی مسیں ابھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن اس کی ناک بے حد نمایاں تھی، لمبی، بہت لمبی، جو چھوٹتے ہی دکھائی دے۔ وہ اندر گھسنے لگا۔ مگر محافظوں کا کپتان آگے بڑھا اور اسے روک کر بولا۔ "تم جیسے لوگوں کو مشرقی دروازے سے آنا چاہئے۔ یہ بڑے لوگوں کیلئے وقف ہے۔"

"ہوں ...؟" وہ اس کو گھور کر بولا۔ "کون کہتا ہے میں بڑا نہیں۔"

"تمہارے پھٹے ہوئے کپڑے۔"

"لیکن تمہیں میری نسل کا کیا علم ؟"

"ہاں تو بتاؤ نا؟ تمہارا نام کیا ہے ؟"

"علی ——!"

"واہ! مسلمانوں میں علی کون نہیں ہوتا —— ؟ اپنے قبیلے کے کسی بڑے آدمی ہی کا نام بتاؤ - اور تمہارا پیشہ کیا ہے ؟"

"تمام بڑے آدمی میرے رشتہ دار ہیں اور پیشہ شمشیر زنی۔"

کپتان منہ چڑا کر بولا۔ "کیا تمہیں اس قسم کی فضول اور لغو باتیں کرتے شرم نہیں لگتا - ؟"

"یاد رکھو!" وہ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "جو شخص مجھے مشتعل کرتا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔"

بہت زور سے ایک قہقہہ پڑا اور اتنی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے مجمع میں سے دو شخص آگے بڑھے ایک سرخ لباس اور دوسرا سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔

نوجوان ان کی طرف پلٹ کر بولا۔ "کون ہنسا تھا اور کس پر ؟"

سرخ پوش نے فوراً جواب دیا۔ "میں —— تم پر ——"

"جانتے ہو کیا انجام ہوگا ؟"

"ہاہاہا!!"

"میری تلوار پیاسی ہے۔"

"ابھی تو تمہارے لب ہی پیاسے ہیں —— ماں کے دودھ کے! اے بچے!"

"اچھا بڈھے مرد" کہہ کر وہ اس کے پنجوں پر چڑھ گیا اور سرخ پوش اس تکلیف سے بلبلا اٹھا۔

"دیوانہ مت بن، ورنہ یاد رکھیو!"

"کیا ؟"

"تلوار اور تو ——"

"اوہو —— تم ؟"

سرخ پوش نے اپنے غصہ پر قابو پا کر آہستہ سے کہا "میں لونڈوں سے کیا لڑوں ——؟"

"واہ کیا معقول بات ہے۔"

"جب تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا میں تمام قبیلے میں سب سے زیادہ جنگجو مانا جاتا تھا۔" کہہ کر سرخ پوش ہنسا لیکن دفعتہً سنجیدہ بن کر وہ اس کے قریب آیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "یہ طوطے کی چونچ جیسی ناک میں نے کہیں دیکھی ہے ....

ہاں ایک دفعہ جب میں قیدیوں میں ....."

دفعتہً علی نے تلوار سونت لی اور چیخ کر بولا —— "بہادر صاحب اپنے آپ کو بچائیے۔"

سرخ پوش نے سیاہ پوش کی طرف دیکھا اور جب سیاہ پوش نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا تو وہ بھی تلوار کھینچ کر مقابلے پر آ گیا - وہ تلوار ہوا میں پھراتے ہوئے بولا "دوستو' ذرا تماشہ دیکھو لو چھوٹا بڑوں کے منہ آیا ہے - مگر خیر میں اس کو زیادہ گزند نہیں پہنچاؤں گا۔"

سرخ پوش ابھی مذاق ہی کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ لال ہو گیا اور غصے میں آ کر اس پر پل پڑا لیکن چند ہی لمحات بعد اس نے محسوس کر لیا کہ "وہ بچہ" اس "مرد" سے کہیں زیادہ شمشیر زنی میں ماہر ہے - آناً فاناً علی نے سرخ پوش کے سینہ میں تلوار بھونک دی - سرخ پوش لڑکھڑاتا ہوا گرا اور سیاہ پوش کو اپنے پاس دیکھ کر کہنے لگا۔ "میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا" اور سب کے دیکھتے ہی دیکھتے چل بسا۔

سیاہ پوش اب آگے بڑھا اور بولا "لو اب تم جلدی سے اپنے ٹٹو پر بھاگ جاؤ ——!"

"کیوں ——؟"

"کیونکہ مقتول . . ."

"ایمانداری کے مقابلے ہی میں تو . . . ."

"بیشک! لیکن وہ امیر سمرقند کا بہترین شمشیر زن تھا جس پر سونے چاندی اور جواہرات کی بارش کی جاتی تھی۔"

"ہوا کرے۔"

"لیکن ——!"

"کچھ ہرج نہیں، امیر اس سے بہتر مجھے شمشیر زن پائیگا - میری تلوار اس کی خدمت کو حاضر ہے۔"

دفعتہً سیاہ پوش نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اچھا —— اس نے تمہیں منظور کر لیا ——" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی اتار دی - لوگ اسے دیکھتے ہی ادب سے جھک گئے - لوگوں کو زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ امیر

شام کو بھیس بدل کر ادھر اُدھر گشت کرتا ہے تاکہ سپاہیوں، افسروں، تاجروں غریبوں غرض کہ اپنی تمام رعایا سے مل کر حالات معلوم کرتا رہے۔

اس نے علی کو اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔

۳

اس طرح علی معروف جہاں امیر سمرقند کا بہادر شمشیر زن مقرر ہوگیا اور لوگ اس کا احترام کرنے لگے۔ اس کو محل اور شہر میں آنے جانے کی مکمل آزادی تھی اور تھوڑے عرصہ بعد اس کی یاسمین بنت شمس قاسم نواب ایلکان سے ملاقات ہوگئی۔

یاسمین نے اس کے گلے میں فرط محبت سے بانہیں ڈال دیں اور بے قابو ہوکر بولی —— "بھائی —!"

"ہش" وہ جلدی سے بولا۔ "تم یہاں مجھے اجنبی سمجھو۔"

پھر کانا پھوسی میں ایک دوسرے نے اپنے اپنے حالات سنائے۔ یاسمین کہنے لگی —— "اور میں تم کو ہر وقت یاد کرتی تھی کہ میرا نوجوان بھائی ایک دن ...... خیر، تم کیا جانو ایک بہن اپنے بھائی سے ایسی جگہ مل کر کس قدر خوش ہوتی ہے مگر ہاں ..... تم یہاں خطرے میں بھی تو ہو .... کہیں خدانخواستہ تمھیں کوئی پہچان نہ لے۔"

"واہ! اسلام بہادر لڑکوں سے بھرا پڑا ہے، ہر مسلمان کا بچہ اتنا ہی بہادر اور ایسا ہی شمشیر زن ہونا چاہیے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا مطلب ہے کہ تمھاری ناک ... "

"ارے" وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ہاں وہ جو سرخ پوش بہادر تھا نا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا مگر میں نے فوراً ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب میں اس کی جگہ ہوں اور یہی ہمارے لئے مفید ہے۔"

"اور وہ پھول تو بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے ہونگے۔ فارس سے جو آئے تھے۔" یاسمین دوسری باتیں کرنے لگی۔

سمرقندی سرحد سے اُدھر جاکر ایلکان والوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ کبھی ڈاکہ ڈال دیا۔ کبھی مویشی چرا لئے۔ کبھی عورتوں کو بھگا لائے۔ کبھی ہٹ دھرمی سے ان کی چراگاہوں کو اپنا بتا دیا۔ نواب شمس قاسم نے معروف جہاں کی توجہ اس طرف منعطف کرائی لیکن اس نے اس کی کوئی خاص پروا نہیں کی جب حالات ناقابل برداشت ہوگئے تو جنگ چھڑ گئی مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر مصالحت کرنی پڑی اور وہ بھی اس طرح کہ والئی سمرقند نے نواب شمس قاسم کی لڑکی کو یرغمال کی حیثیت سے اپنے یہاں بلوا لیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد علی جوانی کے جوش میں انتقام کو فرض سمجھنے لگا اور یہ طے پایا کہ پہلے یاسمین کو آزاد کر کے لایا جائے۔

علی نے باتوں کا رخ بدل کر کہا —— "تمھیں لے جانا کوئی مشکل بھی نہیں میں امیر کا خاص ملازم ہوں۔ اس لئے مجھے ہر جگہ جانے کی آزادی ہے۔ اب بہت جلد ہم تم اپنے وطن چلے چلیں گے ——" وہ خوب ہنسا لیکن بہن کو خاموش دیکھ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں سمرقند نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ہیں —؟"

وہ خاموش تھی، علی نے پھر کہا "کیوں نہیں؟"

وہ چپکی رہی، علی نے اپنے آپ ہی کہا۔ "کہیں کوئی مرد۔ سمرقندی؟"

"ہاں، ہاں، اس کو میں چاہتی ہوں اور وہ مجھے —!"

"ہرگز نہیں، — ناممکن —— ایک قابل نفرین ہستی۔"

"تمھارے لئے ہوگا —— میرے لئے نہیں، اللہ، ایلکان کا کوئی شخص اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا کہتی ہے، کیا تو اسے مجھ سے زیادہ چاہتی ہے؟ —— اپنے باپ سے بھی۔ اپنی ماں سے بھی۔؟"

"کس قدر فضول سوال ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ کیا تجھے وہ اپنے خون اور گوشت سے بھی زیادہ پیارا ہے؟ ——"

"میں کیا جواب دوں —— تم مردانہ ضد سے کام لے رہے ہو۔"

"دغا باز —! —— بے غیرت!"

وہ رونے لگی ..... اور اسی وقت ایک شخص جو باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا اس طرف سے گزرا ..... محمود کبیر اس کا نام تھا، شہزادہ سمرقند۔ اس نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا اور علی کی طرف تیوری چڑھا کر بولا —— "کیا تم نے انھیں کچھ کہا ہے؟"

اس نے جواب کے بجائے ایک الٹا سوال کیا —— "کیا تم اس کے محب ہو؟"

"ہاں! پھر تمھیں کیا؟"

"میری توہین — اور تمھارے لئے موت!... آہ!" وہ دفعتاً بولا "یہ میری بہن ہے، او نالائق —!"

علی نے اپنی تلوار کھینچ لی اور محمود بھی مقابلے پر آ ڈٹا۔ تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خوفناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں اور — یاسمین ایک طرف کھڑی کانپ رہی تھی۔

اسی اثنا میں امیر سمرقند اپنے گشت پر جانے کیلئے ادھر سے گذرا اور بیٹے کی موت کے خیال نے اس کے دل و دماغ کو تھرا دیا لیکن جونہی محمود نے اپنے باپ کو دیکھا وہ تلوار چھوڑ کر علی کے سامنے جھک گیا۔

علی ششدر رہ گیا۔

"ہم یہاں کوئی تین منٹ سے تلوار بازی میں مصروف تھے، آپ کے شمشیرزن نے مجھے بہت سے ہاتھ سکھائے۔" محمود نے بصد ادب اپنے باپ سے کہا۔

امیر خوشی سے پھولا نہ سمایا اس نے علی کو سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "تمھیں شاہی خلعت۔ بہترین گھوڑا اور جواہرات دیئے جائیں گے جو شمس قاسم سے لوٹے گئے تھے۔ وہ بڑا بیوقوف ہے۔"

۴

ایک سہپر کو علی محمود کے پاس گیا اور جھک کر سلام کیا۔

"آپ سے ایک بات کہنی ہے — میرا سر دروازے پر کاٹ کر لٹکا دیا گیا ہوتا... آپ نے میری جان بچائی۔"

"واہ! تم نے میری زندگی بچائی ہے۔"

"کیسے؟"

"تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ ان کا غصہ الاماں! اگر تم اسے بتا دیتے کہ مجھے یاسمیں — نواب ابا کان کی بیٹی سے محبت ہے تو... اوہ اس خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

ایک دوسرے کی آنکھیں ملیں، وہ مسکرائے اور ایک دوسرے نے مصافحے کے بعد معانقہ کیا۔ محمود بولا — "بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم دونوں آپس میں دشمن ہوں۔"

"بیشک! اور تم کو میری بہن سے محبت ہے۔" علی نے کہا۔

"اس سے زیادہ حسین تو زریں چاند یا نیلے آسمان پر بھی کوئی نہ ہوگا۔"

"کیسی بے معنی باتیں ہیں۔" علی نے الفاظ چبا چبا کر کہے — "وہ تو صرف ایک عورت ہے۔"

"کیا صرف ایک عورت... وہ؟"

"اور کیا۔ مجھے تو آج تک ایک بھی ایسی عورت نہیں ملی — جو میرے دل میں جگہ......"

"تم عورتوں کو نہیں جانتے۔"

"میں خوب جانتا ہوں — سب ایک سی ہوتی ہیں۔ بیوقوف غیر مستقل مزاج، کمزور..."

دفعتہً کہیں سے آواز آئی — "ذرا اس عقلمند نوجوان کی باتیں سننا... اس عقلمند نے زندگی اور زندگی کے رازوں کا اس طرح انکشاف کیا ہے جیسے ایک بندر ناریل توڑتا ہے۔"

محمود نے پلٹ کر دیکھا — "طوفہ!" اس نے پکارا "میری بہن!"

طوفہ محمود کی طرف متوجہ نہیں ہوئی اور سیدھی علی کے پاس آ گئی۔

"ہاں ذرا اب سے تو کہو، جو کچھ تم نے میرے بھائی سے کہا تھا۔" وہ ذرا خفگی سے بولی۔ "آہ!" اور پھر نقاب الٹ کر۔ "میری طرف غور سے دیکھو... پہچان گئے ہاں اب کہو، ہم سب بیوقوف ہیں، غیر مستقل مزاج، سب کی سب؟"

"ن... ن..." علی گھبرا کر بولا۔ "شاید... سب نہیں..."

"اہا سب نہیں، تو پھر وہ کون ہوگی — جو اس سے مستثنیٰ ہے؟ غالباً وہ عورت جو تمھارے دل پر قبضہ کرلے... ناک تو بڑی لمبی رکھتے ہو آخر میں بھی تو دیکھوں وہ کون سی عورت ہوگی — جس کو یہ اعزاز بخشا جائیگا"

علی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اس کو محبت سے دیکھا۔ خوبصورت آنکھیں بلوری پیشانی۔ یاقوتی لب، سیب جیسے رخسار — دفعتہً ایک عجیب و غریب بات اس نے کہی یعنی محمود کے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ "تم سے زیادہ حسین کوئی زریں چاند اور نیلے آسمان پر بھی کوئی نہ ہوگا۔" اور پھر اس نے محسوس کرلیا کہ یہ الفاظ بیوقوفی کے نہیں بلکہ گہرے اور سنجیدہ ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اور طوفہ ایک پرند کے دو بازو ہیں اور اگر ان میں سے ایک معطل ہو جائے تو پرند دوسرے کے بل پر پرواز نہیں کرسکتا اور جب طوفہ نے دوبارہ پوچھا۔ "میں بھی تو دیکھوں یہ خوش قسمت لڑکی کون ہوگی؟" تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ بالکل تمھاری جیسی ہے... ایسی ہی رنگت اور ایسی ہی حسین اور جس کے متعلق ہماری کتاب مقدس

کہتی ہے کہ اس کی قیمت لعل و یاقوت سے بھی زیادہ ہے۔"

اور بغیر محمود کا بھی کچھ خیال کئے جو اس کی طرف مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا، اس نے طوفہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

طوفہ گھبرا کر بولی ۔۔۔ "آخر کس عوض میں ۔ ۔ ۔ ؟"

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اپنے ہی عوض میں ۔ ۔ ۔ تمھاری قیمت میری زندگی ہے ۔۔۔ "

اسی رات کو جبکہ باغ میں پھول خوب کھل رہے تھے آسمان محبت کے چار چاند اپنی الفت پاش ضیائے متقدس فضائے بسیط پر پھیلا رہے تھے۔ وہ چاروں مسرور تھے بھائی اور بہن، بہن اور بھائی۔

اور کیوں نہ ہوتے جبکہ شاندار اور سنہرا وقت ان پر مسرت کے سچے موتی قربان کر رہا تھا ۔۔۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملول ہو کر رہ گئے ۔۔۔ مستقبل کے خیال سے۔

"پھر وہی باتیں ہونگی ۔ ۔ ۔ دشمنی کی آگ ۔ ۔ ۔ امیر اور نواب کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی، اور کوئی بھی ایسا موقع نہ نکلے گا جبکہ امن و صلح کے بعد آپس میں شادیاں ہو جائیں۔ انھوں نے سوچا۔

"مستقبل میں کیا ہوگا؟"

"لڑائی ۔۔۔ جھگڑہ ۔۔۔ جنگ ۔۔۔ " یاسمین نے کہا۔

"اور کیا" طوفہ نے بھی کہا ۔۔۔ "قتل عام، منافرت۔"

"مرد ہی نفرت کرینگے" یاسمین بولی "عورتیں نہیں۔"

"یہ تو ہے ہی، عورتیں نفرت نہیں کیا کرتیں ۔۔۔ یہ تو مردوں ہی کا کام ہے۔ کیونکہ وہ ضدی ہوتے ہیں، سرکش ۔۔۔ "

"مردوں میں عقل نہیں ہوتی۔"

"بالکل نہیں" دونوں لڑکیوں نے آپس ہی آپس میں اشارے کر لئے۔

"تم سمجھتی ہو ۔۔۔ " علی نے طنز سے کہا۔ "کہ عورتوں میں زیادہ عقل ہوتی ہے ۔۔۔ ؟"

"بہت زیادہ!"

"اچھا اگر ایسی ہی عقلمند ہو تو تم دونوں کیا کرو اگر ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں!" محمود کو بھی طیش آچلا تھا۔ "تم کیا کر سکو گی؟ ۔۔۔ ہمارے والدین کی سختی اور دشمنی کے مقابلے میں؟"

"ہم اپنے والدین کی بیجا سختی اور ظلم پر ۔۔۔ اپنی محبتوں اور مسرتوں کو قربان نہیں کرینگے۔"

"اگر ہم مرد ہوتیں تو اپنی عورتوں کو گھوڑوں پر بٹھا کر کہیں چلی جاتیں۔"

"بس!" علی بات کاٹ کر بولا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔"

محمود کہنے لگا۔ "بس تو آج رات کو ہم نکل جائیں گے۔"

"کہاں؟" علی نے پوچھا۔

"بہت دور ۔۔۔ ایک ویرانے میں، کوہ طوفان پر ۔ ۔" محمود نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں اس جگہ سے خوب واقف ہوں۔"

۵

تھوڑے دنوں بعد امیر سمرقند اور نواب ابا کان کو پیغامات ملے جنھیں سن کر دونوں کو طیش آ گیا۔

ایک غصے سے بیتاب ہو کر بولا۔ "تمام سرداروں کو جمع کر لو ۔ ۔ ۔ یہ بدمعاش کا لڑکا میری بیٹی کو لیکر بھاگ گیا۔"

اور دوسرے نے طیش میں کہا۔ "قسم ہے خدا کی اب معاف نہیں ہی اس کا بیٹا میری آنکھوں کی ٹھنڈک کو مجھ سے جدا کر کے لے گیا۔"

دونوں والیان سلطنت جوش میں بھرے ہوئے اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ کوہ طوفان کی طرف بڑھے اور دامن تک پہونچ کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ گالیاں اور کوسنے شروع ہوئے اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے کہ کوہ طوفان کے پرانے قلعوں میں سے کسی نے سر نکال کر صاف اور بلند آواز میں کہا۔

"خبردار! ایک کو مارو گے تو دوسرا بھی مر جائیگا کیونکہ ہم چاروں بیان ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے متحد ہو گئے ہیں ۔۔۔ زندگی ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے بعد تک ۔۔۔ "

امیر پر بڑا اثر ہوا اور نواب نے سوچا اب لڑائی جھگڑا کس کام کا۔ ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں ۔۔۔ اب تو ان جوانوں کا زمانہ ہے جب یہی خوش ہیں تو ہم کیوں ان کی مسرتوں میں مخل ہوں۔ امیر نواب کو دیکھ کر مسکرایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دوستانہ اور آزادی کے عہد و پیمان ہو گئے۔

کسی ابا کانی کپتان نے کہا ۔۔۔ "ان چاروں کو سزا ملنی چاہئے۔"

امیر سمرقند بھی بولا۔ "بڑے گستاخ بچے ہیں۔"
نواب نے کہا "ہاں کس قسم کی سزا دیں۔؟"
امیر نے جواب دیا۔ "ان کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہئے۔"
"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" اباکان کے نواب نے متفق ہو کر کہا۔
"دوہری شادی ہوگی ——— ہو بھی لاؤ گے اور داماد بھی ———"
"ہاں ہاں ——— بڑی خوش قسمتی ہے۔"
کوہ طوفان کے بلند بوسیدہ اور پرانے قلعہ میں سے چار چاند جلوہ افروز ہوئے اور سب لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کر کے ——— ان کو اپنے حلقہ میں لے لیا ——— جیسے ستارے چاند کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔
محمود نے کہنی مار کر کہا۔ "ایک بات تو بتاؤ ——— عورتیں زیادہ عقلمند ہوتی ہیں نا ——"
"اور کیا ——— علی نے عورتوں پر محبت بھری نگاہیں جما کر کہا
"عورتوں میں مردوں سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔"

(ترجمہ) صادق اجمیری بی۔ اے۔

بھر دے میرا پیالہ بابا

جناب اندر جیت صاحب شرما

اک پردیسی ہوں دکھیارا
پھرتا ہوں مارا مارا
جگ میں کوئی نہیں ہے سہارا
کھول گرہ کا تالہ بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

جوگی ہوں میں دان کا پیاسا
بزرگ بھی ہے گیان کا پیاسا
چنچل من ہے دھیان کا پیاسا
کر دے اب متوالا بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

تو داتا ہے تو بھنڈاری
میں ہوں تیرے در کا بھکاری
دین کی سن لے ٹیر مُراری
مرے لبوں پر نالہ بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

تیرے کارن جوگ لیا ہے
بیوگ میں تیرے سوگ لیا ہے
دنیا بھر کا روگ لیا ہے
پڑا جگر میں چھالا بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

امیّد

از حضرت دُعا ڈبائیوی!

زندہ باد اُمید اے روحِ روانِ زندگی
جانِ دل جانِ تمنا بلکہ جانِ زندگی

تیرے دم سے خلق میں قائم ہے شانِ زندگی
ذات تیری وجہ تزئینِ جہانِ زندگی

آدمی کے واسطے اک اک گھڑی دشوار تھی
دم اگر تیرا نہ ہوتا زندگی بیکار تھی

پڑ گئی مُردہ دلوں میں جان تیرے فیض سے
آن تیرے دم قدم سے شان تیرے فیض سے

دل کا مطلب مدعا ارمان تیرے فیض سے
جی رہا ہے ایک اک انسان تیرے فیض سے

نامرادوں کیلئے تیرا اشارہ ہے بہت
ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہے بہت

کم سنوں کے واسطے درسِ عمل ہے تیری بات
قبضۂ قدرت میں ہے تیرے نوجوانوں کی نجات

ہے ضعیفوں کیلئے دم تیرا تسکینِ حیات
تیری ممنون کرم سب خلق ساری کائنات

رونقِ بزمِ جہاں واللہ تیری ذات ہے
تو اگر روپوش ہو جائے تو دن بھی رات ہے

ساری دنیا سارا عالم نام پر تیرے فدا
تجھ میں وہ خوبی ہے کوئی بھی نہیں تجھ سے خفا

نور تیرا ہر جگہ چاروں طرف تیری ضیا
بزمِ ہستی کو بنا رکھا ہے تو نے خوشنما

سحر یہ تیرا ہی ہے تیرا ہی یہ اعجاز ہے
جس کا کوئی بھی نہیں دنیا میں تو دمساز ہے

جوشِ ہمت اور دونا کر دیا امید نے
دل میں استقلال پیدا کر دیا امید نے

شمعِ بزمِ زندگی تیرے سبب پُرضیا
ذکر تیرا دل پسند و دلفریب و دلربا

خلق میں رکھا ہی کیا تھا یاس و حرماں کے سوا
تجھ سے پایا زیست کا ہر مرنے والے نے مزا

فکر سے آغاز کا انجام ہو سکتا نہیں
جب نہ ہو امید کوئی کام ہو سکتا نہیں

تو نہ ہوتی خلق میں تو لطف جینے کا تھا کیا
آدمی کے واسطے اک ایک پل دشوار تھا

کوئی فریاد و فغاں کرتا کوئی سر پھوڑتا
جیتے جی ہی موت کا آتا مزا ملتی سزا

دل لگا کر سیکڑوں مایوسِ الفت بچ گئے
مرنے والے تھے مگر تیری بدولت بچ گئے

اے دعاؔ امید ہے دراصل وجہ زندگی
اس سے اطمینانِ دل ہے اس سے طبیعت کو خوشی

رنج میں بھی شاد رکھتی ہے طبیعت ہر گھڑی
اس کے ہوتے آدمی گھبرا نہیں سکتا کبھی

عالمِ امکاں کو اس کے دم سے قائم شان ہے
یہ بشر کی زندگی یہ آدمی کی جان ہے

ڈالدی ہر فلک جس پر نظر امید نے
خانۂ دل میں بنایا اس کے گھر امید نے

اپنی حکمت سے دکھایا وہ اثر امید نے
کر دیئے نخلِ تمنا بارور امید نے

کچھ بھی ناکامئ قسمت کا خیال آتا نہیں
دم لبوں پہ ہے مگر انسان گھبراتا نہیں

رہنے سہنے کا سہارا کر دیا امید نے
واقعی دنیا کو دنیا کر دیا امید نے

ہے اسی کے دم سے عالم میں نشاطِ زندگی
درحقیقت ہے یہی زیبِ بساطِ زندگی

ابو مسلم خراسانی

خلافت عباسیہ کا ایک خونی ورق

مولٰنا شہید تھانوی

ابو مسلم تاریخ اسلام میں ہمیشہ عمدہ الفاظ سے یاد کیا جائیگا اور اگر کبھی اسلامی بہادروں کی فہرست مرتب کی گئی تو اس کے نام کو نمایاں طور پر جگہ دی جائیگی۔ وہ نہایت جری۔ بہادر عقلمند چالاک۔ بارعب۔ صاف گو۔ بیباک۔ جرنیل تھا۔ علوم متداولہ میں بھی اس کو کافی مہارت تھی۔ ابراہیم امام (جن کا تذکرہ بعد میں آئیگا) نے اس کو نہایت معقول تعلیم دی تھی۔ وہ علم حدیث کا ایک بلند پایہ عالم تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ جاں نثار اور وفادار بہادر بھی۔ خلافت عباسیہ کو قائم کرنا نہ صرف قائم کرنا بلکہ ہر طرح سے مستحکم کرنا اور اس کو خطرات سے ہمیشہ کیلئے نجات دلا دینا اسی کے دست وبازو کا کام تھا اس نے اول خراسان فتح کیا اور پھر لڑتا بھڑتا کوفہ تک جا پہونچا اور وہاں پہونچکر ابوالعباس سفاح کی خلافت کا اعلان کر دیا اور مخالف عنصر بنی امیہ کی سلطنت کا خاتمہ کرکے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالدی۔ خلافت عباسیہ ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی اس کے ان احسان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اولاد کو ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ وہ اپنی سلطنت قائم کریں چنانچہ مخفی طور پر ان کی یہ کوششیں آخر تک جاری رہیں محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد علوئین کے سردار ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ قرار پائے۔ وہ کسی ضرورت سے ہشام بن عبدالملک (خلیفہ اموی) کے پاس شام تشریف لے گئے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں قدیم الایام سے عداوت چلی آتی تھی۔ ہشام بن عبدالملک نے بظاہر بہت کچھ آؤ بھگت کی مگر دل ہی دل میں ان کی لیاقت وقابلیت سے بہت خائف ہوا۔ چنانچہ جب یہ مدینہ منورہ واپس ہوئے تو ہشام نے کسی شخص کے ذریعہ سے ان کو دودھ میں زہر دلوا کر مروا دیا۔

جب انھیں اپنی موت کا یقین ہوگیا تو قدیم تعلقات کی بنا پر آپنے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو اپنا جانشین بنا دیا۔ چنانچہ جس قدر شیعہ ابو ہاشم کے ساتھ تھے ان سب نے محمد بن علی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یہیں سے خلافت عباسیہ کی بنیاد پڑنا شروع ہوتی ہے۔

کچھ روز خفیہ طور پر کوشش کرتے ہوئے انھوں نے بھی انتقال فرمایا۔ تو ان کے بڑے صاحبزادے ابراہیم نے اس خدمت کو ہاتھ میں لیا اور پہلے کی بہ نسبت نہایت خوش اسلوبی اور کافی سرگرمی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ ان لوگوں کی تمام تر کوششیں صوبہ خراساں کی طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اہل حجاز تو بہت تھوڑی مقدار میں تھے۔ اور اہل کوفہ اور اہل بصرہ کی قدیم بیوفائیوں اور غداریوں کی وجہ سے ان پر اطمینان نہ تھا اور اہل مصر واہل شام کے دلوں میں بنو امیہ کی محبت اس قدر رچی ہوئی تھی کہ ان سے کوئی امید ہی نہ ہوسکتی تھی۔ لے دے کر خراسان ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ان لوگوں کو اپنی کامیابی کی امید ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ابراہیم امام نے اپنے داعی زیادہ تر خراسان کی سرزمین میں پھیلا دیئے جو خفیہ طور پر لوگوں کو اس کے لئے تیار کرتے رہے۔

مروان ثانی (آخری خلیفہ بنی امیہ) کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے فوراً ابراہیم امام کو گرفتار کرکے حران کے محبس میں قید کردیا۔ چنانچہ وہ اسی قید میں انتقال فرما گئے مگر ابراہیم کبھی نہ فرو ہونے والی ایسی آگ لگا گئے تھے کہ ان کی موت نے اس پر ادرمٹی کے تیل کا کام دیا۔ وہ اپنے بعد ابومسلم جیسا شخص چھوڑ گئے تھے اس لئے ان کی وفات بھی کچھ زیادہ مفید نہ ہوئی۔ ابراہیم امام نے اپنے گرفتار ہونے سے کچھ پہلے داعیوں کے زمرہ میں ابومسلم خراسانی کو بھی خراسان بھیجا

تھا۔ چنانچہ اس نے بہت سرگرمی سے اس معاملہ میں حصہ لیا اور خراسان میں اپنا وطن ہونے کی وجہ سے اور بھی اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

ابراہیم امام کے انتقال پر ان کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں بالآخر ایک روز موقع دیکھ کر ابومسلم خراسانی نے خلافت عباسیہ کا اعلان کر دیا۔ اور اپنی فوج کو لے کر نصر بن سیار والی خراسان سے مقابلہ کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ نصر بن سیار کے پاس فوجی قوت نہایت کمزور تھی اس نے شکست کھائی اور اس طرح خراسان پر ابومسلم کا قبضہ ہو گیا۔

ابومسلم کی اصل مورخین نے اس بارہ میں بہت سے متعارض اقوال نقل کئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بزرجمہر کی اولاد سے ہے۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں پرورش پائی جوان ہونے پر ابراہیم امام کے ساتھ مل گیا۔ دوسرے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ غلام تھا۔ ابراہیم امام نے جب دیکھا تو قیافہ سے اس کی بہادری اور شرافت معلوم کر کے جوہر قابل سمجھ کر فوراً خرید لیا۔ کچھ روز تک اپنے پاس رکھ کر نہایت معقول تعلیم دی پھر دعوت خلافت عباسیہ کے کام پر مامور فرما کر خراسان بھیج دیا۔

مگر ابومسلم کا خود اپنا یہ دعویٰ ہے کہ میں سلیط[1] بن عبداللہ بن عباس کی اولاد سے ہوں۔ بنو عباس بھی اس کی خدمات اور بہادریوں کو دیکھ کر اس کے اس دعوی پر خاموش ہو رہے مگر عامۂ مورخین اس کے اس دعوی کی تکذیب کرتے ہیں۔

ابومسلم نے جب خراسان کو فتح کیا تو ابراہیم امام کے دونوں چھوٹے بھائی ابوالعباس سفاح اور ابوجعفر منصور مروان ثانی خلیفۂ اموی کے خوف سے کوفہ میں ابوسلمہ[2] خلال کے مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ ابومسلم نے یہ معلوم کر کے کوفہ کی طرف پیشقدمی شروع کی اور کوفہ کو فتح کر کے سفاح کو خلیفہ بنا دیا۔ چنانچہ اسی روز کوفہ کی جامع مسجد میں ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۹ء کو سفاح کے ہاتھ پر عام بیعت لی گئی۔ آہستہ آہستہ تمام عالم اسلامی پر عباسیین کا قبضہ ہو گیا اور مروان ثانی خلافت سے بے سروسامانی کے ساتھ جمادی الثانیہ ۱۳۲ھ مطابق جنوری ۷۵۰ء میں مصر کے ایک گاؤں بوصیر میں قتل کر دیا گیا۔

سفاح ابومسلم کا بہت احترام کرتا تھا کیونکہ سلطنت عباسیہ کی بنیاد اسی کے ہاتھوں پر ہوئی تھی۔ مگر ابوجعفر منصور اس کی صاف گوئی اور بیباکی سے بہت نالاں تھا۔ اس نے بارہا سفاح سے کہا کہ آپ ابومسلم کو قتل کیوں نہیں کر دیتے۔ جب تک یہ زندہ رہیگا اس وقت تک سلطنت اسی کی ہوگی اور ہم اس کے غلام ہونگے مگر سفاح نے ہمیشہ یہ کہہ کر منصور کو جھڑک دیا کہ ایسے وفادار اور بہادر شخص کو قتل کر دینا کھلی ہوئی احسان فراموشی ہے چنانچہ سفاح کے زمانہ میں ابومسلم کا اقتدار روز بروز بڑھتا رہا جو منصور کو کبھی ایک آنکھ نہ بھایا۔

بالآخر سفاح نے چار سال خلافت کر کے انتقال کیا اور ۱۳۶ھ میں منصور تخت خلافت پر بیٹھا۔ اسے تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن عباس جو اس وقت شام میں تھا اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ منصور بہت گھبرایا اور ابومسلم سے مشورہ کیا۔ ابومسلم نے کہا اگر آپ فرمائیں تو میں کمر کو پٹکا باندھ کر آپ کی خدمت کروں اور اگر آپ فرمائیں تو میں خود خراسان جاؤں اور وہاں سے فوج لیکر آپ کی امداد کروں اور اگر آپ فرمائیں تو میں خود عبداللہ بن علی سے لڑنے کے لئے نکلوں۔ جیسے ارشاد ہو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ منصور نے اس سے یہی درخواست کی کہ آپ خود عبداللہ بن علی سے مقابلہ کے لئے تشریف لے جائیں۔

چنانچہ ابومسلم خراسانی ایک بڑے لشکر کے ساتھ عبداللہ بن علی سے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔ ایک زمانہ تک دونوں میں معرکہ آرائی ہوتی رہی بالآخر عبداللہ بن علی شکست کھا کر اپنے بھائی سلیمان بن علی کے پاس بھاگ آیا۔ اس طرح ابومسلم کے ہاتھوں اس خوفناک بغاوت کا استیصال ہوا۔ اس جنگ میں ابومسلم کو بہت کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ منصور نے اس خوف سے کہ کہیں ابومسلم تمام مال فوج پر تقسیم نہ کر دے اپنے کچھ آدمی بھیجدیئے کہ وہ جاکر تمام مال غنیمت کو اپنی حفاظت میں لے لیں یہ بات ابومسلم کو بہت ناگوار ہوئی اور اسی طیش میں آکر منصور کو بہت سخت و سست کہا۔ جاسوسوں نے اس تمام گفتگو کی منصور کو

۱؎ اس سلیط کا قصہ بہت لمبا چوڑا ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک باندی کا لڑکا ہے جس نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کر لیا تھا اسی سے یہ سلیط پیدا ہوا۔ بعد میں باندی نے اس کو عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب کر دیا حضرت عبداللہ نے اس سے انکار کیا اور اس سے ہمیشہ نفرت کرتے رہے مگر ان کی وفات پر قاضی شہر نے سلیط کے موافق فیصلہ دیا اور اس کو وارث قرار دیا۔

۲؎ جو آئندہ چل کر سفاح کا وزیر ہوا اور پھر اسی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اطلاع دی ۔ منصور پہلے ہی ابومسلم کی طرف سے بھرا ہوا تھا اب تو اور بھی آگ بگولہ ہوگیا فوراً طلبی کا خط لکھا کہ تم بہت جلد میرے پاس بغداد پہونچو ۔ ابومسلم جو نہایت ہی مدبر اور ہوشیار جرنیل تھا فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو اس طلبی کا انجام میرا قتل ہوگا ۔ چنانچہ اس نے کھلم کھلا انکار کردیا اور صاف لکھدیا کہ میں اس وقت خراسان جارہا ہوں وہاں کچھ روز رہکر دیکھتا ہوں اگر تم نے اپنے رویہ کو بدل دیا تو پھر میں تمھاری فرماں برداری کرونگا ۔ ورنہ جو میرے لئے مناسب ہوگا وہ کروں گا ۔

منصور اب تو بہت پریشان ہوا اور اس کو ایک سخت خطرہ لاحق ہوگیا ۔ کیونکہ یہ اسے بھی معلوم تھا کہ عالم اسلامی اور خصوصاً خراسان میں ابومسلم کا کس قدر اثر و اقتدار ہے ۔ خاص خاص لوگوں سے مشورہ کرکے پھر ایک بہت ہی نرم خط لکھا کہ تمھیں میری نسبت ایسا خیال نہ کرنا چاہیئے ۔ تم نے جو کچھ ہماری سلطنت کی بناء اور پھر اس کے استحکام میں خدمات انجام دی ہیں وہ خود اس کی بہت بڑی ضامن ہیں کہ ہماری طرف سے تمھیں کوئی گزند نہیں پہونچ سکتا ، نیز امرائے قریش سے بھی اس قسم کے خطوط لکھوائے اور ایک عقلمند شخص کے ہاتھ روانہ کردیئے اور چلتے ہوئے یہ بھی کہدیا کہ اگر ابومسلم کسی طرح بھی آنے پر راضی نہ ہو تو اس سے کہدینا کہ اگر تو نہ آیا تو پھر تو بنو عباس میں سے نہیں اور اگر تو خراسان چلا گیا اور مجھ سے مقابلہ کرنے کے لئے میں خود نہ آیا تو میرا نام بھی منصور نہیں ۔

ابومسلم کے پاس جب یہ خطوط پہونچے تو اس نے اپنے ایک خاص دوست مالک بن الہیثم سے مشورہ کیا ۔ مالک بن الہیثم نے بھی یہی کہا کہ اگر آپ اس وقت منصور کے پاس چلے گئے تو وہ آپ کو فوراً قتل کردیگا ۔ چنانچہ ابومسلم نے پھر وہی جواب دیا کہ میں اس وقت بغداد نہیں آسکتا اب میں خراسان جارہا ہوں ۔ وہاں جاکر غور کرونگا ۔

جب قاصد ہر طرف سے ناامید ہوگیا تو پھر منصور کا آخری پیغام بھی پہونچا دیا جسے سُنکر ابومسلم نے سر جھکا لیا اور بہت دیر تک غور کرنے کے بعد چلنے پر تیار ہوگیا ۔ اور اپنا تمام لشکر ایک دوست کے حوالے کرکے یہ کہہ کر روانہ ہوگیا کہ اگر تمھارے پاس میرا کوئی خط آئے جس پر میری نصف مُہر لگی ہوئی ہو تو سمجھنا کہ میں زندہ ہوں اور اگر پوری مہر لگی ہوئی ہو تو سمجھ لینا کہ خط جعلی ہے اور میں قتل کردیا گیا ۔

منصور اس وقت مدائن میں ٹھہرا ہوا تھا جب ابومسلم کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے تمام بڑے بڑے لوگوں کو استقبال کیلئے بھیجا چنانچہ نہایت پرتپاک اور شایان شان استقبال کیا گیا اور جب ابومسلم منصور کے پاس پہونچا تو اس نے خود بھی ابومسلم کا بہت اکرام کیا اور اپنے قریب بلاکر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا ۔ سفر کے متعلق کچھ باتیں کیں اور پھر آرام کرنے کیلئے اجازت دیکر رخصت کردیا ۔ ابومسلم اس حد سے بڑھی ہوئی تعظیم و تکریم کو دیکھ کر مطمئن ہوگیا کہ جیسا کہ میرا خیال تھا منصور مجھ سے زیادہ ناراض نہیں ۔

ابومسلم کا خوفناک انجام

جب منصور نے ابومسلم کو بھی طرح شیشہ میں اتار لیا تو اگلے روز صبح ہی سے منصور نے اپنے دربار میں یہ انتظام کیا کہ پردوں کے پیچھے چند بہادر سپاہیوں کو چھپا دیا اور کہدیا کہ جب تین تالی بجاؤں فوراً پردوں سے نکل کر ابومسلم کو مار ڈالنا ۔ یہ انتظام کرکے اس نے ابومسلم کو بلایا ۔ ابومسلم ایک ہاتھ میں تلوار لئے مسلح دربار میں پہونچا ۔ منصور نے مزاج پرسی وغیرہ کرنے کے بعد سامنے بیٹھنے کی اجازت دی اور پھر دریافت کیا کہ سُنا ہے کہ اس جنگ میں تمھیں عبداللہ بن علی کی دو عمدہ تلواریں بھی ہاتھ آئی ہیں ابومسلم نے سادگی سے اپنی تلوار منصور کے ہاتھ میں پکڑا دی کہ ہاں ان میں سے ایک تو یہ ہے ۔ ابومسلم کی یہ سب سے بڑی اور خوفناک غلطی تھی ۔ منصور نے اسے لیکر اپنے مصلے کے نیچے رکھ لی اور پھر اس کی ایک ایک کرکے تمام خطائیں گنانا شروع کیں اور اس کو خوب ڈانٹا اس پر ابومسلم نے طیش کھاکر جواب دیا ۔

ابومسلم امیر المومنین مجھ جیسے شخص سے اس طرح گفتگو نہیں کیجاتی اور میری ان خدمات کے بعد جو میں کرچکا ہوں یہ باتیں خطاؤں میں شمار نہیں ہوسکتیں ۔

منصور تو نے خدمات کیں بخدا اگر تیری جگہ کوئی حبشی باندی ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی اور کیا تو جو اس مرتبے پر پہونچ گیا ہے وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کی وجہ ہی سے نہیں پہونچا

ابومسلم بس جانے دیجئے ، میں خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتا ۔

منصور نے تالی بجائی اور چاروں طرف سے سپاہیوں نے ابومسلم پر پلہ بولدیا ۔ آخر میں ابومسلم نے چلاکر کہا ۔ " امیر المومنین مجھے کم از کم اپنے دشمنوں ہی کیلئے باقی رکھ لیجئے " ۔ منصور نے اس کا بڑی سرد مہری سے جواب دیا اور کہا ۔ " کیا میرا تجھ سے بڑا بھی کوئی دشمن ہے " ۔ اس طرح اس باوقار جرنیل کا خاتمہ کردیا گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سلا دیا گیا ۔ تاریخ اس کے اس خونیں انجام کو ہمیشہ دہراتی رہیگی ۔

شہید ۔ تھانوی

تعمیرِ حیات!

نشۂ ان مستی بھری آنکھوں کا ہی آنا مجھے — دل نظر آتا ہے اپنا ساغرِ صہبا مجھے

ایک خوش آیند امید اک سکوں ہوتا مجھے — اُن کے وعدہ پر یقیں اے کاش آجاتا مجھے

عالمِ دل میں ہے برپا انقلابِ کیفیات — تم نے کیوں آخر نگاہِ لطف سے دیکھا مجھے

اپنے بیگانے ہوئے دنیا نے دیوانہ کہا — آپ نے لیکن نہ بھولے سے کبھی پوچھا مجھے

وہ جفا دشمن سہی لیکن یہ ان سے پوچھیے — کیوں وفا کے نام سے برباد کر ڈالا مجھے

اپنے اندازِ تغافل ہی کو یہ الزام دو — مجھ سے کیوں شکوہ ہے تو نے کر دیا رسوا مجھے

کائناتِ عقل و دیں کا ذرّہ ذرّہ لٹ گیا — کفر پروردہ نظر سے کس نے یہ دیکھا مجھے

امتحانِ عزمِ جانبازی اگر منظور ہے — امتحاں کیجے، بنا لیجے مگر اپنا مجھے

حسنِ رنگیں کا تصوّر ہو نشاطِ زندگی — یا الٰہی ایسی پھر مل جائے اک دنیا مجھے

عشق کی ناکامیاں کرتی ہیں تعمیرِ حیات
آپ نے جو کچھ کیا اس کا نہیں شکوہ مجھے

صہبائی، بی۔ اے (آنرز)

عالمگیر ماہ نومبر ۱۹۳۵ء
۲۹
خاص نمبر ۱۹۳۶ء
عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۶ء اپنی ہنگامہ پرور خصوصیات کے ساتھ دسمبر ۱۹۳۵ء میں
بڑے سائز پر شائع ہو رہا ہے ہم اس خاص نمبر پر کم و بیش
Rs 6000
کی خطیر و کثیر رقم صرف کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سال کے خاص نمبر پر اتنی بڑی رقم
صرف ہوگی، وہ اپنی دلاویزیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے اعتبار سے بے مثل و لاجواب ہوگا۔
عدیم النظیر تصاویر، گرانمایہ مضامین، بے حد دلکش افسانوں،
اساتذہ کرام کے بہترین کلام، کا یہ باصرہ نواز مجموعہ بلاشبہ اپنی نظیر آپ ہوگا،
جو حضرات
عالمگیر کے خریدار نہیں وہ اس معرکہ آرا اور قابل دید خاص نمبر کو
بالکل مفت!
حاصل کرنیکے لئے آج ہی ایک سال کیواسطے عالمگیر کی خریداری قبول فرمالیں، اس صورت
میں جون ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی مفت ملیگا
سالانہ قیمت صرف
چار روپے چار آنے
علاوہ
محصولڈاک
نیازمند منیجر عالمگیر لاہور!
عالمگیر بارہ تیرہ سال سے جاری ہے اور ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو خاص نمبر ایک دسمبر میں اور ایک جون میں بالکل مفت پیش کرتا ہے۔

پہچان

از جناب مولانا امیر اللہ صاحب آسی - رام نگری

خدا نہ کرے کوئی چیز ٹوٹے۔ دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی ہے۔ ستارے ٹیک چینی کے پیالے تک کے ٹوٹنے میں ایک بار انسان کا دل سہم اٹھتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ہم پکار اٹھتے ہیں۔ "کس کا اعتبار ـــــ کس کا بھروسہ؟"

ہاں! ٹوٹنا صرف دکھ کا ہے۔ عجیب ہیں وہ لوگ جو ہنستے ہیں اور ہنسنے کے بعد ہی اپنے دل کو آنسوؤں سے شرابور نہیں پاتے۔ پھوڑوں کی طرح پکے۔ شیس بھرے آموں کی بیمار ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی۔ بن کی مایوس جوگن کی درد بھری چیخ کو کوئل کی کوک کہنے والے اور صدیوں کے ٹوٹے ہوئے دل کو گلاب سمجھنے والے کیسے انسان ہیں بدھاتا؟ ـــــ کیا انہیں بھی تمہیں نے بنایا ہے؟

ستیش کو اب معلوم ہونے لگا کہ رات کا رنگ سیاہ کیوں ہے؟ ستارے بھیڑیے کی آنکھوں کی طرح کیوں چمکتے ہیں؟ اور گھر کا ٹمٹماتا دیا اتنی سیاہی کیوں اگلتا ہے؟ اس کا سوچ اس طرح ڈوبا جیسے سینے میں کٹار بیٹھ جاتی ہے۔ خون کی دھار بہہ نکلی اور موت کی سی گہری تاریکی چھا گئی۔ ستیش کراہ اٹھا۔ اب کیا رہا؟ اب تو سبھی کچھ کھو گیا۔

ستیش ابھی تک اپنی پریم کی بنسی بجا رہا تھا اور اس کی کملا سُر میں سر ملا کر کوک رہی تھی ـــــ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں محو تھے۔ سرشار تھے ـــ شادی کی گفتگو سن کر ان کی آنکھوں نے اپنی خاموش زبان سے تبادلہ پیغام کیا تو ان کے دل دوڑ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے ـــ ستیش مسکرا رہا تھا اور کملا لال کلی سی لجا کر کچھ اور ہو جاتی تھی ـــــ یہ دونوں حسن سنہرے دنوں کے خواب دیکھ رہے تھے انہیں جلد ہی آنے میں کیسے شک تھا۔

ستیش اور کملا کے والدین میں ان دونوں کی شادی کی بات طے ہو گئی تھی اور کملا کے باپ یہ موقع برابر دیتے تھے کہ ستیش کملا کو دیکھ سکے اور کبھی کبھی بات چیت کر سکے لیکن کملا کے باپ نے اونچ کھایا تھا۔ وہ دنیا میں رہتے تھے اور جانتے تھے کہ اس اونچی نیچی زمین پر کس طرح چلنا چاہئے۔ ستیش کافی پڑھا اور ذہین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی طرف ذرا متوجہ ہوئے تھے لیکن ہونہار ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ـــــ بھروسہ ہو نہ ہو اور پھر ستیش ذرا غریب تھا اس کے باپ پہلے سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے لیکن اب صرف سوا سو ملتے تھے اس لئے کملا کے باپ کو کوئی ایسی چاہ بھی نہ تھی۔ لیکن بڑھاپے میں بکھیڑے جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ستیش سامنے پڑا اور فی الحال اس سے اچھا لڑکا ملنا مشکل بھی تھا اس لئے انہوں نے دو سال پہلے ہی سے ستیش کو ریزرو کر لینا مناسب سمجھا اور باتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس موہنی سے بھی کام لیا جسے "ولایت" کہتے ہیں اور جو لڑکی والوں کا زبردست حربہ ہے۔ ستیش ان کی کملا کا ستیش ولایت جائیگا۔

لیکن کملا کے باپ بیوقوف نہ تھے۔ وہ ہزاروں کو پڑھا چکے تھے۔ سونے کا کنگن دکھا کر پیتل کا کنگن کس طرح تھما دیا جاتا ہے؟ وہ خوب جانتے تھے۔ انہوں نے صرف ولایت ہی کی موہنی کا بھروسہ نہیں کیا بلکہ دنیاوی دوراندیشی اور نفسیات سے بھی کام لیا انہوں نے دیکھا کہ ستیش کملا کی طرف مائل ہے تو دروازہ اور بھی کھول دیا اور خود اونگھنے کا بہانہ کر کے ستیش کے سہارے ڈھلک رہے۔ محبت سے بڑا بندھن اور شادی کے خیال کو مستحکم بنانے والی اس سے زیادہ مضبوط اور کوئی چیز نہیں۔ یہ نکتہ ان کے سفید بال بھول نہ گئے تھے۔ اگر ستیش کملا کے دام محبت میں پوری طرح اسیر ہو جائے تو سارا کھیل بن جائے

ولایت کی بات تو بات تھی۔ اس وقت دل میں حوصلہ تھا اور کچھ ایسا تھا کہ ایشور چاہتا تو پورا بھی ہو جاتا لیکن اب تو ...... کیا کہیں ایسے دن آگئے ہیں کہ کچھ کہا نہیں چلتا۔ ورنہ ولایت بھیجنا کون سی بڑی بات تھی۔ رہی لڑکی۔ سو آپ کی ہے اور آپ کے سامنے ہے۔

کملا کے باپ نے یہ سب پہلے ہی سوچ لیا تھا ــــ بعد میں تو سب کچھ انہیں کے ہاتھ میں ہوگا ــــ لڑکی کو ایک دھوتی پہنا کر رخصت کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہوگا۔

ڈیڑھ سال گذر گئے کملا کے باپ جال بن رہے تھے اور ستیش ٹہنی پر بیٹھا چہک رہا تھا۔ اس کے لئے کئی جگہ سے آدمی آئے لیکن اس نے سب کے جواب میں "نہیں" کہہ دیا۔ ایک سے ایک حسین۔ سگھڑ۔ پڑھی لکھی اور امیر گھر کی لڑکیوں کے لگن آئے لیکن ستیش کسی پر رضا مند نہ ہوا اس کی کملا کے آگے سب ہیچ تھیں چاتک کو آج سواتی سے بھری ہوئی کٹوری ملی تھی اس کے سامنے سورگ کی گنگا کا جل بھی کوئی قیمت نہ رکھتا تھا۔ پریم کی بنسی کی وہ بھری تان میں ستیش محو ہو رہا تھا اور کملا سراپا تان بنی ناچ رہی تھی لیکن رسیلی راگنی کی تکمیل کو پہونچتے پہونچتے یکایک ستار کے تار ٹوٹ گئے۔

ستیش کے ایم۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد جب شادی کے دن آئے تو کملا کے باپ نے ایسا ڈھنگ بدلا اور کچھ اس طرح پیش آئے کہ ستیش کے دل کو سخت صدمہ پہونچا۔ کملا کے باپ نے دیکھا کہ اب ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے ستیش پچیسوں جگہ کے لئے انکار کر چکا ہے اب تو اس کے لئے کملا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن وہ جو چاہتے تھے وہ نہ ہوا ستیش نے جس موتی کیلئے کتنے ہیرے تیاگ دیئے تھے جب اُسے وہ موتی بھی بآسانی نہ مل سکا تو وہ کراہ اٹھا۔ لیکن اس نے طے کر لیا کہ خودداری کا خون نہ ہونے دیگا۔

اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ دنیا سے انسانیت فنا ہو گئی تھی ــــ رشک و حسد بغض و کینہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ستیش نے غم اور غصہ سے آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن انسان کے اختیار میں ہے ہی کیا؟ ــــ ہم اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتے؟ اس فانی دنیا میں خود درد دکسک ہی کتنی مدت تک زندہ رہ سکتی ہے؟ ــــ ہم درد کا بھی تو پورا مزہ نہیں اٹھانے پاتے اور جس زخم کو ہم تازہ رکھنا چاہتے ہیں ــــ وہ ہمارے علم کے بغیر ہی مندمل ہو جاتا ہے

ستیش اب بھی زندہ تھا وہ کھاتا۔ پیتا۔ باتیں کرتا اور دوستوں میں ہنستا بھی تھا لیکن سچ بات تو یہ تھی کہ اس کا دل مُردہ ہو گیا تھا۔ اسے نہ تو کوئی خواہش رہ گئی تھی نہ تمنا۔ اس کا دل آرزوں اور امنگوں سے یکسر خالی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بازو ہیں اور چاہے تو اڑ بھی سکتا ہے لیکن ان بازوؤں کو ہلانے کے لئے اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا۔ پی۔ سی۔ ایس یعنی ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں کامیاب ہونا اس کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن اس نے اپنی بے دلی سے امتحان میں پرچے خراب کر دیئے۔ وہ جیتا تھا تو صرف اس لئے کہ وہ کملا کو بھول نہ سکتا تھا۔ کملا اب بھی اس کے دل میں بس رہی تھی۔ جب کبھی کملا کی مہراجن سے سن پاتا کہ کملا دیوی آج کل بہت اداس رہتی ہیں اور دبلی ہوتی جاتی ہیں تو اس کا دل تڑپ اٹھتا۔

کیا اب وہ زندگی میں کچھ کر سکیگا ــــ؟ اس کی طرح بد قسمت کون ہوگا ستیش کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف خلا اور اوپر کھلا آسمان تھا۔ اسے دنیا کی ساری چیزیں بدصورت اور بے حقیقت نظر آتی تھیں، وہ اب کسی اور سے شادی کریگا۔ یہ تو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا اس کی آنکھوں میں کملا کے روپ کے سوا کسی دوسرے کی چھبی کے لئے جگہ بھی تو نہ تھی وہ اکثر رات بھر پڑا سوچا کرتا اور ــــ کملا کی یاد میں آنسو بہایا کرتا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ سب فضول اور صرف دل کی کمزوری ہے لیکن انسانی دل کی کمزوری کا آخر کیا علاج ہے۔؟ ستیش کوئی رشی تو تھا نہیں آدمی ہی تھا۔ جب دنیا کی مضبوط بنیاد دہل جاتی ہے تو بھلا آنسوؤں سے بھیگے ہوئے انسان کے کمزور دل کا کیا پوچھنا۔؟ لیکن ستیش اس وقت بھول سا گیا تھا کہ انسان انسان تو ہے اور جتنی آسانی سے یہ غلطی کر سکتا ہے اتنی آسانی سے چنبیلی کی کلی بھی نہیں توڑ سکتا۔ وہ بھول گیا تھا کہ ہم اکثر کتنی سچائی سے اپنے کو دھوکہ دیتے ہیں۔ خون کے روکھے پن کو محبت کی گرمی ــــ بدصورتی کو خوبصورتی اور خیال آرائی کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چار مہینے کے بعد ستیش کو معلوم ہوا کہ کملا کے علاوہ دنیا میں اور بھی عورتیں ہیں اور کہیں بڑھ چڑھ کر لیکن کچھ دنوں تک تو ستیش کا علم و احساس سوتا ہی رہا۔

اسے جب ایک شخص دیکھنے کے لئے آئے تو اسے بالکل اچھا نہ معلوم ہوا

اس وقت ستیش کو شادی ایک تماشہ معلوم ہوتی تھی۔ اپنی تمناؤں اور امیدوں کی قبر پر گنبد کھڑا کرنا تماشہ نہیں تو اور کیا ہے۔؟

ستیش رضامند نہ ہوتا تھا لیکن بوڑھے باپ کے شدید اصرار پر اسے انکار کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ لڑکی کے باپ بڑے دولتمند تھے اور اپنی سب سے چھوٹی اور آخری بیٹی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔

ستیش کے باپ نے دیکھا کہ ہر نقطہ نظر سے بشتہ بہترین ہے لڑکی کا خاندان تعلیم یافتہ اور مہذب تھا اور خود لڑکی الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔اے میں پڑھتی تھی۔ لڑکی کے باپ لڑکی کو دکھانے کے لئے بھی رضامند تھے۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر ستیش کو اپنے باپ کی مرضی کے خلاف ناکام بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہوئی ——— لیکن درحقیقت اس کا دل شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

جب وہ لڑکی دیکھنے کے لئے الہ آباد گیا تو اس بے دلی سے کہ نہ تو اس نے اپنے کپڑوں کا خیال رکھا اور نہ کسی طرح کی آرائش و زیبائش کی۔ اور جب وہاں سے واپس آیا تو اترا ہوا منہ لے کر۔ اسے لڑکی بالکل پسند نہ آئی کملا کی چنچل چھبی کے سامنے ودیا کا سادہ روپ اسے ایک آنکھ نہ بھایا اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ اس سادہ حسن کے پردہ میں انمول موتی سادہ نسوانی دل پوشیدہ ہے جو اپنی شیرینی سے زندگی کو امرت بنا سکتا ہے۔

جتنی باتوں کا پتہ لگ سکا ان سے یہی ثابت ہوا کہ لڑکی بے حد سلیقہ مند اور ایک حد تک خوبصورت بھی ہے۔ لیکن ستیش کے دل میں کوئی بات اترتی ہی نہ تھی۔ ستیش کے باپ بیٹے کی شادی کرنے کے شوق میں بے چین ہو رہے تھے ستیش پچھلے آٹھ سالوں سے اینی سی کرتا آ رہا تھا۔ لیکن سگھڑ اور مالامال لڑکی مل جانے کی وجہ سے اسے باپ کے اصرار پر شادی کے لئے "ہاں" کہنا ہی پڑا۔

لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جاتے تھے اس کا [illegible] بڑھتا جاتا تھا۔ اسے کملا کے ساتھ بیتے ہوئے سکھی دن یاد آتے تھے۔ ماضی کی رنگین یاد حال کی ساری رنگ رلیوں کو بے کیف بنا دیتی۔ کملا کی چنچل اٹکھیلیاں ستیش کو نہ بھولتیں اس دن جاتے جاتے گیندے کا پھول توڑنے کے بدلے کملا نے مسکرا کر دیکھا تھا اور پھول توڑ کر اسے مارا بھی تھا۔ لیکن ماضی کی یاد اور سنہری خیالات کی طلسم سے ستیش آزاد نہ ہو سکتا تھا

اس کا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا وہ اپنے دوست سروج کے پاس پہنچا اس نے دیکھا ستیش کی آنکھیں سرخ اور بھری ہوئی ہیں چہرے سے رنج و غم اور مایوسی کے جذبات نمایاں ہیں ستیش نے جاتے ہی کہا "سروج میں تو لکھنے جا رہا ہوں کہ میں شادی نہ کروں گا"

سروج چونک پڑا ——" کیوں ایسی کیا بات ہو گئی ———؟"

ستیش نے کہا۔" سروج! بھلا ایسی شادی سے کیا فائدہ؟ میرا تو جی نہیں چاہتا اور پھر تم نے بھی تو تصویر دیکھی ہے کہو نا کیسی ہے۔۔۔؟"

سروج نے کہا" ستیش تم تو ناول کے منچلے نوجوانوں کی سی باتیں کرتے ہو جب تمام باتیں طے ہو گئیں اور سب جگہ شادی کا نویدہ بھیج دیا گیا تو اب تم چلے ہو انکار کرنے تمہیں کچھ اپنی اور غریب لڑکی کی بدنامی کا بھی خیال ہے؟ اور پھر تم اس کی ناک اور ٹھوڑی تو دیکھتے ہو لیکن اس کی ہزاروں خوبیوں کی طرف سے کیوں آنکھیں بند کر لیتے ہو کیا تم نے وہ خط نہیں دیکھا جس میں ودیا نے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ اگر وہ اس کی شادی ایسے شخص سے بھی کر دیں گے جو صرف پانچ روپیہ ماہوار پاتا ہو تو بھی وہ اس کے ساتھ سکھی رہے گی جس کے ایسے خیالات ہوں ایسی لڑکی کہاں بکتی پھرتی ہے۔ ستیش سبھا کی پریوں اور گھر کی بیویوں میں بڑا فرق ہوتا ہے میں تو کہوں گا کہ اب فضول خیالات کو اپنے دل سے نکال دو"

ستیش چپ ہو گیا۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا دل مطمئن بھی ہوا؟

طوفانِ نوح!

ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی مدظلہٗ

خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے
ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے

خیر سے یہ حوصلے پیدا ہوئے
اپنے شیدائی کے وہ شیدا ہوئے

کیوں نہ دیدیں پھر بتوں پر اپنی جاں،
ہم جو مرنے کیلئے پیدا ہوئے

ہم کو دل نے کر دیا بے اختیار
آپ پر کیا آپ سے شیدا ہوئے

بڑھتے بڑھتے بات ان کی بڑھ گئی!
سلسلے میں سلسلے پیدا ہوئے

دیکھئے آتی ہیں کیا کیا آفتیں
بے جگہ ہم بے طرح شیدا ہوئے

وہ شب فرقت بلاؤں کا ہجوم!
یہ سمجھ لو پھر سے ہم پیدا ہوئے

ہم سے پوچھے کوئی لطف آزار کا،
جب ہوئے بیدرد پر شیدا ہوئے

پھر حسینوں سے لڑی میری نگاہ
عشق کے آثار پھر پیدا ہوئے

یہ ہمارا ہے کہ ان کا ہے قصور؟
جب کیا شیدا تو ہم شیدا ہوئے

اُس نے یہ پوچھا ہمارے ذکر پر،
کیا جناب نوح پھر پیدا ہوئے

"فلسفۂ سکون و مسرّت"

حضرت طالب باغپتی!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ سکون و مسرت بھی دولت ہی کے حلقہ بگوش ہیں۔ لیکن اگر آپ دنیا کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرینگے تو آپ کو واضح ہو جائیگا کہ بہت لوگ ایسے ہیں جن کے پاس سکون و مسرت حاصل کرنے کے بظاہر تمام اسباب موجود ہیں لیکن نہ وہ مطمئن ہیں نہ مسرور۔

واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے اپنی سرمایۂ نازش مخلوق ـــــ بنی نوع انسان کیلئے ہر نعمت مہیا کی ہے۔ وہ اسے دولت دیتی ہے، قوت دیتی ہے۔ عزت دیتی ہے، عقل دیتی ہے اور ایک طویل زندگی بھی ان تمام نعمتوں سے متمتع ہونے کیلئے عطا کرتی ہے ـــــ لیکن سکون و مسرت وہ اسے براہ راست عطا نہیں کر سکتی۔ سکون و مسرت حاصل کرنا خود انسان ہی کے اختیار میں رکھا گیا ہے۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے جس زندگی کو "کامیاب زندگی" سمجھا جاتا ہے وہ خطرات و تفکرات سے کسی لمحہ خالی نہیں کہی جاسکتی۔ اگر کسی شخص کی فطرت میں سرور و انبساط کا رجحان موجود نہیں ہے تو تمام دنیا کی نعمت و فراغت، روئے زمین کی دولت و حکومت اسے خوش و خرم نہیں رکھ سکتی۔

سکون و مسرت حاصل کرنے کا راز خواہشات پر قابو یافتہ رہنے اور خیالات کی صحیح رہنمائی کرنے میں مضمر ہے اس طرح کی زندگی کے افسوسناک اور درد انگیز پہلو سے قطع نظر کر کے صرف اس کے خوش آئند اور رنگین رُخ کو پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی اپنے احساسات لطیف کو محض ان ہی واقعات سے متاثر ہونے دیا جائے جو کسی نہ کسی پہلو سے نشاط خیز ہوں۔ بقول شوپنہار:-

"یہی دنیا ایک شخص کیلئے بے کیف و بے رنگ ہے اور فطرت کا ایک زاہد از صرف شوق ـــــ لیکن یہی دنیا دوسرے کے لئے دلکش و با معنی ہے........ اس کی کیا وجہ ہے؟ ـــــ صرف یہ کہ مسرت بھی رباب کے نغموں کی طرح ایک توازن اختیاری کا نام ہے۔"

اگر ہم اپنے جذبات و خیالات کو اپنے ماحول و واقعات سے صحیح طور پر متوازن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں سکون و مسرت حاصل نہ ہو۔ لیکن ہمہ وقت اس کے حصول کی فکر میں لگا رہنا بھی انسان کو حقیقی مسرت سے محروم کر دیتا ہے بقول فرینکلن۔

"حصول مسرت کو غیر معمولی اہمیت نہ دو۔ مسرت خود تمہارا تعاقب کریگی۔ اپنی شخصیت کے متعلق بھی زیادہ غور و خوض نہ کرو اس لئے کہ دنیا میں صرف تم ہی ایک انسان نہیں ہو۔"

رسکن کہتا ہے۔

"مسرت کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو بلکہ مسرور ہونے کے لئے تیار رہو۔"

صرف انہیں چند اصولوں پر کاربند رہ کر ہم اپنی زندگی کو قابل رشک طور پر مطمئن و مسرور بنا سکتے ہیں۔

شوخی و ظرافت کی صفات قدرت نے محض بنی نوع انسان ہی کو ودیعت فرمائی ہیں۔ یہ مسئلہ البتہ مختلف فیہ ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں بھی عقل و ادراک ہے یا نہیں۔ لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ مزاح و ظرافت کی صفات سے محروم ہیں۔ اب اگر مبداء فیاض کے اس عطیۂ بے بہا سے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے تو یہ ہماری ذاتی کوتاہی ہے قدرت کا اس میں کیا قصور؟ جیمفرے کا مقولہ ہے کہ:-

"جس دن ہم مطلق نہ ہنسے اس دن کا نقصان ہماری زندگی
کا وہ عظیم ترین نقصان ہے جس کی تلافی عمر بھر ممکن نہیں"۔

وہ لمحے بھی کس درجہ لطیف اور نشاط انگیز ہوتے ہیں جب ہم آزادانہ ہنستے ہیں یا کسی آزاد منش کے طویل قہقہوں کی آوازیں سنتے ہیں ——— یہ احساس ہوتا ہے کہ کائنات حقیقی معنوں میں جاگ اٹھی ہے اور گلشن ہستی کی ہر شے جگمگا رہی ہے۔

حصول مسرت کے سلسلہ میں ہماری خود غرضی بسا اوقات ہمیں صحیح راستے سے بھٹکا دیتی ہے جتنا ہم اپنی ذات کے متعلق غور و خوض کرینگے اتنا ہی غمگین و افسردہ رہینگے لیکن اگر خود غرضی سے قطع نظر کر کے ہم دوسروں کی فلاح و بہبود کی راہیں نکالتے ہیں تو ہمیں روحانی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ حقیقی مسرت حاصل کرنے کے لئے وسعت نظر شرط اول ہے۔ اور دائرہ خیال کو مرکز خودی سے ہٹانا لازمی سمجھئے۔ تجربے کے طور آپ خود عمدہ عمدہ غذائیں کھا کر دیکھئے اور پھر کسی بھوکے کو اپنے سامنے عمدہ عمدہ کھانے کھلا کر اس مسرت کا موازنہ اپنی پہلی مسرت سے کیجئے ...... نقل اور اصل کا فرق واضح ہو جائیگا۔

اکثر حضرات کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمہ وقت گردش زمانہ کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر جنت ہی میں پیدا کیا جاتا اور وہیں کی بیفکر زندگی انہیں عطا کر دی جاتی تو وہاں بھی وہ شکوے شکایت کیلئے بہت سی وجوہ نکال لیتے۔ اس لئے کہ انہیں خوش و خرم رہنا نہیں آتا۔ وہ نہیں جانتے کہ اسی غمکدہ عالم کو کیونکر "دار النشاط" بنایا جا سکتا ہے۔؟

اس کے برخلاف دنیا میں ایسے آزاد منش بھی کمیاب نہیں جو ہر جگہ خندہ جبین اور ہنس مکھ نظر آتے ہیں۔ اور خواہ کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہوں انہیں اپنے ماحول میں رنگینی و مسرت ہی کھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مسرت، اخلاق انسانی کا ایک جوہر بے بہا ہے جس طرح کہ آفتاب کی روشنی درختوں پر پھول کھلا کر انہیں بار آور کرتی ہے۔ اسی طرح مسرت جو حریت اور زندہ دلی کے احساس کا نام ہے ہمارے اخلاق میں بہتری اور بہبودی کے بیج بوتی ہے اور ہمارے اوصاف حمیدہ کے جوہر چمکاتی ہے۔

غور کیجئے تو مسرت ایک قسم کا حق العباد ہے۔ یونان کی ایک اساطیری روایت ہے کہ "جہاں قوس قزح زمین سے ملتی ہے وہاں ایک سنہری جام پیدا ہوتا ہے ———" یہ تو خیر ایک روائت ہی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن کی خندہ پیشانی، مترنم آواز۔ مسرور و محظوظ شخصیت سورج کی اس پہلی کرن کے مانند ہوتی ہے جو ہر چیز کو ایک لمحہ کیلئے سنہری بنا دیتی ہے۔

اگر انسان ہمیشہ خوش و خرم رہے تو اس کی تندرستی کیلئے لازمی ہے اور بہت سی معمولی بیماریوں سے اسے نجات مل جائے ایک خوش مزاج بذلہ سنج اپنے دائرہ احباب میں کیوں ہر دلعزیز ہوتا ہے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنسانا جانتا ہے۔

کوہساروں کے خوشنوا پرند، رنگین و شاداب درخت، چمکدار و شفاف چشمے صحت و تندرستی کے لئے ان تمام بیش بہا ادویات سے بہتر ثابت ہو چکے ہیں جو آج تک دنیا کے قابل ترین اطباء ایجاد کر سکے ہیں۔

آرنلڈ کا مقولہ ہے کہ

"خدا بھی انہیں لوگوں کو عزیز رکھتا ہے جن کے پہلو میں مسرت آشنا دل ہوتے ہیں اور جن کا چہرہ ایک سدا بہار پھول کے مانند ہر حال میں شگفتہ رہتا ہے۔ وہ لوگ خدا کے نزدیک بھی بیوقوف ہیں جو اس کی حقیقی نعمت (مسرت) سے متمتع ہونا نہیں جانتے۔"

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی پیدائش نادار اور مفلس گھرانوں میں ہوئی ہے اور ان کی زندگی عبارت ہے مشقت دوام سے، لیکن اس کا اطلاق صرف غربا پر ہی نہیں ہوتا۔ بہت سے فارغ البال اور دولتمند بھی ایسے ملینگے جن کی دولت و فراغت ہی ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے اور زندگی ایک قید پر محن ——— اور انہیں اس آرام کا شائبہ بھی میسر نہیں جو ایک مفلس و نادار کا پیدائشی حق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم اس دنیا میں تکالیف و مصائب سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم خود کو ان چیزوں سے بالاتر بنا لیں اور رنج و آلام ہمارے احساسات کو مجروح نہ کر سکیں۔ یہ کیفیت ہمیں اپنی قوت متخیلہ کو خوش فکر اور قلب کو مضبوط بنانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا میں ہر شخص مسرت کا خواہاں ہے لیکن بہت کم اس امر سے واقف ہیں کہ مسرت کیونکر حاصل ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مقصد حیات

سے بے بہرہ رہتے ہیں اور ایک جاہل زندگی گزار کر دنیا سے چل بستے ہیں۔ غم و آلام سے یکسر بے تعلقی اختیار کر لینا ہمارے اختیار سے باہر سہی مگر افسردگی سے مصائب کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ ہنسی خوشی انھیں گزار دیا جائے۔ پس ہمیں چاہئے کہ معمولی معمولی تکالیف کو از خود اہمیت دیکر اپنے لئے وبال جان نہ بنائیں بلکہ سکون و اطمینان کے ساتھ انھیں برداشت کر لیں یہ سب کچھ ہمارے اختیار میں ہے کہ اہم سے اہم بات کو معمولی ——— اور معمولی سے معمولی بات کو اپنے لئے اہم بنائیں۔

سیسرو کا مقولہ ہے کہ

"دنیا میں کوئی بات بھی اتنی اہم اور غیر معمولی نہیں جو ایک عاقل و فرزانہ کے لئے بھی اسی قدر وزن رکھتی ہو جس قدر کہ وہ ایک جاہل و کم سمجھ دیہاتی کے نزدیک وزن رکھتی ہے ایک سمجھدار آدمی کے لئے دنیا کا کوئی واقعہ بھی خلاف امید و توقع نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیا کا ہر انقلاب دیکھنے کے لئے خود کو آمادہ رکھتا ہے۔"

ایک متمدن دماغ، میری مراد صرف فلسفیانہ دماغ ہی نہیں بلکہ ہر وہ دماغ جو تعلیم و تہذیب کی روشنی سے منور ہوتا ہے انقلاب فطری سے (خواہ وہ کامیڈی ہو یا ٹریجڈی) اس قدر متاثر نہیں ہوتا کہ اس کے لئے اپنی صحت و تندرستی کو فراموش کر دے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ زندگی نام ہے مسلسل انقلابات کا اور ہر انقلاب فطرت کی طرف سے پہلے انقلاب کی یاد صفحہ قرطاس دماغ سے مٹانے کے لئے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ زمانہ محض تیغ و تفنگ ہی کے زخموں کا اندمال نہیں کرتا۔ بلکہ رنج و آلام سے دل کی گہرائیوں میں جو جراحت پیدا ہو جاتے ہیں انھیں بھی مندمل کرتا رہتا ہے۔

انسانی زندگی کا انتہائی انقلاب موت ہے لیکن وہ ایک ایسی عام افتاد ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ نہ غور و فکر سے اس کا التوا ممکن ہے اس لئے وہ اس قدر توجہ کی مستحق نہیں کہ اس کے خوف سے زندگی اجیرن کر لی جائے در حقیقت ہمیں جن چیزوں سے خوف کرنا چاہئے وہ خود ہماری خواہشات ہیں۔

ایک مشہور حکیم کا قول ہے کہ

"تفکرات و آلام نے جتنی زندگیوں کا خاتمہ کیا ہے اتنی اموات امراض و وبا سے واقع نہیں ہوئیں۔"

یہ قول بڑی حد تک درست ہے اس لئے کہ دماغی پریشانی بذات خود ایک بیماری ہے اور ہر بیماری میں دماغی پریشانی یا فکر و اندیشہ کا دخل ضرور ہوتا ہے تعلیم و تربیت سے قوت متخیلہ جلا پاتی ہے تو اس میں غور و فکر کا مادہ بھی ضرور پیدا ہوتا ہے یعنی اگر ایک طرف تعلیم دماغ کو انقلابات کی اہمیت سے بے نیاز کرتی ہے تو دوسری طرف تفکرات سے اس کو بھر دیتی ہے۔ لیکن یہ فریب خیال ہے محض دور اندیشی یا کسی مسئلہ کا عمیق مطالعہ پریشانی فکر کا مترادف نہیں۔ پریشانی فکر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معمولی واقعات کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اور مشکلات کو مصائب سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں چونکہ دماغ پر تاثرات کا غلبہ ہوتا ہے ——— اس لئے وہ ان مشکلات کا کوئی صحیح حل بھی نہیں سوچ سکتا۔

عام تندرستی کی حالت میں نیند اڑ جانا۔ خیال کا کسی مرکز پر لوٹ لوٹ کر آنا۔ سر میں ایک قسم کی گرانی اور قلب پر کسی دباؤ کا احساس پریشانی فکر اور بے چینی دماغ سے عبارت ہے۔ جس وقت نظام جسمانی میں یہ علامات رونما ہوں ایک وبائی مرض کی طرح ان کے دفعیہ کی فی الفور تدابیر کرنی چاہئے۔ اس کے لئے کسی ڈاکٹر کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ حفظ ماتقدم کے طور پر سب سے اول خلوت و تنہائی سے گریز کرنا چاہئے۔ اس کے بعد دو ایک ایسے زندہ دل دوستوں کو تلاش کر لینا چاہئے جنھیں آپ اپنے نزدیک عاقبت اندیش اور بے فکر سمجھتے ہوں جو ہر فقرے کے بعد دو ایک فرمائشی قہقہے لگانے کے عادی ہوں اور جن کی گفتگو سینما، تھیٹر اور سیر و شکار سے آگے نہ بڑھتی ہو۔ کم از کم ان لوگوں کے لئے جو دماغی پیشے کرتے ہیں یہ امر از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے دائرے میں اس وضع کے دو ایک حضرات کی ضرور گنجائش نکال لیں۔

ہلکی غذائیں کھانا۔ زندہ دل دوستوں کے ہمراہ مناظر فطرت کی سیر کرنا۔ کھلی ہوئی ہوا میں چہل قدمی کرنا۔ بچوں کے ساتھ تفریح کرنا ——— دماغی پریشانی کے یقینی علاج ہیں۔

دماغی پریشانی کے ماسوا انسان کے افسردہ رہنے کی ایک اور بھی وجہ ہوتی ہے۔ اکثر اپنی بے بضاعتی اور کمزوری کا احساس بھی انسان کو سکون و مسرت سے نا آشنا کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو انسان کے ہر شعبہ زندگی میں حائل ہو جاتا ہے اور اس کے لئے ترقی کے تمام راستے مسدود

کر دیتا ہے۔

دوسروں کے مقابلے میں خود کو حقیر سمجھنے لگنا فطرت انسانی کا سب سے بڑا نقصان ہے اور اس نقصان کی تلافی کی طرف ہمیں دماغی پریشانی سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مرض بالعموم بچپن ہی سے ذہن میں پرورش پاتا ہے اور بیشتر ہمارے والدین یا ماؤں کی غلط تربیت اس کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً بے وجود چیزوں سے بچوں کو ڈرانا۔ بات بات پر انہیں جھڑکنا۔ بزرگوں کی موجودگی میں انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرنا۔ ان کے فطری سوالات کا ناکافی جواب دینا ——— بچوں کی معصوم ذہنیت میں بے بضاعتی کا احساس پیدا کرتا ہے اور یہ احساس ان کی آئندہ ترقی میں اس طرح حائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپاہج بن کر رہ جاتے ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں اپنے سے زیادہ ذہین وطباع دوستوں کی صحبت اختیار کرنا۔ جوانی میں اپنے سے بڑے درجہ کے لوگوں میں نشست و برخواست رکھنا۔ اپنے سے زیادہ خوشرو۔ توانا و تندرست آدمیوں کے ساتھ رہنا ——— ممکن ہے دوسرے لوگوں کی نظر میں آپ کی کوئی اہمیت قائم کرتا ہو۔ لیکن خود اپنی نظروں میں آپ کو حقیر و ذلیل کر دیتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو اپنے ہمسروں کی صحبت اختیار کرنا چاہیئے اور اپنے سے کم درجہ و کم استعداد لوگوں میں اپنی برتری و قابلیت کے جوہر پر صیقل کرنی چاہیئے۔

کسی ایک ہستی کو نمونہ بنا کر اپنی زندگی کے لئے راہ عمل نکالنی چاہیئے اور ہر جگہ یہ احساس لے کر جانا چاہیئے کہ فطرت نے خلقتاً انسانوں میں کسی امتیاز کا لحاظ نہیں رکھا لہذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے میرے اندر کوئی کمی ہو اور ——— میں اتنی ترقی نہ کر سکوں جتنی دنیا کے بڑے سے بڑے آدمی نے کی ہے۔

اپنے لاعلاج جسمانی عیوب کو جہاں تک ہو سکے فراموش کر کے دنیا میں اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا چاہیئے کہ دماغ تمام اعضائے رئیسہ پر فوقیت رکھتا ہے لہذا ایک شخص چاہے تو دماغ سے کام لیکر تمام دنیا کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا سکتا ہے۔ تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ اکثر بڑے بڑے لوگوں کی زندگیاں ان کے ذاتی خیالات کی غلط اندازی کا شکار ہو گئی ہیں اور لیبا اوقات دنیا کے مافوق الفطرت کارنامے ایسی ایسی معمولی ہستیوں نے انجام دیئے ہیں جو اپنے ماحول کے لحاظ سے کسی طرح بھی اس کے اہل نہ تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں اور کچھ نہیں تو یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ ہر شخص کے اندر بڑے سے بڑا کارنامہ کرنے کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ اور اس میں کسی مرتبہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ایک انسان فطرتاً دوسرے کے مقابلے میں خفیف ہو۔

بلا غور و خوض کئے اندھا دھند مطالعہ کرنا بھی ہماری فکر کو آوارہ اور دماغ کو سکون نا آشنا بنا دیتا ہے۔ مطالعہ کیلئے کتابوں کا انتخاب تقریباً اسی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے جس احتیاط سے جسمانی تندرستی کے لئے غذا کا انتخاب کیا جاتا ہے اس لئے کہ مطالعہ بہرحال دماغ کی غذا ہے۔

کسی ایسی کتاب کا مطالعہ محض تضیع اوقات ہے جو پڑھنے والے کو زندگی کے تنوعات سے بیخبر رکھے۔ ایسے مصنفین کی تصانیف دیکھنا جو زندگی کی محض تاریک اور دردناک تصویریں کھینچنے کے عادی ہوں ذکی الحس لوگوں کے لئے بالخصوص مضر ہے۔

غرض دنیا میں خوش وخرم رہنے کے لئے دماغ کو فکر و آلام سے محفوظ رکھنا اور اس کے ساتھ ہی مسرتوں کو پوری اہمیت دینا از بس ضروری ہے کہ یہی زندگی کا نفع خالص ہیں۔

خیام نے عیش حاضر اور فراغت امروز کا جو فلسفہ اپنی رباعیات کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ بہر لحاظ قابل توجہ ہے۔ وہ سکون و مسرت کے تمام فلسفہ کی صرف چار مصرعوں میں اس طرح تشریح کر کے رکھ دیتا ہے کہ ؎

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن
فردا کہ نیامدہ ست فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد منہ
حالے خوش باش و عمر برباد مکن،

سکون حاصل کرنے کیلئے اس سے کم الفاظ میں اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

طالب باغپتی،

خاص نمبر ۱۹۳۶ء انشاءاللہ عالمگیر کی تمام گذشتہ خاص نمبروں سے بہمہ وجوہ دلچسپ اور دلفریب ہوگا۔ — مینجر،

ہمارا فرض

از نثار الملک میر احمدی اجمیری

یہی ہے فرض اب ہر نوجواں کا — بنے حامی ضعیف و ناتواں کا
نہ بدلی شومئ قسمت نہ بدلی — ہمیشہ رنگ، بدلا آسماں کا
میں اپنے قول سے ہرگز نہ بدلوں — بدل جائے جو بدلے رخ جہاں کا
بُری شے ہے زباں دے کر مکرنا — بشر کو پاس لازم ہے، زباں کا
رہو مصروف محنت میں عزیزو — قریب آیا زمانہ امتحاں کا
نظر آتا ہے دنیا بھر سے پیچھے — خدا حافظ ہے ایسے کارواں کا
ہمیں دیتے ہیں دعوت گردشوں کو — قصور اس میں نہیں کچھ آسماں کا
کرے انسان خود اپنی مدد آپ — مقولہ ہے یہ انگریزی زباں کا
کھنچے جاتے ہو کیوں بیوجہ مجھ سے — زمانہ اب نہیں تیر و کماں کا
جہاں تک ہو بنے انساں نکوکار — یہی نسخہ ہے عمرِ جاوداں کا

نہ ہو کیوں مبشر کی شہرت جہاں میں
بڑا شاعر ہے، وہ ہندوستاں کا

تجدید الفت!

از جناب ہادی جعفری صاحب

کنواری پروین کی آج پچیسویں سالگرہ ہے۔ میز پر تحائف کا انبار لگا ہوا ہے۔ پروین کی سہیلی یاسمین نے ایک عطردان اٹھا کر پروین کو دکھاتے ہوئے کہا —— "دیکھا تم نے یہ تمہارے خالو مسٹر جمشید جی نے بھیجا ہے۔" پھر ایک مخمل کی چھوٹی سی ڈبیا کھولی اس میں ایک نفیس بندے کی جوڑی تھی۔ "یہ تمہاری خالہ فیروزہ گلنار کی طرف سے ہے۔" پروین ان تحائف کو دیکھ کر مسرور ہو رہی تھی کہ یکایک یاسمین نے ایک گنگا جمنی گلدان کو پروین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا دیکھنا اس پر کیا لکھا ہے —— "میری دنیا! شہریار کا حقیر تحفہ قبول ہو۔" بجائے خوشی کے پروین کے چہرے پر رنج و غم کے بادل چھا گئے اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

"اس ٹھنڈے سانس کا مطلب؟" یاسمین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" پروین نے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا اب تک تمہارا وہی خیال ہے آہ! بیچارہ شہریار ——" یاسمین نے کہا۔

"ہاں وہی خیال ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ پروین اپنے خیالات بدل سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔"

"تو پھر تم نے ——"

پروین نے بات کاٹ کر کہا۔ "سنو میں شہریار کی ہوں اور ہمیشہ شہریار کی رہونگی۔ خواہ وہ مجھ سے الگ ہی کیوں نہ رہے!"

"پروین! سارا قصور تمہارا ہے۔ آخر کوئی وجہ کہ تم اور شہریار رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"بعض غیر متوقع رکاوٹوں نے ہماری راہ میں روڑے اٹکائے اور اتنی تنا میں واقعات نے پلٹا کھایا اور میرا تعلق کالج سے ہو گیا جہاں کی مصروفیتیں کچھ ایسی تھیں کہ ہماری آرزوئیں بر نہ آسکیں اور اب تم جانتی ہو کہ میں ——"

یاسمین نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر میں خیال کرتی ہوں کہ تم دونوں میں محبت کی جو آگ روشن ہو چکی تھی وہ ہنوز بجھی نہ ہوگی۔"

"ہاں یہ صحیح ہے لیکن اب اس آگ کا بھڑکنا اب ذرا مشکل ہے۔" پروین نے مایوسی کے لہجہ میں کہا۔

"نہیں میں سچ کہتی ہوں کہ شہریار کو اب تک تم سے محبت ہے۔ کیا اس کی باتوں سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اب تک تم پر ——"

"خیر، یاسمین اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔؟"

"یہی کہ اپنا عندیہ کسی نہ کسی طرح شہریار پر ظاہر کر دو۔"

"نہیں یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ تم جانتی ہو کہ مجھ سے حرف مطلب زبان پر لایا نہیں جاتا۔ ورنہ کبھی کے ہم ——"

"اچھا اگر شہریار نے پیش قدمی کی تو؟ ——" یاسمین نے پروین کو گدگداتے ہوئے کہا۔

"مجھے توقع نہیں۔" پروین نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

پروین مہمانوں کی تواضع میں مصروف ہے۔ فیروزہ گلنار نواب رضا علی خاں سے باتوں میں مشغول ہے۔ ایک طرف یاسمین اور خورشید بیٹھے ہیں مگر ان سب مہمانوں میں شہریار نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ پروین نے شہریار کی طرف چائے کی پیالی بڑھائی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شہریار نے پیالی لیتے ہوئے کہا شکریہ پروین نے نظریں نیچی کر لیں۔ یاسمین نے کنکھیوں سے شہریار اور پروین کو دیکھا اور مسکرایا۔ پروین کی نظریں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔ چار پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد شہریار کو پروین سے علیحدہ گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا —— سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

"پروین میری ایک خواہش ہے اگر وعدہ کرو تو کہوں"۔

"آپ کی خواہش اور مجھ سے ——؟"

"ہاں ہاں، آپ سے اور صرف آپ سے!"

"فرمایئے شوق سے فرمایئے"۔ پروین نے بےچینی سے کہا۔

"نہیں پہلے وعدہ کرو۔"

پروین نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ہاں وعدہ!"

"تمہیں وہ شام یاد ہوگی کہ ہم تفریح کرتے ہوئے پہاڑی کی طرف گئے تھے اور وہ مکان بھی یاد ہوگا جو تمہیں پسند آیا تھا۔؟"

"ہاں ہاں، وہ دو منزلہ مکان —— خوب مکان تھا وہ"۔ پروین نے خوش ہو کر کہا۔

"میں نے اسے خرید لیا ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ اس مکان کو تم اپنے مذاق کے مطابق آراستہ کردو"۔

"خوب! یہ بھی کوئی خواہش ہے؟ میں نہایت مسرت سے اس خدمت کو انجام دونگی۔ پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو میں کل صبح آکر تمہیں لیچلوں۔؟"

پروین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اقرار کرلیا۔

دوسرے دن پروین منتظر ہی تھی کہ شہریار آیا اور دونوں مکان دیکھنے گئے۔ راستہ میں مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھار گذشتہ واقعات کی بھی چھیڑ چھاڑ ہوجاتی تھی۔ جب مکان میں داخل ہوئے تو شہریار نے پروین کو سارا مکان دکھایا جو اس کو بہت ہی پسند تھا۔

پروین نے پوچھا "تم تو اکیلے ہو پھر یہ مکان کس کے لئے۔؟"

"اوہو، تمہیں خبر نہیں کہ میں عنقریب شادی کرنے والا ہوں"۔

پروین نے ٹھٹک کر کہا "اچھا آپ شادی کرنے والے ہیں۔؟ میں بھی سنوں وہ کون خوش نصیب ہے جو اس گھر کی مالکہ ہوگی؟"

"خوش نصیب، مگر اس کا فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ خوش نصیب ہے یا میں ——؟" شہریار نے جواب دیا۔

"آخر وہ ہے کون؟" پروین نے پوچھا۔

"ہوگی کوئی بھی —— خیر، ہاں تو مکان؟"

پروین نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر اس قدر اوپچے اڑنے اور یوں بات کاٹنے کا مقصد؟ —— میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ مکان اس لڑکی کے مطابق آراستہ کردں، کیونکہ اس گھر کی مالکہ آخر وہی ہوگی"۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں، تم اس کو اپنے مذاق کے مطابق آراستہ کرو۔ کیا تعجب کہ تمہارا مذاق ہو بہو اس کا مذاق ہو ——" شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر جیسی آپ کی خوشی"۔ پروین نے غمگین لہجے میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں وہاں سے واپس ہوئے۔

پروین کو کالج سے فرصت ملنے کے بعد وہ ہر روز مکان جاتی اور آراستہ کرتی مگر ساتھ ہی ساتھ اس گمنام لڑکی کا خیال تکلیف دہ ضرور تھا۔ ایک روز پروین ہاتھوں میں ایک بڑا سا چینی کا گلدان لئے کھڑی تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ یکایک اس کی زبان سے نکلا —— "اگر میں اس گھر کی مالکہ ہوتی تو اس گلدان کو اس نفیس تپائی پر رکھتی"۔ پروین گلدان لئے ہوئے تپائی کی طرف بڑھی اور کھڑے ہو کر —— "اور اس تپائی کو ڈرائنگ روم میں ——"

پروین نے گلدان کو تپائی پر رکھا اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی —— "کاش یہ ڈرائنگ روم میرا ہوتا ——!"

یکایک پروین نے محسوس کیا کہ کوئی سایہ کی طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے مڑ کر دیکھا تو شہریار کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں نے عمداً نہیں سہواً آپ کی بعض دلچسپ باتیں سن لی ہیں معاف فرمایئے۔" اتنا کہہ کر شہریار سیٹی بجاتا ہوا نکل گیا۔ پروین کچھ شرمندہ اور کچھ پریشان ہو کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ جب مکان بالکل آراستہ ہوگیا تو شہریار سے کہا "اب آپ کا مکان بالکل آراستہ ہوگیا ہے خدا آپ کو مبارک کرے اچھا تو آپ کی بیگم صاحبہ کب تشریف لائینگی؟"

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ رہا میری بیگم صاحبہ کے متعلق وہ اپنے وقت پر آجائیں گی آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے۔؟"

"آخر کب تک آئینگی۔؟" پروین نے پھر پوچھا۔

"بہت ممکن ہے آج شام ہی کو آجائیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ آج شام کو چھ بجے وہ یہاں ہونگی"۔

پروین نے مکان واپس ہوتے ہی فلک ناز کو یاسمین کے پاس بھیجا کہ وہ اس کو بلا لائے۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب یاسمین آئی تو پروین پلنگ پر لیٹی رو رہی تھی

"خدا خیر کرے کیوں رو رہی ہو بہن؟" یاسمین نے پریشان ہو کر پوچھا۔

پروین نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اپنی قسمت پر رو رہی ہوں"

"کچھ کہو تو؟"

"تم مجھے ہمیشہ امید دلاتی تھیں ـــ مگر تمہیں کیا معلوم کہ امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت صدمے گزرتے ہیں۔"

اب یاسمین پر واقعات کا انکشاف ہو گیا۔

"مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ تمہارا اور تم اس کی۔" یاسمین نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بھولی یاسمین تم نہیں جانتیں کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟"

"ارے آخر کہو بھی تو کیا ہوا؟"

"تم کو معلوم نہیں آج شہریار کا عقد ہونے والا ہے"

"کس سے؟" یاسمین نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ تم سے یوں دغا کر گیا" یاسمین نے کہا۔

پروین نے روتے ہوئے یاسمین کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

پروین بہت دیر تک ان خیالات میں غرق بیٹھی رہی کہ کسی نے باہر سے پکارا ـــ "کیا میں آ سکتا ہوں۔؟"

پروین نے آنسو پونچھ کر کہا ـــ "تشریف لائیے۔"

شہریار کمرے میں داخل ہوا۔

"اوہو! پروین تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔"

شہریار کے ان الفاظ نے پروین کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ مگر ضبط کر کے کہا۔ "ہاں آپ کے پاس سے واپس ہونے کے بعد طبیعت کچھ مضمحل ہو گئی تھی۔"

"مگر میں تو تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا ـــ معاف کرنا میں صبح تمہیں نہ کہہ سکا۔"

"مگر میری طبیعت ـــ"

"کھلی ہوا سے طبیعت چاق ہو جائے گی۔"

پروین خاموش تھی ـــ "چلو جلدی چلو، ہوا خوری سے طبیعت خود بخود شگفتہ ہو جائیگی۔"

پروین شہریار کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گئی۔ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ سینہ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔

آخر پروین نے پوچھا۔ "کیوں شہریار مکان کی آرائش میں ابھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے یا آپ کی بیگم صاحبہ کی کوئی مزید خدمت۔؟"

"موسم کتنا خوشگوار ہے۔ میری طبیعت آج غیر معمولی بحال ہے۔" شہریار نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

اب تو پروین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ پروین کا دل آنکھوں کی راہ سے بہ نکلے۔ شہریار پروین کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اچھی طرح اس کے خیالات کا مطالعہ کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مسکرا رہا تھا۔ جب مکان پہونچے تو پروین نے کئی مرتبہ وہی سوال دہرایا جو بارہا کر چکی تھی کہ "وہ کب آئیگی اور کون ہوگی؟"

آخر جب چھ بج گئے تو پروین پر دیوانگی کا عالم تھا۔ وہ بار بار دروازہ کی طرف دیکھتی تھی۔

"ہاں بہتر ہے کہ ہم پھر ایک مرتبہ مکان کا معاینہ کر لیں۔" شہریار نے کہا۔

دونوں ڈرائنگ روم سے گزر کر بیڈ روم میں پہونچے ـــ یہاں ایک تصویر آویزاں تھی جس میں ایک شخص گھٹنے ٹیک کر ایک عورت کا ہاتھ چوم رہا تھا ـــ شہریار نے اس تصویر کی طرف اشارہ کیا ـــ پروین اُس تصویر کو دیکھ کر شرما گئی۔ شہریار نے گھٹنے ٹیک کر پروین کے نازک ہاتھوں پر بوسہ دیا اور کہا ـــ

"پروین اب تصویر کی طرف دیکھو! ـــ کہو کیا کہتی ہو ـــ؟ منظور ہے نا ـــ؟"

پروین نے تصویر کو دیکھا اور شرم سے گردن جھکا لی۔

شہریار نے دبی زبان سے کہا ـــ "تجدید اُلفت"

ہادی جعفری حیدرآباد۔ دکن

رشحات ریاؔ

از سید محمد اسمٰعیل صاحب ریاؔ ہمدانی گیاوی ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈوکیٹ

میں ہوں جنگل ہے اندھیری رات ہے کہسار ہے
اپنا سایہ تک نہیں صرف اک خیالِ یار ہے

کوئے جاناں میں مرے ارماں کی یہ رفتار ہے
میں پسِ دیوار ہوں سایہ سرِ دیوار ہے

عشقِ صادق میں رواں جو آنسوؤں کا تار ہے
سب یہ کہتے ہیں کہ سچے موتیوں کا ہار ہے

یاسمن کی شاخ میں پھولا ہوا ہے اک گلاب
دستِ سیمیں اس سمن بر کا تہِ رخسار ہے

اے مری وحشت کہاں سے مجھکو لے آئی کہاں
دشت ہے صحرائے وحشتناک ہے کہسار ہے

عمر ہے ہر دم رواں لیکن نظر آتی نہیں
لطف یہ ہے کہ اقامت میں چھپی رفتار ہے

وہ رواں ہے نقشِ پا لیکن کہیں بنتے نہیں
نکہتِ گل کی طرح یہ نرمیٔ رفتار ہے

سب سمجھتے ہیں کہ ہے روئے سخن میری طرف
بزم میں اس شوخ کی یہ شوخیٔ گفتار ہے

چلتے چلتے کوئے جاناں میں جہاں خود سر جھکے
یہ سمجھ لو اس جگہ پر نقشِ پائے یار ہے

قطعہ

بر سر بیداد تھا یہ آسماں پھر کیا ہوا
جاگ اٹھی سوئی قسمت میہماں وہ یار ہے

یہ ہوا، یہ چاندنی۔ یہ باغ، یہ دلکش فضا
اور دستِ شوق اس نازک گلے کا ہار ہے

قیس کے نارِ گریباں کی طلب ان سب کو ہے
ہر طرف انگلی اٹھائے نجد میں ہر خار ہے

ناامیدی، بیکسی، یاس و الم سب دور ہو
عاشقِ ناشاد اپنی زیست سے بیزار ہے

اک تبسم اس کے دو معنی ہیں بزمِ ناز میں
اس کو ہے انکار میں خوش ہوں کہ یہ اقرار ہے

میری بالیں سے ارے او جانیوالے کچھ ٹھہر
دیکھ لوں اچھی طرح یہ آخری دیدار ہے

عشق میں سب جا چکے ہوش و خرد تاب و تواں
اک اکیلی بیکسی ہے جو مری غمخوار ہے

مرگِ عاشق پر یہ آنسو اور اس کی آنکھ میں
اے ریاؔ بحرِ محبت کا دُرِ شہوار ہے

انقلابی

از قلم مولانا امیر اللہ صاحب آسی رام نگری

رات کے دس بج چکے تھے۔ شہر میں سناٹا ہو چلا تھا۔ اسی وقت ایک نوجوان یورپین لباس پہنے ہوئے تیزی سے ایک طرف جا رہا تھا۔ نائٹ کیپ سے اس کی پیشانی ڈھکی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کا نچلا حصہ اوورکوٹ کے کالر میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں بجلی کا ٹارچ تھا اور بایاں ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔

دفعتاً سڑک سے وہ ایک گلی میں گھسا۔ گلی میں گھستے ہی ایک ادھیڑ عمر کے بھکاری نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "کچھ مل جائے بابو — آج دن بھر کچھ نہیں ملا —"

نوجوان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے بھکاری کو بغور دیکھا۔ بھکاری نے نوجوان کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر گڑگڑا کر کہا — "بابو بھوکا ہوں کچھ مل جائے —"

نوجوان نے بائیں ہاتھ کے کوٹ کے جیب سے ایک اکنی نکال کر بھکاری کو دی اور چل دیا۔

تھوڑی دور چل کر وہ ایک دروازہ پر رکا۔ پہلے اس نے بغور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ دور پر وہی بھکاری سر جھکائے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا نوجوان نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ چند منٹوں کے بعد دروازہ کھلا اور نوجوان اندر چلا گیا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک نوجوان تھا اس نے آنے والے سے پوچھا "اتنی دیر کیوں ہوئی رمیش —؟"

رمیش نے ذرا تیز آواز میں جواب دیا — "مجھے کتنی دور سے آنا پڑتا ہے۔ یہ بھی خبر ہے۔ تمھیں کیا، تم تو دن بھر گھر میں گھسے رہتے ہو۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں ایک کمرے میں پہونچے اس میں ایک گول میز پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف پانچ چھ کرسیاں تھیں اور ان پر تین نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ رمیش کو دیکھتے ہی ایک بولا۔

"لو رمیش آ گیا۔"

رمیش نے اپنی نائٹ کیپ میز پر پٹک دی اور اوورکوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد اپنے سر کے بالوں کو داہنے ہاتھ سے برابر کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس نوجوان نے دروازہ کھولا تھا وہ بھی بیٹھ گیا۔

چند منٹ تک رمیش سر جھکائے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دوسرے چاروں نوجوان سائلانہ نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے یکایک اس نے سر اوپر اٹھا کر کہا — "ابھی اس گلی کے سرے پر مجھے ایک بھکاری ملا تھا۔ وہ کون ہے۔ جانتے ہو؟"

"بھکاریوں سے تعارف حاصل کرنا ہمارے کام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا — کیوں؟ کیا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے؟" ایک نوجوان نے کہا۔

"ہاں اگر وہ مشتبہ شخص ہو تو؟"

"تمھیں وہ کیسا معلوم ہوا —؟" دوسرے نوجوان نے سوال کیا۔

"مجھے اس پر شبہ ہوا، جب ہی تو پوچھتا ہوں۔" رمیش بولا۔

اتنا سنتے ہی سب ہنس پڑے۔ رمیش بھنویں چڑھا کر بولا — "کیوں آپ لوگ ہنستے کیوں ہیں —؟ ہم جس حالت میں ہیں اس میں ہر اس قسم کا شک کرنا ضروری ہے۔ یہ جانتے ہو۔"

"لیکن تمھیں شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اس بھکاری کو جانتے ہیں وہ اکثر اس گلی میں بھیک مانگنے آیا کرتا ہے۔"

"تم لوگوں کو اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہے —؟"

"نہیں!"

"تب کوئی بات نہیں۔"

چند منٹوں تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ یکایک ایک نوجوان بولا

"تم کیا کر آئے؟ یہ تو بتاؤ!"

رمیش نے کہا —— "روپے کا انتظام تو نہیں ہو سکا۔"

"یہ کیوں؟" —— ایک نے بھنویں چڑھا کر سوال کیا۔

"نہیں ہو سکا۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔" رمیش نے جواب دیا ——

"لیکن بندوبست نہیں ہو سکا تو کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟"

"وجہ یہی کہ جہاں سے ملنے والا تھا وہاں سے نہیں ملا۔"

"نہایت تعجب کی بات ہے!"

"تعجب کیوں؟ —— اکثر ایسا ہو جایا کرتا ہے۔" رمیش نے منہ بنا کر کہا

"تعجب اس لئے کہ تم نے یقین دلایا تھا کہ روپے کا انتظام یقیناً کر دوگے۔"

"ہاں میں نے یقین ضرور دلایا تھا۔ لیکن مجبور ہوں۔ مجھے پورا بھروسہ تھا کہ روپے مل جائیں گے لیکن اتفاق کی بات ہے نہیں ملے۔"

"تم تو وقت کی بات" اور "اتفاق کی بات" کہہ کر فرصت پا گئے لیکن یہاں تو ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔"

"مجھے اس کا دلی رنج ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟"

"ہاں! اب کیا کیا جائے، یہی سوچنا ہے۔"

"بغیر روپے کے کام نہیں چل سکتا۔"

رمیش فکر میں پڑ گیا۔ کچھ دیر تک سوچ کر بولا —— "اچھا مجھے کل کی مہلت اور دو۔ میں ایک بار پھر کوشش کروں گا۔"

چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد ایک بولا ——

"اچھا! کل کی مہلت اور دی جاتی ہے۔"

رمیش پرشاد ایک دولتمند خاندان کا لڑکا ہے اس نے بی۔اے تک تعلیم پائی ہے۔ لیکن بی۔اے کی ڈگری حاصل نہیں کر سکا۔ دو سال متواتر فیل ہو جانے کے باعث اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا
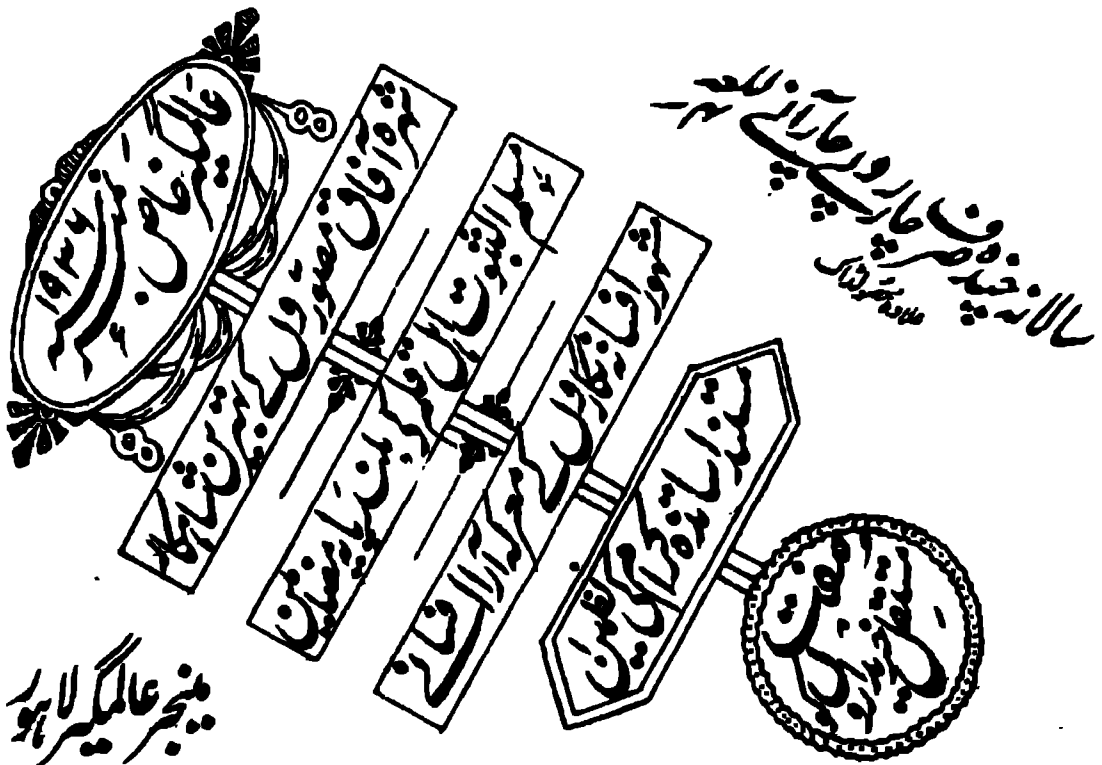
اس وقت اسے انقلابی تحریک نیز انقلاب پسندوں سے بیحد دلچسپی تھی جب وہ اخباروں میں انقلابیوں کے کارنامے پڑھتا تو اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ وہ انقلابیوں سے تعارف حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ متمنی رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے کو بھی انقلابی سمجھنے لگا تھا۔ انقلابیوں کی طرح ہمیشہ محتاط رہنے۔ ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھ کر چلنے پھرنے غرض انقلابیوں کی طرح رہنے سہنے میں اسے بیحد لطف آتا تھا۔ اسے انقلابیوں کی تحریک نیز مقصد سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہ اسے ملک کو آزاد کرانے کی لگن تھی ــــ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ انقلابیوں کی طرح ایک پراسرار شخص ہو جائے۔ اور لوگ اسے انقلابی سمجھ کر اس سے خائف رہیں ــــ وہ کسی انقلابی جماعت کا لیڈر بن جائے ــــ صرف یہ اس کے اہم مقاصد اور دلی تمنائیں تھیں۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ رمیش کے والد اپنے کمرے میں تنہا پڑے سو رہے تھے۔ یکایک کچھ کھٹکا ہونے سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بجلی کی دھندلی روشنی تھی۔ اس مبہم روشنی میں انھوں نے ایک آدمی کا سایہ دیکھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور چاہا کہ بجلی کی دوسری بتی جلائیں۔ انھوں نے جیسے ہی بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک شخص سیاہ چغے سے اپنا بدن ڈھانکے ہوئے اور مُنہ پر نقاب ڈالے لپک کر ان کے قریب آگیا ــــ اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر بھاری آواز میں کہا ــــ "خبردار!"

رمیش کے والد نے دیکھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک پستول ہے اس شخص نے پھر بھاری آواز میں کہا "خبردار ــــ! سوچ مت دبانا، ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا ــــ"

رمیش کے والد نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ گلا خشک ہو گیا انھوں نے خائف آواز میں اس شخص سے پوچھا ــــ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"لوہے کی الماری کی کنجی۔"

رمیش کے والد سوچ میں پڑ گئے۔ اس شخص نے انھیں ہچکچاتے دیکھ کر کڑی آواز میں کہا ــــ "جلدی کرو۔"

رمیش کے والد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے سرہانے سے کنجی نکال کر دیدی۔ اس شخص نے بائیں ہاتھ سے کنجی لے کر کہا ــــ "خبردار نہایت اور نہ شور ہی کرنا ورنہ جان چلی جائیگی۔"

اتنا کہہ کر وہ پاس ہی دیوار میں لگی ہوئی لوہے کی الماری کے قریب پہونچا اور جلدی سے الماری کھول کر اس میں سے کچھ نکالا اور الماری بند کر کے کنجی رمیش کے والد کی طرف پھینک کر بولا ــــ "خبردار! جب تک میں نکل نہ جاؤں چپ چاپ پڑے رہنا۔" اتنا کہہ کر اس نے پستول ہٹایا اور بتی بجھا دی۔ اب بالکل اندھیرا ہو گیا۔ رمیش کے والد نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سُنی۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ پڑے رہے اس کے بعد انھوں نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر سوچ دبایا۔ بجلی کی پوری روشنی سے کمرہ جگمگا اٹھا۔ انھوں نے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر بالکل سناٹا تھا ــــ وہ زور سے چلائے ــــ "چور ــــ چور ــــ دوڑو ــــ پکڑو ــــ"

رات کی خاموشی میں ان کی آواز پورے مکان میں گونج گئی۔ چند ہی منٹوں میں پٹاپٹ کئی دروازوں کے کھلنے کی آواز ہوئی اور دو تین آدمی "کہاں؟ ــــ کہاں؟ ــــ" کا شور کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

رمیش کے والد کو دیکھ کر ایک بولا۔ "کیا ہے سرکار؟"

"ابھی ایک چور کمرے سے نکل کر گیا ہے۔" رمیش کے والد نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایں! آپ کے کمرہ میں چور؟ وہاں کیسے پہونچا؟"

"میں خود چکر میں ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کدھر گیا ــــ؟"

"ابھی اسی دروازہ سے باہر نکل گیا ہے۔"

"تو صدر دروازہ تو بند ہوگا۔ جائیگا کہاں؟ یہیں کہیں ہوگا!"

"لیکن ہوشیار رہنا۔ اس کے پاس پستول ہے۔"

اسی وقت رمیش آنکھیں ملتا ہوا گھبرایا آیا اور پوچھنے لگا ــــ "کیا ہے پتا جی؟ ــــ"

اس کے والد نے سارا حال کہدیا۔ رمیش بولا۔ "ہمارے گھر میں اور چور، نہایت تعجب کی بات ہے؟"

اسی وقت ایک شخص نے آکر کہا ــــ "صدر دروازہ کھلا پڑا ہے معلوم ہوتا ہے چور نکل گیا۔"

رمیش بولا۔ "یہ تو بڑے غضب کی بات ہوئی۔ آپ نے اسے دیکھا تھا؟"

"ہاں سیاہ چغہ پہنے۔ منہ پر سیاہ نقاب ڈالے اور ہاتھ میں ــــ پستول لئے ہوئے تھا ــــ"

"تب تو وہ کوئی چور نہیں تھا۔ کچھ لے بھی گیا؟"

"لے ضرور گیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیا لے گیا ہے؟ چلو دیکھیں!"

سویرے پولیس کو خبر دی گئی۔ سب انسپکٹر نے آکر موقع دیکھا اور تحقیقات شروع کر دی۔ مقامی اخباروں میں بھی یہ خبر شایع ہوگئی۔ پولیس نے چور کا حلیہ سُن کر اندازہ لگایا کہ یہ کام کسی انقلابی کا معلوم ہوتا ہے ــــ رمیش تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا کہ یہ کام کسی انقلابی کا ہے۔

شہر بھر میں سنسنی پھیل گئی تھی، جہاں دیکھو یہی تذکرہ ہو رہا تھا ــــ شام کا وقت تھا۔ اسی گلی کے مکان میں وہ چاروں نوجوان بیٹھے تھے وہ بھی اسی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

ایک کہہ رہا تھا۔ "آج تو رمیش کا آنا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں! اس کے یہاں چوری ہوگئی ہے۔ شاید ہی آسکے۔"

"کیوں جی! بھلا یہ چور کون ہوگا؟"

"کوئی بڑا ہی ہوشیار اور بہادر آدمی ہے۔ پرائے مکان میں اس طرح جاکر چوری کر لانا کھیل نہیں ہے۔"

"اب تو رمیش سے روپیہ ملنا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"کیا کہیں سونے کی چڑیا تو اچھی پھنسی تھی لیکن اتفاق کی بات نکل گئی۔"

"لیکن اسے ہاتھ سے نکلنے نہ دینا چاہئے۔ روپے اسے بیٹنگے ضرور ابھی نہیں تو مہینہ بیس روز بعد سہی لیکن دیں گے یقیناً ــــ!"

"ہاں یہ بات تو رام چندر ٹھیک کہتا ہے۔ اس پر اس وقت انقلابی بننے کا بھوت سوار ہے۔ وہ روپے ضرور دیگا۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آج یہاں آتا ہے یا نہیں۔"

"ممکن ہے روپے نہ لائے۔ لیکن آئیگا یقیناً۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ رام چندر اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا ــــ "لو آگیا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے پر گیا اور دروازہ کھولا۔ رمیش اندر آگیا۔ رمیش کو لئے ہوئے رام چندر کمرے میں داخل ہوا۔ رمیش کو دیکھتے ہی ایک نوجوان مسکرا کر بولا ــــ "آگئے! مجھے تو شک تھا کہ شاید نہ آسکو۔"

رمیش نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ــــ "کیوں؟"

"تمھارے یہاں چوری ہوگئی تھی اس لئے خیال تھا کہ شاید نہ آسکو۔"

رمیش منہ بنا کر بولا ــــ "تو اس سے کیا ہوا؟ چوری ہوگئی۔ ہوگئی اس کے پیچھے کوئی اپنا کام تھوڑا ہی بند کر دیگا۔"

"ٹھیک کہتے ہو؟ لیکن دوست! یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تمھارے گھر میں رہتے ہوئے چوری ہوگئی۔"

"اس کا کیا مطلب؟" رمیش نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"انقلابی کے گھر میں چوری ہو جانا تعجب کی بات نہیں تو کیا ہے؟"

"انقلابی کے گھر میں انقلابی ہی چوری کر سکتا ہے ــــ کچھ بھی ہو۔ اس نے کیا بہادری کا کام، یہ تو ماننا پڑیگا۔" رمیش نے کہا۔

"ہاں یہ تو ضرور ماننا پڑیگا۔ لیکن تمھارے لئے یہ شرم کی بات ہے۔"

"آپ لوگ اپنا کام کیجئے۔ ان پھیر میں نہ پڑیئے۔"

"کام تو روپے سے ہوگا۔ روپے لئے ہو ــــ؟"

"وعدہ کر گیا تھا تو کیسے نہ لاتا ــــ" اتنا کہہ کر رمیش نے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیا۔

رام چندر نے بنڈل کو دیکھتے ہوئے پوچھا ــــ "کتنے ہیں؟"

"دو ہزار!" "اتنے ہی تو تم لوگوں نے مانگے تھے۔"

"ہاں اتنے ہی مانگے تھے۔ لیکن یار خوب لائے۔ ہم لوگوں کو تو امید نہ تھی ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"اسی چوری کی وجہ سے۔ ہم لوگوں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم چوری کے جھگڑے میں پڑ گئے۔ بھلا روپے کیا لا سکوگے۔"

رمیش ہنستا ہوا بولا ــــ "ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اگر انقلابی متاثر ہو جائیں تو بس ہو چکا۔"

اسی وقت کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ رام چندر چونک

کر بولا ـــ "یہ کنڈی کون کھٹکھٹاتا ہے ؟"

سب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ادھر پھر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

"جاؤ، دیکھو، کون کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ لیکن دروازہ نہ کھولنا پہلے سمجھ لینا کہ کون ہے ـــ ؟"

رام چند باہر گیا۔ اُدھر ایک نوجوان نے نوٹوں کا بنڈل اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور میز کی دراز سے تاش نکال کر بانٹنے شروع کر دیئے۔

رام چندر دروازے پر پہونچ کر اندر ہی سے بولا۔ "کون ہے ؟"

"ابھی ایک بابو اس مکان میں گئے ہیں ان کی کوئی چیز گر پڑی ہے۔ لے لیجئے ـــ"

"تم کون ہو ؟" رام چندر نے سوال کیا۔

"میں تو بھکاری ہوں۔ بابو جی نے مجھے جیب سے نکال کر ایک اکنی دی تھی اسی وقت ان کی جیب سے یہ گر پڑی۔"

"کیا چیز ہے ؟"

"کوئی چھوٹی سی کتاب ہے۔"

رام چندر نے کہا ـــ "اوہو! نوٹ بک ہوگی۔ اچھا لاؤ۔"

یہ کہہ کر رام چندر نے دروازہ کھولا ـــ دروازہ کھلتے ہی پولیس کے چھ سات آدمی اندر گھس آئے۔ ایک نے رام چندر کو پکڑ لیا۔ باقی سب کمرے کی طرف چلے۔ آگے آگے سب انسپکٹر تھا اس نے کمرے میں گھستے ہی پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور بولا ـــ "بس جو جہاں ہے وہیں بیٹھا رہے۔"

پولیس کو دیکھتے ہی چاروں کے ہاتھ سے تاش گر پڑے۔

کانسٹبل نے ان چاروں کو بھی حراست میں لے لیا۔ چاروں کی تلاشی لی گئی ایک کے پاس وہی نوٹوں کا ایک بنڈل نکلا۔ اسے انسپکٹر نے اپنے قبضہ میں کر لیا اور پوچھا۔

"یہ رقم کہاں سے ہاتھ لگی حضرت ـــ ؟"

رام چند بول اٹھا۔ "یہ نوٹ ابھی رمیش نے لا کر دیئے ہیں۔"

انسپکٹر ہنس کر بولا ـــ "یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن تم کیسے "ویوقوف سنٹری" ہو کر اتنی جلدی راز فاش کر دیا ـــ اپنے دوست کو پھانس کر خوب بچنا چاہتے ہو۔"

اتنا کہہ کر انسپکٹر نے رمیش کی طرف ذومعنی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے بعد اس نے کانسٹبلوں سے کہا۔ "ان چاروں کو تھانے پر لے چلو ـــ میں ایک گھنٹے کے اندر وہیں آتا ہوں۔"

انسپکٹر نے رمیش سے کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑیگا۔"

رمیش کے والد اپنے باہری کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس تین چار اشخاص اور بھی بیٹھے تھے ـــ اسی چوری کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی وقت انسپکٹر رمیش کو ساتھ لئے ہوئے پہونچا۔

انسپکٹر کو دیکھ کر رمیش کے والد نے پوچھا ـــ "کہئے داروغہ صاحب! کچھ پتہ لگا۔؟"

"ذرا علاحدہ چلئے تو بتاؤں۔"

رمیش کے والد اٹھ کر انسپکٹر اور رمیش کو لئے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں گئے۔ انسپکٹر نے کمرہ کا دروازہ بند کر کے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور اسے رمیش کے والد کے سامنے رکھ کر کہا۔ "لیجئے یہ اپنے روپئے اور یہ روپوں کا چور ـــ" اتنا کہہ کر اس نے رمیش کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے کر دیا۔

رمیش کے والد متحیر ہو کر انسپکٹر اور رمیش کا منہ دیکھنے لگے۔ رمیش سر جھکائے ہوئے کھڑا رہا۔

رمیش کے والد بولے ـــ "کیا اسی کا کام تھا ؟"

"جی ہاں!"

"مجھے یقین نہیں ہوتا داروغہ صاحب! ـــ کیا اس نے یہ بات قبول کر لی ہے ـــ ؟"

"ابھی قبول کرنے ہیں۔"

اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی جیب سے ایک کپڑے کا ٹکڑا نکالا۔ اس کے بعد اس نے رمیش کی قمیص کے بٹن کھول دیئے۔ نیچے کی قمیص کے اوپر کپڑے کا ٹکڑا رکھ کر انسپکٹر نے کہا۔

"دیکھئے یہ کپڑا اس قمیص سے ملتا ہے ؟"

"ہاں ملتا تو ہے۔ لیکن ....."

رمیش کے والد کی بات کاٹ کر داروغہ صاحب بولے۔ "ٹھہرئیے" اس کے بعد انھوں نے قمیص کے دامن کا کونہ دیکھا۔ چاروں کونے دیکھنے پر

ایک کونہ پھنسا ہوا نکلا۔" اور اس پھٹے ہوئے کونہ پر وہ ٹکڑا فٹ ہو گیا۔

رمیش کے والد نے پوچھا ——— "یہ ٹکڑا آپ کو کہاں ملا؟

"آپ کے سونے والے کمرے کی کھڑکی کی نیچے والی دہلیز میں ایک کیل نکلی ہوئی ہے۔ یہ ٹکڑا اس میں پھنسا ہوا تھا۔ میں سویرے جب موقع دیکھنے آیا تھا تو مجھے یہ ملا تھا ——— میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ کام کس کا ہے؟ لیکن اگر اس وقت پوچھتا ان سے تو اتنی آسانی سے پتہ نہ لگتا۔ میں نے ان کے پیچھے خفیہ کا آدمی لگا دیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے گیا اور جب یہ مکان کے اندر گئے تو اس نے مجھے خبر دی میں نے ایک بھکاری کو سکھا کر بھیجا اس نے دروازہ کھلوایا تو میں نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا۔ (رمیش سے) کیوں یہی بات ہے نا؟"

رمیش نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"تو اب کیا ہوگا؟ داروغہ صاحب!"

"ہوگا کیا؟ آپ کا روپیہ مل گیا۔ چور آپ کا لڑکا ہی نکلا۔ اب اس پر کیا مقدمہ چلوایئے گا۔؟"

"نہیں بھلا اس پر کیا مقدمہ چلواؤں گا" (رمیش سے) "واہ بیٹا! خوب بگھر ہی میں شکار کھیلا ———!"

"یہ اچھا ہوا کہ گھر ہی سے بسم اللہ کی اس لئے بچ گئے ورنہ بڑے گھر کی ہوا کھانی پڑتی۔ اچھا اب انھیں سنبھالئے گا۔ مجھے امید ہے کہ اب ان کے دماغ سے ریولیوشنری بننے کا خبط دور ہو جائیگا۔ انھوں نے مجھ سے سویرے بڑے زور کے ساتھ کہا تھا کہ یہ کام صرف ریولیوشنری ہی کر سکتا ہے"۔

"اچھا ان کے ساتھیوں کا کیا ہوگا۔؟"

"ان سب کو میں جانتا ہوں۔ وہ سب شریف خاندانوں کے لڑکے ہیں ان میں سے ایک بھی ریولیوشنری تو کیا ریولیوشنری کی دم بھی نہیں ہے ——— انھوں نے ان سے روپیہ لینے کے لئے یہ سب سوانگ رچا تھا۔ انھیں بھی تنبیہ کرکے چھوڑ دوں گا۔"

انسپکٹر نے رمیش سے کہا۔ "صاحبزادے! ریولیوشنری بننے کا خبط دماغ سے نکال دو۔ یہ تم جیسوں کا کام نہیں ہے ——— اچھا رخصت، آداب عرض ہے"۔

(خاص) ——— (آسی) رام نگری

حشر جذبات

از سحر طراز حضرت ثاقب کانپوری

فریبِ وصل سے میں کامیاب ہو نہ سکا
تسلیوں سے بھی کم اضطراب ہو نہ سکا

مدارِ عشق ہے دنیا میں سعیٔ پیہم پر
وہ کامیاب ہے جو کامیاب ہو نہ سکا

فضول ہے یہ تمنا و انتظارِ کرم
کہ تجھ سے جب مرے دل پر عتاب ہو نہ سکا

میں عرض شوق کروں یا کروں گلہ تیرا
تمام عمر یہی انتخاب ہو نہ سکا

عجیب تھا ترا اندازِ پرسشِ احوال
ترے سوال کا مجھ سے جواب ہو نہ سکا

تاثراتِ حوادث کرینگے کیا آخر
کسی کے عشق میں جب دل خراب ہو نہ سکا

یہ کیسی آگ لگائی تھی تم نے الفت میں
سکوں پذیر کبھی اضطراب ہو نہ سکا

میں کیا کروں گلۂ جورِ ناروا تیرا
کہ میرے شوق کو خود اجتناب ہو نہ سکا

تجھے خبر بھی ہے کچھ شوق دیدِ بیخود کی
تجلیوں کو تری کیوں حجاب ہو نہ سکا

نہاں تھیں چشم غضب میں مروتیں ثاقب
عتاب بھی تو کسی کا عتاب ہو نہ سکا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک فرانسیسی سیاح کی گفتگو

مترجمہ جناب مولانا غلام ربانی صاحب لودھی

ڈاکٹر جیکی مونٹ کو مئی ۱۸۲۹ء میں پیرس میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے ارباب بست وکشاد نے سائنس کے مشن پر ہندوستان بھیجا۔ کلکتہ کے مختصر قیام کے دوران میں راجہ رام موہن رائے کے ساتھ ان کی دلچسپ ملاقات ہوئی اس کے بعد جلد ہی وہ بنگال سے چلے گئے اور دہلی سے ہوکر مغربی تبت میں داخل ہوگئے۔ پھر دہلی واپس آئے اور اس مقام سے ۱۸۳۱ء میں انھوں نے پنجاب وکشمیر کی سیاحت کی۔ ان کی آرزو تو تمام جنوبی ہند کو دیکھنے کی تھی لیکن بیمار ہو گئے اور دسمبر ۱۸۳۲ء میں انتقال کرگئے۔ چھ جلدوں میں ان کا روزنامچہ ہے جوکہ بہت ہی دلچسپ تصنیف ہے۔ مشہور انسانوں اور مقاموں کے علاوہ اس روزنامچہ میں سیاح موصوف کی وہ تحقیقات درج ہیں جوکہ انھوں نے علم نباتات علم طبقات الارض اور دیگر علوم کے متعلق فرمائی ہیں۔ ذیل میں ہم اس روزنامچہ کا ایک ورق پیش کرتے ہیں۔

لاہور۔ ۱۱ مارچ ۱۸۳۱ء

شہر لاہور میں پہونچنے تک انسان کو ایک لق ودق بیابان سے گزرنا پڑتا ہے۔ جن میں کہیں کہیں باغ بھی ہیں۔ ان دلاویز مقامات میں سے ایک دروازے پر مجھے ایک معزز سی ٹولی نظر آئی۔ میرے بدرقہ نے جوکہ وزیرزادہ تھا مجھ سے کہا کہ یہ موسیو الارڈ۔ موسیو ونٹرا اور موسیو کورٹ ہیں۔ انھوں نے میرے استقبال اس تپاک سے کیا گویا وہ میرے پرانے دوست ہیں۔

موسیو الارڈ سینٹ ٹروپیز کا باشندہ ہے۔ قدیم شاہی فوج کا افسر ہے اس نے نیپلز میں جوزف بوناپارٹ کے ماتحت اور سپین میں ملازمت کی ہے جنگ "صدروزہ" میں وہ مارشل بریوں کا ایڈی کانگ تھا۔ ۱۸۱۵ء میں وہ فرانس سے قسطنطنیہ چلا گیا۔ تھوڑا سا عرصہ ترکی میں رہ کر ایران چلا گیا۔ وہاں سے وہ کابل گیا۔ جہاں ابھی تک شاہ شجاع کا بھائی حکمراں تھا۔ کابل میں وہ موسیو ونٹرا سے ملا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تعریف سن کر دونوں پنجاب کی طرف چل پڑے۔ مہاراجہ نے ان دونوں کو ملازمت دیدی۔ ان کی قابلیتوں کے آزمانے کے مواقع اسے بارہا ملے۔ پشاور کی مہموں میں سے ایک میں موسیو ونٹرا نے رسالہ کو ساتھ لیکر ایسا بے دھڑک حملہ کیا کہ بھاگتے ہوئے سکھوں کو اکٹھا کرکے انھیں فتح کی منزل مقصود تک پہونچا دیا۔ موسیو الارڈ اور موسیو ونٹرا نے مہاراجہ کے دل میں فرانسیسیوں کے متعلق بہت بلند خیالات قائم کردیئے اور اکثر ان دونوں کو مہاراجہ کی طرف سے قیمتی تحائف بھی ملتے رہتے تھے۔

موسیو ایو ٹبائیل نیپلز کے باشندہ ہیں اور انھوں نے تھوڑے عرصہ تک فرانس کی فوج میں ملازمت کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ موسیو کورٹ کے ساتھ جنھوں نے ۱۸۱۸ء میں فرانس کی ملازمت ترک کردی تھی گہرا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ کئی سال تک وہ دونوں ایران میں رہے۔ پھر وہ دونوں پنجاب آگئے جہاں وہ دو ایک پیادہ رجمنٹوں کی کمان بھی کرتے ہیں۔ موسیو ایوی ٹبائیل رجمنٹ کی کمان بھی کرتے ہیں اور مالیات کا کام بھی۔ اب تک مہاراجہ کے ساتھ حسابات کے معاملہ میں ان کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ حالانکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بڑا محاسب ہے اور دنیا کا بہترین اکاونٹنٹ بھی ان کی غلط فہمیوں سے نہیں بچ سکتا۔

موسیو الارڈ اور ونٹرا دونوں اکٹھے ایک نئی عمارت میں رہتے ہیں۔ کہ انھوں نے خود کسی مغلیہ محلسرائے کے کھنڈروں پر تعمیر کی ہے۔ یہاں آکر یورپینوں کو بھی لازمی طور پر پردہ دار مکان یا حرم سرا کے رواج کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

لاہور۔ ۱۲ مارچ ۱۸۳۱ء

لاہور پہونچنے کے دوسرے ہی دن مہاراجہ نے اپنے فرانسیسی افسروں کو حکم دیا کہ مجھے دربار میں لے جائیں - مہاراجہ غالباً شالامار باغ میں گدی پر بیٹھا اور اس کے دائیں بائیں قریباً ایک درجن رؤسا ایرانی قالین پر بیٹھے تھے مہاراجہ نے گفتگو کا آغاز ہندوستانی زبان میں کیا جسے میں سمجھ سکتا تھا - میں نے بھی ملاقات کی ابتداء کرنے کے لئے اسی زبان میں فصیح و بلیغ جملے پہلے سے چُست کر رکھے تھے جو کہ سنائے اور مہاراجہ نے ان کو سمجھ لیا - میں نے بونا پارٹ کو اکثر دیکھا تھا اور میری ہمیشہ سے یہ آرزو تھی کہ مشرق کے بونا پارٹ کو دیکھ لوں - مہاراجہ بڑی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے - میری سیاحت کے متعلق مجھ سے حالات پوچھے - لیکن اُردو زبان میں بات کرتے ہوئے مہاراجہ کو بڑی دقت ہوتی تھی اور پنجابی بولتے تھے تو میں اس کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا - چنانچہ موسیو ونٹرا مہاراجہ کے پنجابی ارشادات کا ترجمہ مجھے سناتے تھے - ہماری گفتگو دو گھنٹہ تک جاری رہی مہاراجہ نے انگریزی سپاہیوں کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے -

مہاراجہ :- کیا وہ اچھا لڑتے ہیں ؟

جیکی مونٹ :- بہت اچھا -

مہاراجہ :- ایسا اچھا جیسا فرانسیسی ؟

جیکی مونٹ :- قریباً ایسا ہی اچھا - کیونکہ نپولین نے ان کو (فرانسیسیوں کو) فن حرب سکھایا ہے -

مہاراجہ :- کیا کمپنی کے ہندوستانی سپاہی اچھے لڑنے والے ہیں ؟

جیکی مونٹ :- سنا تو ایسا ہی ہے - جب میں آیا ہوں ہندوستان میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی - اس لئے میں نے ان باتوں کے متعلق لوگوں ہی سے سنا ہے

مہاراجہ :- لیکن بھرت پور کے حالات تو سنائیے ؟

جیکی مونٹ :- قبضہ بھرت پور کے وقت میں ہندوستان میں نہ تھا اس کے علاوہ بھرت پور نہایت ناقص قلعہ ہے یورپ کی توپچی سائنس کے مقابلہ میں وہ قائم رہ ہی کب سکتا تھا ؟

مہاراجہ :- بھرت پور ناقص قلعہ ہے ؟

جیکی مونٹ :- یقیناً ناقص ہے - ہندوستانی فن جنگ محض بچوں کا کھیل ہے - بونا پارٹ کی لڑائیوں کے ایک ایک ہلّے میں پالیس عالیشان ہزار سپاہی کھیت ہوئے -

مہاراجہ :- میں نے الارڈ صاحب سے بھی اکثر ایسا ہی سُنا ہے - کیا آپ نے بونا پارٹ کو دیکھا ہے ؟

جیکی مونٹ :- بہت دفعہ -

مہاراجہ :- کیا آپ نے اسے قریب سے بھی دیکھا ہے ؟

جیکی مونٹ :- ایسا ہی قریب سے جیسا میں حضور کو دیکھ رہا ہوں حضور ہی کی طرح وہ چھوٹے قد کا اور جوانی میں دبلا پتلا تھا اور حضور ہی کی طرح وہ اپنے زور بازو اور اپنی دانشمندی سے بادشاہ اور دنیا بھر میں سب سے زبردست بادشاہ بنا -

مہاراجہ :- پھر بھی اسے شکست ہو گئی اور انگریزوں نے اسے قید کر لیا -

جیکی مونٹ :- اسے دھوکا دیا گیا - وہاں غدار تھے -

مہاراجہ :- آپ کیا کیا سائنس جانتے ہیں ؟

میں لمبی چوڑی فہرست پیش کرنے کو تھا لیکن موسیو الارڈ نے مجھ سے فرانسیسی زبان میں کہا کہ یہ کہدو کہ میں تمام علوم جانتا ہوں -

چنانچہ میں نے ہندوستانی میں کہدیا کہ میں تمام علوم جانتا ہوں -

مہاراجہ :- کیا آپ فن جنگ سے بھی واقف ہیں ؟

میں تامل کرنے لگا تو موسیو ونٹرا نے بڑھ کر جواب دیا کہ حضور وہ جنگ کا علم تو جانتے ہیں لیکن انہوں نے اس کی مشق نہیں کی -

مہاراجہ :- کیا آپ علم سیاست سے واقف ہیں ؟

موسیو الارڈ :- حضور وہ اس علم کے متبحر عالم ہیں -

مہاراجہ :- میں فی الحال کون کون سے ملک فتح کر سکتا ہوں ؟

جیکی مونٹ :- ایسی عمدہ اور ایسی منظم فوج سے تو حضور ایشیا کے ہر ملک کو جس پر انگریزوں یا روسیوں کا پہلے سے قبضہ موجود نہ ہو فتح کر سکتے ہیں -

مہاراجہ :- (شکریہ ظاہر کرنے کیلئے میرے آگے خوش اخلاقی سے جھکتے ہوئے) لیکن پہلے کس صوبہ کو لینے کا ارادہ کروں ؟ تبت ؟ آپ تو وہاں رہ چکے ہیں

جیکی مونٹ :- حضور وہاں تو آپ کو اپنی گورکھا فوج بھیجنا ہی کافی ہوگا لیکن یہ ملک تو صدر درجہ کا مفلس ہے -

مہاراجہ :- ایسے ملک کو فتح کرنے سے کیا فائدہ - مجھے تو ایسے ملک کی

ضرورت ہے جو مالدار اور خوشحال ہو۔ کیا میں سندھ نہیں لے سکتا؟ کہا جاتا ہے کہ وہاں زر و مال بکثرت ہے لیکن اس تجویز کے متعلق انگریزوں کی کیا رائے ہوگی؟

جیکی مونٹ: اگر انگریزوں نے طاس سندھ کے پائین خطے کی حفاظت کا وعدہ وہاں کے حکمرانوں سے نہ کیا ہو تو حضور ان صوبوں پر حملہ کر سکتے ہیں انگریز آپ سے نہ لڑیں گے۔

مہاراجہ:۔ آج کل روسیوں کے متعلق بہت باتیں سننے میں آتی ہیں۔

جیکی مونٹ: اس لئے کہ وہ ایران میں وسیع پیمانے پر فتوحات حاصل کر رہے ہیں۔

مہاراجہ:۔ انگریزوں کا ان کی سرگرمیوں کے متعلق کیا رویہ ہے؟

جیکی مونٹ:۔ وہ اس میں بہت دخل دینے کی پرواہ نہیں کرتے۔

مہاراجہ:۔ لیکن اگر روسی فوج ان پر حملہ کرنے کیلئے آگے بڑھے تو وہ کیا کرینگے

مجھے کہنا تو وہ تھا جو صحیح بات ہے کہ اس صورت میں انگریز مہاراجہ کی خدمت میں عرض کرینگے کہ "افسوس ہے کہ روسیوں کے مقابلہ کیلئے ستلج سے سندھ تک کے علاقہ پر جو کہ مہاراجہ کی عملداری میں ہے انگریزوں کا تسلط ضروری ہو گیا ہے۔ ہم معذور ہیں۔ مجبور ہیں۔ مہاراجہ صاحب ناراضی معاف فرمائیں۔" لیکن میں نے ذرا محتاط جواب دیا اور کہا۔ "حضور انگریزوں کو اس تکلیف سے بچا ہی کیوں نہیں دیتے کہ وہ اتنے دور کے علاقہ سے روسیوں کو ہٹانے کے لئے پیش قدمی کریں۔ حضور کے پاس بڑی منظم اور سیکھی ہوئی فوج ہے اور موسیو الارڈ اور موسیو ونٹرا جیسے قابل فرانسیسی قائد موجود ہیں۔

مہاراجہ:۔ انگریزوں سے میرا پورا پورا اتفاق اور دل و دماغ کی یکجہتی ہے

دوسرے دن مہاراجہ نے میرے ساتھ کشمیر کے متعلق تذکرہ چھیڑا۔ کیونکہ میں وہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مہاراجہ نے کہا کہ "یہ روئے زمین پر جنت ہے لیکن وہاں کے مردوں سے احتیاط رکھیں جھوٹے اور چھٹے ہوتے ہیں البتہ عورتیں فی الواقعہ خوبصورت ہیں۔"

پاس کے ایک خیمے سے پانچ حسین و جمیل عورتیں باہر نکل رہی تھیں ان کی طرف اشارہ کر کے اصرار کے ساتھ میری رائے پوچھی میں نے کہا ہندوستان بھر میں یہ سب سے زیادہ خوبصورت ہیں چاہے کوئی ملک بھی ہو۔ ان عورتوں کے حسن و جمال کا مداح ہوگا۔ وہ دلفریب ہیں۔" اس پر مہاراجہ صاحب خوب کھل کھلا کر ہنسے۔

(ترجمہ) غلام ربانی۔ لودھی۔

از جناب شیخ باقر حسین صاحب وفا اکونٹنٹ اناؤ

تری چتون سے یا چینِ جبیں سے — نہیں امید کی صورت کہیں سے

نظر آئے نہ وہ اتنے قریں سے — تعجب ہے نگاہِ دوربیں سے

بلندی کو ہے زیبا انکساری — ملا ہے آسماں جھک کر زمیں سے

جنھیں پر تولنا ہم نے سکھایا — خدا کی شان اڑتے ہیں ہمیں سے

نگاہیں اور ہی کچھ کہہ رہی ہیں — بھلا کیا فائدہ ایسی نہیں سے

جہاں حد حسن کی ہوتی ہے آخر — سراغ عشق ملتا ہے وہیں سے

مٹا دو ہاں مٹا دو میری ہستی — یہ خالِ بدنما روئے زمیں سے

درِ محبوب بتخانے کا در ہے — مسلماں بنتے ہیں کافر یہیں سے

تمنا پردۂ دل میں رہے گی — محبت کر کے اک پردہ نشیں سے

جنابِ شیخ اور یہ خوش بیانی — یہ حضرت پی کے آئے ہیں کہیں سے

رگِ گردن سے مانا تم قریں ہو — دلا دو ہم کو آنکھیں بھی کہیں سے

مبارک اہل دنیا کو یہ ساماں — ہمیں کیا کام جیب و آستیں سے

کہاں ڈھونڈوں کہاں مجھکو ملو گے — تمھیں سے پوچھتا ہوں میں تمھیں سے

زمانے بھر پہ ہے بیکار قبضہ — ہمیں تو کام ہے دو گز زمیں سے

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — تمھارے ظلم کا شکوہ تمھیں سے

وفا کا تذکرہ ان کی زباں پر — بھلا یہ جوڑ ملتا ہے کہیں سے

درسِ عبرت!

از جناب حلیم صاحب آبر بھاگلپوری

برسات کی رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ کہیں سے جھینگر کی کرخت آواز آ رہی تھی۔ کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی آس پاس کے گڑھوں میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ میں اپنے تاریک کمرہ میں پلنگ پر سویا ہوا تھا کہ خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک قبرستان میں تنہا کھڑا ہوں چاروں طرف ایسا اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ تاریکی چھائی ہوئی ہے سناٹے کا عالم ہے۔ چہار طرف عدم کو جانے والی ہستیوں کے قافلے کے قافلے ابدی نیند میں لیٹے ہوئے ہیں۔ بستر خواب پر شاہ و گدا امیر و غریب پیر و جوان خورد و کلاں عاشق و معشوق سب کے سب ایک ہی حالت میں حشر تک نہ اٹھنے کی قسم کھا کر مست خواب ہیں۔ وہ معشوقان خوشخرام جن کے قدموں تلے ہزاروں جانیں قربان ہونے کو تیار رہتی تھیں آج کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ حسینان برق وش جو تیغ ابرو سے لاکھوں انسانوں کو قتل کرتے تھے آج خاک پر لوٹ رہے ہیں۔ ان کی قبروں پر دو آنسو بھی بہانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ نازک اندام ہستیاں جن سے کسی کی ناز برداری بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آج قبر میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔ وہ جوانان سیلتن جو رستم اور سہراب کو بھی آنکھ نہ لگاتے تھے آج بے بس پڑے ہیں۔ ہاتھ اٹھا کر ایک مچھر کو بھی بھگا نہیں سکتے۔ وہ شیر خوار بچے جنھیں ماں کی گود کے سوائے کوئی چیز نہ بھاتی تھی آج تختہ خاک پر سوئے ہوئے ہیں۔ وہ شاہزادے اور امیرزادے جن کی نظروں میں تاج فریدوں اور تخت سلیمانی کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ تھی آج ہزاروں من مٹی کے تلے پڑے ہیں۔

ان بے بس ہستیوں کی بستی یعنی قبرستان جہاں قیامت تک انھیں رہنا ہوگا کس مپرسی کی حالت میں ہے یہاں۔ صفائی کا نام و نشان نہیں ہے۔ کہیں خس و خاشاک کے ڈھیر ہیں تو کہیں کانٹوں اور جھاڑیوں کے انبار لگے ہیں۔ تعفن اور بدبو اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ دماغ پراگندہ ہو کر پھٹا جاتا ہے ایک منٹ بھی ٹھہرنا محال ہے۔ کہیں مویشیوں کے گوبر کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نظر آ رہے ہیں۔ قبریں نہایت بری حالت میں ہیں۔ کوئی ٹوٹی ہوئی ہے تو کسی میں جانوروں نے بڑے بڑے سوراخ کر ڈالے ہیں۔ کوئی بارش کی دست و برد سے دانت نکالے ہوئے ہے تو کوئی دب دبا کر بالکل برابر ہو گئی ہے۔ کسی کے تختے نظر آ رہے ہیں تو کسی کی لکڑیاں باہر پڑی ہیں۔ کہیں نوچا کھسوٹا کفن پڑا ہے تو کسی میں ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں کہیں گھٹنے کہیں ٹخنے اور کہیں کھوپڑیاں لڑھک رہی ہیں۔

میں قبرستان اور قبروں کی بری حالت دیکھ کر نہایت متاثر ہوا۔ ان کی ناگفتہ بہ کیفیت سے رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جی میں آیا کہ ہر قبر سے مل کر روؤں کہ ایک ضعیف مردہ کی لاش پر نظر پڑی اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ پوچھا تمھاری یہ ٹانگ کیسے ٹوٹی۔؟ آواز آئی۔ آہ! کیا بتلاؤں۔ یہ مسلمانوں کی غفلت اور لاپروائی کا نتیجہ ہے ایک گائے نے چرتے چرتے میری ٹانگ پر اپنا پاؤں اس زور سے رکھ دیا کہ ٹانگ کھٹ سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ اگر میرے بھائی بیجا اخراجات کے عوض ذرا قبرستان کی طرف توجہ کرتے۔ لہو و لعب۔ ناچ گانے۔ تھیٹر و سینما کے بجائے اپنی موت کا خیال کرتے اور اس قبرستان کو چاروں طرف دیواروں سے گھیر دیتے تو نہ گائے اندر آتی اور نہ میری کمزور ٹانگ ٹوٹتی۔ دوسری قبر کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک حسین عورت بالکل برہنہ پڑی ہوئی ہے۔ پھٹا پرانا کفن کوئی جانور باہر گھسیٹ لایا ہے۔ قبر میں گیدڑوں نے سوراخ بنا ڈالا ہے اور لاش کے منہ سے یہ الفاظ دلسوز نکل رہے ہیں۔" افسوس کیا دنیا سے مسلمان اٹھ گئے۔ کیا مسلمانان در

گور و مسلمانی در کتاب صحیح ثابت ہوا جو آج اس طرح میری بے پردگی ہو رہی ہے اور میرے تن کو ڈھانکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر میرے اعزہ و اقربا یا دیگر مسلمان میری تربت کو مہینہ میں کم سے کم ایک مرتبہ بھی دیکھ لیتے۔ سال میں ایک بار بھی دیکھ کر اس کی مرمت کرا دیتے تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔ میں۔ وہ پھول کہ بھول کر بھی کسی نامحرم کی نظر نہ پڑتی تھی لیکن آج ظالم گیدڑوں نے میرے کفن کو دانتوں سے نوچ ڈالا ہے اور میری بے حرمتی ہو رہی ہے۔ میں وہاں سے ہٹ کر دوسری قبر کے قریب گیا تو دیکھا کہ قبر کے ایک گوشہ میں سیاہ سانپ بیٹھا ہوا ہے۔ میں تھرا اٹھا۔ تمام جسم میں لرزش ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں کہ قبر سے یہ آواز آئی۔ نہ بھاگو۔ ذرا میری باتیں سن لو۔ میں تمہاری فانی دنیا میں نیک اور صالح مرد کہلاتا تھا۔ مردم آزاری سے گریز کرتا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ ہر قسم کے برے اور ناجائز کاموں سے پرہیز کرتا تھا۔ لیکن آج مجھے مار سیاہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ یہ میرے بھائیوں کی غفلت کا باعث ہے کہ میری قبر کے آس پاس خس و خاشاک اور خود رو جھاڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں اگر قبرستان صاف ستھرا ہوتا تو آج یہ مار سیاہ یہاں گھر نہ بناتا اور آج ہی روز حشر کے قبل دوزخ کی یاد نہ آتی۔

یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ وہاں سے ہٹ کر دوسری قبر کے پاس گیا تو دیکھا ایک خوش رو جوان نہایت بےچینی سے کروٹیں بدل رہا ہے اور منہ سے یہ جگر سوز الفاظ نکل رہے ہیں۔

"میں زندگی میں فرش مخمل پر پڑا رہتا تھا۔ نرم اور ملائم بستروں پہ آرام کیا کرتا تھا۔ طرح طرح کی خوشبوؤں سے دماغ بسا رہتا تھا لیکن آج اپنے غافل بھائیوں کے ہاتھوں یہ اذیتیں اٹھا رہا ہوں میری قبر کے آس پاس اس قدر گندگی ہے کہ بدبو سے دماغ پراگندہ ہو گیا ہے میری تربت ایسی ایسی خاردار جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہے کہ نکیلے کانٹوں نے چبھ چبھ کر میرے تمام جسم کو چھلنی بنا ڈالا ہے اگر میرے تغافل شعار بھائی قبرستان کی خبر لیتے صرف دس روپئے تنخواہ پہ ایک ملازم رکھ چھوڑتے کبھی کبھی قبروں کی دیکھ بھال کر کے صفائی کا خیال رکھتے تو مجھے یہ تکلیف نہ ہوتی۔" میں اور قبروں کے پاس جانا چاہتا تھا کہ چاروں طرف سے آواز آئی معلوم ہوتا تھا سیکڑوں ہزاروں آدمی ایک ساتھ کہہ رہے ہیں۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے ۔۔۔ نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ آواز پرغم سن کر میں چونک پڑا۔ نیند سے بیدار ہو کر پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور تھوڑی دیر تک خواب کی باتوں پر غور کیا واقعی تمام ہندستان کے قبرستانوں کی یہی زبون حالت ہے۔ اگر مسلمانان تغافل شعار خواب غفلت سے بیدار ہوں اور انگریزوں کے کسی قبرستان کو چشم عبرت سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائیگا کہ انگریز کس جزا کے لائق ہیں اور مسلمان کس سزا کے قابل ہیں انگریزوں کے قبرستان میں گندگی کا نام نہیں کوڑا کرکٹ کا پتہ نہیں قبریں قطار در قطار عمدہ ترتیب سے بنی ہیں چاروں طرف پختہ دیواریں ہیں سامنے دروازہ ہے جو کیبار معترم ہے۔ ہزارہا قسم کے پھول لگے ہیں جن کی خوشبو تمام قبرستان میں پھیلی ہوئی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ۔۔۔ حلیم آبر بھاگلپوری

چار آنے کے ٹکٹ!

اگر آپ کی میعاد خریداری ختم نہیں ہوئی تو خاص نمبر ۳۶ء بحفاظت تمام حاصل کرنے کیلئے ۴ر کے ٹکٹ روانہ فرمائیے تاکہ آپ کا خاص نمبر بذریعہ رجسٹری بھیجا جا سکے۔ جن حضرات کی میعاد خریداری ختم ہو چکی ہے وہ ٹکٹ ارسال نہ فرمائیں ان کی خدمت میں خاص نمبر ۳۶ء آئندہ سال کے چندہ کیلئے بذریعہ وی۔ پی حاضر ہوگا،

نوٹ:۔ اس مرتبہ چونکہ خاص نمبر ۳۶ء کا سائز بڑا ہے اس لئے وہ کافی وزن دار ہوگا اور بذریعہ رجسٹری بھیجنے میں محصولڈاک یقیناً ۴ر سے زاید لگے گا۔ لیکن ۴ر سے زاید محصول دفتر عالمگیر خود ادا کرے گا۔

نیازمند:۔ منیجر عالمگیر لاہور

عالمگیر بکڈپو کی چند قابل دید کتابیں!

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار۔ نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ لکھنؤ کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا ہوا ہے۔ کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائیں گے۔ بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت عہ محصول ۵/

خطوط کی سنتم ظریفی مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ہنسانے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کے مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر۔ بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت ۱۲/

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم عرب کے ایک بلند پایہ ادیب تھے آپ نے تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب بتقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا۔ اب ہمارے پاس پانچسو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں۔

اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپیہ ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف عہ میں ملیگی (علاوہ محصولڈاک) کتاب کا حجم پونے آٹھ سو صفحات ہے۔

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے رومانی حالات خود ملا صاحب کے فاونٹن پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے حجم ۱۶۰ صفحات قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے عہ

صبح لطافت ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابل دید مجموعہ۔ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں۔ پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے عہ

(نوٹ) ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنہ (عہ) علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

مویدِ ظامو بول کا دربار ۱۲ از حجم ۳۰۰ صفحے | **مجبوبۂ قیروان** ۱۲ حجم ۲۵۰ صفحے

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کے لئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے آج سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ

"عالمگیر بکڈپو" بازار سید مٹھا لاہور

Alamgir Book Depot
Bazar Said Mitha
Lahore